مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ المؤمن - سورۂ حٰمٓ السجدة - سورۂ الشوریٰ

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۃ المؤمن - سورۃ حٰمٓ السجدۃ - سورۃ الشوریٰ

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان (سورۃ المومن، السجدہ، الشوریٰ)
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوعِ اسلام، لاہور
زیراہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	مئی 2012ء
مطبع	....	باقریونس پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ ویاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؑ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفیؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو

آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست

رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ المؤمن

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورۃ المؤمن آیات 1 تا 9)

) قرآنِ حکیم میں فرعون کی کابینہ کے ایک مردِ مومن کے خطاب کی اہمیت کا ذکر ____ 37

) قرآنِ حکیم میں حروفِ مقطعات کی وضاحت ____ 38

) Education (تعلیم) اور Information (معلومات) میں بنیادی فرق ____ 38

) وحی اور انسانی تصورات میں فرق کی نوعیت ____ 39

) عقلِ انسانی کے لیے قرآنِ حکیم پر ایمان لانے کا طریق: غور و تدبر اور فہم و دانش ہے۔ ____ 39

) عربی لغت کے لحاظ سے علیم اور عالم کی دو الگ الگ صفات بڑی اہم خصوصیات کی حامل ہیں ____ 40

) ذاتِ خداوندی جو ماورائے محسوسات ہے اسے صرف اس کی صفات سے ہی پہچانا جا سکتا ہے اور وہ صحیح موقع پر ظہور میں آتی ہیں ____ 40

) ہمارے ہاں کے مروجہ قرآنی تراجم سے قرآنِ حکیم سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ دیکھیے بخشش کا قرآنی مفہوم ____ 41

) لفظ غَفِر اور ذَنبِ کا لغوی مفہوم ____ 42

) لفظ میزان کی اہمیت اور نیکی کا مفہوم ____ 43

) قانونِ مکافاتِ عمل کی ماہیت اور لفظ توبہ کا حقیقی مفہوم ____ 44

) لفظ عِقاب کا لغوی مفہوم ''کسی کے عمل کا نتیجہ پیدا کرنے کے لیے اس کا پیچھا کرنا'' ہے ____ 45

) جس طرح انسان کا کافر یا مومن کے گھر میں پیدا ہونا اس کے بس کی بات نہیں، اسی طرح عمل کا نتیجہ بھی اس کے بس میں نہیں ____ 46

) حق کو جھٹلا کر اور باطل کو لا کر انجام تو دیکھو کہ کیسا رہا ____ 47

) ایران اور روما کی مملکتوں کے زوال میں رومن امپائر کی تاریخ قرآنی حقائق کا واضح ثبوت ہے ____ 48

) قرآن فہمی کے سلسلہ میں مفکرِ قرآن علامہ پرویزؒ کے تیس چالیس سالہ غور و فکر کی روشنی میں کچھ کائناتی قوتوں کا تذکرہ ____ 49

) جنگِ بدر اور جنگِ حنین کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ ''اے رسول! تو ملائکہ کو دیکھ نہیں سکتا'' اور سورۃ الزمر میں یہ بھی کہ ''ملائکہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔'' ____ 50

) نظامِ زندگی کے سلسلہ میں عقل اور وحی کے وضع کردہ طریق میں فرق 50

) عالمِ اسلام میں مسلمانوں کی حالتِ زار کی وجہ ان کے خود ساختہ قوانین ہیں، اسلام کا عطا کردہ ضابطۂ حیات نہیں ملاحظہ ہو ''کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟'' ____ 51

) جشنِ نزولِ قرآن کی تقریب پر علامہ پرویزؒ کے خطاب کے موضوع کی اہمیت اور ہماری کم مائیگی ___ 51

) قرآنی نظامِ حیات کے لیے استعمال ہونے والی اصطلاحات کا اپنا الگ ایک مفہوم ہے: تحت اور کرسی کی مثال _ 52

) ہمارے ہاں کی تفسیروں میں عرش اور آسماں کے متعلق پائے جانے والے غیر قرآنی تصور کی نوعیت ___ 53

) ان افسانوں کو نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کرنے کا نتیجہ اور جاری کردہ کفر کا فتویٰ مگر دنیا کو کیا کہیں گے!!! ___ 53

) لفظ عرش اور تسبیح کا قرآنی مفہوم ___ 54

) جماعتِ مومنین کا فریضہ اور ان کی عملی زندگی کی وضاحت ___ 55

) خدا تعالیٰ کی طرف سے ظلم کو مٹانے کا طریق: مکہ کے مظلوم اور جماعت مومنین کے فریضہ کی مثال اور قیصر و کسریٰ کی بھی ___ 55

) قرآنِ حکیم کے آخری دو پاروں کی بدرجہ اتم خصوصیات کا ذکر: قرآن مجید شعر نہیں مگر آدمی پڑھتے ہوئے جھوم اٹھتا ہے۔ ___ 56

) جماعتِ مومنین کا یہ بھی فریضہ ہے کہ مظلوم قوموں کو مستبد قوتوں کے پنجۂ استبداد سے چھڑا کر سطحِ انسانیت پر کھڑا کر دے ___ 57

) سب سے بڑا عذاب انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا رک جانا ہے: الجحیم یہ ہے اور صدا بہار زندگی بھی ہے ___ 59

) جنت انسان کے اپنے ہی خونِ جگر یعنی صلاحیتوں کی نشوونما میں پنہاں ہے، یہ کسی بخشش کے ذریعے نہیں ملتی، یہ حکمت پر مبنی ہے جس میں طبقاتی ناہمواریاں نہیں ہیں۔ ___ 60

) قرآنِ حکیم کے معاشی نظام میں طبقاتی تفریق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا: نہ غلام اور لونڈیاں کا، نہ امیر و غریب کا اور نہ ہی آسائشوں کا۔ ___ 60

) احترامِ آدمیت دینِ خداوندی کا سب سے زیادہ قیمتی زیور ہے مگر اس مروجہ نظام میں امیر و غریب خدا کی طرف سے بتایا جاتا ہے پھر زبانی کون کھولے۔ ___ 61

) حاملینِ عرش کی ذمہ داری نظامِ ربوبیت کو عالم گیر سطح تک پھیلانا ہے ___ 62

دوسرا باب: **سورۃ المؤمن** آیات (10 تا 27)

) انسان کی بدعملی کے نتائج انسان کی طبعی زندگی سے کہیں زیادہ انسانی ذات پر مرتب ہوتے ہیں اور اس کا ارتقا رک جاتا ہے: یہ ہے دین ___ 64

) قرآنِ حکیم نے انسانی زندگی کو دو موتوں اور دو زندگیوں سے تعبیر کیا ہے، زندگی سے پہلے کی موت کی حالت ایک بڑی بلند سائنسی حقیقت ہے ___ 64

) ''لائف کی نمود کہاں سے اور کیسے آئی'' سائنس اس قدر تحقیق کے باوجود اتنا ہی جان پائی کہ پانی اور مٹی کے امتزاج سے پہلا لائف سیل وجود میں آیا ہے ___ 65

) صدیوں پہلے زندگی کی نمود کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا ارشاد 65

) انسان کی طبعی زندگی کے بعد کی زندگی کی ہیئت کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہ کیسی ہوگی۔ یہ ہے ایک اہم سوال ___ 66

) اُخروی زندگی میں عذاب کی کیفیت یہ ہے کہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ سامنے آ کر ہی رہے گا، وہ معاف نہیں ہوتا ___ 67

) نقصان رساں نتائج سے بچنے کا طریق انسان کا حسنِ عمل ہے، کچھ کرنا ہے۔ اس میں توحید کا ایک سوال۔ ___ 67

) یا اللہ! ''کیا ہے؟ ایک تصور جو سب مذاہب میں موجود ہے مگر انسانی زندگی کی عمارت ''توحید'' کے تصور پر اٹھتی ہے۔ وہ کیا چیز ہے؟ ___ 68

) خدا کا انسانوں کے ساتھ تعلق صرف اور صرف کتاب اللہ

کے ذریعے ہی ہے جیسے مملکت کا اس کے آئین سے ہے ____ 69

) کتاب اللہ کے بیان کردہ ضوابط سے انحراف بغاوت یا شرک ہے اور کتاب اللہ ہی ہمارے اور خدا کے درمیان ذریعہ ہے ____ 69

) شرک ایک ایسا جرم ہے جو کسی صورت بھی قابلِ معافی نہیں' یہ بغاوت ہے ____ 70

) کتاب اللہ کے بالمقابل انسانوں کے بیان کردہ نظریات کی پیروی اور دل جوئی کی اولیّت کا نتیجہ؟ ____ 71

) قرآنی نظامِ حیات کے سلسلہ میں دنیا بھر کی آزاد مسلمان مملکتوں کی یہ حالت کیوں؟ کہ محکومیت خدا کی نہیں ____ 71

) قرآنِ حکیم کی طرف سے شرک کے سلسلہ میں حقِ حکومت کی دوٹوک وضاحت ____ 72

) حقِ حکومت کی محکمیت اور توحید کی وضاحت کے سلسلہ میں خارجی کائنات کی مثال تو انسانوں میں یہ کیوں نہیں ____ 73

) خدا کی اطاعت کی عملی شکل قرآنِ حکیم کی اطاعت ہے خواہ وہ کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے ____ 73

) خداتعالیٰ کی ہستی کو محسوس تصور کی بجائے اس کی صفات سے ہی سمجھا جاسکتا ہے اور یہ بھی کہ اس کی تخلیق کردہ ہر شے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی نقطہ آغاز سے عروج تک پہنچتی ہے ____ 73

) خداتعالیٰ کی ذات کسی ارتقائی مراحل کی محتاج نہیں ہے ____ 74

) لفظ عرش کا قرآنی مفہوم: مرکزی کنٹرول جو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ____ 75

) خدا کے ساتھ انسانوں کا تعلق صرف اور صرف اس کی کتاب قرآن کریم اور اس کتاب کے احکام کے ذریعے سے ہی ہے ____ 75

) لفظ الرُّوح کا قرآنی مفہوم' روحانیت کا غلط تصور اور یوم التلاق کی انسانی بھول ____ 76

) لفظ التلاق اور طلاق کے باہمی فرق کے علاوہ التلاق کا مفہوم بڑا غور طلب ہے ____ 76

) انسان کا کوئی عمل ایسا نہیں جو قانونِ خداوندی کی نگاہوں سے چھپا ہوا ہو۔ یَوْمَ التَّلَاقِ میں وہ بارز ہوئے گا جو یہاں مستطر ہے 77

) دین کا مفہوم چند ایک عقائد کا نام نہیں بلکہ یہ ایک پورا نظامِ حیات ہے' انسان اس کا ''دبیلی'' ہے۔ ____ 78

) قرآنِ حکیم کی نظر میں یوم الدین کی وضاحت کہ جب انسانوں پر کتاب خداوندی کی حکومت ہوگی۔ ____ 78

) یوم الدین میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا نہ محکوم ہوگا اور نہ ہی محتاج ____ 79

) یوم الدین کے نظامِ حکومت میں کوئی کسی کی محنت کو سلب نہیں کر سکے گا' سلب کرنے والوں کے دل حلق تک آجائیں گے اور ظلم' جو فساد کی جڑ ہے' معنی' غلط نظام کے تباہ کن نتائج اور نگاہ و دل کا قانون خداوندی ____ 80

) خدا کے ہاں دلوں میں گزرنے والے خیالات اور نگاہوں کی خیانت بھی انسانی ذات پر اثر انداز ہوتے ہیں ____ 81

) ہر قسم کی برائی کے خاتمے کا علاج دل و دماغ کا زاویۂ نگاہ بدلنے میں ہے ____ 81

) قرآنِ حکیم کی تعلیم افراد کو اچھا بناتی ہے اور گرفت کے لیے دو شرائط کو لازم ٹھہراتی ہے ____ 82

) خداتعالیٰ کے قانونِ مکافات میں قوت بھی ہے اور مجرم کو سزا دینے کی صلاحیت بھی ____ 83

) داستانِ حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کا ذکر ____ 83

) داستانِ فرعون میں ہامانیت' قارونیت اور فرعونیت کے باہمی روابط کی اہمیت کو واضح کیا ہے ____ 83

) فرعون کی خفیہ سازش کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد
اور فرعون کے خدشات ______ 85
) اِدھر ملوکیت کا آخری حربہ کہ اسے قتل کر دو اور اُدھر فرعون
کی کیبنٹ کے ایک مردِ مومن کی عظمت کا تذکرہ ______ 86

تیسرا باب: **سورۃ المؤمن** آیات 28 تا 29)

) داستانِ موسیٰؑ میں فرعون کے جبر' استکبار' سلب ونہب کے
خلاف ایک مردِ مومن کی حق گوئی اور ایمان کو چھپانے میں
ضرورت کے وقت جھوٹ بولنے کے فتویٰ کے لیے دلائل ______ 87
) قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا تصریفِ آیات کا طریق اور دل میں
کسی چیز کو چھپائے رکھنا یہ کیا چیزیں ہیں؟ ______ 89
) انانیت اور تکبر کا جذبہ مانع ہوتا ہے کہ انسان اپنی سچ بات
کو زبان پر لائیں' وہ اسے اپنے دل میں چھپائے رکھتے ہیں ______ 89
) متکبر' غلام اور محکوم قوموں کی بات کو تسلیم ہی نہیں کرتے'
آن میٹرٹ لیتے ہی نہیں ______ 90
) علم اور جذبات کا تقابلی جائزہ: علم سے تو قلب ایک
چیز کا اعتراف کرتا ہے مگر جذبات حائل ہیں ______ 90
) بڑا بننے کے جذبات صداقت کو اُبھرنے نہیں دیتے مگر کوئی
شدید حادثہ بدمعاش کو بھی مظلوم ضعیفوں کا حامی و ناصر بنا دیتا ہے 91
) فرعون کے درباریوں میں ایک سعید روح کی حق گوئی و بے باکی
کا ایک منظر اور ہمارے ہاں کی عجیب وغریب تفسیر و مفہوم ______ 92
) اس مردِ مومن کے قول ''ربی اللہ'' کے مفہوم کی سند' نبی اکرم ﷺ
سے منسوب بخاری شریف کی ایک روایت بتائی جاتی ہے ______ 92
) تحریکِ پاکستان کی پوری تاریخ اسی منسوب شدہ سند کے تصور
کی ترجمان ہے اس لیے کہا ہے کہ الفاظ قرآن مجید پر سوچا کرو۔ 93
) قرآنِ حکیم کا ایک ایک لفظ انسانی سوچ کی منزل کا تعین
کرتا ہے' اِس سلسلہ میں مردِ مومن کا للکارنا اور ربی اللہ
کے لیے فرعون کے خدشات ______ 94
) حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے مطالبہ پر فرعون کی
فردِ قراردادِ جرم ______ 95
) ربی اللہ پر جم کر کھڑے ہونا ہے اگر یہ ہو جائے تو پھر اس قوم
پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے تو یہ کشمکش کیا ہے؟ ______ 95
) حضرت موسیٰؑ کے ربی اللہ کے اس چیلنج پر فرعون کا ردِعمل
اور اس کے اعلانِ عام کی مرکزی اور ارتکازی تفصیل ______ 96
) حضرت موسیٰؑ فرعون کے سامنے اپنے رب کے مالک
ہونے کے سلسلہ میں لب کُشا ہیں ______ 96
) قرآنی نظام میں رزق کے سرچشمے پر کسی کی ذاتی ملکیت
کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' فرعون کے نزدیک یہ بغاوت تھی ______ 97
) ربی اللہ میں بات صرف نماز تک ہی محدود نہ تھی' وہ تو
فرعون کے اقتدار کی بنیاد ہی کی نفی تھی ______ 98
) مردِ مومن کی مدافعت کی وجہ جواز' فرعون کے احسانات اور
خدشات کہ اے موسیٰ! تم چاہتے ہو کہ حکومت یہاں نہیں
تو وادئ سینا میں سہی۔ ______ 98
) قومِ بنی اسرائیل کی آزادی کے لیے حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ
اور مردِ مومن کی للکار کہ یہ کہتا ہے کہ ان خدا کے بندوں کو خدا کی
عبدیت میں دے دو ______ 100
) خدا کی حکومت یا اسلامی حکومت قائم کرنے والوں کا فریضہ
اور منزلِ مقصود ______ 101
) قرآنِ حکیم میں دین کا لفظ ''نظامِ حیات'' کے معنوں
میں استعمال ہوا ہے اور اس مردِ مومن نے انؑ کی مدافعت
میں اسی کی وضاحت کی ہے ______ 102

) نوعِ انسانی کے لیے ''رَبِّیَ اللّٰہُ' رَبُّکُمْ' رَبُّ اٰبَآئِکُمْ' رَبِّیْ یا رَبَّنَا'' کے انقلاب کا مفہوم اور اس مردِ مومن کا قول جو قرآن کریم نے قیامت تک کے لیے محفوظ کر لیا۔ ____ 103

) ''اے اربابِ نظر! نشہءِ قوت ہے خطرناک۔'' یہ ہے مردِ مومن' حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے مکالموں کے امتزاج کا لُبِّ لباب 103

) فرعون کا ایک الجھا دینے والا نازک سوال' حضرت موسیٰؑ کا بے لاگ جواب اور مردِ مومن کی پکار کہ اپنی روش کا سوچو _ 104

) اس مردِ مومن کا انتباہ' دانش مندانہ مشورہ اور اس پر فرعون کا ناصحانہ و معذرت خواہانہ اسلوب ____ 106

) ایک مردِ مومن کا کردار اور اس کی تعمیری سوچ' ہزاروں انسانوں کے لیے انقلاب کا باعث بن جاتی ہے ____ 107

چوتھا باب: سورۃ المؤمن آیات 30 تا 45)

) سابقہ درسِ قرآن حمید کی تجدید اور مردِ مومن کی وضاحت _ 108

) اسلامی حکومت کے سربراہ کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ خدا کے احکام میں خود کو شریک نہ کرے: مردِ مومن کی ایک وضاحت 109

) مردِ مومن کی فرعون سے مزید مدبرانہ گفتگو جس نے ہوا کا رُخ بدل کر رکھ دیا ____ 110

) اس مردِ مومن نے فرعون کے سامنے قومِ عاد اور ثمود کی تباہی کی وجہِ جواز بھی پیش کی گئی ____ 111

) قرآنِ حکیم میں تاریخی نوشتوں کو پیش کرنے کا مقصد نظامِ خداوندی کی اہمیت کو اُجاگر کرنا تھا اور ہے: اس مردِ مومن کی توضیح ____ 112

) عبادت کا حقیقی مفہوم ''پرستش'' نہیں ''محکومی'' ہے۔ خدا ظلم نہیں کرتا تم خود ظلم کرتے ہو اور خودکشی میں اور ظالم کے خنجر سے مرنے میں فرق ہے۔ ____ 112

) انسانوں کے خودساختہ نظاموں کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے: اس مردِ مومن کی پکار ____ 113

) ہمارے ہاں قرآنی تراجم کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا ایک Touch اور قرآنِ حکیم کا اصل ارشاد ____ 113

) مصر میں لفظ فرعون کا مختصر سا تعارف و وضاحت اور تاریخ کے کچھ قیاسات کا ایک ورق ____ 114

) فرعون کے دربار میں حضرت یوسفؑ کا ذکرِ خیر اور مردِ مومن کی للکار ____ 115

) روکنے پر ضدبازی کا نتیجہ ہمیشہ حقیقت کو تسلیم نہ کرنے کی شکل میں نکلتا ہے اسی لیے روکنے ٹوکنے والا باعثِ رحمت ہے: یہ ہے انسانی نفسیات کا ایک پہلو ____ 116

) قرآنِ حکیم کی مخالفت قرآنِ حکیم کو ماننے والوں کی طرف سے کیوں ہوتی ہے؟ ____ 117

) قرآنِ حکیم کے پیش کردہ پیمانوں (قوانین) کا استعمال' ان کی حدود شکنی' مردِ مومن کی تقریر کا تسلسل اور جھگڑے کی بنیاد 118

) رعونت اور مفاد پرستی انسانوں کو اپنا محتاج بنانے کا نظام ہے اور بات ہے آنکھوں پہ پردے اور کانوں میں ڈاٹ کی ____ 120

) زُعم اور تکبر کی نفسیاتی کیفیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ''انسان کسی دوسرے کی بات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا'': حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کی مثال ____ 120

) اِدھر علم کے لیے نبی اکرم ﷺ جیسی عظیم ہستی کی رب العزت کے ہاں دعا اور اُدھر تکبر و رعونت کی ذہنیت کا خلفشار ____ 121

) حق بات کو کھلے دل سے تسلیم نہ کرنے والوں کی کیفیت: مردِ حق کا لاجواب کرنا اور فرعون کا استہزا پر اتر آنا ____ 122

) متکبر کا آخری سہارا مذہب ہوتا ہے' اُسے فریقِ مخالف کی

ہر بات جھوٹی نظر آتی ہے 123

)پراگندہ ذہنیت کبھی راہِ راست پر نہیں آ سکتی 124

)استہزا کے عمل میں الجھی ہوئی ذہنیت کا انجام 124

)فرعون کی اندرونِ خانہ تدبیریں اور مردِ مومن کا قوم کے
نام الرشاد 124

)مفاد پرستی نے انسان کو ہمیشہ گمراہ کیا' کائنات کی ہر شے
انسان کے لیے متاعِ حیات ہے' مقصود بالذات نہیں:
اس مردِ مومن کا قوم سے خطاب 125

)سفرِ زندگی کے یہ لمحات مستقر نہیں ہیں: مردِ مومن کی وضاحت 125

)اس زندگی میں پرورشِ آہ و نالہ کا مقصد ''انسانی ذات کی
نشو و نما ہے'' اور دنیاوی متاع اس کا بس ذریعہ ہے: فرعون
کے دربار کا مردِ مومن اور اقبالؒ 126

)صلاحیت بخش کام ہمیشہ پختہ یقینی کی بنیاد کا طلب گار رہتا ہے 127

)مرد اور عورت دونوں میں خدا کا قانون کوئی فرق نہیں کرتا'
یہ فرق انسان کا خود پیدا کردہ ہے 127

)انسان اپنے جذبات اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے خدا کے پیمانوں
کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا 128

)مرد ہو یا عورت قرآنِ حکیم کے نزدیک تو دونوں برابر
واجب التکریم ہیں 128

)مملکتِ پاکستان میں عائلی قوانین کی شرعی کیفیت اور
قرآنِ حکیم کا حکم 128

)دربارِ فرعون کا مردِ مومن اپنی تقریر میں حفاظت آ گئیں
اور تخریب خیز قوت کا فرق سمجھاتا ہے 129

)قرآنِ حکیم کی راہنمائی میں روزِ اول سے آخر تک
نہ کوئی تضاد ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی کمی 130

)فرعون کے دربار میں اُس مردِ مومن کا آخری پیغام 130

)حضرت موسیٰؑ سے حق و باطل کا مقابلہ کرنے کے لیے
فرعون کے مذہبی پیشواؤں کا فیس کا مطالبہ 131

)فرعون کے دربار میں پورے مجمع کے سامنے فرعون کے
مذہبی علما کا اعترافِ حقیقت' فرعون کا شیر کی طرح دھاڑنا
اور حضرت موسیٰؑ کی فتح 131

)فرعون کے سامنے مردِ مومن کی بے باک جرأت کا اظہار'
اطمینانِ قلب کی کیفیت' اور فرعون کا غرق ہونا 132

پانچواں باب: **سورۃ المؤمن** آیات (46 تا 55)

)لفظ عذاب کے تصور میں ثنویت کا عنصر اور ہمارے ہاں
ذہنیتِ فکر و نظر کے دو حصوں کا الجھاؤ 135

)انسانوں کی یا قوموں کی بدعملیوں کے نتائج کے لیے
قرآنِ حکیم نے سزا کا لفظ استعمال ہی نہیں کیا' ان کے عواقب
کا ذکر کیا ہے اور اسے عذاب کہا ہے 135

)ہمارے ہاں کی مذہبی دنیا میں قوموں پر عذاب کا تصور جو
قرآنِ کریم نے نہیں دیا 136

)اس زندگی میں قرآنِ حکیم کے نزدیک سب سے زیادہ
اذیت ناک عذاب ذلت و پستی ہے جو انسانی غیر صالحہ
اعمال کا نتیجہ ہے 136

)قرآنِ حکیم کے الفاظ میں دین و دنیا کے مفہوم کی ثنویت
کے پیدا کردہ نتائج' قرآنِ کریم نے نظام کا تصور دے کر
افراد کی ذمہ داریوں کا تعین کیا ہے 137

)غیر صالح عمل اور صالح عمل کی محسوس شکل اور اس کا عملی نتیجہ 137

)انسانوں کے عملِ بد کے فطری نتیجے کے تحت ہونے والے
نقصان کو خدا تعالیٰ کے غصہ کا غماز نہیں کہا جا سکتا' ہم نے

درحقیقت خدا کو اپنے ہاں بادشاہ کا سایہ بنایا ہوا ہے۔ ____ 138
) ہمارے ہاں خدا تعالیٰ کے تصور اور سلطان کے تصور
میں مماثلت ہے۔ کیوں؟ ____ 138
) وحی سے ملنے والی راہنمائی پر عمل کرنے کی بجائے ہم سطحی
باتوں پر عمل کرتے ہیں: کوٹھے پہ چڑھ کر اذانیں دینے لگتے ہیں۔ 139
) قرآنِ حکیم کے نزدیک اصلاح نہ ہونے کی وجہ' یہ روز
صبح و شام کی تباہیاں' یہ سب غلط نظام کے عواقب ہیں ____ 139
) مادر پدر آزاد' وحی خداوندی کی پابندی نہ کرنے والی قوموں
کا انجام آخر ''اشدِ عذاب'' کی شکل اختیار کر جاتا ہے اور
یہی فرعون اور قومِ فرعون کے ساتھ ہوا ____ 140
) انسانی معاشرے کی بربادی کا ماخذ اُن کے ہاں نافذ غلط
نظام ہوتا ہے جس میں حکمران طبقہ اپنی سرکشی سے باز نہیں آتا ____ 141
) تعمیرِ ملت کے سلسلہ میں ہالینڈ کی پُرعظیم صلاحیتوں کی
ایک مثال ____ 141
) قرآنِ کریم میں مختلف قوموں میں مختلف مصائب کا
تذکرہ جن کے علاج کی وہ تدابیر نہیں کرتی تھیں ____ 142
) قوانین کی سرکشی کی بنا پر مجرم قوم پر تباہی کا عذاب' لفظ جرم
کا مفہوم اور اکابرین و متبعین کے مابین مکالمہ آرائی کا عجیب نقشہ 143
) السَّاعَۃُ کا مفہوم' دنیا اور آخرت کی ثنویت اور اُس کا اثر ____ 144
) دین و دنیا کے معاملات کو دو حصوں میں تقسیم کرنا' قرآنِ حکیم
کی مجموعی تعلیم کے خلاف ہے اور اس سے اکابرین و متبعین
دونوں متاثر ہوتے ہیں ____ 144
) ظالمین کی پیدا کردہ تباہی اور بربادی محکوم قوم میں انقلابی
جرأت پیدا کر دیتی ہے ____ 145
) ظہورِ نتائج کے وقت لیڈرانِ قوم کے مابین باہمی گفتگو کی
ایک تصویر اور دروس کے ٹیپس کو شارٹس ہینڈ رائٹ کرنے کی
ایک پہلے کی کوشش ____ 145
) لیڈرانِ قوم کی' جیل خانہ جات کے ملازمین سے درخواست
اور ان کا جواب اور ادھر ''آج قانون ہے کہ ملتا ہی نہیں'' ____ 147
) سزا اور جزا کے قوانین سے مکمل آگاہی کا اتمامِ حجت تک ہونا
ضروری ہے اس کے بعد معافی کی درخواست چہ معنی دارد ____ 147
) قرآنِ حکیم حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کے سلسلہ میں حق کے
باطل پر غالب آنے کی ایک روشن اور واضح مثال پیش کرتا ہے 148
) بنی اسرائیل کی مختصر سی آبادی اور عالمِ اسلام کی حد تک ایک
جمِ غفیر کی حالتِ زار اور جہاد کی تشریح و صراحت کا نتیجہ ____ 149
) قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں مسلمان کی بجائے مومن کی
اصطلاح استعمال کی ہے جو ہمیشہ کفار پر غالب رہیں گے ____ 149
) خدا کی ذات تو قرآنِ حکیم میں مومن کی مدد کرنا اپنا فریضہ
گناتی ہے اور اس کے لیے اپنے آپ کو ''انا'' کہتی ہے ____ 150
) خدا تعالیٰ کے وعدہ کے ساتھ ساتھ مومن کا فریضہ' یہ وعدہ
اور یہ فریضہ لازم و ملزوم ہیں ____ 150
) آج ہی نہیں بلکہ صدیوں سے ہم مسلمانوں کی یہ حالت
کیوں ہے؟ اس لیے کہ ہم مومن نہیں ہیں۔ ____ 151
) قرآنِ حکیم میں بیان کردہ حقائق کی روشنی میں سوچنے کی
ایک بات کہ آیا ہم وہی مومن بنے ہیں جن سے خدا نے غالب
کرنے کا وعدہ کیا ہے ____ 151
) خدا تعالیٰ کا وعدہ تو مومنین کے ساتھ ہے' ہم مسلمانوں
کے ساتھ نہیں' سوچو تو! ____ 152
) جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے تو یہی
لوگ کافر ہیں اور اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں ____ 153

) ایران کے حاکم کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عدالت میں ایک حقیقت پر مبنی بیان ____ 153

) جس کے ساتھ خدا کی رفاقت شامل ہو' اُسے کوئی شکست نہیں دے سکتا اور جسے شکست ہوتی ہے وہ خوش گواریوں سے محروم رہتا ہے ____ 154

) سورۃ الفاتحہ میں مَغْضُوْبِ عَلَیْھِم کے الفاظ اور یہودیوں کے متعلق پائے جانے والے تصور کی نوعیت ____ 155

) قرآنِ حکیم کے ہاں ظالمین کے لفظ کا استعمال اور ہماری اپنی سوچ کا رُخ۔قرآن کریم تو واقعات سے کچھ نتائج اخذ کرتا ہے 156

) قرآنِ حکیم کا پیش کردہ وحی کا پیغام' کیا آنے والے دور کے لیے قابلِ فراموش ہوتا ہے: ایک اہم سوال ____ 156

) نظامِ حیات کے سلسلہ میں وحی کے پیش کردہ ثمرات کسی خاص وقت تک نہیں ہوتے' نبی کی قوم اس کی کتاب کی وارث ہوتی ہے۔ ____ 157

) آج زمین وآسمان کے درمیان قرآنِ حکیم ہی ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جس میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی ____ 157

) ہماری طرف سے قرآنِ حکیم کے ساتھ ہونے والا سلوک ____ 158

) ہم مسلمانوں کے مقابلے میں دوسرے مذاہب والوں کا اعتراض اور قرآنِ کریم کا بیان ____ 158

) قرآنِ حکیم میں داستانِ موسیٰؑ اور بنی اسرائیل بیان کرنے کا مقصد: استقامت سے اپنا کام کیے جاؤ ____ 159

) مسلمانوں کے ہاتھوں رومن امپائر اور ایرانی امپائر کی شکست کی روداد ____ 159

) قرآنِ حکیم کے تراجم میں پیدا شدہ ایک خطرناک الجھاؤ اور لفظ ذنب کا حقیقی مفہوم اور کفار کا کردار ____ 160

) وقتی طور پر کسی تدبیری غلطی' سہو یا چوک کا ہو جانا کوئی جرم نہیں مگر ہم الجھن میں آ پھنسے ____ 161

) حقیقت کے برعکس ہمارے ہاں متضاد خیالی کی ایک مثال 161

) لفظ سَبِّحْ اور حَمْدِ کے لغوی مفہوم کے تحت نبی اکرم ﷺ کی عملی زندگی کا ذکرِ خیر ____ 161

) سفرِ زندگی کے اندر وحی کی روشنی میں ہر آن سرگرداں رہنا حمد کا موجب بنتا ہے ____ 162

چھٹا باب: **سورۃ المؤمن** آیات 56 تا 63)

) یقینِ محکم کی تاکید اور اس کے نتائج ____ 163

) قرآنِ حکیم کی نظر میں دلیل (Reason) ایک بہت بڑی قوت کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے ____ 164

) دلیل و برہان کے بغیر اپنی بات کو منوانا دوسروں پر حملہ کرنے کے مترادف ہے' مدافعانہ صورت اختیار کرو ____ 165

) انسانی معاشرے میں قوت کا حصول اس آئین سے ہی مشروط ہے جو آئین بذاتِ خود الحق کے ترازو پر پورا اترتا ہو: عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد ____ 166

) الحق کا غلبہ تو قوت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے ____ 167

) مذہب کی دنیا میں الحق کے ساتھ کبریائی کا تو محض نظری سا ایک تصور ہی ہوتا ہے' قوت دلیل کے اندر ہوتی ہے ____ 167

) کبریائی کے لیے غالب آنے کی' اصل قوت دلیل کی قوت ہے' کائنات میں خدا وہ قوت ہے جس کے قانون کے زور پر سلسلہ کائنات قائم ہے: سائنسدانوں کا بیان ____ 167

) ظہورِ قرآن کریم کے زمانے میں عرب بھی' آج کے مفکرین کی طرح' خارجی کائنات میں خدا کو مانتے تھے' اپنی دنیا میں نہیں' یہ متضاد کیفیت کیوں؟ ____ 168

) کائنات کی وسعت کے سلسلہ میں علمِ انسانی کی بے بسی _ 169
) تخلیقِ آدم کی ابتدا: اوّلین جرثومۂ حیات ________ 170
) انسان کے لیے اشرف المخلوقات کا تصور خود ساختہ ہے' اس سے اکبر تخلیق بھی ہے اور انسان کے لیے قوانین خداوندی بھی ہے۔ 170
) خدا نے کائنات کے اس قدر محیر العقول سلسلے کے لیے غیر متبدل اور محکم قوانین دیئے ہیں ____________ 171
) طبعی قوانین کے ساتھ' انسانیت ساز' بصیرت پر مبنی' وحی خداوندی کے غیر متبدل اقدار و قوانین بھی دیئے ہیں _____ 172
) خارجی کائنات اور انسانی دنیا' دونوں میں' خدا کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے' کہا یہ ہے کہ اس الساعت میں کوئی شک وشبہ نہیں' بس استقامت رکھو ____________ 172
) ہر بات کو آخرت پر نہیں چھوڑا جا سکتا مگر ہمارے ہاں یہی ہوتا ہے ______________ 173
) لفظ السَّاعَۃ کا دل ونگاہ کی بصیرت کو جلا بخشنے والا مفہوم ___ 174
) انسانی زندگی کے لیے داستانِ بنی اسرائیل کی مثال کہ تخریبی نظام کے تباہ کن نتائج نے نمودار ہونا ہے ______ 175
) داستانِ فرعون میں ''اَنَا رَبُّکَ'' کی عظمت نکھر کر سامنے آجاتی ہے ______________ 175
) خدا تعالیٰ کے ہاں انسانوں کی دنیا کو کنٹرول کرنے کا طریق: ''ہم اپنے قوانین کو انسانوں کے ہاتھوں سے انسانی دنیا میں کارفرما کراتے ہیں''۔ ____________ 176
) انسانی دنیا میں خدا اپنے قانون کے مطابق کام انسانوں سے کرواتا ہے لیکن منسوب اپنی طرف کرتا ہے _______ 176
) غالب کے الفاظ میں کام خدا کا اور ہاتھ نبی اکرم ﷺ کا _ 177
) اے بندۂ مومن! تو کجائی تو کجائی ____________ 178
) حضرت موسیٰؑ کے لیے کوہِ طور سے وحی کی پکار: ایک محاکاتی انداز ____________________ 178
) نبوت کی ذمہ داریاں مومن کی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ صبر آزما' مشکل اور جفاکش ہوتی ہیں ________ 178
) لفظ فَاعْبُدْنِیْ کا مفہوم صرف خدا کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا ہے ____________ 179
) قیامِ صلوٰۃ کا نظامِ حیات تو بڑا پُر معنی اور ہمہ گیریت کا ترجمان ہے: ایک غور طلب نکتہ ____________ 180
) فرعون کے خلاف ظہور پذیر ہونے والا انقلاب قدم بہ قدم اپنی منزل کی طرف ________________ 180
) قرآنی نظام اپنے اندر جو ایک عظیم انقلاب کی نوید لیے ہوتا ہے جس میں معاوضہ کا ترجمہ ''محنت کا ماحصل'' ہے اس کی وضاحت 181
) صلوٰۃ کے نظام میں محنت کا معاوضہ نہیں بلکہ محنت کا ماحصل ہوتا ہے ____________________ 181
) انسانیت کی تین لعنتیں اور تین قوتیں ہیں' مُلّا کی اذاں اور ہے مجاہد کی اذاں اور' الساعت یعنی ظہورِ نتائج کی گھڑی آیا ہی چاہتی ہے ________________ 182
) ہزار سال سے قیامت کے عذاب میں مبتلا قومِ مسلم کے غلط تصورات اور اقبالؒ کی پکار ______________ 183
) آج کی محرف تورات اور عیسائی پادریوں کے فتوؤں کا نتیجہ اور قرآن حمید کی راہ نمائی کا طریقِ کار ____________ 183
) فرعونی نظامِ زندگی کے عذاب سے بچنے کے لیے ہمارے ہاں کیے گئے غلط قرآنی تراجم کی عملی شکل کا نتیجہ ________ 184
) کسی تباہی کا آخری حد کو چھونے سے پہلے مہلت کے وقفے کی نوعیت اور حضرت موسیٰؑ کو خدا کا فرمان ________ 185

) باطل سے مقابلہ کرنے کے لیے حق کے نفاذ کا طریق
اور خارجی کائنات کی مثال ________ 186
) مہلت کا وقفہ تو قدرت کی طرف سے ایک بہت بڑی نعمت
ہے کہ تم سکینت وسکون حاصل کرلو اور وہ اصلاح کرلیں اور اگر
نہ کریں تو یہ ہے ناشکر گزاری ________ 186
) انسان دنیا میں آتا ہی نہیں' اگر مجبوراً آ گیا ہے تو دوسری
چیز اس کے بس میں ہے کہ یہاں سے چلا جائے' روتا کیوں ہے:
ایک فلاسفر کا قول ________ 187
) خارجی دنیا ہو یا انسانی دنیا' ان کے ساتھ خدا کا تعلق
ربوبیت کا ہے پھر کسی اور کی طرف کیوں پھرے جاتے ہو؟ _ 187
) لفظ یَجْحَدُوْنَ کا لغوی مفہوم ________ 188

ساتواں باب: **سورۃ المؤمن** آیات 64 تا 76)

) انسانی زندگی کی ربوبیت کے لیے ارض وسماوات میں باہمی
روابط کی نوعیت وافادیت اور تیزی سے گھومتی ارض کا مستقر ہونا 190
) نظامِ شمسی کے ساتھ زمین کا یہ کرہ' انسانوں کے لیے'
ایک حیران کن منزل کی طرف صدیوں سے دہری گردش
لیے مصروف کار ہے ________ 192
) اس کرۂ ارض پر قرآنِ حکیم نے انسانی زندگی کے لیے
''قرار'' کا لفظ استعمال کیا ہے ________ 192
) نظامِ شمسی کے متعلق آج کے دور کی تحقیق اور قرآنِ حکیم _ 193
) بطلیموسی نظام کے خلاف مرتد ہونے کے فتوے کی اصل بنیاد 193
) زمین اور سما کے متعلق چودہ سو سال پیشتر قرآنِ حکیم کا
فرمان مگر مذہب میں عقائد ہیں حقائق نہیں ہیں ________ 194
) ہمارے ہاں کی کتب میں عرش کے متعلق پایا جانے والا
عقیدہ کہ مذہب تو چلتا ہی توہم پرستی پر ہے ________ 195
) قرآنِ حکیم کے مطابق ارض وسما کی کیفیت اور سقفِ
محفوظ کی نوعیت وافادیت ________ 195
) اس کرّہ ارض کو روشن کرنے کے لیے نظامِ قدرت کی کارفرمائی 196
) ایک طرف تو سائنس کے انکشافات سے ہر آنے والا دور
قرآنِ حکیم کے حقائق کی وضاحت کا باعث بنے گا اور دوسری
طرف ہماری کم مائیگی کہ آسمان آج بھی شیشے کے ڈل
سمجھے جا رہے ہیں ________ 197
) زندگی جو ایک توانائی ہے' ہم اس کو جسمانی شکل کے بغیر
محسوس ہی نہیں کر سکتے ________ 198
) قدرت نے انسان کو بہترین تناسب کے ساتھ پیدا ہی نہیں
کیا بلکہ اس کے لیے رزق بھی عطا کیا ہے ________ 198
) لفظ برکت کے علاوہ ''الحی القیوم'' کا مفہوم اور کائنات
کی نشوونما کا ذکر ________ 199
) یورپ کے دانشوروں کی کم مائیگی کی کیفیت مغربی جمہوریت
کے آئینہ میں ________ 200
) انسانوں کی شکستہ حال فکر کے لیے وحی کا پیش کردہ ایک
انقلابی پروگرام نیز لفظ دعا کا مفہوم ________ 200
) خدا تعالیٰ کے لیے لفظ حمد کی اہمیت: مدح اور ثنا کیوں نہیں؟ 201
) امر وابالمعروف کی تاکید کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا حکم'
عالمِ امر اور عالمِ خلق میں فرق ________ 202
) قرآنی قوانین کے ساتھ حکمت کا نزول لازم وملزوم ہونے
کی بنا پر بڑی اہمیت کا حامل ہے ________ 203
) آمریت ہمیشہ حکمت کی سوچ سے محروم ہوتی ہے: ایک
اہم نکتہ ''کتاب کے ساتھ حکمت بھی'' ________ 203
) خالقِ کائنات نے اپنے محکم قوانین کو حکمت کے ساتھ

مشروط کر رکھا ہے _____ 204
) انسانی زندگی کی ابتدا کے سلسلہ میں قرآنی حقائق کی
وضاحت اور ''کُنْ فَیَکُوْنُ'' کے لیے خدا کی ہمہ گیر
قوتوں کا عالم _____ 204
) عقلِ انسانی کی نارسائی کی کیفیت اور خدائے علیم کا عالمِ
امر اور کُنْ فَیَکُوْنُ کی وضاحت _____ 206
) دنیا بھر کے انسانوں کے لیے ایک قابلِ غور بات جو
روزِ اول سے حقیقت پر مبنی ہے _____ 207
) انسانیت کے ہر عمل کا نتیجہ صرف قیامت پر ہی موقوف نہیں،
وہ یہاں بھی ظہور میں آتا ہے _____ 207
) انسانوں کا انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں جکڑے
رہنے کا نتیجہ ہر دو جہانوں میں دوزخ کا عذاب ہے _____ 208
) خدا تعالیٰ کی ذات تو کسی کو گمراہ نہیں کرتی، وہ تو سراپا راہنمائی
کا سرچشمہ ہے _____ 209
) خود ساختہ قوانینِ حیات کے تحت انسانوں کی معاشرتی زندگی
کا جہنمی نقشہ: جہنم ایک ہی ہے مگر اندر آنے کے دروازے مختلف ہیں 209
آٹھواں باب: **سورۃ المؤمن** آیات 77 تا اختتام)
) نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کی جماعت کے ساتھ مخالفین کے
تصادمات کی لمبی داستان کا بنیادی نقطہ _____ 211
) صبر کا مروّجہ اور قرآنی مفہوم اور عملی تفسیر _____ 212
) زندگی کے ہر میدان میں استقامت دل و دماغ کی رضامندی
کے متقاضی ہونے کا ثبوت ہے _____ 213
) حکمِ خداوندی کی اور آمریت کی اطاعت میں ایک
بنیادی فرق ہوتا ہے _____ 213
) خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ قانون پر مبنی حکومت
اور انسانوں کی حکومت میں فرق _____ 213
) ''قانون'' کے تصور سے دل و دماغ کی عملی ہم آہنگی انسان کو
جرأت اور یقینِ محکم کی دولت سے نوازتی ہے: یہ ہے
وعدہ کی عملی تفسیر _____ 214
) خدا تعالیٰ کی طرف سے کیے گئے وعدہ سے مراد ''خدا کا
متعین کردہ قانون ہے اور وہ اپنے نتائج سامنے لاکر رہتا ہے'' 215
) حضور ﷺ کی بیس سالہ زندگی کی جدوجہد اور اس کے ماحصل
کو دیکھنے کی آرزو: ایک معصوم سا سوال _____ 216
) حضور ﷺ کی مقدس آرزو کے اظہار پر خدائے علیم کی طرف
سے کھرا جواب _____ 217
) خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والے ''روکھے'' جواب پر
ہمارے ہاں کے تراجم اور اصل صورتِ حال _____ 218
) حضور ﷺ کی یہ خواہش کب پوری ہوگی؟ کے جواب میں
خدا تعالیٰ کا ارشاد _____ 218
) ذاتِ خداوندی، قادرِ مطلق ہونے کے باوجود، عالمِ امر
میں عالمِ خلق کے لیے بنائے ہوئے قانون میں، کوئی تبدیلی
نہیں کرتی بس تم اسے پہنچائے چلے جاؤ _____ 219
) قرآنِ حکیم کے پیش کردہ حقائق کو سمجھنے میں سب سے بڑی
رکاوٹ تقلید پرستی پر مبنی ہمارے عقائد ہیں، قوانینِ خداوندی پر عمل
تو ہم نے خود کرنا ہوتا ہے _____ 220
) خدا کے دائرۂ اختیار اور انسانوں کے دائرۂ اختیار کی حدود
کے تعین میں خود عائد کردہ پابندیاں کوئی مجبوری نہیں ہیں _____ 220
) کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانے کی کیفیت کو سمجھنا کسی
انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور دوسری یہ بات کہ بیوی
نہیں تو بیٹا کیسے ہو؟ _____ 221

) انسانوں کے متعلق خدا کا پروگرام انسانوں کے ہاتھوں ہی
بروئے کار لایا جاتا ہے؛ اس کا اپنا ایک پروسیس ہے ______ 221
) باطل نظام کی بنا ہمیشہ ریت کے تودوں پر استوار کی جاتی ہے
اور جماعتِ مومنین کا ہاتھ اس کی رہی سہی کسر بھی نکال دیتا ہے 222
) اگر خدا کے قانون کے ساتھ انسان کا ہاتھ شامل ہو جائے
تو کامیابی نزدیک تر ہو جاتی ہے ______ 223
) خدا کی ذات قانون کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں انسانوں
کی تباہی کو اپنی طرف منسوب کرتی ہے ______ 223
) خدا کی قضا یعنی خدا کے قوانین کے تیر تو جماعتِ مومنین
کی کمان کے منتظر ہوتے ہیں ______ 223
) انسان ہو یا کوئی قوم اس کا مقامِ انسانیت سے گر جانا
بہت بڑے عذاب کا موجب ہے ______ 224
) مصر کے گورنر حضرت سعدؓ کے نزدیک کسی کو ذلیل کہنا بھی
بہت بڑا جرم تھا ______ 225
) کائناتی قوتوں کے ساتھ انسانی ہاتھ کی ہم آہنگی نتائج
لانے کے عمل کو سرعت بخشتی ہے ______ 225
) ذاتِ خداوندی کے لیے کسی ایک مقام وجگہ کا تعین کرنا
دنیائے تصوف کی پیداوار ہے؛ انسان کا ہر قدم قانونِ
مکافاتِ عمل کی طرف اٹھتا ہے ______ 226
) قرآنِ حکیم کے انسانی اعمال کے نتائج کو سامنے لانے کے
طریق کی وضاحت: نظامِ ربوبیت اور انسان کے وضع کردہ
نظام کی مثالوں سے ______ 227
) عقل وفکر سے ماورا قرآنی اقتدار کی قدر ومنزلت اقدار کی
عملی شکل میں نکھر کر سامنے آجاتی ہے؛ سیکولرازم میں نہیں آتی _ 230
) کرۂ ارض پر تہذیب وتمدن سے آراستہ قوموں کی تباہی کا
بنیادی سبب قرآنی بصیرت سے محرومی تھی ______ 231
) اصل سوال مرنے کے بعد صرف زندہ ہونے کا نہیں بلکہ
یہاں کی تمدنی زندگی میں بدعملیوں کی گرفت کا ہے ______ 232
) قرآنی نظامِ حیات یا قرآنی اقدار پر ایمان اور سیکولرازم
میں بنیادی فرق کی وضاحت ______ 232
) خالقِ کائنات کی طرف سے حضور نبی اکرم ﷺ انسانیت
کے امام کے لیے خدا تعالیٰ کا ارشاد اور انسان کا اپنے ہی مفاد
پرستی کے جذبے کے آگے جوابدہ ہونا ______ 233
) جہانِ فردا سے لاتعلقی کی بنیادی وجہ اپنے اعمال کے نتائج
بھگتنے سے انکاری ہونے میں ہے ______ 234
) ظہورِ نتائج کے وقت انسان کی لاچار زبوں حالی کی کیفیت
اور قرآن حکیم کا فیصلہ ______ 234
) کلمت اللہ اور سنت اللہ میں فرق کی وضاحت ______ 235
) باطل نظام کی ابدی ناکامی کے برعکس سنت اللہ کا نفاذ اور
''انسان نے کیا سوچا'' کی ایک حقیقت ______ 235
) رابرٹ برفو جیسے مفکر کے الفاظ میں دنیائے انسانیت میں
تنہا عقلِ انسانی کی ناکامی کی بنیادی وجہ ______ 236
) امریکا کے مؤرخ ڈارسے کی نگاہِ بصیرت ______ 238

❀......❀......❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات حم السجدہ

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: **سورۃ حٰمٓ السجدۃ** (آیات 1 تا 8)

) حروفِ مقطعات کی حقیقت ________ 241

) درس اور تنزیل کا قرآنی مفہوم ________ 242

) وحی کی بنیادی خصوصیت خارج سے ملنا ہے ______ 242

) وحی کے علاوہ ہر علم انسانی کوشش کا ہی رہین منت ہوتا ہے 242

) الہام اور کشف وغیرہ سب غیر قرآنی تصورات ہیں' ابواب کا ذکر اور الرحمٰن الرحیم کا بھی ________ 243

) مودودیؒ کی تفسیر میں الرحمٰن' الرحیم کا دیا گیا مفہوم ___ 244

) اعترافِ حقیقت کے راستے میں مقبولیت عامہ کے بُت کے ٹوٹنے کا خوف سب سے بڑی رکاوٹ ہوتا ہے ______ 244

) رحمٰن ورحیم کا قرآنی مفہوم: رحمِ مادر کی مثال اور ابواب کا ذکر 245

) کائنات میں نظریہ ارتقا بڑی اہمیت کا حامل ہے اور بڑے غور وفکر کا متقاضی ہے ________ 246

) قرآنِ حکیم خداتعالیٰ کی صفتِ رحمٰن کا مظہر بھی ہے' وہ بتدریج وہاں تک نہیں پہنچا جس طرح فکرِ انسانی پہنچتا ہے _____ 247

) وحی کے ملنے سے پہلے نبی کو بھی وحی کی ماہیت اور افادیت کا علم نہ تھا ________ 247

) وحی ملنے کا خاصہ ہی رحمانیت ہے' رحیمیت نہیں ہے ___ 248

) نبی علیہ السلام نے وحی کا علم رحمانیت کے طریق پر حاصل کیا اور رحیمیت کے تحت لوگوں کی رہنمائی کی گئی ________ 249

) مجھے قرآنِ حکیم کی گل بہار وادی تک پہنچنے کے لیے کئی ایک سنگلاخ منازل طے کرنا پڑیں: پرویزؒ ________ 249

) لفظ ''مفصل'' کے غلط مفہوم کے باعث ہمارے ہاں پیدا ہونے والی پیچیدگیاں' ان میں فرقہ اہلِ قرآن بھی آتا ہے_ 249

) نماز کے سلسلہ میں فرقہ اہل قرآن کی متضاد خیالی کی ایک واضح مثال ________ 250

) فصل کا لغوی اور قرآنی مفہوم' نگینوں کی طرح جڑے ہوئے الفاظ کا قرآنِ کریم ________ 251

) نزولِ قرآن کریم کے سلسلہ میں روایات کا بیان _____ 252

) خدا کا مقام اور مقامِ نبوت ہمارے ان خودساختہ تصورات سے بہت بلند ہے' ان تصورات میں تو خوف ہے' کپکپی ہے اور بیوی کی تسلیاں ہیں ________ 253

) نبوت ملنے کے سلسلہ میں ورقہ بن نوفل عیسائی کی کہانی اور ہماری ذہنی پس ماندگی ________ 254

) ورقہ بن نوفل تو ایمان نہ لایا کیوں؟ مگر اسلام کی تاریخ میں سب سے بڑا کفر کا فتویٰ میرے خلاف تھا: پرویزؒ _____ 254

- قرآنِ حکیم کے ایک لفظ اقراء کے معنی ''پڑھ'' کرنے سے یہ کہانی بنی ____ 255
- لفظ ''قراء'' کا مفہوم اور دنیائے تصوف کا نظریہ حیات _ 255
- قرآن حکیم کا نزول عربی زبان میں کیوں ہوا؟ ____ 257
- اصل بات عجمی یا عربی ہونے کی نہیں بلکہ قرآنی تعلیم کو نہ ماننے کی ہے ____ 258
- قرآنِ حکیم کی تعلیم کو سمجھانے کے سلسلہ میں اقبالؒ اپنی مثال آپ تھے اور یہ زندگی کی تمام بیماریوں کے لیے شفا ہے __ 258
- قرآنِ حکیم صفات کے لحاظ سے' اور حقائق کے لحاظ سے ایک ضابطۂ حیات ہے ____ 259
- اہل عرب عربی ہونے کے باوجود قرآن مجید کو کیوں نہیں سمجھتے؟ ____ 260
- صدیوں سے امتِ مسلمہ نے اپنے آپ کو صرف قرآن کریم کے پڑھنے اور سننے تک محدود کر رکھا ہے' سمجھے نہیں ہیں ___ 261
- قرآنی معاشرے کے لیے حیاتِ آخرت کا تصور اور اس پر ایمان ایک بنیادی نظریہ ہے ____ 262
- اس زندگی اور اُخروی زندگی میں نظر نہ آنے والا ایک پردہ ہے 262
- قرآنِ حکیم کے نزدیک حجاب مستور کا مفہوم ____ 262
- قرآنِ حکیم سے بے اعتنائی کا انداز بھی ایک عجیب انداز ہے مگر کوتاہیوں سے جو نقصان پہنچتا ہے' اس سے محفوظ رہو __ 263
- قرآن حکیم میں حجابِ مستور سے ربط کی صفاتِ عظمیٰ نظر نہیں آتیں کہ وہ آخرت کے منکر ہیں ____ 264
- قرآنِ حکیم کا تو ایک ایک لفظ غور وفکر کا متقاضی ہے __ 265
- جہاں کارل مارکس ناکام رہ گیا' اس سے آگے ____ 265
- کارل مارکس کی ناکامی کی وجہ جواز اور اس کا علاج ___ 266
- اس دنیا کی زندگی جسم کی ضروریات کو پورا کرنے تک محدود ہے اور زندگی آگے بھی چلتی ہے ____ 267
- انسانی ذات پر ایمان اور اس کی نشوونما کا اصول ____ 267
- یہ نظام اس وقت تک قائم رہے گا جب تک تم ان خطوط پر عمل کرتے رہو گے ____ 268
- خدا کی طرف سے یہ اجر انسان کی محنت کا ہی معاوضہ ہوگا اور وہ تو ہماری بات ہے کہ ہم کام کی بات کہہ سکیں ____ 269

دوسرا باب: **سورۃ حٰمٓ السجدۃ** (آیات 9 تا 12)

- خارجی کائنات کی تخلیق اور انسان کے متعلق ارتقائی مراحل کا ذکر ____ 270
- آج کا سائنسدان اور محقق قرآنی حقائق کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور ہے ____ 271
- انسان کے لیے زندگی میں اعمال کا معاوضہ نہیں بلکہ ماحصل ہے جیسے کسان کے لیے اس کی کھیتی اس کی محنت کا ماحصل ہے 272
- معاوضے اور ماحصل میں ایک بنیادی فرق ہے: اُجرت کا معاوضہ ہے اور محنت کا ماحصل ہے ____ 273
- سرمایہ داری نظام میں بھاؤ اس نے خراب کیا جو رات کو بھوکا سویا ____ 273
- سرمایہ داری نظام میں محنت کا معاوضہ مقرر کرنے کا حق سرمایہ دار اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے ____ 274
- ماحصل کے سلسلہ میں قرآن حکیم زراعت کی مثال پیش کرتا ہے۔ کیوں؟ ____ 274
- ہر وہ شے جو خدا اپنی طرف منسوب کرے وہ پوری انسانیت

کے لیے مشترکہ طور پر باعثِ منفعت ہوتی ہے ______ 274
) خدا کی پیدا کردہ زمین پر ذاتی ملکیت کا تصور شرک ہے' پھر
زمین کی خرید و فروخت کیسے اور وراثت کیسی؟ ______ 275
) قدرت نے زمین یعنی رزق کے سرچشمے کو پوری انسانیت
کے لیے پیدا کیا ہے کسی کی ذات ملکیت کے لیے نہیں ____ 277
) قدرت کاشتکار سے صرف اپنا حصہ ہی طلب کرتی ہے'
اس کی ذات ملکیت کو تسلیم نہیں کرتی: بیٹھ کر حساب کر لو ____ 278
) کاشتکار کی محنت اور زمین کی صلاحیت کا لیکھا' کیا ہی
عمدہ حساب ہے! ______ 279
) خالق کی قائم کردہ واٹر سپلائی اور حرارت کا
ایک بصیرت افروز سسٹم ______ 279
) سبز ٹہنیوں میں آگ کے یہ شعلے اور ان کے پانی سے
پٹرول حاصل کرنے کی کوشش ______ 281
) اس قدر احسانات کی بارش کے باوجود احسان نہیں' بلکہ صرف
ایک حقیقت کی یاددہانی ہے: حساب کر لو ______ 281
) خالقِ کائنات اپنا یہ حصہ تمام انسانوں کے لیے محفوظ رکھتے ہیں
اور تم صرف اپنی ذات تک رکھتے ہو ______ 282
) سال بھر کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قدرت کے
واٹر سسٹم کا ایک اور انداز ______ 282
) مختلف موسموں کے لحاظ سے مختلف فصلوں اور پھلوں کی نوید'
یہ سارا کچھ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ رہنا چاہیے ______ 283
) یہ تمام سامانِ ربوبیت ہر ضرورت مند کے لیے کھلا نہیں ہے
تو یہ شرک عظیم ہوگا' یہ نہیں ہے کہ یہ کسی ضرورت مند تک نہ پہنچے
یا کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ رہے: یہ ہے قرآنِ حکیم کا
معاشی نظام ______ 283
) خارجی کائنات ابتداً دُخان تھی۔ کیا یہ بات عرب کا ایک
ان پڑھ کہہ سکتا ہے؟ ______ 284
) انسان کو کائنات کی ہر شے کے مقابلے میں اختیار و ارادے
کی ایک انفرادیت حاصل ہے ______ 285
) ''اطاعت'' کا قرآنی مفہوم ہی ایمان کی نشانی ہے کہ اس
اطاعت سے دل میں ذرا سی کبیدگی بھی نہ ہو ______ 285
) اطاعت کا یہ نظام رسولِ خدا اور صحابہ کرامؓ تک ہی تو محدود نہ تھا 287
) قانون کی حقانیت اور فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کی صداقت
پر ایمان ضروری ہے' یہ ہو تو کبیدگی نہیں ہوتی ______ 287
) ہمارے ہاں حمل امانت کا غلط ترجمہ واثرات اور اس کا
قرآنی مفہوم ______ 288
) سبع سموات کا صحیح مفہوم ______ 289
) خدا تعالیٰ نے کائنات کی ہر شے کی طرف وحی کر رکھی ہے 290
) کائنات کی ہر شے کے برعکس انسانوں کی طرف وحی کرنے
کا طریق انبیائے کرام کی وساطت سے اختیار کیا گیا اور کہا
کہ اُنہیں تعلیم دو اور پھر چھوڑ دو کہ تم ان کے مطابق کام کرو یا
نہ کرو مگر نتیجہ دونوں صورتوں میں بھگتو ______ 290
) تخلیق کے دو گوشے: عالمِ امر اور عالمِ خلق مگر انسان کے لیے
طریقہ دیگر اشیائے کائنات سے مختلف ______ 291
) انسانوں کی طرف وحی کا سلسلہ اب ہمیشہ کے لیے
ختم کر دیا گیا ______ 292
) شہاب ثاقب اور سقفِ محفوظ کی حقیقت ______ 293
) خلا کے اندر کرّوں کے ٹکڑوں کی پسی ہوئی خاک کا عمل _ 293

تیسرا باب: سورۃ حٰمٓ السجدۃ (آیات 13 تا 25)

) خارجی کائنات اور انسانی زندگی کے لیے دیئے گئے ضابطہ حیات کے نتائج ضرور ظہور پذیر ہوتے ہیں ____ 296
) تاریخ گزرے ہوئے واقعات کا نام نہیں بلکہ اختیار کردہ نظام کے نتائج کا نام ہے جو چودہ سو سال پہلے قرآن کریم کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتی ____ 296
) تاریخ کے سلسلہ میں چودہ سو سال پیشتر قرآن حکیم کا اندازِ بیان ____ 297
) کائناتی اصولوں کے نتائج کی طرح معاشرتی نظام کے نتائج بھی ہمیشہ اٹل ہوتے ہیں، بات صرف سمجھنے کی ہے ____ 298
) آج ہمارے پاس سائنس اور قرآن کریم ہونے کے باوجود ایمان کی حالت ناگفتہ بہ کیوں ہے؟ ____ 298
) قرآن حکیم نے تاریخ کی شہادات کو ہمیشہ علت و معلول کی وضاحت کے لیے بیان کیا ہے مگر ہم میں سامریت ہے _ 299
) عبادت اور عبودیت کے تراجم نے قرآنی تعلیم کو مسخ کر دیا ہے اور اب ہے عجوبہ پرستی ____ 300
) حقائق کو تسلیم کرنے کے بجائے نبی اکرمؐ سے معجزوں کا مطالبہ تھا، یہ بچپن اور جوانی میں شعور اور ذہن کا فرق تھا ____ 301
) قوموں کی تباہی و بربادی کے اسباب افراد کے انفرادی عیوب نہیں بلکہ غلط نظام ہوتا ہے قرآن کریم اس طرف توجہ دلاتا ہے ____ 302
) بغیر الحق نظام کو قوت کے زور پر مسلط کرنا سب سے بڑا جرم ہے مگر مومن الحق سے اعلون بنتا ہے ____ 302
) مسلط کرنے کا ذریعہ: قوت با مشاورت مگر اقتدارِ خداوندی کو مشاورت سے نافذ کرنا ہی الحق ہے، قومِ عاد کی مثال ____ 303
) آج قوت کے زور پر دوسروں سے بڑھ جانے کا جذبہ مادہ پرستی کا خاصہ بن چکا ہے ____ 304
) تعمیری قوت کو دوام بخشنے کا راز عام منفعت سازی میں ہے، صرف اس میں نہیں کہ قوت کس کے پاس زیادہ ہے ____ 304
) قانونِ خدا یہ ہے کہ ایٹم پورے کرّہ ارض کو تباہ کر سکتا ہے مگر تم ضد اور سرکشی کی بنا پر انکار کرتے ہو، دلیل و برہان سے نہیں۔ تمہارے ہاں جمود ہی جمود ہے ____ 305
) شب و روز کی اس گردش میں نہ کوئی دن منحوس ہوتا ہے اور نہ ہی مبارک۔ یہ منحوس و مبارک ہندوآنہ تصور ہے جو ایران سے در آیا ____ 306
) اسوہ ابراہیمیؑ: خاکِ زندہ ہے تُو تابع ستارہ نہیں، اور منحوس تو مصیبت ہوتی ہے دن نہیں ____ 307
) عذاب الخزی کا قرآنی مفہوم ____ 308
) ہماری سوچ ہمیشہ آخرت اور قیامت کے لحاظ سے فریبِ نفس کی اسیر رہی ہے ____ 308
) ذلت و رسوائی کے عذاب میں صرف قوم ہی رسوا نہیں ہوتی بلکہ اس کا ہر فرد رسوا ہوتا ہے اور آخرت میں اس سے بھی زیادہ 308
) موجودہ زندگی آخرت کی زندگی کا پیمانہ ہے اور غلط نظام کا نتیجہ ____ 309
) امداد کے طور پر باسی روٹی کا ٹکڑا انسان کے لیے اور زیادہ رسوائی کا باعث بنتا ہے مگر انسان رہتا مطمئن ہے ____ 309
) گداگری کے ٹکڑوں پر پلنے والی قوموں کی نفسیاتی حالت اور خدا کا تصور کہ ''یہ سب خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے۔'' __ 310

) ذلت ورسوائی کی شکل میں خدا کا یہ عذاب کیوں وارد ہوا؟
وہ تھا غلط نظام کا نتیجہ اور آج ہے نظامِ جمہوریت کا بھی ایک کھیل 311
) قرآنِ حکیم کے نزدیک یتیم کا مفہوم اور اس کی
عزت وتوقیر کا مقام ______________ 312
) مسکین کا قرآنی مفہوم، نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اور قرآنِ کریم
کی مخالفت کہ یہ غلط معاشی نظام ہے ______________ 313
) نظامِ سرمایہ داری میں فرد سے خاندان تو بنتا ہے، فرد باقی نہیں
رہتا کیونکہ یہ مَا یَنْفَعُ النَّاس نہیں ہے ______________ 313
) نظامِ سرمایہ داری کے بالمقابل قرآنِ حکیم نے نظامِ خداوندی
کو العقبۃ کے لفظ سے پیش کیا ہے ______________ 314
) نظامِ خداوندی کا پہلا فریضہ، موت ہے ہر نوع غلامی کے لیے
اور دوسرا: کوئی فرد بھوکا نہ رہے اور نہ ہی اپنے آپ کو تنہا محسوس
کرے ورنہ عذاب الھون ہے ______________ 314
) توبہ ہمیشہ نظام کے بدلنے سے قبول ہوتی ہے، گناہوں سے
یہ توبہ صرف اس لیے ہے کہ نگاہ کہیں ہمارے انتظام کے نظام کی
خرابی کی طرف نہ اٹھ جائے ______________ 316
) قرآنِ حکیم نظام کی بات کرتا ہے اور تاریخ سے طوفانِ نوح
کے عذاب کی مثال سے سمجھاتا ہے ______________ 316
) نظام الحق کے ساتھ مادی ذرائع اور ان کا استعمال کرنا: یہ ہے
کامیابی کا راز، نیز زندگی کے لیے حشر اور جحیم کا قرآنی مفہوم 317
) انسانی زندگی کے لیے جوئے رواں کا وجود زندگی کی
بنیادی شرط ہے ______________ 318
) جسمِ انسانی ذاتِ انسانی اور مکافاتِ عمل کا باہمی ربط ___ 318
) اگر ذاتِ انسانی یعنی ''میں'' کے لیے خدا کے قانون کو نہ
مانا جائے تو پھر خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں رہتی ______ 320
) ''میں'' کے کیے گئے اعمال کی شہادت کو بیان کرنے کا
قرآنِ کریم کا ایک محاکاتی ومکالماتی انداز ______________ 321
) آج کی سائیکالوجی کے کرشمے: وہ اعمال بھی ظہور میں آ گئے
جن کے متعلق تم مطمئن تھے کہ انہیں کسی نے دیکھا ہی نہیں ___ 322
) سریع الحساب کے تحت تو اعمال کے نتائج کے لیے کوئی کتاب
بھی مرتب کرنے کی ضرورت نہیں مگر عمل اور نتیجے کے درمیان
مہلت کا وقفہ ہوتا ہے ______________ 323
) باطل نظام کے سربراہان کے ارد گرد مصاحبوں کا کردار اور
تاریخ کی سائنس ______________ 323

چوتھا باب: **سورۃ حٰمٓ السجدۃ** (آیات 26 تا 32)

) مصاحبوں کے چکر میں چاروں طرف سے گھرے ہوئے
بااختیار لوگوں کی کیفیت ______________ 326
) قرآن حکیم جن وانس یعنی صحرا میں اور شہر میں بسنے والے
لوگوں سے مخاطب ہے ______________ 326
) قرآنِ حکیم کے متعلق مخالفین کو ایک کھلا چیلنج ______ 327
) بنی امیہ کے زمانے تک تو عربوں کے ہاں نثر کی کوئی کتاب
ہی نہ تھی، قرآن حکیم کی مثل کا چیلنج تھا، مخالفت ہوئی مگر یہ آواز
اپنا اثر کیے چلی گئی ______________ 327
) قرآن مجید کی آواز دبانے کی ایک خطرناک چال ____ 328
) صدیوں سے مذہبی فرقہ بندی کی اس کائیں کائیں کے
باعث ملتِ اسلامیہ امت واحدہ نہیں بن سکی اور پرویزؒ بھی
اس سے مستثنیٰ نہیں رہا ______________ 329
) ہمارے ہاں ذرائع ابلاغ کا غلط استعمال، محمد علی جوہر جیسی

علمی شخصیت اور اسلم جیراجپوریؒ کا باطل پر فرمان ____ 331

) قرآنِ حکیم میں زانی مرد اور زانیہ عورت کی سزا متعین طور پر بتا دی گئی ہے مگر علما حضرات اس کے مخالف ہیں ____ 332

) قرآنِ حکیم کی ایک آواز کو دبانے کے لیے اتنا زیادہ انتظام اور پروپیگنڈا کیوں؟ ____ 333

) ''الاتقان'' ایک مستند سمجھی جانے والی کتاب میں کیا کچھ لکھا ہے؟ ____ 334

) ابن ماجہ ❶ کے مطابق رجم کی آیت کی تفصیل ____ 335

) 32 جلدوں پر مشتمل تفسیر کبیر میں رجم کے سلسلہ میں امام رازی کا فرمان اور حضرت عمر فاروقؓ کا بیان ____ 336

) قرآنِ حکیم کی سینکڑوں آیات کے منسوخ ہونے کا تصور یا للعجب!! ____ 337

) رجم کے سلسلہ میں بخاری شریف کی روایت: ایک بندریا کو بندروں نے سنگسار کیا تھا لہٰذا یہ دینِ فطرت ہے ____ 337

) فتویٰ یہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار کفر ہے ____ 338

) سنگسار کے سلسلہ میں تفسیر ''فتح الباری'' کا بیان ____ 338

) رجم کے بارے میں عدالت کے فیصلے کے خلاف علما حضرات کی آہ و فغاں تاکہ تم قرآن مجید پر غالب آجاؤ ____ 339

) میرا نہ تو کوئی مذہبی فرقہ ہے، نہ ہی کوئی سیاسی پارٹی اور نہ ہی مجھے معتقدین کی ضرورت ہے: پرویزؒ ____ 339

) جو قوم اپنے محسنوں کو فراموش کردے، قدرت ان میں محسن پیدا کرنے بند کر دیتی ہے: بھائی کی خدمات کا کچھ تذکرہ ____ 340

) قرآن کریم کو ناقص ثابت کرنے کے لیے حضرت عمرؓ کی تائید (معاذ اللہ) اور قرآنِ کریم کا فیصلہ ____ 340

) دنیا کے اندر آج کے دور میں مسلمانوں کی حالتِ زار: تباہی اور بربادی کا جہنم ____ 341

) خدا کے دشمن بنے رہو مگر اس کی کتاب کے دشمن نہ بنو ____ 341

) یہ بڑے بڑے دوسروں کے علاوہ عوام کو بھی لے ڈوبتے ہیں 342

) قرآن کریم کسی کو ناامید نہیں ہونے دیتا لیکن اس کے لیے رَبُّنَا اللّٰہ کی ایک شرط ____ 342

) لا الہ کہنا تو آسان ہے مگر ماننا مشکل ہے اور ہم کیا سمجھیں نزولِ ملائکہ ____ 344

) مشکل اوقات میں دل کا مطمئن ہو جانا قدموں میں استقامت کا باعث بنتا ہے ____ 344

) ہمارے ہاں 1965ء کی جنگ کے وضع کردہ افسانے اور جنگ بدر و اُحد میں نزولِ ملائکہ سے طمانیتِ قلب ____ 345

) قرآنِ حکیم کا فرمان ہے کہ فرشتے نظر نہیں آیا کرتے البتہ قلبی سہارا دیتے ہیں اور یہ سلسلہ اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے 346

) حضرت نظام الدینؒ کے ساتھ ولی کے بجائے لفظ اولیا کا استعمال ____ 347

) خدا کی طرف سے ملی ہوئی ''ولایت'' کا نتیجہ تصور سے بھی زیادہ ثمر بار مگر اس قدر نوازشات کرنے کے باوجود دینے والے کا جی نہیں بھرتا ____ 347

) آئندہ کی زندگی کے ظروف کا مقابلہ اس زندگی کے ظروف و معیارات سے کیا ہی نہیں جا سکتا ____ 348

) رب المومنین کے نظامِ ربوبیت کو نہ تو کسی ترازو میں تولا جا سکتا ہے اور نہ ہی ماپا ____ 349

) مومن تو خدا کا مہمان ہوگا ___ 349
) عربوں کے ہاں مہمان داری کا جذبہ اور اس کا بے مثل احترام 349
پانچواں باب: **سورة حٰمٓ السجدة** (آیات 33 تا 39)
) فکرِ قرآنی کی تعلیم ہمیشہ محسوس شکل میں ہوتی ہے:
رَبُّنَا اللّٰہ کہنے والوں کی بھی اور قولِ احسن کی بھی ___ 351
) خدا کی طرف دعوت دینے کا مفہوم' خدا سے ہمارا تعلق
اور اس کی کتاب قرآنِ کریم کے احکام کو عملاً نافذ کرنا ___ 353
) ایمان لانے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے
آپ کو صرف مسلم ہی کہے ___ 354
) مسلمان تو عربی کا لفظ ہی نہیں ہے' خدا نے اس کا نام مسلم
رکھا ہے پھر یہ اتنے فرقے کیوں؟___ 354
) فرقہ بندی کی بدنامی سے بچنے کے لیے مکاتبِ فکر
کہنا شروع کر دیا___ 356
) مسجد کی ایک اذان ان کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دے گی 356
) مسلمانوں کی سیاسی تفریق ___ 356
) پاکستان کا موجودہ قانون فرقہ بندی کی توثیق کرتا ہے
اور جو کسی فرقہ سے متعلق نہیں' وہ کیا کرے؟___ 357
) ہر فرقے کی دعوت اپنے اپنے فرقے کی طرف بلانے کی
ہوتی ہے' خدا کے قانون کی طرف نہیں ___ 357
) ہم نے کام اور اعمال میں فرق پیدا کر رکھا ہے ___ 357
) رحم کے سلسلہ میں صبح و شام کی بحثیں زور و شور سے جاری ہیں 358
) میری قرآنی بصیرت کے مطابق فرقوں کا وجود اور اسلام
دو متضاد چیزیں ہیں ___ 359
) امتِ واحدہ اور اسلام دونوں لازم و ملزوم ہیں ___ 360
) آج ادراک پر مختلف رنگ کی جو تہیں جمی ہوئی ہیں' انہیں
کھرچ کر الگ کرنا ہوگا: یہ ہوگا قائداعظمؒ کا تصورِ پاکستان _ 360
) مقدر اپنے ہاتھوں کے کرتوت ہوتے ہیں اور قرآنِ حمید کی
رو سے تین چیزیں ___ 361
) آج مسلمانوں کی باہمی شناخت علیحدہ علیحدہ ملکوں کے
اعتبار سے پہچانی جاتی ہے ___ 361
) تبلیغی جماعتوں کا عمل اور اس کا نتیجہ ___ 362
) اجتماعی طور پر ایک ہزار علمائے کرام کا فتویٰ ہے کہ میں کافر
ہوں: پرویزؒ ___ 362
) قرآن حکیم نے ساری کی ساری بات تین لفظوں اِنَّنِیْ مِنَ
الْمُسْلِمِیْنَ میں سمو کر پیش کر دی اور پھر حسنات اور سیّئات کیا؟ 363
) ہر مذہب میں بھلائی اور برائی کا معیار اپنا اپنا ہوتا ہے'
مسلمانوں میں بھی حلال و حرام کی مختلف فہرستیں ہیں ___ 363
) کائنات کا حسن اور انسانی ذات کا حسن قرآنِ حمید نے المعروف
اور المنکر دو الفاظ میں بیان کر دیا ہے اور ایک حد مقرر کر دی ہے 364
) قرآن حکیم کا سیئات اور حسنات کے لیے معیار اور سیئات
کے لیے فرمان کہ برائیوں کو بھلائیوں کے ذریعے دور کرو _ 364
) خرابیوں کے علاج کے لیے سزا کا تصور تو بہت دور کی بات
ہوتی ہے' یہ تو حسن کارانہ انداز سے زیادہ سے زیادہ کام کرنا ہوتا ہے 365
) بھوک کے چور کا علاج قید خانہ نہیں' اس کی روٹی کا' اور اس کے
خوف کے ادفع کا انتظام کرنا ہے: یہ ہیں دو شرائط ___ 365
) دشمن کو دوست بنانے کا سارا راز' استقامت اور برداشت
میں مضمر ہے اور اس کا نتیجہ ہے کامیابیاں اور کامرانیاں __ 366
) قرآن کریم کے نزدیک بگاڑ پیدا کرنے والی قوتوں سے

بچنے کا طریق اور ہمارا عمل ______ 367
) حسن پیدا کرنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی پیش کردہ نظامِ
کائنات کی محسوس مثال ______ 368
) قوانینِ خداوندی کے زیرِ اہتمام مردہ قوموں کے لیے
زمینِ مردہ کی مثال ______ 369
) ملتِ اسلامیہ کے لیے حیاتِ تازہ کی نوید وحی سے ہی ممکن
ہے اس لیے کہ اس نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں 369
) حسن کے لیے صحیح توازن نہایت ضروری ہے اور اسی طرح
اقتدار اور قوت میں بھی ______ 370
) قرآنِ حکیم کی روشنی میں الحاد کا' یہودیت اور عیسائیت میں
عدل اور رحم کا مفہوم ______ 370
) سیکولرازم کیا ہے؟ تصوف کیا ہے؟ یہ ہے اسمائے خداوندی
کے اندر الحاد (Extremism) ______ 371

چھٹا باب: **سورۃ حٰمٓ السجدۃ** (آیات 40 تا 43)

) مسئلہ تقدیر کی اہمیت' الجھن اور حل ______ 374
) ایران کا گورنر ہرمزان پے در پے میدانِ جنگ میں شکست
کھانے کے بعد حضرت عمرؓ کی عدالت میں ______ 375
) شکست خوردہ ایرانیوں کا بدلہ: تقدیر کا مسئلہ مسلمانوں کا
جزوِ ایمان بن گیا ______ 376
) تقدیر کے اس ایمان نے مسلمانوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا _ 377
) تقدیر کے اس مسئلہ کا پس منظر: عالم امر' خدا کی مشیّت _ 377
) خدا تعالیٰ نے عالمِ امر میں ہر شے کے لیے قانون بنا دیئے 378
) کائنات کی کسی شے کو حق حاصل نہیں کہ بنائے ہوئے
قانون کو بدلے ______ 378

) فطرت تو اشیا کی ہوتی ہے انسان کی نہیں ہوتی' اسے صاحبِ
اختیار بنایا مگر نتائج مرتب کرنے میں نہیں ______ 379
) عمل انسانی مرضی سے لیکن نتیجہ خدا کے قانون کے مطابق
ہوتا ہے: عالم خلق کا حصہ ______ 379
) خدا بھی اپنے بنائے ہوئے قوانین کو نہیں بدلتا ______ 380
) انسان کا اختیار و ارادہ کتابِ فطرت کو پڑھ تو سکتا ہے
لیکن اسے لکھ نہیں سکتا ______ 380
) ہمارے ہاں لفظ ''انشاء اور شآء'' کے غلط مفہوم کا نتیجہ
اور ایرانیوں کا بدلہ ______ 381
) خدا تعالیٰ نے انسان کو اس کی اپنی دنیا کے اندر خدا بنا دیا ہے
کہ جونسی روش جی چاہے اختیار کرو' بس بات سمجھنے کی ہے __ 383
) عمل کی دنیا میں مرضی انسان کی ہے لیکن نتائج پر کنٹرول
خدا کا ہے ______ 383
) قرآنِ حکیم انسانی اختیار کو کسی صورت میں بھی پامال نہیں کرتا 384
) دراصل فرمانِ خداوندی یہ تھا کہ تم وہی چاہو جو خدا چاہتا ہے
مگر اس میں الجھاؤ پیدا کر دیا گیا ______ 384
) قرآنی الفاظ کو اپنی مرضی کے معنی پہنانا شرکِ عظیم ہے:
تمہیں چاہیے کہ تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں ______ 385
) خدا تعالیٰ بھلائی کا راستہ تو دکھاتا ہے مگر اس پہ چلاتا نہیں ہے'
چلنا خود ہوتا ہے ______ 385
) انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی مرضی کو خدا کی مشیت کے ساتھ
ہم آہنگ کرے ______ 386
) راضی برضا کا قرآنی مفہوم: ان کا عمل ہماری مشیت سے
ہم آہنگ ہو گیا ______ 386

) قضائے حق یا تقدیرِ یزداں کا مفہوم اور دنیائے تصوف 387

) خدا تعالیٰ انسان کے لیے کیا چاہتا ہے؟ 388

) عربی لفظ ھویٰ کا قرآنی مفہوم 388

) خدا اپنا حکم اشیائے کائنات پر تو ٹھونستا ہے مگر انسان پر نہیں: یہ ہے مسئلہ تقدیر کا حل 389

) تقدیر کے غلط مفہوم کی سوچ نے احساسِ زیاں کو بھی ختم کر دیا ہے 389

) متضاد خیالی اور متضاد عملی کی انتہا: تقدیر بھی اور تدبیر بھی 390

) خدا کا مکمل قانون بڑے غلبے والا ہے جو کبھی نہیں بدلتا مگر یہ ہیں کہ الفاظ تو نہیں، کچھ اور کرتے ہیں 391

) قرآن حکیم جیسی عظیم کتاب کے ساتھ برپا ہونے والا سلوک: رجم کی سزا کے معاملے کا شرعی عدالت کا فیصلہ اور اس کے خلاف واویلا 392

) رجم کی سزا قرآن حکیم میں نہ ہونے کے باوجود قرآن حکیم میں ہونے کا دعویٰ 392

) نبی اکرمؐ صحابہ اور کرامؓ کے عہد میں قرآنِ حکیم کا پھیلاؤ مگر یہ کہتے ہیں کہ قرآنِ حکیم کی سورتوں کو اٹھا لیا 393

) قرآن حکیم پر چاروں طرف سے ہونے والا سلوک 393

) 500 سو قرآنی آیات کو منسوخ کرنے والے ائمہ تفسیر تھے، مذہب میں یہی کچھ ہوتا چلا آتا ہے 394

) خدارا! خدا کی کتاب کو احبار و رہبان سے سنگسار ہونے سے بچایئے 395

) اس قرآنِ ظاہر کے علاوہ اربابِ طریقت کے ہاں ایک قرآنِ باطن بھی ہے 395

ساتواں باب: **سورۃ حٰمٓ السجدۃ** (آیات 44 تا 50)

) انسانی زندگی کے سلسلہ میں وحی نے ہر قوم کو اس کی اپنی زبان میں آگاہ کیا 398

) عربی زبان کی خصوصیات: وضاحت و بلاغت 398

) وحی کے الفاظ اور خیالات دونوں ہی خالصتاً خدا کی طرف سے ہوتے تھے 399

) اردو زبان میں نماز کا عمل غیر قرآنی ہے 400

) کسی بھی زبان کے الفاظ قرآنِ حکیم کا بدل نہیں ہو سکتے اور اردو میں نماز' تین نمازوں اور نوروزوں کا شوشہ 400

) تین نمازوں پر اہل قرآن کے ساتھ مخالفت 401

) قرآن حکیم کی زبان بذاتِ خود ایک معجزہ ہے 401

) بڑے سے بڑے عربی دان بھی اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں 402

) نیٹشے کا اعتراف کہ وحی یا الہامی زبان کا ایک الگ ہی انداز ہوتا ہے مگر سوال قاری کی اپروچ کا ہے 402

) قرآن کریم سے استفادہ کا راز: براہ راست جذبات پر اثر انداز ہونا ہے 403

) قرآنِ حکیم کی بلند نگہی اور رفعتِ پرواز کو" گائے اور بھینس والی آنکھ" تو دیکھ ہی نہیں سکتی اس کے لیے ضرورت ہے قلب کی 403

) قرآنِ حکیم کی تعلیم کو دل کے راستے دماغ تک پہنچنا چاہیے 405

) انسان ذہنی و عملی طور پر جو کچھ بننا چاہے قرآن حکیم اسے وہ کچھ بنا دیتا ہے مگر دل کی گواہی ضروری ہے 406

) کسی بات کا فکری طور پر سمجھ لینا پہلی منزل ہے 406

) تفسیرِ جلالین کی ایک ناتمام کوشش 407

) وحی کی آخری منزل قلب ہے ________ 408

) ہرآنے والی نئی نسل قرآنی الفاظ کوحفظ کرنے تک ہی
محدود ہوکر رہ گئی ________ 409

) قرآنِ حکیم کومختلف قرأتوں میں پڑھنے کے انداز میں فرق
مگران میں معنی معلوم نہیں جبکہ یہ ہے صحیح راستے کی طرف
راہ نمائی کا ذریعہ ________ 409

) قلب کی تبدیلی کے باعث قرآن حمید نفسیاتی امراض
کے لیے شفا ہے ________ 410

) اگر باہر کے خوف سے محفوظ ہونے کا نام امن ہے تو قلب
کے اعتدال پر ہونے کا نام اطمینان ہے مگر ''میں''، یعنی اِلغواس
طرف آنے نہیں دیتی ________ 411

) انسان کی ذاتی انا ہی حقیقت کوتسلیم کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے
اور پھر نتیجہ بربادی ہوتا ہے ________ 412

) ملت اسلامیہ کوقرآن حکیم براہ راست ہی سمجھنا ہوگا' یہ سامی
المذہب کی عبرانی زبان عربی زبان سے ملتی جلتی ہے ____ 412

) قرآن حکیم کی یہ واضح تعلیم' جس میں کوئی اختلاف بھی نہیں'
آخر کیوں سمجھ میں نہیں آتی؟ فتورنیتوں کا ہے ________ 413

) عربی زبان میں مرادفات کی کیفیت ________ 413

) شک اور ریب میں فرق ________ 414

) حصولِ جنت کے متعلق یہودیوں کا اور عیسائیوں کا تصور 414

) یہودیوں کے بچوں کا جنت میں داخل ہونے کے لیے
ختنے کا مسئلہ ________ 415

) ختنوں کے سلسلہ میں حضرت ابراہیم u کے بارے میں
بخاری کی روایت ________ 415

) دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی شفاعت کا ایک عقیدہ وضع کیا گیا 416

) اس قسم کے غیر قرآنی تصورات انسانی ذات کو عملی طور پر
پامال کردیتے ہیں ________ 417

) یہودی عقیدے میں توبہ کا تصور نہیں' عیسائیت میں صرف رحم
ہے' عدل نہیں مگر قرآنِ حمید کا بیان کچھ اور ہے ________ 418

) انسان کو اپنی لغزش کی بازآفرینی کے سلسلہ میں عرقِ انفعال
پیش کرنا ہوگا ________ 418

) خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں بازآفرینی کا امکان ہر آن موجود
رہتا ہے' ابلیس اور شیطان ایک ہی سکے کے دو رُخ ____ 419

) بخشش کا تصور قرآن حکیم کی تعلیم کے ہی خلاف ہے:
عمل اور اس کے نتیجے میں مہلت کے وقفہ کی مثالیں ____ 419

) دولت کی ہوس سے اس انسان کا پیٹ ہی نہیں بھرتا ____ 421

) وحی انسانی سوچ میں حدِ امتیاز پیدا کردیتی ہے ____ 422

) علامہ اقبالؒ انسان کے متعلق خدا سے ہم کلام ہے ____ 422

) لفظ مایوس اور قنوط کا مفہوم ________ 423

) شاہراہ زندگی پر چلنے کے دوران انسان کے مایوس ہونے
کی وجہ جواز اور اس کا علاج ________ 424

) قارون' جونظام سرمایہ داری کا نمائندہ تھا' کا انجام ____ 424

) ھذا لی کا قرآنی مفہوم: قرآن کے معاشی نظام اور کیپٹل ازم
پر ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے ________ 425

) ہمارے ہاں ''ھٰذَا مِنۡ فَضۡلِ رَبِّیۡ'' (27:40) کا استعمال
اور مذہبی پیشوائیت کا کردار جو محض فریبِ نفس ہے ____ 425

آٹھواں باب: **سورۃ حٰمٓ السجدۃ** (آیات 51 تا اختتام)

) ایک اہم نکتہ کی وضاحت: زکوٰۃ کا موجودہ تصور قرآن کریم

کے معاشی نظام کے خلاف ہے ________ 427
) قرآن حکیم کے معاشی نظام کی بنیاد ''قل العفو'' پر ہے'
اور خود لفظ پرائیویٹ کا لاطینی ماخذ ''محروم کرنا ہے'' ____ 427
) زیادہ سے زیادہ جمع کرنا اور کم از کم دینا: یہ قرآن کریم کا
معاشی نظام ہی نہیں ہے'اس کی بنیاد Consumer's
Property پر ہے ________ 429
) قرآن کریم کے معاشی نظام کے خدوخال کے سلسلہ میں
نبی اکرم ﷺ کی حدیث اور موجودہ زمانے میں جمع کرنے کا
مقصد محض تحفظ خویش کا جذبہ ہے ________ 430
) انسانی ارادے کی پختگی کی اہمیت اور ناپختگی کا رونا ____ 430
) اس سورۃ کی آخری دو آیات کی اہمیت اور کیفیت ____ 432
) ہندوستان میں قرآنِ حکیم کو آخری کتاب ثابت کرنے کے
سلسلہ میں مباحثوں کی شدت ________ 432
) قرآنِ حکیم کے منجانب ہونے کا کیا ثبوت؟ سائنس کے
انکشافات نے مذہب میں کھلبلی مچادی ________ 432
) کسی انسان نے اس کائنات کی کسی چیز کو ایجاد نہیں کیا بلکہ
اسے Discover (بے نقاب) کیا ہے ________ 434
) دنیائے سائنس نے دنیائے مذہب کو ہمیشہ شکست دی:
ایک حقیقت اور عرب کے اُس امیؐ کا دعویٰ ________ 435
) ہمارے ہاں قرآنِ حکیم تو صرف ثواب حاصل کرنے
کے لیے ہے'ہم نے تو کوئی سائنسی تحقیق نہیں کی ____ 436
) ہم مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ ہر قرآنی دعویٰ کو علمی حیثیت
سے ثابت کریں مگر ہم مرتد ہونے کا فتویٰ صادر کرتے ہیں _ 437
) سرسید احمد خاںؒ نیچری ہونے کی بنا پر مرتد قرار پائے __ 437
) قرآن حکیم کے سلسلہ میں عقل کی بات کرنے والا پرویز کافر
ٹھہرا'خدا کی نگاہ میں ہر شے ہے' کرّوں میں آبادی ہے مگر ہم
نے عملاً کوئی تحقیق نہیں کی ________ 438
) قرآنِ حکیم سمجھنے کی بات بھی ہے اور کرنے کی بھی ____ 439
) فکری دنیا کی ابتدا اڑھائی ہزار سال پہلے یونان سے ہوئی تھی
اور اس کے آئمہ آج بھی فلسفے اور فکر کے امام مانے جاتے ہیں 439
) ہندوؤں کے ویدوں کی'منُوں کی'اور برہما کی کہانیاں'ان کا
پس منظر اور عرب کی توہم پرستی ________ 440
) شاعری کی آنکھ میں کائنات کی حقیقت: آنکھوں دیکھی
حقیقت کو افسانہ بنا دیتی ہے ________ 441
) مسلمانوں کے ہاں مذہب کی پکار اور اس کا نتیجہ:
یہ حق نہیں' باطل ہے ________ 442
) دنیا بھر کی سوچ کو قرآنِ حکیم کا کھلا چیلنج ________ 442
) کائنات کے متعلق قرآن حکیم کا دیا ہوا یہ تصور کہ کائنات
بالحق تخلیق کی گئی ہے ہمارے ایمان کا حصہ ہے اور اس میں
قوت پوشیدہ ہے ________ 443
) کائنات کو بالحق نہ ماننے کا حشر تباہی اور ذلت کے سوا
کچھ نہیں ہے: تاریخ کا یہی فیصلہ ہے ________ 444
) سائنس کے میدان میں آج کے ہندوستان کا اعلیٰ مقام
اور اُدھر بدھ مت کی حالت'اور ملتِ اسلامیہ کی کیفیت:
تباہی اور بربادی ________ 444
) قرآنِ حکیم کی اس پیش کردہ تعلیم کے آئینہ میں ملت اسلامیہ
کے افسردہ چہرے کی عکاسی ________ 444
) اس بلند مقصد کے حصول کے لیے قرآن حکیم کی پیش کردہ

آیات بطور راہنمائی ہیں ____________ 445
) آیات صاحبانِ عقل وفکر کے لیے ہیں' الباب ہیں جو قوانینِ
خداوندی کو ہر وقت اپنے سامنے رکھتے ہیں ________ 446
) قرآنِ حکیم کی روشنی میں لفظ ذکر کا مفہوم اور مومن کی تعریف 446
) لفظ سبحان اللہ کا قرآنی مفہوم: خوشحالیاں آئینگی ____ 446
) ہم نے تو ''النار'' کا لفظ قیامت تک کے لیے اٹھا رکھا ہے
تو اب ہمارا کوئی ہمدم نہیں اور ہم النار میں ہیں ________ 447
) علیٰ وجہ بصیرت کسی چیز کو قبول کرنے کا نام ایمان ہے
اور یہ ہیں بیوقوف ________________ 447
) ہمارے ہاں مقامِ مومن سے بھی بلند درجہ متقی کا ہوتا ہے
تو متقی کون؟ ________________ 448
) قرآن حکیم کے نزدیک علما کون ہیں؟ یہ سائنسدان ہیں
اور اس بارے میں ہمارے ایک دوست کا شگوفہ اور ایک مثال 448
) ذاتِ خداوندی کو بے نقاب دیکھنے کی وضاحت:
قانونِ مکافات کو سامنے دیکھنا اور حقائق کو تسلیم کر لینا ____ 451
) کائنات پر ریسرچ اور اس کے نتائج سے آگہی کو ہی القا کہا گیا
ہے' اب کچھ زیادہ عرصہ زندہ رہنے کے لیے جی چاہتا ہے: پرویزؒ 451
) مومن ہونے کے لیے شرط اول ''خارجی کائنات میں تحقیق''
اور شرط دوم ''ماحصل کا اقدارِ خداوندی کے مطابق استعمال کا
پورا کرنا'' ضروری ہوگا ________________ 452
) قرآن حکیم انسانوں کو تین کیٹیگری میں تقسیم کرتا ہے __ 453
) پہلی کیٹیگری: اقوامِ مغرب ____________ 453
) دوسری کیٹیگری: جماعت مومنین ____________ 453
) تیسری کیٹیگری: دورِ حاضر کے مسلمان اور ان کی بے کسی و بے بسی 453
) یہ تھیں لقا رب والی وہ آیات جن کے تحت خدا تعالیٰ
کائنات کے کونے کونے میں موجود ہے ________ 454

❀......❀......❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ الشوریٰ

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: **سورۃ الشوریٰ** (آیات 1 تا 13)

) حروفِ مقطعات خدا تعالیٰ کے اسماء الحسنٰی کے مخففات ہیں 457

) خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر قوم کی طرف رسول اور نبی آتے رہے ____ 458

) آج دنیا میں سابقہ انبیائے کرام کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں تحریف نہ ہو چکی ہو ____ 459

) احادیث اور کتب سابقہ کے پرکھنے کا طریق ____ 459

) خدا تعالیٰ کی پہچان' اس کی ذات کی نوعیت سے نہیں' اس کی صفات سے ہے اور قرآن حمید کے ترجمے سے بات نہیں بنتی _ 459

) ''عزیز اور حکیم'' اسلامی نظام کے دو ستون ہیں جن میں حکمت ہے' غایت ہے اور پھر قوت بھی ہے ____ 460

) ارض و سما کی ہر شے خدا تعالیٰ کے پروگرام کی تکمیل کے لیے مصروف کار ہے ____ 461

) قدرت نے کائنات کے اس محیر العقول سلسلہ کو بڑی مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر رکھا ہے ____ 461

) مروّجہ تراجم کے تحت اس خدائے حکیم و عزیز و علی و عظیم اور فرشتوں کے متعلق پیدا ہونے والا تصور ____ 462

) قرآن حکیم کے لفظ غفور اور رحیم کا قرآنی مفہوم ____ 463

) اسلامی نظام کے محفوظ رہنے کی تیسری بنیادی خصوصیت: سامانِ حفاظت کا بہم پہنچانا ہے ____ 463

) بخششیں یا Mercy کا لفظ انسان میں احساسِ کمتری پیدا کر دیتا ہے ____ 463

) خدا سے مانگنے کی شکل میں خدا کا جواب اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ کی شکل میں ملتا ہے اور خدا نگہبان ہے نیز اَلرَّسُلُ کے معنی ____ 464

) نبی اکرم کی سنت یہ ہے کہ تبلیغ اپنے خاندان سے' اقربا سے' شروع کرو اور مسلسل آگے بڑھاتے چلے جاؤ ____ 465

) حضور ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں دس لاکھ مربع میل کا رقبہ آپ ﷺ کے زیر کنٹرول تھا ____ 465

) قرآن حکیم ایک نصاب کی چیز ہے' اسے تدریساً پڑھانا چاہیے' اور اسلام زبردستی نہیں پھیلا ____ 466

) اسلام نہ تو کبھی شمشیر کے ذریعے پھیلا ہے اور نہ ہی وہ اس طرح پھیلے گا' وہ جنگیں تو اس کے راستے میں حائل رکاوٹیں دور کرنے کے لیے تھیں ____ 467

) وحی کی روشنی میں تشکیل پانے والے نظام کے درخشندہ نتائج کو دیکھ کر دنیا نے اسے اپنایا ____ 467

) مولوی حضرات کے مقابلے میں پادری حضرات ڈاکٹریٹ

تک تعلیم حاصل کیے ہوتے ہیں ____ 467
) موجودہ اسلام کے بارے میں اہلِ دانش کا اعتراف مگر کیا
کریں صورت بنیں حالش میرس ❶ ' ____ 468
) قرآن کی حکمرانی کے بغیر کوئی مملکت اسلامی نہیں کہلا سکتی یہ
مسلمانوں کی حکومت ہیں اسلام نے تو صرف مدافعت
کے لیے جنگ لڑی ____ 469
) قرآنِ حکیم کے مروّجہ غلط تراجم اور ان میں تضادات:
ایک بڑی دشواری ____ 469
) قرآنِ حکیم کی روشنی میں ''من یشاء'' کا مفہوم' یہ ہے مروّجہ غلط
ترجے اور ان کے تضادات۔ آیت (42:8) کا مفہوم اور آیات
سے ربط باہم کہ قانون کی قوت بہت بڑی ہوتی ہے ____ 470
) اس پوری کائنات میں اصل قوت قانون کی ہی ہے ____ 471
) صدیوں سے موجود مسلمانوں کے باہمی اختلافات مٹانے
کے لیے قرآنی راہنمائی ____ 471
) باہمی اختلافات مٹانے میں سب سے بڑی رکاوٹ ذاتی
اغراض اور مفاد پرستیاں ہیں جن کی وجہ سے یہ قرآن حکیم کی
طرف نہیں آ رہے۔ ____ 472
) یہ رہنمائی اس خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی ہے جو ہر شے کو عدم
سے وجود میں لانے والا ہے اور اس پر سائنسدان کی بھی عقل
محوِ حیرت ہے۔ ____ 473
) خدا تعالیٰ کی ہستی ہر قسم کی وسعتوں کے تشبیہی تصورات اور
محسوساتی پیکروں سے بالاتر ہے مگر یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے
لکھوالاتے ہیں یاللعجب! ____ 473
) خدا تعالیٰ کو محسوس شکل میں عرش پر بٹھانے کی کہانی ____ 474
) خدا اپنی صفات کے اظہار میں ذرائع کا محتاج نہیں۔ ہمارا
صرف اس پر ایمان ہے جو قرآن کریم سے ہی سمجھا یا جا سکتا ہے 475
) خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ خزانوں کی نوعیت اور کیفیت ____ 476
) کائنات کی چابیاں ہمیشہ اس قوم کے ہاتھ آئیں گی جو کائناتی
خزانوں کو مسخر کرے گی ____ 477
) تسخیرِ کائنات کے بعد مومن اور کافر میں بنیادی فرق کی پہچان
اور انبیائے کرام کی مثال ____ 478
) لفظ شریعت کا قرآنی مفہوم ____ 478
) الدین اور شریعت میں بنیادی فرق ____ 479
) دین کے اندر فرقہ بندی کو شرکِ عظیم کہنے والے کی سب سے
زیادہ مخالفت ہوتی ہے ____ 479
) فرقہ بندی کی بنا پر پیدا ہونے والی ذہنیت کا نتیجہ ____ 480
) فرقوں کو مٹانے کا بہترین طریق انسانوں کے بجائے
قرآن حکیم کو اپنا امام تسلیم کرنا ہے ____ 481
) امتِ واحدہ کے تصور کو اُجاگر کیے بغیر دینِ خداوندی کی تشکیل
ممکن نہیں ہے۔ کچھ پتہ نہیں زندگی میں موقع ملے یا نہ ملے: پرویزؒ 481
) فرقہ بندی کے خلاف قرآن مجید کی یہ تعلیم یہود و نصاریٰ
کے لیے ہی نہیں' یہ ہمارے لیے بھی ہے ____ 482
دوسرا باب: **سورۃ الشوریٰ** (آیات 14 تا 21)
) دین ایک نظام کا نام ہے' کوئی تصوراتی یا خیالی نظری
(Iheoretial) عقیدہ نہیں ہے ____ 485
) جہاں الدین ہوتا ہے وہاں فرقہ بندی نہیں ہوتی اور فرقہ بندی
شرک ہے کیونکہ فرقہ کسی انسانی شخصیت پر آ کر رک جاتا ہے ____ 486
) دو متضاد کیفیات میں الجھی ہوئی قومِ مسلم کے دعویٰ کا تجزیہ 487

) فرقوں کے جواز کے لیے مکاتیب فکر کی پُرفریب اصطلاح 487
) ہم تو کعبے کے امام کے پیچھے بھی نماز نہیں پڑھتے ______ 488
) پاکستان کے اندر مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی کے بٹوارے کا
پیدا کردہ جہنم ____________________ 489
) فرقہ بندی کے شرک کو چھوڑ کر امتِ واحدہ کے سمندر میں
مدغم ہونا ہمیں گراں گزرتا ہے ____________ 489
) فرقوں کے بننے کی وجہ: دوسروں پہ چڑھ دوڑنے کا جذبہ _ 490
) فاتح کلکتہ کی شان میں مولوی صاحب کا جلوس ______ 490
) یہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنا بڑا بننا فرقوں کی بنیاد میں مضمر ہے
اور قرآنِ حکیم تو صرف ثواب کی غرض تک محدود ہے ______ 490
) رجم کی سزا کو خلافِ قرآن مجید کہنے پر ججز کے
خلاف علما کی اپیل ____________________ 491
) رجم کی سزا اور الگ الگ قرآن وسنت کے
باوجود مہلت کا وقفہ ہے ____________ 491
) تفرقے سے قوموں کی تباہی، قرآن مجید بطور مھیمن اور نبی اکرمؐ
کا دعوتِ توحید کا فریضہ ________________ 492
) فرقہ بندی کے مرض میں مبتلا مریض کو امتِ واحدہ کا عظیم تصور
بڑا ہی گراں گزرتا ہے اور اس میں استقامت کی ضرورت ہے 493
) جذبات کے بجائے استدلالی طور پر اور عقل وفکر پر خدا کی
طرف دعوت ____________________ 493
) سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ از خود قرآنِ حکیم پر ایمان لانے کا
اعلان کرتے ہیں ________________ 493
) قرآنِ حکیم پر ایمان لانے کی ایک بنیادی اور اہم خصوصیت 494
) حضور ﷺ بھی قرآن مجید پہ بغیر کسی مجبوری کے ایمان لائے
اور انہیں کہا گیا کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو ______ 495
) کتاب وسنت کی اصطلاح کا تجربہ ____________ 495
) دوسو سال کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ نے چھ ہزار روایات
اکٹھی کیں ____________________ 496
) روایات کے تحت کفر اور ایمان کا معیار خود معیار پر بھی
پورا نہیں اترتا ____________________ 497
) حکمِ خداوندی ہے کہ اے رسول! تو کتاب اللہ کے مطابق
فیصلے کیا کر ____________________ 498
) قرآنِ حکیم کے نزدیک عدل کا معیار وہ فیصلہ ہے
جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہو ____________ 498
) پرویزؒ کی وہ آواز جو تیس سال سے بلند ہو رہی ہے
وہ قرآنِ حمید کی آواز ہے ______________ 499
) پرویزؒ کے ایامِ زندگی، پرویزؒ کی زبانی ________ 499
) ہم میں اور تم میں رب قدرِ مشترک ہے، قانونِ مکافاتِ عمل
کارفرما ہے اور جانا اسی فیصلے پر ہے ________ 500
) انا اول المسلمین ہونے کے دعویٰ کے بعد کی وارننگ ___ 501
) انسان کا ہر عمل میزان میں تولا جائے گا ________ 501
) الساعۃ کا مروّجہ مفہوم اور اس کے مضمرات ________ 502
) قرآنِ حکیم کے نزدیک الساعۃ یا قُربِ قیامت کی عملی تفسیر 503
) ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی بے سروسامانی کا عالم مگر انقلاب عظیم
کا کہا جاتا رہا ____________________ 504
) خدا کا نظامِ ربوبیت ہمہ گیر اور غیر جانبدار وہ اپنے قوانینِ
فطرت میں مومن اور کافر کی کوئی تخصیص نہیں کرتا ______ 504
) ماحصل میں کفر اور ایمان کی حدِ فاصل کو قائم کرنے کا طریق،

پرکھ اور قرآنِ کریم میں اس کی مثال ______ 506
) لفظ عطا کا قرآنی مفہوم: عطیہ کے آگے پھاٹک لگا دینا
ملا کی شان نہیں ______ 507
) خدا کے قوانین میں انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی
ملاوٹ شرک ہے ______ 507
) خدا کا شریک کون ہے اور کس طرح ہے؟ ______ 508
) ہمارے ہاں کے قوانینِ شریعت انسانی فکر کا نتیجہ ہیں ______ 509
) پرویزؒ کی کہانی، پرویزؒ کی ❺ زبانی ______ 509
) مذہب کی دنیا سے وابستہ کوئی قوم بھی خود کو عزت وتکریم کے
زیور سے آراستہ نہیں کرسکی: تاریخ کا فیصلہ ______ 511
) خود مسلمانوں کی حالتِ زار پر، یہودیوں کا قبضہ اور
میدانِ عرفات کی دعائیں ______ 512

تیسرا باب: **سورۃ الشوریٰ** (آیت 22 اور اجراً اِلا المودّۃ فی القربیٰ)

) آج کے درس کی ایک اہم ترین آیت ______ 515
) سلسلۂ نبوت میں کوئی نبی بھی اپنی دعوت کے اجر کا طلب گار نہ تھا 515
) ''الا'' کے لفظ کا مفہوم اور استعمال نیز اجر نہیں چاہتا
تو کیا چاہتا ہوں؟ ______ 517
) میرے اجر کا معاملہ کسی انسان کے ساتھ نہیں بلکہ وہ تو
خدا کے ساتھ ہے ______ 518
) میری ساری زندگی کا ماحصل قرآنی تعلیمات ہیں، ان میں زندگی
کا وہ حصہ شامل نہیں جسے میں عہدِ جاہلیہ کہا کرتا ہوں: پرویزؒ ______ 519
) زیرِ نظر درسِ قرآنِ حکیم کی اہم آیت کا غلط مفہوم رسالت
کے منصب کی ساری عمارت گرا دیتا ہے ______ 521
) حضور ﷺ کی رشتہ داریوں کی تفصیل، قرآنِ حکیم کی
تعلیمات اور امتِ مسلمہ میں رشتہ داروں سے محبت میں
ابتدائی گروہ بندی کا عمل ______ 521
) حضرت علیؓ کی حضرت فاطمہ الزہرہؓ سے ساتھ شادی کے علاوہ
ان کی دیگر شادیوں کا تاریخی بیان اور ان سے اولادوں کی تخصیص 522
) نسلی طور پر نبی اکرم ﷺ کی طرف سے اجر کے طلب
کرنے کا معاملہ ______ 523
) نسلی اور نسبی امتیازات کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی واضح تعلیم
کے خدوخال ______ 523
) قرآنِ حکیم کے نزدیک ''اہل'' ہونے کا معیار ______ 524
) امتِ محمدیہ ﷺ کی بنیاد کسی رشتہ داری پر استوار نہیں، بدر کا
میدان اس کی زندہ شہادت ہے ______ 525
) قرآنی ایمان کی بنا پر قائم ہونے والی برادری کو باہمی محبت کا
سبق دیا گیا تھا ______ 526
) حضور ﷺ کی زندگی کا آخری خطبہ اور نسبی یا نسلی
رشتے داریوں کی نفی ______ 526
) فی القربیٰ کا قرآنی مفہوم ______ 527
) نبی اکرم ﷺ کو سب سے زیادہ اذیت آپؐ کے قریب ترین
رشتہ داروں نے ہی پہنچائی ______ 528
) اہل قریش کے متعلق حضور ﷺ کا فرمان: رشتہ داری کے
تعلقات کا تو کم از کم خیال رکھو اور پھر فتح مکہ ______ 529
) زیرِ نظر قرآنی آیت کو یہ معنی کس طرح پہنائے گئے؟
یہ تاریخ کا حصہ ہے، بنو ہاشم بھی اور بنو امیہ بھی ______ 530
) بنو ہاشم اور بنو امیہ کی سلطنت کے خلاف گہری سازش ______ 531
) خلافت کے سلسلہ میں شیعہ حضرات اور سنیوں کے ہاں تصورِ

خلافت اور امامت ___ 532
) مجھے کسی کے عقیدہ سے کوئی واسطہ نہیں: پرویزؒ ___ 533
) بنوعباس کی حکومت کا قیام اور ایک حیرت انگیز مثلث ___ 534
) نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کردہ ایک روایت ___ 534
) حجۃ الوداع کے خطبہ کے متعلق متضاد روایات ___ 535
) ابومسلم خراسانی کی طرف سے اہل بیت کی وضع کردہ اصطلاح'
وراثت کا معاملہ اور عترتِ رسول ___ 536
) شیعہ حضرات اور سُنّی حضرات کی الگ الگ حدیثوں کے مجموعہ
جات' ان کا مقام اور درود ___ 536
) کچہری میں کسی ایک سید کے متعلق سُنّی کا بیان
اور پھر نماز میں درود ___ 537
) مشکوٰۃ کی ایک حدیث ___ 538
) تصوف کی قید میں بیس برس تک گرفتار رہنے والی شخصیت'
پرویزؒ کی زبانی' تصوف کے خانوادوں کی روئداد ___ 538
) علامہ اقبالؒ اور دنیائے تصوف کی شاعری ___ 539
) یہ عقائد کے مبالغے میں قرآنِ حکیم کی تعلیم نہیں ___ 541

چوتھا باب: **سورۃ الشوریٰ** (آیات 23 تا 24)

) میری رفاقت کے ایک پچاس سالہ رفیق شیخ سراج الحق رحمہ اللہ کی
جدائی کا صدمہ: پرویزؒ ___ 542
) سابقہ درس کی صدائے بازگشت: قرآن حکیم نے عزیز داری کی
تخصیص کبھی ملحوظِ خاطر نہیں رکھی ___ 543
) حسنات سے معمولی لغزشوں کے نقصانات کا ازالہ ___ 543
) کشمکشِ حق و باطل میں غلبۂ حق کی شرط ___ 544
) پوری کائنات میں حق و باطل کی کشمکش ہر آن جاری وساری
رہتی ہے ___ 545
) ہیگل کا تعمیری اور تخریبی تصورات میں ٹکراؤ کا نظریہ
اور قرآنی تعلیمات ___ 546
) مارکس کے کہنے کے مطابق دراصل یہ ٹکراؤ نظامِ زندگی
میں ہوتا ہے ___ 548
) مَا یَنْفَعُ النَّاس کے سلسلے میں چودہ سو سال پیشتر
قرآنِ حکیم کا اعلان ___ 548
) جب حق پر مبنی کوئی Idea (تصور) عملی شکل اختیار کر جائے
تو پھر وہ دین کہلاتا ہے ___ 549
) حق کا یا دین کا یہ سسٹم اپنے طریق پر نشوونما پاتا ہے'
ابن مسکویہ نے اسے ''سفرا'' کہا ___ 549
) زندگی کے حقائق تک پہنچنے کے لیے عقل کو طویل المیعاد
مسافت طے کرنا پڑتی ہے ___ 550
) نظریہ ارتقاء کے سلسلہ میں میدان بدر کی مثال ایک زندہ
شہادت ہے ___ 551
) اس عہدِ اولیٰ کے بعد Emergent Evolution
(فجائی ارتقا) کی جگہ پھر NaturalEvolution (فطری ارتقا)
نے لے لی ___ 552
) کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟ ___ 552
) اقبالؒ کی فکر قرآنی میں حق و باطل کی کشمکش کی ترجمانی ___ 552
) کشمکشِ حق و باطل میں غلبۂ حق اور یہ ہے دین ___ 555
) باطل کی تکنیک ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بے نقاب
ہونے ہی نہ دے ___ 555
) مذہب نے خود کو ہمیشہ دین کے نقاب میں ہی پیش کیا ہے ___ 556

) ابلیس کے آدم کے خلاف حربے ____ 556

) اعتقادات کو پھیلانے کے سلسلہ میں مذہبی دنیا کے
ذرائع ابلاغ ذہنوں کو ماؤف کرنے کا موثر ترین حربہ ہیں ____ 557

) معاشرتی تنہائی کے خوف کا حربہ ____ 558

) عباسیوں کے عہد میں اہل معتزلہ کے ساتھ ہونے والا سلوک 559

) آج کے دور میں قرآن کریم کی آواز اٹھانے والے کا حشر 559

) غلبۂ حق کے لیے ایک جماعت کی ضرورت اور اس کے
بغیر ابلیسی تکنیک ____ 560

) غلبۂ حق کے لیے فطری طریق کار ہے جو اپنی سست روی
کے باوجود اپنی اندر کی قوت سے اوپر کو جاتا ہے ____ 560

) نسلِ انسانی کے ارتقا کا معاملہ: جسمانی اور ذہنی ارتقا
مسلسل ہو رہا ہے ____ 561

) حق و باطل پر مبنی تصورات (Ideas) کی چھان پھٹک میں
وحی کا کردار اور قوموں کے عروج زوال کی داستان کا مطالعہ ____ 562

) تاریخ کے سلسلہ میں مغرب کے محققین کا کردار اور ہمارا اپنا جرم 563

) شب برات کی کہانی تواتر کی زبانی ____ 565

پانچواں باب: **سورۃ الشوریٰ** (آیات 25 تا 38)

) سابقہ درس کی صدائے بازگشت ____ 568

) مکافاتِ عمل کا قرآنی اصول ____ 569

) نظامِ عدل میں عفو کا مفہوم ____ 570

) ''یعفوا'' کے قرآنی مفہوم میں ''رحمت'' ____ 570

) یہودیوں کی ایک غلط سوچ نے انہیں کہاں پہنچا دیا ____ 571

) عیسائیت کے کفارے کے تصور کے بعد ہندوؤں کے
ہاں آواگون کا معاملہ: مجبوری و مقہوری ____ 571

) قندیلِ آسمانی کے نزدیک قانونِ مکافاتِ عمل میں
رحمت کی گنجائش ____ 572

) ایسی جنت جو بخششیں میں ملے، مومن کی نظروں میں
کہاں جچتی ہے ____ 572

) قرآن حکیم نے یہاں توبہ کا قانون دیا ہے اور اسی سے
جرم کا ازالہ ممکن ہے ____ 573

) خدا کے قانون پر یقین نہ کرنا ہی جرم کی بنیاد بنتا ہے ____ 574

) غلط عمل کے سرزد ہونے کے بعد اس کے علاج کا طریقِ کار 574

) انسانی اختیارات کو محدود رکھنے میں بھی ایک مصلحت ہے ____ 575

) نوعِ انسانی کے لیے قدرت نے زمین کے اندر لامحدود
خزانے دفن کر رکھے ہیں ____ 575

) خالقِ کائنات قدم قدم پر انسان کے لیے شرف و تکریم کے
پھول بکھیرتا چلا جاتا ہے ____ 577

) سامانِ نشو و نما پر خدا کا احسن کنٹرول ____ 577

) قرآن حمید کی اصطلاحات الفاظ نہیں ہیں بلکہ یہ زندگی کے
Concepts (تصورات) ہیں ____ 578

) مذہبی پیشوائیت کے دورِ اقتدار میں جہالت اور ظلم
(یورپ میں بھی) اپنے عروج پر ہوتا ہے ____ 579

) فکرِ انسانی کے جمود کے سلسلہ میں ہماری اپنی حالتِ زار
اور مرتد کی سزائے قتل ____ 579

) فکری جمود تو روشن حقائق کو بھی تسلیم کرنے سے انکاری ہوتا ہے 580

) جدید سائنسی انکشافات قرآن کریم کی روشنی میں ____ 581

) قدم قدم پر کائنات کے حقائق کو Discover (بے نقاب)
کرنے والی قوموں کا ایمان ____ 583

) تقدیر کی آڑ میں انسانی نفسیات کا اندازِ فکر ________ 583
) تقدیر کا عقیدہ اور شبِ برات کے تصور کی حقیقت ____ 584
) غلط قسم کے نظریات خصوصاً تقدیر انسانی فکر کو عملی طور پر مفلوج
کر دیتے ہیں ______________ 585
) اس قدر الجھے ہوئے مسئلے کا حل صرف چار الفاظ میں:
قانونِ خداوندی کے مطابق عمل کرو __________ 586
) خدا کی ذات کسی کو مصیبتوں میں مبتلا نہیں کرتی بلکہ وہ ان کا
ازالہ کرتی ہے ______________ 587
) اجتماعی مصیبتوں کی وجہ جو از اجتماعی نظام کی خرابی ہوتی ہے
اور اللہ کا قانون ان سے بچاتا ہے __________ 588
) رزق کی باہم رسائی کے لیے سمندروں میں تیز ہواؤں
کے گزرنے کا انتظام اور کشتیوں کی مثال سے قانونِ خداوندی
کی وضاحت ______________ 588
) زندگی دو مختلف پہلوؤں سے عبارت ہے: ایک کا تعلق
طبعی قوانین سے ہے اور دوسری کا تعلق اقدار سے _______ 590
) توکل کا قرآنی مفہوم اور لغزش اور جرائم میں فرق ____ 591
) قابلِ ملامت افعال پر انسانی ردِعمل اور قرآنی راہنمائی ___ 591
) لغزشوں سے بچنے کا طریقِ عمل __________ 593

چھٹا باب: **سورة الشوریٰ** (آیات 39 تا اختتام)

) صفاتِ خداوندی انسانی ذات کے لیے حدِ بشریت کے اندر
ایک معیار مقرر کرتی ہیں ____________ 596
) نشوونما یافتہ ذات کا ردِعمل صفاتِ خداوندی کا عکس ہوگا:
یہ ہے مومن کی صفات کا معیار ____________ 597
) مقامِ نبوت کے لیے بھی مشاورت کا حکم ہے ______ 598
) لفظ ینفقون کا قرآنی مفہوم اور مروجہ تراجم ________ 599
) لفظ ینتصرون کا قرآنی مفہوم ______________ 599
) قرآنی معاشرے میں تادیب کے متعلق عمل پیرائی کی حدود 600
) ذاتِ خداوندی کی نوازشِ بے کراں مگر جرم کی سزا،
جرم کے مطابق ______________ 601
) مومن کا شعار ______________ 603
) قصۂ ابلیس و آدم کی حقیقت اور ہماری معاشرتی زندگی ___ 603
) قرآنِ حکیم کے نزدیک سزا تو اس کے لیے ہے جو اپنی غلطی
کو تسلیم ہی نہ کرے ______________ 604
) بغاوت جیسے جرم کے سلسلہ میں بھی قرآنِ حکیم احساسِ
ندامت کو آخری دم تک پیشِ نظر رکھتا ہے __________ 605
) سزاؤں کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ قیامت
تک بار آور ہوگا ______________ 606
) "غفر" کے لیے استقامت اور عزم الامور ________ 607
) ہمارے ہاں مروّجہ تراجم کی نوعیت اور ان کے اثرات ___ 608
) غور و فکر قرآنی تعلیم کا بنیادی تقاضا ہے __________ 608
) اسلاف پرستی، اجماعِ امت اور سوادِ اعظم کے تصورات ___ 609
) سند و حجت یا معیار صرف خدا کی کتابِ عظیم قرآن کریم ہے 609
) قرآنِ حکیم کی تعلیم کو امتِ واحدہ کے انداز میں عام کرنا
عزم الامور کا متقاضی ہے ____________ 610
) توبہ کی قبولیت کے لیے غلط کام کا پہلے تعمیری انداز میں ازالہ کرنا
ضروری ہے: ندامت بعد از وقت کی کچھ اہمیت نہیں ______ 610
) عذاب کہیں باہر سے نہیں آتا، یہ انسانی عمل کا ہی
فطری نتیجہ ہوتا ہے ______________ 612

) مومن کا فریضہ ہے کہ ضابطۂ ہدایت دوسروں تک پہنچا دے 612

) اسوۂ حسنہ کے برعکس ہمارا طرزِ عمل _____ 613

) جنین کے متعلق اہلِ یورپ کے سائنسدانوں کی تحقیق __ 615

) بیٹی کی پیدائش پر موت طاری ہو جاتی ہے _____ 615

) لڑکے یا لڑکی کی پیدائش کا انحصار مرد کے نطفہ پر ہوتا ہے:
آج کی تحقیق _____ 616

) انسان قوانین فطرت اور اقدارِ خداوندی کو Discover
(بے نقاب) کر سکتا ہے لیکن وضع نہیں کر سکتا _____ 618

) خدا کی طرف سے وحی الفاظ کے ذریعے تھی اور اس کے ملنے
کا طریق نبی کے علاوہ کوئی شخص جان نہیں سکتا تھا _____ 618

) وحی کے ملنے کا طریق نبی کے علاوہ کوئی شخص جان نہیں سکتا تھا 619

) ہمارا فریضہ وحی پر ایمان لانا ہے _____ 620

) قرآن حمید از خود ایک جگمگاتا ہوا سورج ہے _____ 621

❀......❀......❀

پہلا باب: سورۃ المؤمن (آیات 1 تا 9)

عزیزانِ من! آج جنوری 1981ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمن سے ہو رہا ہے' یہ چالیسویں سورۃ اور 24واں پارہ ہے۔

قرآنِ حکیم میں فرعون کی کابینہ کے ایک مردِ مومن کے خطاب کی اہمیت کا ذکر

ایک سورۃ المؤمنون ❶ بھی ہے لیکن یہ المؤمن ہے۔ اور اس نام کے ساتھ یہ ایک خصوصیت ہے کہ اس میں صاحبِ ضربِ کلیمؑ اور فرعون کی کشمکش کے ذکر میں ایک مقام آتا ہے جہاں کابینہ میں یہ مسئلہ پیش ہوتا ہے۔ اور وہاں فرعون یہ تجویز کرتا ہے کہ موسیٰؑ کو قتل کر دیا جائے ورنہ یہ ملک میں بغاوت پھیلا دے گا۔ اور مجھے اس کا منشا یہ نظر آ رہا ہے کہ یہ تمہیں تمہاری اس حکومت سے ہی الگ کر کے رکھ دے گا۔ گویا وہاں Discussion (گفتگو) یہ ہوئی کہ یہ مذہبی معاملہ نہیں ہے' یہ ایک سیاسی حرکت ہے اور اس کے لیے یہ کرنا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کابینہ کے اور ممبر اس کے ساتھ متفق ہو نگے۔ قرآنِ کریم میں یہ ہے کہ ان میں ایک مردِ مومن تھا۔ وہ اٹھا اور اس نے ایک

---

❶ یہ 23 ویں سورۃ ہے اور 18 ویں پارہ میں ہے۔

تقریر کی اور قرآنِ کریم نے قریباً دو رکوع میں اس کی ساری تقریر Verbatim (لفظ بہ لفظ) محفوظ کر لی ہوئی ہے۔ ایک تو آپ اس کی اہمیت کا اندازہ لگایئے اور دوسرا یہ کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کی اتنی بڑی سعادت مندی تھی کہ قرآنِ کریم میں حضراتِ انبیائے کرامؑ کے تذکارِ جلیلہ میں تو یہ باتیں آتی ہیں کہ ان کے کوائف بھی ہوں' ان کے مکالمات بھی ہوں' ان کے خطابات بھی ہوں لیکن ایک غیر از نبی شخص کی تقریر کو قرآن حکیم کے دامن میں سمیٹنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے ابدیت در کنار کر دیا۔ قیامت تک کے لیے اس کی تقریر کا ایک ایک لفظ محفوظ ہو گیا۔ آپ تقریر کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایئے۔ اور اس کا تو ایک صلہ یہ بھی ہے کہ خود اس سورۃ کا نام المؤمن بھی اس کی وجہ سے ہے۔ آگے چل کر وہ بات آئے گی' کشمکش کا بھی ذکر آئے گا اور اس کی پوری تقریر بھی ہمارے سامنے آئے گی۔

قرآنِ حکیم میں حروفِ مقطعات کی وضاحت

اس سورۃ کا آغاز مقطعات میں سے ایک لفظ حٰمٓ (40:1) سے ہوتا ہے۔ مقطعات کے سلسلہ میں تو میرا معمول اور مسلک آپ جانتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے متعلقہ حروف لے کر انہیں رکھا جاتا ہے۔ اور میں اسی طرح سے ان کے معنی کیا کرتا ہوں۔ مثلاً حٰمٓ میں ''ح'' ہے اور ''م'' ہے یعنی خدائے رحمان ورحیم کا ارشاد ہے کہ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (40:2)۔ تنزیل کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کا بتدریج نازل کرنا۔ کسی چیز کا نازل کرنا اور اس میں تدریج یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر تیئیس سال میں یہ صحیفۂ مقدسہ وحی کے ذریعے تکمیل تک پہنچا تھا۔ یہ اس قدر تدریجاً نازل ہوا ہے۔

Education (تعلیم) اور Information (معلومات) میں بنیادی فرق

آپ کو معلوم ہے کہ اِس لفظِ نزول یا نازل ہونے کے اندر ایک بہت گہری معنویت اور فلسفہ ہے۔ یہ چیز ہمارے دور میں عام ہوئی ہے کہ بعض چیزیں Subjective (داخلی) ہوتی ہیں وہ انسان کے اندر سے نکلتی ہیں مثلاً میرے خیالات' میری آرزوئیں' میرے مقاصد' میرے ارادے' میرا علم' یہ میرے اندر سے باہر آتے ہیں۔ شاید آپ کو علم ہو کہ لفظ Education کے معنی ''کسی چیز کو اندر سے باہر لانا'' کے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ جو Education (تعلیم) ہے' یہ Education نہیں ہے' یہ Information دی جاتی ہے' معلومات دی جاتی ہیں۔ Education (تعلیم) کے معنی ہوتا ہے کہ انسان کی داخلی' اندرونی' صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر باہر لانا۔ تو اس لفظ کے معنی ہی آج جن کو پتا نہیں' ان کو کیا پتا کہ تعلیم کیا ہوتی ہے۔ یہ Subjective ہے' اندر کی چیز ہوتی ہے۔ انسانی تصنیفات جتنی بھی ہیں' وہ ساری Subjective (داخلی' اندر کی) ہوتی ہیں۔

وحی اور انسانی تصورات میں فرق کی نوعیت

میں جو کچھ لکھ رہا ہوں' میری ساری کتابیں' میرے اپنے ذاتی خیالات ہیں جو اندر سے باہر آ گئے ہیں یعنی میں نے ان کو Express (ظاہر) کیا ہے۔ وحی ایک ایسا منفرد ذریعۂ علم ہے کہ وہ انسان کے اندر سے باہر نہیں آتا بلکہ باہر سے کوئی شے اندر آتی ہے۔ اور یہ طریق یعنی کسی چیز کا جو نازل ہونا ہے' اس کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ کسی چیز کا اوپر سے نیچے یا اندر آنا۔ تو وحی کی Definition (تعریف) اس لفظ کے اندر آ جاتی ہے کہ مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی (53:3) یہ رسول اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر رہا' یہ Subjective (اندرکی) چیز نہیں ہے بلکہ یہ خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ تَنۡزِیۡلُ .... مِنَ اللّٰہِ (40:2)۔ اس میں یہ جو Objectivity پائی جاتی ہے' جو اس میں خارجیت پائی جاتی ہے' جو باہر سے کسی چیز کا' معلومات کے ذریعے سے آنا ہے' علم آنا ہے' جس میں انسانی کاوش اور فکر کو کوئی دخل نہ ہو' تو یہ ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔ وحی کی کنہ و کیفیت یعنی یہ کہ خدا کی طرف سے وحی کیسے آتی تھی' حضورﷺ اس کو کس طرح Receive (حاصل) کرتے تھے' ہم یہ چیزیں نہیں سمجھ سکتے' یہ صرف صاحبِ وحی سمجھ سکتا تھا۔ اور وحی چونکہ نبی اکرمﷺ کی ذات پہ ختم ہوگئی اس لیے اس کا تو اب امکان ہی نہیں۔ یہ بڑی منفرد چیز تھی۔ یہ کسی فلسفے' کسی سائیکولوجی کی رو سے نہیں سمجھی جاسکتی۔ اب ہمیں اس سے تو غرض بھی نہیں لیکن وحی کے جو Contents (مضامین) ہیں یعنی جو کچھ وحی کے ذریعے سے ہمارے سامنے آیا ہے' وہ عقل و بصیرت اور علم و تدبر کی رو سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اتنے حصے پہ تو ہمیں ایمان لانا ہوتا ہے کہ نبی اکرمﷺ نے یہ جو فرمایا ہے کہ یہ میری فکر کی تخلیق نہیں ہے' یہ وہ علم ہے جو خدا کی طرف سے مجھے براہِ راست ملا ہے' تو اس کو تو ہم صرف ایمان کے ذریعے سے تسلیم کرتے ہیں۔ حضورﷺ کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے کہ آپﷺ نے یہ جو فرمایا ہے' یہ بالکل سچائی ہے۔ اس سے آگے جب ہم پہنچتے ہیں تو یہ جو قرآن مجید ہمارے سامنے آتا ہے' یہ وہ ہے جو حضورﷺ نے ہمیں وحی کہہ کر دیا ہے۔

عقلِ انسانی کے لیے قرآنِ حکیم پر ایمان لانے کا طریق: غور و تدبر اور فہم و دانش ہے۔

اب اس پورے قرآن مجید کو عقل و بصیرت' علم و دانش' کی رو سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں انسانی فکر کا دخل آتا ہے۔ غور کیجیے' مجھے یا کسی اور کو اس سے واسطہ کیا کہ یہ رسول اللہﷺ کو کیسے ملا تھا' اس پر تو ہمارا ایمان ہے۔ فرض کرو کہ کوئی اسے نہیں مانتا تو میں یہ دعویٰ کیا کرتا ہوں کہ خود قرآنِ کریم کو آن میرٹ لے لیتے ہیں کہ یہ جو کتاب ہے یہ کیسی ہے۔ اس سے ہم دیکھیں گے کہ اس نتیجے پہ پہنچا جا سکتا ہے کہ یہ کسی انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے بلکہ یہ علمِ خداوندی ہے جو اس نے خود انسان کو دیا تھا۔ قرآن حکیم سے یہ چیز ثابت ہو جاتی ہے۔ اور میرا انداز یہی ہے کہ خود قرآن حکیم پہ تدبر سے غور و فکر سے انسان اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ کسی انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے بلکہ ماورائے فکرِ

انسانی ہے۔ یہ بات غور و تدبر اور بصیرت اور فہم و دانش سے ثابت اور سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اتنی سی بات ہمیں چاہیے۔

عربی لغت کے لحاظ سے علیم اور عالم کی دو الگ الگ صفات بڑی اہم خصوصیات کی حامل ہیں

کہا ہے کہ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ (40:2) اس میں دو صفات العزیز اور العلیم آئی ہیں۔ عربی زبان میں ایک لفظ علیم ہے اور دوسرا عالم ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ عربی زبان کے اندر جن کو ہم باب یا وزن کہتے ہیں، ان کی الگ الگ خصوصیات ہوتی ہیں۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ یہ بڑی سائنٹفک زبان ہے۔ علم حاصل کرنے والا یعنی عالم تو کسی ایک وقت میں عالم ہو سکتا ہے، دوسرے وقت میں کسی دوسری چیز کے متعلق وہ جاہل ہو سکتا ہے کہ وہ بات اسے نہیں آتی لیکن علیم میں تسلسل ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ صاحبِ علم رہتا ہے یعنی یہ بات نہیں ہے کہ کسی بات کا اس کو علم ہے اور کسی بات کا علم نہیں یا کسی وقت کسی بات کا علم ہے اور دوسرے وقت میں نہیں۔ یہ تو انسان کی کیفیت ہوتی ہے جبکہ خدا تو علیم ہے۔

ذاتِ خداوندی جو ماورائے محسوسات ہے اسے صرف اس کی صفات سے ہی پہچانا جا سکتا ہے اور وہ صحیح موقع پر ظہور میں آتی ہیں

اب خدا کی کچھ صفات آئی ہیں۔ میں یہاں پھر عرض کر دوں کہ جہاں تک ذاتِ خداوندی کا تعلق ہے کہ خدا کیا ہے، خدا کیسا ہے؟ تو اس کو کنہ و کیفیت کہتے ہیں اور یہ عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں ہے کہ ہم اس کو جان سکیں۔ میں نے پہلے بھی یہ عرض کیا تھا کہ وہ لامحدود (Infinite) ہے۔ کوئی Infinite چیز Finite (محدود) ذہن کے اندر آ ہی نہیں سکتی۔ محدود ذہن کے اندر لامحدود کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔ فلسفے کی زبان میں انہیں Meta-Physical (مابعد الطبیعاتی) کہتے ہیں۔

فزکس کے معنی ہیں عالمِ محسوسات یعنی ہماری یہ محسوس کائنات۔ محسوس کائنات کے متعلق تو ہم اپنے حواس کے ذریعے Senses کے ذریعے علم حاصل کر سکتے ہیں۔ اسے Perception کہتے ہیں، Perceptual Knowledge (علم بالحواس) کہتے ہیں لیکن محسوس کائنات سے ماورا چیزیں تو ہمارے حواس کی زد میں آ ہی نہیں سکتیں کیونکہ وہ تو محسوسات سے ماوراء ہیں۔ اسی لیے انہیں میٹا فزکس کہا جاتا ہے یعنی ماورائے محسوسات، ماوراء الطبیعات۔ یہ چیز کہ ذاتِ خداوندی کیا ہے، اس کا وہاں کا جو نظامِ مشیت یا عالمِ مشیت یا عالم امر ہے وہ کیا ہے، کیسے Work (کام) کرتا ہے، کیسے فیصلے ہوتے ہیں، وہ نظام کیسے چلا رہا ہے؟ ہم نہیں سمجھ سکتے۔ جونہی یہ چیز محسوس کائنات کے دائرے میں آئے گی اس میں ہر چیز سمجھی جا سکتی ہے۔ جو کچھ ابھی نہیں سمجھا گیا وہ علمِ انسانی کا نقص ہے کہ ہم وہاں تک نہیں پہنچے ورنہ یہ جو وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا (2:31) تھا یہ تو قرآنِ کریم میں پہلے ہی آدم کی صفت بتائی گئی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اسے اس

کائنات کی ہر شے کے علم حاصل کرنے کا امکان دیا گیا ہے' صلاحیت دیدی گئی ہے۔اب انسان جس حد تک علم کے اندر ترقی کرتا جائے گا اس حد تک یہ علم الاسمآء حاصل کرتا چلا جائے گا۔قرآن کریم نے جو یہ کُلَّهَا (2:31) کہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کائنات کے متعلق کُلی علم حاصل کرسکتا ہے۔لیکن محسوس کائنات کے متعلق ہی کرسکتا ہے اس سے آگے انسان قیاس کرسکتا ہے' اندازہ لگا سکتا ہے۔وہ لفظ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (6:91) جو آیا ہے کہ انہوں نے خدا کے متعلق صحیح اندازہ نہیں لگایا' تو یہ معرفت کا لفظ نہیں ہے۔میں پھر دہرا دوں۔آپ کو یاد ہو گا میں نے بتایا تھا کہ قرآن کریم میں خدا کی معرفت کا ذکر آیا ہی نہیں ہے۔اس کا عرفان ہو ہی نہیں سکتا' اس کو پہچانا نہیں جا سکتا۔اس کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اور وہ ان صفات کے ذریعے سے لگایا جا سکتا ہے جو خود اللہ نے قرآن میں دی ہیں ورنہ اس کے علاوہ ذہنِ انسانی اس کے متعلق جو کچھ کہے گا وہ اس سے بلند ہے' ماوراء ہے۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (37:159)۔خود اس نے اپنے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ اس کی صفات ہیں۔ان صفات کی رو سے خدا کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس آیت میں پہلے دو صفات الْعَزِيْزِ ' الْعَلِيْمِ آئیں اور آگے کہا ہے کہ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِى الطَّوْلِ ❶ (40:3)۔اس میں صفات بظاہر متضاد سی نظر آتی ہیں لیکن متضاد نہیں ہیں۔قرآن میں تو کہیں تضاد نہیں ہے۔مختلف مواقع پر انسان کی کسی مختلف خصوصیت یا عادت یا صفت کا ظہور ہوتا ہے۔ظالم کی کلائی مروڑنا بھی شرفِ انسانیت ہے' مظلوم کی مدد کرنا بھی شرفِ انسانیت ہے حالانکہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔یہاں رحم کا جذبہ ہے' وہاں گرفت اور قوت کا جذبہ ہے۔دونوں جذبے موجود ہیں۔اپنے اپنے مواقع پر کسی ایک خاص صفتِ انسانی کا جو ظہور ہے اگر یہ صحیح موقع پر استعمال ہو تو صحیح ہے۔اگر وہ غلط چیز ہو جائے یعنی ظالم سے ہمدردی' مظلوم کے ساتھ ظلم' تو دونوں چیزیں تو انسان کے اندر اپنی ہیں لیکن ان کا استعمال غلط جگہ ہو رہا ہے۔خدا کی صفات کی بھی یہ صورت ہے۔اب دیکھیے وہ کہتا ہے کہ غَافِرِ الذَّنْبِ (40:3) اور شَدِيْدِ الْعِقَابِ (40:3)۔

ہمارے ہاں کے مروجہ قرآنی تراجم سے قرآنِ حکیم سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔دیکھیے بخشش کا قرآنی مفہوم

میں یہ عرض کر دوں جیسا کہ اب آپ شاید بیس برس سے یہ بات سنتے چلے آ رہے ہیں کہ ہمارے ہاں یہ ترجمے صحیح نہیں ہوئے۔وہ خاص ذہنیت ہے جس کے تابع یا وہ ترجمے ہوئے یا ان ترجموں سے ذہنیت بنتی ہے۔غَافِرِ الذَّنْبِ (40:3) کا ترجمہ کیا جاتا ہے ''وہ گناہوں کا بخشنے

---

❶ اس ضابطہ پر چلنے والوں سے اگر کہیں سہو و خطا ہو جائے تو یہ ایسا طریق بھی بتاتا ہے جس سے وہ اس لغزش کے مضر اثرات سے محفوظ رہ سکیں (11:114)۔ اگر کسی دوراہے پر ان کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھ جائے' اور وہ اپنی غلطی کو محسوس کر کے پلٹ آئیں' تو انہیں باز آفرینی کا موقع دیتا ہے۔دوسری طرف' جو لوگ اس ضابطہ سے عمداً سرکشی برتیں ان کی سخت گرفت کرتا ہے۔اس کا قانونِ مکافات بڑی قوتوں کا مالک ہے اس لیے اس کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1088)

والا'' ۔ یہ جو بخش دینے والی بات ہے یہ بڑی غلط چیز ہے۔اس نے شروع قرآن سے آخر قرآن تک ایک ایک مقام پہ ایک ایک ذرے کے متعلق قانونِ مکافاتِ عمل کہا ہے مثلاً کہا ہے کہ فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۔ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (99:7-8) ایک ایک ذرہ مکافاتِ عمل کے میزان کے اندر تلتا ہے۔اور اس کے بعد یہ ہے کہ پھر اس کے مطابق اس شخص کا فیصلہ ہوتا ہے۔اب اگر ایک طرف مکافاتِ عمل لیا جائے تو یہ دین اور اسلام کی ساری بنیاد ہے کہ نہ کسی پر زیادتی ہو' نہ کسی کا کوئی عمل ایسا ہو جو نتیجہ خیز نہ ہو سکے۔ ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہونا مکافاتِ عمل ہے۔اب سوچیے کہ اس تصور میں بخش دینے کا تو تصور ہی نہیں آ سکتا۔ یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔لیکن ہمیں تو یہ ''بہشتے فی سبیل اللہ ہم است'' راس آتا ہے یعنی ''اللہ واسطے دی جنت ملے تے ہور چا ہیدا کی ہیگا اے'' (اگر اللہ واسطے کی جنت ملے تو اور کیا چاہیے)۔قوم ہزار سال سے اس میں ڈوبی ہوئی ہے کہ یہ تو بخشش سے ہو جائے گا۔ ہماری دعائیں یہ ہوتی ہیں کہ یا اللہ! بخش دے۔قوم کی ذہنیت یہ ہوگئی ہے کہ عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ کسی طرح سے بخشش ہو جائے۔کسی طرح سے بخشیش مل جائے' بغیر عمل کے یہ چیزیں مل جائیں۔ یہ تصور قرآن حکیم کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔تو پھر اب یہ کہا جائے گا کہ غَافِرِ الذَّنۡبِ کا کیا مفہوم ہوا۔

لفظ غَفۡرِ اور ذَنۡبِ کا لغوی مفہوم

دو باتیں یاد رکھیے! ایک تو میں نے یہ عرض کیا ہے کہ ترجمہ سے نہیں بلکہ عربی زبان سے پوچھیے کہ غَفۡرِ کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی بخشنا نہیں ہیں۔اس کے معنی ہیں ''کسی نقصان سے محفوظ رکھنا''۔پہلی چیز تو یہ ہوگئی۔اب آگے ذَنۡبِ ہے۔میں نے عرض کیا تھا کہ یہ عربوں کے ہاں عجیب چیز ہے۔کوئی چیز جو کسی کے ساتھ چپکی رہے اسے ذنب کہتے ہیں۔جانور کی دم کو ذَنۡبِ کہتے ہیں۔وہ جہاں جائے دُم ساتھ چپٹی ہوئی ہے۔یہ عجیب قوم تھی کہاں سے کہاں (الفاظ) لاتی تھی۔اسی لیے وہ کہتے تھے کہ اگر کسی نے کوئی جرم کر دیا ہے تو وہ اس سے چھوٹ نہیں سکتا۔ جہاں جی چاہے چلا جائے وہ اس کے پیچھے چپکا رہتا ہے۔ یہ قوم عجیب محسوس مثالوں سے اپنی زبان مرتب کرتی ہے۔اب ایک لغزش ہوگئی' وہ چھوٹ نہیں سکتی' چپٹی ہوئی ہے۔اس کا ایک نقصان ہے' اس کا نتیجہ نقصان دہ ہے۔ یہودی تصور تو یہ تھا کہ بس یہ جو ہو گیا سو ہو گیا' اب اس کا نقصان ہونا ہے اور یہ کسی طرح سے محو نہیں ہو سکتا۔عیسائیت کا تصور یہ تھا کہ کسی قسم کے گناہ یا جرم کی کوئی سزا وغیرہ مل ہی نہیں سکتی۔ حضرتِ عیسیٰؑ کے کفارے پر ایمان لے آؤ تو آپ کی بخشش ہو جائے گی۔بخشش کا تصور تو ہمارے ہاں عیسائیت سے آیا۔ یہودیوں کا تصور ہے کہ کسی طرح سے وہ محو ہو ہی نہیں سکتا' ایک دفعہ جو لغزش ہوگئی محو نہیں ہو سکتی۔قرآن حکیم نے اس کے درمیان ایک چیز دی ہے اور آپ دیکھیے گا کس طرح سے عین فطرت کے مطابق ہے۔کہا کہ لغزشیں ہوتی ہیں۔ان کے

نقصان' اس کی تباہی' یہ بھی نتیجہ خیز ہوجاتی ہے لیکن اس سے محفوظ رہنے کی بھی شکلیں ہیں۔آدمی بیمار ہوسکتا ہے لیکن بیماری کا علاج بھی ہوتا ہے۔غَافِرِ کے معنی ہیں ''بیماری کا علاج''۔صحت جو علاج سے ملتی ہے وہ بخشش سے نہیں ملتی۔علاج اس نقصان سے محفوظ رکھتا ہے جو بیماری کی وجہ سے پہنچنے والا ہوتا ہے۔اب آپ نے سمجھا کہ غَافِرِ کے معنی کیا ہوئے۔غَافِرِ تو علاج ہوتا ہے۔دوسری بات جو میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن حکیم کی کسی ایک آیت کا' کسی اصطلاح کا' مفہوم معلوم کرنا ہو تو دوسرے مقامات میں دیکھیے' وہ وہاں واضح کردیتا ہے۔ یہاں اس نے کہا ہے کہ وہ جو مرض ہے' علاج اس کے نقصان سے بچا سکتا ہے۔ دوسرے مقام پہ اس نے کہا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (11:114) قانون یہ ہے کہ ہر لغزش کا نقصان پہنچنا ہے لیکن جو غلطی کی ہے اگر اس سے زیادہ وزن کا' بہتری کا کام تم کروگے' اگر تعمیری کام کروگے' دوسروں کی خیر خواہی کا ایسا کام کروگے جو اس کے وزن سے زیادہ ہو تو یہ چیز اس کے نقصان سے تمہیں بچالے گی۔

لفظ میزان کی اہمیت اور نیکی کا مفہوم

وہ جو قرآن کریم نے لفظ میزان کہا ہے یعنی تلنے کی جو بات کہی ہے تو اس میں یہ بڑی عجیب چیز ہے۔کسی ترازو یا کسی میزان کے دو پلڑے ہوتے ہیں' ان میں اگر قرآن کریم کی رو سے ایک طرف تخریبی کاموں کا پلڑا ہے' دوسری طرف تعمیری کاموں کا پلڑا ہے۔جسے گناہ یا ثواب کہتے ہیں یہ دو پلڑے ہیں۔یہ نہیں ہے کہ انسانی زندگی میں ایک پلڑا برائیوں کا' شر کا' نقصان کا' بالکل ہی خالی ہو اور دوسرے پلڑے میں کچھ ہو تو پھر اس کی بخشش ہوتی ہے یا جنت ملتی ہے۔اسے معصوم ہونا کہتے ہیں۔انسان کے ساتھ تو لغزشیں لگی ہوئی ہیں۔اس نے کہا ہے کہ اگر یہ بھلائیوں کا پلڑا' تعمیری کاموں کا پلڑا جھکا ہوا ہے تو پھر یہ اس قابل ہے کہ اس کو اگلی جماعت میں چڑھا دیا جائے یعنی اگر اس نے مثلاً 60% مارکس لے لیے ہیں' اس کے پرچے میں 40% تو غلطیاں ہوتی ہیں۔اس نے پاس مارکس کو اصل معیار مقرر کیا ہے۔اور یہ اس کی بڑی رحیمیت ہے۔ 60% تو آپ کو لینے ہوں گے۔تو گویا 60% جو اس کا وزن ہے یہ وہ جو 40% نقصان دینے والا تھا یہ اس کا کفارہ بن جاتا ہے۔یہ ہے غَافِرِ الذَّنْبِ (40:3) کہ اگر کسی وقت کوئی لغزش ہوگئی ہے' اس کے نقصان سے بچنے کا امکان ہے۔یہودیت میں امکان نہیں ہے' عیسائیت میں اعمال کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔اگر ساتھ میں حضرتِ عیسیٰؑ کے کفارے پر ایمان لے آئے ہیں تو بخشش ہے۔یہاں یہ صورت ہے کہ انسان سے لغزش ہوسکتی ہے۔قرآن کریم نے تو آدم کا پہلا تعارف لغزش سے کرایا ہے۔تو لغزش تو ہوسکتی ہے لیکن لغزش سے جو نقصان پہنچنے والا ہے اس سے حفاظت ہوسکتی ہے بشرطیکہ تم اس سے زیادہ کوئی وزن دار نیک کام کرو۔

اب میں نے یہ نیک کا لفظ کہہ دیا۔تعمیری کام' بھلائی کا کام۔قرآنِ کریم کی رو سے نیک کسے کہتے ہیں' نیکی کس کو کہتے ہیں؟ یہ

سمجھنے کی بات ہے۔ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (13:17) جو کچھ تم نوعِ انسان کی بھلائی کے لیے کرو گے اسے نیکی کہا جائے گا۔ کہا کہ ''بقا اس عمل کے لیے ہے جو نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے' بہتری کے لئے' تعمیر کے لئے' کیا جائے''۔ مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ ۔ منفعت ہے۔ کوئی لغزش ہوئی ہے اس کا کچھ نقصان ہونا ہے۔ ایسے کام کرو کہ وہ نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہوں۔ تم بھی اس کے اندر آ جاؤ گے۔ تمہارے اس کام کا وزن اتنا بڑا ہوگا کہ وہ جو تمہاری لغزش سے نقصان ہونے والا تھا یہ جو اس بوجھ کا وزن اتنا زیادہ ہے وہ اس کا کفارہ ادا کر دے گا۔ یہ ہیں غَافِرِ الذَّنۡبِ (40:3) کے معنی۔ بخشنے والا نہیں' بخشش کا تصور نہیں ہے۔ انسان اپنے عمل سے اپنے خلاف کچھ کام کرتا ہے خود اپنے ہی دوسرے قسم کے منفعت بخش عمل سے اس کا ازالہ کر سکتا ہے۔

قانونِ مکافاتِ عمل کی ماہیت اور لفظ توبہ کا حقیقی مفہوم

Law (قانون) کے اندر یہ Provision (گنجائش) رکھ دی گئی ہے۔ قانونِ مکافاتِ عمل اس قدر سخت نہیں بنایا گیا کہ ایک دفعہ اگر لغزش ہوئی ہے تو اس کے نقصان سے کسی صورت میں بچاؤ کی کوئی شکل ہی نہ پیدا ہو سکے۔ انسان سے لغزش ہوئی۔ اس لغزش کے نقصان سے محفوظ رہنے کا ذریعہ بھی انسان خود ہے' باہر سے کوئی نہیں اس کو بخش سکتا۔ وہ آپ کو نیٹشے (18441900ء) کا قول یاد ہوگا جو میں اکثر دہرایا کرتا ہوں۔ وہ بڑی اہم بات کہہ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ (مثلاً) کسی نے اس کو کچھ نقصان پہنچایا اور کہا کہ مجھے معاف کر دیجیے تو وہ کہتا یہ ہے کہ جو تم نے مجھے نقصان پہنچایا ہے اسے تو میں معاف کر دوں گا لیکن اس سے جو تم نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا ہے اسے کون معاف کرے گا۔ یہ اپنے آپ کو جو نقصان پہنچایا جاتا ہے انسان آپ ہی اس کا ازالہ کر سکتا ہے' کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ کتنی ماںتا والی ماں کیوں نہ ہو' بچے کے پیٹ میں درد ہے تو بچے کو دوا پلانے سے ہی آرام ہوگا۔ یہ بنیادی چیز ہے۔ اب دیکھیے غَافِرِ الذَّنۡبِ کی تفسیر اگلے دو لفظوں کے اندر خود آ جاتی ہے' اس کے معنی خود آ جاتے ہیں۔ کہا ہے کہ قَابِلِ التَّوۡبِ (40:3)۔ اب ہمارے ہاں تو پھر اگلی بات آئی کہ ''توبہ قبول کرنے والا''۔ ادھر سے گناہ کیا' لغزش کی اور پھر اس کے بعد کہا کہ یا اللہ! میری توبہ ''بس' یا اللہ! میری توبہ کہیا تے فیر توبہ ہوگئی'' (بس' یا اللہ! میری توبہ کہا تو پھر توبہ ہوگئی)۔ میں پھر عرض کرتا ہوں کہ مروجہ مفہوم کو ذہنوں سے نکال لیے اور دیکھیے کہ یہ لفظ کیا ہیں اور کیا معنی رکھتے ہیں۔ عربوں کے ہاں اس کے معنی یہ تھے کہ آپ راستے پہ چل رہے ہیں' آگے چل کر چوراہے پہ جہاں سے صحیح راستے کی طرف مڑنا تھا' وہاں سے غلط راستے پہ مڑ گئے۔ کچھ دور جا کر آپ کو احساس ہوا کہ یہ راستہ نہیں ہے یا کسی سے پتہ کیا تو انہوں نے کہا کہ سڑک تو وہی تھی جس پہ تم نے اس گاؤں کے لیے جانا تھا۔ اب وہاں جانے کے لیے آپ کو کیا کرنا پڑے گا؟ یہ جتنا غلط راستہ آپ نے طے کیا ہے' آپ کو اس چوراہے پہ لوٹنا پڑے گا جہاں سے غلط راستے پہ مڑے تھے۔ یعنی اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں

ہے کہ آپ وہاں واپس آئیں جہاں سے قدم غلط راستے کی طرف مڑا تھا۔ یہ بھی کرنے کا کام ہوا۔ یعنی جتنی غلطیاں آپ کر گئے ہیں ان کو پہلے Undo (ختم) کیجیے۔ واپس آنے کے معنی تو یہ ہوئے کہ جتنے قدم غلط سمت کی طرف اٹھے تھے اس سے الٹی سمت کو وہ قدم اٹھیں تو اس کے معنی یہ ہو گئے کہ وہ جو اس سے پہلے آپ نے وہاں تک جانے میں غلطیاں کی تھیں پہلے آپ ان کو Undo (ختم) کیجیے اور وہاں پہنچیے۔ اب آپ کا حساب برابر ہوا۔ آپ کے پاس کوئی چیز ابھی Positive (مثبت) نہیں آئی۔ صرف وہ جو غلطیاں ہوئی تھیں ان کو آپ نے محو کیا ہے' Undo (ختم) کیا ہے۔ اب As you were (جیسے آپ تھے) ہوئے۔ اب یہاں سے آپ نے صحیح راستہ اختیار کیا۔ تو یہ جو غلط راستے پر چل کر اپنی غلطیوں کو Undo (محو) کر کے پھر اس مقام پہ آ جانا' جہاں سے آپ غلط مڑے تھے اس کو توبہ کہتے ہیں۔ وہاں واپس آنا پڑتا ہے۔ تو آپ کو تو خود ہی واپس آنا پڑے گا' خود آپ ہی Undo (ختم) کرنا پڑے گا۔

سوچ لیجیے کہ اس کے اندر ہر فرد اپنے ہر عمل اور ہر ارادے اور ہر نیت کا مسئول ہے۔ کوئی دوسرا اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ وہاں اس غلط جگہ پر کھڑے رہیے اور کسی کو آٹھ آنے دے کر بھیج دیجیے کہ صاحب! میں میل بھر غلط آیا ہوں تم ذرا وہاں تک چلے جانا۔ تو کیا آپ صحیح راستے پہ پہنچ جائیں گے؟ عزیزانِ من! آپ کو تو خود ہی چلنا پڑے گا۔ ٹھیک ہے بظاہر یہ نظر آ رہا ہے کہ بڑی سخت سی چیز ہے۔ میں کہتا ہوں یہی چیز اس کی رحمت ہے کہ اس نے یہ Provision (گنجائش) رکھی ہے کہ تم واپس آ کر پھر صحیح راستے پہ جا سکتے ہو۔ یہودیت کے تصور میں یہ Provision (گنجائش) نہیں تھی' ایک دفعہ ہوا تو ختم۔ وہاں پھر اس کے بعد اپنے جو بڑے بزرگ تھے ان کی شفاعت سے وہ کہتے تھے کہ ہم جنت میں جائیں گے۔ شفاعت کا تصور وہاں (یہودیت) کا ہے۔ وہ کہتے تھے ایک دفعہ جو غلطی ہوئی' ہو گئی' اس کا ازالہ ہی نہیں ہو سکتا۔ وہاں پھر وہی شفاعت کا تصور آ گیا۔ عیسائیت نے کہا کہ کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ غلط چلے جا رہے ہو چلے جاؤ۔ حضرتِ عیسیٰؑ خود تمہیں صحیح راستے پر لے جائیں گے۔ وہاں واپسی کا ہی تصور ہے۔ قرآن کریم کے اندر یہ تصور ہے کہ اگر ایک دفعہ غلطی ہو گئی ہے تو تم For ever Condemn (ہمیشہ کے لیے مطرود) نہیں ہو گئے بلکہ تمہارے لیے گنجائش ہے کہ اپنی غلطیوں کو Undo (محو) کرو اور اس کے بعد پھر وہیں آ جاؤ جہاں سے غلط قدم اٹھا تھا۔ اب صحیح راستے پہ چلو۔ اگر نہ چلو گے تو شَدِيْدِ الْعِقَابِ (40:3) ہے۔

لفظِ عقاب کا لغوی مفہوم ''کسی کے عمل کا نتیجہ پیدا کرنے کے لیے اس کا پیچھا کرنا'' ہے

کیا بات ہے اس کے اس لفظ عِقَابِ کی! تم نے سمجھ لیا کہ وہاں سے ہم نے جو یوں دوسرا راستہ اختیار کر لیا تو بس ٹھیک ہے' اب ادھر تو کوئی آئے گا ہی نہیں۔ عِقَابِ کے معنی ہوتا ہے ''کسی کے پیچھے پیچھے جانے والا''۔ کہنے لگا وہ بڑی تیزی سے پیچھے چلا کرتا ہے۔

جہاں جاؤ وہ تمہارا پیچھا کیا کرتا ہے۔عمل کا نتیجہ Follow (تعاقُب) کیا کرتا ہے۔اور پھر بڑی سختی سے گرفت کرتا ہے اگر واپس نہیں آتے۔آگے کہا ہے کہ ذِی الطَّوْلِ (40:3) جاؤ تو' کہاں تک جاؤ گے۔جہاں تک جاؤ گے وہ تمہارا پیچھا کرے گا۔آپ نے غور فرمایا کیا صفات بیان ہو رہی ہیں! یہ کہ غَافِرِ الذَّنْبِ بھی ہے' قَابِلِ التَّوْبِ بھی ہے' شَدِیْدِ الْعِقَابِ بھی ہے' ذِی الطَّوْلِ بھی ہے۔اور کہا یہ سب اس لیے ہے کہ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ (40:3) اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔کوئی اور ہو تو پھر اس کے ساتھ یہ کچھ کرلے کہ چلو ان کو کسی طرح سے بخشوا بھی دو' معافی بھی دیدو' کچھ اپنی طرف سے دو چار جوتے ہی مار دو کہ چلو جی! قصہ ختم ہوا۔کہنے لگے کہ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔وہاں تو صرف اس کا قانون چلتا ہے' کسی دوسرے کا قانون چلتا ہی نہیں ہے۔لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ (40:3)۔وہاں تو کہا تھا کہ پیچھا کر رہا ہے۔یہاں کہا ہے کہ پیچھا کیا کر رہا ہے! ''تم نے تو ہیر پھیر کے آنا ہی وہیں ہے''۔اس نے کہا ہے کہ ایک دن مفرور مجرم' اشتہاری ملزم' نے خود اس عدالت کے اندر آنا ہے۔یہ مکافاتِ عمل ہے۔کہنے لگا کہ بات کتنی صاف ہے جو ہم نے کہی ہے لیکن مَا یُجَادِلُ فِیۡۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا (40:4) ٹھیک ہے ہم یہ جو کچھ قانون بیان کر رہے ہیں اس میں جھگڑا وہی لوگ کرتے ہیں جو پہلے سے طے کر لیتے ہیں کہ ہم نے ماننا ہی نہیں ہے۔

جس طرح انسان کا کافر یا مومن کے گھر میں پیدا ہونا اس کے بس کی بات نہیں' اسی طرح عمل کا نتیجہ بھی اس کے بس میں نہیں

کفر اور ایمان یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گئے تو یہ ایمان ہو گیا' غیر مسلم کے گھر میں پیدا ہو گئے تو یہ کفر ہو گیا۔ایمان کچھ کرنے کا کام ہے' اسی طرح کفر بھی کچھ کرنے کا کام ہے۔یہ کَفَرَ' یہ اٰمَنَّا Verb (فعل) ہے۔پیدائش کے ساتھ تو دونوں بچے یکساں پیدا ہوتے ہیں۔نہ وہ کافر ہوتا ہے نہ یہ مومن ہوتا ہے۔اس کو اپنی زندگی میں مومن بننا پڑتا ہے' اُسے کافر ہونا پڑتا ہے۔ہر سچائی کو اختیار کرنا اور اس کے مطابق عمل کرنا مومن بننا ہے۔سچائیوں کا انکار کرنا اور اس کے خلاف چلنا کفر ہے۔کہا کہ یہ لوگ جو یہ طے کر لیتے ہیں کہ ہم نے صحیح راستے پہ نہیں چلنا' غلط راستے پہ ہی چلنا ہے' دھاندلی کرنی ہے' قانون شکنی کرنی ہے' رشوت خوری کرنی ہے' ان کے سامنے یہ قوانین جتنے جی چاہے پیش کرو' یہ اس کے خلاف جھگڑے نکالیں گے۔یہ وہ لوگ ہیں۔لہٰذا بات یہ ہے کہ پہلے سے ہی طے نہ کر لیا جائے کہ میں نے یہ ماننا نہیں ہے۔بات کو دیکھو' اس کو آن میرٹ پرکھو۔ماننے کی بات ہے تو مانیے' نہیں ماننے کی' تو چھوڑ دیجیے۔پہلے سے ہی طے کر لینا تو کفر کی ذہنیت ہے۔قرآن حکیم کہتا ہے کہ وہ اس لیے اس پر اڑے رہتے ہیں اور جھگڑے کرتے ہیں کہ اس سے ان کو مفادِ عاجلہ حاصل ہو جاتے ہیں' کوٹھیاں بن جاتی ہیں' بڑے بڑے سامان مل جاتے ہیں۔ساری عمر تیس سال تک جھک

جھک کر لیجیے۔ سو روپے سے شروع کیا تو ڈیڑھ روپے سالانہ ❶ ترقی ہوئی۔ پچیس سال کے بعد ڈیڑھ دو سو روپے تنخواہ ہوگئی۔ اس میں سے روٹی نہیں نکلتی، کرایہ نہیں نکلتا۔ اور دوسرے مقام پہ دیکھیے تین سال کے اندر تین چار کوٹھیاں بن گئی ہوتی ہیں۔ کہا کہ یہ چیزیں انسان کو دھوکے میں رکھتی ہیں۔ یہاں تو رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے لیکن وہ ہمارے ہی لیے ہے۔

آگے کہا ہے کہ فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ (40:4) ان کا اس طرح سے شہروں اور بستیوں میں تصرف اور قبضے پہ قبضہ حاصل کیے چلے جانا تمہیں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ کردے کہ راستہ تو یہی ٹھیک ہے۔ ہمارے ہاں روز یہ ہوتا ہے کہ میاں! تم نے دیانتدار بن کر کیا کمالیا۔ یہ ہے غلط فہمی میں مبتلا ہونا کہ تمہیں ملا کیا۔ چلو تم ادھر کو ہوا ہے جدھر کی۔ دو چار فقرے کہے اور سب جائز ہوا۔ کہا کہ دیکھیے! یہ بات تمہیں کہیں غلط فہمی میں مبتلا نہ کردے۔ اس وقت تو یہ نظر آتا ہے کہ واقعی غلط نظام سے، غلط روش سے، مفاد پہ مفاد حاصل ہوئے چلے جاتے ہیں لیکن انجام بھی تمہیں معلوم ہے کہ کیا ہوا کرتا ہے؟ اور انجام کے لیے وہ ہمیشہ اقوامِ سابقہ کی داستانیں پیش کرتا ہے۔ طریقہ ہی یہ ہے ورنہ جس کو اس طرح سے چڑھتا ہوا سب کچھ نظر آ رہا ہے اور ملتا چلا جا رہا ہے اس کو سمجھانے کا کوئی جملہ اور ہے ہی نہیں بجز اس کے کہ تمہارے جیسا اس سے پیشتر کرنے والا جو تھا تم نے اس کا انجام دیکھ لیا کہ کیا ہوا تھا۔ تو یہ تو ہے نہیں کہ اس کے ساتھ یہ ہوا تھا تمہارے ساتھ نہ ہو۔

حق کو پھسلا کر اور باطل کو لا کر انجام تو دیکھو کہ کیسا رہا

یہاں یہ کہا ہے کہ یہ کچھ تمہیں غلط فہمی میں مبتلا نہ کردے۔ ان سے کہو کہ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ (40:5) دیکھو! اقوامِ سابقہ اور انبیائے گزشتہؑ کی داستانیں پڑھو، ان میں سے بھی ہر ایک کے ساتھ یہ ہوا۔ وَجَادَلُوْا ان کے ساتھ ٹکراؤ ہوا۔ جتنے بھی غلط روش پہ چلنے والے لوگ تھے اُنہوں نے اِن تمام کو جھٹلایا، یہ سب کچھ اِن سے کیا۔ وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ (40:5) اُنہوں نے اِن کو غلط پروپیگنڈے سے مغلوب کرنا چاہا لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ (40:5) تاکہ حق کو اپنے مقام سے پھسلا دیں۔ حق کہتے ہی اس کو ہیں جو اپنے مقام پہ محکم کھڑا رہے۔ حق کے لیے یہ بڑی ضروری چیز ہے۔ وہ جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30) جنہوں نے ایک دفعہ یہ اعتراف کرلیا کہ یہ ٹھیک ہے، رب وہی ہوسکتا ہے اور اس کے بعد پھر وہ جم کر اس چیز پر کھڑے ہوگئے۔ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (41:30) ان کے اوپر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ استقامت شرط ہے۔ ایک دفعہ حق کو حق مان لینے کے بعد معاملہ ختم

---

❶ یاد رہے کہ یہ بات جنوری 1981ء کی 16 تاریخ کو کہی گئی تھی جب سالانہ ترقی اتنی ہی ہوتی تھی۔

نہیں ہوجاتا' یہ تو عمر بھر استقامت سے اس کے اوپر کھڑے ہونے والی بات ہے۔ کہا ہے کہ اُن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ جم کر نہ کھڑے رہیں' پھسل جائیں۔ ترغیب دلا کر' کشش دلا کر' دھکا دے کر' کسی طرح سے ان کے قدم اس مقام سے اکھیڑ دیئے جائیں۔ یہ جتنے بھی استبداد اور غلبہ کے باطل پرست ہیں' ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ دیانتدار اور ایماندار کے قدم وہاں سے اکھیڑ دیئے جائیں۔ اس کے لیے ہر حربہ اختیار کرتے ہیں' ہر طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ بڑی سخت آزمائش ہوتی ہے۔ کیا بات ہے! باطل کے حربے استعمال کر کے حق پرست کے پاؤں کسی طرح سے اکھیڑ دیئے جائیں' اس کو کسی طریقے سے پھسلا دیا جائے۔

عزیزانِ من! اسلام کی ساری داستان یہی ہے' انسان کی داستان ہی یہ ہے کہ کسی طرح سے اسے حق سے پھسلا دیا جائے۔ کہا ہے کہ **فَاَخَذْتُهُمْ** (40:5) انہوں نے تو یہ کوششیں کیں لیکن ہم نے یعنی خدا کے قانونِ مکافات نے اُن کو پکڑا۔ ساری تاریخ انسانیت آپ دیکھ لیجئے' ظلم اور استبداد' سلب اور نہب' استحصال اور Exploitation کرنے والوں کا انجام' آپ پوری تاریخِ انسانیت کے اندر دیکھیے' تباہی نظر آئے گی۔ یہ ہے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل۔ ابھی میں عرض کروں گا کہ یہ کس طرح سے کارفرما رہتا ہے۔ کہا ہے کہ **فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ** (40:5) آہاہا! وہاں **شَدِيْدِ الْعِقَابِ** (40:3) کہا تھا۔ اب کہا کہ پھر یہ پوچھو کہ ہم جو ان کو Follow (تعاقب) کر رہے تھے' ہمارا یہ Follow (تعاقب) کرنا کیسا رہا۔ یہ تو الفاظ ہی یہ ہیں ''کیوں بھئی! ہم نے جو تمہارا پیچھا کیا تھا کہیے کیسا رہا!'' **فَاَخَذْتُهُمْ** (40:5) پکڑ لیا جا کر۔ اس پکڑنے کے بعد پوچھتے ہیں کیوں بھئی! ہم جو پیچھے آ رہے تھے سناؤ! کیسا رہا۔

ایران اور روما کی مملکتوں کے زوال میں رومن امپائر کی تاریخ قرآنی حقائق کا واضح ثبوت ہے

یہی چیز ہے جہاں انسان کی بھول ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ کوئی میرے پیچھے آ رہا ہے' کوئی مجھے پکڑ سکتا ہے۔ کہا ہے کہ جس طرح سے یہ پہلے اقوامِ سابقہ کے ساتھ ہوا' سنو! **وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا** (40:6) اس طرح سے خدا نے جو بات کہی تھی' اس کے قانون میں جو کہا گیا تھا کہ غلط کوشی کا نتیجہ تباہی ہے' وقتی طور پر کتنی ہی کامیابیاں تم کیوں نہ حاصل کر لو' وہ فریب نفس ہے' خدا کی بات آخر الامر سچ ہو کر سامنے آتی ہے۔ تاریخ انسانیت اسی نتیجے پہ پہنچاتی ہے۔ (Edward Gibbon 1737-94ء) کی جو تاریخِ روما ہے وہ تاریخوں میں تفصیل کے اعتبار سے' میں سمجھتا ہوں' بڑے اچھے مقام کی چیز ہے' اس میں صرف واقعات ہی نہیں دیئے۔ اس کا نام ہے:

"The History of the Decline & Fall of Roman Empire(1776-88)"

رومن امپائز دنیا کی تاریخ میں ایک بلند ترین وسیع امپائر ہے۔ایرانی مملکت اور رومن مملکت' دو ہی مملکتیں ہیں جن کی تاریخ اتنی لمبی ہے۔ اس نے جواس کی تاریخ لکھی ہے تو صرف واقعات ہی نہیں لکھے بلکہ لکھا یہ ہے کہ کہاں کہاں ان سے کس قسم کی لغزشیں ہوئیں اوران کے نتائج کس طرح مرتب ہوئے۔قرآنِ کریم نے Semitic Race (سامی اقوام) کی جو قومیں تھیں انہی کا ذکر کیا ہے۔ان کی تاریخ بھی اب ہمارے سامنے آتی چلی جارہی ہے۔کہا ہے کہ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ(40:6) (تیرے رب کی وہ بات جوان سے کہی جاتی تھی کہ ان قوانین کی خلاف ورزی کا نتیجہ' تباہی اور بربادی ہوگا' حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ گئی اوران کی سعی وعمل کی کھیتیاں جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئیں۔یہی کچھ اِن لوگوں کے ساتھ ہوگا کہ) وہ آخرالامر تباہی میں رہیں گے۔ تاریخ یہ بتارہی ہے۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں مفکرِ قرآن علامہ پرویزؒ کے تیس چالیس سالہ غور وفکر کی روشنی میں کچھ کائناتی قوتوں کا تذکرہ

اب ان کے برعکس ایک دوسری جماعت آتی ہے۔عزیزانِ من! یہ دوتین آیتیں ہیں' یہ بہت زیادہ غور طلب ہیں۔میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ عالمِ محسوسات میں جو کچھ ہورہا ہے اس کا سمجھ لینا مشکل نہیں ہے۔وہ حواس (Senses) کی زد میں آتا ہے۔اگر آج یہ کچھ نہیں سمجھا گیا تو کل سمجھا جائے گا۔ماورائے حواسِ انسانی (Meta Physics) سے متعلق کی کنہ اور حقیقت کا معلوم کرنا ہمارے بس کی بات نہیں' اس کا کچھ اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے۔

ایک چیز ہے جسے ملائکہ کہا جاتا ہے' جس کا ترجمہ فرشتے کیا جاتا ہے۔قرآنِ کریم کے تیس چالیس سال کے مطالعہ نے مجھے جس نتیجے پہ پہنچایا اس میں یہ ہے کہ ملک کے معنی ''قوت'' ہوتی ہے۔ایک تو یہ قوتیں ہیں جو اس کائنات میں' Nature میں' فطرت میں' کارفرما ہیں۔وہ کسی بھی انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہیں (مثلاً یہ) کہ سورج اپنے وقت پہ چڑھ کر اتنی روشنی دیتا ہے' اتنی حرارت دیتا ہے۔یہ خدا کی تخلیق کردہ ہیں۔یہ تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ سورج کتنے وقت پہ چڑھے گا' طلوعِ آفتاب کا سیکنڈ تک بتایا جاسکتا ہے۔یہ کیوں ایسا ہوتا ہے ہم نہیں سمجھ سکتے۔محسوس شے کو تو سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کس طرح ہوتا ہے۔اس کو کون پیچھے سے چلا رہا ہے یہ ہم نہیں سمجھ سکتے۔قرآنِ مجید نے ان قوتوں کے لیے بھی' جو محسوس کائنات میں خدا کے امر یا پلان کو بروئے کار لاتی ہیں' ملائکہ کہا ہے۔فطرت کی قوتیں اس اعتبار سے ملائکہ کے زمرے میں آتی ہیں لیکن ملائکہ کا ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق خدا کے اس عالمِ امر سے ہے جو محسوس کائنات سے ماورا ہے۔جہاں یہ پلان بنتا ہے' جہاں یہ پروگرام بنتے ہیں' جہاں یہ قوانین بنتے ہیں' وہاں وہ کچھ طے ہوتا ہے۔ملائکہ کا

یہ ایک حصہ‘ قرآنِ کریم کی روسے‘ عالمِ امر سے متعلق ہے۔ وہاں یہ کیا ہوتا ہے اور کیسے ہوتا ہے‘ ہم نہیں سمجھ سکتے۔ ملائکہ کا دوسرا حصہ عالمِ محسوس سے ہے وہ چیز جب عالمِ محسوس میں آتی ہے پھر ہماری سمجھ میں وہ بات آتی ہے۔ یہ دو چیزیں ہیں اور ان دونوں چیزوں کو سامنے رکھنے سے قرآن مجید میں جہاں جہاں ملائکہ آیا ہے‘ وہاں بات سمجھ میں آتی ہے۔ ملائکہ میں سے وہ ہیں جو خدا کا امر یا خدا کی وحی ان انبیا تک لاتے ہیں۔ یہ حصہ عالمِ امر سے ہے۔ ہم یہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ وحی کی کنہ وحقیقت کو نہیں سمجھ سکتے تو یہ کیسے سمجھیں کہ وہ فرشتہ کیا ہے جو لاتا ہے۔ یہ میٹافزکس (ماورائے طبیعات) ہے لیکن اس کائنات سے ان کا جو تعلق ہے‘ وہ قرآنِ کریم پر غور وفکر کرنے سے سمجھ میں آتا ہے۔ یہ قرآنِ کریم میں بعض مقامات پر آیا ہے۔

جنگِ بدر اور جنگِ حنین کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ ”اے رسول! تو ملائکہ کو دیکھ نہیں سکتا“ اور سورۃ الزمر میں یہ بھی کہ ”ملائکہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔“

یہ جو پچھلی سورۃ (الزمر) کے آخری الفاظ تھے‘ اس میں یہ بات آئی تھی جسے میں نے وہاں نہیں بیان کیا تھا۔ وہاں کہا تھا کہ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (39:75) تُو ملائکہ کو دیکھے گا کہ وہ عرشِ خداوندی کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ یہاں سے ایک بات ذہن میں آتی ہے‘ وہ غور سے سنیے گا۔ یہ ہے تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ (39:75) کہ تُو دیکھے گا۔ اور ملائکہ جو بدر ❶ اور حنین ❷ کے میدانوں میں ان مجاہدین کی نصرت اور تقویت کے لیے آئے تھے‘ ان کے متعلق قرآن حمید نے خود رسول اللہ ﷺ سے کہا ہے کہ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے جُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا (9:26;9:40;33:9)۔ تو گویا ایک وہ کیفیت ہے کہ جنہیں دیکھا نہیں جا سکتا۔ یہاں (39:75) وہ ہیں جنہیں وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ (39:75) دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کیا ہیں؟ ملائکہ تو وہ قوتیں ہیں۔

نظامِ زندگی کے سلسلہ میں عقل اور وحی کے وضع کردہ طریق میں فرق

میں نے عرض کیا ہے کہ ایک تو یہاں یہ جو ظلم اور استبداد کا نظام اٹھتا ہے‘ ٹھیک ہے‘ یہ انسانوں کی جماعتوں کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ دوسرا‘ یہ جو کائناتی قوتیں ہیں‘ جن کو زمانے کے تقاضے کہتے ہیں‘ وہ بھی غیر محسوس طور پر‘ انسان کو اس طرف لاتی ہیں‘ جس طرف صحیح راستہ جا رہا ہوتا ہے۔ یہ Trial & Error (سعی وخطا) انسانیت کا تجرباتی طریق ہے۔ انسانی عقل ایک فارمولا‘ ایک پروگرام‘ ایک نظام‘ وضع کرتی ہے۔ اس پہ چند قدم چلتی ہے‘ ٹھوکریں کھاتی ہے‘ نقصان اٹھاتی ہے‘ ہڈیاں تڑواتی ہے۔ پھر سوچتی ہے کہ یہ غلط

---

❶ سترہ رمضان 2ھ مطابق 13۔ مارچ 624ء کو لڑی گئی۔

❶ جنگِ حنین شوال 8ھ کو لڑی گئی۔

ہے' پھر واپس آتی ہے' پھر دوسرا پروگرام لیتی ہے' اس پہ چلتی ہے۔اس طریق پہ چل کر بھی ایک دن وہ صحیح راستے پر پہنچ جاتی ہے لیکن یہ بڑا لمبا راستہ ہے۔اور اس میں انسان کے جتنے نقصانات ہوتے ہیں' اس سے انسان دلبرداشتہ ہو جاتا ہے۔وحی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پہلے دن بتا دیتا ہے کہ یہ صحیح راستہ ہے۔یعنی وحی Trial & Error (سعی وخطا) کے راستے سے صداقت تک نہیں پہنچاتا بلکہ وہ پہلے دن چوراہے پہ کھڑا ہو کر بتا دیتا ہے کہ یہ راستہ شہر کو جاتا ہے۔اور جو یہ طریقہ اختیار نہیں کرتا وہ پھر کبھی اُس راستے پہ جاتا ہے' پھر واپس آتا ہے' کبھی اس راستے پہ جاتا ہے' پھر واپس آتا ہے۔یہ ہے جو عقل کا طریقہ ہے۔یہ جو وحی کے ذریعے سے صحیح راستے کا مل جانا ہے جو قوم اسے اختیار کرے گی وہ ان تمام لغزشوں سے' تباہیوں سے' نقصانات سے' بچ جائے گی جو Trial & Error (سعی وخطا) کی رو سے ہونا ہے۔دوسری قومیں اس راستے سے چلی جا رہی ہونگی اس میں یہ چیزیں ہیں جنہیں زمانے کے تقاضے کہتے ہیں۔

عالمِ اسلام میں مسلمانوں کی حالتِ زار کی وجہ ان کے خودساختہ قوانین ہیں' اسلام کا عطا کردہ ضابطۂ حیات نہیں ملاحظہ ہو''کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟''

یہ عجیب چیز ہے کہ زمانے کے تقاضے سے بھی جو قومیں کسی طرف آ رہی ہیں وہ اسی طرف آ رہی ہیں جس طرف وحی نے آنے کے لیے کہا تھا۔میرا ایک مضمون تھا کہ ''کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے[1]''۔یہ جو کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں تو اس نے اپنے نتائج دیئے تھے اور اس کے بعد پھر ختم ہو گیا ہے' نتائج ہی نہیں دے رہا اور مثال تمام عالمِ اسلامی کی' مسلمانوں کی پیش کرتے ہیں تو یہی سمجھانا مشکل ہے کہ بابا! مسلمانوں کی مثال سے اسلام کے متعلق نتیجہ تو برآمد نہ کرو۔اگر ایک لڑکا حساب کا سوال غلط طریقے سے کرتا چلا جاتا ہے تو یہ تو آپ نہ کہو کہ وہ حساب غلط ہے۔وہ حساب کا طریقہ تو صحیح ہے' یہ لڑکا غلط ہے۔لیکن کیا یہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کے حالات سے اندازہ لگا کر کہا جاتا ہے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔کسی زمانے میں تو اس نے نتائج دیئے تھے' اب یہ ختم ہو گیا ہے۔تو میں نے اس مضمون میں یہ بتایا ہے کہ دنیا کی قوموں کا اپنے تجرباتی طریق سے جس طرف قدم اٹھ رہا ہے وہ وہی منزل ہے جو قرآن حکیم نے یا وحی نے مقرر کی ہوئی ہے۔

جشنِ نزولِ قرآن کی تقریب پر علامہ پرویزؒ کے خطاب کے موضوع کی اہمیت اور ہماری کم مائیگی

درمیان میں یہ بات آ گئی۔عیدِ میلادالنبی ﷺ کا جشن مبارک ہے۔یہ جنوری 1981ء کی 19 تاریخ پڑتی ہے۔ہمارا معمول یہ ہے کہ جو کوئی جمعہ اس سے پہلے یا بعد میں آتا ہے' میں اس میں ایک درس اس تقریب کی نسبت سے مخصوص کر لیا کرتا ہوں۔تو یہ آج کا

---

[1] یہ الگ پمفلٹ میں بھی (اردو اور انگریزی میں) شائع ہو چکا ہے۔

درس تو نہیں بلکہ اس کے بعد 23 تاریخ کو جو جمعہ آ رہا ہے' اس جمعہ کو میں نے اسے اس تقریب سے متعلق خطاب یا درس کے لیے مخصوص کیا ہے۔تو 23 تاریخ کے جمعہ کو جو ساڑھے نو بجے یہاں ہمارا اجتماع ہوگا یا درس ہوگا' میں نے اس کا عنوان ہی یہ رکھا ہے کہ ''دنیا نظام محمدی ﷺ کے لیے بیتاب ہے''۔ یہ ہمارا قصور ہے کہ ہم ان کو بتا نہیں سکتے کہ تم جس چیز کے لیے شدت سے بیتاب ہو اور انتظار کر رہے ہو' وہ اس نظامِ محمدی ﷺ کے اندر موجود ہے۔ہم ان کو نہیں بتا رہے۔ہمیں دیکھ کر وہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ یہ بھی صحیح راستہ ہوسکتا ہے لیکن وہ اپنے عقل کے تجرباتی طریق سے ٹھوکریں کھا کھا کر جس مقام پہ پہنچے ہیں وہاں کے دانشور کسی ایک نظام کے لیے چلا رہے ہیں۔آپ حیران ہونگے کہ ان کو معلوم نہیں ہے کہ ہم یہ کیا کہہ رہے ہیں اور کونسا نظام چاہتے ہیں؟ جس کے لیے چلا رہے ہیں۔ وہ نظامِ محمدی ﷺ ہے۔نہ ان کے سامنے یوں آیا' نہ ان کے سامنے ہم نے پیش کیا۔وہ تو ہماری حالت سے اندازہ لگا رہے ہیں کہ یہ نظام جس کا نتیجہ یہ کہ یہ لوگ آج روٹی کے لیے ہمارے محتاج ہیں۔توبہ توبہ توبہ۔یہ ہے ایک طریقہ۔اسے کہتے ہیں کہ یہ کائناتی قوتیں' ملائکہ بھی یہ کچھ کرتی ہیں۔

قرآنی نظامِ حیات کے لیے استعمال ہونے والی اصطلاحات کا اپنا الگ ایک مفہوم ہے: تحت اور کرسی کی مثال

ایک لفظ میں قرآنِ کریم نے ایک اور طریق بتایا ہے۔وہ کہتا یہ ہے کہ ایک جماعت پیدا ہو جاتی ہے جو نظامِ خداوندی کو قائم کرتی ہے۔اس کے لیے اس نے جو اصطلاحات استعمال کی ہیں وہ دنیاوی نظام اور دنیاوی بادشاہتوں کی ہوسکتی ہیں۔مثلاً ''تختِ حکومت'' ایک اصطلاح ہے۔پہلے تو وہ واقعی ایک تخت بنا ہوا ہوتا تھا خواہ وہ تختِ طاؤس ہی کیوں نہ ہو۔کوئی ایسی چیز' بڑی ساری کرسی' جس پہ آ کر بادشاہ بیٹھتا تھا تو وہ تو اب ختم ہوا مگر Throne کی اصطلاح باقی رہ گئی ہے۔اس کے معنی وہ سچ مچ کا تخت نہیں ہوتا بلکہ Final Authority ہوتا ہے' Final Control ہوتا ہے۔ Loyalty to the Throne کے معنی ہوتا ہے کہ اس حکومت کی جو Final Authority ہے اس کے ساتھ ایفا شعار رہنا۔یہ جو اقتدارِ مطلق ہے' Final Authority ہے' آخری کنٹرول ہے' اس کے لیے قرآنِ کریم میں ''عرش'' کا لفظ آتا ہے جیسا ہمارے ہاں تخت کا لفظ آتا تھا۔محسوس تختوں سے نکل کر ہم بھی اب اس کی معنوی حیثیت تک آ پہنچے ہیں۔ Throne کے معنی اب وہ سچ مچ کی کوئی بہت بڑی کرسی نہیں ہے بلکہ اس کے معنی ''اقتدار'' ہے۔خدا کے متعلق ہے کہ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (7:54;10:3;13:2;25:59;32:4;57:4) تو وہ یہ نہیں ہے کہ واقعی کوئی اس قسم کا وہ تخت بنا ہوا ہے' Throne بنا ہوا ہے جس پر خدا بیٹھا ہوا ہے (معاذ اللہ)۔یہ تو قرآن حمید کے خدا کے تصور کے خلاف ہے۔وہ تو کہتا

ہے کہ **هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ** (57:4) خدا تو تمہارے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی تم ہوتے ہو۔**اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ** (50:16) وہ تو تمہاری رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔تو اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کسی خاص جگہ ایک خاص قسم کا ایک تخت بنا ہوا ہے' اس پر بیٹھا ہوا ہے صریحاً غلط ہے۔ یہ تو ہمارے محدود ذہن نے لامحدود کے متعلق یہ تصور دیا ہے جو کہ غلط ہے۔ وہ نہ کسی مقام میں ہے' نہ کسی مقام پر کوئی تخت ہے' نہ وہ اس تخت کے اوپر بیٹھا ہوا ہے۔

ہمارے ہاں کی تفسیروں میں عرش اور آسماں کے متعلق پائے جانے والے غیر قرآنی تصور کی نوعیت

یہ باتیں ہمارے ہاں کی روایات میں ہیں۔ ان کا ذہن تو محدود تک ہی جا سکتا تھا۔ عرش کے متعلق جو ہمارے ہاں تفسیروں میں آیا ہے اگر آپ اس کو دیکھیں تو نظر آ جاتا ہے کہ یہ محدود ذہن کی فکر ہے۔ یہ حدیث ہے یعنی اس کو حدیث کہا جاتا ہے۔ میں بتاؤں گا کہ اس سے کیا نقصان پہنچا۔ یہ ترمذی ❶ میں زیادہ تفصیل سے آئی ہے' باقی مجموعوں میں بھی ذکر آتا ہے۔ عرشِ خداوندی کے متعلق اس میں لکھا ہے کہ یہ زمین سے لے کر اوپر چلے جائیں تو نو آسمان آتے ہیں۔ ایک تو ان کے ہاں کا نو آسمانوں کا تصور ہی اب تحقیقات نے بتا دیا کہ یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ ان کے نزدیک یہ ہے کہ آپ اوپر چلیے' اس طرح سے طبقاتی طور پہ نو طبقے ہیں' وہ ہر ایک کو آسمان کہتے ہیں۔ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان بہتر تہتر یا چوہتر سال کا فاصلہ ہے۔ یہ اسی طرح سے فاصلہ بتاتے ہیں۔ سال کے معنی یہ کہ تہتر سال میں انسان جتنا چل سکتا ہے ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک اتنا فاصلہ ہے۔ اس قسم کے نو آسمان ہیں۔ یہ میں روایت بیان کر رہا ہوں۔ آخری آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے۔ سمندر کی گہرائی بھی اتنی ہے جتنا بہتر سال کے عرصے میں انسان چلتا جائے۔ اس سمندر کے اندر آٹھ پہاڑی بکرے کھڑے ہیں۔ وہ اتنے بڑے ہیں کہ سمندر کا پانی ان کے گھٹنوں تک آتا ہے۔ ان بکروں کے سینگوں کے اوپر خدا کا عرش ہے اور اس عرش پہ خدا بیٹھا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے آپ کا جوری ایکشن ہے میں سمجھتا ہوں۔ کوئی بری بات نہیں تھی اگر ہم یہ سمجھتے کہ اس دور میں چونکہ علمِ انسانی ابھی بہت محدود تھا تو انہوں نے اپنے اس محدود علم کے مطابق یہ سمجھا

چوں نہ بینند حقیقت رہِ افسانہ زنند

(جو حقیقت کی راہ سے ناواقف ہوتے ہیں' وہ افسانے گھڑتے ہیں) یعنی حقیقت سامنے نہ ہو تو انسان افسانے تراشی کرتا ہے۔ یہ افسانے ہیں۔

ان افسانوں کو نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کرنے کا نتیجہ اور جاری کردہ کفر کا فتویٰ مگر دنیا کو کیا کہیں گے!!!

عزیزانِ من! اگر یہ ہے کہ وہ جو ترمذی[1] کا جامع تھا' یہ اس کا بیان ہوتا تو ہم یہ کہہ دیتے کہ اس نے یہ کہا ہے تو غلط کہا ہے۔ یہ اس

---

❶ یہ مجموعۂ احادیث ہے جو امام ابوعیسیٰ محمد ترمذیؒ (279-209ھ مطابق 910-831ء) نے مرتب کیا۔ آپ جامع ترمذی کہلاتے ہیں۔ آپ کا وطن ترمذ ہے۔ آپ نے تین لاکھ احادیث جمع کیں اور ان میں سے 3115 اپنے مجموعہ ترمذی میں درج کیں۔

کے ذہن کا افترا کردہ افسانہ ہے۔ لیکن جب وہ یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا ہے تو وہاں ہمارے لیے مصیبت آ جاتی ہے۔ جب کہتے ہیں کہ یہ حضور ﷺ کا قول نہیں ہوسکتا تو منکرِ حدیث بن جاتے ہیں' کفر کا فتویٰ لگ جاتا ہے۔ اس کو مانیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو دنیا کو کیا منہ دکھائیں کہ تمہارے رسول کا مبلغِ علم یہ تھا اور اس کا خدا کے متعلق یہ تصور تھا۔ عزیزانِ من! یہ دشواری ہے جو ہمارے ہاں ان روایات نے پیدا کر رکھی ہے ورنہ مجھے خدانکردہ کوئی چاؤ تو نہیں آتا کہ ان کے متعلق یہ کہہ کر کہ یہ اقوال رسول اللہ ﷺ نہیں ہوسکتے ساری دنیا کی دشمنی ''سہیڑ'' (مُول) لوں۔ میری ساری عمر گزر گئی۔ اب عمر کا آخری حصہ ہے۔ انہی مخالفتوں میں ہی گزر گئی لیکن کچھ بھی ہے' میں کس طرح یہ کہہ دوں کہ میرے رسول ﷺ نے یہ فرمایا تھا جو عالم الناس ہیں جو علمِ انسانی کی بلندتریں بلندیوں پر کھڑے ہیں۔ ان کے لیے تو آسان ہوگیا اور انہوں نے عرش کا یہ ترجمہ کر دیا۔ اَلَّذِیۡنَ یَحۡمِلُوۡنَ الۡعَرۡشَ وَمَنۡ حَوۡلَہٗ (40:7) ''عرش اور اس کے گرد جو ہیں وہ ان کو اٹھائے ہوئے ہیں''۔ یہ ترجمہ بھی اسی طرح سے کر دیا۔ آج کی دنیا میں ہم کیا کہیں گے۔ آج کی دنیا نہیں' قرآن حکیم کی تعلیم کے مطابق جہاں اس نے کہا ہے کہ خدا تو تمہاری شہ رگ سے بھی قریب تر ہے' ہر شخص کے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی کوئی ہے' اس کے متعلق کیا کہیں گے۔ خدا کے متعلق جو کہا کہ تم اس کا صحیح اندازہ بھی نہیں لگا سکتے' وہ تمہارے ذہن میں ہی نہیں آ سکتا مگر بتاؤ تو سہی کہ دنیا کو کیا کہیں گے۔

لفظ عرش اور تسبیح کا قرآنی مفہوم

یہ چیز میں سمجھتا ہوں یہ ہے کہ خدا کے اس اقتدارِ اعلیٰ کو اس دنیا کے اندر نافذ کرنے کے لیے' مسلط کرنے کے لیے' یہ جماعت اٹھتی ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جو عرشِ خداوندی کی حامل ہوتی ہے۔ وہ خود عرش پہ نہیں بیٹھتی۔ یہ عرش بڑا عجیب لفظ ہے۔ نظامِ خداوندی میں حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ جو اس حکومت کو قائم کرتے ہیں ان کا اپنا اختیار کچھ نہیں ہوتا۔ کیسی حسین اصطلاح ہے کہ عرش کے اوپر' تخت کے اوپر' یہ جماعت خود نہیں بیٹھتی۔ وہ تو جو عرش ہے وہ اقتدارِ خداوندی کی علامت ہوتا ہے' یہ جماعت اس کو اٹھائے ہوئے ہوتی ہے۔ یہ بڑی خوبصورت تشبیہ ہے۔ یہ وہ جماعت ہے۔ آگے کہا ہے کہ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ (40:7)۔ وہاں تو ان کے لیے آسانی ہوگئی یعنی سَبِّحۡ کے معنی انہوں نے تسبیح کیا کہ وہ اللہ کی حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ ملائکہ کے متعلق تو تصور ہی یہ ہے کہ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ (2:30) یعنی یہ ترجمے آپ دیکھیے کہ ملائکہ نے خدا سے یہ کہا کہ تُو آدم کو خلیفہ بنا رہا ہے اور ہماری یہ حالت ہے کہ ''ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں' تیری پاکی بیان کرتے رہتے ہیں''۔ عزیزانِ من! سَبِّحۡ کے معنی میں بتا چکا ہوں کہ ''یہ کسی مقصد کے حصول کے لیے انتہائی توانائی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے چلے جانا'' ہے جیسا کہ وہ تیراک ہے جس نے First

Stand (پہلا نمبر حاصل) کرنا ہو جس طرح سے وہ لمبے ہاتھوں سے تیرتا ہے' جس طرح سے گھوڑا دو دو پاؤں پہ یوں سرپٹ دوڑتا ہے' اس کو عرب سَبّحُ کہتے تھے۔ یہ تو اس طرح سے قوانینِ خداوندی کو نافذ (Implement) کرنا ہے۔ یہ ہے تسبیح۔

جماعتِ مومنین کا فریضہ اور ان کی عملی زندگی کی وضاحت

یہ جماعت جس کا نظام یہ ہے کہ وہ خدا کے اقتدارِ مطلق کی صرف حامل ہوتی ہے' خود اس کے اوپر نہیں بیٹھی ہوتی۔ بڑی حسین تشبیہیں ہیں۔ پھر یہ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ (40:7) ہے۔ اپنی تعریف کے لیے وہ کچھ نہیں کرتی کہ جہاں جائے سپاس نامہ ان کے حضور گزارا جائے بلکہ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ (40:7) اُس کی ربوبیت کو ایسا عام کرے کہ لوگ کہہ اٹھیں کہ ہاں صاحب! اس کا نظامِ ربوبیت واقعی حمد وستائش کے قابل ہے۔ یہ اس کے لیے اس قسم کی کوشش کرتے ہیں۔

عزیزانِ من! اس لفظ نے خود بتا دیا کہ انسانوں کی جماعت کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ آگے ہے کہ وَيُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ (40:7) وہ اس کی صداقتوں پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔ پھر وہ کیا کرتے ہیں؟ کہا کہ وَيَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا (40:7)۔ یہاں سے وہ بات آئی جو میں کہنے والا تھا۔ ان کا فریضہ اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی جماعت' اپنی قوم' اپنی مملکت' اپنا خطۂ ارض' کو مستحکم رکھتے ہیں بلکہ جہاں جہاں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ان کی صداقتوں پر تو یقین رکھتے ہیں لیکن وہاں وہ کمزور ہوتے ہیں' دبے ہوئے ہوتے ہیں' یہ ان کی حفاظت کا ذمہ بھی لیتے ہیں۔ یہ اگلا پروسیس ہے۔ اور اس کے لیے قرآن حمید نے خود نظیر دی ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے ظلم کو مٹانے کا طریق: مکہ کے مظلوم اور جماعت مومنین کے فریضہ کی مثال اور قیصر وکسریٰ کی بھی

مدینے میں مسلمانوں کی' جماعتِ مومنین کی' مملکت قائم ہوگئی۔ یہ بڑی قوت والی تھی۔ رومن امپائر اور ایران تک کے لیے ان کے دبدبے تھے لیکن مکے میں جو مسلمان رہ گئے تھے' وہ ابھی ان قریش کے استبداد میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ کمزور تھے' قوت نہیں تھی' کوئی حامی وناصر نہیں تھا' مدینے والے وہاں جا نہیں سکتے تھے۔ وہ وہاں مدد کے لیے خدا کو پکارتے تھے کہ ہماری مدد فرما' کسی طرح سے ہمیں ان ظالموں کی بستی سے نکال لے۔ خدا کے لیے کیا مشکل تھا کہ ان کو وہاں سے نکال لے۔ آپ کو معلوم ہے کہ خدا کیا کہتا ہے؟ خدا مدینے کے مسلمانوں کو جن کی حکومت ہے' کہتا ہے کہ او! تم سنتے نہیں ہو' وہ ہمیں پکار رہے ہیں اور تم سوئے ہوئے ہو۔ ہم ہوتے تو کہتے کہ صاحب! آپ کو پکار رہے ہیں' آپ جانیں وہ جانیں''اسی وچ کس طراں آ گئے' تے تسی اپنی ذمہ واری ساڈے سر تے پان ڈئے ہوئے ہیگے او۔ کھان پین نوں بھاگ بھری دھون بھنان نوں جمعہ'' (ہمارا عمل دخل اس میں کیسے ہوا آپ اپنی ذمہ داری ہمارے سر

تھوپ رہے ہیں۔ کھانے پینے کو' عیش ونشاط کو بھاگ بھری اور صفائی دھلائی کے لیے جمعہ خاں۔ واہ کیا کہنے!!)۔ لیکن وہ تو جانتے تھے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں انسانوں کے ہاتھوں سے پوری کرایا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سنتے نہیں ہو! یعنی قرآن کے الفاظ عجیب ہیں کہ سنتے نہیں ہو! کہ وہ ہمیں مدد کے لیے پکار رہے ہیں اور تم بیٹھے ہوئے ہو۔

عزیزانِ من! یہ عجیب نظام ہے۔ اس جماعت کے متعلق تو یہ ہے کہ یہ پہاڑوں کی طرح اٹل اپنے پاؤں پہ جمے ہوئے ہے لیکن اتنا ہی نہیں ہے کہ یہ اپنے آپ تک ہی رہیں بلکہ جہاں سے بھی کسی مظلوم کی آواز آئے اس کی مدد کے لیے پہنچنا بھی ان کا کام ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایران کے کسریٰ اور روم کے قیصر کو جو خطوط لکھے ہیں' عجیب بات ہے کہ ان میں یہ فقرہ ابھی تک موجود ہے اور یہ نظر آ رہا ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کا ہو سکتا ہے۔ کہا تھا کہ ''یاد رکھو! تمہارے ہاں کے کسانوں اور محنت کشوں کے اوپر جو ظلم ہو رہا ہے اس کو اگر تم نے روک نہ دیا تو ان کا بدلہ لینے کے لیے ہم آئیں گے''۔ وہ مسلمان بھی نہیں ہیں۔ سن رکھیے! یہاں تو سوال ہی نہیں ہے کہ مظلوم مسلمان ہے یا غیر مسلم ہے۔ صرف انسان ہے۔ یہ خطوط تھے جس کو کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ان کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ یہ دعوت تھی کہ تمہارے ہاں کے کسانوں اور محنت کشوں کے اوپر جو ظلم ہو رہے ہیں اگر ان کو تم نہیں روکو گے تو انہیں روکنے کے لیے ہمیں آنا پڑے گا۔ یہ فریضہ ہے اس قوم کا جو حاملِ عرشِ خداوندی ہے' اس کے نظامِ حکومت کو قائم کرنے کی ذمہ دار ہے۔ اپنے ہاں محکم اور جہاں سے بھی مظلوم کی' غریب کی' ناتواں کی' آواز اٹھے جس کو استبداد نے کچل کر رکھ دیا ہو' ان کی مدد کے لیے پہنچے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہاں جا کر کرے کیا؟

قرآنِ حکیم کے آخری دو پاروں کی بدرجہ اتم خصوصیات کا ذکر: قرآن مجید شعر نہیں مگر آدمی پڑھتے ہوئے جھوم اٹھتا ہے۔

عزیزانِ من! بہت دور کی بات ہے' ابھی ہم چوبیسویں پارے پہ ہیں۔ خدا کرے کہ مجھے اتنی مہلت مل جائے کہ آخری پاروں تک پہنچ جاؤں۔ آخری پاروں میں قرآن حمید نے اپنی تعلیم کا تت نکال کر رکھ دیا ہے۔ اتنی اتنی چھوٹی چھوٹی سی آیتیں ہیں۔ وہ اتنی Concentrated (مرتکز) ہیں' ان کے اندر اتنا ارتکاز ہے کہ پوچھو نہیں۔ اور پھر الفاظ تو اس قسم کے لایا ہے کہ وہاں جا کر آدمی جھوم اٹھتا ہے۔ یہ چیز کہ یہ وہاں جا کر ان کو صرف ان ظالموں کے پنجے سے چھڑا ہی نہیں دیتے' ان کا کام کچھ اور بھی ہے۔ سورۃ النّٰزِعٰتِ ہے۔ ہمارے ہاں تو ان کے متعلق بھی کہا گیا کہ یہ ملائکہ اور فرشتوں کی باتیں ہیں لیکن نہیں! وہ تو ''حاملینِ عرشِ خداوندی'' (40:7) کی اس جماعت کی باتیں ہیں۔ کیا کہا گیا ہے؟ عزیزانِ من! پہلے سنیے کہ قرآن حمید شعر نہیں ہے' ہے تو نثر ہی' آپ غور کیجیے گا کہ شاعری

کا لطف کتنا آتا ہے۔ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا . وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا . وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا . فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا . فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (79:1-5) آدمی پڑھتے ہوئے جھوم جاتا ہے:

ہے ریاض ایک رندِ مست خرام
نہ پیئے اور جھومتا جائے

نہ سمجھنے کے باوجود ایک نشہ ہے۔

جماعتِ مومنین کا یہ بھی فریضہ ہے کہ مظلوم قوموں کو مستبد قوتوں کے پنجۂ استبداد سے چھڑا کر سطحِ انسانیت پر کھڑا کر دے

کہا ہے کہ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا (79:1) کہتا ہے کہ جماعت مومنین کا فریضہ کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا کہ اتنا ہی نہیں کہ ظالم کو وہاں سے ہٹا دیا اور ان کو چھوڑ دیا کہ لو بھئی! ہم نے وہ کام کر دیا۔ کہنے لگا کہ نہیں۔ ''یہ لوگ وہ ہیں کہ جن کی انسانی صلاحیتوں کو ان مستبد قوتوں نے غرق کر کے رکھا ہوا تھا'' دبا کر رکھا ہوا تھا۔ یہاں ''غرق'' کا لفظ دیکھیے۔ جس کو ''غرق'' کیا جاتا ہے' وہ اتنا دبایا ہوا ہوتا ہے کہ وہ ابھر ہی نہیں سکتا۔ اور پھر جس زمین پہ کبھی سیرابی ہوا اور اس کا پانی نیچے چلا جائے تو وہ اوپر سے بنجر رہ جاتی ہے۔ اس کے ہاں نیچے پانی کی نمی باقی ہوتی ہے' اوپر نہیں ہوتی۔ یہ عرب اس کو بھی ''غرق'' کہتے تھے۔ کہا کہ ''یہ جماعتیں وہ ہیں کہ وہ وہاں جاتی ہیں' مستبد قوتوں کو الگ کرتی ہیں اور پھر یہ نہیں ہے کہ ان کو اپنا محتاج بنا لیتی ہیں کہ ہر وقت یہی دیکھیں کہ یہ آ کر ہماری مدد کرتے رہیں گے۔ نہیں۔ وہ ان کی دبی ہوئی' کچلی ہوئی' غرق کردہ' توانائیوں کو ابھار کر' کھینچ کر' اوپر لاتے ہیں۔''

صاحب! نٰزِعٰتِ کا لفظ عجیب ہے۔ جو نیچے غرق ہو گیا ہو' اس کو کیسے اوپر لاتے ہیں؟ اُسے کھینچ کر لانا پڑتا ہے۔ اس میں اتنی توانائی نہیں ہوتی کہ وہ کچھ مدد سے اوپر آ جائے' اس کو کھینچ کر اوپر لانا پڑتا ہے۔ یہ جو ''وتر'' زمین کے نیچے چلا جاتا ہے اس پانی کو وہاں سے Pumping کے ذریعے اوپر لاتے ہیں۔ کیا لفظ ہیں قرآن مجید کے! کہ یہ قوم پھر ان کی کچلی' دبی ہوئی صلاحیتوں کو کھینچ کر' ابھار کر' اوپر لاتی ہے۔ اس قوم کو سطحِ انسانیت پہ لا کھڑا کرتی ہے اور ہر وقت مستقل طور پہ اپنا محتاج نہیں بنائے رکھتی۔

آگے کہا ہے کہ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا (79:2) آہاہا! نشاط کا لفظ بھی کیا خوبصورت ہے! ''ان کے راستے میں جو انہوں نے گرہیں دے دے کر رکاوٹیں کھڑی کی ہوئی تھیں' وہ ان تمام کو دور کر دیتی ہے اور ان کی آزادی کے راستے کو یہاں سے وہاں تک صاف کر دیتی ہے'' تاکہ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا (79:3) جتنی توانائی سے انہوں نے آگے بڑھنا ہے' یہ وہ اپنی پوری توانائی صرف کرنے

کے قابل ہو جائیں اور راستے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔ فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا (79:4) اور پھر یہ ان تمام قوموں سے آگے بڑھ جائیں۔ اس لیے کہ قرآن مجید نے کہا یہ ہے کہ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (3:139) تم ہی غالب ہو گے اور یہاں کہا کہ تمام اقوام عالم سے تم آگے بڑھ جاؤ گے۔ فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا (79:4)۔ اور یہ اس طرح سے ہوگا کہ فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا (79:5) وہ اپنے معاملات کی تدبیر خود کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

عزیزانِ من! یہ حاملینِ عرشِ خداوندی جو قوم ہے' جو یوں اس کے نظام کا دعویٰ لے کر اٹھی ہے' یہ اپنے ہی ہاں اپنے آپ کو مستحکم نہیں کرے گی بلکہ دنیا بھر کی قومیں کہ جن کو مستبد قوتوں نے اس طرح کچل کر' دبا کر' رکھا ہوا ہے' ان کی صلاحیتوں کو ابھار کر اوپر لے آئے گی۔ یعنی یہ قوم جو قوت والی ہے' جو جا کر ان کو مستبد قوتوں سے چھڑاتی ہے' اس کا عجیب فریضہ یہ ہے کہ ان کی صلاحیتوں کو کھینچ کر ابھارے۔ اس کو اس سطح کے اوپر لائے اور اس قابل بنا دے کہ وہ آپ تدبیر امور کر سکیں۔ پھر دنیا کی دوڑ میں' دوسری قوموں کی ریس میں' ان سب سے آگے بڑھ جائے۔ کہا کہ تمہیں معلوم ہے یہ کرنے کے لیے کیا ہوگا؟ جب یہ قوم وہاں پہنچے گی تو تَرۡجُفُ الرَّاجِفَةُ . تَتۡبَعُهَا الرَّادِفَةُ (79:6-7) یہ آسانی سے نہیں ہوگا' جھٹکے دینے پڑیں گے۔ یہ جب جائیں گے وہ یوں نہیں انہیں چھوڑ دیں گے' جھٹکا دینا پڑے گا لیکن ہر جھٹکا وہ ہوگا کہ جس میں نیچے والا اوپر آ جائے گا اور اوپر والا نیچے آ جائے گا۔ آہاہاہا آہاہاہا! رحمت کا جھٹکا وہی ہے جس میں نیچے والا اوپر آ جائے ورنہ دنیا میں ہوتا ہی یہ ہے کہ جو چھڑانے والے کہیں آتے ہیں' وہ چھڑانے کے بعد پہلے سے بھی زیادہ ظالم اور مستبد ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے یہ ان کے مقابلے میں دبے ہوئے پھر کہتے ہیں کہ اس سے تو وہی اچھا تھا۔ ساری دنیا کی تاریخ یہ کرتی ہے۔ ہر چھڑانے والا آ کر اس طرح سے ان کو پھر نچوڑتا ہے کہ جو چار قطرے خون کے رہ گئے ہوتے ہیں ان کو بھی نچوڑ لیتا ہے۔

یہاں حاملینِ عرشِ خداوندی کی کیفیت یہ ہے کہ وہ آتے ہیں' مستبد قوتوں سے ان کو چھڑاتے ہیں۔ پھر ان کی توانائیوں' صلاحیتوں کو اوپر لاتے ہیں۔ اور ان کو خود مختاری دیتے ہیں' ان کے ہاں مدبراتِ امر خود ہوتے ہیں۔ ایسے ہوتے ہیں کہ دوسروں قوموں سے بھی مسابقت حاصل کر جاتے ہیں۔ اور کہا کہ یہ کام جھٹکے دینے کے بغیر نہیں چلتا۔ اور ہر جھٹکے کا نتیجہ جو بتایا ہے' بڑا خوبصورت نتیجہ ہے۔ کہا کہ پھر پوچھو نہیں کیا ہوتا ہے! قُلُوۡبٌ یَّوۡمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ . اَبۡصَارُهَا خَاشِعَةٌ (79:8-9) ہر جھٹکے سے نیچے اترنے والوں کے دل یوں دھڑک رہے ہونگے کہ اب گئے اب گئے۔ نگاہیں ہونگی کہ ندامت کے مارے زمین میں گڑی ہوئی ہونگی۔ یہ کیفیت ہو جائے گی۔ کیا بات ہے! جی نہیں چاہتا چھوڑنے کو۔ یَقُوۡلُوۡنَ ءَ اِنَّا لَمَرۡدُوۡدُوۡنَ فِی الۡحَافِرَةِ (79:10) کہا کیا پھر وہی ہماری پہلی حالت جو تھی ہمیں وہیں پہنچا دیا جائے گا؟ ءَ اِذَا کُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً (79:11) کہنے لگا: یہ ہڈیوں کا پنجر ہوگا۔ یہ جو' اب تمہیں نظر آتے ہیں' ان کا یہ ہڈیوں کا پنجر باقی رہ جائے گا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ حاملینِ عرش جو ہیں ان کے متعلق یہ کہا کہ وہ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِلَّذِیۡنَ

اٰمَنُوْا (40:7) ان لوگوں کی حفاظت کا سامان بھی کریں گے مگر یہاں اس کے ترجمے کیے جاتے ہیں کہ ان کی بخشش کی دعائیں مانگیں گے۔ وہ ان کی اتنی بڑی ذمہ داری کو نہیں دیکھتے۔ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (40:7) بارِخداوندی! تُو ربوبیت کا عالم ہے' تیری ربوبیت کا نظام تو پھیلا ہوا ہے' بڑا وسیع ہے۔ وہ یہ نہیں کہ کسی ایک رقبے یا کسی ایک قوم تک محدود ہے بلکہ وہ تو بڑا وسیع ہے' اس کو اور وسیع کر۔

کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے

اور دستِ کرم کو کشادہ کر۔ یہ مظلوم بھی اس کے مستحق ہیں۔ کیا بات ہے صاحب! تیری رحمتوں کا دامن تو بڑا وسیع ہے' وہ محدود کیوں رہے' اس کو وہاں تک جانا چاہیے۔

آگے کہا ہے کہ فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا (40:7)۔ اب یہاں پھر وہی بات آئی۔ کہا ہے کہ مستبد قوتوں کے ہاتھوں سے ان کی حفاظت کا انتظام کر' تا کہ یہ وہاں لوٹ کر آ جائیں جہاں سے ان کو اس سطح پر بھیج دیا گیا تھا۔ اب انہیں اس قابل بنا دے کہ وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ (40:7) یہ تیرے راستے پر چل سکیں۔ ان ظالموں نے ان کو اس قابل بھی نہیں رہنے دیا تھا کہ تیرے راستے پر چل سکیں۔ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ❶ (40:7) آہاہا! جَحِيْم کیا لفظ قرآن حمید یہاں لایا ہے! ''وہ مقام جہاں پہنچنے کے بعد کوئی رک کر کھڑا ہو جائے''۔ یہ ہے جحیم۔

سب سے بڑا عذاب انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا رک جانا ہے: الْجَحِيْم یہ ہے اور صدا بہار زندگی بھی ہے

کہا کہ ایک محکوم کے لیے سب سے بڑا عذاب یہ ہوتا ہے کہ اس کی صلاحیتوں کو جامد کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ ابھرنے نہیں پاتیں' آگے نہیں بڑھنے پاتیں' ان کو پتھر بنا دیا جاتا ہے۔ یہ ہے عَذَابَ الْجَحِيْمِ (40:7)۔ اور اس کے مقابلے میں کہا ہے کہ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ ❷ (40:8) وہ جو تُو نے وعدہ کیا تھا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ ❸ (24:55) تیرا وعدہ تھا کہ جو اس راستے پہ چلے گا' اپنے اندر یہ جوہر پیدا کر لے گا تو اس کو

---

❶ اور تُو انہیں تباہیوں اور بربادیوں سے محفوظ رکھ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1090)۔

❷ (اے ہمارے نشوونما دینے والے!) اور انہیں زندگی کی وہ شادابیاں عطا کر دے جن کی بہار پر کبھی خزاں نہ آئے۔ یہ وہ زندگی ہے جس کا تو نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص 1090)

❸ ہم نے ان لوگوں سے جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ہمارے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں، یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم انہیں اس زمین میں حکومت عطا کریں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔ 810)

ہم اسی دنیا کے اندر ایک ہمیشہ پُر بہار رہنے والی جنت کی زندگی عطا کر دیں گے' وہ ان کے حق میں بھی پورا کر۔ ہمارے حق میں تو ہو گیا ہوا ہے' ان کے حق میں بھی پورا کر۔ واہ واہ واہ! یہاں رقابت اور رشک نہیں یہ تو رحمت کی وسعت ہے جو اس دامن کو وہاں تک پھیلانا چاہتے ہیں۔ اور آگے کہا ہے کہ وَمَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَاَزۡوَاجِهِمۡ وَذُرِّيّٰتِهِمۡ (40:8) انہیں بھی' ان کے آباؤ اجداد' ان کے ساتھی' ان کے ازواج' ان کی اولاد تک کو بھی۔ اب یہ بات نہیں ہے کہ ان کو بھی ان کے ساتھ جنت میں بھیج یا یہ جو جنت ان کے ہاتھوں سے یہاں اب قائم ہوئی ہے اس کے بعد وہ اگلے آنے والے جو جی میں آئے کریں' یہ اسی طرح سے رکھ دی۔ یہ نہیں ہے۔

جنت انسان کے اپنے ہی خونِ جگر یعنی صلاحیتوں کی نشوونما میں پنہاں ہے' یہ کسی بخشش کے ذریعے نہیں ملتی' یہ حکمت پر مبنی ہے جس میں طبقاتی ناہمواریاں نہیں ہیں۔

کیا بات ہے! کہا ہے کہ وَمَنۡ صَلَحَ (40:8) ان میں سے جو یہ صلاحیتیں اپنے اندر رکھیں' انہیں یہ سب کچھ نصیب ہو۔ یہ مَنۡ صَلَحَ ہے۔ اگر وہ معنی بھی آپ لیتے ہیں اس جنت کے اور بخشش کے تو وہاں بھی یہ بات ظاہر ہو گئی کہ کسی مومن کا تو ایک طرف' نبی کا باپ ہونا' نبی کا بیٹا ہونا' نبی کی بیوی ہونا بھی' اس کے لیے بخشش کا ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ تینوں کی مثالیں قرآن حمید نے دیدی ہوئی ہیں یعنی حضرت نوحؑ کا بیٹا' حضرت ابراہیمؑ کا باپ' حضرتِ لوطؑ کی بیوی۔ ہم جانتے ہیں کہ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ (40:8) تُو بڑا صاحبِ اقتدار ہے لیکن تیرا اقتدار دھاندلی پہ مبنی نہیں ہے۔ یہ حکمت پر مبنی ہے۔ آگے کہا ہے کہ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ (40:9) زندگی کی ناہمواریوں سے ان کو بچالے۔ یہ اس لیے ہے کہ وَمَنۡ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوۡمَئِذٍ فَقَدۡ رَحِمۡتَهٗ (40:9) تیری رحمت کے لیے شرط یہ ہے کہ زندگی کی ناہمواریاں دور ہو جائیں۔ وہ دور ہونگی تو طبقاتی ناہمواریاں دور ہونگی۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام میں طبقاتی تفریق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا: نہ غلام اور لونڈیاں کا' نہ امیر وغریب کا اور نہ ہی آسائشوں کا۔

عزیزانِ من! اسلام کے نظام میں غریب اور امیر کا کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ طبقاتی ناہمواریاں یا تفریق اور تمیز بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ آج کے انسان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کیونکہ اس نے اپنی ساری تاریخ میں یہی رکھا ہے۔ یہ جو طبقات ہیں ان کو اپنے اپنے مقام پہ مستحکم رکھنے کا نظام چلا آ رہا ہے۔ اس کے ذہن میں بھی یہ نہیں آتا کہ کوئی ایسی دنیا ہو جس میں امیر وغریب کی تفریق ہی نہ ہو' ایک درجہ ہو' سب کو ایک معیار میسر ہو۔ یہ کچھ ان کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ ہمارے لیے قرآنِ کریم نے یہ نقشہ دیا مگر ہم نے اسے آخرت کی جنت تک محدود کر دیا۔ ٹھیک ہے جی! ہمارے ہاں کی ہزار سالہ ملوکیت نے ان طبقات کو مستحکم سے مستحکم کیا ہوا ہے۔ ان کے ہاں

غریب اور امیر تو ایک طرف رہے' ابھی تک غلام اور لونڈیوں کو شرعاً جائز قرار دیا جا رہا ہے۔

قرآن کریم نے جنت کا ایک نقشہ دیا ہے۔ سارے قرآن کریم میں آپ دیکھ جائیے جنت کی نعما جو آسائشیں' رہائشیں' ہیں وہ میں سمجھتا ہوں کہ بلند ترین معیار ہے جو کسی کے تصور میں آسکتا ہے یہ وہ نُعما ہیں۔ یعنی اتنے اتنے بڑے قالین بچھے ہوئے ہیں' اس کے اندر صوفے سیٹ ہیں' زر و جواہرات یوں بکھرتے جا رہے ہیں جیسے مکئی کے دانے ہوتے ہیں' رزق کی نہریں بہہ رہی ہیں' پھل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اِنہیں حاصل کرنے کے لیے دور تک ہاتھ نہیں بڑھانا پڑے گا' وہ خود جھک کر آپڑیں گے۔ اللہ اکبر! لحمِ طیور کا ذکر آرہا ہے۔ یعنی یہ ساری چیزیں جنت میں نظر آرہی ہیں۔ اور کہیں بھی یہ نہیں ہے کہ یہ کسی ایک طبقے کے لیے ہونگی دوسرے کے لیے نہیں ہونگی بلکہ سب کے لیے یکساں ہیں۔ وہاں یہ بھی نہیں ہے کہ کچھ صوفوں پہ بیٹھے ہونگے' کچھ نیچے قالین پہ بیٹھے ہوئے ہونگے۔ بالکل نہیں۔ یہ سب کے لیے ہیں۔ ان میں کسی کا امتیاز (Discrimination) نہیں ہے۔

احترامِ آدمیت دینِ خداوندی کا سب سے زیادہ قیمتی زیور ہے مگر اس مروجہ نظام میں امیر و غریب خدا کی طرف سے بتایا جاتا ہے پھر زبانی کون کھولے۔

یاد رکھیے! انسان اور انسان کے اندر جہاں تفریق ہوئی' وہاں احترامِ آدمیت ختم ہو گیا۔ اور احترامِ آدمیت ہی تو دین کی لِم ہے۔ ہر انسان بحیثیت انسان واجب التکریم ہے۔ اور جونہی آپ امیر کے ساتھ غریب لائیں گے تو غریب بیچارے کی تکریم و تحریم کیا۔ وہ تو اپنے ذہن میں اپنے آپ کو اس جیسا انسان بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اور یہ بات ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے کہ یہ طبقاتی تفریق خدا کی پیدا کردہ ہے (معاذ اللہ)۔ وہ خدا جو ایک طرف کہتا ہے کہ وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (17:70) ہم نے ہر انسانی بچے کو یکساں واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ ایسا پیدا کیا اور اس کے بعد پھر اسی خدا نے ایسے طبقات بنا دیئے کہ یہ جو طبقہ غریبوں کا' جو تاریخ کے اندر 80% سے بھی زیادہ رہا ہے' ان کے ذہن میں تصور بھی نہیں آسکتا کہ تکریم تو ایک طرف' وہ آدمی ہونے کا بھی تصور اپنے ذہن میں نہیں کر سکتے۔ کیا خدا یہ طبقات بنا دے گا؟ لیکن ملوکیت کے لیے' ان بادشاہوں کے لیے تو یہ حربہ بڑا اچھا تھا۔ بجائے اس کے کہ یہ کہتے کہ ہمارے غلط نظام نے ان کو یہ کچھ بنایا ہے اور ہمارا استبداد ان کو یہاں رکھنے پہ مجبور کر رہا ہے' ان کے خلاف بغاوت کے خیالات پیدا ہوتے جیسے آج کے دور میں کچھ ہو رہے ہیں' انہوں نے کہا کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہو رہا ہے۔ ہر اس قسم کی چیز خدا کی طرف سے اور ہر اُس قسم کی چیز کی تائید (نعوذ باللہ) نبی اکرم ﷺ کی طرف' منسوب کر دی جاتی ہے۔ وہ خدا اور یہ رسول' اب انسان اس کے خلاف زبان کیا کھولے۔

حاملینِ عرش کی ذمہ داری نظامِ ربوبیت کو عالم گیر سطح تک پھیلانا ہے

یہ چیزیں قرآنِ کریم میں ہیں کہ وَذٰلِکَ ھُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ (40:9) یہ نجات (Salvation) نہیں کہ ان کا وہاں سے چھٹکارا ہو گیا بلکہ فَــوۡزُ ہے جس کا انگریزی میں ترجمہ Achievement ہے۔ یہ بہت بڑی Achievement (فوز) ہے کہ مثبت چیز ہاتھ میں آئے گی۔ کہا کہ یہ ہیں جو حاملینِ عرش ہیں۔ وہ خدا کے نظامِ حکومت کے علمبردار ہیں۔ ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ دنیا میں جہاں بھی کوئی ایسا خطہ، ایسی قوم، ایسا گروہ نظر آئے جسے مستبد قوتوں نے کچل کر رکھ دیا ہو، وہ وہاں جائیں، مستبد قوتوں کو ہٹائیں، ان کو سطحِ انسانیت پر کھینچ کر، ابھار کر، لائیں اور اس قابل بنا دیں کہ اپنے امور کی آپ تدبیر کریں اور دنیا کی قوموں کی مسابقت میں آگے بڑھیں۔ یہ کچھ کریں۔ یہ ان کی ذمہ داری ہے، یہ ہے نظامِ حکومتِ خداوندی:

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

عزیزانِ من! میں پھر دہرا دوں کہ 23 جنوری کو اگلا درس ساڑھے نو بجے جشنِ عیدِ میلاد النبی ﷺ کی تقریب میں ہوگا۔ عنوان ہوگا ''دنیا نظامِ محمدی ﷺ کے لیے بیتاب ہے''۔ اس کے لیے چھپے ہوئے کارڈ باہر موجود ہیں۔ آپ ساتھ لے جائیے، اپنے حلقے میں جن لوگوں کو آپ دیکھیں کہ اس سے دلچسپی ہے، ان میں تقسیم کر دیں، ان کو ساتھ بھی لے کر آئیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀......❀......❀

دوسراباب: **سورۃ المؤمن** (آیات 10 تا 27)

عزیزانِ من! آج جنوری 1981ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمن کی آیت 10 سے ہو رہا ہے:(40:10)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ پیچھے سے وہی تقابل چلا آتا ہے کہ ایک جماعت خدا کے قوانین کو لے کر اٹھتی ہے۔ دوسری اس کی مخالفت کرتی ہے۔ ان کے آپس میں ٹکراؤ ہوتے ہیں۔ باہمی آویزش کا' کشمکش کا' آپس کی مخاصمت کا' یہی سلسلہ ہے جو چلا آتا ہے۔ اور پھر قرآن کریم ان کے نتائج بیان کرتا ہے۔

انسان کی بدعملی کے نتائج انسان کی طبعی زندگی سے کہیں زیادہ انسانی ذات پر مرتب ہوتے ہیں اور اس کا ارتقا رک جاتا ہے: یہ ہے دین

قرآنِ کریم نتائج کے دن کے متعلق کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ (40:10) اس دن ان سے کہا جائے گا کہ یہ ٹھیک ہے تمہاری غلط کوشیوں کے جو نتائج تمہارے سامنے آئے ہیں، وہ تم پر بڑے گراں گزر رہے ہیں، تمہیں ان کی وجہ سے بڑا اضطراب ہے۔ تم آج اپنے آپ سے بیزار ہو رہے ہو لیکن یہ تو وہ چیزیں ہیں جن کو تم محسوس کرتے ہو۔ ہمارے قانون مکافاتِ عمل کی رو سے ان کے وہ نتائج جو تمہاری ذات پر مرتب ہوتے ہیں ان کا تو تمہیں محسوس اور مرئی طور پہ پتا ہی نہیں چل رہا۔ وہ اس سے کہیں زیادہ تخریبی ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ دین کی بنیاد اس پر ہے کہ انسان کی یہی طبعی زندگی (Physical Life) ہی نہیں، اس کے سوا ایک اور شے بھی ہے، جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ یہ جتنی کچھ بھی یہاں کی سزائیں، عذاب، تباہیاں، جسے کہتے ہیں، وہ تو اس دنیا میں طبعی جسم پر ہی مرتب ہوتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انسان کے ہر عمل کا ایک نتیجہ اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اور اصل شے وہی ہے کہ جس نے مرنے کے بعد آگے چلنا ہے۔ اور اس دنیا کے اندر جو کچھ کسی نے کیا ہے اس کے نتائج اور نقوش کو اپنے ساتھ لے کر جانا ہے۔ اگر وہ ایسے ہیں کہ جن سے انسانی ذات کی تعمیر اور استحکام ہوتا ہے تو وہ اگلی دنیا کی اس سے بلند ارتقا کی منزل کے قابل ہو جاتی ہے۔ اگر وہ ایسے نہیں ہیں اس سے اس کا استحکام اور نشوونما نہیں ہو پاتا تو اس کا مزید ارتقا رک جاتا ہے۔ یہ ہے جو کچھ دین ہمیں بتاتا ہے۔ کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ طبعی طور پر جو تباہیاں تمہارے سامنے آئیں، ان کی وجہ سے تم واقعی بہت بے کل، مضطرب اور بے چین ہو، اپنے آپ سے بیزار ہو لیکن تمہیں معلوم نہیں ہے کہ وہ نتائج جو تمہاری آنکھوں سے ابھی اوجھل ہیں، جو قانونِ خداوندی کی رو سے مرتب ہوئے ہیں، وہ تمہارے سامنے کھل کر آجائیں تو تم اس سے بھی کہیں زیادہ اپنے آپ سے بیزار ہو جاؤ جتنا اس وقت ہو۔

قرآنِ حکیم نے انسانی زندگی کو دو موتوں اور دو زندگیوں سے تعبیر کیا ہے، زندگی سے پہلے کی موت کی حالت ایک بڑی بلند سائنسی حقیقت ہے

قرآنِ حمید نے بتایا ہے کہ قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ (40:11) وہ کہیں گے کہ بارِالٰہا! ہمیں معلوم ہے کہ تُو نے ہمیں دو موتیں دیں اور دو زندگیاں عطا کیں۔ قرآنِ کریم نے کئی اور مقامات پر بھی ان دو موتوں کا اور دو زندگیوں کا ذکر کیا ہے۔ موت کی پہلی حالت وہ ہے جب ہنوز انسان کو زندگی عطا ہی نہیں ہوتی یعنی اس

زندگی سے پہلے کی حالت کو بھی قرآن مجید نے موت سے تعبیر کیا ہے۔ گویا پہلی چیز تو اس کے ہاں یہ ہے کہ زندگی کے بعد ہی موت کی حالت نہیں بلکہ زندہ ہونے سے پہلے کی حالت بھی موت ہے۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ انسان پہ وہ دور گزرا ہے جب **لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا** (76:1) وہ قابلِ ذکر شئے نہیں تھا۔ وہ جو اس کی اس زندگی' اس ہیئت' میں آنے سے پہلے کی زندگی ہے' وہ اسے بھی موت سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہ بڑی ہی عمیق اور بڑی ہی ایک بلند سائنٹفک چیز ہے جسے قرآن حمید اس طرح سے بیان کرجاتا ہے۔

''لائف کی نمود کہاں سے اور کیسے آئی'' سائنس اس قدر تحقیق کے باوجود اتنا ہی جان پائی کہ پانی اور مٹی کے امتزاج سے پہلا لائف سیل وجود میں آیا ہے

زندگی' جسے Life کہتے ہیں' کہاں سے آئی' کیسے شروع ہوئی؟ اس وقت تک کی سائنس اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اس کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے جہاں زندگی یا Life محسوس شکل میں سائنس کے سامنے آتی ہے۔ وہاں سے وہ اس کی تحقیق شروع کرتے ہیں۔ اور پھر وہ جن ارتقائی منازل سے گزرتی چلی جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی تحقیقات کی گاڑی کو چلاتے چلے جاتے ہیں اور اس اسٹیج تک آجاتے ہیں جس میں انسان اس وقت ہے۔ وہ لائف کہاں سے آئی' کیسے آئی؟ یہ چیز سائنس کے حیطۂ تحقیق کے اندر نہیں آسکتی لیکن قرآن حمید نے جو کہا ہے' یہ وہاں اس کی صداقت تک پہنچ چکے ہیں۔ زندگی کی نمود جہاں ہوئی ہے ان کی اصطلاح میں اسے First Life Cell (پہلا جرثومۂ حیات) کہتے ہیں۔ ایک جرثومۂ ہمارے ہاں تو ایک ذرہ' خشخاش کا دانہ' سوئی کا ناکہ' چھوٹی سے چھوٹی چیز' کو کہتے ہیں لیکن وہ جو جرثومہ حیات یا لائف سیل ہوتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ کم ہوتا ہے' وہ مائیکروسکوپ (خوردبین) کے اندر سے کہیں نظر آتا ہے۔ وہ ہے جس کے اندر سب سے پہلی زندگی کی نمود ہوتی ہے۔ اس سے پہلے قرآن حمید نے یہ بات کہی کہ **وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ** (21:30) زندگی کی نمود پانی سے ہوتی ہے یعنی یہ لائف یا زندگی جسے آپ کہتے ہیں' جس میں حرکت ہوتی ہے' اس کی نمود پانی سے ہوتی ہے۔ اب یہاں تک ہی ان کی یہ تحقیق پہنچی ہے کہ پانی کے ساتھ جب سمندر یا کسی جوہڑ کے کنارے کی مٹی ملتی ہے تو ان دونوں کے امتزاج سے وہ پہلا لائف سیل وجود میں آتا ہے' لائف کی پہلی نمود ہوتی ہے۔

صدیوں پہلے زندگی کی نمود کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا ارشاد

غور فرمایئے! یہاں تک یہ اب پہنچے ہیں اور قرآن حکیم نے چودہ سو سال پہلے یہ کہا کہ پانی سے زندگی کی نمود ہوتی ہے۔ اور آگے کہا کہ پھر پانی سے طینِ لازب بنتی ہے' چپچپی مٹی بنتی ہے۔ مٹی اور پانی کے امتزاج کا ذکر چودہ سو سال پہلے قرآن حکیم میں ہے جب کسی انسانی فکر کی وہاں تک رسائی تو کیا' تصور بھی نہیں' قیاس بھی نہیں' خیال بھی نہیں' گمان بھی نہیں' آسکتا تھا۔ اس وقت قرآن حکیم نے

طِینٍ لازِب کہا۔ یہاں تک سائنس پہنچ چکی ہے کہ یہ وہ چپچپی مٹی ہے جو جو ہڑیا سمندروں کے کنارے پہ ہوتی ہے۔ وہاں وہ کائی جیسی چیز پیدا ہوتی ہے اور اس کے اندر یہ Life Cells کے جرثومے پیدا ہوتے ہیں۔ تو اب یہ دونوں چیزیں' پانی اور وہ مٹی بھی' In-animate (بے جان) ہوتی ہیں یعنی ان میں زندگی نہیں ہوتی۔ اس شے کو' اس حالت کو' Animate (جاندار) کہتے ہیں جس میں زندگی کی نمود ہوتی ہے۔ اور In-animate (غیر جاندار) اس سے پہلی حالت جس میں زندگی کی نمود نہیں ہوتی۔ پانی کو الگ لیا جائے تو وہ بتاتے ہیں کہ اس میں بھی زندگی نہیں ہے۔ مٹی کو لیا جائے تو اس میں بھی زندگی نہیں ہے۔ یہ دونوں چیزیں In-animate (غیر جاندار) ہیں اور ان دونوں کا امتزاج ہوتا ہے تو Animate (جاندار) ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ کھڑے ہیں کہ یہ اس امتزاج سے کیسے ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے بتایا۔ اب یہ جو حالت ہے یعنی لائف کے Animate (جاندار) حالت میں آنے سے پہلے کی زندگی جس میں یہ In-animate (جاندار) ہے' اسے بھی اس نے موت سے تعبیر کیا ہے۔ تو یہ ہے وہ پہلی موت۔ اور اس کے بعد پھر یہ زندگی ہے جس میں انسان آیا۔ اور اس زندگی کے بعد پھر یہ طبعی موت (Physical Death) ہے پھر اس کا جسم In-animate (غیر جاندار) ہو گیا۔ اور اس کے بعد پھر جو اگلی زندگی ہے اس کو دوسری زندگی کہا گیا۔ پہلی زندگی اس پہلے In-animate Stage (غیر جاندار اسٹیج) سے Animate (جاندار) کے اندر جب آئی تو وہ پہلی زندگی ہوئی۔ اور مرنے کے بعد پھر یہ انسانی ذات کی آگے چلنے کی جو زندگی ہے یہ دوسری زندگی ہے۔ قرآن حکیم نے ہر جگہ اسے دو زندگیاں اور دو موت سے تعبیر کیا ہے۔

انسان کی طبعی زندگی کے بعد کی زندگی کی ہیئت کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہ کیسی ہو گی۔ یہ ہے ایک اہم سوال

اب جو اگلی چیز ہے وہ ہم ابھی اپنے اس شعور کی سطح پہ سمجھ نہیں سکتے کیونکہ وہاں اہلِ جنت کو یہ کہنا کہ اب اس کے بعد موت نہیں آئے گی' وہ حیاتِ جاوید کیسی ہو گی' کب تک ہو گی' یہ ہم نہیں سمجھ سکتے' وہاں کب تک بھی کہا جائے تو اسے سمجھنا مشکل ہے۔ بہر حال وہ اگلی زندگی سے متعلق شے ہے جس کے متعلق اس سطح کے اوپر ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہاں دونوں ہی چیزیں قرآن حمید نے کہی ہیں کہ دو زندگیاں' دو موت ہیں۔ اہلِ جہنم نے کہا کہ یہ جو تو نے ہمیں دوسری زندگی عطا کی ہے' یہ تو اس موت سے بھی بدتر ہے۔ جیسا کہ میں نے کئی دفعہ قرآنِ کریم کی آیات سامنے لائی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ جہنم کی زندگی میں نہ زندگی ہوتی ہے نہ موت ہوتی ہے۔ وہ عجیب کیفیت ہے کہ نہ زندگی ہوتی ہے نہ موت ہوتی ہے بلکہ دوسری جگہ یہ ہے کہ چاروں طرف سے موت آتے دکھائی دیتی ہے لیکن مرتا بھی نہیں۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔

اُخروی زندگی میں عذاب کی کیفیت یہ ہے کہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ سامنے آ کر ہی رہے گا' وہ معاف نہیں ہوتا

عزیزانِ من! قرآنِ کریم مثال کے طور پر سمجھاتا ہے کہ وہ وہاں اس جہنم کے عذاب میں چلاّئیں گے۔ جہنم کے داروغے سے کہیں گے کہ اپنے رب سے کہو کہ کم از کم ہمیں موت ہی دیدے' اس زندگی سے تو چھٹکارا مل جائے۔ کہا جائے گا کہ اس کا عذاب ایسا نہیں کہ موت سے اس کا چھٹکارا ہو جائے۔ چونکہ یہ طبعی زندگی کا تو عذاب نہیں ہے' یہاں کی زندگی تو انسان کے اپنے ہاتھ کی بات ہے کہ اگر نا قابلِ برداشت ہو تو وہ خودکشی کر سکتا ہے لیکن جس زندگی کے متعلق یہ ہو کہ انسان خودکشی بھی نہیں کر سکتا اور اس عذاب کو برداشت بھی نہیں کر سکتا اور اس نے اس میں رہنا ہے تو اندازہ لگائیے کہ اس عذاب کی کیفیت کیا ہوگی۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنی لغزشوں کا' اپنے جرائم کا' اعتراف کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ یہ اعتراف اس وقت قابلِ قبول ہوتا ہے جب اس کے بعد انسان کے پاس زندگی باقی ہو اور اس میں وہ کچھ کام کر سکے۔ اور اس اعتراف کے معنی صرف یہ نہیں ہوتا کہ ''یا اللہ میری توبہ'' کہا اور توبہ قبول ہوگئی' ''استغفر اللہ'' کی تسبیح پڑھی اور سمجھ لیا کہ پہلے سارے گناہ معاف ہوگئے۔ اس میں معافی کا تصور ہی نہیں ہے۔ کوئی بھی عمل جو انسان سے سرزد ہوتا ہے' وہ معاف نہیں ہوتا۔

نقصان رساں نتائج سے بچنے کا طریق انسان کا حسنِ عمل ہے' کچھ کرنا ہے۔ اس میں توحید کا ایک سوال۔

قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ اس کے ازالے کی صورت یہ ہے کہ اس سے جو نقصان رساں نتیجہ پہنچا ہے' تم ایسے اچھے کام کرو جو اِن کا ازالہ کردیں۔ وہی ثَـقُـلَتْ مَوَازِیْنُهٗ (23:102) اور خَـفَّـتْ مَوَازِیْنُهٗ (23:103) ہے کہ وہاں تو ترازو رکھا ہوا ہے۔ ایک طرف تخریبی اعمال کے نتائج ہیں' ایک طرف تعمیری اعمال کے نتائج ہیں۔ جو پلڑا جھکے گا اس کے مطابق مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ اگر تخریبی اعمال کا یہ پلڑا کسی طرح سے ایسا ہے جس میں اعمال کم ہیں تو اگر تم اعتراف کرتے ہو تمہیں احساس ہے' اس پہ ندامت ہے کہ جو کچھ کیا غلط تھا' تو ایسے صحیح کام کرو کہ یہ صحیح کاموں والا پلڑا جھک جائے۔ اسے توبہ کہتے ہیں۔ اور اگر وقت وہ ہو کہ جس کے بعد کچھ کام کرنے کے لیے یہاں مہلت ہی نہ ملے یعنی موت سامنے کھڑی ہو تو قرآن مجید نے کہا ہے کہ جب موت سامنے کھڑی ہو جائے تو اس کے بعد اس وقت کی ندامت اور توبہ کے معنی کچھ نہیں ہیں۔ اس لیے کہ اس کے بعد تو تمہارے پاس عمل کرنے کا وقت ہی نہیں ہوگا کہ تم اپنے ان نقصانات کا ازالہ کر سکو جو تمہاری غلط کوشیوں کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے ازالے کے لیے کام کرنے کا وقت ہی نہیں ہے تو پھر توبہ کے کیا معنی۔ اس لیے اس نے یہ کہا ہے کہ یہ جو تم اس وقت اعتراف کر رہے ہو' اس اعتراف کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔ وہی بات ہے کہ فَهَـلْ اِلٰـی خُـرُوْجٍ مِّـنْ سَبِیْلٍ

(40:11) کیا یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے' کوئی طریقہ ہے' کوئی سبیل ہے؟ وہاں سے نکلنے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ چیزیں تو درس میں برسوں سے آ رہی ہیں۔ جہنم کو تو کہا ہی جحیم گیا ہے کہ جہاں آ گے انسان کی ترقی رک جائے' وہ کھڑا (Static) ہو جائے۔ تو یہ جو چیز نکلنے کی ہے وہ نکلنا یا داخل ہونا نہیں بلکہ یہ ہے کہ جنت تو ارتقائی منازل طے کرنے کا نام ہے۔ جہنم وہ مقام ہے جہاں انسان کا مزید ارتقا رک جاتا ہے۔ اور جب وہ رک جاتا ہے تو پھر اس کے لیے وہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے دنیا کی اس طبعی زندگی کو بڑی اہمیت دی ہے کہ یہی قولِ فیصل ہے' یہیں تمہارے مستقبل کا فیصلہ ہونا ہے۔ Future (آخرت) میں جانے کے بعد یہ بات نہیں ہوگی۔ یہاں ابھی تمہارے پاس وقت ہے۔ اور چونکہ انسان کو پتا نہیں کہ موت کس وقت آ جانی ہے اس لیے اس کے لیے اعتراف اور ندامت کا ازالہ ہر سانس میں کر لینا ضروری ہے کہ اسی وقت کر لیا جائے۔ کیا پتا ہے کہ اس کے بعد اگلا سانس آئے ہی نہیں' تو پھر تو انسان کے لیے اس کا موقع ہی نہیں مل سکتا۔ اب یہ جس طرح سے ان کی تخریبی زندگی' عذاب کی زندگی' سزا کی زندگی' تڑپ اور خلش کی زندگی' سوز و گداز کی زندگی' ہے' جسے وہ برداشت نہیں کر رہے' سنیے! یہ کس چیز کا نتیجہ ہے؟ کہا ہے کہ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا (40:12)۔ عزیزانِ من! قرآن کریم میں پہلے ورق سے لے کر آخری ورق تک ایک ہی چیز آتی چلی جاتی ہے جسے توحید کہا جاتا ہے' خدائے واحد کہا جاتا ہے۔ ذرا ذہن پہ زور دے کر گہرائی میں جا کر سوچیے۔ توحید کے معنی ہیں کہ ''کہو اللہ ایک ہے''۔ ایک نے کہہ دیا کہ اللہ ایک ہے' دوسرے نے مثلاً عیسائی نے کہہ دیا کہ تین ہیں۔ ان دونوں کے اندر کیا فرق ہے کہ ایک نے یہ کہہ دیا اور دوسرے نے وہ کہہ دیا؟ یہ بھی ہے ایک اور سوال۔ اور اس کا تعلق توحید سے ہے۔

یا اللہ!'' کیا ہے؟ ایک تصور جو سب مذاہب میں موجود ہے مگر انسانی زندگی کی عمارت ''توحید'' کے تصور پر اٹھتی ہے۔ وہ کیا چیز ہے؟

کبھی اس پہ بھی غور کیجیے گا کہ خدا کے متعلق ہم جو کچھ کہتے ہیں اس کی تو یہ صورت ہے کہ یا اللہ! یہ کر دے' یا اللہ! ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے جسے آپ ''یا اللہ!'' کہہ رہے ہیں۔ آپ کے ذہن کا کچھ تصور ہے' اسے آپ نے کبھی نہیں دیکھا' اس کی کبھی آواز نہیں سنی' وہ کبھی سامنے نہیں آیا۔ آپ بلاتے بھی ہیں تو کوئی Response (جواب) نہیں ہے کہ ادھر سے ہی کوئی جواب آ رہا ہو۔ آپ اپنے ذہن سے ایک تصور قائم کر کے یہ کچھ کہتے رہتے ہیں۔ ہندو اپنے ذہن میں برہما کا ایک تصور کر لیتا ہے' وہ بھی یہی کچھ کہتا رہتا ہے۔ جس طرح آپ مطمئن ہو جاتے ہیں' وہ بھی مطمئن ہو جاتا ہے۔ عیسائی اپنے طور پر ایک God کا تصور کرتا ہے' یہی

کچھ وہ اپنے ہاں کہتا رہتا ہے اور وہ بھی مطمئن ہو جاتا ہے۔ وہ (عیسائی) تین ماننے والے ہیں' وہ (ہندو) سینکڑوں ماننے والے ہیں' آپ کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے۔ ہمارے ہاں جب اسلام' مذہب میں تبدیل ہو گیا تو معنی یہ رہ گئے کہ کہو ''اللہ ایک ہے''۔ اور شرک کے معنی بت پرستی ہو گئے۔ چونکہ مسلمان بت پرست نہیں ہے' اس واسطے یہ شرک نہیں کرتا۔ یہ توحید پرست ہو گیا کہ اس نے کہہ دیا: ''اللہ ایک ہے''۔ کیا بس اتنا ہی فرق تھا' کیا اسی کے لیے یہ سلسلہ انبیائے کرامؑ کا شروع ہوا اور آخر تک گیا' کیا اسی لیے کتابیں آئیں اور اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی اور یہ قرآن مجید نازل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو محفوظ رکھا؟ بس اس کے لیے ہی کہ یہ کہے کہ ''اللہ ایک ہے'' اور یہ بت پرستی نہ کرے تو کیا یہ توحید پرست ہو گیا؟ زندگی کی ساری عمارت اس پہ اٹھتی ہے جسے آپ توحید کہتے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے؟

خدا کا انسانوں کے ساتھ تعلق صرف اور صرف کتاب اللہ کے ذریعے ہی ہے جیسے مملکت کا اس کے آئین سے ہے

عزیزانِ من! اسے اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ خدا کا ہمارے ساتھ تعلق یا ہمارا خدا کے ساتھ تعلق' صرف اس کی کتاب کی وجہ سے ہے۔ خدا کے ساتھ ہمارے تعلق کا یہ ذریعہ ہے۔ اتنے حصے میں تو ایمان کی ضرورت یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہمارے پاس کتاب آئی ہے۔ اس کے بعد باقی جو کچھ بھی ہے وہ سارا اس کتاب کے مطابق ہوگا۔ توحید یا خدائے واحد کے معنی یہ ہیں کہ ''خالص اس کی کتاب کی اطاعت کی جائے' کسی اور کی نہیں''۔ شرک کے معنی یہ ہیں کہ ''اس کی کتاب کے ساتھ کسی بھی انسان کی اطاعت کرنا' انسان کی حکومت قائم کرنا' انسانوں کو قانون سازی کا اختیار دینا''۔ یہ سارا شرک ہے۔ توحید یہ ہے کہ خالص کتاب اللہ کی محکومیت ہو۔ ہمارا خدا کے ساتھ تعلق ہی اس کتاب کے ذریعے ہے۔ اب یہ وہ چیز ہے جو ذہنی نہیں' قیاسی نہیں' تصوراتی نہیں' نظریاتی نہیں' Abstract (غیر محسوس) نہیں بلکہ محسوس ہے۔ اگر آپ حکومت کے تصور کو چھوڑ دیں' State کے تصور کو لیں جسے مملکت کہتے ہیں تو اس کا آپ کے ساتھ تعلق کس ذریعے سے ہوتا ہے؟ یہ اس Constitution (آئین) کے ذریعے سے ہوتا ہے جو اس مملکت کی ہوتی ہے ورنہ اسٹیٹ ایک Abstract (غیر محسوس) تصور ہے' وہ اسٹیٹ (مملکت) محسوس طور پہ کہیں Exist نہیں کرتی۔ اگر Constitution (آئین) نہیں ہے تو اسٹیٹ کا وجود ہی نہیں ہوتا۔

کتاب اللہ کے بیان کردہ ضوابط سے انحراف بغاوت یا شرک ہے اور کتاب اللہ ہی ہمارے اور خدا کے درمیان ذریعہ ہے

قرآنِ کریم آپ کا Constitution (آئین) ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ Constitution (آئین) آپ انسانوں کا اپنا بنایا

ہوا ہوتا ہے جبکہ قرآن کریم انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ یہ خدا کی طرف سے مرتب کردہ ملا ہے۔ اس پہ ہمارا ایمان ہے۔ کسی مملکت میں ایک سے زیادہ Constitutions (آئین) آپ لے آئیں گے تو مملکت کے خلاف بغاوت ہوگی۔ اسے شرک کہا جاتا ہے۔ اگر اس کتاب کو کوئی مانتا ہی نہیں ہے تو وہ تو کفر ہے۔ پاکستان میں رہنے والوں کے لیے اپنا Constitution (آئین) ہے اگر وہ اس کو نہیں مانتا تو وہ (مثلاً) انڈیا چلا جائے۔ ٹھیک ہے وہ وہاں کا Constitution (آئین) مانے گا۔ یہاں کے Constitution (آئین) سے اس نے انکار کیا ہے۔ یہ کفر ہے۔ لیکن اس مملکت میں رہتے ہوئے اگر یہ صورت ہو کہ دو تین قسم کے قوانین کے ضابطے ہوں' ایک کسی کا مرتب کیا ہوا' ایک کسی کا مرتب کیا ہوا' کبھی آپ اس کا اتباع کریں' کبھی آپ اُس کی محکومیت اختیار کریں تو یہ اسٹیٹ کس طرح سے چل سکے گی۔ یہ شرک ہے۔ ایک سے زیادہ آئین یا ایک سے زیادہ ضوابطِ قوانین کا تسلیم کرنا شرک ہے۔ سوال بت پرستی کا نہیں ہے' سوال خدا پرستی کا بھی نہیں ہے۔ ہم نے تو جب خدا کو ایک پرستش کی شے کہا تو دوسری طرف ہم نے بت پرستی کہہ دیا۔ نہ یہ پرستش کی بات ہے' نہ وہ پرستش کی بات ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ محکومیت کس کی اختیار کرتے ہیں' قانون کس کا ہے جس کے تابع آپ زندگی بسر کرتے ہیں۔ خدا کا قانون ہے تو ایمان ہے یعنی صرف خدا کا قانون ہی توحید ہے۔ اس کے ساتھ انسانوں کا بنایا ہوا قانون آپ ملاتے ہیں تو شرک ہے۔ اسی کو مملکت میں بغاوت کہتے ہیں۔ یہاں آپ دعویٰ کر کے دیکھیے کہ میں اس Constitution (آئین) کو نہیں مانتا' کچھ اس کے حصوں کو مانتا ہوں اور کچھ ان کو مانتا ہوں تو یہ بغاوت ہے۔ میں ضابطۂ تعزیراتِ پاکستان کو کلیتاً نہیں مانتا' اس کی کچھ شقیں مانتا ہوں اور کچھ شقیں میں اور لاتا ہوں یا میں نے خود بنائی ہوئی ہیں' میں ان کو مانتا ہوں تو یہ بغاوت ہے۔ جسے ہم بغاوت کہتے ہیں اسی کو شرک کہتے ہیں۔ حکومتِ خداوندی میں شرک کے معنی اس سے بغاوت کے ہیں۔ ہمارا اور خدا کا تعلق اس کی کتاب کے ذریعے ہے۔

شرک ایک ایسا جرم ہے جو کسی صورت بھی قابلِ معافی نہیں' یہ بغاوت ہے

کتاب اللہ کی محکومیت ہی خدا کی اطاعت ہے۔ اسی کے مطابق خدا کا تصور قائم ہوتا ہے۔ انسان کا تعلق خدا کے ساتھ براہِ راست ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ جو سلسلۂ نبوت تھا وہ ختم ہو گیا۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے کہ وہ کیسے تھا۔ اس کا نتیجہ قرآن حمید کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اب خدا کا ماننا' اس کی کتاب کا ماننا ہے۔ ماننا نہیں بلکہ اسے اپنے لیے ضابطۂ قوانین و ہدایت تسلیم کرنا اور صرف اسی کو تسلیم کرنا۔ جونہی کسی انسان کا بنایا ہوا قانون آپ نے شامل کیا تو شرک ہو گیا۔ اور قرآن حمید کہتا ہے کہ تمہاری اور لغزشوں کا ازالہ ہو سکے گا لیکن شرک کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی شہری کتنا ہی امن پسند کیوں نہ ہو' اس نے ساری عمر نہایت نیک زندگی' پارسائی کی زندگی' امن پسندی کی زندگی' کیوں نہ بسر کی ہو' اگر وہ کسی وقت مملکت کے خلاف بغاوت اختیار کر لے تو وہ جتنے بھی اس سے پہلے کے اس کے اچھے

کام ہوتے ہیں اس مملکت کے اندر رہتے ہوئے وہ سارے غارت ہوجاتے ہیں اوراس کی سزا موت ہوتی ہے۔وہ جرم عظیم ہے۔قرآن حمید نے یہی کہا ہے کہ تمہاری باقی لغزشوں کے ازالے کی شکل تو نکل آئے گی لیکن اگر تم نے یہ بغاوت کی کہ خدا کی کتاب کے ساتھ کسی اور کو شریک کیا تو یہ قابلِ معافی نہیں ہے۔اسے ہی ظلمِ عظیم کہا ہے۔بغاوت کہیں بھی نہیں بخشی جاسکتی ۔ یہ ہے جو کہا گیا ہے۔کہا کہ تمہاری یہ حالت اس لیے ہے کہ تم نے خدا کی کتاب کے علاوہ دوسروں کے قوانین اور ضابطہ حیات تسلیم کیا ہوا ہے۔

کتاب اللہ کے بالمقابل انسانوں کے بیان کردہ نظریات کی پیروی اور دل جوئی کی اولیّت کا نتیجہ؟

اب دیکھیے یہ کفر کی حالت نہیں ہے کہ انہوں نے بالکل انکار کیا ہوا ہے۔کہا کہ یہ اس لیے ہے کہ جب تمہیں کہا جاتا تھا کہ صرف خدائے واحد کی اطاعت کرو تو تم اس سے انکار کرتے تھے۔اور اگر اس کے ساتھ انسانوں کو ملایا جاتا تھا تو پھر تم ایمان لاتے تھے۔یہاں تو اتنا ہی کہا ہے کہ ایمان لاتے تھے۔پچھلی سورۃ الزمر میں یہ کہا گیا ہے کہ پھر تمہاری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (39:45) جب صرف خدائے واحد کی بات کی جاتی ہے تو کلیجہ مسوس کررہ جاتے ہیں۔ان کے اوپر یہ بات بڑی گراں گزرتی ہے۔اور جب اس کے ساتھ کچھ اور انسانوں کو ملایا جاتا ہے جن کو یہ اپنے بزرگ اور اولیاء اور کیا کچھ سمجھتے ہیں' ان کا ساتھ ذکر کیا جاتا ہے تو باچھیں کھل جاتی ہیں: ''سبحان اللہ! اب بات ہوئی ناں جی!''۔عزیزانِ من! غور کیا یہ کس کی بات ہورہی ہے؟

ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

قرآنی نظامِ حیات کے سلسلہ میں دنیا بھر کی آزاد مسلمان مملکتوں کی یہ حالت کیوں؟ کہ محکومیت خدا کی نہیں

عزیزانِ من! تعداد کے اعتبار سے نوے کروڑ یا اس سے بھی زیادہ کیوں نہ ہوں' ساری دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمان کیوں نہ ہوں' ان کی آزاد مملکتیں بھی جب آزاد نہیں تھیں تو اس وقت تو پھر بھی ہمارے پاس ایک عذر تھا کہ ہم آپ اپنا قانون بنا نہیں سکتے۔آزاد مملکتیں ہیں لیکن دنیا کی کسی مملکت کے اندر قرآن مجید کا قانون نافذ نہیں ہے۔جن کو سیکولر کہتے ہیں ان کو تو چھوڑ دیجیے' جو شریعت کے قوانین کی مدعی ہیں وہاں بھی قرآن مجید کا قانون نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ انسانوں کا بنایا ہوا قانون چلتا ہے۔اور آہستہ آہستہ قرآن کریم تو بالکل بیک گراونڈ میں چلا جاتا ہے وہ اس میں رہتا ہی کچھ نہیں۔سارا ہی انسانوں کا بنایا ہوا قانون ہوتا ہے اور اسے قانونِ شریعت کہا جاتا ہے۔

عزیزانِ من! جسے آپ فقہ یا فقہ کے قانون کہتے ہیں وہ انسانوں کے بنائے ہوئے تھے۔وہ انسان کتنے ہی واجب الاحترام کیوں نہ ہوں' ہم بھی ان کی عزت کرتے ہیں' اپنے وقت کے اندر اچھے لوگ تھے' اچھے انسان تھے' یہ سب انسانوں کا بنایا ہوا ہے۔قرآن کریم کا

قانون کہیں بھی رائج نہیں ہے۔اور اس کے بعد پھر ان کی انکوائری کمیٹیاں بیٹھتی ہیں اور اتنی اتنی بڑی کانفرنسیں ہوتی ہیں کہ ہماری یہ حالت کیوں ہے؟ قرآن حکیم سے پوچھو تو یہ بتائے۔نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ جسے آپ خدا کا ماننا کہتے ہیں یا اس پہ ایمان لانا کہتے ہیں' وہ خدائے خالص کی محکومیت یا اطاعت ہے۔ ہماری کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ اگر یہاں کوئی شخص اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ صرف خدا کی کتاب ہمارے لیے ضابطۂ قوانین ہے تو اس کے خلاف کفر کے فتوے عائد ہوتے ہیں۔آپ غور فرمائیے! یہ کہنا بھی کفر ہے۔اب میں نے یہاں تک کہا کہ آیت میں تو یہی تھا کہ جب تمہیں خدائے واحد کی طرف بلایا جاتا ہے تو کفر کرتے ہو اور جب اس کے ساتھ انسانوں کو ملایا جاتا ہے تو بہت خوش ہو جاتے ہو۔میں نے بات یہ کی تھی کہ دوسرے انسانوں کو ساتھ ملا کر جسے شرک کہتے ہیں کیا وہ انسانوں کی پرستش یا بتوں کی پرستش نہیں ہے! ساری بات خدا کے حکم کا ماننا ہے کہ حکومت کس کی ہے اور محکومیت کس کی اختیار کرنی ہے۔سوال یہ تھا کہ یہ کہنے کی سند کیا ہے کہ خدا کی پرستش نہیں' محکومیت یا حکومت ہے۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے شرک کے سلسلہ میں حقِ حکومت کی دوٹوک وضاحت

یہ جو آیت میں نے پڑھی ہے اس کے آخری الفاظ میں نے ابھی نہیں پڑھے۔کہا ہے کہ **ذٰلِکُمۡ بِاَنَّہٗۤ اِذَا دُعِیَ اللّٰہُ وَحۡدَہٗ کَفَرۡتُمۡ وَ اِنۡ یُّشۡرَکۡ بِہٖ تُؤۡمِنُوۡا** (40:12) خالص خدا کی طرف دعوت دی جاتی تھی تو کفر اختیار کرتے تھے اور اگر ساتھ اوروں کو ملایا جاتا تھا تو پھر ایمان لاتے تھے۔یہ کیا بات ہے؟ عزیزانِ من! قرآن کریم تو اپنے معنی خود واضح کرتا ہے۔اگلے الفاظ سنیے! کہا ہے کہ **فَالۡحُکۡمُ لِلّٰہِ الۡعَلِیِّ الۡکَبِیۡرِ** (40:12) او بابا! توحید یہ ہے کہ حکومت صرف خدا کے قانون کی ہے' اس میں کسی اور کا قانون شریک نہیں ہوتا **الۡعَلِیِّ الۡکَبِیۡرِ** (40:12) اقتدار اسی کو حاصل ہے' Sovereignty اسی کی ہے' وہ بڑی کبریائی کا مالک اور سب سے ارفع و اعلیٰ ہے اس لیے **فَالۡحُکۡمُ لِلّٰہِ** (40:12) اس کے حکم میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔اس لفظ نے تو خود بتا دیا کہ شرک کسے کہتے ہیں اور توحید کے کیا معنی ہیں۔صرف **اَلۡحُکۡمُ لِلّٰہِ** ہے۔اور اللہ کا حکم اس کی کتاب میں ہے۔**وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ** (5:44) (یاد رکھو! جو شخص ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتا' وہ کافر ہے)۔یہ ما انزل اللہ کتاب اللہ ہے۔**فَالۡحُکۡمُ لِلّٰہِ** (40:12) تمام فیصلے خدا' اور صرف خدا' کے قوانین کے مطابق ہوتے ہیں۔اور حکم کے اندر ہی شرک ہے جو یہ کرتے ہیں کیونکہ کہا ہے کہ **لَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا** (18:26) یہ دین کا بنیادی نقطہ ہے کہ ''وہ اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا''۔

حقِ حکومت کی محکمیت اور توحید کی وضاحت کے سلسلہ میں خارجی کائنات کی مثال تو انسانوں میں یہ کیوں نہیں

یہاں تک لانے کے بعد جیسا قرآن حکیم کا انداز ہے' وہ فوراً خارجی کائنات کی طرف توجہ منعطف کر دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ انسانوں کی دنیا میں تو تمہیں خدا کا قانون کہیں نافذ نظر ہی نہیں آئے گا۔ خارجی کائنات میں چونکہ انسان اپنی مرضی سے جو جی میں آئے نہیں کر سکتا اس لیے وہاں کیفیت یہ ہے کہ وہاں خالص خدا کا قانون ہے۔ کہتا ہے کہ هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ وَیُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًاؕ وَمَا یَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ یُّنِیْبُ (40:13) ذرا باہر دیکھو تو سہی! یہ بادل' سمندر سے پانیوں کا اوپر اٹھ کر جانا' ہواؤں کا مشکیزوں کو ادھر سے اُدھر لے جانا' یہ بارش برسنا' اس سے زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا ہونا' تمہارے رزق کا سامان فراہم ہونا' کہتا ہے کہ یہ سوچو تو سہی' یہ کس کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے؟ اس میں کسی اور کا قانون ساتھ آ جائے تو یہ سارا سلسلہ تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ یہ توحید ہے جو خارجی کائنات کے اندر کارفرما ہے۔ یہی توحید ہم تمہاری دنیا کے اندر بھی چاہتے ہیں۔ فرق اتنا ہی ہے کہ تمہیں اختیار دیا گیا ہے کہ تم اس کی محکومیت اختیار کرو یا انسانوں کی اختیار کرو۔ اگر انسانوں کی اختیار کرو گے تو آگے بات آتی ہے۔

خدا کی اطاعت کی عملی شکل قرآنِ حکیم کی اطاعت ہے خواہ وہ کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے

کہا ہے کہ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (40:14) اس لیے صحیح روش زندگی یہی ہے کہ تم اطاعت کو خالص قوانینِ خداوندی اس کے لیے مختص کرو' خالص خدا کی اطاعت یعنی خدا کی کتاب کی اطاعت۔ خواہ یہ بات ان لوگوں کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے جو اس حقیقت سے انکار کر کے اس کے ساتھ اور بھی ملاتے ہیں۔ انہیں گراں گزرتی ہے تو گراں گزرنے دو۔ تمہارے لیے یہی ہے کہ اطاعت کو خالص خدا کے لیے کرو۔ میں نے عرض کیا ہے کہ خدا کی اطاعت اپنے ذہن سے ہم نہیں کر سکتے کہ ہم خدا کی اطاعت کر رہے ہیں۔ وہ تو اس کی کتاب کی اطاعت ہے تو اس کی اطاعت ہے مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (40:14) (بہرحال صحیح روشِ زندگی یہی ہے کہ تم اطاعت و فرماں پذیری خالصتاً قوانینِ خداوندی کی اختیار کرو اس میں کسی اور کو شریک مت کرو خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے جو ان قوانین کی صداقت سے انکار کرتے ہیں)۔

خدا تعالیٰ کی ہستی کو محسوس تصور کی بجائے اس کی صفات سے ہی سمجھا جا سکتا ہے اور یہ بھی کہ اس کی تخلیق کردہ ہر شے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی نقطہ آغاز سے عروج تک پہنچتی ہے

اس کے بعد خدا کا ایک تصور دیا یعنی جسے ہم خدا کی صفات یا اسماء کہتے ہیں ان کی رو سے ایک تصور قائم ہوتا ہے۔ اب تصور کے

متعلق بھی سوچنا چاہیے۔ ہمارا Finite (محدود) ذہن تو محسوس شے کا ہی تصور کر سکتا ہے اس کے لیے غیر محسوس کا تصور ہی مشکل ہے۔ اس لیے خدا کے متعلق ذکر جب آتا ہے تو ذہن میں آتا ہے کہ وہ کہیں عرش پر اس قسم کا بیٹھا ہوا ہے اور یہ اس کی صفات ہیں۔ یہ سوال نہیں ہے۔ اس کا اس قسم کا یہ محسوس تصور کبھی ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا اور نہ آنا چاہیے۔ قرآنِ کریم نے خدا کی صفات یا اسماء دی ہیں' اس کی ذات کے متعلق کہیں نہیں بتایا کہ وہ ایسا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

صفت یہ ہے کہ رَفِيۡعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الۡعَرۡشِ (40:15) ۔زبان اور گرامر کی رو سے جسے Construction (ترکیب) کہتے ہیں یہ ذرا سمجھنے کی ہے۔ رَفِيۡعُ الدَّرَجٰتِ کے ایک تو یہ معنی ہو سکتے ہیں اور وہ آسان ہیں کہ ''درجات کو بلند کرنے والا''۔ قرآن کریم میں یہ چیز بار بار آئی ہے کہ قرآن کے مطابق جو نظام قائم ہوگا اور جو لوگ اس کی اطاعت کریں گے' ان کے درجات بلند ہوتے چلے جائیں گے لیکن جب خود خدا کے متعلق یہ ہے تو اس میں بڑی اہم چیز ہے جو قرآن کریم نے بیان کی ہے۔ کائنات کی ہر شے اپنے نقطۂ آغاز میں جس قسم کی تھی' وہ بڑی ہی ناقص اور کمزور حالت میں تھی۔ جیسا میں نے ابھی کہا ہے کہ زندگی کا پہلا جرثومہ تھا' پھر زندگی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اوپر کو گئی' جسے ایک ایک درجہ کہتے ہیں۔ یہ عرب عجیب قوم تھی اور ان کی زبان بھی عجیب تھی۔ میں یہ عرض کردوں کہ یہ سیڑھی کے جو ڈنڈے ہوتے ہیں جن کو ہم ڈانڈے کہتے ہیں۔ وہ وہی ہوتے ہیں۔ جب انسان اوپر کی طرف جاتا ہے یعنی وہ ڈنڈے جب اوپر لے جاتے ہیں تو وہ ان کو درجات کہتے ہیں۔ وہی ڈنڈے ہیں لیکن جب انسان نیچے کو اترتا ہے تو پھر ان ڈنڈوں کو وہ درجات نہیں کہتے بلکہ درکات کہتے ہیں یعنی نیچے لے جانے والے۔ وہ سیڑھی وہی ہوتی ہے' یہ انسان ہے کہ ان ڈنڈوں کو کیسے استعمال کرتا ہے' اوپر جانے کے لیے کرتا ہے یا نیچے اترنے کے لیے کرتا ہے۔ کیا بات ہے! سیڑھی وہی ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيۡرًا وَّ يَهۡدِىۡ بِهٖ كَثِيۡرًا (2:26) اسی قرآن سے بہت سوں نے صحیح راہنمائی پائی' بہت سے اس سے گمراہ بھی ہوئے۔ سیڑھی تو وہی ہوتی ہے' یہ انسان پہ موقوف ہے کہ اسے استعمال کس طرح سے کرتا ہے۔ ہر شے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی ان مدارج کی رو سے' ان درجات کی رو سے' Evolutionary Process (عملِ ارتقا) کی رو سے' اپنے نقطۂ آغاز سے عروج تک پہنچتی ہے۔

خدا تعالیٰ کی ذات کسی ارتقائی مراحل کی محتاج نہیں ہے

یہاں بڑی عجیب چیز کہی ہے کہ رَفِيۡعُ الدَّرَجٰتِ (40:15) خدا کی ذات ایسی ہے جو اس ارتقائی Process (عمل) سے بلند ہے۔ وہ یوں خدا نہیں بنا کہ پہلے ایک کمزور یا ناقص سی حالت کے اندر خدا تھا اور پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے' ارتقائی منازل طے کرتے کرتے' پھر وہ خدا ہو گیا اور خدا بھی ایسا کہ ذوالعرش ہے پھر وہ عرش کے اوپر جا بیٹھا۔ یہ ایسے نہیں ہے۔ وہ درجات کے ذریعے

سے عرش پہ نہیں بیٹھا ''اوپوڑی دے ڈنڈے چڑھ چڑھ کے کوٹھے تے نئیں پہنچیا'' (وہ سیڑھی کے ڈنڈے چڑھ کر چھت پر نہیں پہنچا)۔ کیا بات ہے! وہ اس تصور سے بلند و بالا ہے کہ اگر تم سمجھو کہ وہ بھی اس طرح سے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اپنے بلند تریں مرتبے کو پہنچا ہوا ہے۔ رَفِيۡعُ الدَّرَجٰتِ (40:15) وہ اس تصور سے بہت اونچا ہے' بہت بلند ہے۔

لفظ عرش کا قرآنی مفہوم: مرکزی کنٹرول جو خدا کے ہاتھ میں ہے۔

ذُو الۡعَرۡشِ (40:15) کہا ہے۔ عرش بھی یہ نہیں۔ جیسا میں نے روایتاً کہا تھا کہ سات آسمانوں کے اوپر وہ پہاڑی بکرے ہیں' ان پہاڑی بکروں کے سینگوں کے اوپر ایک عرش ہے اور اس عرش کے اوپر پھر خدا بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ تو ہمارے آپ کے ذہن کا خدا ہے۔ عرش کے تو معنی ہی ''آخری کنٹرول' مرکزی کنٹرول'' کے ہیں۔ خدا وہ ہے جو ارتقائی منازل طے کرتا ہوا خدا نہیں بنا۔ اور قرآن حمید میں تو ایک جگہ بڑی عجیب چیز ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر تم تمام کے تمام خدا سے انکار کردو تو اس سے خدا کا کیا بگڑے گا۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ ہم تو اس وقت بھی خدا تھے جب تم میں سے کوئی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ یہ نہیں ہے کہ تم ہمیں مانو تو ہم خدا رہیں' تم نہ مانو تو خدا ہی نہ رہیں۔ یہاں تو ہر ایک جو بڑا ہے وہ اس لیے بڑا ہے کہ ماننے والے اس کو بڑا مانتے ہیں۔ ماننے والے بڑا ماننا چھوڑ دیں' اس کی بڑائی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہماری کیفیت یہ نہیں ہے۔ اس کا کنٹرول ہے اور وہی حکم کا لفظ چلا آ رہا ہے کہ ''مرکزی کنٹرول'' اس کے ہاتھ میں ہے۔ جو ارتقائی منازل طے کرتا ہوا وہاں نہیں پہنچا' وہ ان تمام چیزوں سے بلند اور بالا ہے۔

خدا کے ساتھ انسانوں کا تعلق صرف اور صرف اس کی کتاب قرآنِ کریم اور اس کتاب کے احکام کے ذریعے سے ہی ہے

پھر ذہن میں آیا کہ وہ تو ان سے بلند اور بالا ہے' عرش پہ ہے تو انسانوں کے ساتھ پھر تعلق کس قسم کا ہے' اس کا کیسے تعلق قائم ہوا؟ قرآن کے عجیب انداز ہیں! کہا ہے کہ يُلۡقِى الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِهٖ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ (40:15) وہ وحی کو' اپنے احکام کو' نازل کرتا تھا' اپنے بندوں میں سے جن کو اس کے لیے چن لیتا تھا۔ ''تھا'' میں نے اس لیے کہا ہے کہ نبوت کا سلسلہ تو حضور ﷺ کی ذات کے ساتھ ختم ہو گیا۔ وہ اپنے بندوں میں سے جنہیں اس مقصد کے لیے چن لیتا تھا' ان کی طرف اپنے احکام نازل کر دیتا تھا۔ اب خدا کا اور بندوں کا تعلق ان احکام کی رو سے ہوا' جو وہ ان انسانوں پہ نازل کرتا تھا جنہیں رسول یا انبیا کہا جاتا ہے۔ اور وہ پھر ان احکام کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے تھے اور اب وہ آخری مرتبہ مکمل شکل میں قرآن حکیم کے اندر موجود ہیں۔ اب ہمارا اور خدا کا تعلق اس قرآن حکیم کی رو سے ہوا۔

لفظ الرُّوۡحَ کا قرآنی مفہوم' روحانیت کا غلط تصور اور یوم التلاق کی انسانی بھول

یہاں یُلۡقِی الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِہٖ (40:15) کہا ہے۔ضمناً میں یہ عرض کردوں کہ ہمارے ہاں بھی روح اور روحانیت ہے۔ یہ جو انسان کے لیے روح ہے' قرآن حمید میں اس قسم کے روح کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس میں صرف انسان کے نفس یا ذات کا ذکر ہے۔ یہ روح جس کو ہم Soul کہتے ہیں یہ یونانی تصور تھا' یہ قرآن حمید کا تصور نہیں ہے۔ روح کے معنی ''قوت اور توانائی یعنی Pure Energy '' ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کے ذریعے خدا اپنے رسولوں کے اوپر وہ ''شے'' نازل کرتا تھا' جسے وحی کہا جاتا ہے۔قرآن حکیم نے وحی کے لیے روح کا لفظ استعمال کیا ہے' انسان کے Soul یا روح کے لیے نہیں۔ اور جب انسانی روح کے لیے قرآنِ کریم میں لفظ ہی نہیں ہے تو یہ جو روحانیت ہے' یہ تو ہمارا تراشیدہ تصور ہے یعنی (انسانی) روح ہی نہیں ہے تو روحانیت کہاں سے آ جائے گی۔ اور ہمارے ہاں سب سے بڑے جو مقدسین بنے ہوئے ہیں' وہ (بقول خود) روحانیت کے مدارج طے کیے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی روح انسان میں ہے ہی نہیں' وہ تو انسان کا نفس ہے جس کے لیے وہ اپنے ان قوانین کو انسانوں کی راہنمائی کے لیے بذریعہ وحی نازل کرتا تھا۔ اور یہ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ لِیُنۡذِرَ یَوۡمَ التَّلَاقِ (40:15) ہے۔کاہے کے لیے یہ سارا سلسلہ ہے؟ تا کہ وہ انہیں آگاہ کرے کہ ایک دن تمہارے اعمال کے نتائج تمہارے سامنے آنے ہیں۔ یہاں یَوۡمَ التَّلَاقِ آیا ہے' یہاں سے ملاقات کا لفظ ہے کہ تمہارے سامنے ایک دن یہ نتائج آنے ہیں۔ بس یہ سارا رسالت کا' وحی کا' نبوت کا' سلسلہ آگاہ کرنے کے لیے آیا ہے۔ اور انسان کی بھول ہی یہ ہے کہ وہ یہاں جو کچھ کرتا ہے اگر یہاں اس کی گرفت نہیں ہوتی تو پھر وہ سمجھتا ہے کہ بس چھوٹ گیا' معاملہ ختم ہو گیا۔

لفظ التلاق اور طلاق کے باہمی فرق کے علاوہ التلاق کا مفہوم بڑا غور طلب ہے

عزیزانِ من! یہ موضوع کچھ زیادہ کچھ خشک سا ہو گیا ہے تو کچھ شگفتگی پیدا کردوں۔ یہ لفظ یَـوۡمَ التَّلَاقِ ہے جس میں ''تلاق'' لفظ کا مادہ ''ل ق ی'' ہے جس کے معنی ہیں ''آمنے سامنے ہونا''۔ یہ وہی ہے جس کو ہم ملاقات کہتے ہیں۔ ایک لفظ ''طلاق'' ہے جس کو Divorce کہتے ہیں اس کا مادہ ''ط ل ق'' ہے۔ یہ وہی ہے جو بیوی کو دیتے ہیں' یہ 'ط' کے ساتھ ہے۔ طـلـق کے معنی ''آزاد ہو جانا' آزاد کر دینا'' ہیں۔ میاں صاحب نے غصے میں آ کر یہ کہہ دیا کہ طلاق طلاق طلاق' یعنی میں نے طلاق دی۔ تھوڑے سے وقت کے بعد غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ تو پھر اس چیز کے لیے بھاگتے ہیں کہ اب کیا کیا جائے۔ مُلّا تو بتاتا ہے کہ جس نے غصے میں آ کر یہ بکواس کی تھی' اس کو تو اس کا کوئی جرمانہ نہیں ہوتا' کوئی سزا نہیں ملتی۔ وہ بیچاری جو مظلوم ہے' جس کے ساتھ یہ ہوا ہے' ان کی شریعت کہتی ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ جا کر نکاح کرے' ایک رات اس کے ساتھ رہے' پھر صبح کو اس کے ساتھ آ سکتی ہے (معاذ

اللہ)۔ یہ بڑی مشکل کی بات ہوگئی۔اس نے کہا کہ جی! یہ تو مشکل ہے' میں تو یہ نہیں کرسکتا۔اُس نے کہا: کوئی بات نہیں۔آپ کو پتا ہے کہ فقہ کے قوانین کی ان کتابوں کے ساتھ ایک باب ہوتا ہے۔اسے کتاب الحیل کہتے ہیں کہ یہ جو جرم ہو جائے اس سے بچنے کی راہ کونسی ہے' کیسے بچا جائے۔وہ وہیں ساتھ دیا ہوتا ہے۔مولوی صاحب نے کہا کہ ''تمہیں تو یہ کہہ رہا ہے کہ اتنے دیجئے' یا اتنے مانگتا ہے۔ مجھے اتنے پیسے دو تو میں تمہیں چھڑا دیتا ہوں''۔کہنے لگا جی! ٹھیک ہے۔کہنے لگا: جی! یہ کیا بات ہوئی؟ کہنے لگے: جہاں تمہیں کہیں گے کہ کیا تم نے طلاق طلاق طلاق کہا تھا؟ کہنا کہ جی ہاں' کہا تھا۔انہوں نے کہا: پھر آگے کیا؟ کہا: کہنا کہ ''میں ت نال تلاق کہیا سی' ط نال نئیں سی کہیا۔میں تے کہیا سی تلاق' ملاں گے ملاں گے ملاں گے' میں تے اے کہیا ہیگا سی تے تسی آپ ای اوہنوں ط نال طلاق کہہ دتا ہیگا' لکھیا ہویا تے کتھے ہے نئیں' زبانی کہیا سی ناں'' (میں نے ''ت'' سے ''تلاق'' کہا تھا' ''ط'' والی سے نہیں کہا تھا۔میں نے ''تلاق'' کہا تھا کہ ''ملیں گے' ملیں گے' ملیں گے''۔میں نے یہ کہا تھا مگر آپ نے خود ہی اسے ''ط'' سے ''طلاق'' کہہ دیا تھا۔کہیں لکھا ہوا تو ہوتا نہیں' زبانی تو کہا تھا)۔یہ بڑے دلچسپ لوگ ہیں۔

یہاں يَوْمَ التَّلَاقِ کہا ہے آہاہا! کہا کہ اس يَوْمَ التَّلَاقِ کو کہ جب ''آمنا سامنا'' ہو جائے گا۔کیا لفظ ہے جس سے یہ کہا ہے! يَـوْمَ هُـمْ بٰـرِزُوْنَ (40:16)۔آپ نے تو یہ گرامر کی ضمیریں نہیں پڑھی ہونگی کہ یہ ضمیرِ بارز اور ضمیرِ مستتر کیا چیزیں ہوتی ہیں۔ مستتر ہوتی ہے جو چیز نگاہوں سے چھپی ہوئی ہو' مستور ہو۔''بارز'' ہوتی ہے جو ابھر کر محسوس طور پر سامنے آجائے۔قرآن حمید کیا بات کہہ گیا ہے! کہا کہ یہ جو کچھ تم نے کیا تھا اور اس کے بعد محسوس شکل میں جو قانون تھا اور جو عدالت کا طریق تھا' اس سے تو تم بچ گئے اور چھوٹ گئے اور اس کے بعد تم نے سمجھ لیا کہ اب تو کوئی ہاتھ ڈالنے والا ہی نہیں' معاملہ ختم ہوگیا۔کہا کہ یہ جو تم نے جرم کیا تھا تو یہاں اس کا جو سارا پہلو سامنے آیا تھا' وہ تو محسوس تھا۔اصل چیز اس کی وہ ہے جو محسوس نہیں تھی' مستتر تھی' چھپی ہوئی تھی' کسی کی نگاہ کے سامنے نہیں آسکتی تھی' پولیس والا بھی نہیں دیکھ سکتا تھا' عدالت تک بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔یہ کیا چیز چھپی ہوئی ہے؟ وہ جرم اور جرم کا وہ اثر یا نتیجہ جو انسان کی ذات پر مرتب ہو رہا ہے۔کہا کہ وہ وہاں مستتر تھی۔آج کے دن يَـوْمَ هُـمْ بٰـرِزُوْنَ (40:16) وہ محسوس طور پر تمہارے سامنے آگئی ہوئی ہے۔

انسان کا کوئی عمل ایسا نہیں جو قانونِ خداوندی کی نگاہوں سے چھپا ہوا ہو۔يَـــوْمَ التَّلَاقِ میں وہ بارز ہوئے گا جو یہاں مستتر ہے

کیا بات ہے! یہ ہے جسے آپ قیامت کہتے ہیں' یومِ مکافات کہتے ہیں' یوم التلاق کہتے ہیں۔جو کچھ ہوا اور یہاں اس کی سزا مل

سکتی تھی لیکن تم نے انتظام کرلیا' وہ چھپا ہوا ہی رہا۔ کہا کہ آج وہ بارز ہو کر تمہارے سامنے آ گیا۔ لَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰہِ مِنْھُمْ شَیْءٌ (40:16) جو کچھ تم نے وہاں یہ جرائم کیے تھے' لوگوں کی نگاہوں میں تو سب چھپے ہوئے تھے' قانونِ خداوندی کی نگاہ سے تو کچھ بھی چھپا ہوا نہیں' وہ جانتا تھا۔ ہوا صرف اتنا ہے کہ وہاں یہ چیز ''مستطر'' تھی' اب یہ ''بارز'' ہوگئی ہے۔ اور ظہورِ نتائج کے وقت' مکافاتِ عمل کے سامنے آنے کے وقت' اُس وقت' یہ کہا جائے گا کہ لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ (40:16) کہو آج اقتدار کس کا ہے۔ وہاں تمہارے جتنے صاحبِ اقتدار تھے' جو تمہارے حامی و ناصر تک بھی بن گئے یا جنہوں نے تمہیں چھوڑ دیا' کیا تمہیں چھڑا لیا؟ آج کسی کا اقتدار نہیں۔ یہ بات سن رکھو! لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ (40:16) آج کس کا اقتدار ہے؟ کہا کہ لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ (40:16) صرف خدا کا' خدائے واحد کا ہے۔ دیکھا! یہ لفظ اقتدار کے لیے آیا ہے۔ یہاں یہ لفظ لِمَنِ الْمُلْکُ کہا ہے' دوسری جگہ اس کو الدِّیْنِ (1:3) کہا ہے۔

دین کا مفہوم چند ایک عقائد کا نام نہیں بلکہ یہ ایک پورا نظامِ حیات ہے' انسان اس کا ''دبیلی'' ہے۔

ہم ہر نماز میں سورۃ فاتحہ میں مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (1:3) کہتے ہیں۔ بس! کہتے ہیں اور آگے چلے جاتے ہیں۔ کہیں ذہن میں یہ آ جائے کہ یہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (1:3) ہے کیا؟ دین کے معنی ''نظام'' ہوتا ہے' دین کے معنی ''جزا اور سزا'' ہوتا ہے' ''نتیجہ'' ہوتا ہے' ''قانون'' ہوتا ہے۔ یہ عربی زبان کا بڑا جامع لفظ ہے۔ کہا کہ یہ تو تم روز مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (1:3) کہتے ہو۔ قرآن حمید سے پوچھو کہ یَوْمِ الدِّیْنِ کیا ہے۔ عزیزانِ من! ایک یا دو آیتوں میں قرآن حمید نے سارا معاملہ صاف کر کے رکھ دیا۔ ہمارے ذہن میں تو یوم الدین یہی ہے کہ وہ قیامت تک ہے۔ اور ہم نے تو سب چیز قیامت تک اٹھا کر رکھ دی ہے' اس دنیا میں تو ان چیزوں کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ اور اگر قرآن حمید میں غور کریں تو وہ قیامت تک کا جو معاملہ ہے' وہ تو اس نے کہا ہے کہ تمہاری سمجھ میں اب آ ہی نہیں سکتا۔ جو تمہاری سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا اس کے متعلق یہ چیزیں بار بار کہنا سوائے اس کے کچھ نہیں کہ یہ ایک اعتقاد کی چیز ہے۔ قرآن حمید اس دنیا کی بات کرتا ہے' یہ یہیں کے معاملات ہیں۔ الدِّیْنِ کے معنی ''نظام'' ہوتا ہے۔ ایک نظام وہ ہے جس میں اقتدار انسانوں کو حاصل ہوتا ہے اور دوسرے انسان ان کے محکوم ہوتے ہیں۔ وہ جسے ''دبیلی'' کہتے ہیں' یعنی کسی کے نیچے ہونا' کسی صاحبِ اختیار کا محکوم ہونا۔ اصل تو یہ ہے کہ یہاں محکوم کا لفظ بھی وہ بات پیدا نہیں کرتا ''جو کسے دا دبیلی ہونا ہوندا اے'' (جو کسی کا دبیلی ہونا کہتے ہیں) کہ ہر طرح سے اس کا محتاج بھی' اس کا محکوم بھی' اس کا تابعدار بھی ہو' یہ وہی ہے ''جنوں تھلے لگیا ہویا کیندے نیں'' (جسے نیچے لگا ہوا کہتے ہیں)۔

قرآنِ حکیم کی نظر میں یوم الدین کی وضاحت کہ جب انسانوں پر کتاب خداوندی کی حکومت ہوگی۔

قرآن حکیم کہتا ہے کہ تم یہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (1:3) کہتے ہو۔ یہاں سورۃ الانفطار میں وہ بات شروع کرتا ہے کہ وَمَآ اَدْرٰکَ

مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ (82:17) کبھی کھڑے ہوکر سوچا بھی کہ یَوۡمِ الدِّیۡنِ (1:3) کیا ہے؟ جسے خدا کا نظام کہتے ہو وہ کیا ہے؟ کبھی یہ سوچا ہے؟ تمہیں یہ کون بتائے گا سوائے خدا کے۔ یہ ایسی اہم چیز تھی کہ اسے دہرایا ہے۔ کہا ہے کہ وَمَآ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ ثُمَّ مَآ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ(82:17-18) او پھر سنو جو ہم کہتے ہیں۔کوئی اور نہیں تمہیں بتائے گا کہ یَوۡمِ الدِّیۡنِ کیا ہے۔ یہ وہ ہے جس کے لیے تم روز مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ(1:3) کہتے ہو۔عزیزانِ من! سنیے یَوۡمِ الدِّیۡنِ کیا ہے؟ اسے وہ نظامِ خداوندی کہتا ہے۔ جب وہ نظام قائم ہوگا تو اس میں کیفیت یہ ہوگی کہ یَوۡمَ لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا (82:19) یہ وہ دور ہوگا جس میں ہر انسان اپنے اپنے اعمال کو اپنے سامنے دیکھے گا' کسی انسان کا دوسرے انسان پر کوئی اختیار و اقتدار نہیں ہوگا۔ یہ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ہے۔نماز پڑھنے والا دن میں کم از کم چوالیس مرتبہ تو سورۃ فاتحہ میں یہ دہراتا ہے کہ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ(1:3) پھر آگے ہے کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (1:4) ۔اُسے پتا ہی نہیں ہوتا کہ کیا کہہ رہا ہوں۔وہ ایسی اہم چیز تھی کہ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ مَآ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ (82:17) او! کبھی سوچا بھی کہ یوم الدین کیا ہے۔ یہ تمہیں کون بتائے گا۔پھر کہا کہ ثُمَّ مَآ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ(82:18) او! بڑی اہم چیز ہے سن لو! ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ جسے تم یوم الدین کہتے ہو' جسے نظامِ خداوندی کہتے ہو' وہ کیا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب انسانوں پہ خدا کی کتاب کی حکومت ہوگی۔اب سوال یہ ہے کہ اس میں کیا کیفیت ہوگی؟

یوم الدین میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا نہ محکوم ہوگا اور نہ ہی محتاج

عزیزانِ من! اس سے زیادہ جامع اور اس سے زیادہ صحیح انسانیت کو شرف بہم پہنچانے والا نظام کوئی نہیں۔اس نظام میں لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا (82:19) ہوگا یعنی کسی انسان کا دوسرے انسان پر کوئی اقتدار و اختیار نہیں ہوگا۔تو کیا پھر انارکی ہوگی' فوضویت ہوگی؟ انسانوں نے تو معاشرے میں رہنا ہے۔تو پھر کیا ہوگا؟ کہا کہ کسی انسان کا دوسرے انسان پہ اقتدار نہیں ہوگا۔وَالۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ (82:19) اس دور میں صرف خدا کی حکومت ہوگی۔عزیزانِ من! مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ(1:3) کے یہ معنی ہیں کہ جس نظام میں خدا کے سوا کسی اور کو کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہ ہو: لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا(82:19)۔دیکھیے! خدا انسانوں کو کس مقام پہ پہنچاتا ہے! یہ قرآن کہاں لے جاتا ہے! میں سمجھتا ہوں ہم تو دل کی گہرائیوں میں بھی تصور نہیں کر سکتے کہ وہ نظام کیا ہوگا جس میں کسی انسان کو دوسرے انسان پہ کوئی اختیار اور اقتدار نہیں ہوگا۔اتنا بڑا شرفِ انسانیت' ایسی تکریمِ انسانیت کو آزادی کہا جائے گا۔ یہ ہے لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا وَّالۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ (82:19)۔

یوم الدین کے نظامِ حکومت میں کوئی کسی کی محنت کو سلب نہیں کر سکے گا' سلب کرنے والوں کے دل حلق تک آ جائیں گے اور ظلم' جو فساد کی جڑ ہے' معنیٰ' غلط نظام کے تباہ کن نتائج اور نگاہ و دل کا قانون خداوندی

کہا کہ لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ(40:16) اس دور میں کسی کا کسی دوسرے پہ کوئی اختیار و اقتدار نہیں ہوگا۔ اُس دن ہر ایک زبانِ حال سے پکار اٹھے گا کہ سب اختیارات صرف خدائے واحد کے لیے ہیں جو ہر بات پر غلبہ رکھتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پھر ہوگا کیا؟ کہا کہ اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا کَسَبَتْ (40:17) جو کچھ کوئی کرے گا' اس کا بدلہ اس کے سامنے آئے گا۔ نہ کسی کی محنت میں کوئی سلب و نہب ہوگا' نہ کسی کو بنا کیے ہوئے سب کچھ ملے گا' نہ کسی پہ کسی قسم کا کوئی ظلم ہو سکے گا۔ وہاں تو لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (53:39) ہر انسان کی محنت کا ماحصل اس کو ملے گا۔ یہ ہے کہ اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا کَسَبَتْ لَاظُلْمَ الْیَوْمَ (40:17) اس دور میں' اس نظام میں' کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

آپ کو معلوم ہے کہ عربوں کے ہاں ظلم کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ''جس شے کو جس مقام پہ ہونا چاہیے اس کا وہاں نہ ہونا''۔ کیا بات ہے! یہ جس قدر بھی ہمارے ہاں فساد ہے' وہ اسی بات کا ہے کہ جسے جہاں ہونا چاہیے وہ وہاں نہیں ہے۔ یہ بڑی بات ہے کہ جسے جہاں ہونا چاہیے وہ وہاں نہیں ہے۔ ''ذرا موڈھے اچ زور ہیگا تے اوا گلے نوں زور دے کے اگاں لنگ جاندا اے' تھوڑا جیا کمزور ہے تے ہور پچھاں ہو جاندا ہیگا اے۔ آ ویکھیا اے کیو (قطار) دے وچ کمزور آدمی دی کی حالت ہوندی اے' بس اچ ای نئیں چڑھ سکدا۔ جیہدے موڈھے اچ زور اے اوا گاں لنگ جائے گا'' (جس کے کندھے طاقتور ہیں وہ طاقت لگا کر آگے والے سے آگے نکل جاتا ہے۔ اگر وہ کم طاقتور ہے تو وہ اور بھی پیچھے رہ جاتا ہے آپ نے قطار میں دیکھا ہوگا کہ کمزور آدمی کی کیا درگت بنتی ہے' وہ تو بس میں سوار ہی نہیں ہو سکتا۔ جو طاقتور ہے وہی آگے بڑھ جائے گا)۔ کہا کہ لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (40:17) یہ نہیں ہے کہ ہم نے یہ معاملے ملتوی کر رکھے ہیں' ٹال رکھے ہیں' یہ تو ساتھ کے ساتھ حساب ہوتا چلا جاتا ہے۔ فرق اتنا ہی ہے کہ پہلے' شروع میں' یہ (معاملات اور ان کے نتائج) مستور ہوتے ہیں' اس کے بعد بارز ہو جاتے ہیں۔

عزیزانِ من! جب قوموں پر تباہی آتی ہے تو ان کو نظر آ جاتا ہے کہ وہ کونسا غلط نظام تھا جس کے یہ تباہ کن نتائج ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ کہا کہ اے رسول! وَاَنْذِرْهُمْ یَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَی الْحَنَاجِرِ کٰظِمِیْنَ (40:18)۔ یہاں یوم الاٰزق کہا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ہم ہر چیز قیامت تک اٹھا رکھتے ہیں۔ یہاں ہے کہ ''وہ دن جو قریب آ رہا ہے' ان کو اس کی تباہی سے آگاہ کرو' ۔ یہیں اسی دنیا میں تباہیاں آتی ہیں۔'' اس دن پھر جب ٹکراؤ ہوگا' جب اس دن تباہی آئے گی' جب اس دن شکست ہوگی' تو اقتدار کی

کرسیاں الٹی ہوکر گر پڑیں گی''۔ جب یہ چیز ہوگی تو وہ ہوگا جسے اردو میں کہتے ہیں کہ ''دل بلیوں اچھل کر آ گیا''۔ دلوں کی یہ کیفیت ہوگی کہ وہ حلق تک آ جائیں گے لیکن مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ (40:18) اس دن کوئی کسی کا نہ دوست ہوگا' نہ سفارشی ہوگا' نہ ہی کوئی ایسا ہوگا کہ کسی کی بات مانی جائے۔ ہر ایک کا اپنا کیا ہوا عمل ہوگا اور اس کا نتیجہ ہوگا۔ وہ نہ کسی سے رعایت اور سفارش سے ایسے مقام پہ پہنچا دے گا جہاں پہنچنے کے وہ لائق نہیں ہے' نہ کسی کو کوئی روک کر پیچھے رکھے گا کہ جس سے زیادہ کا وہ مستحق ہے۔ اس دن کوئی ایسا نہیں ہوگا جو اس قسم کا کوئی اثر پیدا کر سکے۔ اور پھر جیسا ابھی کہا ہے کہ یہ اس خدا کا قانون ہے جو یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ (40:19) نگاہوں کی خیانت اور دلوں کے رازوں تک سے واقف ہے۔

خدا کے ہاں دلوں میں گزرنے والے خیالات اور نگاہوں کی خیانت بھی انسانی ذات پر اثر انداز ہوتے ہیں

وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ ''تمہارا ارادہ بھی ایک عمل ہے اور وہ خود ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔'' ارادہ محسوس شکل میں باہر آتا ہے تو اس کو ہم عمل یا ایکشن کہتے ہیں۔ دنیا کا کوئی بھی عدل کا نظام ہو' اچھے سے اچھا نظامِ عدل بھی ہو تو اس میں بنیاد یہ ہوتی ہے کہ جرم کے سرزد ہونے کے بعد عدل متحرک ہوتا ہے۔ آپ کہیں بیٹھے ہوئے ہزار سوچتے رہیں کہ میں نے اس کا یہ چرا لینا ہے' یہ باہر نکلے تو میں نے اس کو چھری مار دینی ہے' یہ کچھ کرنا ہے۔ پولیس کا سپاہی آپ کے پاس کھڑا ہوگا لیکن وہ آپ کو ہاتھ نہیں ڈال سکتا' عدالت آپ کو سزا نہیں دے سکتی۔ یہ جرم نہیں ہے لیکن خدا کا قانونِ مکافات کہتا ہے کہ جو بات تم نے دل سے شروع کی' تم نے جس وقت ارادہ کر لیا' اس کا اثر تمہاری ذات پہ مرتب ہونا شروع ہو گیا۔ وہ اگلی چیز ہے کہ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس کا موقع ہی نہ ملے۔ دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہو' ذہن میں ہے کہ یہ اٹھ کر جائے تو میں اس کی گھڑی چراؤں۔ وہ اٹھ کر ہی نہیں جاتا' تمہاری بدنصیبی۔ تو آپ نے دنیا کی عدالت کی رو سے کوئی جرم نہیں کیا۔ نیٹشے (1844-1900ء) کا وہ بڑا ہی معروف فقرہ ہے کہ ''جو جرم تم نے میرے خلاف کیا ہے اس کو تو میں معاف کر دوں گا لیکن اس سے جو جرم تم نے اپنے خلاف کیا ہے اسے کون معاف کرے گا''۔ یہ جو گھڑی چُرانے کا ارادہ تھا' یہ اپنے خلاف جرم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم تو نگاہوں کی خیانت اور دلوں کے ارادوں تک سے واقف ہیں۔ یہ چیزیں بھی سامنے آئیں گی۔

ہر قسم کی برائی کے خاتمے کا علاج دل و دماغ کا زاویۂ نگاہ بدلنے میں ہے

عزیزانِ من! اگر انسان کو اپنے ارادوں' خواہشات' اپنی آنکھوں اور اپنے قلب پہ' کنٹرول ہو جائے تو جرائم کا خاتمہ ہو جائے۔ اور جرائم کا خاتمہ اسی صورت میں ہی ہو سکتا ہے کہ آپ کے دل میں بھی جرم کرنے کا ارادہ نہ پیدا ہو۔ اور یہ چیز قرآن کی تعلیم اور تربیت سے ہو سکتی ہے۔ یہ باہر کا' خارجی قانون یہ نہیں کر سکتا' یہ خدا کے اُس قانون کے مطابق ہوتا ہے جو یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ

وَمَا تُخۡفِی الصُّدُوۡرُ . وَاللّٰہُ یَقۡضِیۡ بِالۡحَقِّ (40:19-20) ظاہراً اعمال تو ایک طرف نگاہ کی خیانتوں اور دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے۔ یوں وہ خدا الحق کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔ ظلم نہیں ہوتا۔ تم کہو گے کہ صاحب! میں نے وہ چیز چرائی تو نہیں تھی؟ جناب! چرانے کا ارادہ تو کر لیا تھا۔ یہ الحق ہے۔ وَالَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ لَا یَقۡضُوۡنَ بِشَیۡءٍ اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ (40:20) ایسا وہی کر سکتا ہے جو سب کچھ سننے والا' سب کچھ دیکھنے والا ہو۔ اس کے سوا جتنے بھی اور عدالت کے نظام ہیں ان کی گرفت محسوسات اور مرئی جرائم تک ہے۔ وہ جو جرائم کا سرچشمہ ہے جہاں سے یہ ساری چیزیں ابھرتی ہیں ان تک تو ان کی دسترس ہی نہیں ہو سکتی۔ اگر دل کے ارادوں پر کسی کا کنٹرول نہ ہو تو پھر جرائم کا ازالہ کیسے ہو سکتا ہے' جرائم کس طرح رک سکتے ہیں۔ اس کے بعد قرآن حکیم یہ سارے احکامات نظری طور پر (Abstract) بیان کرتا ہوا تاریخ کی شہادت لاتا ہے۔ وہ افراد کی بات نہیں کرتا بلکہ قوموں کی بات کرتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم افراد کو اچھا بناتی ہے اور گرفت کے لیے دو شرائط کو لازم ٹھہراتی ہے

عزیزانِ من! یہ بھی قرآن حکیم کی عجیب چیز ہے کہ وہ افراد کو اچھا بناتا ہے تاکہ اس سے اچھا معاشرہ بن جائے' اچھی قوم بن جائے ورنہ وہ ترقی اور تنزل قوموں کا بیان کرتا ہے' اس نے تباہیاں بھی قوموں کی گنائی ہیں۔ یہاں تک لانے کے بعد کہا کہ اَوَ لَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ (40:21) کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں! روز جاتے ہیں' راستے میں ان اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات دیکھتے ہیں۔ کیا انہوں نے وہاں دیکھا نہیں ہے کہ یہ بستیاں کتنی شان و شوکت کی مالک تھیں۔ یہ حجاز کے عرب ان سب سے واقف تھے' ان کی داستانیں ان کے ہاں روز دہرائی جاتی تھیں' وہ ان راستوں سے روز گزرتے تھے۔ کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ کس قدر عروج اور اقبال اور شان و شوکت اور قوت و حشمت کے یہ مالک تھے۔ پھر کیا ہوا؟ کہا کہ کَانُوۡا ہُمۡ اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً وَّاٰثَارًا فِی الۡاَرۡضِ (40:21) وہ قوت میں بھی ان سے بڑھ چڑھ کر تھے' ان کے پاس سامانِ پیداوار بھی بہت زیادہ تھا اور شان و شوکت بھی بڑی تھی۔ فَاَخَذَہُمُ اللّٰہُ بِذُنُوۡبِہِمۡ (40:21) خدا کے قانونِ مکافات نے ان کی خطا کوشیوں پر ان کی گرفت کی۔ وَمَا کَانَ لَہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ وَّاقٍ (40:21) تو پھر اس سے چھڑانے والا کوئی نہ ہوگا۔ اس سے ورے تو چھڑانے والے آ جاتے ہیں لیکن وہاں چھڑانے والا کوئی نہیں۔ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَانَتۡ تَّاۡتِیۡہِمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَکَفَرُوۡا فَاَخَذَہُمُ اللّٰہُ (40:22)۔ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ قرآن کریم نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ کسی پہ گرفت کرنے کے لیے ہماری دو شرطیں ضرور ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ قانون اس کے علم میں آ چکا ہو جس کی خلاف ورزی سے جرم ہوتا ہے۔ اور دوسری اس کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیت اتنی

ہو چکی ہو کہ وہ سمجھ لے کہ قانون کیا ہے۔قرآن حمید نے بیشمار مقامات میں یہ باتیں واضح کی ہیں۔ یہاں (40:22) میں کہا کہ ''یہ اس لیے ہے کہ ہم نے اپنے رسولوں کو' پیغامبروں کو' ان قوانین کو دے کر بھیجا۔انہوںؑ نے ان تک پہنچایا اور اِنہوں نے اس کے باوجود اس سے سرکشی برتی۔اس پر خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں پکڑ لیا۔

خدا تعالیٰ کے قانونِ مکافات میں قوت بھی ہے اور مجرم کو سزا دینے کی صلاحیت بھی

عزیزانِ من! اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پھر یہ خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت میں آ گئے۔اِنَّہٗ قَوِیٌّ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ (40:22) (حقیقت یہ ہے کہ خدا کا قانون بڑی قوتوں والا اور مجرمین کا پیچھا کرنے میں بڑا ہی سخت واقع ہوا ہے)۔کیا بات ہے! وہ قوت بھی رکھتا ہے۔ایک تو یہ ہے کہ مجرم کو پکڑنے کی قوت تو ہے لیکن پکڑنے کا ارادہ نہیں کرتا' بیٹھا رہتا ہے۔تو اس کی یہ قوت کسی کام نہیں آئی۔یہ ساری پولیس کی فورس پتا نہیں' یہ پنجاب میں پچاس ساٹھ ہزار❶ ہوگی' ان کے اندر بڑی قوت ہوتی ہے لیکن کیا بات ہوتی ہے کہ یہ ساری قوت پکڑنے میں کسی کام نہیں آتی؟ کہتا ہے کہ یہ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ (40:22) نہیں ہے' مجرم کا پیچھا نہیں کرتی۔خدا کا نظام وہ ہے کہ قوت بھی رکھتا ہے اور مجرم کا پیچھا بھی اتنی سختی سے کرتا ہے ''ایہڈا اوڈا کھوجی ہیگا اے'' (اتنا بڑا کھوجی ہے) کہ کوئی اس سے کہیں جا نہیں سکتا۔

داستانِ حضرتِ موسٰیؑ اور فرعون کا ذکر

اس کے بعد حضرت موسٰیؑ کی داستان آئی۔ان ساری داستانوں میں حضرتِ موسٰیؑ اور فرعون کی داستان بہت مشہور ہے اور اسے قرآن حکیم بار بار بیان کرتا ہے۔کہا کہ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ (40:23) ہم نے موسٰیؑ کو اپنے بیّن قوانین دے کر بھیجا۔اور اس کے بعد ایسے دلائل اور ایسے اقتدار کی باتیں دیں جو بڑی واضح اور کھلی ہوئی باتیں تھیں' جو انہوںؑ نے فرعون کے ساتھ جا کر کی ہیں۔عزیزانِ من! اندازہ لگایئے ہم تو فرعون اور موسٰیؑ کی یہی داستان جانتے ہیں۔

داستانِ فرعون میں ہامانیت' قارونیت اور فرعونیت کے باہمی روابط کی اہمیت کو واضح کیا ہے

قرآن حمید تو انسانیت کے لیے تباہی اور بربادی کے تین ہی عناصر یعنی تین ہی غلط نظام گنا تا ہے۔(1) ملوکیت کا استبداد کہ کسی ایک انسان کی حکومت جسے آپ شخصی حکومت کہتے ہیں۔اس کا نمائندہ قرآن حمید نے فرعون کو قرار دیا ہے جو کہتا ہے کہ اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی (79:24) میں ہی تمہارا ''اَن داتا'' ہوں' تمہارا سب سے بڑا پرورش کرنے والا میں ہی ہوں۔یہ ہے ملوکیت کا استبداد

---

❶ یاد رہے یہ بات جنوری 1981ء کی 30 تاریخ کو کہی گئی تھی۔آج یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔

اوراس کا نمائندہ ہے فرعون۔ تباہی اور بربادی کے ان تینوں عناصر کو ایک جگہ لیا ہے۔ موسیٰؑ کو اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَهَامٰنَ (40:24) بھیجا۔ (2) مذہبی پیشوائیت کے اربابِ اقتدار' تھیوکریسی والے ہامان ہیں۔ ہامان وہاں کی مذہبی پیشوائیت کا ہیڈ پریسٹ تھا۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ صاحب! انہوں نے کیا کرنا ہوتا ہے' یہ تو وہاں کوئی بھگتی' کوئی پرستش' کوئی نماز روزے والی بات کرتے ہیں۔ بالکل نہیں۔ ان کا جب اثر پڑتا ہے تو یہ فرعونیت' ہامانیت کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ انسان شخصی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے پہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد یہ بغل میں کتابیں دابے ہوئے آ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''بالکل نہیں! یہ تو خدا کی دی ہوئی حکومت ہوتی ہے' السلطان ظل اللہ علی الارض یعنی بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے' جسے وہ چاہتا ہے حکومت دیتا ہے' جس سے چاہتا ہے چھینتا ہے' یہ تو خدا کی دی ہوئی ہے اس کے خلاف اگر آواز اٹھاؤ گے تو خدا کے خلاف یہ آواز اٹھانی ہوگی''۔ وہ کھشتری راجہ جب تخت پہ بیٹھنے لگتا ہے تو برہمن آ کر ٹیکتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ایشور کا اوتار ہے۔ اُسے یوں منواتا ہے۔ اور (3) قارون ہے۔

آپ کے ہاں ہزار سال سے ملوکیت کی' شخصی حکومت کی' ایک پوری کی پوری مسلسل لڑی چلی آ رہی ہے۔ پہلی ملوکیت جو یہ کہتے ہیں وہ حضرت معاویہؓ کی ہے اور انہوں نے یزید [1] کو ولی عہد بنایا۔ اس کے خلاف آج تک ہر ایک لعنت برسا رہا ہے۔ اس تیرہ سو سال میں اس کے بعد یہ جتنے بادشاہ بنے اسی طرح سے بنے۔ ان شہنشاہوں کے دربار میں منبروں پہ کھڑے ہو کر یہ آپ کے ہاں بڑے بڑے (پیشوا' ہامان) جن کو آپ برگزیدہ ہستیاں کہتے ہیں ان کے لیے دعائیں مانگتے تھے۔ لوگوں کو کہتے تھے کہ ان کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہے۔ تو قرآن کریم نے فرعون کہا اور اس کے ساتھ ہامان کہا۔ اور تیسری چیز نظامِ سرمایہ داری ہے' اس کے لیے وَقَارُوۡنَ کہا۔ قرآن کریم تینوں ہی لے آیا۔

عزیزانِ من! یہ رسول بڑی انقلابی ہستیاں ہوتی تھیں۔ کس کس چیز کے خلاف وہ انقلاب برپا کرتے تھے؟ وہ انسانوں کی حکومت اور اقتدار کے خلاف' مذہبی پیشوائیت کی فریب کاریوں کے خلاف اور نظامِ سرمایہ داری کے سربراہوں کی خون آشامیوں کے خلاف' انقلاب برپا کرنے کے لیے آتے تھے۔ ان تینوں کی طرف حضرت موسیٰؑ کو بھیجا۔ فَقَالُوۡا سٰحِرٌ كَذَّابٌ (40:24) اُنؑ کے آتے ہی اُنؑ سے کہا گیا کہ جھوٹ بولتا ہے کہ ہم تباہ ہو جائیں گے' برباد ہو جائیں گے۔ اتنی بڑی شوکت کے مالک برباد ہو جائیں گے! یہ کیا ہی عجیب بات کہہ رہا ہے!

---

[1] حضرت امیر معاویہؓ کا دور 661.680ء/41.60 اور یزید بن امیر معاویہؓ کا 680.683ء/60.84ھ تک رہا۔

فرعون کی خفیہ سازش کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد اور فرعون کے خدشات

کہا کہ فَلَمَّا جَآءَ هُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَ هُمْ (40:25) جب موسیٰؑ ہماری طرف سے یہ سارے قوانین لے کر' دلائل لے کر گیا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے ابناء کو قتل کرواوران کی نساء کو زندہ رکھو۔ اب آپ کو معلوم ہے کہ یہ داستان لمبی ہے۔ جب فرعون انؑ سے اس پہ بات کرتے ہوئے عاجز آ گیا تو اس نے کہا تھا کہ یہ تمہارا میرا معاملہ نہیں ہے کیونکہ یہ سلطنت کا معاملہ نہیں' مذہب کا معاملہ ہے تو میں مذہبی رہنماؤں کو' پیشواؤں کو بلاتا ہوں۔ پھر اس نے ہامان کو بلایا تھا۔ ان کو تو چھوڑ دیجیے۔ آخری بات یہ ہے کہ اس نے یہ طے کیا تھا کہ موسیٰؑ کے ساتھ جو ایمان لائیں' جو اس کی پارٹی کے آدمی ہوں' جو ان کے ابنائے قوم ہوں' جو سرکردہ لوگ ہوں' جن کے متعلق یہ خیال ہو کہ یہ کچھ شرارت کریں گے' ان کو ذلیل کرو' ان کو قتل کرو۔ اور وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَ هُمْ (40:25) ان میں سے جو لوگ عورتوں جیسی خصلتیں رکھتے ہوں' عورتوں کو محاورے کے طور پر ہمیشہ کمزور مانا گیا ہے' ان کو بڑھاؤ' چڑھاؤ' مقرب بناؤ۔ اور جن میں جوہرِ مردانگی ہوں ان کو ذلیل بھی کرواوران کو قتل بھی کرو۔ یہ پالیسی اختیار کرو' اس کی قوم میں پھوٹ ڈالو۔ جو ذرا سا سرکردہ ہے' ان کے ساتھ یہ کرو۔ اور جو لوگ ذرا سے لالچ میں آنے والے ہوں' کمزوردل کے ہوں' ان کو اپنے ساتھ ملالو۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (40:25)۔ کیا لفظ استعمال کیا ہے! کہا ہے کہ یہ ایک خفیہ تدبیر تھی جسے سازش کہتے ہیں۔ یعنی اگر وہ سچ مچ کا قتل کہتے ہیں کہ بچوں کو قتل کر دیتا تھا تو اس کے لیے یہ لفظ کید آ ہی نہیں سکتا۔ کید تو ایسی تدبیر ہوتی ہے کہ جو پتا نہ چلے کہ کیا کر رہا ہے اور کر سب کچھ جائے۔ اس نے یہ کیا لیکن غلط اصولوں پر مبنی اس قسم کی سازش کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ تھوڑے وقت کے لیے نظر آتا ہے کہ کامیاب ہو رہی ہے' آخر میں اس کے حصے میں ناکامی آتی ہے۔

فرعون نے اپنے تمام حربے آزما دیکھے۔ یہاں قرآن کریم کہتا ہے کہ نظر آتا ہے کہ یہ محض مذہبی بات نہیں تھی' وہ تو بہت بلند سیاست تھی۔ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (40:26) فرعون نے کہا کہ بھئی! دیکھو' اب تم میرا ہاتھ نہ پکڑو۔ وہ اپنی کابینہ کے اندر مشورہ کر رہا ہوگا۔ وہاں کہا کہ مجھے اس کو قتل کر دینے دو۔ پھر یہ اپنے رب کو پکار کر دیکھ لے کہ وہ اسے کس طرح بچا سکتا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ یہ تمہارے نظامِ حکومت کو بدل دے گا اور ایک دوسرا نظام لے آئے گا۔ عزیزانِ من! یہاں ایک لفظ یُبَدِّلَ ہے یعنی یہ اس نظام کی جگہ دوسرا نظام لے آئے گا' یہ اپنا نظام لے آئے گا۔ مجھے یہ خطرہ نظر آتا ہے۔ اور اگر یہ ایسا نہ کر سکا تو اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (40:26) کم از کم فساد تو برپا کر ہی دے گا تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اور یہ موجودہ نظام تہس نہس ہو کر ملک میں فساد برپا کر دے گا۔

اِدھر ملوکیت کا آخری حربہ کہ اسے قتل کردو اور اُدھر فرعون کی کیبنٹ کے ایک مردِ مومن کی عظمت کا تذکرہ

فرعون نے کہا کہ یا تو نظامِ ملوکیت کی جگہ یہ اپنا نظام قائم کرے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو یہ فساد برپا کردے گا۔ اس لیے مجھے چھوڑ دو اور اسے قتل کر دینے دو۔ قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّىْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ (40:27) اس پر موسیٰؑ نے صرف یہ کہا کہ میں تمہارے اس جور و ستم کی دھمکیوں کے خلاف خدا کے قانونِ رحمت میں پناہ ڈھونڈتا ہوں۔ وہ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ قانونِ رحمت کس کے خلاف ہے؟ بتایا کہ وہ اُس متکبر کے خلاف ہے جو لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ (40:27) جو خدا کے قانونِ مکافات پر ایمان نہیں رکھتا۔ متکبر تو وہی ہوسکتا ہے جو اپنے مواخذے سے ڈرتا نہ ہو۔ جس کو حساب کا فکر نہ ہو' جو اس سے انکار کرتا ہو' وہی تکبر کرسکتا ہے۔ کہا ہے کہ ''ایسے شخص کے خلاف میں خدا کے قانون کی پناہ میں آتا ہوں''۔ اور آگے بات وہ شروع ہوئی اور آپ کو پتا ہے جس دن میں نے یہ سورۃ المؤمن شروع کی تھی' تو میں نے کہا تھا کہ یہ سورۃ المؤمن ایک مومن کے نام پہ ہے۔ تو اس مقام کے اوپر قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ فرعون کیبنٹ میں یہ ڈسکس کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ مجھے اس کو قتل کر دینے دو۔

عزیزانِ من! قرآن کریم نے آگے کہا ہے کہ انہی میں سے ایک مردِ مومن اٹھا اور اس نے اٹھ کر اس کیبنٹ کی میٹنگ کے اندر تقریر کی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس مردِ مومن کی کتنی سعادت اور شرف ہے کہ قرآن کریم' جس کا ایک ایک لفظ ہمالیہ کی طرح اپنی جگہ اٹل ہے' ابد درکنار ہے' کبھی محو نہیں ہوسکتا' اس نے اس مردِ مومن کی پوری تقریر' دو رکوعوں[1] کے اندر' Verbatim (لفظاً) درج کی ہے۔ اور وہ اسی لیے کی ہے کہ انقلابی روح اور جذبات رکھنے والا شخص جب اٹھ کر متکبر کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ پھر کس بیباکی سے اور صداقت سے بات کرتا ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے اس کی پوری تقریر کو اپنے ہاں محفوظ رکھا ہوا ہے۔ اور یہاں سے اس کی تقریر شروع ہوجائے گی کہ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ (40:28) وہ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ اٹھا اور اس نے بھرے دربار میں کہا کہ......

عزیزانِ من! آج وقت ہوگیا۔ سورۃ المؤمن کی آیت 27 تک ہم آگئے' 28 ویں سے ہم آئندہ اس تقریر کو لیں گے۔ اس میں آپ دیکھیے گا کہ مردِ مومن اس قسم کے ہوتے ہیں۔ فرعون' ہامان اور قارون کے مقابلے میں کھڑا ہو کر' ایک مردِ مومن بھی اگر اس طرح سے کہنے والا ہو تو انقلاب برپا ہوجاتا ہے۔ قرآن کریم تو یہ کہہ رہا ہے کہ ان کی ساری تدابیر اور کید انہوں نے خاک میں ملا کر رکھ دیئے مگر شرط یہ ہے کہ کوئی ایک اٹھے تو سہی!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

---

[1] مردِ مومن کی تقریر (40:28-44)

تیسرا باب: **سورة المؤمن** (آیات 28 تا 29)

عزیزانِ من! آج فروری 1981ء کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمن کی آیت 28 سے ہو رہا ہے:(40:28)۔

داستانِ موسیٰؑ میں فرعون کے جبر، استکبار، سلب ونہب کے خلاف ایک مردِ مومن کی حق گوئی اور ایمان کو چھپانے میں ضرورت کے وقت جھوٹ بولنے کے فتویٰ کے لیے دلائل

جیسا کہ میں نے پچھلے درس میں عرض کیا تھا کہ آج آغازِ سخن تاریخ کی ایک ایسی مثال سے ہو رہا ہے جسے قرآنِ کریم نے پوری تفصیل کے ساتھ اپنی دفتین میں محفوظ کر دیا ہے۔ یہ ہے دربارِ فرعون کا ایک مردِ مومن۔ کشمکشِ صاحبِ ضربِ کلیمؑ اور فرعون کا پس منظر تو آپ کو یاد ہوگا۔ ایک طرف جبر، استکبار، ظلم، سلب ونہب کا مجسمہ فرعون ہے جو خود ظلم اور بربریت کے لیے ضرب المثل ہو چکا ہے۔ فرعونیت کے معنی انتہائی شدت کے درجے کا استبداد اور جبر اور قہر ہوتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں خدا کا ایک پیغمبر ہے جو عام ذہنوں کے اندر تو ایک مبلغ اور واعظ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اتنا بڑا انقلابی ہے کہ وہ فرعون کے ساتھ ٹکر لے رہا ہے۔ یہ اکیلا فرعون ہی نہیں ہے کہ جس کے پاس حکومت کی قوت تھی بلکہ اس کے ساتھ قارون بھی ہے جو سرمایہ داری کا نمائندہ ہے اور ہامان بھی جو مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ ہے۔ یہ تینوں قوتیں، تینوں لعنتیں ہیں، جو انسانیت کے سینے پر قابوس کی طرح سوار ہوتی ہیں، ان تینوں سے بیک وقت ٹکر لینے کے لیے یہ ایک گلہ بان آتا ہے جو دس بارہ برس تک مدین کی وادیوں میں بھیڑیں چراتا رہا تھا۔ پہلے مباحث قرآن کریم کے مختلف مقامات پہ پھیلے ہوئے ہیں۔

اور وقت وہ آ گیا ہے کہ جب فرعون نے تنگ آ کر بالآخر اسے قتل کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی کیبنٹ میں وہ اس فیصلے کو Announce (اعلان) کر رہا ہے کہ تم میرے ہاتھ چھوڑ دو: ذَرُوۡنِیۡۤ اَقۡتُلۡ مُوۡسٰی (40:26) تم مجھے چھوڑ دو کہ میں اسے قتل

کروں۔اور پھر طنز ہے کہ وَلۡيَدۡعُ رَبَّهٗ (40:26) اور پھر میں دیکھوں کہ وہ کس طرح اپنے خدا کو بلاتا ہے یا اسے کہوں کہ جاؤ اپنے خدا کو بلا کر لاؤ۔ یہ بھی فرعونیت کی بڑی چیز تھی جو کہا ہے۔کیا انداز ہے قرآن کریم کا! چھوڑ و مجھے میں اسے قتل کروں۔نظر آتا ہے کہ اگر چہ فرعون تھا اور فرعون سے بڑا ڈکٹیٹر کون ہوسکتا ہے لیکن کیبنٹ کا کچھ انداز اس کے ہاں بھی تھا اور وہ ان سے بھی مشورے کرتا تھا۔اور اسی لیے ان سے یہ کہہ رہا ہے کہ چھوڑو میرے ہاتھ' مجھے اسے قتل کرنے دو۔بہر حال بات یہاں تک پہنچ گئی کہ مجھے قتل کرنے دو اور پھر میں کہوں کہ جاؤ بلاؤ اپنے خدا کو۔افوہ ! استکبار کی بھی انتہا ہے۔اور یہ ہے وہ مقام جہاں اس کی کیبنٹ میں سے ایک مردِ مومن اٹھتا ہے اور ان کے سامنے ایک تقریر کرتا ہے۔اُس تقریر کو قرآنِ کریم نے Verbatim (بہ الفاظہٖ) اپنی دفّتین میں محفوظ کرلیا ہے۔اور بہر حال یہ عربی زبان میں ہے [1]۔

قرآن کے دو رکوع ہیں جو اس ایک تقریر کے لیے وقف کیے ہیں۔آپ اندازہ لگائیے کہ یہ کس قدر اہم چیز ہے جو قرآن کریم نے بیان کی ہے اور واقعی بڑی اہم چیز ہے۔اس کے دربار میں سے انہی میں سے اٹھ کر قَالَ رَجُلٌ مُّؤۡمِنٌ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ (40:28) ۔ قرآن چار لفظوں میں ساری بات کہہ گیا ہے۔ایک تو خود رجل کے معنی عام طور پہ مرد کے' آدمی کے ہوتے ہیں لیکن عربی زبان میں رجل اس وقت بولتے ہیں جب اس میں واقعی جرأت اور بیباکی کی مردانہ قوتیں ہوں۔ یہ وہی ہے جسے ہم مردِ میدان کہتے ہیں ''جنے دا پتر ہویاناں'' (بے باک' نڈر مرد کا بیٹا ہوا ناں)۔یہ انداز ہو تو ایسے وقت میں وہ ساتھ رجل بھی کہتے ہیں ورنہ اگر مومن بھی کہا جاتا تو اس کے معنی بھی ایک مردِ مومن ہی ہوتا ہے لیکن قرآن کریم نے اس کے ساتھ یہاں اس کی ایک اور صفت بیان کی ہے کہ اس کا مرد ہونا' رجل ہونا' جرأت اور بیباکی کا مجسمہ ہونا ہے۔اس پہلے لفظ میں ہی یہ بتا دیا کہ کیا بات تھی۔مرد ہے' جرأت اور بیباکی اور قوت کا مجسمہ ہے' مومن ہے' اٰلِ فرعون میں سے ہے یعنی انہی میں سے اٹھا ہے۔اس کے بارے میں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ يَكۡتُمُ اِيۡمَانَهٗۤ (40:28)۔عام معنی تو اس کے یہ کیے جاتے ہیں کہ ''جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے ہے''۔اور پھر اس مفہوم کی بنیادوں کے اوپر جو کذب اور باطل کی عمارتیں اٹھتی ہیں تو پوچھو ہی نہیں۔ یہاں سے ایک نظریہ یہ اٹھتا ہے کہ ٹھیک ہے اگر انسان اپنے ایمان کو ساری عمر چھپائے رکھے تو کوئی بات نہیں' وہ مومن کا مومن رہتا ہے۔پھر آگے فتویٰ دیا کہ ضرورت کے وقت جھوٹ بولنا واجب [2] ہو جاتا ہے اور

---

[1] دربارِ فرعون کے اس مردِ مومن کی تقریر (40:28-44) پر پھیلی ہوئی ہے۔

[2] اصل الفاظ یہ ہیں کہ ''راستبازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہوں میں ایک بدترین برائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے''۔۔۔ صلح بین الناس اور ازدواجی تعلقات کی درستی کے لیے اگر صرف صداقت کو چھپانے سے کام نہ چل سکتا ہو تو ضرورت کی حد تک جھوٹ سے بھی کام لینے کی شریعت نے صاف اجازت دی ہے۔یہ فتویٰ جناب مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979ء) کا دیا ہوا ہے۔

اس کے لیے یہ دلیلیں لائی جاتی ہیں۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا تصریفِ آیات کا طریق اور دل میں کسی چیز کو چھپائے رکھنا یہ کیا چیزیں ہیں؟

میں نے عرض کیا تھا اور کئی دفعہ کہتا ہوں کہ قرآن حمید نے کہا ہے کہ یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا (2:26) اسی قرآن سے بہت سے لوگ تو صحیح راستے پہ آ جاتے ہیں' اسی کی غلط اور باطل سند لے کر اپنی مفاد پرستی کے لیے بہت سے لوگ پھر باطل کے راستے پر گمراہ بھی ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی چیزوں سے دلیل لا کر یہ کہنا کہ عمر بھر منافقت کی زندگی بسر کی جائے یعنی دل میں کچھ اور ہو' زبان پہ کچھ اور۔ اور جھوٹ بولنا ضرورت کے لیے واجب قرار پا جائے۔ اور سندیں قرآن سے لائی جائیں تو یہ قرآن حمید سے گمراہ ہونے والی بات ہے۔ یعنی قرآن حمید کو اپنی مفاد پرستی کے لیے استعمال (Utilize) کرنا بھی ایک انداز ہے جو بتایا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ جو قرآن حمید نے خود يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ (40:28) کہا ہے کہ ''ایمان چھپا ہوا تھا'' تو یہ کیا بات تھی؟ میں پھر قرآن کو سمجھنے کا طریقہ دہرا دوں اور دہراتا چلا جاؤں گا۔ وہ یہ ہے کہ کوئی بات ایک مقام پہ آئے تو باقی قرآن حمید میں دیکھا جائے کہ کسی اور جگہ اس کی کوئی تفسیر' کوئی تشریح' کوئی وضاحت' کوئی ایزاد (اضافہ)' کیا گیا ہے۔ وہاں وہ مقامات سامنے لائے جائیں تو پھر بات صاف ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے خود بتایا ہے کہ اس کو سمجھا ہی اسی صورت میں جاتا ہے۔ یہی جو آلِ فرعون کے اکابرین تھے' یہ جو بڑے بڑے لوگ تھے' ان کے متعلق اس نے بڑی عجیب چیز کہی ہے۔

آج میں خاص طور پہ یہ عرض کروں گا کہ حوالے بھی لکھیے اور نوٹس بھی لکھیے۔ یہ بات نہیں ہے کہ میں اپنے متعلق کوئی بڑائی بیان کر رہا ہوں۔ اصل یہ ہے کہ یہ باتیں اس سے پیشتر آپ کے سامنے نہیں آئی ہونگی اور اگر یہ ہوا میں اڑ گئیں تو پھر دوبارہ تو شاید نہ ہی آ سکیں۔ اور یہ کام آئیں گی' اس کے لیے نوٹس بھی لکھیے اور حوالے بھی لکھیے۔ اس کے اندر بڑی اہم چیزیں آتی ہیں۔

اب یہی چیز ہے کہ وہ ایمان کو چھپائے ہوئے تھا۔ اس کو سطحی طور پر لیا جائے تو وہ سارے نتائج اس سے مستنبط ہوتے ہیں جو ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ منافقت اور کیا ہوتی ہے کہ دل میں کسی چیز کو چھپائے رکھنا' زبان پہ وہ چیز نہ لانا۔ قرآن مجید نے اس کو ''رجلِ مومن'' بھی کہا ہے۔ اور یہاں يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ (40:28) سے وہ سند لائے ہیں۔ تو یہ کیا چیز تھی؟

انانیت اور تکبر کا جذبہ مانع ہوتا ہے کہ انسان اپنی سچ بات کو زبان پر لائیں' وہ اسے اپنے دل میں چھپائے رکھتے ہیں

قرآن حکیم نے خود کہا ہے کہ ان میں وہ لوگ بھی تھے جن کی کیفیت یہ تھی کہ وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (27:14)

ان کے دل تو اس بات سے مطمئن تھے۔ یہ بات جانتے تھے کہ جو کچھ موسیٰؑ کہہ رہا ہے یہ ٹھیک ہے لیکن انانیت‘ تکبر‘ بڑے بننے کا جذبہ‘ یہ ان کے راستے میں مانع تھا کہ اس بات کو زبان پر لائیں۔ وہ دل میں مطمئن تھے بلکہ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ موسیٰؑ صحیح کہتا ہے لیکن یہ ظلم اور علو کے‘ استکبار کے‘ بڑے بننے کے‘ انانیت کے‘ جذبات ان کے راستے میں حائل ہو رہے تھے کہ وہ بات زبان پہ نہ لائیں۔ یہ منافقت کی وجہ سے نہیں تھا۔ آپ نے غور کیا کہ ان دونوں کے اندر کتنا فرق ہے۔ اور اس قسم کے لوگ تو ہمیں کئی مقام پر نظر آتے ہیں کہ دل سے ایک بات کو مانتے ہیں لیکن بعض جذبات ایسے ہوتے ہیں جنہیں قرآن حکیم نے خاص طور پہ انانیت کے جذبات کہا‘ بڑا بننے کے جذبات کہا کہ اب میں بنی اسرائیل جیسا ہو جاؤں! اتنی عمر تک تو میں ان سے جھگڑا کرتا رہا‘ لڑائی کرتا رہا‘ انکار کرتا رہا‘ ان کو جھوٹا کہتا رہا‘ تو اب میں پست ہو جاؤں۔ یعنی یہ جذبہ کہ اب میں پست ہو جاؤں‘ یہ راستے میں حائل ہوتا ہے۔ اور بہت سے ہیں جن کے راستے میں یہ چیز حائل ہوتی ہے۔

متکبر‘ غلام اور محکوم قوموں کی بات کو تسلیم ہی نہیں کرتے‘ آن میرٹ لیتے ہی نہیں

قرآن مجید نے یہاں بڑے ہی مدلّل اور حسین انداز سے علم اور جذبات کا تقابل بھی بتایا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ علم کی رو سے تو قلب ایک چیز کا اعتراف کر رہا ہے۔ وہ مانتے تھے‘ ان کا دل مانتا تھا کہ موسیٰؑ صحیح کہتا ہے۔ اس کے دلائل سے‘ اس کی بیّنات سے‘ اس کی تعلیم سے‘ اس پر غور و فکر سے‘ دل مانتا ہے لیکن انانیت کے اور بڑا ہونے کے اور تکبر کے جذبات‘ کہ ہم اس قوم کی جو ہماری محکوم اور غلام ہے‘ بات مان لیں! فرعون نے اپنے رفقا سے‘ اکابرین سے‘ کہا ہی یہ تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اسؑ کی بات تو سن لینی چاہیے۔ تو اس نے کہا تھا کہ دو باتیں ہیں کہ بَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا (23:47) یہ ہمارے ہی جیسا ایک انسان ہے وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ (23:47) اور اس کی قوم ہماری محکوم ہے۔ ہم محکوم قوم کے ایک فرد کی بات مان لیں!! یعنی یہ نہیں کہ بات کو آن میرٹ دیکھا جائے کہ وہ کیسی ہے۔ محکوم اور غلام کی کوئی خوبی‘ خوبی نظر نہیں آتی۔

جسے زیبا کہیں آزاد بندے‘ ہے وہی زیبا

جن کی قوم ہماری محکوم ہے تم کہتے ہو کہ میں اس کی بات پہ کان دھروں‘ اس کی بات سنوں‘ اس کی بات مان لوں۔ یہ بات تھی ان لوگوں کی۔

علم اور جذبات کا تقابلی جائزہ: علم سے تو قلب ایک چیز کا اعتراف کرتا ہے مگر جذبات حائل ہیں

قرآن حمید کہتا ہے کہ دل سے تو وہ اس کا یقین رکھتے تھے کہ یہ ٹھیک کہتا ہے لیکن یہ جذبات ان کے راستے میں حائل ہو رہے تھے اور زبان پہ اس چیز کا اعتراف نہیں آنے دیتے تھے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن حمید نے علم اور جذبات کا تقابل بڑے ہی حسین انداز میں

کیا ہے کہ دل تو مان رہا ہے مگر انانیت مانع ہے۔شعر یاد آ گیا۔اگر چہ وہ انانیت تو نہیں ہے' جذبہ تو کچھ اور ہے لیکن بہرحال علم کے اوپر جذبہ کیسے غالب آ تا ہے یہ بڑے حسین انداز میں ہے۔غالباً آغا حشر (1935-1879ء) کا شعر ہے کہ

کسے معلوم تھا کہ عشق اس طرح لاچار کرتا ہے

دل اس کو جانتا ہے بے وفا اور پیار کرتا ہے

یہ کیا چیزیں ہیں؟ کہ ''جانتا ہے''۔یہ وہی ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ مرزا اسداللہ خاں غالب (1869-1797ء) اپنے انداز میں کہہ گیا ہے کہ

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یہ جذبات اور علم کی وہی تقابل اور کشمکش ہے۔

دل اس کو جانتا ہے بے وفا' اور پیار کرتا ہے

جذبات کی وجہ سے لاچاریاں یہ ہیں۔

بڑا بننے کے جذبات صداقت کو اُبھرنے نہیں دیتے مگر کوئی شدید حادثہ بدمعاش کو بھی مظلوم ضعیفوں کا حامی وناصر بنادیتا ہے

قرآن حکیم نے جہاں بھی جذبات کہے ہیں یہ دوسری قسم کے جذبات ہیں۔کہا ہے کہ ظُلۡمًا وَّعُلُوًّا (27:14) ہائیں! ہم اتنے بڑے اور یہ تسلیم کرلیں! وَاسۡتَیۡقَنَتۡهَآ (27:14) دل مانتا ہے کہ ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن اعتراف نہیں کرتے کہ اس سے تو ہم ہیچ ہو جائیں گے۔اب آپ نے دیکھ لیا کہ جسے قرآن حکیم نے کہا تھا کہ ایمان تو دل کے اندر تھا' ابھی تک باہر نہیں آیا تھا۔کیوں نہیں آیا تھا ؟ کیونکہ وہ ان میں سے ایک تھے۔اب ایسے وقت پہ ہوا کیا؟ اس سے پہلے تک تو نظر آتا ہے کہ وہ ان چیزوں کو برداشت کرتا گیا۔سعید روحیں ایسی ہوتی ہیں۔لیکن جب فرعون نے یہ کہا کہ اسے قتل کردیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ضمیر یکا یک بیدار ہوگیا۔اور انانیت اور ظلم و تکبر کے جو جذبات تھے' ان کے اوپر حقیقت اور فراست کا اعتراف غالب آ گیا اور وہ (مردِ مومن) اٹھ کھڑا ہوا۔ایسے مواقع انسانوں کی زندگی کے اندر آتے ہیں۔جسے Accidents (حادثات) کہتے ہیں وہ ایسے ہوتے ہیں۔لوگوں کو بھی یہ حیرت ہوتی ہے کہ صاحب! یہ سارے زمانے کا بدمعاش اور غنڈہ اور لوٹنے والا ڈاکو تھا۔معلوم نہیں کہ یکا یک' شباشب' اس کے اندر کیا تبدیلی آئی' وہ تمام غریبوں'

مظلوموں اور ضعیفوں کا حامی بنا ہوا ہے' ان کی خاطر جان دینے کے لیے باہر آ گیا ہے۔ یہ کیا ہوتا ہے؟ تحت الشعور میں یہ چیز ہوتی ہے لیکن جذبات اتنے غالب آئے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ اس کو ابھرنے نہیں دیتے۔ کوئی ایک واقعہ زندگی میں ایسا ہو جاتا ہے کہ اس واقعہ کا اثر اتنا شدید ہوتا ہے کہ اس قسم کے جذبات الگ ہٹ جاتے ہیں اور صداقت ابھر کر اوپر آ جاتی ہے۔ یہاں قرآن حکیم نے یہ کہا ہے کہ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ (40:28) وہ (مردِ مومن) ان میں سے ہی تھا۔ باقی بھی ان میں سے ایسے تھے کہ دل مانتا تھا لیکن انانیت اور تکبر کے جذبات بات زبان پہ نہیں آنے دیتے تھے۔

فرعون کے درباریوں میں ایک سعید روح کی حق گوئی و بے باکی کا ایک منظر اور ہمارے ہاں کی عجیب و غریب تفسیر و مفہوم

واقعہ یہ ہوا کہ جب فرعون نے کہا ہے کہ چھوڑ و مجھے کہ میں اسے قتل کروں تو نظر آتا ہے کہ یہ سعید روح تھی۔ وہ ان جذبات کے اوپر غالب آیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور یہ بڑی چیز ہے۔ اسی بھرے دربار میں' اس کی کیبنٹ کی میٹنگ میں اور اس فرعون کے سامنے کہا کہ ٹھیک ہے مجھے معلوم ہے کہ میرے ساتھ کیا ہو گا لیکن میں اب اسے برداشت نہیں کر سکتا اور جو جی میں آیا آج میں کہہ دینا چاہتا ہوں۔ یَکۡتُمُ اِیۡمَانَہٗۤ (40:28) وہ اس وقت تک اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا تو بات یہ سمجھ میں آ گئی کہ یہ منافقت کی بات نہیں تھی بلکہ ظُلۡمًا وَّ عُلُوًّا (27:14) انانیت' تکبر اور بڑا بننے کے جذبے کی بنا پر وہ زبان پر نہیں لا رہے تھے۔ اور اس کے اندر اور بھی تھے لیکن اسے یہ سعادت نصیب ہو گئی' یہ کسے معلوم تھا۔ وہ جرأت سے اٹھا اور اٹھ کر فرعون سے بیبا کانہ کہا کہ اَتَقۡتُلُوۡنَ رَجُلًا اَنۡ یَّقُوۡلَ رَبِّیَ اللّٰہُ (40:28) کیا تم صرف اس جرم میں اس شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب' میرا نشوونما دینے والا' اللہ ہے۔ صرف اس جرم میں تم اسے قتل کرنا چاہتے ہو۔

یہاں سے بھی ہمارے ہاں جو مفہوم لیا گیا' پھر جو تفسیر بیان ہو گئی' وہ بھی عجیب و غریب ہے۔ کہا ہے کہ اس نے کہا یہ تھا کہ موسیٰؑ کا جرم یہی ہے کہ یہ خدا پرست ہے' اللہ کو مانتا ہے۔ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ اصل میں بات کیا تھی۔ ان کے نزدیک تو گویا جرم اتنا ہی تھا کہ یہ خدا پرست ہے' اللہ کو مانتا ہے اور اس مردِ مومن نے یہ کہا تھا کہ یہ کوئی بھی جرم نہیں ہے جس کی بنا پہ تم اسے قتل کرنا چاہتے ہو۔

اس مردِ مومن کے قول ''ربی اللہ'' کے مفہوم کی سند' نبی اکرم ﷺ سے منسوب بخاری شریف کی ایک روایت بتائی جاتی ہے

اب میں نے کہا کہ رَبِّیَ اللّٰہُ (40:28) پہ عمارت اٹھی ہے۔ دین میں اس کے کیا معنی تھے' وہ تو ابھی ہمارے سامنے بات آتی

ہے۔ مذہب میں پہنچ کر اس کے معنی یہ ہوگئے کہ ''اگر کوئی حکومت اس کی اجازت دیدے کہ لوگ ربی اللہ کہہ سکیں کہ میرا رب اللہ ہے یعنی خدا کی پرستش کرسکیں تو پھر اس حکومت کے خلاف کچھ نہیں کہا جاسکتا' وہ بالکل جائز ہے۔ بات اتنی ہے کہ وہ تمہیں نماز روزے کی اجازت دیتی ہے یا نہیں۔ یہ دیتی ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ باقی وہ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا جو کچھ ہے وہ ہوتا رہے''۔ اس معنی ومفہوم کے لیے سند آئی۔ یہ تفسیر کہاں سے آئی؟ یہ بخاری شریف میں ہے کہ نبی اکرمﷺ ایک دن حرمِ کعبہ میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے تو ان قریش کے سرداروں میں سے ایک شخص آیا اور اس نے آ کر پیچھے سے چادر کا پھندا آپؐ کی گردن میں ڈالا اور اس کو اس طرح سے بٹ دیا' مروڑ دیا تا آنکہ آپﷺ کا گلا گھٹ گیا اور اتنے میں پھر صحابہؓ میں سے کوئی' بعض کہتے ہیں حضرتِ صدیقؓ تھے یا کوئی اور تھے وہ آئے اور انہوں نے آ کر چھڑایا۔ اور جب چھڑایا تو اس وقت اس سے یہ کہا کہ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ (40:28) کیا تم اس شخص کو اس جرم میں مار دینا چاہتے ہو کہ یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ وہاں سے یہ چیز آ گئی کہ ''وہ جو رسول اللہﷺ نماز پڑھ رہے تھے' وہ ہے اصل میں اللہ کو اپنا رب کہنا''۔ اور اس کے لیے انہوں نے کہا تھا کہ اس کا جرم تو اتنا ہی ہے کہ یہ خدا کی پرستش کر رہا ہے۔ تو یہ جو حضرتِ موسیٰؑ یا اس مردِ مومن کا واقعہ تھا' اس کے لیے اس واقعہ کا انطباق کیا' جو حضورﷺ کہتے ہیں کہ وہاں نماز پڑھ رہے تھے۔ اب یہاں سے بات آ گئی کہ اس نے یہی کہا تھا کہ بھئی! یہ خدا کی نماز پڑھنا چاہتا ہے' خدا کی پرستش کرنا چاہتا ہے تو یہ تو کوئی ایسا جرم نہیں ہے جس جرم کی بنا پہ اسے قتل کر دیا جائے۔ اب یہ سند ہوگئی۔

تحریکِ پاکستان کی پوری تاریخ اسی منسوب شدہ سند کے تصور کی ترجمان ہے اس لیے کہا ہے کہ الفاظ قرآن مجید پر سوچا کرو۔

اب اس سند کی بنا پر ہمارے ہاں پہلے تو پنجاب میں وہ مرزا غلام احمد (1908-1835ء) دعویٰ نبوت والے اٹھے۔ انہوں نے کہا کہ ''انگریزوں کی حکومت میں مسلمانوں کو نماز روزہ حج زکوٰۃ کی پوری پوری آزادی ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ جب وہ ہمارے اسلام میں مداخلت نہیں کرتے' ہمیں اس کی اجازت دیتے ہیں تو اس کے بعد ان کی حکومت کے تابع زندگی بسر کرنا عین اسلام کے مطابق ہے۔ اور سند یہ ہے کہ وہ تو ربی اللہ کہنے دیتے ہیں' روکتے ہی نہیں ہیں۔ تو اس مردِ مومن نے فرعون سے یہی کہا تھا کہ تم کیوں اس کو روکتے ہو۔ اگر فرعون' موسیٰؑ کو خدا کی پرستش کرنے سے نہ روکتا تو پھر یہ کوئی جرم نہیں تھا''۔ عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں اسی قرآن حمید سے پھر بات کہاں جاتی ہے۔ اب اسی سند کو لیتے ہوئے یہ حضرات آگے بڑھے تو یہ جو تحریکِ پاکستان کے دوران اقبالؒ (1938-1877ء) اور قائداعظمؒ (1948-1876ء) اور ان کے مقابلے میں نیشنلسٹ علما حضرات کی کشمکش تھی وہ یہی تو تھی کہ وہ کہتے یہ

تھے کہ یہاں ہندوستان میں ہندوؤں کی جمہوری حکومت میں مسلمانوں کو ان کے نماز روزہ حج زکوۃ اور شخصی قوانین کی پوری پوری آزادی ہوگی تو جب یہ آزادی ہوگی تو پھر اسلام تو آزاد ہوا پھر تم کیوں کہتے ہو کہ ہمیں اسلام کی خاطر ایک دوسری مملکت بنانی ہے' بھئی! اس مملکت میں تو اسلام آزاد ہوگا۔ وہ وہاں یہ دلیل دیتے تھے۔ اور وہ کوئی چھوٹے چھوٹے مسجدوں کے ملا دلیل نہیں دیتے تھے۔ شیخ الحدیث صدر جمعیت علما مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (1957-1879ء)' جیسے یہ لوگ اس بات کی یہ دلیل دیتے تھے کہ ''یہ ہندو اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ مسلمانوں کو یہاں ان کے مذہب کی پوری آزادی ہوگی۔ جب مذہب کی آزادی ہوگی تو پھر اسلام تو آزاد ہوا۔ اب یہ خواہ مخواہ ایک سٹنٹ ہے جو جناحؒ لیے پھرتا ہے کہ اسلام کا تقاضا اپنی آزاد مملکت ہے' یہ غلط ہے' یہ اسلام کا تقاضا نہیں' یہ فریب دہی ہے۔ اسلام آزاد رہ سکتا ہے اگر یہ ہمیں ربی اللہ کہنے دیتے ہیں تو پھر کوئی جرم نہیں''۔ آپ نے غور فرمایا کہ اتنی سی بات سے بات کہاں لے جاتے ہیں اور بات کہاں پہنچ جاتی ہے۔ اور میں جو کہا کرتا ہوں کہ قرآن حمید کے ان الفاظ کو دیکھ کر یونہی نہ آگے بڑھ جایا کرو۔ سوچا کرو کہ یہ کیا بات کہی ہے۔

قرآنِ حکیم کا ایک ایک لفظ انسانی سوچ کی منزل کا تعین کرتا ہے' اِس سلسلہ میں مردِ مومن کا للکارنا اور ربی اللہ کے لیے فرعون کے خدشات

عزیزانِ من! قرآن حکیم کا ایک ایک لفظ اس کا متقاضی ہے کہ اس پہ کھڑے ہو کر سوچا جائے کہ یہ بات کیا ہے۔ یہ اس رجلِ مومن نے فرعون کو کیا کہا تھا اور یہ اتنے سے معنی لینے کہ یہ تو صرف خدا پرستی چاہتا ہے یا نماز روزے کی اجازت چاہتا ہے' یہ کوئی اتنا بڑا جرم نہیں ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ یہ ربی اللہ کا قرآنی مفہوم نہیں ہے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ وہ مردِ مومن' کیبنٹ میں کھڑا ہوا' فرعون کے دوبدو بات کر رہا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے جو فرعون سے کہہ رہا ہے کہ کیا تم اس جرم کی بنا پہ اسے قتل کرنا چاہتے ہو۔ گویا یہ کوئی بڑا چیلنج درپیش ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ یہ مفہوم جو لیا جاتا ہے کہ اس نے یہ کہا تھا کہ یہ تو صرف خدا پرستی کی اجازت چاہتا ہے' یہ کیا جرم ہے؟ وہاں کیبنٹ میں فرعون سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اور یہ جو آیت ہے' اس سے پہلی آیت کے اندر' خود قرآن حکیم نے کہا ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ کے خلاف فرعون کیا فردِ جرم عائد کر رہا تھا۔ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے' یہیں اس سے ایک آیت پہلے ہی وہ بتا رہا ہے کہ فرعون نے یہ کہا تھا کہ اِنِّيٓ اَخَافُ اَنۡ يُّبَدِّلَ دِيۡنَكُمۡ اَوۡ اَنۡ يُّظۡهِرَ فِى الۡاَرۡضِ الۡفَسَادَ (40:26) مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ یہ شخص تمہارا نظامِ حکومت بدل دے گا' اس نظام کی جگہ یہاں کوئی دوسرا نظام نافذ کرے گا۔ اور اگر اسے اس میں یہاں کامیابی نہ بھی ہوئی تو کم از کم اس نظام کا تو بیڑہ

غرق کر کے رکھ دے گا۔ یہاں یہ نظر آ رہا ہے کہ فرعون ان کے خلاف کیا فردِ جرم عائد کر رہا ہے۔ بات اتنی ہی نہیں ہے کہ یہ صرف خدا پرستی چاہتا ہے یا نماز روزے کی اجازت چاہتا تھا۔ بات کچھ اور ہے۔ فرعون کو اس آیت (40:26) میں اور واضح الفاظ میں یہ کچھ کہہ دیا تھا۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے مطالبہ پر فرعون کی فردِ قراردادِ جرم

عزیزانِ من! جب یہ دونوں بھائی حضرتِ موسیٰؑ اور حضرتِ ہارونؑ فرعون کے پاس گئے ہیں تو جا کر فرعون سے اپنا مطالبہ پیش کیا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ میں سمجھتا ہوں جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ یہ ہے کہ وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِی الْاَرْضِ (10:78) تم یہاں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہو۔ فرعون ان سے اعلانیہ کہہ رہا ہے کہ تم یہ چاہتے ہو کہ ملک میں تمہارا اقتدار قائم ہو جائے' تم یہاں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہو۔ حضرتِ موسیٰؑ کے خلاف فرعون یہ جرم عائد کر رہا تھا' اس کے سامنے اس کی کیبنٹ کا ممبر' یہ مردِ مومن ہے' کیا وہ یہ کہتا ہے کہ اس کا صرف یہ جرم ہے کہ یہ نماز کیوں پڑھتا ہے یا خدا پرستی کیوں کرتا ہے؟ کیا اس پر وہاں وہ سارے سامنے سے بلبلا اٹھتے اور کہتے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ نہیں' یہاں بات ہی کچھ اور ہے۔ اگر یہی خدا پرستی کی' بات ہوتی تو فرعون ہی یہ نہ کہتا کہ میں نے بار بار تم لوگوں سے کہا ہے کہ ان کے ارادے یہ ہیں' یہ یہاں حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں' اپنی کبریائی چاہتے ہیں' تمہارے نظام کو الٹ دینا چاہتے ہیں' یہاں فساد برپا کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ میں اس کے خلاف یہ جرم عائد کر رہا ہوں۔ اب آئی یہ بات کہ یہ جو ربی اللہ تھا' یہ اتنا خطرناک کیوں تھا کہ فرعون نے یہ جرم عائد کر کے کہا کہ اس کو قتل کر دینا چاہیے' اس سے کم میں یہ فتنہ فرو نہیں ہوگا۔ یہ ہے ربی اللہ۔

ربی اللہ پر جم کر کھڑے ہونا ہے اگر یہ ہو جائے تو پھر اس قوم پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے تو یہ کشمکش کیا ہے؟

عزیزانِ من! یہ ربی اللہ بہت بڑی چیز تھی جو اس مردِ مومن نے کہی تھی۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30) وہ جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تو گویا یہ ایسی بات ہے کہ جس پر جم کر کھڑے ہو جانا ہے' یہ ہے اصل چیز۔ یہ محض جسے اللہ اللہ کرنا کہتے ہیں' ہمارے ہاں ربی اللہ کے یہ معنی ہو جائیں گے۔ اللہ اللہ کونسی ایسی چیز ہے کہ جس پر ساتھ یہ کہا جائے کہ اس پہ پھر وہ جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں' ان میں استقامت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے یہ جو اس طرح سے اللہ اللہ کہہ کے (ربی اللہ کا ترجمہ میں یوں کر رہا ہوں) اور پھر وہ اس پہ استقامت سے جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں پھر اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں؟ اس کے نتیجے کے لیے آگے تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (41:30) کہا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ ''ان پہ ملائکہ کا نزول شروع ہو جاتا ہے''۔ یہ ربی اللہ کہنا اتنی عظیم چیز ہے۔ ربی اللہ کی یہ ساری لم تو اتنی ہی ہے۔ سنیے! کشمکش کیا تھی۔ عزیزانِ من! غور سے سنیے! جرم یہی تھا کہ یہ ربی اللہ کہتا ہے۔ بات ساری ربی اللہ کی ہے۔ کیا کہتا ہے یہ؟

حضرت موسیٰؑ کے ربی اللہ کے اس چیلنج پر فرعون کا ردِعمل اور اس کے اعلانِ عام کی مرکزی اور ارتکازی تفصیل

عزیزانِ من! یہ بڑی اہم چیز ہے' اسے بڑے غور سے سنیے گا کہ فرعون کیا کہتا ہے۔ جب بات وہاں تک پہنچ گئی تھی کہ حضرتِ موسیٰؑ نے چیلنج دیدیا تھا اور طے یہ ہوا تھا کہ پھر کھلے میدان میں بات کر لی جائے۔ اور ہامان نے یہ کہا تھا کہ ہم اس کے ساتھ مناظرہ کریں گے۔ میں آگے چل کر عرض کروں گا کہ فرعون جب بے بس ہو گیا ہے' سامنے سے کوئی دلیل نہیں سوجھتی تھی تو اس نے حضرتِ موسیٰؑ کو مذہب کی طرف الجھایا ہے۔ وہ بات آگے آئے گی۔ فرعون نے پھر سارے ملک میں اعلان کرنے والے بھیجے' جسے ڈھنڈورا پیٹنے والے' منادیاں کرنے والے کہتے ہیں وہ بھیجے اور ان سے یہ کہا کہ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24)۔ یہ تھا دعویٰ کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24)۔ میں ہوں تمہارا سب سے بڑا ان داتا' مجھ سے تمہیں روٹی ملتی ہے' تم میرے محتاج ہو۔ آپ نے غور فرمایا کہ وہ یہ کہتا ہے کہ تم کس طرح سے ربی اللہ کہتے ہو؟ رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى تو میں ہوں۔

عزیزانِ من! سنیے! اس کی دلیل کیا ہے' سند کیا ہے۔ ٹھیک ہے رزق کے سرچشمے اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور جب رزق کے سرچشمے ہاتھ میں لے لیے تو پھر اس کے بعد تو ربِ اعلیٰ بن ہی گیا۔ کہا کہ نَادٰى فِرْعَوْنُ فِىْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ (43:51) وہ منادی دینے والے کیا منادی دیتے تھے؟ یہ کہ فرعون کا حکم یہ ہے' فرعون کا اعلان یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اے میری قوم سنو! کہ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ (43:51) بتاؤ' مصر کا ملک کس کا ہے' حکومت کس کی ہے وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ (43:51) اور یہ دریائے نیل کس کا ہے' یہ نہریں کس کی ہیں' یہ پانی کس کا ہے' یہ زمین کس کی ہے (اور پھر خود ہی کہتا ہے کہ) اَلَيْسَ لِىْ (43:51) کیا یہ ہماری نہیں ہے۔ اور جب یہ ہماری ہے' اس ملک کے سب ذرائع پیداوار ہمارے ہیں تو پھر اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) ہم سے بڑا رب کون ہے؟ ہم ہیں۔ یہ تھا دعویٰ فرعون کا۔ موسیٰؑ نے کہا تھا کہ تُو رَبِّىَ اللّٰهُ نہیں' ان کا رب تو ہو جن کے لیے تُو یہ کہہ رہا ہے' میرا رب تُو نہیں ہے۔ یہ تھی وہ بات! وہ کہتا تھا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) اور یہ کہتے تھے کہ میرا رب تُو نہیں ہے اور اُس مردِ مومن نے حضرت موسیٰؑ کے یہی الفاظ دہرائے تھے۔ اس سے بڑی بغاوت اور کیا ہو سکتی تھی!

حضرت موسیٰؑ فرعون کے سامنے اپنے رب کے مالک ہونے کے سلسلہ میں لب کُشا ہیں

عزیزانِ من! غور فرمایا کہ قرآن کیا بات کہہ گیا ہے' یہ کیا کشمکش تھی۔ اس کا یہ جو دعویٰ تھا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) اس کے جواب میں یہ کھلی ہوئی بغاوت تھی کہ ربی اللہ' میں تجھے اپنا رب نہیں مانتا' میں تو اللہ کو رب مانتا ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ فَمَنْ رَّبُّكُمَا (20:49) میں اگر نہیں ہوں تو تمہارا رب کون ہے؟ میں نے تو بتا دیا کہ مصر کی یہ سرزمین' یہ ملک' اس کی نہریں' اس کا پانی'

اس کی پیداوار کا میں مالک ہوں۔ تم کہتے ہو کہ نہیں ہمارا رب تو اللہ ہے' تم نہیں ہو۔ اس نے یہ کہا تھا کہ وہ رب کون ہے' کیسا ہے جسے تم مانتے ہو اب سنیے کہ قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى (20:49)۔ کہتا ہے کہ اے موسیٰؑ! یہ کونسا رب بتایا جا رہا ہے۔ عزیزانِ من! غور سے سنتے چلے جایئے' باتیں بڑی صاف ہوتی چلی جائیں گی۔ ''انسانوں کی حکومت اور خدا کی حکومت'' ان خطوط پر بات چل رہی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ میں رب اعلیٰ ہوں' انہوںؑ نے کہا تھا کہ تُو میرا رب نہیں ہے' میرا رب اللہ ہے۔ اس نے کہا تھا: کون ہے وہ اللہ' کیا ہے؟ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ زمین' یہ پانی' یہ نہر' یہ سب میرا ہے' میری ملکیت ہے۔ اس نے پوچھا کہ کون ہے تمہارا رب؟ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (26:24) کہا کہ میرا رب وہ ہے کہ اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں' اس کے درمیان جو کچھ ہے' سب اس کی ملکیت ہے' کوئی اور اس کا مالک نہیں ہے۔ دیکھ رہے ہیں فرعون کے کس دعوے کی تردید ہو رہی ہے! یہ بغاوت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ ربی اللہ بڑی چیز ہے۔

قرآنی نظام میں رزق کے سرچشمے پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' فرعون کے نزدیک یہ بغاوت تھی

کہا ہے کہ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (26:24)۔ عزیزانِ من! اتنی سی بات ہے کہ جو اس چیز پر ایمان رکھتا ہے کہ اس کائنات کے اندر کسی کی کوئی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی' ملکیت سب خدا کی ہے' وہ ہے جو حکومتِ خداوندی قائم کرنے کا دعویدار ہو سکتا ہے۔ پہلی بات یہی ہے کہ کسی کی کوئی ملکیت نہیں یہ تو لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ(3:180) (تمام اشیائے کائنات' جن سے ان کا جمع کردہ مال اور اسباب ترکیب پاتا ہے' خدا کی ملکیت ہیں)۔ یہ بات فرعون کی اور موسیٰؑ کی نہیں ہو رہی ہے۔ یہ تو ساری کشمکش اسی بات کی ہو رہی ہے کہ دنیا میں جتنے لوگ قوت حاصل کر کے ان تمام چیزوں کے مالک بن بیٹھتے ہیں اور پھر دوسروں کو اپنا محتاج کر دیتے ہیں' یہ ان کے درمیان اور دوسرے ان کے درمیان ہے جو اس چیز کی نفی کرتے ہیں' اس کی تردید کرتے ہیں' اس سے انکار کرتے ہیں۔ یہ ان دونوں میں کشمکش ہو رہی ہے۔ یہ دونوں تو اس کشمکش کے Symbols (علامات) ہیں۔

عزیزانِ من! پھر سنیئے' قرآن بتاتا ہے کہ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (26:24)۔ سنیے! (موسیٰؑ نے کاہ کہ خدائے رَبّ العالمین وہ ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے کی نشوونما کرتا ہے)۔ اس پر فرعون نے اپنے درباریوں پر ایک نظر ڈالی اور قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗۤ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ (26:25) اپنے ان حواریوں سے کہا کہ سن رہے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے یعنی یہ اتنی بڑی بغاوت کے الفاظ کہہ رہا ہے۔

ربی اللہ میں بات صرف نماز تک ہی محدود نہ تھی' وہ تو فرعون کے اقتدار کی بنیاد ہی کی نفی تھی

عزیزانِ من! بات اگر نماز پڑھنے کی ہوتی تو یہ ساری کشمکش کاہے کی تھی۔ٹھیک ہے ہم اپنے طریقے پر پرستش کر لیتے ہیں' تم اپنے طریق پر کرلو۔اور یہ بنی اسرائیل تو وہاں تھے' یہ تو خدا کو مانتے تھے۔فرعون کے تابع رہنے والے بھی جو بنی اسرائیل تھے' یہ اپنے انبیا کو مانتے تھے' اس سے پہلے جتنے انبیا گزرے تھے' خدا کو مانتے تھے۔یہ جو بات ہے کہ یہ جو کہہ رہا ہے کہ میرا رب اللہ ہے' یہ اور ہی بات تھی۔یہ ہے وہ بات جو انہوںؑ نے کہا ہے کہ میرا رب وہ ہے کہ جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' اس کا مالک ہے تو اس پر وہ اپنے حواریوں کو کہہ رہا ہے کہ اَلَا تَسۡتَمِعُوۡنَ (26:25) سن رہے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے۔واہ واہ واہ! یہ تو ہمارے اقتدار کی بنیاد کی نفی کر رہا ہے۔جب ہماری یہ ملکیت ہی نہیں ہے تو ہمارا اقتدار کس طرح سے قائم ہو سکتا ہے۔اور انہوںؑ نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی کہ یہ کیا کہہ رہا ہے' اپنے اسی سانس میں کہا کہ قَالَ رَبُّکُمۡ وَ رَبُّ اٰبَآئِکُمُ الۡاَوَّلِیۡنَ (26:26) کہا: میرا ہی رب نہیں' وہ تمہارا بھی رب ہے' تمہارے آباؤ اجداد کا بھی رب ہے۔وہ ہے رب جس کی طرف میں دعوت دے رہا ہوں۔اسی کی نفی نہیں کی' اس کے آباؤ اجداد کی حکومت کے جو دعاوی تھے ان کی بھی نفی کر دی کہ وہ بھی خدا کے باغی تھے' تم بھی خدا کے باغی ہو۔

مردِ مومن کی مدافعت کی وجہ جواز' فرعون کے احسانات اور خدشات کہ اے موسٰیؑ! تم چاہتے ہو کہ حکومت یہاں نہیں تو وادیٔ سینا میں سہی۔

اب یہاں سے ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس مردِ مومن کو یہ معلوم تھا کہ حضرتِ موسٰیؑ کے خلاف فردِ جرم کیا عائد ہوئی ہے' حضرتِ موسٰیؑ کا دعویٰ کیا ہے' ان کا پروگرام کیا ہے اور یہ بھی اسے معلوم تھا کہ فرعون یہ جرم عائد کر رہا ہے کہ یہ دونوں بھائی بغاوت برپا کر رہے ہیں' یہاں اپنی حکومت چاہتے ہیں تو یہ فرعون کی کابینہ کا مردِ مومن جو ربی اللہ کے ان معنوں کی Defence (دفاع) کے لیے کھڑا ہوا ہے تو پھر یہ Defence (مدافعت) تو معقول نہیں رہتی۔یہاں سے فرق شروع ہوا۔اب سوال یہ ہے کہ حکومتِ خداوندی کا جو داعی ہے' جو نظامِ خداوندی قائم کرنے والا ہے اور جو انسانی حکومت قائم کرنے والا ہے' ان دونوں میں فرق کیا ہوا۔اور یہیں سے یہ معلوم ہوا کہ اِس مردِ مومن نے بات کیا کہی تھی۔

عزیزانِ من! دنیا میں جو شخص بھی انقلاب کا دعویٰ لے کر اٹھتا ہے' کسی حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتا ہے' وہ اس حکومت کو الٹتا ہے تا کہ اس کی جگہ وہ خود حاکم بن جائے' وہ اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے پہلے دوسری حکومت کو الٹتا ہے' خواہ اس کے لیے یہی کچھ نہ کہنا پڑے کہ اس میں یہ خرابیاں ہیں اور اس کی وجہ سے یہ تباہیاں آئیں اور قوم برباد ہوگئی اور اس نظام میں یہ ہوگیا' اس

لیے اس کو میں ہٹانا چاہتا ہوں' ہم اس لیے اس کے ہاتھ سے حکومت چھیننا چاہتے ہیں۔ دلیل تو یہ ہوتی ہے کہ یہ اتنے ظلم اور ستم ہو رہے ہیں' تباہیاں ہو رہی ہیں اور اصل چیز ہوتی ہے کہ وہ اسے ہٹانا چاہتے ہیں تا کہ ہم تخت پر بیٹھیں۔

عزیزانِ من! ذرا غور سے سنیے کہ وہ کیا بات کہہ گیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ تو ٹھیک ہے جو تم نے یہ کہا ہے کہ یہ چھیننا چاہتا ہے' نظام بدلنا چاہتا ہے۔ یہ اس حالت میں جرم ہوتا اگر یہ اس نظام کو بدل کر خود حاکم بننا چاہتا مگر یہ تو رَبِّیَ اللّٰہُ کہتا ہے' یہ تو خود حاکم نہیں بن رہا یہ خدا کے قانون کی حکومت چاہتا ہے۔ یہاں اس مردِ مومن نے جرم کی بنیاد کاٹ دی کہ یہ تو حاکم نہیں بن رہا۔ اس نکتے کو دوسرے مقام پہ قرآن کریم نے بڑے عمدہ انداز میں واضح کیا ہے۔ فرعون نے یہ کہا تھا کہ قَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ (23:47) ان کی قوم ہماری محکوم ہے۔ ٹھیک ہے' وہ اسی کی تو محکوم تھی۔ حضرتِ موسیٰؑ نے فرعون سے کہا تھا کہ میں یہاں تمہیں کچھ نہیں چھیڑنا چاہتا' کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ یہ ملک تمہیں مبارک ہو' تمہاری قوم تمہیں مبارک ہو لیکن یہ قومِ بنی اسرائیل ہے عَبَّدۡتَّ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ (26:22) تم نے اس پوری کی پوری بنی اسرائیل کو اپنی محکومی کے شکنجے میں جکڑے رکھا ہے۔ اور دوسرے مقام پہ جو حضرتِ موسیٰؑ نے کہا ہے' یہ بھی بڑی عجیب چیز ہے۔ جب فرعون کے پاس آ کر انہوں نے یہ ساری باتیں کیں کہ تم یہ کرتے ہو اور میں یوں آیا ہوں تو فرعون نے کہا تھا کہ موسیٰؑ! ہمارے احسانات بھول گئے۔ تم دریا میں بہا دیئے گئے تھے' ہم نے تمہیں وہاں سے بچا لیا' محلات میں تمہاری پرورش کی' شہزادوں کی طرح تمہیں پالا پوسا۔ تم تو یہاں کے ولی عہد بننے والے تھے' اتنا کچھ ہم نے تمہارے حق میں کیا' یہ کچھ کیا تو تم سارے احسانات بھول گئے اور اس طرح سے میرے مقابل میں کھڑے ہو کر باتیں کر رہے ہو۔ اس پر حضرتِ موسیٰؑ نے کہا کہ حضور! ایک جو سب سے بڑا احسان ہے' وہ آپ نے مجھے یاد نہیں دلایا' اسے بھی ذرا یاد دلا دیجیے۔ اور وہ یہ ہے کہ اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ [1] (26:22) تم پوری کی پوری بنی اسرائیل کو تو اپنی غلامی کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہو اور میرے ذاتی احسان کے بدلے میں مجھ سے کہتے ہو کہ میں کچھ نہ کہوں۔ اُدھر خود فرعون کا اعتراف موجود ہے کہ قَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ (23:47) اس کی قوم ہماری محکوم ہے۔

عزیزانِ من! الفاظ عابد اور عبادت آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ قرآن کریم میں کن معنوں میں استعمال ہو رہے ہیں؟ یہ عبادت گزار کے معنوں میں استعمال نہیں ہو رہے۔ حضرتِ موسیٰؑ نے کہا تھا کہ ٹھیک ہے تمہاری قوم ہے' تم اس کے حاکم ہو اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اپنی

---

[1] وَتِلۡکَ نِعۡمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ (26:22) باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ تم نے بچپن میں میری پرورش کی اور محلات میں ناز و نعمت سے پالا۔ تو تم اپنے ان احسانات کا بدلہ یہ چاہتے ہو کہ پوری کی پوری قومِ بنی اسرائیل کو اپنی محکومی کے شکنجے میں جکڑے رکھو! (تم نے ایک فرد پر جو احسانات کیے' انہیں تو جتاتے ہو لیکن اس کی پوری قوم پر جو مظالم کر رہے ہو' ان کا ذکر کیوں نہیں کرتے؟)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 836)۔

قوم پر جس طرح جی چاہے حکومت کرو' اس قوم بنی اسرائیل پر کیوں تم اس قسم کی حکومت اختیار کرتے ہو۔ اَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ (20:47) بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ انہیں یہاں سے آرام سے نکال کر لے جاؤں۔ اس راستے میں تم مزاحم مت ہو' تمہارا اس میں کیا بگڑتا ہے' میں ان کو لے جانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ ٹھیک ہے' میرا کچھ نہیں بگڑتا' کہو یہ کہ میرا رہتا کیا ہے' محکوم قوم کو یہاں سے لے جاؤ تو میں حکومت کس پر کرونگا۔ حاکم کے لیے تو محکوم کی ضرورت رہتی ہے۔ محکوم کو نکال کر لے جانا اور یہ کہنا کہ تمہارا کچھ نہیں بگڑتا' غلط ہے۔ کہا یہ ہے کہ رہتا ہی کچھ نہیں ہے۔

اور آگے بات آئی کہ پھر ٹھیک ہے' یہاں سے' میری محکومیت سے' تم بنی اسرائیل کو نکالنا چاہتے ہو' تا کہ یہ ہمارے محکوم نہ رہیں تو وہاں لے جانا چاہتے ہو تا کہ وہاں جا کر انہیں اپنے محکوم بنا لو۔ اس سے زیادہ تو کسی کے تصور میں بات نہیں آ سکتی کہ یہ جو حکومت کے لیے اس طرح سے جھگڑ رہا ہے' کشمکش ہو رہی ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ یہاں اگر تم میری حکومت قائم نہیں کرنے دیتے' چلو کوئی بات نہیں' تم یہاں حاکم رہو' میں بنی اسرائیل کو لے کر سینا کی وادیوں میں چلا جاتا ہوں کہ تم وہاں ان پر حکومت کرو' مقصد تو تمہارا حکومت کرنا ہے۔ سارے ملکِ مصر پہ نہ سہی' سینا کی وادیوں میں بنی اسرائیل پر ہی سہی۔ تم یہ چاہتے ہو۔ اسی لیے یہ کہتے ہو کہ اَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ (20:47) بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔

قومِ بنی اسرائیل کی آزادی کے لیے حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ اور مردِ مومن کی للکار کہ یہ کہتا ہے کہ ان خدا کے بندوں کو خدا کی عبدیت میں دے دو

عزیزانِ من! سنیئے کیا بات ہے! کہ وَلَقَدۡ فَتَنَّا قَبۡلَهُمۡ قَوۡمَ فِرۡعَوۡنَ وَجَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌ كَرِيۡمٌ (44:17) ان سے پہلے قومِ فرعون کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو گزرا ہے۔ ان کی طرف ہمارا ایک معزز رسول آیا۔ اور ان سے کہا کہ اِنِّیۡ لَكُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِيۡنٌ (44:18) میں تو ایک پیغامبر ہوں' خدا کا پیغام تمہاری طرف پہنچا رہا ہوں' اپنی تو میں بات ہی نہیں کر رہا۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ ان اَدُّوۡۤا اِلَیَّ (44:18) تم کہتے ہو یہ میرے عباد ہیں' میرے محکوم ہیں' میرے عبد ہیں' میرے بندے ہیں۔ انہیں میرے حوالے کر دو۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ تمہارے نہیں ہیں اور اس کے بعد یہ کہہ رہا ہوں کہ میرے بھی نہیں' بلکہ عِبَادَ اللّٰهِ (44:18) یہ اللہ کے محکوم ہیں۔ ان کو مجھے دیدے' انہیں میرے سپرد کر دو' میں ساتھ لے جاؤں تا کہ یہ میری اور تمہاری غلامی سے چھوٹ کر اللہ کی غلامی کے اندر آ جائیں۔ اور یہاں یہ لفظ **ادوا** آیا ہے۔

قرآن حمید عجیب الفاظ استعمال کرتا ہے۔ یہ ''اَدُّوْا'' ❶ ہوتا ہے ''کسی کی چیز جو دوسرا سنبھال کر بیٹھ جائے' اسے یہ کہنا کہ بھئی! جو اس چیز کے اصل مالک ہیں اس کو انہیں واپس لوٹا دو۔ اس کے لیے یہ لفظ ''اَدُّوْا '' آتا ہے۔ امانت کے لیے یہ لفظ آتا ہے کہ جس کا یہ ہے یہ اس کی طرف لوٹا دو۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے کہ میں یہاں سے بنی اسرائیل کو لے جانا چاہتا ہوں تا کہ وہاں میں ان کو اپنا محکوم اور عبد بنا لوں۔ اَدُّوْا اِلَیَّ (44:18) یہ جس کے ہیں ان کی طرف لوٹا دو۔ عِبَادَ اللّٰہِ (44:18) یہ اللہ کے محکوم اور عباد ہیں۔ میں ان کو خدا کی عبدیت میں دینے کے لیے لے جانا چاہتا ہوں۔ صاف فرق ہو گیا۔ فرعون کے اس فرد' مردِ مومن' کا جواب بھی ہو گیا۔ مردِ مومن نے کہا کہ اس کے خلاف بغاوت کا الزام تو اس صورت میں دھرا جا سکتا ہے جب یہ یہاں تمہاری یا ہماری حکومت کو الٹ کر خود حکمران بننا چاہیں یا بنی اسرائیل کو لے جا کر وہاں ان پر خود حکومت کرنا چاہیں۔ وہ تو یہیں اعلان کر رہا ہے کہ نہ بابا! میں تو حکومت نہیں کرنا چاہتا' میں تو اسی طرح عبد ہوں جس طرح سے یہ ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہاں تم نے ان کو اپنا عبد بنا رکھا ہے' میں ان کو لے جانا چاہتا ہوں تا کہ خدا کے بندوں کو خدا کی عبدیت میں دیدوں۔

خدا کی حکومت یا اسلامی حکومت قائم کرنے والوں کا فریضہ اور منزلِ مقصود

یہ کتنی بڑی بات ہے جو یہاں ایک لفظ رَبِّیَ اللّٰہُ (40:28) میرا نشو ونما دینے والا اللہ ہے' میں واضح ہو گئی۔ خدا کی حکومت قائم کرنے والوں کا مقصد اور دنیا میں انقلاب برپا کرنے والوں کا مقصد ایک انسان کی یا انسانوں کے گروہ کی حکومت کا تختہ الٹ کرا پنی نہیں بلکہ حکومتِ خداوندی قائم کرنا ہے۔ نظامِ خداوندی کے داعی کا مقصد انسانوں پر سے انسانوں کی غلامی کا جوا اتار کر انہیں خدا کی غلامی میں دیدینا اور خود بھی اس کی غلامی میں آجانا ہے۔ یہ ہے جی دونوں کے اندر فرق۔ خدا کی محکومیت میں آنے والا کسی انسان کا محکوم رہتا ہی نہیں ہے۔ قرآن مجید نے تو واضح الفاظ میں کہہ دیا ہوا ہے کہ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَ الْحُکْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا' اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے' خواہ اس کے پاس قانون سازی کے اختیار ہوں' خواہ اس کے پاس انتظامیہ ہو' خواہ وہ نبی کیوں نہ ہو' اس کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم میرے محکوم اور غلام بن جاؤ۔ وہ یہ کہے گا کہ خدا کے محکوم بنو' اس کتاب کی رو سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو۔ نبی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کہے کہ تم میرے محکوم اور غلام بن جاؤ۔

---

❶ اس کا مادہ ''ادی (ادو)'' ہے۔ یہاں اس کے معنی ہیں ''کسی کے سپرد کر دینا جیسے امانت واپس کر دی جاتی ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد اول' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1960' ص۔ 216)۔

قرآنِ حکیم میں دین کا لفظ ''نظامِ حیات'' کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس مردِ مومن نے انؑ کی مدافعت میں اسی کی وضاحت کی ہے

یہاں یہ حضرتِ موسیٰؑ نبی ہیں' وہ بھی فرعون سے یہ نہیں کہتے کہ میں بنی اسرائیل کو یہاں سے لے جانا چاہتا ہوں تا کہ وہاں وادیٔ سینا میں' میں ان کو اپنی محکومیت میں رکھوں۔ وہ جو فرعون نے کہا تھا کہ یہ یا تو دین بدل دے گا یا فساد برپا کر دے گا۔ عزیزانِ من! دین کے معنی ''نظام'' ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے۔ کہا ہے کہ یہ یہاں یا تو نظام الٹ دے گا' ایسا نہیں ہوگا تو یہاں فساد برپا کر دے گا۔ حضرتِ موسیٰؑ نے کہا کہ نہیں' اس سے نہ ڈرو' یہ دونوں ہی چیزیں نہیں ہیں۔ یہ تمہیں یہ تمہاری قوم مبارک ہو' کرتے رہو ان کے اوپر حکومت۔ میں تو ان بندوں کو جنہیں تم نے اس قدر اپنے ہاں غلامی کے جوئے میں جکڑ رکھا ہے' لے جانا چاہتا ہوں تا کہ یہ خدا کی غلامی کے اندر آ جائیں۔ میں وہاں حاکم نہیں بننا چاہتا۔ اُس مردِ مومن نے کہا یہ تھا کہ تم کہتے ہو کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) میں تمہاری پرورش کرتا ہوں' کھانے پینے کو میں دیتا ہوں' میں ہی تمہارا ''ان داتا'' ہوں اس لیے تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ یہ شخص' یہ نہیں کہتا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) بلکہ يَقُوْلَ یہ کہتا ہے کہ رَبِّيَ اللّٰهُ (40:28) میرا نشوونما دینے والا اللہ ہے۔

عزیزانِ من! جو انسانوں کی حکومت یا نظام کو بدلنے کے لیے کہہ کر اٹھتا ہے' وہ تو خدا کی بات کرتا ہے۔ اور جو ایک رب کی جگہ' دوسرا رب انہی انسانوں میں سے بدل دیتا ہے' جیسا شرک وہ کر رہا ہوتا ہے اسی قسم کا شرک یہ کر رہا ہوتا ہے۔ اب آپ نے یہ سمجھا کہ اس مردِ مومن نے فرعون کو اس فردِ جرم کا جواب کیا دیا تھا' اب آپ نے سمجھا کہ یہ بات نماز روزے کی نہیں ہو رہی تھی' نہ ہی یہ ہو رہا تھا کہ ایک انسان کی حکومت کو بدل کر دوسرے انسان کی حکومت مسلط کر دی جائے۔ اس مردِ مومن نے کہا تھا کہ اس کا ان کو بھی اقرار ہے اور میں بھی اس کا اقرار کرتا ہوں کہ یہ اپنی حکومت نہیں قائم کرنا چاہتا' خدا کی ربوبیت کے اندر انسانوں کو لانا چاہتا ہے۔ اور میرے نزدیک یہ کوئی ایسا جرم نہیں ہے کہ جس کی پاداش میں اس کو قتل کر دیا جائے۔ میں اس کی مدافعت میں اٹھتا ہوں۔ اور دوسری یہ بات تھی کہ یہ لوگ اس بات کے دل سے قائل تھے کہ بات یہ ٹھیک کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ (40:28) اس نے جو دلائل تمہارے سامنے دیئے ہیں' ان کا تمہارے پاس جواب نہیں۔ تمہارے قلوب مطمئن ہیں۔ یہ تمہاری جو انانیت ہے' دماغ کے اندر فرعونیت ہے وہ حکومت کا نشہ ہے' بدمستی ہے' وہ تمہیں اس کا اقرار نہیں کرنے دیتی' دل میں تم بھی مانتے ہو کہ بات یہ ٹھیک کہتا ہے۔ تو جب یہ بات ٹھیک کہتا ہے تو اس جرم کی پاداش میں اس کو قتل کر دینا کیسے جائز ہے۔ عزیزانِ من! اب آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم

نے اس مردِ مومن کی تقریر کو کیوں محفوظ کیا ہوا ہے۔

نوعِ انسانی کے لیے ''رَبِّیَ اللّٰہُ ' رَّبِّکُمْ ' رَبُّ اٰبَآءِکُمْ' رَبِّیَ یا رَبَّنَا'' کے انقلاب کا مفہوم اور اس مردِ مومن کا قول جو قرآن کریم نے قیامت تک کے لیے محفوظ کرلیا۔

یہ اس مردِ مومن کی تقریر نہیں' یہ قیامت تک کے لیے صداقت پر مبنی حقیقتِ حال ہے۔ جہاں بھی خدا کی حکومت میں اور انسانوں کی حکومت میں آویزش ہوگی' وہاں اٹھ کر یہ جو مردِ مومن ہے' اس کی تقریر کہی جائے گی۔ یہی تقریر دہرائی جائے گی کہ ہم رَبِّیَ اللّٰہُ (40:28) کہنا چاہتے ہیں اور تم اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (79:24) کہنا چاہتے ہو۔ ہر انسانی اقتدار اور قوت کا جو مالک ہے' وہ ان الفاظ میں کہے یا نہ کہے' مفہوم یہی اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی ہوتا ہے۔ اور حقیقت میں جسے آپ انقلابِ خداوندی کہتے ہیں یہ اسی کا ہی بدلنا ہے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کہے۔ کہا یہی ''رَبِّیَ اللّٰہُ ' رَّبِّکُمْ ' رَبُّ اٰبَآءِکُمْ' رَبِّیَ ' رَبَّنَا'' جانا چاہیے۔ اور پھر یہاں وہ حکومت و اقتدار کا بھی لفظ نہیں ہے' رب ہی کا لفظ ہر جگہ آ رہا ہے۔ اصل تو بات یہی ہے۔ ربوبیت کا سامان جب ہاتھ میں لے لیا جاتا ہے تو اس کے بعد یہ باقی حکومت' اقتدار اس کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔ اس مردِ مومن کا قول قرآن کریم نے نقل کیا ہے کہ وَقَدْ جَآءَکُمْ بِالْبَیِّنٰتِ مِنْ رَّبِّکُمْ (40:28) اور وہ اپنے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس واضح دلائل لے کر آیا ہے۔ وہ اپنے دعوے کو علم و بصیرت کی بنا پر پیش کرتا ہے اور عقل و برہان سے منواتا ہے اور تم اس کے مقابلہ میں دھاندلی سے کام لے کر اسے مار ڈالنا چاہتے ہو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ دلائل کس قسم کے دیئے جا رہے ہیں اور جواب کیا مل رہا ہے؟

''اے اربابِ نظر! نشۂ قوت ہے خطرناک۔'' یہ ہے مردِ مومن' حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے مکالموں کے امتزاج کا لُبِّ لباب

عزیزانِ من! یہ حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش کی کیا ہی داستان ہے! اس کے اندر قرآنِ کریم نے دنیا بھر کی سیاست سمو کر رکھ دی ہے۔ فرعون سے جواب بن نہیں پڑ رہا۔ کیا کہہ رہا ہے؟ یہ کہ وَقَالَ فِرْعَوْنُ یٰھَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ . اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓی اِلٰہِ مُوْسٰی وَاِنِّیْ لَاَظُنُّہٗ کَاذِبًا (40:36-37)۔ یہاں وہ باتیں ہو رہی ہیں' کتنی Serious (سنجیدہ) بات ہو رہی ہے' کتنی اہم بات ہو رہی ہے لیکن حکومت کا نشہ ہے۔ آپ دیکھیے کہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے شرابی کی باتیں ہیں۔ وہ یہ سب کچھ سن رہا ہے' ہامان جو سب سے بڑے مذہبی پیشوا ہیں' بیٹھے ہوئے ہیں۔ فرعون نے کہا کہ ہامان! یہ بار بار کچھ اللہ کی

بات کرر ہا ہے اور کہتا ہے کہ یہ آسمان کے اوپر ہوتا ہے اور وہ ہے۔ ذرا ایک بڑا سا مینارہ تو بناؤ' میں اس کے اوپر چڑھ کر جھانکوں تو سہی کہ وہ رب کہاں بیٹھا ہوا ہے۔ یہ مذاق اڑا رہا ہے۔

ارباب نظر ! نشۂ قوت ہے خطرناک

یہ انسان کو سمجھنے کی طرف آنے نہیں دیتا۔ بات کیسی ہو رہی ہے اور درمیان میں کہہ کیا رہا ہے۔ مذاق کرر ہا ہے لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اُسے پالا کس سے پڑا ہے۔ انہوں نے اس کی اس بات کا نوٹس ہی نہیں لیا تھا کہ اس نے کیا کہا ہے' اپنی بات آگے جاری رکھی۔ اور جب وہ بالکل عاجز آ گیا' کچھ نہ بن پڑی' تو پھر جس طرح ہر وہ شخص جو دلائل سے لاجواب ہو جائے' وہ پھر دوسروں کو مذہبی بحث کے اندر الجھا دیتا ہے۔ اس نے پوچھا تھا کہ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى (20:49) اے موسیٰ! تمہارا رب کون ہے؟ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (20:50) حضرت موسیٰ نے کہا کہ ہمارا رب وہ ہے جو ہر شے کو پیدا کرتا ہے اور پھر اسے وہ راستہ بتا دیتا ہے جس پر چل کر وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ سکتی ہے۔ اگر ان کی حضرتِ موسیٰ کی یا مردِ مومن کی تقریریں اکٹھی کی جائیں یا جو فرعون کے مکالمے ہیں وہ اکٹھے کیے جائیں تو یہ داستان عجیب چیز بنتی ہے۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں۔

فرعون کا ایک الجھا دینے والا نازک سوال' حضرت موسیٰ کا بے لاگ جواب اور مردِ مومن کی پکار کہ اپنی روش کا سوچو

آپ کو معلوم ہے کہ یہ فرعون حضرت موسیٰ کو کہاں الجھانا چاہتا ہے۔ سنیے! کہنے لگا کہ موسیٰ' ذرا ٹھہرو! یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی' قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى (20:51) یہ بتاؤ کہ ہمارے بڑے' جو یہاں سے مر گئے ہیں' وہ وہاں کس حال میں ہیں۔ بات اتنی Serious (سنجیدہ) سیاست کی ہو رہی ہے' جواب نہیں بن پڑتا۔ اور کہا ہے کہ اس کو مذہبی بحث میں الجھاؤ۔ اُس نے یہ جو اِن کے اکابرین یا حالی موالی یا وزیر درباری سارے بیٹھے ہوئے تھے' ان کے نازک جذبات کو Touch (مَس) کیا۔ ان کے بھی تو بڑے بزرگ تھے' جو پہلے مر گئے ہوئے تھے۔ کہا کہ موسیٰ! بس ہمیں یہ بتا دو کہ ہمارے جو بڑے بوڑھے مر چکے ہیں' وہ کس حال میں ہیں' جنت میں ہیں یا جہنم میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مشرک ہے' اس کے بڑے بوڑھے سارے مشرک ہیں' انہیں معلوم تھا کہ اب اگر یہ کہا کہ وہ تو درکِ اسفل میں ہونگے جو مر گئے تو یہ کہے گا کہ دیکھو! تمہارے بڑوں کو کیا کہہ رہا ہے اور پھر پوری قوم میں مشہور کر دے گا اور اس بھیڑ کو پیچھے لگا دے گا کہ یہ ہمارے بزرگوں کو گالیاں دیتا ہے' ہمارے اسلاف کو کہتا ہے کہ جہنم میں ہیں' ارے سنتے ہو' کیا کہہ رہا ہے کہ وہ فلاں حضرت صاحب جہنم میں ہیں۔ یہ مسئلہ ہی خرد برد ہو جائے گا۔ یہ ہوتی ہی سیاست کی تدبیریں ہیں کہ ان کو ان مسئلوں

کے اندر الجھادو

مست رکھو ذکر و فکرِ صُبحگاہی میں اسے
پُختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اور الجھادو ان مسئلوں کے اندر کہ

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات؟

(اقبالؒ: ارمغانِ حجاز اردو)

کہا کہ انہیں اس میں الجھادو کہ موسیٰؑ! ذرا بتانا۔ یہ سوال اگر ہمارے ہاں کے کسی واعظ سے اور ہمارے ہاں کے مناظر سے کرتا تو وہ ساری رات اس کے اندر سلجھانے میں لگ جاتا۔ جو اصل سوال تھا' وہ سارے کا سارا خرد برد ہو کر رہ جاتا' اسی میں الجھ کر رہ جاتا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ پالا کس سے پڑا ہے۔ یہ خدا کا رسول تھا جس کے ساتھ اس کا پالا پڑا ہے۔ اس نے یہ بات پوچھی کہ ان کا کیا حال ہے؟ کہا کہ **قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ** (20:52) ان کا معاملہ میرے خدا کے ہاں ہے' ان کے اعمال نامے کی رو سے وہاں طے ہوتا ہوگا۔ تم یہ بتاؤ کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیجتے ہو یا نہیں۔ فرعون تنگ آ گیا' اس نے ہامان کو بلایا ''کہن لگا: بابا! اینوں سانبھ' اے میرے وس دی گل تے نئیں ہیگی'' (کہنے لگا کہ بابا! اسے سنبھالو یہ تو میرے بس کی بات نہیں ہے)۔ کیا داستان چلی آ رہی ہے! فرعون کی کابینہ کے اس مردِ مومن نے کہا تھا کہ **وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ** (40:28) یہ خدا کی طرف سے واضح دلائل لے کر آ گیا ہے۔ یہ بات بڑی صاف ہے۔ آگے قرآنِ کریم نے اس کی بات کا بتایا ہے کہ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ **وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ يَعِدُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ**(40:28) اگر وہ اپنے دعویٰ رسالت میں جھوٹا ہے تو اس کا وبال اس پر پڑے گا اور اگر تم اپنی اس روش پہ چلے گئے' اسی نظام پر قائم رہے' یہی کچھ کرتے رہے جو کچھ تم ظلم اور استبداد کر رہے ہو تو یاد رکھو! تباہ ہو جاؤ گے' جن تباہیوں کے متعلق وہ تمہیں آگاہ کر رہا ہے' وہ تم پر آ کر رہیں گی۔

اس مردِ مومن نے کہا کہ اس کو قتل کرنے کی کوئی بات نہیں' اس کو ٹھہرائے رکھو اور دیکھو کہ جو کچھ یہ کہتا ہے یہ سچ ہے یا غلط ہے۔ اگر یہ سچا ہوا تو ٹھیک ہے یہ عذاب تو پھر تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ اگر یہ اس معاملے میں جھوٹا ہوا تو تمہیں تو کوئی نقصان نہیں' تمہارا تو کچھ نہیں بگڑے گا' یہی بھگتے گا۔ قتل کر دینے سے تمہیں کیا حاصل ہوگا۔ تم نے قتل کیا تو اگر اس بات میں یہ سچا ہے کہ تم تباہ ہو جاؤ گے' تمہارا یہ نظام تباہ ہو جائے گا تو اس سے تم نہیں بچ پاؤ گے اگر جو کچھ یہ کہہ رہا ہے' یہ صحیح کہہ رہا ہے اور میں سمجھتا ہوں بالکل صحیح کہہ رہا ہے اس لیے یہ

تمہاری تدبیر کیا ہے کہ جبر سے، جور سے، اس طرح سے، اس کی زبان بند کرو کہ بات یہ کہے ہی نہیں تو کیا اس سے تم بچ جاؤ گے؟ سنو! یہ قتل بھی ہوجائے گا تو کیا تم اس تباہی سے بچ جاؤ گے؟ اس لیے تمہاری یہ تدبیر بڑی غلط ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کس انداز سے وہ مردِ مومن اس کی طرف آ رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کذاب ہو، جھوٹی بات کہے، حد سے تجاوز کرنے والا ہو، ظلم کرنے والا ہو، وہ بچتا نہیں ہے، خدا اس کو کبھی صحیح منزلِ مقصود پہ نہیں پہنچاتا۔ اگر یہ ٹھیک بات ہے تو ہم تباہ ہوجائیں گے۔ یہ زندہ رہے یا تم اس کو قتل کردو، تم اس تباہی سے نہیں بچ سکتے۔ سوچو یہ کہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے وہ صحیح بات ہے یا نہیں۔

اس مردِ مومن کا انتباہ، دانش مندانہ مشورہ اور اس پر فرعون کا ناصحانہ و معذرت خواہانہ اسلوب

عزیزانِ من! اس مردِ مومن نے اگلی بات یہ کہی ہے کہ **یٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ**(40:29) میں جانتا ہوں کہ آج جو تم اس قسم کی ٹکے ٹکے کی باتیں کررہے ہو، یہ صرف اس لیے ہے کہ حکومت تمہارے ہاتھ میں ہے، قوت کا نشہ ہے جو تمہیں سچی اور سیدھی بات کو سوچنے نہیں دیتا، غلبہ تمہارا ہے، تسلط تمہارا ہے۔ ٹھیک ہے اس کی بنا پہ تم یہ سب کچھ کررہے ہو لیکن **فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا** (40:29) بتاؤ! یہ جو کچھ کہتا ہے کہ ظلم اور تحدی اور استبداد کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے، آج تم اس ملک کے مالک حاکم جابر، استبداد قوت والے، غلبے والے بنے پھرتے ہو، اس غلبے اور تسلط کی بنا پہ جب تباہی آئی تو بتاؤ کہ اس سے تمہیں کون بچائے گا۔ وہ یہ کچھ اس لیے کہہ رہا تھا ورنہ یہ کہتے کہ ہم تو اسے مانتے ہی نہیں ہیں کہ اس کی وجہ سے تباہی آئے گی۔ یہ انہی میں سے تھا کہ جن کے دل مانتے تھے کہ یہ ٹھیک کہتا ہے اور وہ انانیت اور فرعونیت ان کو زبان پہ نہیں لانے دیتی تھی۔ یہ ان سے کہہ رہا ہے کہ تم اس بات کو مانتے ہو کہ یہ کہتا ٹھیک ہے۔ اور چونکہ یہ تمہاری انانیت اس کا اعتراف نہیں کرنے دیتی اس کے لیے تم نے طریقہ یہ سوچا ہے کہ اس کو قتل کردو۔ اس کو قتل کردو تو جس چیز کو تم خود سمجھتے ہو کہ ٹھیک ہے، وہ کل کو جب آ گئی تو کیا ان عواقب سے تم بچ جاؤ گے۔ اس کے قتل کردینے سے تو تم ظلم اور تحدی کے نتائج سے نہیں بچ سکو گے، وہ آ کر رہے گی۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ یہ قدم نہ اٹھاؤ۔ اس کے رہتے ہوئے ہوسکتا ہے کہ آج نہیں تو کل اس کی بات تمہاری سمجھ میں آ جائے اور بچ جاؤ۔ یہ نہ رہا تو پھر تو بچنے کی کوئی صورت نہ رہے گی اس لیے یہ نہ کرو۔

عزیزانِ من! اس کا جواب کیا ملتا ہے؟ کہا کہ **قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ** (40:29) فرعون اپنے اُن درباریوں سے کہہ رہا ہے جنہیں اس نے دیکھا کہ وہ اس سے کچھ Convince (قائل) ہوتے جا رہے ہیں کہ کہیں یہ بھی نہ الٹ جائیں کیونکہ اسے معلوم تھا کہ دل میں تو مانے ہوئے ہیں۔ اور وہ مردِ مومن یہ کہہ رہا تھا کہ یہ قتل کردینا کونسا صحیح قدم ہے جو تم اٹھا رہے ہو۔ فرعون بری الذمہ ہو رہا ہے، ان کے اوپر ڈال رہا ہے۔ کہا کہ بھائی! بات یہ ہے کہ میں تو جو کچھ صحیح سمجھتا

ہوں' ایمانداری سے وہ بات تمہیں کہہ رہا ہوں' میں تمہارے بھلے کی بات کہہ رہا ہوں' میری رائے یہ ہے' میری بصیرت اسی نتیجے پہ پہنچاتی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ یعنی ان کے ذمے ڈالا ہے۔ اب وہ جو فرعونیت کا استکبار تھا کہ نہیں! کوئی پروا نہیں ہے' کر دو قتل اس کو' اب وہ جھکا ہے کیونکہ معلوم ہے کہ دل سے تو یہ بھی قائل ہیں' باتیں جو کر رہا ہے' وہ Convincing (قابلِ قائل) ہیں۔ اس سے یہ مطمئن ہو جائیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی الٹ جائیں' خلاف ہو جائیں تو ان سے یہ کہہ رہا ہے کہ میں یہ کوئی حکم نہیں دے رہا' نہ یہ ہے کہ تمہاری مرضی کے خلاف میں کوئی چیز کہہ رہا ہوں۔ مجھے بہر حال یہ چیز صحیح نظر آتی ہے کہ ایسا ہونا چاہیے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ میں تو تمہارے بھلے کی بات کہہ رہا ہوں۔

عزیزانِ من! آج وقت ہو گیا۔ ہم سورۃ المؤمن کی آیت 29 تک ہی آئے۔ آج تو اگر ایک ہی آیت آجاتی تو وہ بھی بڑی بات تھی۔

ایک مردِ مومن کا کردار اور اس کی تعمیری سوچ' ہزاروں انسانوں کے لیے انقلاب کا باعث بن جاتی ہے

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اگر کہیں سے کوئی ایک مردِ مومن بھی اٹھ کر کھڑا ہو جائے تو فرعون کے لیے معاملات کس قدر خوف کا باعث بن جاتے ہیں۔ یہاں آپ نے دیکھا کہ ابھی اس نے دو جملے کہے ہیں تو فرعون کی فرعونیت کہاں چلی گئی' اس کا Attitude (رویہ) Apologetic (معذرت خواہانہ) ہو گیا' اپنوں سے ہی معذرت خواہانہ بات ہو رہی ہے کہ بھئی! میں کوئی دھاندلی کی بات نہیں کر رہا۔ میں نہ تم سے یہ کہہ رہا ہوں کہ میرا حکم مانو اور نہ ہی یہ ہے کہ ضرور یہ کچھ کرو۔ میری سمجھ میں یہ بات آئی ہے جو میں تم سے کہہ رہا ہوں' میں تمہارے بھلے کی بات کہہ رہا ہوں۔ اب وہ اس پر آ گیا۔ عزیزانِ من! بڑی چیز ہوتی ہے اگر ایک مردِ مومن بھی اٹھ کر کھڑا ہو جائے۔ یہاں تک تو ہم آئے اور ابھی تو تقریر باقی ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

چوتھا باب: سورۃ المؤمن (آیات 30 تا 45)

عزیزانِ من! آج فروری 1981ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمن کی آیت 30 سے ہو رہا ہے:(40:30)۔

سابقہ درسِ قرآن حمید کی تجدید اور مردِ مومن کی وضاحت

چونکہ بات مسلسل چلی آ رہی ہے اس لیے تجدیدِ یادداشت کے لیے یہ عرض کردوں کہ داستان ہے یہ صاحبِ ضربِ کلیم حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش کی۔ اس نقطے تک بات پہنچی تھی کہ بالآخر فرعون نے فیصلہ کرلیا کہ حضرتِ موسیٰؑ اس کے دربار میں دوبارہ آئے تو ان کو قتل

کر دیا جائے۔اس مقام پر اسی کی کیبنٹ یا پارلیمان میں سے نظر آ رہا ہے کہ ایک اعلیٰ منصب یا پوزیشن کا ایک شخص ہے جسے قرآن حمید نے مردِ مومن کہا ہے۔ جب معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل تک پہنچا تو پھر وہ رک نہ سکا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔اس نے فرعون کو بھی اور اپنے دوسرے رفقا کو بھی مخاطب کر کے ایک تقریر کی۔قرآنِ کریم نے اس تقریر کو' اس سورۃ کے اندر' دو رکوع میں بالفاظہٖ درج کیا ہے اور محفوظ کیا ہے۔ پچھلا پورا درس اسی ایک نقطہ کے لیے میں نے مختص کیا تھا۔وہ اس تقریر کا آغاز اس سے کرتا ہے کہ تم اس کے خلاف الزام یہ عائد کرتے ہو کہ یہ تم سے حکومت چھین کر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے' خود حکمران بننا چاہتا ہے۔یہ الزام ہی غلط ہے' تم یہ ثابت ہی نہیں کر سکتے۔وہ اپنی حکومت نہیں چاہتا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بات صرف وہاں کی نہیں ہو رہی۔ جہاں بھی آپ انسانوں کی حکومت کے مقابلے میں' خدا کی حکومت لائیں گے تو بات یہ ہو گی جو یہاں مردِ مومن نے دو لفظوں میں کہی تھی۔کہا کہ تم کہتے ہو کہ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (79:24) میں ہوں تمہارا سب سے بڑا رب' اَن داتا' روٹی دینے والا' تم میرے محتاج ہو مگر یہ ایسی بات نہیں کہتا کہ تم نہیں' میں رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی ہوں۔ یہ الزام تو اس صورت میں عائد ہو کہ تم سے چھین کر وہ خود کچھ بننا چاہے۔وہ تو یہ کہتا ہی نہیں ہے۔وہ کہتا یہ ہے کہ بھئی! پرورش کرنے والا' اَن داتا' جس کی احتیاج ہو' وہ نہ تم ہو نہ میں ہوں' وہ ہے جو تمہارا بھی پرورش کرنے والا ہے' میرا بھی' تمہارے آباؤالاولین کا بھی ہے۔وہ آج کی حکومت لینے کے لیے نہیں آیا۔وہ جو تمہارے ہاں کی نسلیں پیچھے سے متوارث چلی آ رہی تھیں' وہ تو تمام نوعِ انسانی کا رب ہے۔اس کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ ربوبیت کے دعوے اور حکومت کے اجزا انسانوں کے ہاتھوں سے چھین لے اور اس کے ہاتھ میں دیدیئے جائیں جو فی الحقیقت رب ہے۔کہا کہ فردِ جرم یہ عائد ہوتی ہے اس کے خلاف' وہ نہیں جو تم کہتے ہو۔

اسلامی حکومت کے سربراہ کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ خدا کے احکام میں خود کو شریک نہ کرے: مردِ مومن کی ایک وضاحت

یہ بڑی عظیم چیز ہے جو یہ مردِ مومن کہہ گیا ہے۔ جو شخص بھی دنیا میں خدا کے نام پہ یا خدا کی حکومت یا جسے اب اسلامی حکومت کہا جائے گا' کا ادعا لے کر اٹھے اس کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ حکومت میں اس کا اپنا کوئی دخل نہ ہو۔اگر کسی دوسرے کی جگہ یہ حاکم ہو گیا تو جیسا شرک وہ تھا ویسا ہی شرک یہ ہے۔ یہ تو بغاوت ہو جائے گی' یہ تو ایک متوازی حکومت یا اس کی جگہ دوسری حکومت قائم کرنے کی بات ہو جائے گی لیکن اگر صورت یہ ہو کہ وہ انسانوں کے ہاتھ سے چھین کر اپنے ہاتھ میں نہ لے' کیونکہ یہ تو پھر انسانوں کے ہاتھ میں لینے والی بات ہو جائے گی' بلکہ وہ خدا کے احکام اور اس کے قوانین کو نافذ کرے تو کہا کہ وہ الزام عائد نہیں ہوتا جو تم عائد کرنا چاہتے ہو۔اس مردِ

مومن نے فرعون سے پہلی بات یہ کہی تھی

مردِ مومن کی فرعون سے مزید مدبرانہ گفتگو جس نے ہوا کا رُخ بدل کر رکھ دیا

عزیزانِ من! اس مردِ مومن نے دوسری بات یہ کہی تھی کہ یہ جو تمہاری تدبیر ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے تو سنو! اس کا تمہیں نقصان پہنچے گا۔ یہ شخص یہ نہیں کہتا کہ میں تمہیں قتل کر دوں گا یا میں تمہیں تباہ کر دوں گا۔ یہ بھی نہیں کہتا کہ پھر تم اس سے ڈر جاؤ کہ صاحب! اس کو قتل کر دیجیے تاکہ یہ مجھ پہ وار نہ کر سکے۔ یہ سن لیجیے! یہ خود نہیں وار کر رہا' کہہ یہ رہا ہے کہ یہ جو تمہارا غلط نظام ہے اس کے نتائج بڑے تباہ کن ہونگے' یہ تمہیں اور تمہاری قوم کو لے ڈوبیں گے۔ اس مردِ مومن نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ اس کو زندہ رکھو۔ اگر یہ بات ٹھیک ہوئی جو یہ کہتا ہے کہ اس کے نتائج تمہیں تباہ کریں گے تو ہوسکتا ہے کہ اُس وقت یہ تمہیں کوئی ایسی تدبیر بتادے کہ جس سے تم اس سے بچ جاؤ۔ اور اگر تم نے اس کو قتل کر دیا تو تمہیں حاصل تو کچھ نہ ہوا اور اس وقت اگر تمہیں اس چیز کی ضرورت پڑی کہ کوئی صحیح راستے پہ ہی لے جانے والا ہو' کوئی بات صحیح کرنے والا ہو' کوئی صحیح مشورہ دینے والا ہو' تو اس کو تو تم نے قتل کر دیا' اس وقت کوئی بھی نہیں ہوگا۔ یہ یاد رکھو۔ اس لیے یہ تمہارے حق میں ہے کہ اس کو قتل نہ کرو۔ یہ دو باتیں تھیں جو وہاں اس نے کہیں۔

اور اس کے بعد اس نے یہ کہا تھا کہ **یٰقَوۡمِ لَکُمُ الۡمُلۡکُ الۡیَوۡمَ ظٰہِرِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ**(40:29) ٹھیک ہے آج بادشاہت بھی تمہاری ہے' حکومت تمہاری ہے' غلبہ تمہارا ہے' جبر واستبداد تمہارا ہے' یہ آج تو اتنا بڑا کچھ ہے لیکن اس غلط نظام کے نتائج جب سامنے آئیں گے' ان کی وجہ سے جو تباہی آئے گی' اس تباہی سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ یہی تمہاری حکومت یا مملکت یا غلبہ اور تسلط کے لائے ہوئے وہ عواقب ہونگے' اسی کی لائی ہوئی تو وہ تباہی ہوگی تو تمہیں یہ کیسے بچالے گی۔ اس لیے یہ جو تمہارے ذہن میں ایک زعم ہے کہ ہماری بڑی قوت اور بڑی طاقت ہے' یہ ہمیں بچالے گی' غلط ہے۔ کسی انسانوں کے ساتھ مقابلہ ہو تو وہ تو ہوسکتا ہے کہ قوت کا مقابلہ قوت سے کر لیا جائے لیکن قوت کے غلط استعمال سے جو تباہ کن نتائج آتے ہیں اس کا مقابلہ تو قوت سے نہیں کر سکو گے۔ سوچو' اس بات پہ کان دھرو جو یہ کہتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ تمہارے غلط نظام کا نتیجہ تمہاری تباہی ہوگا۔ اس سے بچنے کا جو کہہ رہا ہے یہی ایک طریقہ ہے کہ **اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ** (11:114) یہ جو غلط نظام ہے' اس کی جگہ صحیح نظام قائم کرو تو اس کے خوشگوار نتائج اس کا ازالہ کر سکیں گے۔ وہ یہ کہہ رہا ہے اور تم اس کو ذاتی طور پہ ایک چیز لے رہے ہو کہ یہ کیوں کہہ رہا ہے اس لیے اس کو قتل کر دو۔ اس کے قتل کر دینے سے تمہارا کیا بنے گا' تم تو نہیں جیت جاؤ گے' تم تو اس سے نہیں بچ سکو گے۔ یہ دوسری چیز جو اس مردِ مومن نے (کابینہ میں علی الاعلان) کہی۔

عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ بات تو دربارِ فرعون کے ایک مردِ مومن کی ہو رہی ہے۔ وہ تو قیامت تک کے لیے اصول بیان کر رہا

ہے۔اس لیے کہا کہ یاد رکھو! فَمَنۡ يَّنۡصُرُنَا مِنۡۢ بَاۡسِ اللّٰهِ اِنۡ جَآءَنَا❶ (40:29)۔میں نے کہا تھا کہ نظر آتا ہے کہ یہ جو اس مردِ مومن نے بات کہی تھی' حالانکہ فرعون کے بالکل علی الرغم خلاف جاتی تھی لیکن تھی ایسی مدلل اور براہان سے بھری ہوئی کہ نظر آ رہا ہے کہ فرعون نے یہ دیکھ لیا کہ اس کا کچھ اثر ہو رہا ہے۔اب اس نے اپنا پینترا بدلا' اس پر کچھ نرم ہوتا ہوا نظر آتا ہے کیونکہ اس نے کہا کہ قَالَ فِرۡعَوۡنُ مَاۤ اُرِيۡكُمۡ اِلَّا مَاۤ اَرٰى وَمَاۤ اَهۡدِيۡكُمۡ اِلَّا سَبِيۡلَ الرَّشَادِ (40:29) فرعون نے بات کاٹتے ہوئے ان سے کہا کہ دیکھو بھئی! میری جو رائے ہے' وہ میں تم سے بیان کر رہا ہوں' تم پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونس رہا۔نظر آتا ہے کہ اتنے میں ہی کچھ وہاں ہوا کا رخ بدل گیا تھا کہ اتنے بڑے فرعون جیسے مستبد نے بھی اپنے انداز میں لچک پیدا کرنے کی کوشش کی۔کہا کہ یہ میری رائے ہے اور میں اپنی دانست میں سمجھتا ہوں کہ یہی صحیح ہے جو میں کہہ رہا ہوں لیکن بہرحال یہ میری رائے ہے۔ایک جو مستبد جابر فرعون جیسا ہے' وہ اپنے حکم اور فیصلے کی بجائے رائے کہہ رہا ہے تو یہ نظر آ گیا کہ اگر یہ دلیل دی جائے اور اس انداز سے دی جائے جیسا ایک مردِ مومن نے کہا تھا تو وہ بات کتنی جلدی اثر کر جاتی ہے۔یہ اکیلا ہی نہیں تھا۔

اس مردِ مومن نے فرعون کے سامنے قومِ عاد اور ثمود کی تباہی کی وجہ جواز بھی پیش کی گئی

عزیزانِ من! قرآن مجید نے جو کہا ہے کہ ان میں ایسے لوگ تھے جو دل میں تو اس بات کے قائل تھے کہ یہ شخص (حضرتِ موسیٰؑ) بات ٹھیک کہتا ہے لیکن وہ جو رعونت تھی' انانیت تھی' جو قوت کا نشہ تھا' وہ اس بات کو زبان پر نہیں لانے دیتا تھا' اسے وہ اپنی ہیچ سمجھتے تھے۔

یہ لوگ وہاں موجود تھے۔اسی لیے فرعون کو فوراً یہ کہنا پڑا کہ میں دھاندلی سے یہ چیز نہیں کرنا چاہتا' یہ میری رائے ہے' میں اپنی دانست میں سمجھتا ہوں کہ یہی بہتر ہے۔اس مردِ مومن نے دھیان ہی نہیں دیا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔اس نے اپنی بات جاری رکھی کہ وَقَالَ الَّذِيۡۤ اٰمَنَ يٰقَوۡمِ اِنِّيۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ مِّثۡلَ يَوۡمِ الۡاَحۡزَابِ ۔ مِثۡلَ دَاۡبِ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ وَالَّذِيۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ (40:30-31)۔ قرآن کریم کا انداز یہ ہے اور یہی انداز اس مردِ مومن نے اختیار کیا کہ ایک دعویٰ کیا ہے اور اس کی دلیل یا شہادت میں تاریخ کی شہادتیں پیش کر رہا ہے۔نظر آتا ہے کہ یہ قومیں یا اس ملک کے یہ رہنے والے' ان قوموں کی تباہی سے' ان کے انجام سے' واقف تھے۔وہ کہہ رہا ہے کہ یہ جو عاد اور ثمود اور دوسری اسی قسم کی قومیں پہلے گزر چکی ہیں' ان کا انجام تمہیں معلوم ہے۔موازنہ کرو کہ اسی قسم کا نظام انہوں نے قائم کیا تھا جیسا نظام تم نے قائم کر رکھا ہے۔يُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَ يَسۡتَحۡيُوۡنَ نِسَآءَكُمۡ (2:49) معزز افراد کو' جن میں اسے جوہرِ مردانگی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اور جن سے اُسے خطرہ کا امکان نظر آتا تھا' ذلیل وخوار کر کے غیر مؤثر بنا تا رہتا تھا اور جو طبقہ ان جوہروں

---

❶ (یہ بتاؤ کہ) اگر ہم پر خدا کا عذاب آ گیا تو اس سے ہمیں کون بچا سکے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔1095)

سے عاری ہوتا انہیں اپنا معزز و مقرب بنا کر' آگے بڑھاتا رہتا تھا۔ یہی کچھ انہوں نے کیا تھا اور اس کے بعد جو کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا' وہ تمہیں معلوم ہے۔ میں تو تمہیں یہ کہہ رہا ہوں کہ جب ایسے ہی نظام کا نتیجہ وہ نکلا جو عاد و ثمود کے ہاں تھا اور اس سے تم انکار نہیں کر سکتے' شہادت تمہارے پاس موجود ہے' ان کی اجڑی ہوئی بستیاں تمہارے راستے میں پڑتی ہیں' تو تمہارے ساتھ یہ کیوں نہیں ہوگا۔

قرآنِ حکیم میں تاریخی نوشتوں کو پیش کرنے کا مقصد نظامِ خداوندی کی اہمیت کو اُجاگر کرنا تھا اور ہے: اس مردِ مومن کی توضیح

میں اس لیے تمہیں اس سے آگاہ کرتا ہوں کہ تاریخی نوشتوں کو پڑھ کر دیکھو۔ اور یہاں یہ بتایا ہے کہ یہاں قانون کی کارفرمائی ہے۔ اگر عاد و ثمود اس قسم کا نظام قائم کریں تو اس کا بھی وہ نتیجہ ہے اور اگر فرعون اور ہامان وہی نظام نافذ کریں تو اس کا بھی وہی نتیجہ ہے۔ کہا کہ اب وہی کچھ تمہارے ساتھ ہونے والا ہے۔ اب یہاں ایک بات پیدا ہو سکتی ہے کہ صاحب! قوم کی قوم کو تباہ کر دینا' بستیوں کی بستیوں کو اجاڑ دینا تو کوئی چنگیز یا ہلاکو ہی کیا کرتا ہے' جیسے مثال میں یہ بات ہے کہ کوئی ظالم' مستبد' کوئی اس قسم کی فوجیں' اس قسم کے حکمران' یہ کرتے ہیں اور یہ تو ظلم ہے۔ کہا کہ وَمَا اللّٰهُ يُرِيدُ ظُلۡمًا لِّلۡعِبَادِ (40:31) خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا تو اس سے بتا دیا کہ ایک چیز جو ایک مستبد حاکم کی طرف سے ہوتی ہے' وہ تو اس کی ذاتی ہوتی ہے' اور وہ جو اپنی قوت کے بل بوتے پہ دوسرے کے خلاف کرتا ہے' وہ ظلم ہے۔ اور یہ جو کسی کی غلط روش کے نتیجے میں فطری نتائج مرتب ہوتے ہیں' یہ ظلم نہیں ہے۔ اس لیے ایک تباہی تو تم قومِ بنی اسرائیل کے اوپر لا رہے ہو۔

عبادت کا حقیقی مفہوم ''پرستش'' نہیں ''محکومی'' ہے۔ خدا ظلم نہیں کرتا تم خود ظلم کرتے ہو اور خودکشی میں اور ظالم کے خنجر سے مرنے میں فرق ہے۔

عزیزانِ من! عباد کا یہ لفظ یہاں بڑا معنی خیز ہے۔ اس لیے کہ اس نے یہ کہا تھا کہ یہ میرے محکوم ہیں' میرے عباد ہیں۔ اسی لیے حضرتِ موسیٰؑ نے اس سے کہا تھا کہ احسان مجھ پہ جتاتے ہو' جو سب سے بڑا احسان ہے وہ کیوں نہیں جتاتے۔ اور وہ احسان یہ ہے کہ اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ (26:22) تُو نے بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنا رکھا ہے۔ ضمناً میں عرض کروں کہ یہ وہی لفظ ''عبد'' ہے جہاں سے ''عبادت'' ہے جس کے معنی ہم نے پرستش کر دیا تو بات کہیں سے کہیں چلی گئی۔ خدا کو معبود کہا' معبود کے معنی ہیں ''جس کی پرستش کی جائے'' ورنہ یہ عبد کا لفظ تو قرآن حکیم میں موجود ہے' یہ محکوم کے معنوں میں آتا ہے۔ کہتا ہے کہ خدا کے جو محکوم بندے ہوتے ہیں' وہ ان سے ظلم نہیں کرتا' تم ان سے ظلم کرتے ہو۔ یہ فرق ہے۔ اب یہ رہا کہ وہ نتیجہ تو وہی تباہی اور بربادی ہے جس کو تم ظلم کہتے ہو۔

کہا کہ ایک تباہی کسی کے اپنے کسی عمل کے نتیجے میں آتی ہے مثلاً جو خود سنکھیا کھالیتا ہے' ایک اس کی یہ موت ہے۔ اور ایک اس کی موت وہ ہے جو کسی ظالم کے خنجر سے مرتا ہے۔ موت تو دونوں کی ہے لیکن اس میں بڑا فرق ہے۔ اب یہ جو تمہارے ہاں تباہی آنے والی ہے' یہ دھاندلی سے' جور سے' ظلم سے' استبداد سے' خنجر گھونپنے والی بات نہیں ہے' یہ تم خود کشی کر رہے ہو' یہ اس سے تباہی آئے گی۔ خدا جو اپنے بندوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ ظلم نہیں کرتا جو ظلم ہوتا ہے' وہ ان کے اپنے اعمال کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ اور یہ جو مستبد حاکموں کی طرف سے اپنے محکوموں کے اوپر ہوتا ہے' یہ ظلم ہوتا ہے' انہوں نے ان کو اس طرح سے دبایا ہوا ہوتا ہے۔

انسانوں کے خود ساختہ نظاموں کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے: اس مردِ مومن کی پکار

عزیزانِ من! اب دونوں باتوں میں فرق کر دیا۔ کہا ہے کہ جو قومِ نوحؑ' عاد اور ثمود کی یا جو قومیں ان کے بعد آئی تھیں' ان کی تباہی اُن کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہوئی تھی اور **وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ** (40:31) اللہ اپنے بندوں میں سے کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کیا کرتا۔ اس مردِ مومن نے کہا کہ **يٰقَوْمِ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ** (40:32)۔ کیا بات ہے! کہتا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ تباہی جو آنے والی ہے' وہ ایسی ہوگی کہ اس وقت تم آوازیں دو گے' ایک دوسرے کو مدد کے لیے پکارو گے۔ **يَوْمَ التَّنَادِ** کیا لفظ ہے! اسے ''دہائی دینا'' کہتے ہیں' ایک دوسرے کو پکارنا' ایک دوسرے کو آوازیں دینا کہ مدد کے لیے آؤ۔ کہا ہے کہ یہاں اس قسم کی بھاگڑ مچے گی' ایسی صورت ہوگی کہ **يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ** (40:33) جیسے کوئی میدانِ جنگ میں شکست کھا کر' پیٹھ دکھا کر' بھاگتا ہے تم اس طرح سے بھاگو گے' اس آنے والی تباہی کے ہاتھوں دہائی دو گے' ایک دوسرے کو آوازیں دے دے کر پکارو گے' کوئی تمہاری پکار کا جواب نہیں دے گا۔ تم پناہ کے لیے لوگوں کو پکارو گے لیکن **مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ** (40:33) کوئی پناہ نہیں دے سکے گا۔ سوچو ذرا! اس وقت کے متعلق سوچو کہ کیا کرو گے۔ یہ شخص تمہیں اس تباہی سے بچانے کے لیے کہہ رہا ہے۔ اور میں بھی اسی کا اعادہ کر رہا ہوں جو کچھ یہ کہہ رہا ہے کہ خدا کے قانون کی رو سے جو تباہی آنے والی ہے' اس سے تمہیں کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔

ہمارے ہاں قرآنی تراجم کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا ایک Touch اور قرآنِ حکیم کا اصل ارشاد

آگے کہا ہے کہ **وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ** (40:33)۔ یہ وہی ہے جس کا یوں عام ترجمہ کرنے سے' میں نے کہا ہے کہ کتنی گمراہیاں ہمارے ہاں پھیلتی ہیں' کہ ''جس کو خدا گمراہ کر دے اس کو کوئی سیدھے راستے پہ لا نہیں سکتا''۔ یہ جو کچھ اس نے کہا' جتنی دلیلیں دیں' وہ سارے کا سارا' اِس ایک ترجمے سے غتر بود ہو گیا۔ اب اس ترجمے کی رُو سے وہ تو کہیں گے کہ ہمارا جرم پھر کیا ہے۔ تم خود تو کہہ رہے ہو کہ خدا جسے گمراہ کر دے اس کو کوئی سیدھے راستے پہ لا ہی نہیں سکتا تو ہمیں خدا نے گمراہ کیا ہوا ہے' تو پھر تباہی کا ہے کی لا

رہے ہو۔خود ہی وہ گمراہ کرتا ہے' خود ہی تباہ کرتا ہے اور ابھی تم کہتے ہو کہ وہ ظلم نہیں کرتا' یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔غور فرمایئے۔یہی نہیں کہ اِن دونوں باتوں میں ربط نہیں بلکہ وہ ساری تعلیم جو چلی آ رہی ہے اور جو کہی جا رہی ہے' اس ساری کی ساری تعلیم کو منسوخ کر دیتا ہے' اس کا الٹ کر دیتا ہے' بات ہی نہیں بنتی' آگے وہ چل نہیں سکتا۔وہ جواب میں یہ کہیں گے لیکن پہلے تو یہی چیز جو پیچھے سے کہہ رہا ہے اور دو ہی آیتیں آگے دیکھیں۔میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن مجید تو کہیں اِدھر اُدھر جانے نہیں دیتا۔دور جانے کی ضرورت نہیں ہے' دو ہی آیتوں کے بعد اس نے کہا ہے کہ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ هُوَ مُسۡرِفٌ مُّرۡتَابُ (40:34) جو ظلم کرتے ہیں' جو سرکشیاں کرتے ہیں' جو حدود فراموشیاں کرتے ہیں' جو اس کے قوانین کے خلاف چلتے ہیں' وہ ہیں جو غلط راستے پہ چلتے ہیں۔اسے کہا جاتا ہے جو خدا گمراہ کرتا ہے' خدا نہیں گمراہ کرتا' قانون شکنی کا نتیجہ یہ ہے کہ صحیح راستے پر پھر وہ قوم چل نہیں سکتی۔گمراہ وہ ہوتا ہے جو هُوَ مُسۡرِفٌ مُّرۡتَابُ ن (40:34) اس کے قانون یا اس قانون کے نتائج کی صداقت میں شک کرنے والا اور حدود شکنی کرنے والا ہوتا ہے۔یہ ہے وہ قوم کہ جو صحیح راستے کو چھوڑ کر غلط راستے پہ چلتی ہے۔اور جو اس طرح سے غلط راستے پہ چلے' اسے کوئی صحیح راستے پہ لا نہیں سکتا کیونکہ وہ تو خود غلط راستے پہ چلی ہے۔خود ہی آنا چاہے' تو صحیح راستے پہ آئے' دوسرا کون لائے گا۔یہ ہے وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ (40:33) جو لوگ خدا کا بتایا ہوا صحیح راستہ چھوڑ دیتے ہیں' انہیں کوئی کامیابی کی راہ نہیں دکھا سکتا۔

مصر میں لفظ فرعون کا مختصر سا تعارف و وضاحت اور تاریخ کے کچھ قیاسات کا ایک ورق

اب اس کے بعد پھر یہی جو مصر کی قوم تھی (یہ مصر کی تاریخ بڑی عجیب ہے)' اس میں مختلف خاندان مختلف اوقات میں آئے اور حکومت کی ہے' ایک ایک خاندان نے صدیوں تک حکومت کی ہے۔یہ جسے ہم فرعون کہہ رہے ہیں' یہ فرعون اس بادشاہ کا نام نہیں ہے جو حضرتِ موسیٰؑ کے وقت میں ہوا تھا۔فرعون وہاں کے بادشاہوں کا لقب تھا۔یہ سورج کے پرستار ہی نہیں بلکہ اس کے اوتار مانے جاتے تھے' سورج دیوتا کو ''رع'' کہتے تھے۔پرانے زمانے میں' یہ بادشاہ یا یہ جتنے راجہ تھے' وہ ایشور کے اوتار یا دیوتاؤں کے اوتار ہوتے تھے جیسے آپ کے ہاں جو سلطان تھے وہ ظل اللہ ہوتے تھے' زمین کے اوپر خدا کا سایہ ہوتے تھے۔ہاں تو یہ فرعون ان بادشاہوں کا لقب تھا' ان کے نام اور تھے۔اور یہی خاندان کئی صدیوں سے وہاں حکومت کر رہے تھے جس میں سے ہر بادشاہ اپنا جو لقب تھا' وہ فرعون رکھتا تھا۔ تاریخ کا قیاس اس طرف جاتا ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ کے دور میں دو بادشاہ گزرے تھے۔ابتدائی زمانہ جو بچپن کا تھا' جس میں وہ اپنے محل میں لے گیا تھا' وہ اور فرعون تھا' وہ مر گیا تھا اور اس کے بعد یہ اس کا بیٹا تھا جس کے ساتھ یہ ہوا ہے لیکن قرآن مجید ان کو فرعون ہی کہتا ہے۔یہ دیر سے چلے آ رہے تھے۔مصر میں حضرتِ ابراہیمؑ بابل سے ہجرت کر کے فلسطین میں آئے۔ان کے بعد ان کے بیٹے حضرتِ

یعقوبؑ وہیں تھے۔حضرتِ یعقوبؑ کے بیٹے حضرتِ یوسفؑ تھے۔وہ داستان آپ کو معلوم ہے کہ وہ کس طرح وہاں سے Kidnap (اغواہ) کیے گئے' جسے کہا جائے گا کہ ورغلائے گئے۔وہاں سے وہ مصر میں ایک غلام بنا کر لے آئے گئے۔اس زمانے میں اس طرح سے انسانوں کو پکڑ کر لے جاتے تھے۔

اب ہمارے ہاں اس دورِتہذیب کے اندر بھی تو روز یہ قصہ سننے میں آتا ہے کہ بچوں کو ورغلا کر' پکڑ کر' لے جاتے ہیں اور اس کے بعد پھر ان کی قیمت مانگتے ہیں' روپے مانگتے ہیں۔اس زمانے میں وہاں کی بات ہم کرتے ہیں تو وہ دورِ وحشت اور بربریت کا تھا۔دیکھیے کس طرح سے لوگوں کو غلام بنا لیتے تھے۔اب جو ہمارا دورِتہذیب ہے' اس میں قوموں کی قوموں کو غلام بنایا جاتا ہے' وہاں تو پھر بھی افراد کو بناتے تھے۔اور افراد کو تو جس تعداد میں آج کل بنایا جاتا ہے' اس زمانے میں تو اتنی تعداد میں ہمیں نظر ہی نہیں آتا۔بہرحال حضرت یوسف علیہ السلام کو وہ مصر لے گئے تھے اور وہاں جا کر انہیں کو غلام کی حیثیت سے نیلام کیا یا بیچا تھا۔وہ بھی فرعون ہی تھا جو وزیر تھا یا دربار کا منصب دار تھا عزیز' اس کو کچھ اختیارات حاصل تھے' وہ مملکت کے ارکان میں سے تھا جس کے گھر یہ رہے تھے۔تو وہیں پھر مصر میں ہی یہ نبوت سے سرفراز ہوئے اور مصر میں ہی رہے۔اس طرح سے مصر میں حضرتِ یعقوبؑ کے بیٹے حضرت یوسفؑ جو بنی اسرائیل میں تھے' یوں مصر میں پہنچے تھے۔انہی کی وجہ سے پھر یہ قومِ بنی اسرائیل مصر میں بھی تھی۔

فرعون کے دربار میں حضرت یوسفؑ کا ذکرِ خیر اور مردِ مومن کی للکار

یہ جو زمانہ حضرت موسیٰؑ کا آ رہا ہے یہ ان حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے بعد کا دور ہے۔قومِ بنی اسرائیل وہی تھی جو اس زمانے میں یہاں آئی تھی ورنہ پہلے مصر میں بنی اسرائیل نہیں تھے۔یہ تو وہی تھے جو وہاں فلسطین کے علاقوں میں تھے۔حضرتِ یوسفؑ اسی مصر میں آئے' اسی قوم میں آئے جس کے تسلسل میں اب یہ فرعون ہے۔وہ بھی فرعون تھا۔وہی قوم ہے جو تسلسل میں یہاں تک آئی ہے۔یہاں اس مردِ مومن نے یاد دلایا کہ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ (40:34)۔نظر آتا ہے کہ اس قوم کی طرف اس دوران میں شاید کوئی اور اتنا بڑا پیغمبر نہیں آیا' یا درمیان میں شاید کوئی دوسرا آیا نہیں' تو اس مردِ مومن نے کہا کہ ''ایک پیغمبر یوسفؑ بھی تمہاری طرف خدا کے واضح قوانین لے کر آئے تھے' تمہاری طرف اسی قوم کی طرف لے کر آئے تھے''۔کسی قوم کے متعلق جب بات کی جائے تو وہ خواہ سو سال پہلے کی بھی کیوں نہ ہو' اسی قوم سے کہا کرتے تھے۔جیسے ہم کہا کرتے ہیں کہ ہم مسلمانوں میں تو صاحب یہ ملوکیت اتنے عرصے سے چلی آ رہی ہے تو ہم مسلمانوں سے مراد یہ نہیں جو ہمارے مخاطب ہیں بلکہ یہ قوم جو Continously (تسلسل سے) چلی آ رہی ہے۔اس مردِ مومن نے کہا کہ تمہاری طرف وہ بھی تو آئے تھے۔انہوںؑ نے آکر یہی کچھ کہا تھا جو کچھ یہ کہہ رہا ہے۔یہ تو

یہیں کا واقعہ ہے۔ گویا اس نے قومِ عاد اور ثمود وغیرہ کا ذکر کیا' وہ دوسرے علاقوں کے تھے' اگرچہ ان کے قرب وجوار میں ہی تھے۔ اب اس کے بعد اس نے خود اسی قوم کی ہی مثال دی کہ خود تمہارے ہاں بھی تو یہ ہو چکا ہے۔ حضرت یوسفؑ آئے تھے۔ انہوںؑ نے آ کر یہی کچھ کہا تھا جو کچھ یہ کہہ رہا ہے۔ اور تمہاری کیفیت یہی تھی کہ فَمَا زِلْتُمْ فِیْ شَکٍّ مِّمَّا جَآءَکُمْ بِہٖ (40:34) تم نے اس پہ بھی یقین نہیں کیا تھا جو کچھ وہ کہہ رہا تھا۔ اور تمہیں پھر معلوم ہے کہ اس کا انجام کیا ہوا تھا۔ یہ تو تمہاری آپ بیتی ہے جو میں تمہیں یاد دلا رہا ہوں لیکن اس کے بعد تم نے اپنے آپ کو کس طرح اطمینان دلا لیا تھا سنو! حَتّٰۤی اِذَا هَلَکَ قُلْتُمْ لَنْ یَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا (40:34) یوسفؑ جب فوت ہو گئے تو تم نے اطمینان کا سانس لیا کہ اچھا ہوا پیچھا چھوٹا' اب ہمیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں آئے گا۔ یعنی تم اس پہ خوش ہو گئے کہ روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں آئے گا حالانکہ یہ روکنے ٹوکنے والا ہی اگر آتا رہے تو اس کی وجہ سے قوم پھر بھی بچ جاتی ہے تو تم خوش ہو گئے کہ کوئی بات نہیں وہ تو گیا' اب اس کے بعد کوئی ایسا تو نہیں آئے گا جو ہماری اس روش سے روکے گا' ٹوکے گا' تباہیوں کی تنبیہات کرے گا۔

روکنے پر ضد بازی کا نتیجہ ہمیشہ حقیقت کو تسلیم نہ کرنے کی شکل میں نکلتا ہے اسی لیے روکنے ٹوکنے والا باعثِ رحمت ہے: یہ ہے انسانی نفسیات کا ایک پہلو

عزیزانِ من! پھر قوموں کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ روکنے ٹوکنے والے کے شکرگزار ہوں کہ یہ ہمیں ہلاکت سے تنبیہ کرتا ہے' وارننگ دیتا ہے' وہ اس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ یہ ہمارے گھروں کے جو سرکش بچے ہوتے ہیں' گھر میں سے' بڑے بوڑھوں میں سے' جو بھی ان کو روکے ٹوکے' یہ سب سے پہلے اس کے خلاف ہوتے ہیں۔ وہ باقی جوان سے کچھ نہ کہیں ان کو ان کی غلط روش میں بڑھتے رہنے دینے کی اجازت دیتے ہیں کہ بڑھتے چلے جائیں۔ وہ بھی ان کے دشمن ہوتے ہیں' یہ سرکش بچے ان کے خلاف نہیں ہوتے۔ وہ جوان کو روکتا ہے ''او! پرے ہٹ جا' بنیرے تے نہ آئیں' ڈگ پئیں گا تھلے۔ اے اوہدا دشمن ہوندا ہیگا'' (اے پیچھے رہنا' مکان کی مُنڈیر پہ نہ آنا' گر جاؤ گے۔ یہ (سرکش بچہ) اس کا دشمن بن جائے گا) کہ دیکھیے جی! وہ ہر بات میں ہمیں روک دیتا ہے' ٹوک دیتا ہے۔ یہ روکنے ٹوکنے والے اگر یہاں ہوں تو یہ تو خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ اپنے Interest میں' اپنے مفاد میں' روکنے ٹوکنے والا تو مستبد ہوتا ہے۔ یہ خیرخواہ ہے جو اس کے مفاد میں اس کو روکتا ٹوکتا ہے' اسے زہر نہیں کھانے دیتا' اسے خودکشی نہیں کرنے دیتا۔ ایسے کا جو ہونا ہے' یہ تو خدا کی رحمت ہے لیکن اُسی کے لیے ہے جو اپنا غلط راستہ چھوڑ کر سیدھے راستے پر آنا چاہے۔ اور جو اسی غلط روش میں ہی لذت محسوس کرے' اس کا سب سے بڑا دشمن یہ روکنے ٹوکنے والا ہوتا ہے۔ یہ ہے انسانی نفسیات کا ایک پہلو۔

قرآنِ حکیم کی مخالفت قرآنِ حکیم کو ماننے والوں کی طرف سے کیوں ہوتی ہے؟

یہ ہمارے ہاں جو قرآن حکیم کا نام نہیں سننا چاہتے' ان کو چھوڑ دیجیے۔ یہ جو ہمارے ملحد ہیں' انہیں بے دین کہہ لیجیے' خدا کے منکر یا جو اس قسم کے لوگ ہیں' وہ کہیں کہیں ہیں' ان کو بھی چھوڑ دیجیے۔ یہ جو آپ کے ہاں مذہب پرست طبقہ ہے' قرآنِ کریم کی سب سے زیادہ مخالفت ان کی طرف سے ہوتی ہے ان کی یہ مخالفت اس شخص سے ہوتی ہے جو قرآن حکیم کی دعوت دیتا ہے۔ کیا کبھی سوچا ہے کہ یہ کیوں ہے؟ یہ جو قرآن حکیم ہے' یہ ان چیزوں سے روکتا ٹوکتا ہے جو انہوں نے غلط اختیار کر رکھی ہیں اور وہ خود بھی اس کو صحیح سمجھتے ہیں' لوگوں کو بھی غلطی کے اوپر لے جاتے ہیں اور اس میں ان کا پروفیشن ہوتا ہے' ان کا ذریعہ معاش ہوتا ہے' یہ قرآن حکیم اس سے روکتا ہے۔ قرآن حکیم نے جو کہا ہے کہ یہ جو احبار و رہبان ہیں' یہ جو علماء اور مشائخ ہیں' یہ صحیح راستے کی طرف آنے سے لوگوں کو روکتے ہیں' یہ قرآن حکیم کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ کیوں ایسا کرتے ہیں؟ اس نے وہیں بتا دیا کہ **وَ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ** (9:34) اس لیے کہ یہ ان کا پروفیشن ہے ''باطل سے لوگوں کا مال کھاتے ہیں''۔ قرآن حکیم یہ کرنے نہیں دیتا مگر ان لوگوں نے اپنے خود ساختہ قوانین بنا کر ان کو شریعت کہہ رکھا ہے' ان کو اسلامی کہہ رکھا ہے' ایک چیز کا نام بدل دیتے ہیں اور بات وہیں کی وہیں رہتی ہے۔ سنیے! سود کو انہوں نے حرام کہا۔ قرآن حکیم نے ان کو ٹوکا کہ یہ جو ربوٰ ہے یہ تو خدا کے خلاف بغاوت ہے۔ انہوں نے کہا کہ ربوٰ کا نام نہ لو یہ بغاوت کہتے ہیں' اس کو Profit (نفع) میں Share (حصہ) کہو۔ قرآن حکیم تو یہاں نہیں آنے دیتا' وہ تو کھلی سی Definition (تعریف) کرتا ہے کہ خالی سرمایہ پر جو زیادتی ہے' جو بڑھوتی ہے' وہ ربوٰ ہے' اس کی شکل کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ یہ قرآن حکیم کی طرف لانے والے کے خلاف کیوں نہ ہونگے! وہ تو اس پہ چلنے ہی نہیں دیتا۔ مزارعت یہ ہے کہ زمین دوسرے کو دیتے ہیں' وہ سارا سال اس پہ محنت کرتا ہے' اس کے بعد جب اس میں کچھ پیدا ہوتا ہے تو یہ چوہدری صاحب ہیں جو گھر میں بیٹھے ہوئے آدھی فصل ان کے گھر میں آ جاتی ہے۔ ارے یہ کیا ہے؟ یہ ربوٰ نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ نہیں یہ مزارعت ہے' ربوٰ نہیں ہے۔ یہ دیو داس نہیں' عبدالرحمٰن ہے۔ بس نام ہی دوسرا رکھ لیا۔ یہ ہے وہ چیز۔ یہ روکنے والے ٹوکنے کے خلاف اس لیے ہوتے ہیں۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ (انبیائے کرامؑ) آئے اور انہوں نے تمہیں ان چیزوں سے روکا ٹوکا۔ وہ جب وفات پا گئے تو تم نے خدا کا شکر کیا کہ چلو جی! بلا گلے سے اتری' روکنے والا تو باقی نہ رہا۔ اور اس کے بعد کہا کہ شاید اب پھر کوئی اور نہیں آئے گا لیکن اب وہ ایک اور آ گیا ہے اس لیے تم اس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ وہ تو جو بھی روکے ٹوکے گا' اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ تم نے کہا کہ خیر! اب تو ہماری جان چھوٹی' اب تو کوئی اور نہیں آئے گا۔ وہ یوسفؑ تو پھر بھی دوسری جگہ سے آئے تھے' یہ حضرت موسیٰؑ اسی قوم کے اندر سے اٹھ کر کھڑے

ہو گئے ۔ لَنۡ یَّبۡعَثَ اللّٰہُ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ رَسُوۡلًا (40:34) یہاں آیا ہے کہ ''اس کے بعد اللہ کسی رسول کو تمہاری طرف نہیں بھیجے گا تو تم خوش ہو گئے کہ چلو! یہ قصہ ختم ہوا' کوئی ہمیں روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوگا۔'' کہا کہ کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰہُ مَنۡ ہُوَ مُسۡرِفٌ مُّرۡتَابُۨ (40:34) اسی طرح جو لوگ حدود شکنی کرتے ہیں اور قوانینِ خداوندی کے بارے میں یوں شکوک و شبہات میں پڑے رہتے ہیں' وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق' غلط راہوں پر چلتے ہیں۔ اب یہ آئے وہ صحیح معنی۔

قرآنِ حکیم کے پیش کردہ پیمانوں (قوانین) کا استعمال' ان کی حدود شکنی' مردِ مومن کی تقریر کا تسلسل اور جھگڑے کی بنیاد

اس طرح سے جو کوئی شخص یا کوئی قوم' اپنی روش اختیار کر لیتی ہے وہ ہے جو غلط راستے پر پڑتی ہے۔ اور چونکہ خدا کے قانون کے خلاف پڑتی ہے اس لیے اس کو خدا کی طرف منسوب کر دیتی ہیں (مثلاً) سنکھیا کھانے والے کو خدا ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ ذرا گہرائی میں جائیے' درس میں تو اس کے لیے موقع نہیں ہوتا۔ یہ چیز کہ سنکھیا ہلاکت آفریں ہے' سنکھیے کے اندر یہ جو خصوصیت ہے' یہ تو خدا کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اس نے سنکھیا پیدا کیا ہے' یہ بتایا ہے کہ یاد رکھو! اس کا جو ایک قطرہ ہے وہ توانائی بخشتا ہے' زندگی بخشتا ہے' کئی بیماریوں کا علاج ہے' یہ خیر ہے لیکن جب تم اُسے پھانکتے ہو تو اس سے ہلاکت ہوتی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ہم نے چیزوں کو پیدا کیا' فَقَدَرۡنَا (77:23) اس کے پیمانے بھی ہم نے مقرر کر دیئے۔ یہ جو پیمانہ ہے' یہ اصل شے ہے۔ کوئی چیز شر نہیں ہے۔ اس نے ہر چیز جو پیدا کی ہے' وہ تو بِیَدِکَ الۡخَیۡرُ (3:26) ہے۔ خدا کے ہاتھ میں تو خیر ہی خیر ہے' شر تو نہیں ہے۔

اس نے جو پیدا کیا ہے اس کے ساتھ ہی اس نے کہا ہے کہ ہم نے اس کے پیمانے بھی مقرر کر دیئے کہ اس چیز کا یہاں تک استعمال یا اس طرح سے اس کا استعمال' خیر کا نتیجہ پیدا کرے گا۔ اسے چھوڑ کر اگر تم اُسے اپنے طور پر استعمال کرو گے تو پھر یہ شر ہو جائے گا۔ اب اگر یہ چیز اس انداز سے کہی جائے کہ سنکھیا کھانے والے کو خدا ہلاک کر دیتا ہے تو یہ بھی ٹھیک ہے لیکن یہ تو اس کے اپنے اختیار میں تھا کہ وہ اُسے کھائے یا نہ کھائے۔ یہ تو جب ہو کہ ''خدا آ کے ڈھاہ کے اوہدے منہ اچ سنکھیا پائے' تے ایس طراں نال مار دے'' (خدا آ کر زبردستی اس کے منہ میں سنکھیا ڈال دے تو اس طرح اسے مار دے) پھر تو کہو کہ خدا نے مار دیا۔ اور اگر وہ سنکھیا اپنی مرضی سے کھاتا ہے اور وہ کہنے والا اسے کہتا ہے کہ اس طرح کھانے سے تم ہلاک ہو جاؤ گے اور پھر وہ ہلاک ہو جاتا ہے تو یہ ٹھیک ہے اس کی ہلاکت سنکھیا میں رکھے گئے متعین قانون کی خلاف ورزی سے ہوئی ہے۔ اگر وہ سنکھیا کھانے کی محفوظ (Safe) حد نہ توڑتا تو اس کی ہلاکت نہ ہوتی۔ اس نے اس حد کو توڑا تو اس کا یہ نتیجہ نکلا۔ یہ ہے کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰہُ مَنۡ ہُوَ مُسۡرِفٌ مُّرۡتَابُۨ (40:34) یاد رکھو! جو لوگ حدود شکنی کرتے

ہیں اور قوانینِ خداوندی کے بارے میں یوں شکوک وشبہات میں پڑے رہتے ہیں' وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق' غلط راہوں پر چلتے ہیں۔اسے یوں کہو کہ جو خدا کی وارننگ میں شک کرتا ہے کہ سنکھیا ماردے گا اُسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔یہاں آپ مُسْرِفٌ کا لفظ دیکھیے کہ وہ جو اس سنکھیے کی حد مقرر ہے اس سے آگے بڑھ جاتا ہے تو ہلاک ہوجاتا ہے۔یہ ہے وہ چیز جسے آپ کے ہاں کہا جاتا ہے کہ ''جسے خدا گمراہ کردے' اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا''۔انہوں نے بس اتنی سی بات کی ہے اور زندگی کی گاڑی کہیں اور جا پڑی۔

میں نے کہا ہے کہ یہ بات کرنے سے تو وہ ساری تعلیم اور اس کی ساری عمارت' جتنی بھی ہے' منہدم ہوجاتی ہے۔عزیزانِ من! اسے چھوڑیئے' یہ جو مردِ مومن وہاں کھڑا تقریر کررہا ہے اس کی تقریر بے معنی ہوجاتی ہے۔اس مفہوم کے تحت تو وہ کہیں گے کہ ہمیں کیا کہتے ہو تم تو خود کہہ رہے ہو کہ خدا گمراہ کرتا ہے۔سنیئے! وہیں خدا نے یہ کہا ہے کہ کَذٰلِکَ (40:34)۔وہ کس کو ہلاک کرتا ہے؟ کہا کہ مُّرْتَابٌ (40:34) کو ہلاک کرتا ہے۔پہلی بات تو یہ ہے کہ جو خدا کے اس قانون میں شک کرتا ہے وہ اس محفوظ حد Safe) (Limit سے زیادہ سنکھیا کھانے سے ہلاک ہوجاتا ہے' پہلے تو وہ ہے اور پھر مُسْرِفٌ (40:34) سچ مچ اس مقدار سے زیادہ کھاجاتا ہے۔شر تو انسان اپنے ہاتھوں سے پیدا کرتا ہے۔البتہ یہ چیز ہے کہ خدا نے ان چیزوں کے اندر یہ تاثیر رکھی ہے کہ اگر ان کو اس کے پیمانوں سے آپ زیادہ کریں' حدود فراموشی کرجائیں' تو پھر بہرحال اس کا نتیجہ ہلاکت نکلتا ہے۔یہ ہے اس کے معنی۔

جہاں جہاں قرآن حمید میں یہ آیا کہ خدا اسے اپنی طرف نسبت کرتا ہے' خدا یہ کرتا ہے تو یاد رکھیے! خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا' گمراہ تو شیطان کرتا ہے۔خدا نے تو حدود مقرر کردی ہیں' ان سے تجاوز کرنے سے وہ چیزیں ہلاکت آفریں بنتی ہیں۔اب اگر ''خدا گمراہ کرتا ہے'' کہیں تو میں نے کہا ہے کہ قرآن حمید کی ساری تعلیم ہی ختم ہوجاتی ہے۔وہ تو ہدایت دینے والا ہے۔مُّرْتَابٌ اور مُسْرِفٌ دو لفظوں نے یہ ساری بات واضح کردی کہ وہ جو کہتا ہے کہ یہ چیز ہلاکت آفریں ہے' اس میں شک کرنا کہ نہیں یقینی بات نہیں' اور پھر عملاً جو وہ کہہ رہا ہے کہ پانچ قطرے تک لینے ہیں' اس سے زیادہ نہیں' آگے بڑھو گے تو ہلاکت ہوجائے گی۔یہ اور آگے بڑھنا تو خود انسان کرتا ہے۔البتہ اس نے اس کے اندر یہ تاثیر' یہ خصوصیت ضرور رکھی ہوئی ہے (مثلاً) آگ کے اندر یہ تاثیر رکھی ہے کہ چولہے کے اوپر دیگچی رکھو گے تو نہایت فرسٹ کلاس چائے بنے گی' اس میں انگلی ڈال دو گے تو جل جائے گی۔جہاں جہاں قرآن کریم میں اس قسم کے الزامات آئیں یہ چیزیں ذہن میں رکھیے۔یہاں اَلَّذِیْنَ (40:35) کہا ہے کہ کون ہیں یہ لوگ؟ آگے ان کی مزید تشریح بھی کی گئی ہے۔کہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ (40:35) یہ لوگ ہیں کہ جب بھی ان کو قوانینِ خداوندی بتائے جائیں کہ اتنا سنکھیا کھانے سے ہلاکت ہوجاتی ہے تو پہلے تو وہ اس قانون کی صداقت پہ شبہ کرتے ہیں' جب بات آگے بڑھتی ہے تو پھر جھگڑتے ہیں کہ نہیں نہیں! ہم نے دیکھا ہوا ہے' یہ غلط ہے۔

رعونت اور مفاد پرستی انسانوں کو اپنا محتاج بنانے کا نظام ہے اور بات ہے آنکھوں پہ پردے اور کانوں میں ڈاٹ کی

جب کہو کہ بابا! یہ جو تمہارے ہاں کا استبداد اور رعونت کا غلط نظام ہے' یہ انسانوں کو محتاج بنانے کا نظام ہے۔ اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ وہ اس بات کی مخالفت کرتے ہیں پھر اس سے جھگڑتے ہیں۔ اب آپ نے دیکھا کہ کون لوگ ہیں جو غلط راستے پہ پڑتے ہیں۔ یہ قرآن حمید کتنی تشریح کرتا چلا جاتا ہے۔ جھگڑتے ہیں اس سے اور پھر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی' یہ مجادلہ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ (40:35) ہے' یہ دھاندلی سے جھگڑتے ہیں کیونکہ قوت ان کے پاس ہے اس واسطے کسی دوسرے کو سامنے بولنے ہی نہیں دیتے۔ ان کی کیفیت یہ ہے۔ آگے کہا کہ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (40:35) یہ جو ان کی روش ہے' یہ خدا کے نزدیک بھی اور ان کے نزدیک بھی جو خدا کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں' کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاسکتی۔ کہ ''وہ ان کی بھلائی کی بات کہہ رہا ہے کہ اس سے آگے نہ جانا' اس سے ذرا آگے جاؤ گے تو پانی اتنا گہرا ہے کہ ڈوب جاؤ گے''۔ پہلے تو وہ شبہ کرتا ہے' پھر اس سے جھگڑتا ہے' دلیل کوئی نہیں ہے' کہتا ہے کہ ایسا ہی کرونگا' حدود فراموشی کرتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ چیز کس طرح پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ وجہ ہے جو روکنے ٹوکنے والا ان کو روکتا ٹوکتا ہے۔

آگے پھر وہی بات آئی کہ كَذٰلِكَ (40:35) اس طرح سے يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (40:35)۔ آہاہاہا! کہ یہ جو چیز ہے کہ دلوں پہ مہر لگ جاتی ہے' آنکھوں پہ پردے پڑ جاتے ہیں' کانوں میں ڈاٹ لگ جاتے ہیں۔ کوئی خیر کی بات نہ یہ سنتے ہیں' نہ دیکھتے ہیں' نہ سوچتے سمجھتے ہیں حالانکہ علامات سامنے نظر آجاتی ہیں۔ اب یہ جو چیز كَذٰلِكَ ہے' یہ ہے اصل لفظ' جو بتاتا ہے کہ ''اس طرح سے یہ ہوتا ہے''۔ جب وہ خود بتا رہا ہے کہ ''اس طرح سے ہوتا ہے'' تو پھر یہ تو ہے نہیں کہ خدا ظلم کر کے ایسا کر دیتا ہے کہ دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے' آنکھوں پہ پردے ڈال دیتا ہے' کانوں میں ڈاٹ لگا دیتا ہے' نہ سن سکتے ہیں' نہ دیکھتے ہیں' نہ سمجھ سکتے ہیں اور پھر اسے تباہ کر دیتا ہے۔ یہ اس آیت (40:35) کا مفہوم نہیں ہے۔

زُعم اور تکبر کی نفسیاتی کیفیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ''انسان کسی دوسرے کی بات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا'': حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کی مثال

یہ جو كَذٰلِكَ کی بات ہے' یہ ہے اہم کہ ''یوں ہوتا ہے''۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہوتا ہے؟ کیا بات کہی ہے! کہا کہ یہ تکبر اور جبار سے ایسا ہوتا ہے۔ ایک تو رعونت میں خود اپنی نفسیاتی کیفیت ایسی ہوتی ہے۔ یہاں قرآن حمید تکبر کا لفظ لایا ہے' جس میں

آدمی اپنے سے بڑا کسی کو سمجھتا ہی نہیں۔ پہلے تو نفسیاتی طور پہ اپنے اوپر یہ کیفیت طاری کر لیتا ہے کہ جو بھی اس سے کوئی بات کہے' وہ اس کو ذلیل سمجھتا ہے' اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھتا ہے۔ یہ جو تکبر کی نفسیاتی کیفیت ہے یہ اس کے محسوس اعمال یا افعال ہیں جو دوسروں پر زیادتی ہوتی ہے۔ اپنی ذات پہ جو اس کا نفسیاتی طور پہ اثر ہوتا ہے' وہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھتا ہے کہ کسی کی بات پر دھیان ہی نہیں دیتا۔ وہ ہر شخص کو اپنے سے نیچے اور ذلیل سمجھتا ہے' اپنے آپ کو ہمہ دان سمجھتا ہے' بات ہی کسی کی سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

عزیزانِ من! اب یہ دو بھائی حضرتِ موسیٰؑ اور حضرتِ ہارونؑ آئے ہیں۔ آ کر فرعون سے نہایت معقول بات کی ہے۔ پیغمبر یا خدا کا پیغام پہنچانے والا تو دلیل کے بغیر بات ہی نہیں کرتا۔ آ کر یہ بات کہتے ہیں۔ وہ درباری کہتے ہیں کہ کچھ اس کی بات سنیے۔ وہ کہتا ہے ان کی بات سنوں! یہ تو قَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ (23:47) او! یہ تو اس قوم کے افراد ہیں جو ہماری محکوم ہے تو جو ہماری محکوم ہے ان کی بات ہم سننے لگ جائیں؟ یہ کیا بات کریں گے۔ ٹھیک ہے عقلِ کل تو قوت والے کے پاس ہوتی ہے ''جیہدی کوٹھی اچ دانے اوہدے کملے وی سیانے'' (جس کی کوٹھی ''اناج'' سے بھری ہو' اس کے بیوقوف بھی دانش مند ہوتے ہیں)۔ یعنی یہ متکبر جس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں' میں سمجھتا ہوں پاگل بھی ان پہ ہنس دیتا ہے لیکن وہ اس کے بعد اس سے بھی متنبہ نہیں ہوتے' اپنے آپ کو اس سے بڑا سمجھتے ہیں۔ یہ جو انسان کے ذہن کے اندر بڑا ہونے کا زعم ہے' یہ ایسی نفسیاتی کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ پھر نہ بات اس کی سمجھ میں آتی ہے' نہ وہ سننا چاہتا ہے' نہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھتا ہے۔ یہ ہے وجہ اس کی جو قرآنِ کریم نے اس سے روکا ہے کہ اپنے لیے یہ ذہنیت نہ پیدا کرو۔

اِدھر علم کے لیے نبی اکرم ﷺ جیسی عظیم ہستی کی رب العزت کے ہاں دعا اور اُدھر تکبر و رعونت کی ذہنیت کا خلفشار

آخری لمحہ تک حضورِ نبی اکرم ﷺ علمِ انسانی کے انتہا پر پہنچے ہوئے ہیں' وہ بھی یہ دعا مانگتے ہیں کہ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا (20:114) اے میرے رب! میرا علم زیادہ کرتا چلا جا۔ ایک بشر علم کی انتہا پہ پہنچے ہوئے بھی مزید علم چاہتا ہے۔ یہ ہے اصل شے لیکن یہ تکبر اور رعونیت ہے جس سے انسان کے دل کے اندر شیطنت آ جاتی ہے' پھر وہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتا' کسی کی بات پہ دھیان ہی نہیں دیتا۔ اسی لیے یہ جو تاریخ میں اس قسم کے لوگ ہیں یا اس قسم کے جو لوگ سامنے آتے ہیں' جن میں تکبر سے یہ ذہنیت ہوتی ہے تو دوسروں کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ اس کو ہو کیا گیا ہے' یہ بات ہر شخص سمجھتا ہے' اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی تو یہ اسی ذہنیت کے غماز ہوتے ہیں۔

حق بات کو کھلے دل سے تسلیم نہ کرنے والوں کی کیفیت: مردِ حق کا لاجواب کرنا اور فرعون کا استہزا پر اتر آنا

عزیزانِ من! وہ تکبر اور رعونت کا پیکر اس قسم کے انتظامات کرتا ہے کہ کوئی صحیح بات اس تک پہنچنے ہی نہ پائے۔ وہ شخص یوں پردے لٹکا لیتا ہے۔ وہ ہمارے ہاں Iron Curtain (آہنی پردے) ایک اصطلاح آئی ہے کہ اس قسم کی مملکتیں اور سلطنتیں Iron Curtain (آہنی پردے) لٹکا لیتی ہیں' لوہے کے پردے لٹکا لیتی ہیں کہ کوئی بات ان تک پہنچنے ہی نہ پائے۔ پھر یہ ایسے انتظامات کر لیتی ہیں کیونکہ بہر حال اس چیز سے تو دکھ ہوتا ہے جو کوئی کہے کہ صاحب! یہ دیکھیے! اس کی سنیے' وہ تو بڑی صحیح بات کہتا ہے۔ اس کو رد کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہوتی ہے تو کیا کیا جائے؟ اس کے لیے بہتر یہ چیز ہے کہ ایسا انتظام کیا جائے کہ کوئی بات کرنے ہی نہ پائے۔ یہ آپ دیکھیے قرآن حمید کیا دو لفظ استعمال کر گیا ہے۔ ''متکبر'' ہے کہ اندر کی اپنی ذہنیت ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ کوئی بات سننے سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا' ''جبار'' ہے کہ وہ اس قسم کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے' ایسا جبر پیدا کرتا ہے کہ صحیح بات کہیں سے اٹھتی ہی نہیں ہے' اس تک پہنچتی ہی نہیں ہے۔ یہ ہے كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ (40:35) وہ روش جس کی بدولت خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے' ان کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔ آپ نے دیکھا كَذٰلِكَ کے کیا معنی آ گئے۔ یوں ان لوگوں پر صحیح راستہ دیکھنے کی راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ یہ ہے جو کہتے ہیں کہ جی! وہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (2:7) قرآن حکیم نے کہہ دیا ہے کہ خدا ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ جب خدا ہی مہر لگا دیتا ہے تو ان کا کیا قصور ہے۔ یہاں کہا ہے کہ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ (40:35) یوں یہ تکبر کا جبریت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پہلا انتظام یہ ہے کہ اتنا جبر کیا جاتا ہے' گلا گھونٹا جاتا ہے کہ کوئی آواز ہی نہ اس تک نکلنے پائے۔ اندر کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اگر آئے بھی تو سمجھا جائے کہ یہ کیا بات کر سکتا ہے۔ اسی لیے تو کہا ہے کہ وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (23:47) ہائیں! ان کی بات ہم سنیں' ان کی قوم تو ہماری محکوم ہے۔ یہی تو ہیں جن پر ظلم کر رہے ہو' ان کی آواز ہی تو ہے جو تمہیں بتائے گی کہ تم کتنی زیادتی کرتے ہو۔ اب یہاں تک پہنچے تو ہیں۔

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ دلیل سے اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔ فرعون سے بھی اس کا کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ اس لیے اس نے پہلی بات تو اپنی قوم سے وہ کہی تھی کہ بھئی! میری رائے یہ ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ اور اب یہ جو مردِ مومن حضرت موسیٰؑ کی مدافعت میں اور آگے بڑھا ہے تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں تو وہ بالکل ہی لاجواب ہو گیا ہے۔ اب وہ اس کو مذاق میں ٹالتا ہے۔ یہ وہ انداز ہے جسے استہزا کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ [60:36] اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى (40:37) فرعون نے استہزا سے کہا کہ اے ہامان! میرے لیے ایک بہت بلند عمارت بنواؤ جہاں سے میں آسمانوں کے ان راستوں پر جا پہنچوں' جو موسیٰ کے خدا کو جاتے ہیں اور پھر اس خدا کو ذرا جھانک کر دیکھوں! یہ

ہامان سے کہہ رہا ہے۔ ہامان اس کے ہاں مذہبی پیشوائیت کا سب سے بڑا پیشوا ہے۔

متکبر کا آخری سہارا مذہب ہوتا ہے' اُسے فریقِ مخالف کی ہر بات جھوٹی نظر آتی ہے

قرآن کریم نے کہا ہے کہ اب خود تو فرعون دلیل دے نہیں رہا' جو اکابر' اپنے کیبنٹ والے' موجود ہیں ان کے بھی کچھ تیور دیکھ رہا ہے کہ یہ تو کچھ ادھر جھکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب وہ مذہب کو لاتا ہے۔ اور یاد رکھو! جتنے بھی یہ مستبد متکبر ہوتے ہیں' ان کا جو آخری سہارا ہوتا ہے وہ مذہب ہوتا ہے۔ عوام اس فریب میں جلد آ جاتے ہیں۔ یہاں اسی لیے قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس نے ہامان کو کہا کہ آیئے ہامان! ذرا ایک بڑا سا مینار بناؤ' میں اس مینار پہ چڑھ کر دیکھوں اور جھانکوں' پھر جس کو یہ کہتا ہے کہ میرا رب آسمانوں پر ہے' میں ذرا دیکھوں تو سہی اس کا رب کہ وہ کہاں ہے اور کیسا ہے۔ ایک طرح سے تو یہ مذاق اڑا رہا ہے۔ آپ دیکھیے' یہ مذاق مذہبی پیشوائیت کے راستے سے اڑا رہا ہے۔ جب دلیل نہیں بن پڑتی تو مذہب کو درمیان میں لے آتے ہیں کہ میں ذرا جھانکوں تو سہی' موسیٰ کے رب کو دیکھوں تو سہی۔

عزیزانِ من! اس فرعون نے تو اور ہی انداز سے یہ بات کہی تھی۔ یہاں ہمارے ہاں بھی اس قسم کا تکبر ان خلانوردوں [1] میں سے ایک سے ہوا تھا' جو خلا میں گئے تھے۔ ان میں سے کسی ایک [2] نے آ کر یہ کہا تھا کہ میں نے وہاں کوشش کی کہ اتنی بلندیوں پر دیکھوں کہ کہیں خدا بھی ہے تو مجھے تو وہ کہیں نہیں نظر آیا۔ اسی قسم کا ایک مذاق ہے جواب یہ کر رہا ہے کہ میں ذرا اوپر جا کر دیکھوں کہ وہ اس کا خدا' کس قسم کا ہے' وہ کہاں ہے۔ اس لیے ہے کہ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا (40:37) میں اس شخص (موسیٰ) کو اس کے دعوے میں بالکل جھوٹا خیال کرتا ہوں۔ یہاں سے یہ بات ہے۔ یہ کہتا ہے کہ میرا اندازہ یہی ہے کہ یہ جھوٹ بولتا ہے' خدا وغیرہ کوئی نہیں ہے۔ جب انسان پہلے اپنے ذہن میں یہ کچھ دھر لے اور اس کو آگے Proceed (پابندِ عمل) کرے تو خدا اگر اس کے سامنے مجسمہ بن کر بھی کھڑا ہو جائے جب بھی وہ کہے گا کہ نہیں صاحب! تُو خدا نہیں ہے' چہ جائیکہ وہ کہے کہ میں آسمان پہ جا کر دیکھتا ہوں۔ بات تو یہ ہے کہ کس بات کو تم کس ذہنیت سے دیکھتے ہو' سنتے ہو اور تولتے ہو۔ پہلے ہی ذہن میں فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ جھوٹا ہے' اس کے بعد اس کی ہر بات جھوٹی نظر آئے گی۔ آگے پھر وہی كَذٰلِكَ (40:37) آیا ہے کہ ایسے ہی ہوتا ہے' اِسی طرح سے ہوتا ہے۔

---

[1] 12۔ اپریل 1961ء میں Vostok-1 مشن میں یوری۔ اے۔ گگارین پہلا روسی خلانورد تھا جو زمین کے مدار میں پہنچا۔ 1962ء میں Mercury-Atlas مشن کے تحت پہلا امریکی خلانورد جے۔ ایچ۔ گلن تھا جو مدارِ ارض میں پہنچا۔ 19۔ جون 1963ء میں ویلنٹینا پہلی روسی خلانورد تھی جو خلا میں گئی اور وشکاد۔2 مشن کے تحت لیونوو پہلا روسی خلانورد تھا جس نے کرۂ ارض کی خلا میں چہل قدمی کی۔

[2] یہ یوری۔ اے۔ گگارین (68-1934ء) پہلا روسی خلانورد تھا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ میں نے وہاں کوشش کی کہ اتنی بلندیوں پر دیکھوں کہ کہیں خدا بھی ہے۔ مجھے تو وہ کہیں نظر نہیں آیا۔

پراگندہ ذہنیت کبھی راہِ راست پر نہیں آ سکتی

عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ ہر آیت کے بعد کَذٰلِکَ آتا ہے۔اب یہاں جو کَذٰلِکَ ہے وہ بڑے ہی زور کی چیز ہے۔ کہا ہے کہ وَ کَذٰلِکَ زُیِّنَ لِفِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ عَمَلِہٖ (40:37) اسی طرح سے پھر ایک وقت انسان پہ وہ آ جاتا ہے کہ اس کو اپنی ہر بُری بات بھلی نظر آتی ہے۔واہ واہ! بس یہاں تک جب ذہنیت بگڑ جائے تو پھر کوئی نہیں اس کو سنوار سکتا۔زیــن وہ مزین بنا دیتا ہے' بھلی ہی نہیں بلکہ بڑی پرکشش نظر آتی ہے ہر ادا' ہر روش' ہر بات۔کہاں کہا ہے یہ؟ کہ جہاں ذہنیت میں اتنا کمینہ پن آ جائے کہ وہ مذاق اڑانے لگ جائے تو پھر تو کوئی سوال ہی نہیں ہے کہ صحیح دلیل یا برہان یا عقل وفکر کی بات اس تک پہنچ سکے۔یہ جو استہزا ہے' یہ انتہا ہوتا ہے پستی کی اور کمینگی کی اور دنائیت کی۔

استہزا کے عمل میں الجھی ہوئی ذہنیت کا انجام

یہاں پہنچنے کے بعد' یہ جو استہزا کرنے والے ہیں' ان کے متعلق کہا کہ انہیں پھر اپنی ہر بُری بات بھلی نظر آتی ہے' بڑی خوشنما نظر آتی ہے۔اور اس طرح سے وَصُدَّ عَنِ السَّبِیۡلِ (40:37) یوں وہ راستے سے بہک جاتے ہیں' اس کے راستے میں اس طرح سے دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں۔جب یہ ذہنیت ہو جائے کہ جو بات کی جائے' وہ اس کا مذاق اڑانے لگ جائے اور اس طرح سے اس کو اپنی ہر بُری بات خوشنما نظر آنے لگ جائے۔تو کہتا ہے کہ یہ چیزیں ہیں جو راستے میں روک بن جاتی ہیں' وہ صحیح راستے کی طرف چل نہیں سکتا۔

فرعون کی اندرونِ خانہ تدبیریں اور مردِ مومن کا قوم کے نام الرشاد

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَمَا کَیۡدُ فِرۡعَوۡنَ اِلَّا فِیۡ تَبَابٍ (40:37) اور اس دوران وہ اِدھر تو یہ باتیں کرتا رہا اور اُدھر کچھ خفیہ سازشیں' خفیہ تدبیریں بھی سوچتا رہا کہ اس طرح سے کیا جائے اور اس طرح سے کیا جائے۔کہا کہ اس انداز سے سوچنے والے کی کوئی تدبیر بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔ان کا نتیجہ سوائے اس کی اپنی تباہی اور بربادی کے کچھ نہیں نکلتا۔قرآن حکیم نے یہاں کَیۡدُ کا لفظ لیا ہے۔نظر آتا ہے کہ ایک بات تو وہ کھلے بندوں کہہ چکا تھا کہ میں نے اسے قتل کر دینا ہے لیکن اس سے اب یہ پلٹا ہے تو اب کچھ خفیہ تدبیریں سوچ رہا ہے' کچھ اور چالیں چل رہا ہے' کوئی اور پلانز بنا رہا ہے۔قرآن حکیم نے کہا ہے کہ کوئی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اس مردِ مومن نے پھر فرعون کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور وَقَالَ الَّذِیۡۤ اٰمَنَ یٰقَوۡمِ اتَّبِعُوۡنِ اَہۡدِکُمۡ سَبِیۡلَ الرَّشَادِ (40:38) کہا کہ اے میری قوم! اس کی مت سنو' یہ آپ بھی غرق ہوگا' تمہیں بھی ڈبو دے گا' میری بات سنو' میرے پیچھے چلو' میں تمہیں بھلائی کی طرف لے جاؤں گا۔فرعون نے بھی کہا تھا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ الرَّشَادِ (40:29) ہے۔اس نے کہا کہ وہ نہیں' جو میں کہہ رہا

ہوں' یہ بات دلیل و براہان پہ مبنی ہے۔بات سمجھ میں نہیں آتی' مجھ سے پوچھو میں شہادات کی رو سے بھی ثابت کردوں گا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ صحیح ہے۔اس بات کے پیچھے چلو جو میں کہہ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ کونسی بات ہے جو تمہیں صحیح راستے کی طرف نہیں آنے دیتی۔

مفاد پرستی نے انسان کو ہمیشہ گمراہ کیا' کائنات کی ہر شے انسان کے لیے متاعِ حیات ہے' مقصود بالذات نہیں: اس مردِ مومن کا قوم سے خطاب

عزیزانِ من! اور وہ بات جو صحیح راستے کی طرف نہیں آنے دیتی' وہ مفاد پرستی ہے۔اس مردِ مومن نے کہا کہ **یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ** (40:39) یہ اس زندگی کے' اس دنیا کے' مادی مفادات ہیں جو تمہیں اندھا کیے ہوئے ہیں اور صحیح بات سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑ رہے۔تم صحیح راستہ اختیار نہیں کر رہے کہ تمہارے مفادات پر اس کا اثر پڑ رہا ہے' زد پڑ رہی ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ جو مفاد ہیں' ان کی بالآخر عمر کتنی ہے' قیمت کیا ہے؟ عمر کے اعتبار سے ہی پہلے آپ دیکھیے۔کسی شخص کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ مجھے اگلا سانس بھی آئے گا یا نہیں' یہاں یہ کیفیت ہے۔اور یہ تو یقینی بات ہے کہ ہمیشہ کوئی شخص یہاں نہیں رہ سکتا۔اس کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ سانس بھی آئے گا یا نہیں' کب موت ہو جائے گی اور یہ یقینی بات ہے کہ بہر حال انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ایک لفظ متاع ہے اور قرآنِ کریم نے بھی دنیا کی چیزوں کو متاع کہا ہے یعنی جن کو استعمال میں لایا جائے۔یہ استعمال میں لانے کی چیزیں ہیں۔استعمال میں لائی جاتی ہیں' چیز کسی دوسرے بلند مقصد کے حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے (مثلاً) صابن بجائے خویش کوئی متاع نہیں ہے' وہ ہاتھ منہ دھونے' نہانے کے کام آتا ہے' استعمال کی شے ہے۔روٹی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہے' وہ آپ کو تقویت دینے یا زندگی برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔یہ جو دنیا کا رابطہ ہے' یہ وہ ہے جس کو راہِ گزراں کہتے ہیں کہ اس میں سے جانا ہے' اس جانے کے لیے سفر ہے' سفر کے لیے کسی سواری کی ضرورت ہے۔اگر تم اسی سواری کو ہی مقصود بالذات سمجھ لو اور اس گھوڑے کی پیٹھ پہ بیٹھے رہو تو تم نے تو کہیں جانا تھا۔اس جانے کا کیا بنے گا؟ اسے سمجھو۔

سفرِ زندگی کے یہ لمحات مستقر نہیں ہیں: مردِ مومن کی وضاحت

اُس مردِ مومن نے کہا ہے کہ اس دنیا کو اتنا ہی سمجھ لو کہ یہ **دَارُ الْقَرَارِ** (40:39) نہیں ہے' یہ مستقر نہیں ہے' یہ منزل نہیں ہے۔یہ جو راستے میں سے گزرنے والی چیز ہے اس میں اتنا ہی کچھ چاہیے جس سے وہ سفر طے ہو جائے' نہ کہ اپنے اوپر اتنا لا دلو کہ سفر بھی طے نہ ہو سکے۔یہ سمجھ لو کہ اس کے بعد یہ جو **دَارُ الْقَرَارِ** (40:39) کہا ہے' جو مستقر ہے' جو رکنے کی' ٹھہرنے کی' جگہ ہے' وہ اس کے بعد کی زندگی ہے۔لفظ ''قرار'' قرآنِ کریم کا عجیب لفظ ہے۔قرآن کریم کی بنیادی چیز تو یہ حرکت ہے۔زندگی حرکت کا نام ہے۔

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ جو چیز ہے کہ چلتے رہنا ہے' چلتے رہنے میں کسی مقام پر عارضی طور پہ آدمی ستانے کے لیے' دم لینے کے لیے' کھڑا ہو جائے۔ وہ ہوتا ہے جسے قرار کہتے ہیں اور اس جگہ کو مستقر کہتے ہیں۔ وہ بھی آخری منزل نہیں ہوتی بلکہ اس حرکت میں سفر کے اندر کوئی مقام ہوتا ہے جہاں تھوڑے وقت کے لیے ٹھہرنا ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی دنیا کے لیے یہی کہا ہے کہ جو مستقر ہے وہ اس کے بعد ہے۔ یعنی یہاں وہ مستقر بھی آپ کو نہیں بتاتا' یہاں سے تو چلتے ہی رہنا ہے۔ وہ ایک عام سا' عامیانہ سا' ایک شعر ہے:

دنیا میں ہوں' دنیا کا طلبگار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں' خریدار نہیں ہوں

لیکن استعمال کے لیے تو بہر حال خریداری بھی ہے۔ اس زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ کہ

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن

اس زندگی میں پرورشِ آہ و نالہ کا مقصد ''انسانی ذات کی نشوونما ہے'' اور دنیاوی متاع اس کا بس ذریعہ ہے: فرعون کے دربار کا مردِ مومن اور اقبالؒ

یہ شخص ❶ بڑی عجیب بات کہہ جاتا ہے۔ یہ پرورشِ آہ و نالہ' انسانی ذات کی Development (نشوونما) کے لیے اس دنیا کا ضروری سفر ہے۔ یہاں یہ بات ہے کہ انسان کی ذات کی Development (نشوونما) ہوتی ہے:

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گُل کے لیے ہے' نہ آشیاں کے لیے

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

اس کا بھی ایک فائدہ ہے لیکن وہ اتنا ہی ہے کہ یہ تمہاری ذات کی پرورش کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اور اگر اسی کو مقصود بالذات بنا لیا جائے تو وہ تباہی ہے۔ فرعون کی کابینہ کے اس مردِ مومن نے کہا کہ یہ ہے جو فرق ہے۔ یہ فرعون' یہ اس کی فرعونیت' یہ تمہاری حکومت' یہ مال' یہ دولت' یہ قوت' یہ ساری جتنی بھی ہیں' یہ اگر تمہارے سفر کے لیے ذریعہ بن جائیں تو وہاں تک تو ٹھیک ہے۔ اور اگر یہی مقصود بالذات بن جائیں تو انہی کے بوجھ کے نیچے دب کر یہیں کے یہیں رہ جاؤ گے' آگے چل ہی نہیں سکو گے۔ اور جانا تو تم نے اور آگے ہے' تمہاری

---

❶ یہاں یہ اشارہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء) کی طرف ہے۔

منزل آ گئے ہے۔ اُس نے کہا کہ میں یہ کہتا ہوں کہ مَنۡ عَمِلَ سَیِّئَۃً فَلَا یُجۡزٰۤی اِلَّا مِثۡلَھَا (40:40) ان معاملات کے فیصلے کسی دنیاوی بادشاہ کے قوانین کے مطابق نہیں ہوتے۔ ان کے فیصلے خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہوتے ہیں۔ اسے یوں سمجھو کہ جو اس کا مکافاتِ عمل ہے' اس کا اصول' اس کی بنیاد' اس کا قانون یہ ہے کہ ''جو غلط کام ہے اس کا نتیجہ اتنا ہی ہوتا ہے جتنا وہ غلط کام ہوتا ہے۔ اس کے قانون کی رو سے جرم سے زیادہ سزا کبھی نہیں ہوتی۔''

صلاحیت بخش کام ہمیشہ پختہ یقینی کی بنیاد کا طلب گار رہتا ہے

اس کے مقابلے میں وَمَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی (40:40) جو بھی صلاحیت بخش کام کرتے ہیں وہ مرد ہو یا عورت' کسے باشد' وَھُوَ مُؤۡمِنٌ (40:40) اور وہ اس قانون کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں یعنی ان سے یونہی اچانک یا بائی چانس' ایک اچھا کام نہیں ہو جاتا۔ اس کے ساتھ قرآن حکیم کی شرط ہے کہ وَھُوَ مُؤۡمِنٌ (40:40) وہ اس قانون کی صداقت پر پختہ یقین رکھے تو اس سے اس کے عمل کے اندر استقامت ہوگی کہ ''جب بھی میں ایسا کرونگا اس کا نتیجہ یہ نکلے گا''۔ اور اگر کبھی ذہن میں یہ ہو جائے کہ بائی چانس ایک اچھا کام کر لیا اور بائی چانس نتیجہ بھی ایسا نکلا تو اس میں استقامت نہیں ہوتی۔ اچھے کام میں استقامت ہمیشہ ایمان سے ہوتی ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ وہ اس بات سے Convince (متفق) ہے کہ جب بھی اچھا کام کرونگا اس کا اچھا نتیجہ نکلے گا۔ یہ ہوتا ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔ تو اس مردِ مومن نے کہا کہ اگر یہ چیز ہو' اس بات پر یقین ہو کہ اس روش کا نتیجہ اچھا نکلے گا۔ تو اس روش کے اوپر جو صلاحیت بخش ہے وہ اس پہ چلتا رہے۔

مرد اور عورت دونوں میں خدا کا قانون کوئی فرق نہیں کرتا' یہ فرق انسان کا خود پیدا کردہ ہے

اور پھر یہ دیکھیے کہ بات تو اس مردِ مومن کی تقریر کی ہے اور قرآن کریم کا اصول مِنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی (40:40) کا ہے۔ قرآنِ کریم عورت اور مرد کی مساوات ہر مقام پہ بتا رہا ہے۔ اُس دور میں بھی بتا رہا ہے جس دور میں مثال دی جا رہی تھی کہ وہ یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَ کُمۡ وَ یَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَ کُمۡ (2:49) کرتا تھا۔ اس کا عام ترجمہ ہی یہی تھا کہ جن میں عورتوں جیسی صفتیں ہوں' کمزوریاں ہوں وہ انہیں آگے بڑھاتا ہے اور جن میں اُسے جوہرِ مردانگی کی جھلک دکھائی دیتی تھی' وہ انہیں ذلیل و خوار کر کے غیر مؤثر بنا تا رہتا تھا' وہاں بھی قرآن کی دعوت دینے والا خدا کے پیغام کی طرف دعوت دینے والا مردِ مومن مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی (40:40) کہہ رہا ہے کہ خدا کے قانون کے اندر کوئی فرق نہیں ہے عورت میں اور مرد میں۔ ان میں سے جو کوئی بھی اس قسم کے یہ عملِ صالح کرے گا' اس کا نتیجہ وہ ہوگا کہ فَاُولٰٓئِکَ یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ (40:40) وہ جنتی زندگی ہے جس میں یُرۡزَقُوۡنَ فِیۡھَا (40:40) سامانِ زیست کی فراوانیاں ہی

فراوانیاں ہونگی اور بِغَیۡرِ حِسَابٍ (40:40) یہ اُسے بے حد وحساب نعمتیں اور آسائشیں حاصل ہوں گی۔بِغَیۡرِ حِسَابٍ کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہاں وہ یونہی لٹا دیتا ہے۔اللہ کے متعلق تو سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ(3:199) کہا ہے۔بِغَیۡرِ حِسَابٍ کے معنی ہوتا ہے کہ جو تمہارا اانداز ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔

انسان اپنے جذبات اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے خدا کے پیمانوں کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا

قرآن حمید یہ کہتا ہے کہ تمہاری آرزوئیں پوری ہونگی اور اس سے زیادہ بھی ہم دیں گے تو ذہن میں ہی نہیں آتا کہ انسان کی آرزو کی تکمیل ہو جائے تو اس سے زیادہ کیا ہوتا ہے۔اس نے کہا یہ ہے کہ تمہارے محدود ذہن' تمہارا محدود قلب' تمہارے محدود جذبات' کے پیمانے ہی کتنے بڑے ہیں! جیسے وہ ہمارے ہاں کے بچے کو مٹی کا گھوڑا دیدیا جائے تو اسی سے خوش ہو جاتا ہے' کوئی کھلونا اس کو دیدیا جائے' اس کی آرزو کی تکمیل ہو جاتی ہے۔وہ اس سے زیادہ نہیں کچھ مانگتا' اس پر ہی مطمئن ہو جاتا ہے لیکن ہمیں تو پتا ہے کہ اس آرزو کی تکمیل منتہا نہیں ہے' ہم تو اس کے لیے بہت کچھ اور کرتے ہیں۔قرآن حمید نے یہ کہا ہے کہ تمہارے جو Finite (محدود) ذہن اور جذبات ہیں' ان کے پیمانے بڑے چھوٹے چھوٹے ہیں۔تم تو بچوں کی طرح ان کھلونوں سے بہل جاتے ہو۔تو جو تم مانگو گے وہ تو ملے گا ہی اور ہم اس سے کہیں اور زیادہ بھی دیں گے۔کیا بات ہے اس دینے والے کی! بِغَیۡرِ حِسَابٍ کے معنی یہ ہوتے ہیں یعنی تمہارا جو ذہن کا حساب ہے' بچے کا جو حساب ہے' پوچھو اس سے کہ کتنے پیسے چاہئیں؟ دو پیسے چاہئیں۔وہ اس کا منتہا ہوتا ہے۔لیکن دینے والا جانتا ہے کہ جتنے یہ مانگ رہا ہے اس میں یہ چیز نہیں آئے گی وہ اس کو دس پیسے [1] دیتا ہے۔بِغَیۡرِ حِسَابٍ کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے حساب اور تمہارے اندازے سے کہیں اور زیادہ ہم دیں گے۔

مرد ہو یا عورت قرآنِ حکیم کے نزدیک تو دونوں برابر واجب التکریم ہیں

کہا ہے کہ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی (40:40)۔یہ میں نے جو مرد اور عورت کہا ہے تو قرآن مجید میں شروع سے آخر تک آپ دیکھیں گے کہ اس نے ان دونوں کو انسان قرار دیا ہے۔اور انسان ہونے کی جہت سے دونوں کو واجب الاحترام اور واجب التکریم قرار دیا ہے' کہیں یہ نہیں ہے کہ جو مرد ہے وہ عورت سے زیادہ واجب التکریم ہے یا جو عورت ہے وہ مرد سے پچھلی ہے۔کہیں یہ نہیں کہا ہے۔

مملکتِ پاکستان میں عائلی قوانین کی شرعی کیفیت اور قرآنِ حکیم کا حکم

آپ نے پچھلا پرچہ طلوعِ اسلام (جنوری 1981ء) کا دیکھا ہوگا۔آپ کے ہاں یہ جو قانون بن رہے ہیں' جو ابھی اس کے بعد

---

[1] یاد رہے کہ یہ بات فروری 1981ء کی 13 تاریخ کو کہی گئی تھی جب خرید و فروخت کے لیے پیسے کا تعین یہی کچھ تھا۔

غالباً نافذ ہو جائیں گے' آپ کو معلوم ہے کہ ان کے ہاں کی شریعت میں عورت بیچاری کا درجہ کیا ہے؟ ہر مقام پہ عورت کو کچل رکھا ہے۔ یہ تو یہاں تک لے گئے ہیں کہ قتل کی سزا میں وہ جو دیت یا خوں بہا یا Blood Money ہوتا ہے' وہ جو سہو کا قتل ہوتا ہے' اس کے لیے یہ مقرر ہوتا ہے کہ یہ اتنا Blood Money دیدیا جائے تو وہ سزائے موت ٹل جاتی ہے' وہ رقم عدالت مقرر کر دیتی ہے کہ کتنا دیا جائے۔ اب یہ آپ کے ہاں قانونِ شریعت بن رہا ہے اور یہ فقہ کے اندر چلا آ رہا ہے کہ عورت اگر مقتول ہے' اس کو قتل کر دیا جاتا ہے تو اس کا خوں بہا (Blood Money) مرد سے آدھا ہوتا ہے۔ اوستیاناس! اس بیچاری کی جان کی قیمت بھی مرد کی جان سے آدھی ہوتی ہے۔ اور دنیا کے سامنے ہم بانگِ دہل کہتے ہیں کہ ہم نے عورت کو جو مساوات دی ہے' وہ دنیا میں کہیں اور نہیں ملے گی۔ زندگی میں تو مساوات کا پوچھو ہی نہیں جو ملتی ہے' وہ ہمارے سامنے ہے۔ مرنے کے بعد اس کی جان کی جو قیمت ہے' وہ مرد کی جان کی قیمت سے آدھی ہوتی ہے۔ یہ آپ کے ہاں قانون چلا آ رہا تھا۔ ہم نے سمجھا تھا کہ اب یہ نئے قانون بننے لگے ہیں' بہرحال اس میں تو کچھ چیز ایسی آ جائے گی۔ اس نئے قانون کے اندر بھی یہی آدھی قیمت ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (40:40) عورت ہو' مرد ہو' وہ تو دونوں انسان ہیں۔ جو کچھ انسان کے لیے ہم کہہ رہے ہیں' وہ ان دونوں کے لیے کہہ رہے ہیں۔ کہیں قرآن کریم نے ان دونوں کے اندر یہ تفریق نہیں کی۔

دربارِ فرعون کا مردِ مومن اپنی تقریر میں حفاظت آگیں اور تخریب خیز قوت کا فرق سمجھاتا ہے

اس مردِ مومن نے آگے کہا ہے کہ وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ (40:41) اومیری قوم' او میرے بھائیو! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ انداز ہے کہنے کا! تمہیں کیا ہو گیا کہ میں تمہیں تباہیوں سے' بربادیوں سے' اس قسم کی اہانتوں سے' استبداد سے' ان چیزوں سے' نجات دلانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم مجھے جہنم کی طرف بلا رہے ہو۔ سوچو تو سہی۔ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ (40:42) تم چاہتے یہ ہو کہ میں ان قوانینِ خداوندی کا انکار کر دوں یا خدا کی حکمرانی کے اندر انسانوں کی حکمرانی کو بھی ساتھ داخل کر دوں۔ تم اس طرف مجھے دعوت دیتے ہو۔ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ (40:42) اور میں تمہیں تمہاری حفاظت کرنے والے اِس صاحبِ قوت کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ کیا بات ہے! یہاں کے صاحبِ قوت وہ ہیں جو تمہیں ذبح کرتے ہیں۔ میں تمہیں اس صاحبِ قوت کی طرف دیتا ہوں جو تمہاری حفاظت کرتا ہے۔ اب قوت کا استعمال آ گیا۔ ایک تو یہاں کے متکبر حکمران کی قوت ہوتی ہے' وہ ذبح کرنے کے کام آتی ہے۔ ایک خدا کے قوانین کی' اس کے نظام کی' قوت ہوتی ہے' وہ انسانوں کی اور بندوں کی حفاظت کرتی ہے۔ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا

فِی الْاٰخِرَةِ (40:43) تم مجھے اس کی طرف دعوت دیتے ہو' بلاتے ہو کہ جس کی دعوت' جس کا بلاوا' آخرت میں تو ایک طرف رہا' اس دنیا میں بھی کوئی وزن اور قیمت نہیں رکھتا۔ تم اس کی طرف بلاتے ہو جبکہ میں اس حفاظت کرنے والی قوت کی طرف بلاتا ہوں۔

قیاس تو کجائی و من کجا واعظ

کہتا ہے کہ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَی اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِیْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ (40:43)۔ یہ ہے فرق۔ تم جہنم کے معاشرے کی طرف اور اس حکومت کی طرف مجھے دعوت دیتے ہو' میں تمہیں خدا کے اس نظام کی طرف دعوت دیتا ہوں جہاں تمہاری ہر قسم کی Protection (نگہداشت) اور حفاظت ہوتی ہے' اس کے اندر سلامتی ہوتی ہے۔ تم دیکھو کہ ان دونوں دعوتوں میں کتنا فرق ہے۔ اب وہ آخری فقرے پہ آ گیا۔

قرآنِ حکیم کی راہنمائی میں روزِ اول سے آخر تک' نہ کوئی تضاد ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی کمی

عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ قرآنِ کریم نے اس مردِ مومن کی یہ پوری تقریر اپنے ہاں محفوظ کی ہے۔ آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ مردِ مومن ہے۔ یہ ہے تو صدیوں پہلے کی بات۔ یہ حضرتِ موسیٰؑ کے زمانے کے فرعون کی بات ہے لیکن جو کچھ یہ کہہ رہا ہے' یہ وہی ہے جو اس کے بعد قرآن حکیم نے کہا ہے' اور وہی ہے جو آج بھی قرآن حکیم پیش کرنے والے کہہ رہے ہیں۔ یہ بات کوئی پرانی نظر نہیں آتی' نہ اس سے مختلف نظر آتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس قرآن مجید کے اندر دی۔ اور یہ وجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہم نے پہلے پیغمبر سے لے کر آخری پیغمبر تک دین ایک ہی دیا تھا۔ دین پر عمل کرنے کے طریقوں کے اندر تو فرق تھا کیونکہ وہ ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق تجویز کیے جاتے تھے لیکن دین کی جو اصل و بنیاد ہے' وہ ہمیشہ ایک رہی ہے۔ آپ غور کیجیے کہ یہ اس زمانے کا آج سے صدیوں پہلے کا' مردِ مومن ہے۔ اس کی اس تقریر کو آپ دیکھیے تو کیا یہ قرآن مجید کی صدائے بازگشت نہیں ہے! اس لیے کہ ان کا سرچشمہ ایک ہے' یہ وحی خداوندی ہے۔ ان کو مردِ مومن اسی لیے کہا گیا ہے کہ وہ کسی نبی کا جو پیغام تھا' اس پر ایمان رکھتا تھا۔ جو باتیں اس نے کی ہیں ایک ایک بات آپ دیکھتے ہیں کہ وہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے اندر کہی ہے۔ اور اسی لیے خدا نے جو قرآن مجید کے متعلق کہا ہے کہ اس کتاب کے خدا کی طرف ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس میں کہیں اختلاف نہیں ہے تو اختلاف یہاں ہی نہیں کہ خدا کی اس آخری کتاب میں نہیں بلکہ خدا نے جہاں بھی پیغام بھیجا ہے حضرتِ نوحؑ سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک' کسی پیغمبر کے دین کی اصل میں کہیں بھی اختلاف نہیں ہے۔

فرعون کے دربار میں اُس مردِ مومن کا آخری پیغام

یہ کچھ اس مردِ مومن نے کہا اور اب آخر میں پہنچ گیا۔ کہا کہ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ (40:44) اے میرے بھائیو! آج

تم میری باتوں پر کان نہیں دھر رہے لیکن ایک وقت آئے گا کہ تم میری باتیں یاد کرو گے۔ کتنا حسین انداز ہے بات ختم کرنے کا۔ ایک وقت آئے گا کہ تم یاد کرو گے میری ان باتوں کو' جو میں کہہ رہا ہوں۔ اور اس کے بعد اب جو یہ ختم کر رہا ہے تو سامنے فرعون نظر آ رہا ہے' اس کا استبداد نظر آ رہا ہے۔ کہا کہ میں نے جو کہنا تھا کہہ چکا' اب یہ رہا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے تو سنو! وَاُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ (40:44) میں نے اپنے آپ کو اپنے خدا کی طرف سونپ دیا۔ میری فکر نہ تم کرو' مجھے پتا تھا' پہلے ہی جب میں اٹھا ہی ہوں' میں نے سوچ سمجھ کر یہ کچھ کہا ہے' مجھے اس کا بھی علم ہے جو سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ اس کے دل پہ کیا گزر رہی ہے۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ اس لیے مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ اُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ (40:44) میں اپنے تمام معاملات خدا کے سپُرد کرتا ہوں۔ اُفَــوِّضُ کا لفظ بڑا عجیب ہے۔ یہ ہے ''تفویض کر دینا' کسی کے سپرد کر دینا''۔ عزیزانِ من! ساحرینِ دربارِ فرعون نے بھی یہی بات کی تھی۔ وہ بات بھی آئے گی۔

حضرت موسیٰؑ سے حق و باطل کا مقابلہ کرنے کے لیے فرعون کے مذہبی پیشواؤں کا فیس کا مطالبہ

فرعون نے حضرت موسیٰؑ کی مخاصمت میں اپنا آخری داؤ ان لوگوں کے ذریعے لگا دیا تھا جن کو ساحرین کہتے ہیں۔ یہ مذہبی پیشوا تھے۔ فرعون نے ان ساحرین سے کہا کہ تم اس موسیٰؑ کا مقابلہ کرو اور اسے شکست دو۔ جیسا کہ ہر دَور کا مذہبی پیشوا ہوتا ہے' اس دور میں تو ابھی وہ مذہبی پیشوا ہی تھے' انہوں نے کہا تھا کہ اگر ہم اس پر غالب آ گئے تو کہو کہ ہمیں کیا ملے گا؟ ''پہلے ای سودا کرن ڈئے ہوئے ہیگے'' (پہلے ہی مُک مُکا کر رہے ہیں)۔ یہ نہیں ہے کہ دین کی بات کرنے آئے ہیں' حق کی بات کرنے آئے ہیں' ہمارا جو حق ہے وہ باطل پر غالب آ جائے گا' یہی بڑی چیز ہے۔ یہ نہیں کہا بلکہ وہ آئے ہی اس لیے ہیں' پہلے ہی پوچھ رہے ہیں کہ کہیے! ہمیں کیا ملے گا۔ اور وہ دینے والے بھی بڑے کاریگر ہوتے ہیں' انہوں نے پیسے تو تھوڑے ہی بتائے مگر یہ کہا کہ ہم تمہیں خان بہادر کا خطاب دیدیں گے۔ وہ خوش ہو گئے۔ ''شمس العلما'' بنا دیں گے۔ فرعون نے یہی کہا تھا کہ پیسے بھی دیں گے اور ہم تمہیں اپنا مقرب بنا لیں گے۔ انہوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ تو اس زعم پر وہ آئے اور فرعون نے بھی یہ چیز کی اور سمجھا کہ اب یہ حضرت موسیٰؑ کو مات دیدیں گے۔

فرعون کے دربار میں پورے مجمع کے سامنے فرعون کے مذہبی علما کا اعترافِ حقیقت' فرعون کا شیر کی طرح دھاڑنا اور حضرت موسیٰؑ کی فتح

اب جو انہوں نے دیکھا کہ حضرتِ موسیٰؑ جو دلائل دے رہے تھے' ان کا جواب ان کے پاس نہیں تو وہ Convince (قائل) ہو گئے کہ یہ سچا ہے۔ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے اقرار کر لیا کہ اے فرعون! یہ سچے ہیں اور ہم ان پر ایمان لے آئے ہیں۔ یہ فرعون

کی اتنی بڑی شکست تھی‘ یہ پوری قوم کے نمائندوں کا مجمع تھا۔ کہا ہے کہ وہ تو اس نے ایک بہت بڑا جیسے دنگل ہوتا ہے‘ اس قسم کا مجمع لگایا تھا۔ اس میں ان مذہبی پیشواؤں نے یہ بات کہی کہ یہ سچا ہے‘ ہم بھی جھوٹے ہیں‘ تم بھی جھوٹے ہو۔ کیا وہ اس بات کو برداشت کر سکتا تھا؟ وہاں یہ بات آئی ہے کہ ''کیا تمہیں پتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرنے والا ہوں؟ سنو! صلیب پہ ٹانگ دوں گا‘ ایک ایک عضو تمہارا کاٹ دوں گا‘ کھال ادھیڑ دوں گا‘ ابھی تم دیکھو کہ کیا کرتا ہوں''۔ وہاں قرآن کریم نے ایک انداز میں کہا کہ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ تُو جو کچھ بھی یہ کہہ رہا ہے‘ اس دنیا کی زندگی تک تیرا اختیار ہے تُو تو اس سے آگے جا ہی نہیں سکتا اور ہمارا معاملہ اس زندگی سے اگلی زندگی تک ہے۔ تیرا ہاتھ تو اس زندگی تک ہی اٹھتا ہے‘ تو اس سے تم کیا ڈراتے ہو۔ ہم یہیں ختم ہو جانے والے نہیں ہیں‘ ہمارا معاملہ آگے چلتا ہے اور جس کے ساتھ وہ معاملہ پڑتا ہے‘ اس کو ہم جانتے ہیں۔ تُو اس سے زیادہ کر کیا سکتا ہے۔ اندازہ لگایئے کہ جب بھی یہ ایمان کی جھلک اٹھتی ہے تو وہ مذہبی پیشوائیت کے نمائندے ہیں‘ فرعون کی طرف سے یہ کچھ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ صداقت کو بے نقاب دیکھتے ہیں تو اس طرح سے نہیں کھڑے ہو جاتے ہیں‘ پتا ہے کہ فرعون کیا کرے گا۔ وہ شیر کی طرح دھاڑتا ہے‘ وہ نہایت اطمینان سے جواب دیتے ہیں کہ اس سے زیادہ تُو کر کیا سکتا ہے۔ سچ ہے کہ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

فرعون کے سامنے مردِ مومن کی بے باک جرأت کا اظہار‘ اطمینانِ قلب کی کیفیت‘ اور فرعون کا غرق ہونا

عزیزانِ من! ہم یقین اور ایمان کی قوت تو جان ہی نہیں سکتے‘ ہم اس سے لذت آشنا ہی نہیں ہیں‘ ہمیں پتا ہی نہیں کہ ایمان کیا چیز ہوتی ہے۔ اس مردِ مومن نے بھی یہ چیز کہی کہ میری باتیں تم کسی وقت یاد کرو گے کہ کیا کہہ گیا تھا۔ میرے متعلق نہ گھبراؤ‘ اس لیے کہ میں تو جب اٹھا ہی تھا تو اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیا تھا۔ سنو! اُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ (40:44) میں نے اپنے تمام معاملات خدا کے سپُرد کر دیئے کیوں کہ اس کی نگاہ اپنے بندوں کے اوپر ہے اس لیے اس کی نگاہوں سے میں مخفی اور اوجھل نہیں ہوں کہ یہ پتا نہیں کہ کیا کچھ اور کر دے اور اس کو پتا ہی نہ چلے کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ تو ایسا خدا ہے جس پہ میں ایمان لایا ہوا ہوں اس لیے وَاُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ (40:44) میں اپنے معاملات خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

عزیزانِ من! یہ معاملات کو خدا کے سپرد کرنا بڑی عجیب چیز ہے‘ اس سے بڑا سکون اور اطمینان ہوتا ہے کہ اتنے بڑے کے سپرد کر دیا ہوا ہے کہ جس کی سپردگی میں جانے کے بعد کسی اور دست دراز کا وہاں تک ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ وہ مردِ مومن کہتا ہے کہ میں تو اپنے

آپ کو اس کی حفاظت میں لے آیا ہوں، میرے متعلق تم نہ گھبراؤ، پریشان نہ ہو[1]۔قرآن کریم نے یہیں بتادیا کہ **فَوَقٰهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ** (40:45) (فرعون اور اس کے ہم نوا اِس حق گوئی کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے؟ انہوں نے اس مردِ مومن کو، مخالفین کے ساتھ مل کر سازش کرنے والا قرار دیدیا اور اس کے درپئے آزار ہو گئے لیکن) ہم نے اسے ان کے داؤ پیچ سے بھی بچایا، بنی اسرائیل کو بھی بچالیا۔اور یہ جو اس قدر تکبر کرتے تھے اور اس قدر جبار تھے، وہی غرق ہو گئے اور اس کی آنکھوں کے سامنے غرق ہو گئے۔

یہ آخری آیت تھی جو آ گئی۔اس کے بعد یہ ہے کہ پھر ان پر کس قسم کی تباہی آئی۔میں سمجھتا ہوں کہ یہ نیا مضمون شروع ہوتا ہے۔ہم یہیں اس مردِ مومن کی تقریر کے آخری الفاظ پہ ختم کرتے ہیں کہ **فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ** (40:44) میری باتیں یاد کرو گے **وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ** (40:44) اور میں نے اپنے آپ کو اپنے خدا کے سپرد کر رکھا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اسے ہم یہیں ختم کرتے ہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ المؤمن کی آیت 45 تک ہم آ گئے، 46ویں آیت سے اس کے بعد لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀......❀......❀

---

[1] دربارِ فرعون کے مردِ مومن کی تقریر اس سورۃ کی آیت 28 سے شروع ہو کر اس 44ویں آیت پر اختتام پذیر ہوئی۔

پانچواں باب: **سورة المؤمن** (آیات 46 تا 55)

عزیزانِ من! آج فروری 1981ء کی 20 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمن کی آیت 46 سے ہوتا ہے:(40:46)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ کشمکش فرعون اور صاحبِ ضربِ کلیم حضرتِ موسیٰؑ کا سلسلۂ کلام چلا آ رہا ہے۔گزشتہ دو درسوں میں دربارِ فرعون کے ایک مردِ مومن کی تقریر دہرائی گئی تھی۔یہ بڑا عظیم واقعہ ہے جسے قرآن کریم نے اپنی دفتین میں قیامت تک محفوظ کرلیا ہے۔آپ کو یاد ہے کہ اس مردِ مومن نے تو یہ کہا تھا کہ میرے عزیزو! میں نے جو کچھ تم سے کہنا تھا کہہ چکا۔اب اس کے بعد جہاں تک میرے معاملے کا تعلق ہے، میں جانتا ہوں کہ یہ شخص کس قدر مستبد، ظالم اور وحشت پسند ہے لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں۔**وَاُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ** (40:44) میں نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا ہوا ہے۔اور قرآن کریم نے اس کے ساتھ ہی کہا تھا کہ **فَوَقٰهُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِ مَا مَكَرُوۡا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ** (40:45) خدا نے اس مردِ مومن کو فرعون کی سازشوں سے محفوظ رکھا اور خود قومِ فرعون کو سخت تباہی کے عذاب نے آ گھیرا۔یہاں قرآن کریم نے لفظ **مَكَرُوۡا** کہا ہے یعنی خفیہ سازشیں۔

اب ایک تو یہ ہے کہ یہ مردِ مومن اتنا صاحبِ اثر نظر آتا ہے کہ فرعون کو باوجود اپنی اتنی بڑی فرعونیت کے یہ جرأت نہیں ہوئی کہ

اعلانیہ اس کے متعلق یہ کہہ دے کہ اس کو قتل کر دیا جائے یا پھانسی پہ چڑھا دیا جائے۔ اور یا پھر یہی نظر آتا ہے کہ اس کیبنٹ کے سامنے یا پارلیمان کے سامنے' جو کچھ اس مردِ مومن نے کہا تھا اس کا اثر غیر شعوری طور پر ایسا ہو چکا تھا کہ فرعون نے محسوس کر لیا تھا کہ اس پر ہاتھ ڈالنا اچھے نتائج پیدا نہیں کرے گا۔ بہر حال بات کوئی بھی ہو' قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس کو جرأت نہیں ہوئی کہ اعلانیہ اس کے خلاف کچھ کرے۔ وہ سازشوں پہ اتر آیا۔ اور ہم نے اسے اس کی سازشوں سے بھی محفوظ رکھا۔ اور اس کے برعکس فرعون اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں دو چیزیں یہاں آتی ہیں۔ ایک تو قرآن کریم نے کہا ہے کہ انہیں دن رات' صبح شام' مسلسل مختلف قسم کے عذاب میں مبتلا کیا اور دوسری یہ کہ آخر الامر پھر وہ اَشَدَّ الْعَذَابِ (40:46) کی طرف آئے۔

لفظ عذاب کے تصور میں ثنویت کا عنصر اور ہمارے ہاں ذہنیتِ فکر و نظر کے دو حصوں کا الجھاؤ

عذاب کی یہ چیز بڑی غور طلب ہے۔ ہمارے ہاں' جب سے یہ دین اور دنیا میں ثنویت (Dualism) آئی' ہم نے ان کو ایک دوسرے سے الگ کیا تو ہمارے ذہن کے بھی دو حصے ہو گئے۔ وہی الفاظ جب ہم دنیاوی معاملات میں استعمال کرتے ہیں تو ان کا مفہوم کچھ اور ہوتا ہے۔ انہی کو جب ہم مذہب کے معاملے میں استعمال کرتے ہیں یا اس طرف لاتے ہیں یا قرآن حمید کی طرف آتے ہیں تو ذہن میں نقشہ کچھ اور ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں وہی ثنویت' وہی Dualism در آئی۔ ہماری فکر' نظر اور ذہنیت کے دو حصے ہو چکے ہیں۔ ہم روز یہ بولتے ہیں کہ صاحب! قوم عجیب عذاب میں گرفتار ہے۔ اب آپ اس کے معنی سمجھتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ یہ لفظ موجود ہے' ہم اسے روز بولتے ہیں۔ جب ہم اپنے متعلق' قوم کے متعلق' ملک کے متعلق' یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہمارا ذہن مذہب کی طرف نہیں جاتا۔ اس عذاب سے جو کچھ ہم پہ بیت رہی ہے' اس پہ ہم کہتے ہیں کہ عذاب میں گرفتار ہیں۔ ایک فرد اپنے متعلق بھی کئی دفعہ کہتا ہے' ہم بھی بار بار کہتے ہیں کہ صاحب! میں تو عجیب عذاب میں پھنس گیا لیکن جونہی ہم اب یہ کہتے ہیں کہ قومِ فرعون پہ خدا کا عذاب آ گیا تو اس وقت ہمارا ذہن کسی دوسری طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ کوئی ایسی چیز آسمان سے اتری اور اس بجلی نے آ کر ان کو تباہ کر دیا اور ان پر یہ ہو گیا۔ یعنی جس معنی میں ہم یہاں عذاب لیتے ہیں اس معنی میں وہاں نہیں لیتے کہ ان قوموں پر خدا کا عذاب آ گیا پھر خدا نے ان کو عذاب میں مبتلا کیا یا خدا ان کو عذاب دے گا۔ اس وقت ذہن میں عذاب کے معنی کچھ اور ہی ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ ایک ہی اس کے معنی ہوتے ہیں۔

انسانوں کی یا قوموں کی بد عملیوں کے نتائج کے لیے قرآنِ حکیم نے سزا کا لفظ استعمال ہی نہیں کیا' ان کے عواقب کا ذکر کیا ہے اور اسے عذاب کہا ہے

عزیزانِ من! سن رکھیے کہ یہ خرابیاں' یہ بربادیاں اور تباہیاں' یہ فسادات جو پیدا ہوتے ہیں' یہ عذاب ہے یعنی عمل کے تخریبی

نتائج کی محسوس شکل کے لیے بھی عذاب ہی کا لفظ ہے۔اور ہم جسے سزا کہتے ہیں تو سزا کا تو لفظ ہی قرآن حمید کا نہیں ہے۔وہ اسے سزا نہیں کہتا' وہ اسے غلط نظام کے پیدا کردہ جتنے بھی عواقب ہیں' جتنی بھی خرابیاں ہوتی ہیں' ان کی وجہ سے جو کچھ قوموں پر بیتتی ہے' اس کے لیے وہ عذاب کا لفظ لاتا ہے۔تباہی اس کے معنی کیجیے' بربادی اس کے معنی کیجیے' خرابیاں جو معاشرے میں پیدا ہوتی ہیں' جو معاشرے میں اور افراد میں نقائص اور اسقام پیدا ہوتے ہیں' یہ ان کے معنی کیجیے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ پھر یہ کیا ہے۔

ہمارے ہاں کی مذہبی دنیا میں قوموں پر عذاب کا تصور جو قرآنِ کریم نے نہیں دیا

علاوہ ازیں جس کو ہم عذاب کہتے ہیں یا جو قرآن کریم میں لفظِ عذاب آیا ہے یا خدا کی طرف سے جو اس وقت ہوتا ہے' وہ تو قوم کی خرابیوں کی وجہ سے ہوتا ہے' ہم کہتے ہیں کہ یہ عذاب آتا ہے۔یہ ہم اس لیے کہتے ہیں کہ اس وقت عذاب کا ایک مفہوم مذہبی بھی ہوتا ہے۔تو اس وقت وہ خرابیاں جو ہم گناتے ہیں' وہ یہی ہوتی ہیں کہ صاحب! قوم نے نماز چھوڑ دی تھی' روزے چھوڑ دیئے تھے' فسق و فجور میں مبتلا ہوگئی تھی گویا اس کی وجہ سے یہ کچھ ایسا ہوا کہ انہوں نے یہ شروع کیا اور اللہ تعالیٰ کو معاذ اللہ غصہ آیا اور اس نے کہا کہ ان کو ہنٹر مارو' ان کی کھالیں اتارو' انہیں تباہ کردو' لے آؤ ایک سیلاب اور طوفان اور یہ سب کچھ کہتے ہیں۔یہ کچھ اس قسم کا تصور ہمارے ذہن میں آتا ہے۔اسی لیے ہم یہ اعمالِ صالحہ اور اعمالِ غیر صالحہ کا تعلق بھی مذہب سے ہی رکھتے ہیں۔غیر از مذہب جو باہر کی دنیا ہے' اس میں یہ الفاظ نہ بولتے ہیں' نہ ذہن میں یہ بات آتی ہے۔

اس زندگی میں قرآنِ حکیم کے نزدیک سب سے زیادہ اذیت ناک عذاب ذلت وپستی ہے جو انسانی غیر صالحہ اعمال کا نتیجہ ہے

قرآن حکیم تو سب سے پہلے اس دنیا کی بات کرتا ہے' اس کے بعد پھر زندگی کے بعد کی بات کرتا ہے۔پہلی چیز جو یہاں کی ہے' وہ یہ ہے کہ وہ یہاں انسانیت کی سطح پر زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے۔اور اسی کا ایک Sequence (سلسلہ) یا Consequence (نتیجہ) ہے جو آگے چلتا ہے۔اس کو ہم آگے چل کر پھر آخرت کہتے ہیں لیکن وہ تو اس زندگی سے ابتدا کرتا ہے۔جسے اس نے سب سے بڑا عذاب کہا ہے وہ ہے خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا(2:85) اس دنیاوی زندگی میں ذلت اور پستی کا عذاب۔اب عذاب کے معنی آپ نے سمجھ لیجیے۔تو یہ یہاں کے ہی کچھ کام ہیں جن کی وجہ سے جن کے یہ نتائج پیدا ہوتے ہیں۔جو عملِ صالح اور عملِ غیر صالح ہے اس کے متعلق بھی ہمارا ذہن صاف ہونا چاہیے۔ایک Overseer (اورسیئر) جس کو بند بنانے پر مامور کیا ہوا ہے' وہ اگر اپنے مفاد کے لیے وہاں سیمنٹ میں Proportion (تناسب) سے زیادہ ریت ملاتا ہے' یہ اس کا عملِ غیر صالح ہے۔اب یہ جو اس نے ریت کا بند بنایا

ہے وہ موج کا ایک تلاطم آئے گا تو یہ ٹوٹ کر جا گرے گا اور اس کے بعد سیلاب آئے گا تو یہ جو اس طرح تباہی آئے گی' قرآن حکیم کی زبان میں اسے عذاب کہا جائے گا۔

قرآنِ حکیم کے الفاظ میں دین و دنیا کے مفہوم کی ثنویت کے پیدا کردہ نتائج' قرآن کریم نے نظام کا تصور دے کر افراد کی ذمہ داریوں کا تعین کیا ہے

اب وہاں عملِ صالح تو یہ ہے کہ اگر وہ Overseer (اورسیئر) نماز کے وقت میں نماز پڑھ آتا ہے' روزے سے بھی ہے تو یہ تو اس کے اعمالِ صالحہ ہو گئے۔ اور یہ جو اس نے کیا ہے اس کے لیے کچھ اور لفظ استعمال کر لیجیے مثلاً اسے دنیاوی کہہ لیجیے۔ اب یہ جو بند ٹوٹ کر سیلاب آیا ہے' وہ یہ نہیں ہے کہ یہ اس اورسیئر کے عملِ غیر صالح کا نتیجہ ہے جو ہم بھگت رہے ہیں' نہ یہ کوئی خدا کی طرف سے عذاب آیا بلکہ یہ اس ثنویت کا نتیجہ' اس Dualism کا نتیجہ ہے' جو ہمارے ذہنوں کے اندر چھائی ہوئی ہے۔ ہم نے دین کو دنیا سے بالکل الگ کر رکھا ہے۔ دین کا تو محض لفظ ہی بولتے ہیں ورنہ وہ تو مذہب ہی ہے جس کو ہم نے الگ کر رکھا ہے۔ مذہب کی وہ سب بات الگ ہے۔ وہ Overseer (اورسیئر) اگر اپنے وقت میں نماز پڑھ آتا ہے اور تہجد گزار بھی ہے تو اس کے اعمال صالحہ ہیں۔ قرآنِ کریم اس کے برعکس کہتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر وہ عمل جو نظام میں' انسانی زندگی میں' تخریب پیدا کرتا ہے' وہ غیر صالح ہے۔ ہر کام جو تعمیر پیدا کرتا ہے وہ عملِ صالح ہے۔ اب ایک بگڑے ہوئے نظام کے اندر ہوتا کیا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ خود وہ نظام غیر صالح ہوتا ہے۔ اس نظام میں جو جو ذمہ داریاں کسی کو سونپی جاتی ہیں' اس میں جس طریق سے وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے' وہ غیر صالح ہوتے ہیں۔ اس غیر صالحیت کا جو نتیجہ ہے وہ اس نظام یا اس قوم یا اس ملک کے اندر آتا ہے۔

غیر صالح عمل اور صالح عمل کی محسوس شکل اور اس کا عملی نتیجہ

عزیزانِ من! ہم یہ روز چیختے ہیں کہ صاحب! یہ صفائی کرنے والے' یہ کوڑا کرکٹ اٹھانے والے' کام نہیں کرتے' یہ گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ اس سے تعفن پھیلتا ہے' فضا مکدر ہوتی ہے' اس سے بیماریاں پھیلتی ہیں' اس سے تباہیاں آتی ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے' یہ کیا چیز ہے؟ قرآن کریم کی زبان میں اسے کہیں گے تو وہ یہ ہوگا کہ اس نظام میں وہ جو عملِ غیر صالح تھا' اس سے تباہی ہوتی ہے۔ یہ آ گیا عملِ غیر صالح اور یہ جو بیماریاں پھیلی ہیں' یہ آ گیا عذاب۔ اب چونکہ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے کہ جب فضا کے اندر اس قسم کے جراثیم پھیل جائیں تو اس سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں تو یہ ٹھیک ہے کہ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہے لیکن ان کا ربط' ان کا Link (تعلق) تو آپس میں یوں ملتا ہے۔ اب یہاں ایک ایک چیز جو آپ کہتے ہیں' آمیزش کی ہو رہی ہے' کوئی خالص چیز نہیں مل

رہی' تو اس نظام کے اندر ایک ایک فرد کا یہ عملِ غیر صالح ہے۔اب اس کے نتیجے میں دوائی کی ٹکیہ' جو ڈاکٹر تجویز کرتا ہے' اس کی بجائے آپ کو چونے کی ٹکیہ ملتی ہے۔اب قوم کے اندر جو اتنی بیماریاں پھیلی ہوئی ہیں' یہ عذاب ہے۔ یہ عذاب کوئی آسمان سے از خود نہیں گر پڑتا۔ یہ غیرِ صالح نظام میں' غلط نظام میں' غلط انسانوں کے غلط کام' کے جو فطری نتائج ہیں' وہ ان تباہیوں اور بربادیوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے جسے خدا کا عذاب کہا جاتا ہے۔

انسانوں کے عملِ بد کے فطری نتیجے کے تحت ہونے والے نقصان کو خدا تعالیٰ کے غصہ کا غمّاز نہیں کہا جاسکتا' ہم نے درحقیقت خدا کو اپنے ہاں بادشاہ کا سایہ بنایا ہوا ہے۔

عزیزانِ من! میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ ہم اپنے ہاں تو روز یہ کہیں گے کہ صاحب! پوری کی پوری قوم عذاب میں گرفتار ہے' میں تو عذاب میں پھنس گیا۔اس وقت ذہن ادھر مذہب کے خدا کی طرف نہیں جاتا لیکن جونہی ہم ادھر آئے کہ فرعون کی قوم پر عذاب آیا تو ہمارے ذہن میں ایک بات آگئی کہ وہ کوئی بات آسمان کی طرف سے ہوئی اور اس طرح سے یہ چیزیں ہوگئیں۔ یہ جتنا کچھ فرعون' اس کا نظام اور اس کی قوم کر رہی تھی' وہ الگ چیز رہی۔اس کے فطری نتائج یہ نہیں ہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے معاذ اللہ Re-action (ردِ عمل) ہوتا ہے۔گویا وہ ان چیزوں کو دیکھتا ہے تو جیسے ہمارے ہاں کے حکام کی کیفیت ہے' افسروں کی کیفیت ہے کہ ایسی چیز جو ان کو ناگوار گزرتی ہے' وہ چیز ہو تو ان کو غصہ آتا ہے' غصہ آنے کے بعد پھر وہ ایک Ordinance (آرڈیننس) جاری کر دیتے ہیں یا ہنٹر ہاتھ میں لیتے ہیں۔اسی قسم کے ذہن لیے ہم نے اپنا خدا بنا رکھا ہے۔ہم نے تو یہ کہہ رکھا ہے کہ **اَلسُّلْطَانُ الْعَادِلُ ظِلُّ اللّٰهِ عَلَى الْاَرْضِ** سلطان یعنی بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔درحقیقت ہم نے خدا کو اس سلطان کا سایہ بنایا ہوا ہے۔

ہمارے ہاں خدا تعالیٰ کے تصور اور سلطان کے تصور میں مماثلت ہے۔ کیوں؟

عزیزانِ من! جس قسم کا ہمیں یہاں سلطان ''ٹکرتا'' ہے' اسی قسم کا کچھ خدا ہمارے ذہن میں ہوتا ہے۔اِس کو بھی ان چیزوں پہ غصہ آتا ہے کہ ہائیں! تم آئے اور اس طرح سے جھک کر سلام نہیں کیا' اب دیکھو میں شام تک تمہیں کیا کرتا ہوں' میں تمہارے خاندان کو کولہو میں پلوا دونگا۔غصہ آ گیا۔اسی طرح سے ہم سمجھتے ہیں کہ ہم یہ جو نماز نہیں پڑھتے' روزہ نہیں رکھتے تو خدا کو اس سے غصہ آتا ہے حالانکہ وہ قرآنِ کریم میں اپنے متعلق یہ کہتا ہے کہ اگر تم تمام کے تمام انسان بھی کفر برتنے لگ جاؤ اور ہماری ہستی سے بھی انکار کر دو تو اس سے ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ہم تو اس وقت بھی خدا تھے جب تم پیدا ہی نہیں ہوئے تھے' جب یہ کائنات بھی پیدا نہیں ہوئی تھی' ہم تو اس وقت بھی ایسا ہی خدا تھے جیسا آج ہیں۔تمہارے انکار سے ہمارا کیا بگڑتا ہے اور تمہارے اقرار سے ہمارا کیا سنورتا ہے۔اس کا اثر تو خود

تمہاری اپنی ذات پہ پڑتا ہے' ہم پہ نہیں پڑتا۔ اور پھر یہ چیز ہے کہ اگر تم اپنے صحیح کام کرتے رہو تو ہمیں تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے۔ وہ کوئی Sadistic (اذیت پسند) ہستی تو ہے نہیں کہ جسے دوسرے کو تکلیف دے کر خوشی ہوتی ہے۔ یہ Sadism (اذیت پسندی) تو ایک Psychological (نفسیاتی) مرض ہوتا ہے۔ ہم نے خدا کا یہ تصور اپنے ذہنوں میں رکھا ہے کہ جہاں انسانوں نے یہ کیا' وہ طیش میں آیا' اُسے غصہ آیا اور اس نے ملائکہ کو حکم دیدیا کہ جاؤ! اس قوم کو تباہ کر دو۔ یہ ہے ہمارا خدا کے بارے میں تصور۔

وحی سے ملنے والی راہنمائی پر عمل کرنے کی بجائے ہم سطحی باتوں پر عمل کرتے ہیں: کوٹھے پہ چڑھ کر اذانیں دینے لگتے ہیں۔

اس تصور کا نتیجہ یہ ہے کہ جب تباہی آتی ہے تو ہمارا ذہن اُدھر نہیں آتا کہ یہ جو ہم یہاں نظام کی غلطیاں کر رہے ہیں' کاروبار میں بد دیانتی کر رہے ہیں' ذمہ داریوں کے پورا کرنے میں کوتاہی کر رہے ہیں' ان کی اصلاح کریں۔ ہمارا ذہن ادھر آتا ہے کہ بھئی! کوٹھے پہ چڑھ کر اذانیں دینے لگ جاؤ۔ یعنی صحنِ مسجد میں اذان دی ہے تو وہ تو اللہ تعالیٰ نے نہیں سنی معاذ اللہ' ذرا اونچے ہو جاؤ تو سنے۔ ہمارے ہاں تو یہ محاورہ تھا ''ربا! ذرا نیواں ہو کے سُنیں'' (اے رب! ذرا نیچے آ کر سن)۔ ''نیواں ہو کے سنیں' دے اتے تے اسی ہسنے آں'' (نیچے آ کر سننے پر تو ہم ہنسی اڑاتے ہیں) اور جب ہم سے کہا جاتا ہے کہ کوٹھے پہ چڑھ کر اذانیں دو تو اس کو ہم بڑا مقدس کام سمجھتے ہیں۔ وہ نیچے نہیں آیا' ہم ذرا اونچے ہو گئے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک اصلاح نہ ہونے کی وجہ' یہ روز صبح و شام کی تباہیاں' یہ سب غلط نظام کے عواقب ہیں

عزیزانِ من! جب تک آپ کے ہاں وہ جو ثنویت کے پیدا کردہ ذہنی تصور ہیں' جس سے آپ نے دین کو اور دنیا کو دو حصوں میں بانٹ رکھا ہے' نہیں بدلیں گے' کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہ جو کچھ غلط نظام میں ان لوگوں سے ہوتا ہے' اس کی اصلاح نمازیں پڑھانے سے نہیں ہوتی۔ صلوٰۃ اگر قرآن حکیم کی صلوٰۃ ہے تو وہ انسان کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کرتی ہے کہ وہ غیر صالح کام نہیں کرتا۔ بات یہ ہے۔ یہ ہیں غیر صالح کام' جو قوموں کے اندر' دنیا کے اندر' ہوتے ہیں اور ان کے نتائج یہ ہیں جن کو تباہی یا بربادی کہا جاتا ہے۔ عذاب کا ترجمہ یہ کیجیے۔ اس تمہید کی ضرورت' یہی جو آیت ہے' اس کے لیے پڑی ہے۔ کہا ہے کہ **وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ. اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا ۚ وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ** [1] (40:45-46)۔ پہلی چیز یہ ہے کہ یہ عذاب یہیں

---

[1] اور خود قومِ فرعون کو سخت تباہی کے عذاب نے آ گھیرا۔ وہ اس دنیا میں بھی تباہی اور بربادی کے عذاب میں مبتلا رہے' جو ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ اور قیامت کے دن بھی' ان کے متعلق حکم دیا جائے گا کہ انہیں سخت عذاب میں مبتلا کرو (7:133;28:42)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 1098-99)۔

اس دنیا کے اندر ہوتا ہے۔ اب یہ جو چیز ہے کہ صاحب! صبح وشام مسلسل ان پر تباہیاں آتی رہیں تو یہ کیا تباہیاں تھیں جو آتی رہیں؟ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ یہ غلط نظام کے عواقب ہوتے ہیں۔ ابتداً شروع شروع میں چھوٹی چھوٹی کوتاہیاں ہوتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی تباہیوں کی شکل میں وہ آتی ہیں۔ جیسے وہ یہ کہتا ہے کہ ان کو مہلت دی جاتی ہے کہ اس میں یہ اپنے اندر صلاحیت یا اصلاح پیدا کر لیں۔ اصلاح کا لفظ تو ہم بولتے ہیں صلاحیت کے معنی ہم نہیں کرتے۔ پہلے پہلے اس نظام کی غلطیوں کی وجہ سے برے نظام کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی تباہیاں آتی ہیں۔ اگر وہ اسی پہ سنبھل جائیں اپنی اصلاح کر لیں تو پھر بڑی تباہی نہیں آتی۔ اور اگر وہ اس طرف کوئی توجہ ہی نہ دیں اور آگے بڑھتے چلے جائیں تو پھر یہ تباہیاں اور بڑھتی چلی جاتی ہیں تا آنکہ وہ وقت آ جاتا ہے کہ پھر ان کے بچنے کی کوئی شکل نہیں ہوتی اور وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے برباد ہو جاتی ہے۔

مادر پدر آزاد وحی خداوندی کی پابندی نہ کرنے والی قوموں کا انجام آخر ''اشدِ عذاب'' کی شکل اختیار کر جاتا ہے اور یہی فرعون اور قومِ فرعون کے ساتھ ہوا

عزیزانِ من! یہ وہ تباہی ہے جسے کہتے ہیں کہ صفحۂ ہستی سے اس کا نام ونشان مٹ جاتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ ساری کی ساری زمین میں دھنس جاتی ہے۔ قوم کا نام ونشان مٹنا تو تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ قوموں کے ساتھ جو بیتتی ہے۔ اس کے افراد بھی زندہ ہوتے ہیں ہماری طرح سانس بھی لے رہے ہوتے ہیں عذاب میں مسلسل گرفتار ہوتے ہیں۔ قوم پر یہ جو آخری تباہی آتی ہے جس میں پھر یہ اٹھ نہیں سکتی یہ اشدِ عذاب ہوتا ہے۔ یہ اس تباہی کی آخری شدید ترین شکل ہے۔ اس سے پہلے قرآن کریم کہتا ہے کہ قوموں پر چھوٹی چھوٹی سی تباہیاں آتی ہیں اور وہ اس لیے آتی ہیں کہ جسے ہم کہتے ہیں ان کو جھنجھوڑتے ہیں کہ وہ یہ خیال کریں کہ ہماری کیا غلطیاں ہیں جن کی وجہ سے نظام کے اندر یہ ہو رہا ہے۔ یہ تخریب کیوں ہو رہی ہے یہ خرابیاں کیوں پیدا ہو رہی ہیں وہ کھڑے ہو کر سوچیں۔ اس لیے یہ چھوٹی چھوٹی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ جو پہلے دن تھوڑا سا درد ہوتا ہے اسی وقت اگر آدمی ڈاکٹر کے پاس چلا جائے طبیب کے پاس چلا جائے اور دیکھ لے کہ کیا ہوا ہے تو وہ پھر بڑے درد سے اور موت سے بچ سکتا ہے۔ یہ چھوٹا سا جو درد ہے یہ وہ ابتدائی چیز ہے اور یہ نظام خدا کی طرف سے بہت بڑی چیز ہے۔ اور پہلے ہی دن اگر تھوڑا سا ایک لقمہ غلط کھا لینے سے اسی وقت موت واقع ہو جائے تو اصلاح ہی نہیں ہو سکتی۔ اس سے تھوڑا سا پیٹ میں درد ہوتا ہے اس کا علاج ہو جاتا ہے لیکن اگر آپ ادھر توجہ نہ دیں تو وہی Food Poisoning (زہریلی غذا) بھی بن سکتا ہے۔ یہ ہے جو قرآن حکیم کہتا ہے کہ ان قوموں پر پہلے چھوٹی چھوٹی سی تباہیاں آتی ہیں۔ ہر بار ان سے کہا جاتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب یہ آتی ہیں تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یا اللہ! اگر اس میں سے تُو ہمیں بچا لے تو آئندہ کے لیے دیکھ ہم کتنے نیک بن جاتے

ہیں۔اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ان کو انتباہ ہوتا ہے' اس کا احساس ہوتا ہے کہ ہمیں اس کی اصلاح کرنی چاہیے لیکن وہ کہتا ہے کہ وہ تھوڑی سی اصلاح کرنے کے بعد پھر جب پہلی حالت آ جاتی ہے تو پھر وہی کچھ کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ ہے جو قرآن حکیم نے نظام بتایا ہے۔اب اس فرعون کے متعلق جو کہا کہ یہاں اسی دنیا کے اندر مسلسل دن رات ان پر کچھ عذاب آتا تھا۔دوسرے مقام پہ قرآن حکیم نے گنایا ہے کہ وہ کس شکل میں عذاب تھا۔

انسانی معاشرے کی بربادی کا ماخذ اُن کے ہاں نافذ غلط نظام ہوتا ہے جس میں حکمران طبقہ اپنی سرکشی سے باز نہیں آتا

یہ ''عذاب'' میں قرآن حکیم کا ہی لفظ بول رہا ہوں' آپ اس کے لیے ''تباہیاں'' کہیے۔آپ ذہن میں یہ رکھیے کہ یہ قوم کے اندر تباہیاں اور خرابیاں آتی تھیں' بربادیاں پیدا ہوتی تھیں۔ یہ کس کس شکل میں چیزیں آتی تھیں' انہیں میں غلط نظام کی پیدا کردہ چیزیں کہہ رہا ہوں لیکن ہمارے ہاں جب ان کو گنایا جاتا ہے تو کہا یہ جاتا ہے کہ آسمان سے یہ چیزیں آتی تھیں مثلاً (7:133) میں کہا ہے کہ ''اُن پر طوفان آئے۔ٹڈی دَل نے تباہی مچائی۔فصلوں کو برباد کرنے والے کیڑے پیدا ہوئے۔مینڈکوں کی کثرت ہوگئی۔فسادِ خون کی بیماریاں رُونما ہوگئیں''۔ یہ سب کھلی کھلی علامات تھیں اس بات کی کہ جب ملک کا نظام صحیح خطوط پر متشکل نہ ہو تو وہاں اس قسم کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں اور اربابِ نظم و نسق اپنی عیش پرستیوں میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ انہیں اس طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔قوم پر اس قسم کی مصیبتوں کے باوجود' اُس کا حکمران طبقہ اپنی سرکشی سے باز نہ آتا۔وہ درحقیقت تھا ہی مجرموں کا گروہ! جو کچھ ملک میں ہو رہا تھا' وہ انہی کے جرائم کا نتیجہ تھا۔میں نے کہا ہے کہ ان کی آخری تباہی سے پہلے یہ چیزیں وہاں پیدا ہوتی تھیں۔کہا ہے کہ **فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمُ الطُّوۡفَانَ** (7:133) اُن پر سیلاب آتے تھے۔اب ہمیں پتہ ہے کہ سیلاب کیوں کسی قوم پہ آتا ہے؟ یہ وہی کچھ ہے جو بند میں سیمنٹ کی جگہ ریت لگی ہوئی ہوتی ہے۔

تعمیرِ ملت کے سلسلہ میں ہالینڈ کی پُرعظیم صلاحیتوں کی ایک مثال

ہم سے تو ایک دریا نہیں سنبھالا جاتا' ہمارے ہاں ہر سال تباہیاں مچتی ہیں۔ ہالینڈ ❶ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ زمین' جہاں ان کا

---

❶ یہ شمال مغربی یورپ کی ایک سلطنت ہے۔اس کا پرانا نام سلطنتِ نیدرلینڈز ہے۔ یہ ایک نچلی سطح کا (Low-lying) علاقہ ہے جس کا کثیر حصہ سمندر کو پیچھے دھکیل کر نکالا گیا ہے۔آج بھی اس کی سرزمین کا 40 فیصد سے زیادہ حصہ سطح سمندر سے نیچے ہے۔ یہ ایک زرعی ریاست ہے۔گورنمنٹ کے زیادہ تر انتظامی دفاتر ہیگ (Hague) میں واقع ہیں۔اس کا دارالحکومت ایمسٹرڈم ہے۔اس کی آبادی کا گراف 14,300,000 افراد تک ہے اور رقبہ 13,055 مربع میل ہے۔(Reader's Digest (1990). Universal Dictionary.NJ.P.1036)

ملک ہے' وہ سطحِ سمندر سے نیچے ہے۔ وہ پانی کا ایک قطرہ اُدھر سے اِدھر نہیں ٹپکنے دیتے اور ہر سال سمندر کو پیچھے ہٹا کر اپنے ملک کا رقبہ وسیع کرتے چلے جاتے ہیں۔ اِدھر ہمارے ہاں ہر سال کوئی نہ کوئی گاؤں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ ایک صحیح انتظام ہے جو وہاں ہوا ہے۔ وہاں کا Overseer (اورسیئر) سیمنٹ میں ریت نہیں ڈالتا ہوگا۔ وہاں یہ کیوں نہیں ہوتا؟ اس لیے کہ یہ ان کا انتظام ہے۔

قرآنِ کریم میں مختلف قوموں میں مختلف مصائب کا تذکرہ جن کے علاج کی وہ تدابیر نہیں کرتی تھیں

کہا ہے کہ ان پر سیلاب آتے تھے۔ اور وَ الْجَرَادَ (7:133) ٹڈی دَل آتا تھا۔ ٹڈی دَل کا تو آپ کو پتا ہے کہ یہ مکڑیاں فصل کو کیا کرتی ہیں۔ یہ عربوں کے ہاں کی زبان عجیب چیز ہے۔ اس میں یہ ایک لفظ جَـــرَادَ ہے۔ یہ ''تنہا رہ جانا' اکیلا رہ جانا' تباہ ہو جانا' ساتھ کوئی نہ ہونا'' اس کے لیے یہ لفظ ہے۔ مجرد کا لفظ تو آپ نے سنا ہوگا' یہ جراد کا لفظ وہیں سے ہی ہے۔ مکڑی جو کچھ کرتی ہے آپ کو معلوم ہے۔ مکڑیاں آتی تھیں' ٹڈی دَل آتا تھا۔ یہ بھی ایک عذاب کی شکل ہے۔ اتنی اتنی بڑی فصلیں اس طرح سے اجڑتی ہیں کہ ایک پتی کا نشان تک نہیں رہتا۔ یعنی یہ کرۂ ارض کا اتنا بڑا بین الاقوامی عذاب ہے کہ قوموں کو مل کر اس کے متعلق تدبیریں سوچنی پڑ رہی ہیں۔ وہ جو اب سپرے وغیرہ کرتے ہیں وہ کسی ایک ملک تک محدود نہیں رہتا۔ مختلف قوموں نے' ملکوں نے' مل کر اس کے لیے تدبیر کرنا شروع کی۔ یہ اتنا بڑا عذاب ہوتا ہے۔ وہاں غلط نظام تھا' اس کی تدبیر وہ نہیں کرتے تھے' وہاں مکڑیاں آتی تھیں' ٹڈی دَل آتا تھا۔ وَ الْـقُـمَّـلَ (7:133)۔ ہمارے ہاں ترجموں میں تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ان کو جوئیں پڑ جاتی تھیں۔ یہ کونسی ایسی چیز ہے کہ جس کا علاج نہ ہو سکے۔ خدا کی طرف سے عذاب آئے ''تے جوں دا کی ہیگا'' (جوں کا کیا ہوتا ہے)۔ یہ الْـقُـمَّـلَ فصلیں چاٹنے والے کیڑے ہوتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں یہاں ان لوگوں نے کتنی مہم شروع کر رکھی ہیں' اور یہ جو فصلوں کو چاٹنے والے کیڑے ہوتے ہیں' ان کی وجہ سے ہماری فصلوں پہ کتنی تباہیاں ٹڈی دَل سے آئیں۔ اب توجہ دینی شروع کی ہے' ہم اصلاح کر رہے ہیں۔

عزیزانِ من! ''اصلاح کر رہے'' کے لیے عملِ صالح کہیے۔ لیکن کیسے کہیں! اس کا تو تصور ہی ہمارے ذہن میں کچھ اور ہے وَالْقُمَّلَ کے بعد کہا ہے کہ وَ الضَّفَادِعَ (7:133) مینڈکوں کے لشکر آنے شروع ہو گئے۔ اب یہاں تو غنیمت ہے کہ یہ چیز اتنی نہیں پیدا ہوتی۔ جن ممالک میں یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں' مینڈک تو ایک طرف چیونٹیاں ہی تباہی لے آتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سیلاب کی طرح آتی ہیں۔ وہاں یہ پیدا ہونی شروع ہوئیں۔ آگے ہے کہ وَ الـدَّمَ (7:133)۔ اب ہمارے ہاں تو یہ خون کے لیے کہا کہ آسمان سے بارش کی بجائے خون ٹپکا کرتا تھا۔ ارے بھئی! یہ خرابیِ خون کی بیماریاں ہیں۔ سیدھی سی بات ہے۔ کسی طبیب کے پاس جائیے اور جا کر دکھائیے کہ صاحب! ذرا ذرا سے دانے نکلنے لگ گئے' وہ کہتے ہیں کہ خون کی خرابی ہے۔ کہا کہ یہ چیزیں اس قوم کے اندر

پیدا ہونے لگ گئیں۔اب اس کے بعد اس نے کہا یہ ہے کہ یہ چیزیں پیدا ہو رہی تھیں۔اگر وہ ذرا بھی اپنے ہاں کے نظام کی اصلاح کر لیتے تو یہ خرابیاں اور تباہیاں آگے نہ بڑھتیں۔

قوانین کی سرکشی کی بنا پر مجرم قوم پر تباہی کا عذاب' لفظ جرم کا مفہوم اور اکابرین و متبعین کے مابین مکالمہ آرائی کا عجیب نقشہ

عزیزانِ من! اربابِ نظم و نسق نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔قوم پر اس قسم کی مصیبتوں کے باوجود فَاسْتَكْبَرُوْا (7:133) انہوں نے ان قوانین کی طرف سے سرکشی برتی۔وہ قوت کے نشے میں اتنے بدمست تھے کہ ان چیزوں کی طرف ان کی نگاہ ہی نہیں اٹھی تھی۔باہر یہ سب کچھ ہو رہا تھا مگر ان صاحبِ اقتدار کے ہاں تو یہ کچھ نہیں ہو رہا تھا' وہ تو اپنے محل کے اندر تھے' وہاں صفائیاں بھی ہو رہی تھیں' کوڑا کرکٹ بھی اٹھ رہا تھا' وہاں مکڑی بھی نہیں آتی تھی' کوئی مینڈک بھی نہیں آتا تھا' وہاں انسان تک نہیں رہائی پا سکتا' مینڈک کیا آتے۔وہ یہ انتظام ہی نہیں کرتے تھے بلکہ فَاسْتَكْبَرُوْا (7:133) ان عام قوانین کی جو' ان میں اصلاح پیدا کر دیتا' وہ سرکشی برت رہے تھے۔اس لیے وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (7:133) وہ قوم کی قوم ہی مجرم تھی۔

اب جرائم کے معنی یہاں دیکھیے کہ کیا آ گئے؟ یہاں ہمارے ہاں تو یہ جو جرائم پیشہ لوگ ہیں یا جو جرم ہے' وہ یہ ہے کہ وہ عام قانون کی دھجیاں اڑانے والے ہیں۔ان کے متعلق ہی کہتے ہیں کہ وہ جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ہم جو اپنے گھر کا کوڑا باہر سڑک پہ پھینک دیتے ہیں' اس کو ہم کبھی نہیں کہتے کہ ہم نے جرم کیا ہے۔اور استکبار کے ساتھ (طاقت کے زور پر) جو قوم کی قوم کو مجرم کہا ہے تو کیا بات ہے صاحب قرآن کریم کی اور عربی زبان کی! یہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ قوت کے زور پر ان کو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوتا اور یہ قوم پھر خود محنت نہیں کرتی۔عربی زبان میں جرم کے معنی ہوتے ہیں ''دوسرے کے گھر کے درخت کی شاخ ادھر آ جائے تو جو اس کا پھل ہے اس کو کاٹ لینا''۔دوسرے کے درخت کے پھل کو کاٹ کر لے جانے کو جرم کہتے ہیں۔یہ جو استکبار والی' قوت والی اور استبداد والی قوم ہوتی ہے وہ یہ کرتی ہے کہ بیج کوئی بوتا ہے' کاٹ کر کوئی لے جاتا ہے:

دانہ آں می کارد' آں حاصل بُرد

اس کو عربی زبان میں جرم کہتے ہیں کہ کوئی بوئے اور دوسرا کاٹ کر لے جائے۔اب یہ جو صورت پیدا ہو جائے کہ بونے کی ساری محنت تو کوئی اور کرے اور استکبار کے زور پر یہ فصل کاٹ کر اپنے گھر میں لے آئیں۔تو اب ان میں محنت کرنے کی صلاحیت ہی نہ رہی۔اور انتظام تو محنت چاہتا ہے۔اس لیے معاشرے میں' ملک کے اندر' قوم کے اندر' بدنظمی پھیلتی چلی جاتی ہے کیونکہ یہ قوت کے نشے میں

بدمست ہوتے ہیں اور دوسروں کی محنت پر خوش گپیاں کرتے ہیں' رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ یہ ہے قوم المجرمین۔

اب اس کے بعد کہا کہ یہ چیزیں آتی رہیں۔ انہوں نے اس انتباہ سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا' اپنی کوئی اصلاح نہ کی۔ اس اصطلاح میں ان کے اعمال غیر صالحہ رہے اور وہ اسی طرح سے بڑھتے چلے گئے۔ اور اس کے بعد وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (40:46) جب وہ جسے آخری انقلاب کہتے ہیں' آتا ہے تو پھر وہ آخری تباہی آجاتی ہے۔ اس آخری تباہی کو یہاں اَشَدَّ الْعَذَابِ کہا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی تباہیاں تھیں' جن میں مہلت کا وقفہ تھا' اصلاح کی گنجائش تھی' ابھی وہاں تک حالت نہیں پہنچی تھی کہ وہ مرض ناقابلِ علاج ہو جائے۔ وہاں تک مرض قابلِ علاج تھا' حملے بار بار ہوتے تھے لیکن وہ پروا نہیں کرتے تھے۔ اب بجائے اس کے کہ وہ قانون کی پابندی کریں' وہ اس سے سرکشی برتتے تھے۔ عام مرض میں' آپ یہ کر کے دیکھ لیجئے' ڈاکٹر کی ہدایات کی پروا نہ کیجیے اور اسی قسم کی بدپرہیزیاں کرتے چلے جائیے۔ اس کے بعد اَشَدَّ الْعَذَابِ کی نوبت آجائے گی۔ یہی چیزیں قوموں میں ہوتی ہیں۔ اب وہ یہاں آیا جو قرآن کریم نے متعدد بار پہلے بھی ایک مثال کے طور پہ بتایا ہے کہ جب وہ تباہیاں آتی ہیں تو اس وقت پھر یہ جو اکابرین ہوتے ہیں' جو لیڈرز ہوتے ہیں' جو بڑے بڑے صاحبِ ثروت و قوت ہوتے ہیں اور ان کے جو Followers (متبعین) ہوتے ہیں' وہ آپ کو یاد ہوگا قرآن کریم میں کئی مواقع پہ یہ چیز آئی' ان کے آپس کے مکالمے تو بڑی ہی عبرت ناک چیز ہے۔ وہ قرآن حکیم میں مختلف مقامات میں آئے ہیں' ان کو اکٹھا کیجیے تو عجیب نقشہ سامنے آتا ہے۔ اِن Followers (عوام) اور ان کے لیڈر یا حکام اور ان کی رعایا کے مابین عجیب نقشہ سامنے آتا ہے۔ یہاں بھی اسی کے متعلق ایک آیت آئی ہے۔

السَّاعَةُ کا مفہوم' دنیا اور آخرت کی ثنویت اور اُس کا اثر

اب یہ جو السَّاعَةُ ہے' ہمارے ہاں تو اس کا ترجمہ وہی آخری قیامت کیا جاتا ہے مگر یہی جو یہاں آخری تباہی آتی ہے' وہ پھر اچانک آتی ہے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ آخر الامر یہ بھی ہو جائے گا کہ ہمارا تختہ ہی الٹ جائے گا۔ وہ ہے السَّاعَةُ جو آتی ہے۔ کہا ہے کہ اس ساعت کے آنے کو جہنم سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ یہ میں یہاں کی بات کہہ رہا ہوں۔ یہ یاد رکھیے! وہ آخرت کی زندگی کے بارے میں جو قرآن حمید نے کہا ہے' اس پہ ہمارا ایمان ہے لیکن یہاں ہر چیز کو وہاں آخرت تک اٹھا رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم یہاں اپنی اصلاح ہی نہیں کر سکتے۔ وہاں کے معاملے کو تو ہم نے الگ ہی رکھ چھوڑا ہے اور یہاں کے معاملات پر غور ہی نہیں کرتے۔

دین و دنیا کے معاملات کو دو حصوں میں تقسیم کرنا' قرآنِ حکیم کی مجموعی تعلیم کے خلاف ہے اور اس سے اکابرین و متبعین دونوں متاثر ہوتے ہیں

عزیزانِ من! مذہب کی دنیا میں یہ سیمنٹ میں ریت ڈالنا دنیاوی کاروبار ہے اور یہ نماز نہ پڑھنا آخرت کی بات ہے۔ نماز پڑھ لی

تو وہ آخرت والی بات سنور گئی۔ یہاں کا معاملہ یہاں کے ساتھ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایسا انتظام کرلو کہ گرفت نہ ہو سکے' اس کے لیے اوپر والے کو ساتھ ملاؤ یا سیلاب آنے سے پہلے ہی ایک سیلاب ادھر ڈال دیجیے' وہ سیمنٹ میں ریت سارے کا سارا بہہ جائے ''ہاتھی معہ ہودہ غائب'' نشان ہی مٹ جاتا ہے۔ یہ جو دریاؤں اور نہروں کے بند ہوتے ہیں' ان کا ثبوت ہی نہیں ملتا کہ اس میں مسالہ کیا لگا تھا' وہ سیلاب میں بہا دیتے ہیں۔ وہی ثنویت ہے۔ کہا ہے کہ اُس وقت جب یہ انقلاب آتا ہے' تختہ الٹتا ہے تو یہ جو اُس سے پہلے بڑے بڑے اکابر تھے' کسی جگہ ان کو محض لیڈر کہا ہے' کسی جگہ صاحبِ قوت کہا ہے' وہ سارے اُس میں آ جاتے ہیں' اور ان کے جو Followers (متبعین) ہیں یا ان کے جو محکوم ہوتے ہیں' وہ ان کو کمزور کہتا ہے' وہ بھی اُس میں آ جاتے ہیں' وہ دونوں متاثر ہوتے ہیں۔

ظالمین کی پیدا کردہ تباہی اور بربادی محکوم قوم میں انقلابی جرأت پیدا کر دیتی ہے

قرآن مجید نے کہا ہے کہ جب بھگدر مچتی ہے تو پہلے ان کے ہاں جو جلال تھا' استکبار تھا' رعب و داب تھا' وہ اٹھ جاتا ہے۔ محکوم بھی اور حاکم بھی دونوں ہی عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں۔ پھر ان محکوموں کو جرأت ہو جاتی ہے کہ ان سے کھل کر بات کر سکیں۔ دیکھا قرآن مجید کیسا نقشہ کھینچتا ہے! کہتا ہے اس وقت جب یہ قوم السَّاعَةُ میں' اَشَدَّ الْعَذَابِ میں' گرفتار ہوتی ہے تو وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا (40:47) اُس جہنم میں لوگ ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں' جب اس تباہی کے عذاب میں انقلاب آتا ہے تو پھر یہ لوگ جو محکوم تھے' جن کو انہوں نے کمزور کر رکھا تھا' ان میں یہ جرأت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ جو اپنے آپ کو بڑے صاحبِ استکبار کہا کرتے تھے اور قوت والے تھے وہ ان سے دو بدو بات کر سکیں' جھگڑ سکیں۔

ظہورِ نتائج کے وقت لیڈرانِ قوم کے مابین باہمی گفتگو کی ایک تصویر اور دروس کے ٹیپس کو شارٹس ہینڈ رائٹ کرنے کی ایک پہلے کی کوشش

وہ متبعین ان اکابرین سے کہتے تھے کہ تم تو ہمیں یہ کہتے تھے کہ تم بے فکر رہو' تم پر کسی قسم کا کوئی ضعف نہیں آئے گا' کوئی نقصان نہیں پہنچے گا' کوئی خطرہ نہیں ہوگا' سب خیر ہی خیر ہے۔ تم ہمیں یہ تسلیاں دلایا کرتے تھے' اس طرح سے اطمینان دلایا کرتے تھے تو اب یہ جو تباہی آئی ہے تو اس کو دور کرو۔ ہم تو اس تباہی کے اندر پھنسے ہوئے ہیں' اب اپنے وعدے پورے کرو۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں یہ کہیں گے کہ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ (40:47) ہم تمہارے تابع تھے۔ کیا تم اس عذاب کا کچھ حصہ ہم سے دور نہیں کر سکتے؟ پورے کا پورا عذاب نہیں' کسی حد تک تو ہماری حفاظت کرو۔ اس پر قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ (40:48) ان کے وہ لیڈرز' اکابرین کہیں گے کہ ہم تمہاری کیا مدد کریں' اب تو تم بھی ہم بھی' سب اس تباہی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہم اپنی مدد نہیں

کر سکتے، تمہاری مدد کیا کریں گے۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ دیکھا! ایک جھٹکے میں پتا چل گیا کہ وہ جو اپنے آپ کو اتنی قوتوں کے مالک سمجھا کرتے تھے اور ان کمزوروں کو، ان متبعین کو اس طرح دھونس دیتے تھے، آج ان کی کیفیت یہ ہے کہ اعتراف کیے بغیر بن نہیں رہی کہ ہم بھی اسی تباہی کے اندر محصور ہیں، ہمارا تمہارا حال ایک ہی جیسا ہو گیا ہے۔ کہنے لگے کہ دونوں اس تباہی کے اندر آ کر برابر ہو گئے اور **اِنَّ اللّٰہَ قَدْ حَکَمَ بَیْنَ الْعِبَادِ** (40:48) یہ انسانوں کے اعمال کے متعلق خدا کے فیصلے ہیں۔ ان میں ردوبدل کرنے کی کسی کو مجال نہیں ہے۔ ہماری بڑائیاں سب ختم ہو چکی ہیں۔ یہ فیصلے خدا کے قانون کے مطابق ہوئے ہیں، ہمارے قانون کے مطابق نہیں ہوئے کہ ہم تمہیں معافی دیدیں۔ کیا بات ہے قرآن کریم کی! کہ وہ جو قانونِ فطرت کے مطابق تباہی آتی ہے تو پھر اس وقت ان انسانوں کی یہ فسوں سازی کسی کام نہیں آتی۔

تدبر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

تدبر کی جو فسوں سازیاں ہیں، پھر وہ اس وقت کچھ نہیں کر سکتیں۔ کس انداز سے قرآن کریم نے کہا ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ قَدْ حَکَمَ بَیْنَ الْعِبَادِ** (40:48)۔ یہ **قَدْ** خوب ہے۔ کہا ہے کہ **بَیْنَ الْعِبَادِ** (40:48) یہ خدا کے قانون کے مطابق فیصلے ہوئے ہیں۔ اس میں تم اور ہم دونوں برابر ہیں۔ یہ ان کی باہمی باتیں ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ کئی ایک مقامات میں یہ بات ہو چکی ہے۔ اگر آپ کے سامنے قرآنِ کریم کے نسخے ہوں تو آپ ان چیزوں کو لکھ لیا کریں، اس کے بعد آپ کو قرآن کریم کا سمجھنا بڑا آسان ہو جائے گا لیکن یہ تو ہمارے ہاں بھی اب جو لوگ سنتے بھی ہیں، معاف رکھیے گا ان کی بھی صورت ایسی ہے جیسی رات کو سوتے وقت ہم نانی اماں سے کہانیاں سنا کرتے ہیں ورنہ درس کے معنی یہ ہیں کہ "بار بار، بار بار اس کو دہرایا جائے، اس کو نوٹ کیا جائے، اس کے اشارات لکھے جائیں"۔ وہاں کراچی کے درس میں تو یہ صورت تھی۔ ایک صاحب تھے وہ پورے کا پورا جو درس تھا، اس کو ریکارڈ کرتے چلے جاتے تھے۔ وہ اتنا تیز لکھتے تھے۔ بہر حال اب بھی اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ایک ایسا رفیق ❶ ملا ہوا ہے کہ وہ اس درس کے ٹیپ کو شارٹ ہینڈ رائٹ کرتے ہیں۔ اب تو ان کی بڑی عمر ہے، وہ میرے ہی ہمعصر ہیں۔ وہ دس بارہ پندرہ سال سے اس پر لگے ہوئے ہیں۔ وہ ہر ایک ٹیپ کو Short Hand (اختصار نویسی) میں لیتے ہیں، پھر Transcribe (لفظ بلفظ نقل) کرتے ہیں، پھر اس کو ٹائپ کرتے ہیں، پھر اس کی تصحیح کرتے ہیں۔ سارے درس انہوں نے اس طرح سے محفوظ کیے ہوئے ہیں ❷۔ درس کا فائدہ یہ ہے۔

---

❶ یہ اشارہ ملک ظہور احمد صاحب مرحوم کی طرف ہے جو بزمِ طلوعِ اسلام راولپنڈی کے نمائندہ تھے۔

❷ لیکن افسوس کہ ٹرسٹ کے معتبر ذرائع کے مطابق، مرورِ زمانہ کے ہاتھوں ان میں سے اب 70 فیصد دروس کہیں بھی نہیں مل پا رہے۔ بہر حال خدائے علیم وخبیر کا یہ احسانِ عظیم ہے کہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور محترم پرویزؒ کے دروس کو قرطاس پر لانے میں مصروفِ کار ہے اور امید ہے کہ یہ سلسلۂ دراز تقریباً 45 جلدوں میں مکمل کر لیا جائے گا۔

لیڈرانِ قوم کی' جیل خانہ جات کے ملازمین سے درخواست اور ان کا جواب اور ادھر'' آج قانون ہے کہ ملتا ہی نہیں''

اب اگلی بات وہ کہتا ہے کہ اس تباہی میں وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ (40:49)۔ کہتا ہے کہ وہ تو جیل خانے میں ہونگے' تو وہاں یہ جو اس زمانے میں جیل والوں کے اتنے بڑے حاکم بنے پھرتے تھے' وہ وہاں ان کی منتیں کریں گے' کہیں گے کہ اپنے پروردگار سے درخواست کرو کہ وہ اس عذاب میں کچھ وقت کے لیے ذرا کمی کردے۔ وہ کہیں گے کہ صاحب! ہمارے بس میں تو کچھ ہے نہیں' ہم ذرا سی رعایت دیں تو ہم خود اس میں محبوس ہوجائیں۔ وہ ان سے کہیں گے کہ خدا سے ہماری طرف سے درخواست کرو کہ پوری سزا نہیں تو سزا میں کچھ تخفیف ہی کردیں مگر رکھیں جیل کے اندر ہی' بی کلاس ہی دیدیں۔ یہ ہے تخفیف اور یہ ہے مِّنَ الْعَذَابِ (40:49)۔ یہ ہمیں پتا ہے کہ جرم اتنے بڑے ہیں کہ یہ تو ہے نہیں کہ پوری کی پوری معافی مل جائے لیکن کچھ تو رعایت مل جائے۔ تم خدا سے کہہ دو۔ اس کا جواب آتا ہے کہ قَالُوْٓا (40:50)۔ یہاں بڑی عمدہ بات ہے۔ آپ کو یاد ہے میں نے بتایا تھا کہ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ کوئی قوم تباہ نہیں ہوتی' یا اس کے الفاظ یہ ہیں کہ کسی قوم کو ہم تباہ نہیں کرتے جب تک دو باتیں نہ ہوں۔ ایک تو یہ کہ قوانینِ خداوندی ان تک پہنچ نہ پائیں' پہنچ ہی نہ سکیں۔ اور دوسرے یہ کہ ان کی ذہنی سطح اتنی اونچی نہ ہو کہ وہ اس کو سمجھ سکیں۔ عذاب میں تو وہ قوم پھنستی ہے جس کی ذہنی سطح اتنی اونچی ہے کہ وہ اس چیز کو سمجھ سکے۔ اور دوسری چیز یہ ہے جو خدا نے اپنے ذمے لیا ہے کہ قانون ان تک پہنچ جائے۔ یہ جو Ignorance of Law is no Excuse [1] ہے' یہ یہاں کی بات ہے کہ قانون سے ناواقفیت کوئی عذر نہیں ہے۔ یہ عذر کیوں نہیں ہے؟ اس لیے کہ قانون نافذ کرنے والوں کا فریضہ ہے کہ وہ ہر ایک تک قانون پہنچائیں' اس کے بعد وہ ان کو محبوس کرسکتے ہیں لیکن یہاں تو ان سب کا فریضہ یہ رکھا گیا ہے کہ وہ معلوم کرتے پھریں کہ صاحب! کونسا قانون کہاں ہے؟ مگر وہ قانون ہے کہ ملتا ہی نہیں ہے۔

سزا اور جزا کے قوانین سے مکمل آگاہی کا اتمامِ حجت تک ہونا ضروری ہے اس کے بعد معافی کی درخواست چہ معنی دارد

قرآن حمید نے یہ کہا ہے کہ یہ دو شرطیں پوری ہونا نہایت ضروری ہیں کہ وہ قانون ان تک پہنچا ہو اور پھر ان کی ذہنی سطح اتنی بلند ہو کہ وہ

---

[1] اغماضِ قانون کوئی بہانہ نہیں۔

اس کو سمجھ سکیں۔ اگر یہ نہ ہو تو ان کو سمجھاؤ۔ جب یہ دو شرطیں پوری ہوتی ہیں تو کہتا ہے کہ پھر وہ محبوس ہو سکتے ہیں۔ **قَالُوٓا اَوَ لَمۡ تَکُ تَاۡتِیۡکُمۡ رُسُلُکُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ** (40:50) کہا کہ کیا تم تک خدا کے یہ پیغامبر' جو یہ بتانے والے تھے پہنچے نہیں تھے؟ بتاؤ تم تک قانون پہنچا تھا یا نہیں؟ **قَالُوۡا بَلٰی** (40:50) کہیں گے کہ ہاں! یہ تو ہے' قانون تو ہم تک پہنچ گیا تھا۔ کہا تو پھر یہ کیا ہوا؟ **قَالُوۡا فَادۡعُوۡا وَمَا دُعٰٓؤُا الۡکٰفِرِیۡنَ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ** (40:50) وہ یہ کہیں گے کہ جب یہ اتمامِ حجت ہو چکا' تو ہم کس منہ سے تمہاری طرف سے جا کر خدا کو درخواست کریں کہ ان کو معاف کر دو۔ خود ہی دعا کرو' خود ہی خدا کو پکارو' ہم تو بیچ میں نہیں آتے۔ یہ بڑا عجیب انداز ہے۔ اس نے تو یہ اتمامِ حجت کر دی تھی' تم تک قانون پہنچ چکا تھا۔ تو بتاؤ کہ ہم کیا چیز تمہاری طرف سے جا کر خدا کے ہاں معذرت کے طور پر پیش کریں۔ تم خود ہی اس کو پکارو' خود ہی براہِ راست درخواست بھیج دو' پھر جواب مل جائے گا۔ ہم تو یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ پھر اس کی طرف جائیں۔ وہ کہنے لگا کہ **وَمَا دُعٰٓؤُا الۡکٰفِرِیۡنَ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ** (40:50) ان لوگوں کی اس قسم کی درخواستیں وغیرہ اس وقت کیا کام دیں گے' یہ کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ ان کے لیے کسی مدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قرآنِ حکیم حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کے سلسلہ میں حق کے باطل پر غالب آنے کی ایک روشن اور واضح مثال پیش کرتا ہے

عزیزانِ من! اب اس کے ساتھ بڑی عظیم آیت آئی ہے۔ یہ تو ان کا حال ہے جو یہ مجرمین ہیں' ان قوانین سے سرکشی برتنے والے ہیں' جانتے بوجھتے' دیدہ دانستہ ان سے اعراض برتنے والے ہیں۔ خدا کے پاس ان کی درخواست نہیں پہنچ سکے گی' قبول نہیں کی جا سکے گی۔ اس کے مقابل میں وہ لوگ ہیں جو ان قوانین کی پابندی کرتے ہیں۔ ان کا ان لوگوں کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے جو سرکشی برتنے والے مستبد قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ حق و باطل کی کشمکش کا یہ ٹکراؤ تو ہوتا رہتا ہے۔ داستان بھی یہی آ رہی ہے کہ ایک طرف یہ قومِ بنی اسرائیل' حضرتِ موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام ہیں اور دوسری طرف یہ قوم ہے اور ان کا ٹکراؤ ہے۔ یہ مومنین کی قوم ہے' وہ سرکشی برتنے والوں کی قوم ہے۔ عزیزانِ من! یہ بڑی غور طلب چیز ہے جو آئی ہے۔ کہا ہے کہ **اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا** (40:51)۔ **لَنَنۡصُرُ** کے معنی صرف مدد کرنا ہی نہیں ہوتا' اس کے معنی ''کسی کو غالب کرنا'' ہوتا ہے۔ ہم اس کشمکش کے اندر' جو باطل کے ساتھ ہمارے رسولوں کی اور ان ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان لانے والوں کی ہوتی ہے' کے مددگار بنتے ہیں۔ پہلے معنی لیجیے تو ہم ان کی مدد کرتے ہیں اور مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جس کی خدا مدد کرے تو وہ غالب آ تا ہے۔ یہ غالب آتے ہیں۔

بنی اسرائیل کی مختصر سی آبادی اور عالمِ اسلام کی حدتک ایک جمِ غفیر کی حالتِ زار اور جہاد کی تشریح و صراحت کا نتیجہ

عزیزانِ من! اب اگر ان سے پوچھا جائے کہ صاحب! آپ روز رونا روتے ہیں کہ یہ جتنی بھی نام کی مسلمان قومیں ہیں' اسرائیل کی چڑیا سے بھی چھوٹی ایک سلطنت ان کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔یعنی اسرائیل کی ساری آبادی لاہور شہر جتنی بھی نہیں ہے اور مراکش سے انڈونیشیا تک یہ نوے کروڑ یا ایک ارب کے قریب مسلمان ❶ ہیں۔آپ دیکھیے کہ یہ کیا ہورہا ہے؟ وہ بڑھتے چلے جاتے ہیں' چڑھتے چلے جاتے ہیں' ان کو جرأت نہیں ہوتی کہ یہ ان کے خلاف کچھ لفظی اعلان ہی کرسکیں۔حال ہی میں ہونے والی ایک کانفرنس میں کہا ہے کہ ہاں صاحب! ایک Resolution (قرارداد) پاس کیا ہے کہ یہ طے کیا ہے کہ اس کے خلاف جہاد کیا جائے گا۔دوسرے دن آکر انہوں نے کہا کہ صاحب! اس قرارداد کی تاویل سن لیجیے۔اب یہ ڈر گئے کہ وہ کہیں گے کہ یہ جنگ کرنے لگ گئے ہیں اور وہ کہیں پہلے ہی نہ حملہ کردیں۔تاویل میں کہا کہ جہاد تو کوشش کو کہتے ہیں' ہم ہر قسم کی کوشش کریں گے:

میری قرآن دانی سے خفا کیوں ہوگئے صاحب!
مجھے تفسیر بھی آتی ہے' اپنا مدعا کہیے

یعنی ریزولیوشن میں وہ لفظ آیا تو کچھ تھوڑی سی جان میں جان آئی' چلیے شکر ہے کہ وہاں تک یہ قوم پہنچی تو سہی۔یہ ایک ارب قوم کے نمائندے اکٹھے ہوئے ہیں' حرمِ کعبہ میں بیت اللہ کے سائے میں۔ریزولیوشن تک کی ہمت تو ہوگئی' اب جہاد کا لفظ بھی اس میں آگیا مگر باہر نکلتے ہی یہ کہا کہ میاں! خواہ مخواہ ہمارے خلاف کوئی ایسی بات نہ کردو کہ ہم اس چیز پہ اتر آئے ہیں۔تم سمجھے ہی نہیں ہو' جہاد کے معنی تو کوشش کرنا ہوتا ہے۔ٹھیک ہے تو پھر ان اسرائیلیوں نے کہا کہ ''کوشش'' کرتے رہو' گزشتہ تیس سال سے بھی تو کرتے ہی چلے آرہے ہو۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں مسلمان کی بجائے مومن کی اصطلاح استعمال کی ہے جو ہمیشہ کفار پر غالب رہیں گے

ان سے جب پوچھیے کہ صاحب! خدا نے تو کہا ہوا ہے کہ جو وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (40:51) ہیں' وہ مومن ہیں جن کو اب ہمارے ہاں

---

❶ یاد رہے یہ بات فروری 1981ء کی 20 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

مسلمان کہتے ہیں' مسلمان کا تو لفظ قرآن کریم میں نہیں' مومن کا ہی ہے' کہ ہم ان کی مدد کریں گے' یہ غالب رہیں گے۔ تو پھر یہ کیا ہو رہا ہے کہ کافروں کی اتنی چھوٹی سی مملکت ہے اور یہ مقابل میں مومنوں کا ایک ارب کا ہجوم ہے' ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے' وہ ان پر غالب ہیں' یہ ان سے ڈرتے ہوئے' سہمے ہوئے' لرزتے ہوئے جی رہے ہیں۔ خدا نے کہا ہے کہ ہم مدد کریں گے' غالب کریں گے۔ تو یہ کیا ہے؟ کہا کہ یہ قیامت میں جا کر کریں گے جی' چلیے جی۔ ''جتیاں تہانوں ایتھے پین گیاں تے ملم سرتے لان واسطے اوتھے جا کے ملے گی'' (جوتیاں تمہیں یہاں پڑیں گی اور مرہم سر پہ لگانے کے لیے وہاں جا کر ملے گی)۔ یہ فریبِ نفس ہے' عزیزانِ من! اس لیے فریبِ نفس ہے کہ اس نے کہا ہے کہ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (40:51) اس دنیاوی زندگی کے اندر ہم تمہاری مدد کریں گے' تمہیں ان لوگوں پر غالب کریں گے یہ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (40:51) ہے۔ یہاں وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (40:51) کہا ہے کہ ان اہلِ ایمان کی اس دنیا میں بھی مدد کرتے ہیں۔ یہ تو قرآن حمید ہے' فریب کار کو بھاگنے نہیں دیتا۔ کہا ہے کہ جو عام دنیاوی حالات ہیں' ان میں بھی مدد کرتے ہیں اور وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (40:51) اور جب یہ چیزیں مشہود ہو کر سامنے آئیں گی' اس دن ساری دنیا دیکھ لے گی۔ یہاں اَشْهَادُ کی کیا بات آئی ہے! کہ دنیا پکار اٹھے گی' یہ ہماری نصرت کی شہادت ہو گی' دنیا دیکھے گی کہ ہاں صاحب! یہ ہے وہ قوم جس کو خدا کی نصرت حاصل ہوتی ہے' غلبہ حاصل ہوتا ہے۔

خدا کی ذات تو قرآنِ حکیم میں مومن کی مدد کرنا اپنا فریضہ گناتی ہے اور اس کے لیے اپنے آپ کو ''انا'' کہتی ہے

عزیزانِ من! سنیے کس انداز سے قرآن حکیم نے یہ بات کہی ہے۔ آج یہ بات بڑی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ اسی ایشو کو لے لیجیے' یہ جو ہمارے ہاں اسرائیل کا ایشو ہو رہا ہے اور جس طرح ہماری کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں۔ یہ چیز غور کرنے کی ہے۔ یہاں تو یہ ہے کہ اِنَّا لَنَنْصُرُ (40:51)۔ تھوڑی سی عربی جاننے والے بھی جانتے ہیں کہ لَنَنْصُرُ کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ سنیے! یہ لَنَنْصُرُ یقینی چیز ہوتی ہے۔ اور پھر قرآن حکیم نے اِنِّیْ نہیں اِنَّا کہا ہے۔ خدا اپنے آپ کو اِنَّا وہاں کہتا ہے' جہاں اس کا غلبہ' نصرت اور جلال ہوتا ہے کہ ہم کریں گے نصرت' یہ ہمارا وعدہ ہے۔ سنیے! قرآن حکیم کیا کہتا ہے! کہتا ہے کہ وَ کَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ (30:47) ہم پہ یہ مدد کرنا فرض ہے' ہم پہ واجب ہے یہ مومنوں کی مدد کرنا' ان کو غالب کرنا۔ یہ ہے حَقًّا عَلَیْنَا (30:47)۔

خدا تعالیٰ کے وعدہ کے ساتھ ساتھ مومن کا فریضہ' یہ وعدہ اور یہ فریضہ لازم وملزوم ہیں

ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ خدا نے ہمارے اوپر کچھ فریضے عائد کر رکھے ہیں مثلاً کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ (2:216) ' کُتِبَ عَلَیْکُمُ

الصِّيَامُ (2:183) یہ وہ چیز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم نے اپنے اوپر یہ اسی طرح فرض قرار دیدیا ہوا ہے جس طرح تمہارے اوپر ہم نے کچھ باتیں فرض قرار دی ہیں۔ تم اگر اس فریضے کو ادا نہیں کرتے تو جو کچھ ہم کہتے ہیں اگر ہم وہ ادا نہ کریں تو۔ یہ ہے **كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ** (30:47) ہم پر واجب ہے کہ ہم ان لوگوں کی مدد کریں جو ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس نصرتِ خداوندی کا نتیجہ کیا ہے۔ وہ بھی اس نے بتا دیا ہے۔ کہا ہے کہ **وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا** (4:141) یہ ہو نہیں سکتا کہ کفار کو کبھی مومنین کے اوپر غلبہ حاصل ہو۔ **لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ** (4:141) یہ ہو ہی نہیں سکتا۔

آج ہی نہیں بلکہ صدیوں سے ہم مسلمانوں کی یہ حالت کیوں ہے؟ اس لیے کہ ہم مومن نہیں ہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوا کہ صاحب! ایک طرف وہ کہتا ہے کہ ہمارے اوپر یہ فرض ہے' ہم مدد کریں گے' اعلان کر رہا ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ان کو غلبہ حاصل نہ ہو سکے۔ تو پھر آج یہ صورتِ حال کیوں ہے؟ وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ ایک ارب سے اوپر جو مسلمان نام رکھوانے والی جماعت ہے' یہ اسرائیل کی چھوٹی سی' چڑیا سی مملکت کا مقابلہ نہیں کر سکتی جبکہ قرآن حکیم تو ان ساری سپر نیشنز کو کفار کہتا ہے' وہ ان پر کیسے غلبہ پا سکے گی۔ ان سب کے نیچے یہ قوم صدیوں سے دبی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ سوال پیدا ہوگا کہ خدا نے جو یہ کہا ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کفار مومنوں پر غلبہ پا لیں اور یہ تو صدیوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے' ہم خود موجود ہیں' ہمارے اوپر یہ ہو رہا ہے۔ تو پھر یہ کیا معنی ہوئے؟ میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ پھر یا تو یہ مانیے کہ معاذ اللہ خدا کے یہ جو سارے وعدے کیے ہوئے ہیں' یہ سب غلط ہیں معاذ اللہ۔ تم زبان سے نہیں کہنا چاہتے' زبانِ حال سے تو تم یہی کہہ رہے ہو کیونکہ یہ چیزیں تم پڑھتے تو ہو۔ حریمِ کعبہ میں بھی جو قرآن حکیم کی تلاوتیں ہوتی ہیں' اس میں یہ چیزیں آتی ہیں۔ اگر تم ان کو صحیح نہیں سمجھتے' نکال دو ان کو قرآن سے۔ یہ تو تم پڑھتے ہو اور صحیح سمجھتے ہو۔ اور یہ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ہے اپنے آپ کو فریب دے نہیں سکتے کہ قیامت میں یہ کچھ ہوگا۔ تو پھر اگلی بات کیا ہوگی؟ یہ واقعہ ہے کہ کفار کا غلبہ ہے اس وقت ان پر جو اپنے آپ کو مومن یا مسلمان کہتے ہیں۔ خدا کا وعدہ ہے کہ مومنوں کے اوپر یہ غالب نہیں آ سکتے۔ تو ایک ہی بات ہوئی کہ ہم مومن نہیں ہیں۔ عزیزانِ من! اس کا تیسرا نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا۔ اس کو Logical Consequence (منطقی نتیجہ) کہتے ہیں۔ خدا کا وعدہ ہے کہ مومنوں پر کافر غالب نہیں آ سکتے۔ وعدہ سچا ہے۔

قرآنِ حکیم میں بیان کردہ حقائق کی روشنی میں سوچنے کی ایک بات کہ آیا ہم وہی مومن بنے ہیں جن سے خدا نے غالب کرنے کا وعدہ کیا ہے

یہ واقعہ ہے کہ یہ جو قوم اپنے آپ کو مومن کہہ رہی ہے' ان پہ کفار نے غلبہ پا لیا ہوا ہے۔ وعدہ اس کا سچا ہے۔ تو اگلی بات Natural

Consequence (فطری نتیجہ) یہی چیز ہے کہ یہ وعدہ مومنین کے ساتھ تھا' ہم جو ہیں یہ وہ نہیں ہیں جن کے متعلق یہ وعدہ کیا ہوا ہے۔میں نے کہا تھا کہ یہ اجتماعات' یہ کانفرنسیں اور یہ سیمینارز' یہ ریزولیوشن پاس ہوتے ہیں۔ان میں یہ بات بیٹھ کر سوچنے کی ہے کہ امریکہ نے یہ کیا' روس یہ کر رہا ہے۔اب بجائے اس کے کہ یہ کچھ سوچے کہ ان کے ہاں یہ ہوائی جہاز ہیں' وہاں بیٹھ کر اتنا ہی سوچے کہ آپ مسلمانوں کی حیثیت سے جمع ہوتے ہیں یا تو سیکولر حکومتوں کی طرح جمع ہو جایئے تو خدا کو درمیان میں نہ لایئے۔ جہاں آپ جمع ہوتے ہیں وہ ایسے ہوتا ہے جیسے خدا کے سائے کے نیچے آپ پورے کے پورے بیٹھے ہوئے ہیں۔وہاں شروع میں' آخر میں' سب جگہ خدا اور اس کا قرآن حمید لبوں پہ آتا ہے۔خدا کے نام کے ساتھ آتے ہو تو اس کے بعد پھر وہاں کچھ اور نہ سوچو' صرف ایک بات بیٹھ کر سوچو کہ خدا کا یہ وعدہ سچا ہے کہ مومنین پر کفار غالب نہیں آئیں۔یہ کفار ہیں' وہ ہم پہ غالب ہیں تو نتیجہ یہ ہے کہ ہم مومن نہیں ہیں۔اور کچھ کرنے کی آپ کو ضرورت نہیں ہے۔قرآن حمید جن کو مومن کہتا ہے خود وہ بن جاؤ اور اس کے بعد تمہیں نہ کچھ مانگنے کی ضرورت ہے' نہ کہنے کی ضرورت ہے۔اس کا تو فریضہ ہے کہ وہ غالب کرے۔غور فرمایا آپ نے! اس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہوا ہے کہ عَلٰی رَبِّکَ وَعْدًا مَّسْؤُلًا (25:16) خدا نے یہ چیز جسے وعدہ کہا ہے' یہی ہوتا ہے کہ ہم نے یہ چیز حتماً تم سے کہہ دی ہے کہ ایسا ہوگا۔کہا یہ ہے کہ بفرض محال اگر کبھی ایسا نہ ہو تو تم ہم سے پوچھ سکتے ہو کہ ایسا کیوں نہیں ہوا۔میں نے وہاں لکھا ہے کہ قرآن حکیم جن کو مومن کہتا ہے' اس معیار کے اوپر مومن بن جاؤ اس کے بعد تو ہو ہی نہیں سکتا کہ خدا کا یہ وعدہ پورا نہ ہو۔یہ ہمارا ایمان ہے۔اور اس نے کہا ہے کہ اگر اس کے بعد بھی نہ ہو تو تم ہم سے پوچھ سکتے ہو کہ کیوں ایسا نہیں ہوا۔

خدا تعالیٰ کا وعدہ تو مومنین کے ساتھ ہے' ہم مسلمانوں کے ساتھ نہیں' سوچو تو!

میں نے کہا ہے کہ کانفرنسوں میں بیٹھ کر یہ سوچو۔اگر خدا اور اسلام کے نام پر بیٹھتے ہو اور اس کے نام پر کچھ سوچتے ہو تو سوچو یہ بات کہ قرآنِ کریم جنہیں مومن کہتا ہے' کیا اس کے اس معیار پر ہم پورے اترتے ہیں؟ ان آیتوں کو اپنے سامنے لاؤ۔پھر تم اس نتیجے پہ پہنچو گے کہ وعدے بھی اس کے سچے ہیں' سب چیز صحیح ہے۔وہ جو اس نے وعدہ کیا ہے' وہ مومنین کے متعلق کیا ہے' ہم مسلمانوں سے نہیں۔بات وہی ہے کہ ہم اپنا نام جو جی میں آئے رکھ لیں لیکن نام رکھنے سے تو وہ بات نہیں بنتی۔ہم نے تو اپنا نام عبدالرحمٰن رکھ لیا ورنہ وہ رحمٰن کا عبد کہاں ہوتا ہے' بالکل نہیں ہوتا۔تم اپنی کانفرنسوں میں بیٹھ کر یہ سوچو' اس Situation (صورتِ حال) کو Analyze (تجزیہ) کرو کہ اس نے مومنین کے متعلق یہ کہا ہوا ہے۔

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے تو یہی لوگ کافر ہیں اور اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں

میں نے کہا ہے کہ لمبی چوڑی اور باتیں تو چھوڑ دیجئے' بہت سی آئیں گی' ایک ایک چیز لینی پڑے گی۔ بنیاد تو یہاں سے ہے کہ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) جو خدا کی کتاب (قرآنِ کریم) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہوتے ہیں۔ پہلی ہی شق آ گئی۔ کہا ہے کہ آپ اپنے آپ کو مومن کہہ کر اور مومن بن کر خدا کی نصرت کے خواہاں ہونگے اور اس سے مدد طلب کریں گے۔ اس کے بعد دعائیں مانگتے ہیں کہ وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (2:250) اور ہمیں ان لوگوں پر غلبہ عنایت کر دے جو تیرے قوانین سے انکار کرتے ہیں اور ان سے سرکشی برتتے ہیں۔ وہ کہتا ہے ہمارا وعدہ تو مومنین سے ہے۔ خود بیٹھ کر سوچو کہ ہم میں کونسی کمی ہے۔

تمہیں اعتبارِ الفت جو نہ ہوسکا ابھی تک
میں سمجھ گیا یقیناً ابھی مجھ میں کچھ کمی ہے

وہ جو ادھر سے یہ وعدہ پورا نہیں ہو رہا تو بیٹھ کر سوچو کہ ابھی مجھ میں کچھ کمی ہے۔ اس کمی کو پورا کرو۔ عزیزانِ من! یہ وعدے خدا کے ہیں' کوئی مذاق نہیں ہے۔ یہ ہے جو اس نے کہا تھا کہ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (40:51) ہماری مدد' ہمارے رسولوں کے شامل حال ہوتی ہے' اور ان لوگوں کے شامل حال جو ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں ہم ان کی اس دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس وقت بھی ان کی مدد ہو گی جب تمام اعمال کے نتائج مشہود ہو کر سامنے آ جائیں گے۔ یہ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (40:51) والی بات تو اگلی ہے' ابھی تم فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا تک تو رہو۔ عزیزانِ من! کرنے کی بات یہ ہے۔ سارا قرآن مجید پڑھ جاتے ہیں' اپنے آپ کو ہم نے مومن فرض کر رکھا ہے حالانکہ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (2:9) فریب دیتے ہو خدا کو' وہ جو اصلی مومن تھے ان کو' کہا ہے کہ نہیں' یہ تم اپنے آپ کو فریب دیتے ہو' یہ Self Deception (فریبِ نفس) ہے۔ یہ کوئی اور بات ہے۔

ایران کے حاکم کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عدالت میں ایک حقیقت پر مبنی بیان

آپ کو وہ واقعہ یاد ہے جب وہ ایران کا حاکم ❶ گرفتار ہو کر حضرت عمرؓ (581-644/45ء) کے سامنے پا بجولاں آیا تھا۔ آپؓ نے اس سے پوچھا تھا کہ ایک بات بتاؤ کہ اس سے پہلے تم ایرانیوں کی کیفیت یہ تھی کہ ہم عربوں سے برابری کا سلوک تو ایک طرف رہا' تم

---

❶ یہ اشارہ ہرمزان کی طرف ہے جو ایران کا نامور گورنر' ماہر سیاست دان اور نہایت مکّار اور عیار حریف تھا۔

میدانِ جنگ میں بھی آتے تھے تو عربوں کے ساتھ یہ کہہ کر لڑائی نہیں کرتے تھے کہ یہ کمینے ہیں' ان کے ساتھ ہم کیا لڑیں۔تمہاری حالت یہ تھی' عربوں کے متعلق تمہارے یہ خیالات تھے۔اس تخاطب سے تم ❶ کہہ کر بلاتے تھے کہ تم وحشی اور بدتہذیب عرب (فردوسی کے الفاظ میں) سوسمار (گوہ) کھانے اور اونٹوں کا دودھ پینے والے گنوار اور تمہاری جرأتوں کا یہ عالم! یہ قوم اونٹ کا دودھ پیتی ہے ''گوہ'' کا گوشت کھاتی ہے' اس کے ساتھ ہم لڑائی کریں۔کہا کہ دوستی تو ایک طرف' تم تو ہم سے لڑتے بھی نہیں تھے' کہتے تھے کہ یہ بہت ہی زیادہ پست ہیں۔آج یہ کیا بات ہوگئی کہ تم وہی ایرانی ہو' ہم وہی عرب ہیں اور آج لڑنا نہ لڑنا تو ایک طرف رہا' تم ایک پورے صوبے کے حاکم ہونے کے باوجود پابجولاں میرے سامنے کھڑے ہو۔اور تمہارا شہنشاہ جان بچائے ہوئے بھاگے بھاگے پھر رہا ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ شہنشاہِ ایران یزدگرد ❷ ان کے ہاتھوں بھاگا بھاگا پھرا تھا' پن چکی میں جا کر چھپا تھا' وہاں مارا گیا تھا۔انہوںؓ نے یہ پوچھا تھا کہ مجھے بتاؤ کہ یہ فرق کیوں آیا؟ سنیئے' عزیزانِ من! وہ صاحبِ نظر' ہماری آپ کی نگاہ میں کافر' اس نے کہا کہ عمرؓ! بات بڑی صاف سی ہے۔پہلے جب عرب اور ایران سامنے آتے تھے یا ہم مخالفت کرتے تھے تو ایک طرف ایران ہوتا تھا' ایک طرف اکیلے عرب ہوتے تھے۔تو وہ تو کچھ شے ہی نہیں تھے۔اب جو تم لوگ آتے ہو تو ایک طرف اکیلا ایران ہوتا ہے' دوسری طرف عرب اور اس کے ساتھ ان کا خدا ہوتا ہے۔اس کا مقابلہ دنیا میں کوئی نہیں کرسکتا۔

جس کے ساتھ خدا کی رفاقت شامل ہو' اُسے کوئی شکست نہیں دے سکتا اور جسے شکست ہوتی ہے وہ خوش گواریوں سے محروم رہتا ہے

وہ تو اونچی قوم تھی' وہ بات بھی اس انداز سے ہی کرتی تھی۔اب یہ عرب اکیلے نہیں ہوتے۔یہ ہوتا ہے' وہ خدا نے جو کہا تھا۔اس کے تو سارے وعدے سچے اور پکے ہوتے ہیں اور پورے ہوئے تھے۔یہاں کہا ہے کہ **يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ** (40:51) شہادت دی ساری دنیا نے اس امر کی کہ واقعی جب خدا ساتھ ہوتا ہے پھر دنیا کی کوئی طاقت مقابلہ نہیں کرسکتی کیونکہ اس نے کہا ہے کہ **لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا** (4:141) یہ ہو نہیں سکتا کہ کفار مومنوں پر کسی طرح غلبہ حاصل کرلیں۔جب بھی کفار نے مومنوں پہ غلبہ حاصل کیا ہے تو اس وقت بات اتنی تھی سوچنے کی کہ ہم مومن نہیں رہے بس۔پھر اگر اب جی چاہتا ہے مقابلہ کرنے کا یا غلبہ حاصل کرنے کا تو وہ کچھ اور سوچنے کی بات نہیں' اتنی سی بات سوچنے کی ہے کہ ہم وہ نہیں رہے۔خدا کا وعدہ سچا ہے وہ پورا ہوگا۔

---

❶ شہنشاہِ ایران یزدگرد نے حضرت سعدؓ کے بھیجے گئے سفراء کو غصہ کے مارے آگ بگولا ہو کر ان الفاظ سے مخاطب کیا تھا۔

❷ شہنشاہِ ایران یزدگرد کا دورِ حکومت 632ء تا 651ء تھا۔

سیدھی سی بات ہے۔اب یہ دونوں کا تقابل قرآن حکیم نے بتا دیا۔ایک تو وہ جرائم پیشہ مستکبرین ہیں جن کو کفار کہا گیا ہے' ان کا انجام تباہی ہے اور دوسری طرف' جن کو مومن کہا گیا ہے' ان کے متعلق یہ ہے کہ خدا کے وعدے یہ ہیں۔اسی لیے کہا کہ وہ جو ان کی جہنم میں بات تھی' انہوں نے کہا تھا کہ ہم تو خدا سے کچھ نہیں کہہ سکتے یعنی جہنم کے داروغے سے کہا کہ تم ذرا جا کر خدا سے ہماری سفارش کر دو۔**یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ الظّٰلِمِیۡنَ مَعۡذِرَتُہُمۡ وَلَہُمُ اللَّعۡنَۃُ وَلَہُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ** (40:52) جنہوں نے زندگیاں اس طرح سے ظلم اور استکبار میں گزاری ہوں' آخری تباہی کے بعد پھر ان کی کوئی معذرت قابلِ قبول نہیں ہوتی۔آگے کہا ہے کہ **وَلَہُمُ اللَّعۡنَۃُ** (40:52)۔ہمارے ہاں تو بس یہ کہا ہے کہ خدا کی لعنتیں ان کے اوپر ہوتی ہیں۔یعنی وہ پھلتے پھولتے جاتے ہیں' پنپتے جاتے ہیں' غلبہ حاصل کرتے جاتے ہیں اور تم مخالفین ان کے سامنے بھاگتے چلے جاتے ہو۔وہ کہنے لگے کہ کوئی بات نہیں! یہ خدا کی لعنت تو ان کے اوپر ہے اور یہ خدا کی رحمت کے حامل ہم ہیں جو میدانِ جنگ سے بھاگ رہے ہیں اور وہ جو خدا کے نزدیک ملعون ہیں' اُن کے ہاتھوں سے اِن کی کھال ادھڑ رہی ہے۔یاد رکھیے! لعنت کے معنی ہوتے ہیں ''خوشگواریوں سے محروم رہنا''۔اور یہی آج ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔

سورۃ الفاتحہ میں مَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ کے الفاظ اور یہودیوں کے متعلق پائے جانے والے تصور کی نوعیت

کہا یہ ہے کہ یہاں قوت کا سوال نہیں ہے' ظالمین کا سوال ہے کہ یہ ہمارا قانون ہے کہ جو ظالمین ہیں' وہ خدا کی ان رحمتوں سے' اس کے ان وعدوں سے' ان وعدوں سے حاصل ہونے والی خوشگواریوں سے' محروم رہتے ہیں۔ہم انہیں ظالم بھی کہتے ہیں' ملعون بھی کہتے ہیں' مغضوب بھی کہتے ہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ آپ سورۃ الفاتحہ میں نماز میں ایک دن میں کم از کم کوئی چوالیس مرتبہ **اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ. صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ. غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ** (1:5-7) پڑھتے ہیں۔پڑھنے کے بعد یہ کبھی نہیں سوچتے کہ یہ کون ہیں جن کے متعلق کہا ہے کہ ان کا راستہ نہیں چلا۔تفسیر میں پہلے سے یہ فیصلہ کر لیا ہوا ہے کہ **مَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ** یہودی ہیں اور **الضَّآلِّیۡنَ** سے مراد عیسائی ہیں' ہم نہیں ہیں۔''مغضوب علیہ یہودی ہیں'' ہم کہتے چلے آئے۔ٹھیک ہے اس زمانے تک یہودی تو Wanderer (آوارہ گرد) تھے' کہیں ان کا ٹھکانہ نہیں تھا' واقعی کوئی مملکت نہیں تھی۔وہ کہتے چلے آئے کہ تم نے دیکھا! کہ خدا کا غضب ہے اس قوم کے اوپر' انہیں کہیں ٹھکانہ نہیں مل رہا۔چنانچہ ہماری تفسیروں میں یہ فیصلہ کر دیا کہ قیامت تک ان کی کہیں سلطنت قائم نہیں ہو سکتی۔یہ آپ کے ہاں فیصلہ ہے۔اور انہوں نے جو ''ٹھک'' سے وہاں وہ حکومت قائم کر لی تو آئی اب مصیبت کہ ان کی تو حکومت قائم ہو گئی اور مغضوب علیہ بھی تھے۔اب ان سے پوچھیے تو یہ کہتے ہیں کہ خدا کا جو غضب ہے وہ قیامت کے دن کے اوپر ہے یہاں اس دنیا میں نہیں۔

قرآنِ حکیم کے ہاں ظالمین کے لفظ کا استعمال اور ہماری اپنی سوچ کا رُخ۔قرآن کریم تو واقعات سے کچھ نتائج اخذ کرتا ہے

اسی طرح سے جہاں بھی قرآنِ کریم میں یہ ظالمین وغیرہ آتا ہے تو ہمارے ہاں اپنے ظلم وستم کی طرف نگاہ نہیں جاتی کہ ہم ہی ظالم ہیں۔اور پھر آپ کو تو یاد ہوگا' یہ لفظ اتنی دفعہ دہرایا گیا ہے۔ظلم کے معنی تو عربی زبان میں یہ ہیں ''جس چیز کو جہاں ہونا چاہیے' اس کا وہاں نہ ہونا''۔یہ بڑی جامع Definition (تعریف) ہے۔یہ ہے ظلم۔تو اب دیکھیے بجائے اس کے کہ ہماری نگاہ ان کی طرف اٹھے یعنی سب چیزیں ہم نے یہی فیصلہ کر رکھی ہیں۔ہندوستان میں تھے تو وہاں تو ہماری نگاہ زیادہ دور جاتی نہیں تھی' وہ ہندو ہی ہوتا تھا تو ان سب چیزوں کے معنی ہندو ہوتا تھا۔ہم نہ ظالم ہوتے تھے' نہ مغضوب علیہ ہوتے تھے' نہ ضآلین میں ہوتے تھے۔یہ سب وہ ہوتے تھے۔جہاں بھی ظلم ہوگا اس کا نتیجہ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ وہ جو خدا کے وعدوں کی خوشگواریاں مل سکتی ہیں' وہ اس سے محروم رہیں گے۔کہا ہے کہ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (40:52) اوران کی جو زندگی ہے' وہ بڑی ہی تباہیوں اور ناہمواریوں کی زندگی ہے۔

اب بات چلی آ رہی تھی کشمکشِ حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کی اور وہاں پھر مردِ مومن درمیان میں آ گیا تھا۔یہ درمیان کی ساری چیزیں اس کے نتائج تھے جو وہ داستان بیان کی گئی تھی۔قرآن کریم کوئی تاریخ کی کتاب نہیں کہ وہ آپ کے سامنے Historical Hinderences (تاریخی رکاوٹیں) بیان کرے۔وہ تو وہ واقعات بیان کرتا ہے اور اس سے کچھ نتائج اخذ کرتا ہے۔

قرآنِ حکیم کا پیش کردہ وحی کا پیغام' کیا آنے والے دور کے لیے قابلِ فراموش ہوتا ہے: ایک اہم سوال

یہ ساری جتنی باتیں ابھی میں نے آج کے درس میں کہی ہیں' یہ اس داستان کے نتائج تھے جو قرآن حکیم نے پیش کیے ہیں۔اور اس پیش کرنے کے بعد قرآن حکیم پھر سلسلہ کلام وہیں لے کر آ گیا کہ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ. هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ (40:53-54) ہم نے موسیٰؑ کو ضابطۂ ہدایات دیا تھا اور ان کے بعد اس کی قوم کو اس کتاب کا وارث بنایا تھا۔اُس ضابطہ قانون میں عقل وبصیرت سے کام لینے والوں کے لیے سامانِ ہدایت وموعظت تھا۔قرآن حکیم کا یہ نظام بڑا غور طلب ہے۔رسول آتا ہے' وہ خدا کا ایک ضابطۂ قانون کی ایک کتاب لے کر آتا ہے۔اسے پیش کرتا ہے' دوسروں تک قانون پہنچاتا ہے۔اس کے مطابق ایک نظام متشکل کر کے دکھاتا ہے۔اس کی تو زندگی طبعی ہوتی ہے۔کتنی ہی آپ کہہ لیجیے' بہرحال اس نے دنیا سے جانا ہوتا ہے' وہ دنیا سے چلا جاتا ہے تو پھر اس کے چلے جانے کے بعد کیا یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے؟

نظامِ حیات کے سلسلہ میں وحی کے پیش کردہ ثمرات کسی خاص وقت تک نہیں ہوتے' نبی کی قوم اس کی کتاب کی وارث ہوتی ہے۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ یہ سلسلہ اس کی ذات سے وابستہ نہیں تھا۔ یہ جو کچھ حاصل ہوا تھا' اس کتاب کی بدولت حاصل ہوا تھا جو اس نے دی تھی' جس کے مطابق اس نے یہاں نظام قائم کیا تھا۔ وہ کتاب موجود ہے' وہ چلا گیا ہے تو کوئی بات نہیں اس کی جو قوم ہوتی ہے' اس کے جو متبعین ہوتے ہیں' ان کو کتاب کا وارث کہا گیا ہے۔اس نے کتاب کے ذریعے سے جو کچھ کر کے دکھایا تھا' اس کے بعد کتاب کی وارث یہ قوم آ گئی' اب یہی کچھ وہ کر کے دکھا سکتی ہے۔

عزیزانِ من! اس میں تو کوئی کمی ہی نہیں آ سکتی۔اگر یہ کہا جائے کہ وہ رسول تو اب ہم میں نہیں رہا' اب ہم کیا کر کے دکھا سکتے ہیں۔اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ آج اگر ان لوگوں سے کہیے کہ صاحب! دیکھیے تو سہی' اسلام کے صدرِ اول میں' نبی اکرمﷺ کے دور میں' خلافتِ راشدہؓ میں' ان لوگوں کے زمانے میں' اسلام نے کیا کچھ نہ کر کے دکھا دیا۔تو یہ کہتے ہیں کہ صاحب! آپ کیا بات کرتے ہیں' وہ خدا کے رسولﷺ تھے' وہ صحابۂ کبارؓ تھے ''اسی تے بندے بشر ہوئے'' (ہم تو گنہگار بشر ہیں) کیا ہم آپ ان کے مرتبے پہ پہنچ سکتے ہیں؟ توبہ توبہ توبہ! چل بھئی گویا ہم تو کچھ کر نہیں سکتے' وہ چلے گئے' گزر گئے' معاملہ ختم ہو گیا۔اور اس کے بعد کسی اور نبی نے آنا نہیں ہے تو ختم ہوا پھر یہ قصہ۔قرآن مجید نے یہاں کہا ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ کے بعد اس کی قوم کو ہم نے وارثِ کتاب بنایا۔ ہمارے متعلق کہا ہے کہ رسول اللہﷺ کے بعد ہم نے اس قوم کو قرآن مجید کا وارث بنایا ہے۔اور وہاں اصۡطَفَيۡنَا (35:32) کا لفظ آیا ہے کہ ہم نے اسے منتخب کر لیا ہے۔

آج زمین و آسمان کے درمیان قرآنِ حکیم ہی ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جس میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی

ہم جو نبی اکرمﷺ کو مجتبیٰ اور مصطفیٰ کہتے ہیں تو قرآن حکیم نے کہا ہے کہ اس قوم کو ہم نے اس مقصد کے لیے چن لیا۔ یہ امت وارثِ کتاب ہے اور کتاب نے یہ سب کچھ کر کے دکھایا تھا۔اور ہماری کتاب ایسی ہے کہ وہ قیامت تک کے لیے' اسی طرح سے' نتائج دینے کے قابل رہتی ہے۔وہ چلا ہوا کارتوس نہیں ہوتا جبکہ بنی اسرائیل نے یا پہلی قوموں میں جو بھی قومیں بعد میں آئیں' انہوں نے اپنی مفاد پرستیوں کے لیے وہ جو ان کی کتاب تھی' اس میں ہی تحریف کر دی اور اس کو کچھ سے کچھ کر دیا۔ایک بات تو یہ کی۔ پھر اس کے بعد یہ کیا کہ نہیں! یہ کتاب ہی نہیں' کتاب کے ساتھ کچھ اور بھی کیا۔ان کے ہاں یہ جو مذہبی پیشوا تھے' یہ يَكۡتُبُوۡنَ الۡكِتٰبَ بِاَيۡدِيۡهِمۡ ثُمَّ

یَقُوۡلُوۡنَ ھٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ (2:79) انہوں نے پھر فقہ کے قانون خود بنائے' شریعتیں خود بنائیں اور کہا کہ یہ ہے خدا کی شریعت۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو خدا کا قانون بنا کر اس کو نافذ کیا۔ کہا کہ پھر وہ نتائج کیسے حاصل ہو سکتے ہیں۔ کتاب میں تحریف کر دی' کتاب کے ساتھ اور کتابیں خود لکھ کر کہا کہ یہ خدا کی ہیں تو وہ نتائج کیسے پیدا ہوتے۔

ہماری طرف سے قرآنِ حکیم کے ساتھ ہونے والا سلوک

ہم کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے یہ کچھ کیا تھا' ہم نے تو یہ کچھ نہیں کیا۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ کہا کہ صاحب! ہم نے کتاب میں تو تحریف نہیں کی۔ وہ آپ کی تو کاری گری نہیں' وہ تو اس نے خود کہا تھا کہ ہم نے یہ نازل کیا وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (15:9) ہم اس کی حفاظت کریں گے۔ حفاظت تو اس نے کی ہوئی ہے مگر وہ سارا کریڈٹ آپ لے رہے ہیں۔ چلو ٹھیک ہے کتاب تو ہے لیکن کیا اس کتاب کے مطابق تم اپنا نظام بھی قائم کر رہے ہو؟ وہ تو ثواب کی خاطر اور ثواب پہنچانے کی خاطر رکھی ہوئی ہے۔ یہاں پڑھتے رہو' ناظرہ قرآن پڑھتے رہو یعنی اس کے لفظوں کے معنی ہی پتا نہیں اور دہرائے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں کے جو حفاظ ہوتے ہیں' وہ ایک مہینے میں بلکہ ایک رات میں' شبینے میں' پورا قرآن حکیم ختم کرتے ہیں مگر ایک لفظ کے معنی نہیں جانتے۔ پھر یہاں ان کی گٹھڑی میں اتنا ثواب بندھ جاتا ہے کہ ''او اُتوں دی اچھن لگ پیندا ہیگا اے'' (وہ اوپر سے اچھلنے لگ پڑتا ہے)۔ وہ کہتے ہیں کہ ''ہٹ دا پانی کی کریئے؟ اے فیر مردیاں نوں بخشواندے نیں' ایدھر ٹور دے نیں اوہنوں'' (وہ کہتے ہیں اب یہ زائد پانی ہے اس کا کیا کیا جائے؟ تو وہ پھر اُس سے مُردوں کو بخشواتے ہیں' وہ اُسے اُدھر بہا دیتے ہیں)۔

ہم مسلمانوں کے مقابلے میں دوسرے مذاہب والوں کا اعتراض اور قرآنِ کریم کا بیان

عزیزانِ من! ہمارے ہاں اب قرآن کریم کا یہ مصرف ہے۔ ہماری یہ حالت اس قوم سے بھی زیادہ خدا کے غضب کی مستحق ہے کہ وہاں تو وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں ہے ہی نہیں۔ اب جو آج عیسائی یا یہودی ہیں وہ کہہ سکتے ہیں کہ صاحب! ہم کیا کریں' وہ کتاب تو اس سے بہت پہلے محرف ہو چکی تھی تو اب دوسری کتاب ہمارے ہاں اصلی ہے نہیں' ہم کس کتاب پہ عمل کریں' ان کی تو یہ معذرت ہے۔ ہماری تو معذرت بھی کوئی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے پاس تو وہ کتاب موجود ہے اور ہم مناظروں میں ان کے ساتھ دعوے کرتے ہیں کہ یہ فرق ہے تم میں اور ہم میں۔ اس لیے ہم کو جو بنی اسرائیل سے بھی زیادہ مار پڑ رہی ہے وہ اس لیے پڑ رہی ہے کہ ہماری حالت ان سے زیادہ بدتر ہے۔ ہماری معذرت ہی کوئی نہیں ہو سکتی۔ کہا ہے کہ وَاَوۡرَثۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡکِتٰبَ. ھُدًی وَّ ذِکۡرٰی لِاُولِی الۡاَلۡبَابِ (40:53-54)۔ کیا بات ہے قرآن کریم کی کشادہ نگہی کی! کشادہ نگہی کیا' یہ حقائق ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی یہودیوں کے ساتھ کشمکش ہو رہی ہے' کس قدر یہودیوں

نے مخالفت کی تھی پوچھیے لیکن جب ان کے نبی کا' ان کی کتاب کا' ذکر آتا ہے تو جو الفاظ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے متعلق استعمال کیے ہیں' ان کی کتاب کے متعلق وہ الفاظ استعمال کرتا ہے کہ وہ کتاب ایسی تھی جو تمہیں دی گئی تھی لیکن اگلی بات یہ ہے کہ تم نے اس کتاب کو اس کی اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رکھا اور اس کے ساتھ انسانوں کی خود ساختہ شریعتیں ملا دیں۔ یہودیوں کے ہاں ساری شریعت' جتنی بھی ہے' وہ ان کے مذہبی راہنماؤں کی بنائی ہوئی ہے۔ تورات میں تو یہ شریعت والی بات ہی نہیں اور وہ تو اپنی اصلی شکل کے اندر ہے ہی نہیں لیکن قرآن کریم جہاں بھی ذکر کرے گا' جو کچھ بھی کہے گا' وہ ان کی اصلی کتاب کے متعلق کہے گا' جو کچھ وہ کہتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں داستانِ موسیٰؑ اور بنی اسرائیل بیان کرنے کا مقصد: استقامت سے اپنا کام کیے جاؤ

اب یہاں تک لانے کے بعد قرآنِ حکیم نبی اکرم ﷺ کی طرف آ گیا۔ بات تو یہ کہنے کی تھی کہ یہ سارا قصہ پارینہ نہیں ہے جو ہم بیان کر رہے ہیں۔ یہ جو اتنی داستان بیان کی ہے' آپ ایک حضرتِ موسیٰؑ کی لے لیجیے۔ تم نے سوچا کہ انہوںؑ نے کس قدر تحمل' صبر' استقامت اور استقلال سے کام لیا تھا۔ کتنی لمبی زندگی ہے' استقامت سے اس میں کتنی کشمکشیں اٹھا رہے ہیں۔ اسی قسم کا ٹکراؤ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہو رہا تھا بلکہ یہ تو اس سے بھی زیادہ شدید ہو رہا تھا۔ اس لیے آپ ﷺ سے کہا کہ ہم نے یہ داستان اس لیے بیان کی ہے کہ فَاصْبِرْ (40:55) استقامت سے رہو۔ قلبی طور پر یقین بھی اس چیز پہ رکھو۔ کس چیز پہ یقین رکھو؟ اس پر کہ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (40:55) خدا کے وعدے بالکل برحق ہیں۔ اس چیز پر یقینِ کامل رکھو۔ اور جو کچھ اس کشمکش میں کر رہے ہو' استقامت سے اس پر جمے ہوئے رہو۔ کچھ دیر ہو رہی ہے تو اس میں گھبراؤ نہیں' دل نہ چھوڑ دو' نہ تو دل میں یہ بات لاؤ کہ پتا نہیں صاحب! وعدہ تو اس نے کیا تھا' وہ ٹھیک بھی ہوتا ہے یا نہیں۔

مسلمانوں کے ہاتھوں رومن امپائر اور ایرانی امپائر کی شکست کی روداد

فرمایا کہ اس کشمکش سے' جو صعوبتیں اذیتیں مشقتیں تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں' ان میں جی نہ ہارو۔ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (40:55) وہ وعدے سچے ہیں۔ اور ایک ایک وعدہ سچا ہو کر نبی اکرم ﷺ کے سامنے آ گیا۔ کیا سچے وعدے ہوئے ہیں! جب ایرانیوں کا دارالخلافہ مدائن [1] فتح ہوا ہے تو سنیے! ایرانیوں کی یہ سلطنت ہزاروں سالوں سے تہذیب کی حامل چلی آ رہی تھی' یہ دنیا میں سب سے بلند ترین تھی۔ رومن امپائر اور ایرانی امپائر دونوں کو مسلمانوں نے فتح کیا تھا۔ مدائن میں ہزاروں سال کے نوادراتِ شہنشائیت تھے۔ اندازہ لگائیے۔ اور پھر وہ عجم کے تکلفات والے تھے۔ اتنا کچھ وہاں سے ملا تھا۔ وہ جو وہاں سے کچھ بھیجا تھا' اس کے ساتھ جرنیل [2] نے ایک

---

[1] دارالخلافہ مدائن کی فتح 16ھ مطابق 637ء میں ہوئی۔

[2] اس جرنیل کا نام حضرت سعدؓ ہے۔

چٹھی بھی لکھی تھی۔ انہوں نے ایک خط میں لکھا تھا کہ قرآنِ کریم نے جو جنت کی تفاصیل دی ہیں' وہ وہاں کے بڑے بڑے قالین اور ریشمی صوفے' ریشمی پردے' سونے کے کنگن' دودھ کی نہریں' اتنے اتنے عجیب وغریب پھلوں سے لدے ہوئے درخت' پرندوں کے گوشت' اس قسم کی ساری چیزیں' وہ ساری قرآن حمید کی آیات لکھ کر یہ لکھا تھا کہ اے امیر المؤمنینؓ! یہ چیزیں جو خدا نے وعدہ کیا تھا' ہمارا ایمان ہے' ٹھیک ہے اُس جنت کا' یہ ایک ایک چیز یہاں ہمارے سامنے اور ہمارے قبضے میں آئی ہوئی ہے۔ اور کہا تھا اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ (40:55) خدا کے وعدے سچے ہو کر ہمارے سامنے آ گئے۔ اس لیے کہ وہ وعدے مومنوں سے تھے ❶۔

قرآنِ حکیم کے تراجم میں پیدا شدہ ایک خطرناک الجھاؤ اور لفظ ذنب کا حقیقی مفہوم اور کفار کا کردار

عزیزانِ من! اس میں پہلی چیز ہی یہ تھی کہ یہ مومن تھے۔ کہا کہ فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِكَ (40:55) پہلے بھی یہ آیتیں آ چکی ہیں۔ ہمارے ہاں کے ترجموں نے اس میں الجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ پہلے ہم ایک الجھاؤ پیدا کر لیتے ہیں اور پھر اس کے بعد اپنے ہاتھوں سے دی ہوئی گرہ کو دانتوں سے کھولنے کی کوشش کرتے ہیں' پھر تاویلیں شروع کرتے ہیں۔ مثلاً ایک مثال دیکھیے۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق لِذَنۡۢبِكَ (40:55) کا لفظ آیا ہے۔ ذنب کے معنی گناہ کیا۔ وَّاسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِكَ (40:55) اس کا ترجمہ کیا کہ اور استقامت رکھ اس کے اوپر اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہ خدا سے۔ حضورِ نبی اکرم ﷺ کے متعلق ذَنۡۢبِكَ کا لفظ ہے۔ اس پر سوچیے! اب پھر اس کے بعد مناظرے اور تفسیریں کیں کہ صاحب! وہ یوں اور یہ یوں ہے۔ یہ ذنب کے معنی ہی کیوں نہیں متعین کر لیتے؟ " ذَنۡبِ " میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ یہ مویشیوں کے پیچھے جو دم چپکی ہوئی ہوتی ہے اس دم کو ذنب کہتے ہیں۔ یہ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں۔ اس کے بعد یہ استعمال کرتے تھے ''ایسے الزامات جو کسی کے ساتھ ایسے چپکا دیئے جائیں کہ وہ جہاں جائے وہ الزام اس کے ساتھ لگا ہوا ہو' چپکا ہوا ہو'۔ ان لوگوں نے اتنے الزامات حضور ﷺ کے خلاف لگائے۔ مخالفین کا تو یہ قاعدہ ہے' استہزا بھی کرتے تھے' مزاح بھی کرتے تھے' الزامات بھی تراشتے تھے۔ الزامات کا پروپیگنڈہ کیا جائے تو وہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ کہا کہ وہ جو ان کی طرف سے غلط الزامات لگائے جاتے ہیں' ان سے ڈرو نہیں بلکہ ان کی طرف سے جو کسی قسم کے پروپیگنڈے سے نقصان پہنچتا ہے' تم اس کی حفاظت کا سامان کرو' ان کو زائل کرو۔ اور ادھر اس کے معنی ''کچھ کوتاہیاں'' بھی ہیں۔

---

❶ اور یہ بھی لکھا تھا کہ ''یہ تمام زر و جواہرات مسلمان سپاہیوں کے قبضے میں تھے اور ایسے ایسے مقامات سے ملے تھے جہاں انہیں کوئی دیکھنے والا نہ تھا لیکن ان میں کسی نے ایک سوئی بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سب کچھ لا کر اپنے قائد کے سامنے رکھ دیا (پرویزؒ: شاہکارِ رسالت' ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)' 1997' ص۔182)۔

وقتی طور پر کسی تدبیری غلطی، سہو یا چوک کا ہو جانا کوئی جرم نہیں مگر ہم الجھن میں آ پھنسے

عزیزانِ من! ایک تو قرآن مجید کے اصول ہیں جن کو ہم نے عملاً نافذ کرنا ہے اور ایک وہ تدابیر ہیں جو اس کے لیے اختیار کی جاتی ہیں۔ خدا نے کہا ہے کہ ان کے ساتھ جا کر میدانِ جنگ میں لڑو۔ ٹھیک ہے یہ ایک حکم ہے، جانا ہے۔ اب جنگ کے اندر کئی Strategies (حکمت عملیاں) آتی ہیں جن کے اندر کچھ تبدیلی، کسی قسم کی تدبیری کوتاہیاں، ہوتی ہیں، تدبیری غلطیاں ہوتی ہیں، پھر ان کو ٹھیک کر لیا جاتا ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کسی معاملے کے Execute (نافذ) کرنے کے اندر کسی قسم کی کوئی تدبیری غلطی یا سہو یا کوئی چوک ہو جائے تو کہا کہ اس سے بھی کوئی بات نہیں ہے کہ کوئی اتنا بڑا نقصان پہنچے گا۔ ساتھ کے ساتھ دیکھتے رہو اور اس کی طرف سے جو نقصان پہنچتا ہے، اس کی حفاظت کا سامان کرتے چلے جاؤ۔

عزیزانِ من! جرم یا گناہ کا تو تصور ہی قرآن مجید میں نہیں ہے کہ اُسے ہم حضورﷺ کی طرف منسوب کریں۔ اب وہ مصیبت اپنے گلے ڈال لی۔ ایک تو انبیائے کرام معصوم ہوتے ہیں یہ ایمان ہے۔ اور ایک طرف یہ چیز ہے کہ یہ رسول اللہﷺ کے گناہ تھے (معاذ اللہ) جن کی طرف خدا نے کہا ہے۔ اب اس الجھن میں آ پھنسے۔

حقیقت کے برعکس ہمارے ہاں متضاد خیالی کی ایک مثال

عزیزانِ من! یہ گناہ نہیں ہے، یہ الزامات ہیں۔ یہ دونوں ہی معنی اس میں آ سکتے ہیں یا یہ کسی قسم کی تدبیری غلطیاں، سہو ہیں۔ جنگوں کے اندر، کئی جنگوں میں، شکست تدبیری غلطی سے تھی۔ اس کا احساس ہوا، اس کو درست کر لیا، اس کے بعد پھر غلبہ حاصل ہو گیا۔ اور یہ تو ہوتا ہے، یہ کوئی جرم نہیں ہے، کوئی گناہ نہیں ہے۔ کہا ہے کہ یہ کر اور وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ بِالۡعَشِیِّ وَالۡاِبۡکَارِ (40:55)۔ یہ چیز تو اپنے متعلق تھی لیکن یہ کسی نقصان سے اپنی حفاظت چاہنا، اس کا ایک Negative (منفی) پہلو ہے یہ Defence (مدافعت) ہے۔ اتنے سے ہی کامیابی نہیں ہوتی مثبت کام ساتھ کرنا ہوتا ہے۔ Positive Action (مثبت عمل) سے کچھ Achievement (فوز) ہوتی ہے۔

لفظ سَبِّحۡ اور حَمۡدِ کے لغوی مفہوم کے تحت نبی اکرمﷺ کی عملی زندگی کا ذکرِ خیر

یہ اگلا حصہ (مثبت عمل) قرآنِ کریم کا پورا پروگرام ہے۔ کہا ہے کہ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ بِالۡعَشِیِّ وَالۡاِبۡکَارِ (40:55)۔ اب سَبِّحۡ کے معنی ہوا ''تسبیح کرنا'' اور حمد کے معنی ہوا ''خدا کی تعریف''۔ اس سے اس کا یوں ترجمہ کیا کہ ''صبح و شام خدا کی حمد یا الحمد للہ کی تسبیح کرتے رہا کرو''۔ یہ ہوا جی! پروگرام۔ یہ معلوم ہے۔ یہ معنی اور اس کے اوپر یہ عمل کیوں ہو رہا ہے؟ یہ وہی فریب نفس ہے۔ وہاں تو یہ کچھ کرنا پڑتا تھا جو حضورﷺ نے کیا۔ مدینے کی زندگی کے اس سات سال کے عرصے میں سَرِیّہ اور غزوات کو ملایا جائے تو وہ قریباً بیاسی

کے قریب لڑائیاں بنتی ہیں۔اور وہ جتنے غزوے تھے جس کو باقاعدہ جنگ کہتے ہیں' اس میں حضورﷺ خود کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے جایا کرتے تھے۔اب ان کی تو یہ کیفیت تھی۔وہ اِدھر 1965ء کی جنگ ہوئی تھی وہ لوگ (ہندوستانی فوج) واہگے تک آ گئے ہوئے تھے۔(ہمارے ہاں کے ان صاحبانِ جُبہ وعمامہ کو) کبھی توفیق بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہاں جا کر یوں جھانک ہی لیں' وہ تو مسجدوں میں بیٹھے ہوئے تسبیحاں پھیرتے رہتے تھے۔اور بعد میں جب یہ چیز ہوئی کہ کوئی ترانے گائے گئے' یا ان سولجرز اور سپاہیوں کی شان میں کچھ کہا گیا' تو انہوں نے کہا کہ لو جی! یہ سارا کچھ ہماری دعاؤں کے اثر سے ہوا ہے اور یہ کریڈٹ ان کو مل رہا ہے۔ٹھیک ہے جی۔ان سے پوچھو کہ جی! وہ 1971ء والی جنگ میں آپ کی دعاؤں نے وہ کچھ کیوں نہ کر دیا۔نہ وہ سفید گھوڑیوں والے آئے' نہ وہ سبز عماموں والے آئے۔آپ نے بھی بڑی تسبیحاں پھیریں' دعائیں بھی کیں مگر مار پہ مار پڑتی گئی۔

عزیزانِ من! سنیے! عربی زبان میں سَبّح کے معنی ہوتے ہیں ''کسی مقصد کے حصول میں انتہائی' جاں توڑ کوشش کرنا' جتنی توانائیاں اندر ہوں' وہ پوری صرف کر دینا''۔یہ ''سَبّح'' اس تیراک کو کہتے ہیں جو پورے بازو آگے کر کے تیرتا ہے' اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو پورے پاؤں کے ساتھ آگے چلتا ہے۔اِن عربوں کے ہاں اس عمل کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔

سفرِ زندگی کے اندر وحی کی روشنی میں ہر آن سرگرداں رہنا حمد کا موجب بنتا ہے

کہا ہے کہ اس پروگرام کی تکمیل میں انتہائی کوشش کرو' اس کے اندر پوری توانائیاں صرف کر دو' اس کے اندر سرگرداں رہو۔اور وہ پروگرام کیا ہے؟ کہا ہے کہ بِحَمْدِ رَبِّکَ(40:55) خدا کے نظام کو ایسا قائم کرو کہ دنیا پکار اٹھے کہ واہ واہ واہ! کیا نظامِ خداوندی ہے۔بے ساختہ کسی چیز کو دیکھ کر زبان پہ جو واہ واہ کا لفظ آتا ہے' اس کے لیے عربی زبان میں حمد آتا ہے۔خدا کے لیے قرآن کریم نے ہر جگہ حمد کا لفظ کہا ہے حالانکہ اس کے ہاں تو مدح اور ثنا اور یہ سارے الفاظ موجود تھے۔قرآن کریم کوئی دوسرا لفظ کہیں نہیں لایا۔اور یہ جو بے ساختہ کسی کی زبان پر اس چیز کا آ جانا ہے' یہ ہے وہ جو نظامِ خداوندی دنیا میں سامنے آئے' بے ساختہ زبان پہ یہ آ جائے۔کہا کہ یہ جو چیز ہے اس کے نظام کو وجۂ حمد وستائش بنانے کے لیے تگ ودو کرو۔یہ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ہے مگر انہوں نے کہا کہ یہ شام کی نماز ہے' یہ صبح کی نماز ہے۔عزیزانِ من! یہ ''صبح وشام'' محاورہ ہے اس کے معنی ہوتا ہے ''مسلسل''۔مسلسل اس طرح سے اس پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرداں رہو۔یہی انبیائے سابقہؑ نے کیا تھا' یہاں کہا ہے کہ یہی آپﷺ کو کرنا ہوگا' پھر خدا کے سچے وعدے تمہارے سامنے آ جائیں گے۔اور آج امتِ حاملِ قرآن کریم کو یہی کرنا ہے۔

سورۃ المؤمن کی آیت 55 تک ہم آ گئے۔عزیزانِ من! 56 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀......❀......❀

چھٹاباب: سورۃ المؤمن (آیات 56 تا 63)

عزیزانِ من! آج فروری 1981ء کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمن کی آیت 56 سے ہو رہا ہے:(40:56)۔

یقینِ محکم کی تاکید اور اس کے نتائج

سلسلۂ کلام حق و باطل کی کشمکش کا چلا آ رہا تھا۔ اور اس میں آخری آیت یہ تھی کہ حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش کی داستان کے بعد نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ یہ سلسلہ یونہی چلا آ رہا ہے۔ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (40:55) استقامت رکھو اور یہ یقین رکھو کہ خدا کا قانون حق ہے۔ وہ اپنے نتائج پیدا کر کے رہتا ہے۔ اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اور یہی وہ یقینِ محکم ہے' جس کی بنا پر عمل میں استقامت یا استقلال حاصل ہوتا ہے۔ یقین نہ ہو تو پھر تذبذب ہوتا ہے' عمل میں استقامت نہیں ہو سکتی۔ یہ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (40:55) ایک ایمان کی چیز ہے' یقین کی چیز ہے۔ اور اس کے نتیجے میں وَاصْبِرْ والی بات ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ کہا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (40:56)۔ مقابلے میں دوسرا فریق ہے۔ اس کے متعلق یہ کہا کہ وہ قوانینِ خداوندی سے جدل کرتے ہیں۔ یہ جدال ہے یعنی جنگ تک کے معنوں میں یہ چیز آتی ہے۔ جدل کے معنی ہیں کہ "لڑنا' جھگڑنا' Confrontation (ٹکراؤ' مڈبھیڑ) کرنا' جنگ تک میں چلے جانا"۔

قرآنِ حکیم کی نظر میں دلیل (Reason) ایک بہت بڑی قوت کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے

یہاں ایک چیز بِغَیۡرِ سُلۡطٰنٍ (40:56) آئی ہے۔عربی زبان جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ایک عجیب وغریب زبان تھی' قرآن حکیم نے بھی اس بِغَیۡرِ سُلۡطٰنٍ کو استعمال کیا ہے۔کہا یہ ہے کہ وہ لوگ بھی ہیں جو قوانینِ خداوندی سے جھگڑتے ہیں' ان کا مقابلہ کرتے ہیں' ان کے ساتھ بِغَیۡرِ سُلۡطٰنٍ جنگ کرتے ہیں۔یہ عرب بڑی عجیب قوم تھی۔میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے لٹریچر میں بہت کم مقام ایسے ہونگے جس میں Reason کو قوت کہا گیا ہو۔میں نے فلسفہ بھی کافی دیکھا' فکری تاریخ بھی دیکھی۔اور یہ Reason کو قوت کہنا بہت بڑی چیز ہے۔اصل قوت ان عربوں کے ہاں بھی دلیل تھی' Reason تھا۔یہ ایک ہی لفظ سُلۡطٰنٍ ہے جو دلیل کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا اور قوت کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ان کی نگاہ کہاں پہنچی ہوئی تھی! اسے عہدِ جاہلیہ کہا جاتا ہے۔وہاں علم کی کوئی کرن' پورے کے پورے اس خطے کے اندر' نظر نہیں آتی لیکن ان کی نگاہ کتنی گہری گئی! آج بڑے سے بڑے مفکر بھی اس مقام پر نہیں پہنچے۔اُس زمانے میں تو خیر کوئی بھی نہیں پہنچا تھا' بعد میں انہوں نے یہ چیز کہی کہ قوت درحقیقت Reason کا نام ہے۔اگر Reason نہیں ہوتا تو اسے قوت نہیں کہتے' اس کو دھاندلی کہا جائے گا۔

کہا کہ یہ لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی کا مقابلہ کرتے ہیں' جھگڑتے ہیں' Confrontation (ٹکراؤ) کرتے ہیں اور اس کے لیے ان کے پاس کوئی Reason نہیں' کوئی دلیل نہیں۔اس لیے یاد رکھو! ان کے پاس کوئی قوت نہیں ہے۔قرآن حکیم نے جسے دنیا کے اندر بڑی قوت کہا ہے' وہ Reason کی قوت ہے' دلیل کی قوت ہے۔اسی لیے وہ اپنے مقابلے میں جو لوگ آتے ہیں' ان سے کہتا ہے کہ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (2:111) اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو دھاندلی سے یہ بات ثابت نہیں ہوسکتی۔اس سے اگر تم غلبہ بھی حاصل کرلو گے تو درحقیقت قوت نہیں ہوگی' وحشی پن ہوگا۔اصل چیز جسے آپ قوت کہہ سکتے ہیں' جسے آپ کامیابی کہہ سکتے ہیں' جسے آپ غلبہ کہہ سکتے ہیں' وہ دلیل سے حاصل ہوتا ہے۔

سُلۡطٰنٍ دلائل کا نام ہے اور سُلۡطٰنٍ وہ قوت ہے جو دلیل کی رو سے حاصل ہوتی ہے۔اس لیے کہا کہ ان کے پاس لَا بُرۡهَانَ لَهٗ (23:117) اس کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے' تم ان سے دلیل مانگو۔تم دیکھو گے کہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔اسی لیے یہاں قرآن حکیم نے لفظ يُجَادِلُوۡنَ کہا ہے۔وہ جدل ہے' وہ دھاندلی ہے جس سے کسی چیز کو منوایا جائے۔کہا کہ یہ جو آئے ہیں' یہ اندھی قوت کی بنا پر' دھاندلی سے یہ چیزیں منوانے کے لیے آئے ہیں۔اور جو چیز دھاندلی سے حاصل کی جائے' وہ اصلی قوت نہیں ہوتی۔ان کے پاس اس کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔اسی لیے اٰتٰهُمۡ کا لفظ ساتھ آیا ہے کہ بات بھی یہ کہی کہ دلیل بھی وہی آخر میں صحیح دلیل ثابت ہوگی جو قوانینِ

خداوندی کو سچا کر کے دکھائے گی۔اسی لیے جب اس نے کہا تھا کہ **لَا بُرۡهَانَ لَهٗ**(23:117) ان کے پاس اس کے لیے کوئی دلیل نہیں ہوگی تو وہ دلیل حقیقت میں وہی ہے جو سچائی اور صداقت کو سچا کر کے دکھانے والی ہے۔وہ ہے حقیقی دلیل۔

کہا ہے کہ اس کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں جو خدا کے قوانین کو سچا ثابت کرنے کے لیے خدا کی طرف سے ان کو ملی ہو۔یہ ہے جسے آپ حجتِ قاطع کہتے ہیں' یہ ان کے پاس نہیں ہے۔اس لیے یہ جدل ہے' دھاندلی ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔اصل یہ ہے۔کہا کہ **اِنۡ فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ اِلَّا كِبۡرٌ** (40:56) یہ دنیا میں بڑائی چاہتے ہیں' قوت چاہتے ہیں' غلبہ چاہتے ہیں۔**كِبۡرٌ** کے معنی تو بڑا ابننا کے ہیں' اصل میں اس کے معنی یہ بڑا ابننا ہوتا ہے لیکن قرآنِ کریم نے کبریائی صرف خدا کے لیے کہا ہے تو کبریائی کے یا بڑا ابننے کے معنی ہوتے ہیں: ''قوت' تسلط' حکمرانی یعنی یہ کچھ حاصل ہونا''۔کہا کہ ان کے دل کے اندر جو اصل خواہش ہے' وہ یہ نہیں ہے کہ یہ اس لیے ان قوانین سے آ کر جھگڑتے ہیں کہ یہ انہیں سچا نہیں سمجھتے بلکہ یہ خواہش ہے کہ یہ اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں' بڑائی حاصل کرنا چاہتے ہیں' کبریائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔کہا کہ اگر **سُلۡطٰنٍ** پاس نہیں ہے' Reason نہیں ہیں' دلائل نہیں ہیں' تو بڑائی حاصل نہیں ہو سکتی۔**مَّا هُمۡ بِبَالِغِيۡهِ** (40:56) انہیں اس طرح وہ اقتدار حاصل ہو نہیں سکتا۔اب یہ دیکھیے کہ جسے **سُلۡطٰنٍ** کہا گیا ہے وہ تو حاصل ہی اس صورت میں ہو سکے گا کہ وہ دھاندلی نہ ہو بلکہ دلیل اور حجت کی بنا پر دوسرے پر غالب آیا جائے۔کہا کہ ان کے ذہن میں یہ بات نہیں ہے۔یہ کسی نہ کسی طریق سے تسلط اور غلبہ چاہتے ہیں' خواہ دھاندلی سے ہی کیوں نہ حاصل ہو جائے۔ان کو یہ نہیں مل سکتا۔ان کی یہ خواہش تو بڑی ہے' اس کا طریقہ غلط ہے جو یہ استعمال کر رہے ہیں۔اس سے غلبہ و تسلط نہیں مل سکتا۔اب اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ان سے کہا کہ **فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ** (40:56)۔

دلیل و برہان کے بغیر اپنی بات کو منوانا دوسروں پر حملہ کرنے کے مترادف ہے' مدافعانہ صورت اختیار کرو

میں نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں جب بھی عام ترجمے کیے جائیں گے تو پھر یہی کچھ ہوگا کہ (مثلاً) **اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم** پڑھ لیا کرو اس سے بڑائی حاصل ہو جائے گی۔سنیے! بڑائی حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔کہا ہے کہ تم اے رسول! ان مخالفین کی ان باتوں کی پرواہ مت کرو۔تم ان کے مضر اثرات سے بچنے کے لیے **فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ** (40:56) قوانینِ خداوندی کی سپر کے پیچھے پناہ لو۔عزیزانِ من! یہ **فَاسۡتَعِذۡ** وہ چیز ہے کہ کسی کو سپر بنا لیا جائے۔اب یہ Offensive (جارحانہ) کی بجائے Defensive Position (مدافعانہ صورت) اختیار کی جا رہی ہے۔اور مقابلے میں پہلی چیز جو ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ اپنی مدافعت اختیار کی جائے اور اسلام کی تو اگر آپ جنگیں بھی دیکھیں گے تو وہ Offensive (جارحانہ) نہیں ہیں خواہ مخواہ دوسرے پر حملہ کرنے والی بات نہیں ہے۔اس کی صورت یہی ہے کہ دوسرا اگر دلائل و براہین سے نہیں مانتا' دھاندلی سے اور قوت سے تمہارے اوپر غلبہ حاصل

کر کے چاہتا ہے کہ حق کو کسی طرح سرنگوں کر دے تو اس مقام پر پھر کہا ہے کہ پھر تو قوت کا جواب قوت سے دینا ہوگا۔ اس سے پہلے Offensive (جارحانہ) نہیں بلکہ Defensive War (مدافعانہ جنگ) کے اندر کسی چیز کو سپر بنا لینا ہے' کسی چیز کی پناہ قبول کر لینا ہے۔ اب یہاں پناہ بھی جو بنائی جا رہی ہے تو وہ بھی قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہے جس کو پناہ بنایا جا رہا ہے۔

انسانی معاشرے میں قوت کا حصول اس آئین سے ہی مشروط ہے جو آئین بذاتِ خود الحق کے ترازو پر پورا اترتا ہو: عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

یہاں اسلام میں تو سارا نظام ہی اس قانون کی اطاعت پہ چلتا ہے۔ یہ قانون کی رو سے حاصل کردہ قوت اسی کی تو دلیل ہے۔ اس کی جو خلاف ورزی ہے' اس کا نام شکست ہے' خواہ غلبہ اور قوت ویسے ہی کیوں نہ حاصل ہو جائے۔ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (40:56)۔ یہاں یہ جو کبریائی کو بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ کہا ہے' ایک دوسرے مقام پر اس کو بِغَیْرِ الْحَقِّ (7:146) کہا ہے: سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (7:146) جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ وہ 'نوعِ انسانی کے لیے تعمیری کام کیے بغیر' دنیا میں بڑائی' غلبہ' تسلط حاصل کر لیں۔۔۔۔۔ اب یہ دیکھیے کہ قرآنِ کریم اس میں ایک Exception (استثنا) کر کے یا ایک شرط لگا کر کتنی اہم چیز بتا گیا ہے۔ یعنی دنیا میں کبریائی حاصل کرنا کوئی بری چیز نہیں ہے' یہ معیوب نہیں ہے۔ اسلام سے (ذرا) Immediately پہلے جو دنیا کا بڑا مذہب آیا تھا وہ عیسائیت تھا۔ اس عیسائیت کے اندر تو قوت' غلبہ' استیلا' حکومت' کبریائی کا تصور ہی غلط تھا' اِس کو تو وہ شر کہتے تھے۔ قرآن کریم ایک دین لے کر آیا ہے۔ یہ ایک نظام زندگی ہے۔ جس میں اس نے کہا ہے کہ زندہ رہنے کے لیے' آگے بڑھنے کے لیے' قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب یہ قوت کا صحیح اور غلط استعمال ہے جہاں جا کر یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ یہ حق ہے یا باطل ہے لیکن قوت بجائے خویش کوئی بُری چیز یا شر نہیں ہے' اس کا تو بڑا ہونا ضروری ہے۔ قوت کے بغیر تو انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا' نہ فرد زندہ رہ سکتا ہے نہ کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہے۔ یہ بڑی ضروری چیز ہے۔ یہ اور کچھ نہیں تو جسے Preservation of Self کہتے ہیں' جسے تحفظِ خویش کہتے ہیں' وہ بھی قوت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ کہا کہ قوت بُری چیز نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بری چیز کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (7:146) الحق کو چھوڑ کر جو بڑائی حاصل کی جائے یا قوت یا کبریائی حاصل کی جائے گی' وہ ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ وہ ہے جو غلط چیز ہے' وہ ہے باطل' وہ ہے بُری چیز یعنی کبریائی بغیر الحق بُری چیز ہے۔ اور حق کے لیے ہو یا حق کے ساتھ ہو تو وہ تو عین تقاضائے حیات' عین تقاضائے دین ہے:

عصا نہ ہو تو کلیمیؑ ہے کارِ بے بنیاد

(اقبالؒ)

الحق کا غلبہ تو قوت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے

یہ دین اسلام محض وعظ ونصیحت کے لیے نہیں آیا تھا۔ دین تو ایک نظام ہے اور نظام تو قائم ہی قوت کی بنا پر ہوتا ہے لیکن جو قوت ہے' اب اس کے لیے قرآن حمید کا انداز دیکھیے کہ وہ کہیں بھی کبریائی کو بُرا نہیں کہہ رہا۔ کبریائی جو بغیر الحق ہے' وہ ہے جسے وہ شر یا سرکشی کہتا ہے۔ اگر وہ حق کے ساتھ ہے' حق کے لیے ہے تو وہ' جیسا میں نے عرض کیا ہے' عین منشائے خداوندی' دینِ خداوندی ہے۔ یہ کبریائی حق کے ساتھ ہے۔ اسی لیے جماعتِ مومنین کو وہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (3:139) کہتا ہے۔ کبریائی کا بھی وہ مقام ہے جو Superlative Degree (درجہ تفضیلِ کلی) ہے' سب سے بلند ترین مقام ہے۔ اور بلند یہ نہیں ہے کہ وہ نظری طور پر ہے' جسے آپ مرتبے کے اعتبار سے کہتے ہیں' نہیں' یہ بالکل اس پر نہیں ہے۔ اَعْلَوْنَ اعلیٰ تو ہوتا ہے' یہ غلبے کے اعتبار سے بڑا ہونا ہے' تو مومن کی وہ یہ کیفیت بتاتا ہے۔ اس لیے جو کبریائی بغیر الحق ہے' وہ تو قرآن حمید کی رو سے باطل ہے۔

مذہب کی دنیا میں الحق کے ساتھ کبریائی کا تو محض نظری سا ایک تصور ہی ہوتا ہے' قوت دلیل کے اندر ہوتی ہے

حق کی خاطر' حق کے لیے' جو کبریائی ہے' وہ تو نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر تو دین قائم ہی نہیں ہوسکتا۔ اگر کبریائی اس کے ساتھ نہ ہو تو وہ مذہب بن کر رہ جاتا ہے۔ یہاں (7:146) میں یَتَکَبَّرُوْنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ کہا ہے تو وہاں (40:56) میں کہا ہے کہ یہ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ ہے۔ یہ اور وہ ایک ہی بات ہوتی ہے۔ الحق بھی جو اپنے آپ کو منواتا ہے تو وہ دلیل کی رو سے منواتا ہے۔ کہا ہے کہ اُدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ (12:108)۔ نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا گیا کہ کہہ دو کہ ''ہم جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں' میں اور میرے جو متبعین ہیں' وہ علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتے ہیں''۔ یہ ایمان اندھا Faith (عقیدہ) نہیں ہے کہ جس کو ویسے تم نے مان لینا ہے۔ یہ Conviction (علیٰ وجہ البصیرت قائل ہونے) کا نام ہے' یہ Convince (بصیرت کی بنا پر قائل) ہونے کا نام ہے۔ یہ علیٰ وجہ البصیرت پیش کیا جائے گا اور غور وفکر کی بنا پہ اس کو مانا جائے گا۔ اس لیے اس میں جو سُلْطٰنٍ ہے' وہ دلیل کے لیے ہے' سُلْطٰنٍ ہی قوت ہے۔ میں نے جیسا عرض کیا تھا' یہ دنیا کے مفکر ہی اس کو Appreciate (پسند) کریں گے کہ ایک ہی لفظ کے اندر قرآن حمید نے دونوں باتیں' دلیل کے بغیر اور دلیل کے ساتھ' کیسے کہہ دی ہیں۔ دلیل ہی کے اندر قوت ہے۔

کبریائی کے لیے غالب آنے کی' اصل قوت دلیل کی قوت ہے' کائنات میں خدا وہ قوت ہے جس کے قانون کے زور پر سلسلۂ کائنات قائم ہے: سائنسدانوں کا بیان

عزیزانِ من! یہ ایک بڑی عجیب چیز ہے کہ جو اصل قوت ہے' وہ دلیل کی قوت ہے جس قوت پر کوئی دوسرا غالب ہی نہیں آسکتا۔

اگر دوسرے کے پاس حق کی دلیل نہیں ہے تو وہ اس پر غالب نہیں آ سکتا۔ جو اس کے بغیر کبریائی حاصل کرتے ہیں' اسے اس نے باطل کہا ہے' اس کا نام دھاندلی رکھا ہے یعنی وہ قوت جس کے ساتھ دلیل نہ ہو۔

یہاں فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ (40:56) کہا ہے کہ اللہ کے قانون کی سپر کے پیچھے پناہ لو۔ اس قانون میں قوت ہے اور یہ دلیل پر مبنی ہے۔ قرآن مجید نے کئی ایک مقامات پر یہ کہا ہے کہ ان لوگوں سے جب یہ کہو کہ یہ آسمان کس نے بنایا' زمین کس نے بنائی ؟ تو کہیں گے کہ ہاں' خدا نے بنایا۔ جو یہ پوچھیں کہ گردشِ لیل ونہار کس کے زور سے ہوتی ہے؟ یہ کہیں گے کہ خدا نے کیا ہے ۔یعنی یہاں تک تو خدا کو مانتے ہیں کہ یہ زمین و آسمان اور یہ سلسلہ لیل ونہار خدا کے قانون کی قوت سے چل رہا ہے۔ آج بھی مغرب کی وہ قوتیں' جو انسانی زندگی کے اندر خدا کے قانون کو نہیں مانتیں' کائنات کے اندر وہ ہم سے بھی زیادہ اس کے قانون کی قائل ہیں ۔ یہ بڑے بڑے سائنٹسٹ انہی قوموں میں پیدا ہو رہے ہیں ۔ ان کی کتابوں میں آپ دیکھیے' وہ اس نظامِ کائنات کے متعلق قدم قدم پر یہ بات کہیں گے کہ ہاں! وہ ایک قوت ہے جس کے قانون کے زور پر یہ سلسلۂ کائنات قائم دائم ہے اور چل رہا ہے۔

ظہورِ قرآن کریم کے زمانے میں عرب بھی' آج کے مفکرین کی طرح' خارجی کائنات میں خدا کو مانتے تھے' اپنی دنیا میں نہیں' یہ متضاد کیفیت کیوں؟

یہی وہ چیز ہے جو خود ظہورِ قرآن کریم کے زمانے میں بھی وہ لوگ تھے جو اس حد تک تو خدا کو مانتے تھے۔ خود عرب خدا کے قائل تھے۔ عہدِ جاہلیت میں عبداللہ تو حضور نبی اکرم ﷺ کے والد کا نام تھا۔ یہ اللہ کو مانتے تھے لیکن کس اللہ کو مانتے تھے؟ وہی جو آج اس دورِ تہذیب میں ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب کے سائنسدان' مغرب کے مفکر' اس حد تک تو خدا کو مانتے ہیں کہ خارجی کائنات میں تو اس کے قوانین چلتے ہیں۔ اور جو انسانوں کی دنیا آتی ہے تو اس میں وہ کہتے ہیں کہ نہیں! یہاں سیکولرازم ہے' یہاں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کارفرما ہونگے۔ یہ ہے جو ان لوگوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ قرآن کریم ان سے بھی اس زمانے میں یہ کہتا ہے' وہ آج بھی یہ کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس طرح کے خدا کا ماننا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ جس خدا کا ماننا یا نہ ماننا انسانی زندگی پہ اثر انداز نہیں ہوتا' اس کا ماننا یا نہ ماننا یکساں ہے' اس کے کچھ معنی نہیں ہیں۔ عزیزانِ من! اس کے لیے بہت سی آیات ہیں' آپ دو حوالے (29:61; 35:11) لکھ لیجیے۔ آپ وہاں دیکھیں گے کہ وہ ایک ایک چیز کو لاتا ہے۔ (مثلاً یہ کہ) کھیتی کون اگاتا ہے؟ یہ کہیں گے کہ یہ خدا ہے۔ بارش کون برساتا ہے؟ یہ کہیں گے کہ یہ خدا ہے۔ یہ شمس وقمر کی منازل کون طے کراتا ہے؟ یہ کہیں گے کہ یہ خدا ہے۔ اور اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ

جب یہاں تک تم مانتے ہو کہ یہ سارا کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہے اور قانون اتنا اٹل ہے' اس کو بھی تم مانتے ہو تو آگے جا کر کہتا ہے کہ جب پھر تم اپنی دنیا کی طرف آتے ہو تو پھر تمہیں کیا موت پڑ جاتی ہے جو کہتے ہو کہ انسانی دنیا میں انسان کا قانون چلتا ہے' خدا کا نہیں۔ یہاں پہنچنے کے بعد تم اپنے پہلے کلیے کو کیوں چھوڑ دیتے ہو۔

اب جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ وہ کچھ چودہ سو سال پہلے کے عہدِ جاہلیت کی جو کیفیت تھی' آج اس دورِ تہذیب میں بھی یہی کیفیت ہے۔ یورپ کے تمام سائنٹسٹ' مفکر' مدبر' تمام کے تمام' اس خدا کو مانتے ہیں جس کا قانون کائنات کے اندر کارفرما ہے بلکہ وہ تو اس خدا کو اس طرح مانتے ہیں' اس یقین کے ساتھ مانتے ہیں کہ ہم بھی اس یقین کے ساتھ نہیں مانتے ۔ان کی کتابوں کو آپ پڑھیے اور اس کے بعد آپ دیکھیے کہ وہ کائنات کے قوانین کی Study (مطالعہ) کرنے کے بعد بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ یہ قرآن مجید کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔یعنی ان کا اس خدا پہ ایمان علیٰ وجہ البصیرت ہے' دلائل کی بنا پہ ہے' تجربات اور مشاہدات کی بنا پر ہے۔اور وہ یقین بڑا پختہ ہے۔اور دن بدن جوں جوں اپنے تجارب میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں' وہ یقین پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جاتا ہے لیکن' انہی ممالک' انہی اقوام' میں جن کو یہ Belong کرتے ہیں' وہ لوگ انسانوں کی زندگی کے اندر سیکولرازم کے قائل ہیں کہ یہاں انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے قوانین چلیں گے۔جو کچھ اس نے اس زمانے کے ان لوگوں سے کہا تھا' یہی وہ ان سے کہتا ہے کہ خارجی کائنات میں تم اس کے قائل ہو' انسانوں کی زندگی کے اندر اس کے قائل کیوں نہیں ہو۔

کائنات کی وسعت کے سلسلہ میں علمِ انسانی کی بے بسی

عزیزانِ من! یہ عجیب دلیل ہے۔کہا ہے کہ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ (40:57) یہ جو تخلیقِ کائنات ہے' یہ انسان کی تخلیق کے مقابلے میں تو بہت بڑی چیز ہے۔اور قرآن مجید بات بہت عجیب کہہ گیا ہے۔کائنات کا تو ابھی تک کوئی ذہن بھی احاطہ نہیں کرسکتا۔یعنی جو اتنے بڑے بڑے ان کے ہاں کے سائنٹسٹ ہیں' وہ بھی نیوٹن (1624-1727ء) کے الفاظ میں یہ کہہ رہے ہیں کہ ''ہم تو علم کے سمندر کے کنارے پہ بچوں کی طرح گھونگھے چن رہے ہیں''۔ نیوٹن [1] جیسا مفکر' جس کا اس

---

[1] اسی نیوٹن کے بارے میں ایک پاکستانی مؤرخ ڈاکٹر مبارک علی صاحب کا ایک مضمون پڑھیے۔لکھتا ہے کہ

There is an interesting story about the great scientist, Issac Newton. "when he was a student at Cambridge University, he showed his professor his research in mathematics. The professor, a leading mathematician of his time, was so impressed with his work that he resigned from his chair and recommended Newton in his place (Mubarak Ali : Past Present , Dawn, January 16,2011, Karachi, (review)/ P.11).

سائنس کی دنیا میں آج تک مقابلہ نہیں ہوسکا' وہ یہ کہتا ہے کہ ''ہم تو علم کے سمندر کے کنارے پہ بچوں کی طرح سے یہ سیپیاں چن رہے ہیں''۔کائنات کے متعلق جیمز جینز (1946-1877ء) جیسا علم الافلاک کا ماہر یہ کہہ رہا ہے کہ ہم تو' یہ جسے تم کہکشاں کہتے ہو' اس کے ایک ذرے کے برابر بھی ابھی معلومات نہیں رکھتے۔اور Universe (کائنات) کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ یہ The Expanding Universe ❶ (پھیلتی ہوئی کائنات) ہے۔یہ بھی نہیں کہ اس کی کہیں حد قائم ہوگئی ہے اور اب جامد ہوگئی ہے' اس سے آگے نہیں پھیلتی۔ہم اس پوری کائنات کے متعلق بھی علم حاصل کر لیں تو اتنے میں تو یہ اور بڑھ چکی ہوگی' Expand (پھیل) چکی ہوگی۔گویا کائنات کا جو عظیم ہونا ہے اس کے یہ سب قائل ہیں۔

تخلیقِ آدم کی ابتدا: اوّلین جرثومۂ حیات

سب سے بڑی چیز تو یہ ہے جہاں قرآن حمید اس دلیل کو لاتا ہے کہ یہ کائنات جو وجود میں آئی ہے' یہ پہلے Nothingness تھی' عدم تھا' کچھ نہیں تھا۔''کچھ نہیں'' سے یہ کائنات وجود میں آئی۔یہ تو بہت ہی بڑی چیز ہوئی۔انسان کی تخلیق تو پھر بھی تخلیقِ کائنات کے بعد شروع ہوئی ہے۔اس کی ابتدا تو پھر بھی اس ایک کائناتی شے سے ہے جو پہلے موجود تھی۔یہ خواہ وہ پانی اور وہ جوہڑوں کے کناروں کی مٹی' طِینِ لازب ہی کیوں نہ ہو۔جہاں تک آپ کی سائنس پہنچی ہے اور قرآن حمید بھی یہ کہتا ہے کہ وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ(21:30) انسان کی تخلیق کی ابتدا اس چپچپی مٹی سے ہوئی ہے جو پانی اور جوہڑ کے کنارے کی مٹی سے مل کر بنتی تھی۔وہاں سے یہ اولیں جرثومۂ حیات وجود میں آیا۔

انسان کے لیے اشرف المخلوقات کا تصور خود ساختہ ہے' اس سے اکبر تخلیق بھی ہے اور انسان کے لیے قوانین خداوندی بھی ہے۔

یہاں قرآنِ حکیم کیا عجیب چیز کہتا ہے! اُس نے خلق سماوات والارض کو اکبر کہا ہے۔ویسے یہ ذہن میں نہیں آتا کیونکہ انسان کو تو قرآن حکیم نے خود کہا ہے کہ بہت سی مخلوق ہے جسے ہم نے اشرف بنایا ہے۔ضمناً عرض کر دوں کہ یہ جو ہمارے ہاں انسان کو اشرف المخلوقات کہتے ہیں' یہ اس نے اپنے ہی ذہن سے وضع کیا ہے۔قرآنِ کریم میں ہے کہ بہت سی مخلوق سے ہم نے اس کو اشرف بنایا ہے۔گویا اور مخلوق ایسی بھی ہے جو اس سے بھی اشرف ہے لیکن بہرحال قرآن حکیم نے انسان کا بہت بڑا مقام بتایا ہے۔اس کو احسنِ تقویم میں پیدا کیا ہے' بہت سی اشیائے کائنات پر اس کو اشرف بھی بتایا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی جو تخلیق کی ابتدا ہوئی ہے' وہ عدم سے نہیں

---

❶ Expanding Universe ایک کتاب کا بھی نام ہے جو مارک اے۔گارلک Mark A. Garlick نے تحریر کی ہے۔

ہوئی۔اس کے لیے قرآنِ حکیم نے اسے لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا (76:1) کہا ہے کہ تم قابلِ ذکر چیز نہیں تھے۔ شے تو تم یہ تھے لیکن ایسے نہیں تھے کہ ذکر کرنے کے قابل ہو۔اس کی جو تخلیق کی ابتدا ہوئی ہے' تو اس میں سائنس کی تحقیقات یہ ہیں جو قرآنِ حکیم نے نفسِ واحدہ کہا ہے۔ وہ یہی ہے کہ ابتداً پانی اور وہ جو مٹی ہے' اس کی موجودگی سے آگے سلسلہ چلا ہے۔ایک تو تخلیق یہ ہے اور ایک تخلیق وہ ہے کہ پہلے کچھ بھی نہیں تھا اور وہ سماوات والارض وجود میں آئی۔ کہا ہے کہ کہو کہ ان دونوں میں سے کس کی تخلیق زیادہ اکبر ہے۔ جسے آپ ناممکنات میں سے کہتے ہیں۔ جسے آپ کہیں گے کہ ہاں صاحب! یہ بہت بڑی چیز ہے جو خدا نے بنا دی۔یعنی جسے ہم عدم سے وجود میں لائے ہیں۔کہو کہ اس کی وہ تخلیق زیادہ بڑی ہے یا انسان کی تخلیق بڑی ہے کہ جو بہر حال ارتقائی منازل کتنے ہی طے کر کے یہاں تک پہنچا ہو' ابتدا تو اس کی پھر بھی مادی زندگی سے ہوئی ہے۔اور کائنات کی ابتدا Nothingness سے ہوئی ہے' عدم سے ہوئی ہے۔تو بتاؤ کہ وہ بڑی ہے یا یہ بڑی ہے۔کیا دلیل ہے قرآنِ حکیم کی! اس لیے باہر کی کائنات کے متعلق تو تم یقینِ محکم رکھتے ہو کہ وہاں خدا کے قوانین کارفرما ہیں تو جو اس سے نچلے درجے کی ایک مخلوق ہے جسے انسان کہا جاتا ہے' اس کی دنیا میں' اس کے قوانین کیوں نہ کارفرما ہونگے۔قرآنِ حکیم کیا دلیل دیتا چلا آ رہا ہے! چھوٹے درجے پر تو اس کے قوانین اور بھی زیادہ قوی ہونے چاہئیں۔

خدا نے کائنات کے اس قدر محیر العقول سلسلے کے لیے غیر متبدل اور محکم قوانین دیئے ہیں

یہاں پہنچ کر قرآن مجید کہتا ہے کہ تمہیں کیا موت پڑ جاتی ہے' کدھر بہک جاتے ہو' وہاں تک تم چلے آتے ہو کہ کائنات میں قوانینِ خداوندی کی کارفرمائی ہے' ایک ایک کڑی کے اوپر چلے آتے ہو' جب انسان تک پہنچتے ہو تو یہاں پہنچنے کے بعد کہتے ہو کہ نہیں صاحب! یہاں کوئی خدا نہیں ہے' یہاں انسان کے اپنے قوانین چلیں گے۔اور اس کے بعد پھر دیکھ رہے ہو جو نظارہ ہو رہا ہے انسان کے قوانین کو چلا کر۔کہتا ہے کہ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (40:57)۔کیا بات ہے اَكْثَرَ النَّاسِ کی! اکثریت انسانوں کی وہ ہے جو یہ بات نہیں سمجھتی کہ اتنا بڑا عظیم کارگہ کائنات اس کے قوانین کے تابع چلتا ہے تو انسان کی زندگی اس کے قوانین کے تابع کیوں نہیں ہوگی۔اب وہ دو مثالیں لاتا ہے۔ایک تو طبعی قوانین ہیں تم Physical Laws کہتے ہو اور انسانی جسم کے بارے میں انہیں Biological Laws کہتے ہو۔قرآن مجید نے کہا ہے کہ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ (40:58) یہ تو تم دیکھتے ہو اور تم میں سے ہر ایک یہ کہہ دے گا کہ یہ اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتے۔اس میں تو تم میں سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا۔گویا یہ ایسی بیّن مثال دی ہے' جس سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا۔لیکن صرف یہی طبعی یا حیاتیاتی قوانین ہی نہیں دیئے۔

طبعی قوانین کے ساتھ' انسانیت ساز' بصیرت پر مبنی' وحی خداوندی کے غیر متبدل اقدار و قوانین بھی دیئے ہیں

عزیزانِ من! یہ Physical Law (قانونِ طبعی) ہے جس کے مطابق تم نے کہا کہ دیکھنے والا اور اندھا برابر نہیں۔ دوسری طرف یہ بھی کہا ہے کہ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ (40:58) اسی طرح سے انسانوں کی زندگی کے اندر بھی جو قوانینِ خداوندی کا اتباع کر کے چلتے ہیں اور جو اس سے منہ موڑ کر چلتے ہیں' وہ دونوں بھی برابر نہیں ہو سکتے۔ وہاں تو تم کہتے ہو کہ اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتا' بصارت کی حد تک تو تم مانتے ہو' بصیرت میں آ کر پھر تمہیں کیا ہو جاتا ہے جو تم یہ نہیں مانتے کہ یہ قوانین بھی خدا ہی کے دیئے ہوئے ہیں' انسان کے وضع کردہ نہیں ہیں۔ کیا دلائل ہیں قرآن مجید کے! کہا کہ وہی قانون یہاں بھی کارفرما ہیں۔ یہ جو آنکھوں والا اندھا ہوا تھا' وہ اس کے قوانین کی خلاف ورزی سے ہوا تھا۔ اسے تو تم اندھا مانتے ہو۔ یہ جو انسان کی طبعی زندگی ہے یعنی مثال بھی خارجی کائنات میں خود انسان کی زندگی کی دی ہے کہ انسان کی طبعی زندگی کے اندر جو کچھ طبعی قوانین کی رو سے ہوتا ہے' اسے تو تم تسلیم کرتے ہو کہ ہاں ٹھیک ہے۔ پھر اس کے علاج کی طرف تم آتے ہو' وہ بھی ہمارے قوانین کے مطابق آتے ہو۔ نابینائی کے علاج بھی ہوتے ہیں' تو کہا ہے کہ یہ دیکھنے بھالنے والا اندھا کیسے ہو گیا؟ اسے تم مانتے ہو کہ ہمارے قانون کی خلاف ورزی سے ہوا ہے۔ پھر جو اندھا ہے' وہ بینا کس طرح سے ہو گا؟ وہ ہمارے قانون کے اتباع سے ہو گا تو کہا کہ خود تم اپنی زندگی میں جہاں تک Physical Laws (طبعی قوانین) کا تعلق ہے' وہ تو روزمرہ کا تمہارا مشاہدہ ہے' علم ہے' اقرار ہے' ایمان ہے۔ کہتا ہے کہ اسی طرح سے ذرا آگے چلو تو ہمارے قوانین کی خلاف ورزی سے تمہارے ہاں کی انسانی زندگی میں جو فرق آتا ہے' اسے تم تسلیم نہیں کرتے۔ کیا بات ہے! کہا ہے کہ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ (40:58)۔ پہلے کہا تھا کہ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (40:57)' یہاں کہا ہے کہ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ (40:58) بہت تھوڑے ہیں جو اس قسم کے حقائق کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ ذکر کے معنی ''حقائق کو سامنے رکھنا'' ہوتا ہے۔ یہ بہت تھوڑے لوگ ہیں جو رکھتے ہیں۔

خارجی کائنات اور انسانی دنیا' دونوں میں' خدا کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے' کہا یہ ہے کہ اس الساعت میں کوئی شک وشبہ نہیں' بس استقامت رکھو

حقیقت تو یہی ہے کہ Physical Laws (طبعی قوانین) کے اندر جس طرح سے سامنے دیکھ کر تم تسلیم کر لیتے ہو کہ یہ اندھا پن خدا کے قانون کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے' اس سے بینائی کی طرف آنا ہے تو اسی کے قانون کی رو سے آنا ہے اُسی طرح انسانیت کی

دنیا کے اندر رہے۔ وہاں خارجی کائنات تک تو یہ سارا تم ہر وقت اپنے سامنے رکھتے ہو لیکن اس کی یہ جو Values (اقدار) ہیں' ان کے انکار سے جو اندھا پن پیدا ہوتا ہے' وہاں اس بات کو تم اپنے سامنے نہیں رکھتے کیونکہ یہ بصارت نہیں بصیرت ہوتی ہے۔ اب نبی اکرم ﷺ سے کہا۔ یہ پھر وہی بات آ رہی ہے وہی کشمکش ہے' درمیان میں کچھ دلائل خارجی کائنات کے اور انسان کی طبعی دنیا کے متعلق آئے ہیں۔ نقطۂ ماسکہ تو اس کا یہی ہے کہ یہاں حق اور باطل کی ایک جنگ چلی جا رہی ہے۔ خارجی کائنات میں بھی چلی جا رہی ہے' انسانوں کی دنیا کے اندر بھی چلی جا رہی ہے۔ بتانا اس نے یہ ہے کہ راستے میں کتنی ہی کسی کو شکست ہو' کتنا ہی کوئی غلبہ حاصل کر لے' آخر الامر غلبہ اور تسلط قوانینِ خداوندی ہی کی رو سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جس طرح باہر کی دنیا میں ہے' اسی طرح انسانوں کی دنیا میں بھی ہے' وہاں بھی اسی خدا کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی کے قانون کے مطابق یہ نہیں ہو سکتا کہ جو لوگ زندگی کی مستقل اقدار پر یقین رکھ کر ایسے کام کریں جو اُن کی ذات (Personality) اور معاشرہ کو سنوارنے والے ہوں' وہ اُن لوگوں جیسے ہو جائیں جو معاشرہ میں ناہمواریاں اور بگاڑ پیدا کر سکیں۔ حیرت ہے کہ تم ایسی کھلی ہوئی حقیقت پر بھی غور نہیں کرتے!

اب نبی اکرم ﷺ سے ہی تخاطب تھا' اسی کشمکش کا ذکر چلا آ رہا تھا۔ اور وہاں یہ کہا ہے کہ استقامت رکھو' جم کر کھڑے رہو' گھبراؤ نہیں' جی نہ چھوڑ جاؤ۔ سنو! اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيۡبَ فِيۡهَا (40:59) یاد رکھو! یقین رکھو! یہ انقلاب جس سے یہ حقیقت نمایاں ہو جائے گی یہ دونوں گروہ برابر نہیں ہو سکتے' واقع ہو کر رہے گا۔ اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيۡبَ فِيۡهَا کی بات کتنے تیقّن کے ساتھ' کتنے تحکّم کے ساتھ' ہو رہی ہے۔ کہا ہے کہ یقین جانو کہ السَّاعَةَ آنے والی ہے' آ کر رہے گی۔ اس کے آنے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

ہر بات کو آخرت پر نہیں چھوڑا جا سکتا مگر ہمارے ہاں یہی ہوتا ہے

کہا ہے کہ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ (40:59) لیکن بات یہ ہے کہ ان کی اکثریت ان لوگوں کی ہے کہ یہ سارا کچھ' جو کچھ ہے' وہ دیکھ بھی رہے ہیں' ہم سمجھا بھی رہے ہیں' دلائل بھی دے رہے ہیں' اس کے باوجود ان کو اس کا یقین نہیں آتا کہ السَّاعَةَ آ جائے گی۔ یہ السَّاعَةَ ہے۔ اس سے پہلے بھی یہ چیزیں آ چکی ہیں لیکن چونکہ جب بھی آتی ہیں' اس مقام کے لحاظ سے ضروری ہے کہ اس کو ذرا وضاحت سے بیان کیا جائے۔ ہمارے ہاں تو میں نے جیسے کہا ہے' قرآن حمید کو' دین کو' اس کے قوانین کو' ان نتائج کو' ہر چیز کو' آخرت پر اٹھا رکھا ہے۔ اور السَّاعَةَ کا ترجمہ ہی وہی قیامت کیا جاتا ہے۔ وہاں جو آخر کی قیامت آنے والی ہے میں بار بار یہ کہتا ہوں کہ وہ حیاتِ آخرت' وہاں کی زندگی' وہاں کی یہ تمام چیزیں' اس پر ہمارا ایمان ہے' اس کے بغیر تو ہم قرآن حمید کو

ہاتھ میں نہیں لے سکتے' وہ تو اتنی بڑی اہم چیز ہے لیکن یہ بات نہیں ہے کہ یہ جو الفاظ ہیں' ان کو ہم آخرت تک اٹھا رکھیں اور اس زندگی سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ رکھیں۔

لفظ السَّاعَةَ کا دل ونگاہ کی بصیرت کو جلا بخشنے والا مفہوم

السَّاعَةَ آپ دیکھیے کہ قرآن حمید نے کن معنی میں استعمال کیا ہے۔اس مقام پہ میں بتاتا ہوں۔اگر میں اسی موضوع پہ آجاؤں تو میں کتنے ہی درس اس موضوع پہ دے سکتا ہوں کہ السَّاعَةَ کن معنی میں' قرآن حمید نے' استعمال کیا ہے۔یہ ''ساعت'' ویسے تو گھڑی کو کہتے ہیں' Modern Arabic (جدید عربی) میں بھی ''ساعت'' گھڑی کو کہتے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا ہوتی ہے؟ کیا بات ہے اس قوم کی! اس زمانے میں ان کے پاس گھڑی تو ہوتی نہیں تھی کہ انہیں معلوم ہو کہ اس میں یہ ایک سے دو کیسے بجتے ہیں؟ ہوتا یہ ہے کہ Gradually (بتدریج) ایک ایک سیکنڈ سے اس کی سوئی آگے بڑھتی ہے۔اگر کسی گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی نہ ہو اور منٹ کی بھی نہ ہو' اُسے عمر بھر سامنے رکھیں تو آپ کو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ ایک سے دو بجنے کے لیے کچھ ہو رہا ہے' کیسے ہو رہا ہے' یہ گھنٹوں کی سوئی کیسے چل رہی ہے۔اس طرح قریباً غیر مرئی طور پہ وہ چلے گی کہ وہ محسوس طور پہ نظر بھی نہیں آئے گا لیکن' وہ چل رہی ہوتی ہے یا یہ جو Standing Clock ہیں Strike کرنے والے' آپ کو اس وقت پتا لگتا ہے جب وہ ٹن کرتا ہے۔تو یہ چیز جو Gradually (بتدریج)' آہستہ آہستہ' کسی مقام تک پہنچے اور اس کا پتا ہمیں اس وقت چلے جب وہ محسوس طور پہ سامنے آجائے تو اس کے لیے عرب السَّاعَةَ کا لفظ بولتے تھے یعنی ''کسی چیز کا بتدریج آگے چلتے جانا اور پھر ہمارے ذہن میں اس وقت آنا جب وہ محسوس شکل اختیار کر لے''۔

اب آپ دیکھیے کتنی بڑی چیز ہے جو قرآن حمید کہہ گیا ہے۔قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ جو غلط نظام ہے' اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔یہی نہیں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا' وہ اٹھ کر جھگڑتے ہیں۔وہ کیا کہتے ہیں اور تم کیا کہتے ہو؟ یہ کہ غلط نظام کے حامل تو پھلتے ہیں' پھولتے ہیں' پنپتے ہیں' کامیابیاں کامرانیاں حاصل کرتے ہیں' دولت ہے' حشمت ہے' عزت ہے' وقار ہے۔سب کچھ تو ان کو مل رہا ہے۔اب تم کہتے ہو کہ اس کا نتیجہ تباہی ہے' بربادی ہے۔یہ کیسے ہے؟ وہ کہتا ہے کہ غلط نظام کے جو اعمال ہیں' افعال ہیں' یہ نتائج مرتب کیے جا رہے ہیں لیکن' غیر محسوس طور پر یہ سلسلہ چل رہا ہے' اس گھڑی کی طرح جس کی یہ منٹ کی اور سیکنڈ کی سوئیاں نہ ہوں لیکن' وہ سلسلہ تو چل رہا ہے۔یہ ایک وقت آتا ہے خدا کے حساب کے مطابق یا قانونِ خداوندی کے حساب کے مطابق۔یہ جسے آپ ٹائم بم کہتے ہیں' یہ السَّاعَةَ وہ ہوتی ہے کہ اس کو وہ اس پر ایڈجسٹ کر دیتے ہیں۔یہ یونہی ناریل کی طرح پڑا ہوتا ہے' کسی کو پتا ہی نہیں

چلتا۔ وہ جو اس کا وقت آتا ہے' وہ گھڑی جب آتی ہے تو اس وقت وہ پھٹ پڑتا ہے۔ ہماری آپ کی نگاہوں میں وہ وہی وقت ہوتا ہے اس کا بم پھٹنے کا حالانکہ وہ قانون کی رو سے کتنا ہی پہلے سے اس کا سلسلہ شروع ہوا ہوتا ہے۔ پتا نہیں اندر کیا کیا Changes (تبدیلیاں) آ رہی ہوتی ہیں لیکن اس نے ایک ساعت کے اوپر آ کر نمودار ہونا ہے۔ اندازہ لگایئے کہ قرآنِ کریم بات انسانی نظام کے غلط نتائج یا تباہ کن نتائج کے برآمد ہونے کے وقت کی کر رہا ہے۔ سمجھا رہا ہے **اَلسَّاعَةَ** کے ذریعے کہ جس کو Gradually (بتدریج) کسی ایسے مقام پہ پہنچنا ہے کہ آپ کی نگاہوں کے سامنے مرئی طور پر وہ اسی وقت آئے گی اور تم اسے کہو گے کہ یہ اچانک ہو گیا۔ وہ کہتا ہے یہ اچانک نہیں ہوتا' بہت پہلے سے اس کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

باطل اور غلط نظام کے تباہ کن نتائج بہت پہلے سے مرتب ہونے شروع ہو گئے ہوتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ غیر مرئی طور پر مرتب ہوتے رہتے ہیں تا اینکہ ایک وقت آ جاتا ہے جب انہوں نے غیر محسوس سے محسوس شکل میں تمہارے سامنے آنا ہوتا ہے۔ تم اس وقت اس کو انقلاب کہتے ہو حالانکہ یہ انقلاب بہت پہلے سے شروع ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ **سَرِيْعُ الْحِسَابِ** ہے۔ دیکھیے **اَلسَّاعَةَ** کا لفظ کس مقام پہ آیا ہے اور وہاں کس طرح سے یہ بات نمایاں طور پہ سامنے آ جاتی ہے۔

انسانی زندگی کے لیے داستانِ بنی اسرائیل کی مثال کہ تخریبی نظام کے تباہ کن نتائج نے نمودار ہونا ہے

اب یہ پھر وہی کشمکش حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون ہے۔ ایک تو یہ جو داستان بنی اسرائیل ہے یہ خود ان کے ہاں تورات میں بھی اور تاریخ میں بھی' بڑی تفصیل سے مشہور ہے۔ اور وہ کشمکش کا سلسلہ بھی کچھ ایسا کڑی کے ساتھ کڑی ملتے ہوئے مربوط چلا آ رہا ہے' کہ بات ساری سمجھ میں آ جاتی ہے کہ یہ ہوتا کس طرح سے ہے' یہ انقلاب لانے والا اس انقلاب کو لاتا کیسے ہے' کشمکش کے آخری مراحل ہوتے کیا ہیں؟ یہ داستانِ بنی اسرائیل کے اندر' حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش میں ربط بھی ہے' تسلسل بھی ہے اور بڑی نمایاں بھی ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم زیادہ توجہ اسی کی طرف دلاتا ہے۔ شہادت میں اسی کو پیش کرتا ہے۔ اب یہ جو فرعون کی چیز تھی' اس میں یہ ہے کہ فرعون کے غلط نظام کے' تخریبی نظام کے' تباہ کن نتائج آہستہ آہستہ مرتب ہو رہے تھے۔ وہ اس مقام کی طرف پہنچ رہے تھے جہاں اس نے آخر الامر نمودار ہونا ہے' محسوس شکل میں سامنے آنا ہے۔

داستانِ فرعون میں ''اَنَا رَبُّکَ'' کی عظمت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے

بات حضرتِ موسیٰؑ کی ہو رہی ہے۔ وہ طور پہ جاتے ہیں' جہاں انہیں اس کے لیے پیغام دیا جاتا ہے۔ وہاں کہا ہے کہ **اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ** (20:12). کیا بات ہے جلال کی! ورنہ قاعدے کی رو سے ''اِنِّیْ'' کافی تھا کہ میں تمہارا رب ہوں۔ فرعون کہتا تھا کہ **اَنَا رَبُّكُمُ**

الْاَعْلٰی (79:24) ۔یہاں حضرتِ موسیٰؑ سے بات ہو رہی تھی۔ یہ اِنِّیٓ جو ہے' اس میں کچھ تھوڑا سا پیار' Affection ' تھوڑی سی محبت' لگاؤ' تعلق ہوتا ہے' اس میں جلال نہیں ہوتا۔ اس کے بھی معنی عربی زبان میں ''میں'' ہی ہوتے ہیں۔ ایک یہ ''میں'' ہوتا ہے اور ایک وہ جو ''ہمارے دستخط اور مہرِ عدالت سے جاری ہوا'' ہوتا ہے۔ دیکھا وہ ''ہم'' جو بولتے ہیں' وہ عدالت والا ''ہم'' ہوتا ہے۔ ایک یہ ہوتا ہے۔ ایک وہ اَنَا ہوتا ہے اُس کے اندر جلال ہوتا ہے۔ اب یہاں بات حضرتِ موسیٰؑ سے ہو رہی ہے تو ان سے تو اِنِّیٓ کہا جا رہا ہے۔ بات آگے چل رہی ہے کہ معاملہ کیا آ رہا ہے۔ وہاں اَنَــا کہتے ہیں۔ ان سے بات ہوئی تو حضرتِ موسیٰؑ سے کہا کہ سنو! وَ اَنَــا اخْتَرْتُکَ (20:13) ہم نے ایک مشن کے لیے تمہیں منتخب کیا ہے' چن لیا ہے۔ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی (20:13) کان لگا کر سنو جو ہم کہہ رہے ہیں۔ ہم نے تمہیں ایک خاص مشن کے لیے چن لیا ہے۔ یہاں تو اتنا ہی اخْتَـــــــرْتُکَ کہا۔ وہاں (20:41) میں بہت خوبصورت' بہت بڑی بات ہے جو کہی ہے۔ فرعون کی فرعونیت کو مٹانا تھا' اس کے استبداد سے بنی اسرائیل کو چھڑانا تھا۔

خدا تعالیٰ کے ہاں انسانوں کی دنیا کو کنٹرول کرنے کا طریق: ''ہم اپنے قوانین کو انسانوں کے ہاتھوں سے انسانی دنیا میں کارفرما کراتے ہیں''۔

یہ اتنی بڑی کشمکش تھی۔ اب اس کے لیے حضرتِ موسیٰؑ کو مامور کیا جاتا ہے' ایک مشن کے لیے چنا جاتا ہے۔ تو یہاں میں نے کہا ہے کہ کہا ہے کہ کان لگا کر بات سنو! ہم نے تمہیں ایک مشن کے لیے چن لیا ہے۔ اسی سورۃ میں' اسی کو آگے جا کر جب Repeat (دُہرایا) گیا ہے' وہاں ایک اور بات کہی ہے۔ وہاں کہا ہے کہ وَ اصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ (20:41) واہ واہ واہ! اس ایک لفظ سے قرآن حکیم کے کتنے حقائق حل ہو جاتے ہیں۔ کہا کہ ہمارا ایک کام ہے موسیٰ! (معاذ اللہ) جیسے اٹک گیا ہو اور اسے آواز دی ہو کہ آؤ سنو! ہمارا ایک کام ہے' ہم نے اس کام کے پورا کرنے کے لیے تمہیں چن لیا ہے۔ خدا کا یہ کام ہے۔ وہ اتنا بڑا قادرِ مطلق ہے۔ اس کے ایک اشارے سے اتنی بڑی عظیم کائنات وجود میں آ رہی ہے۔ وہ شے کیا ہے' اس کے مقابلے میں فرعون' اس کی فرعونیت' اس کے یہ سارے جنود' بات ہی کیا ہے لیکن یہ چیز ہے جو میں کہہ رہا ہوں جو قرآن حکیم نے بتائی۔ قرآن حکیم نے یہ کہا ہے کہ خارجی کائنات میں تو ہمارے قوانین ازخود ہمارے ہی زور سے کام کرتے چلے جاتے ہیں۔ انسانوں کی زندگی کے اندر ہم اپنے قوانین کو انسانوں کے ہاتھوں سے کارفرما کراتے ہیں۔ ہمارا جو مشن انسانی دنیا میں ہے وہ انسانوں کے ہاتھوں سے پورا ہوتا ہے ان کے ہاتھوں سے ہم پورا کراتے ہیں۔

انسانی دنیا میں خدا اپنے قانون کے مطابق کام انسانوں سے کرواتا ہے لیکن منسوب اپنی طرف کرتا ہے

یہ جو کہا ہے کہ وَ اصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ (20:41) میں نے تمہیں اپنے ایک کام کے لیے چن لیا ہے۔ خدا کا ایک کام ہے۔

(معاذ اللہ) جیسے کہا ہو کہ کہیں رکا پڑا ہے اور اس کے لیے کہتے ہیں کہ موسیٰ! ہم نے تمہیں اس کام کے لیے چن لیا ہے۔عزیزانِ من! اس بات کو اگر سمجھ لیا جائے تو قرآن مجید کے بہت سے حقائق اور تقدیر کے جو مسائل ہیں' وہ سارے حل ہو جاتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر خدا ان کاموں کو منسوب تو اپنی طرف کرتا ہے کہ ''ہم نے یہ کیا اور ہم نے وہ کیا'' حالانکہ وہ اس کام کے لیے انسانوں کو چنتا ہے' انسانوں کے ہاتھوں سے یہ سرانجام پا رہے ہوتے ہیں اور منسوب اپنی طرف کرتا ہے کہ ''ہم نے یہ کیا''۔اب وہاں پہنچنے کے بعد سطح بین لوگوں کو بات سمجھ میں نہیں آتی۔ بدر کے میدان میں جو اس نے یہ کہا تھا کہ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى(8:17) ۔وہ جسے کہتے ہیں کنکریاں پھینکنا' یہ کنکریاں پھینکنے والی بات نہیں تھی۔ کہا یہ تھا کہ ''بظاہر وہ تیر تو تم ہی چلا رہے تھے لیکن درحقیقت وہ ہم چلا رہے تھے''۔''کریڈٹ سارا آپ لے جانداائے''(ساری نیک نامی خود لے جاتا ہے)۔کیا بات ہے صاحب! کہ جو نتیجہ اس کے قانون کے مطابق برآمد ہو رہا ہو' خواہ وہ سائنٹسٹ کی لیبارٹری کے اندر' اس سائنسدان کے ہاتھوں' برآمد ہو رہا ہے' اسے وہ کہہ رہا ہے کہ دیکھو! ہم اس کو یہ کرتے ہیں۔ہم اس طرح سے زہر کو تریاق بنا دیتے ہیں۔''ہم بنا دیتے ہیں''۔بات بھی ٹھیک ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ تو کہتا ہے کہ ''ہم بنا دیتے ہیں'' تو پھر ہمارا قصور کیا ہے۔اب اس کے بعد کہتا ہے کہ ''ہم تمہیں جہنم میں بھیج دیں گے''۔ارے کر دیا تم نے ہمیں اندھا اور بھیج دو گے جہنم میں۔ یہ ہے سارا ایک نکتہ۔ سنیے! انسانوں کی دنیا میں خدا کے قانون کے مطابق سارے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے تو اس کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے لیکن وہ ہمیشہ یہاں انسانوں کے ہاتھوں سے یہ چیز کراتا ہے۔اس جہت سے وہ اس کو انسانوں کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔

غالب کے الفاظ میں کام خدا کا اور ہاتھ نبی اکرم ﷺ کا

وہ جو ابھی میں نے بدر کے میدان کی بات کہی ہے' اس میں یہ تھا کہ وہاں نظر آ رہا تھا کہ تم تیر چلا رہے تھے' ٹھیک ہے تمہی چلا رہے تھے' بھئی! درحقیقت وہ ہم چلا رہے تھے۔ ہمارے پروگرام کی تکمیل کے لیے ہم نے تمہیں چنا تھا' مامور کیا تھا۔اس اعتبار سے کہ وہ تیر تمہاری کمان سے نکل رہے تھے' ٹھیک ہے تم چلا رہے تھے۔اس اعتبار سے کہ وہ ہمارے پروگرام کی تکمیل کے لیے نکل رہے تھے تو ہم چلا رہے تھے۔کیا بات ہے! اس مقام پہ آپ کو یاد ہوگا کہ میں اکثر اسد اللہ خاں غالب(1869-1797ء) کا وہ شعر دہرایا کرتا ہوں۔ نعت کی دنیا میں یہ بڑا عظیم شعر ہے۔ یہ جو چیز تھی کہ وہ تیر تم نہیں' ہم چلا رہے تھے لیکن وہ چلا تو یہ رہے تھے۔ یہ بڑے خوبصورت انداز میں اُس شخص نے بات کہی ہے کہ

تیرِ قضا ہر آئینہ از ترکشِ حق است

قضا کے تیر خدا کے ترکش کے اندر ہوتے ہیں۔ ترکش وہ تھیلی سی ہوتی ہے جس میں وہ تیر رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ چلنے والا تیر تو کمان سے چلتا ہے۔ وہ جس میں تیر رکھے ہوئے ہوتے ہیں اس کو ترکش کہتے ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قضا کے تیر ہوتے تو خدا کے ترکش میں ہیں مگر

اما کشودِ آں ز کمانِ محمدؐ است

وہ تیر چلتا ہے محمد ﷺ کی کمان میں پہنچ کر۔ محمد ﷺ کی کمان ساتھ نہ ہو تو تیر ترکش میں رکھے کے رکھے رہ جاتے ہیں۔ یہ ہے خدا اور اس کے رسول کا باہمی تعلق۔ ''اس کی قضا کے تیر' اِسؑ کی کمان سے چلتے ہیں''۔ اور یہی مومن کا اور خدا کا تعلق ہے۔ اس کے پروگرام کی تکمیل ان کے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔

اے بندۂ مومن! تو کُجائی تو کُجائی

آج یہ جو نظر آتا ہے کہ باطل غالب آتا چلا جا رہا ہے' غلبہ پا رہا ہے' حق کہیں نظر نہیں آ رہا تو آخر یہ کیوں ہے؟ (اقبالؒ کے الفاظ میں) وہ اس لیے ہے کہ وہ مومن اور اس کی کمان نہیں ہوتی جس میں سے وہ تیر نکلنا ہے۔

حضرت موسٰیؑ کے لیے کوہِ طور سے وحی کی پکار: ایک محاکاتی انداز

کِن خوبصورت الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ موسٰیؑ! ادھر آؤ' ہماری بات سنو۔ وہ بیچارہ چرواہا آ رہا ہے' سردی کا موسم ہے' رات اندھیری ہے' کہیں کوئی نشانِ راہ نہیں ملتا' تاپنے کے لیے کہیں آگ نہیں۔ دور پہاڑ پہ دیکھتا ہے کہ آگ نظر آتی ہے تو وہ اس کے لیے آ رہا ہے۔ وہاں اس کو آواز دی جا رہی ہے' وہ کھڑا ہو رہا ہے کہ کیا بات ہے؟ کہا کہ ہم نے اپنے ایک کام کے لیے تمہیں چن لیا ہے۔ یہ اپنے آپ کے لیے کہا ہے۔

نبوت کی ذمہ داریاں مومن کی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ صبر آزما' مشکل اور جفاکش ہوتی ہیں

یہ ''وَ اصۡطَنَعۡتُکَ'' (20:41) تو لفظ ہی بڑا خوبصورت ہے کہ ''ہم نے اپنے لیے تمہیں چن لیا ہے''۔ اچھا جی! ارشاد فرمائیے۔ ہونا تو یوں چاہیے تھا کہ جسے یہاں کا کوئی حاکم کوئی بادشاہ یہ کہہ دے کہ ہم نے تمہیں اپنے لیے چن لیا تو یہ تو موج ہو گئی ''سیّاں بھئے کوتوال' اب ڈر کاہے کا[1]''۔ وہاں کیفیت یہ ہے کہ یہ کہنے کے بعد اس چرواہے سے یہ کہا جاتا ہے کہ اِذۡهَبَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ

---

[1] یہ مثل ہے کہ جس کا رشتہ دار یا واقف کار حاکم ہو' اسے قانون کا ڈر نہیں ہوتا۔

طَـغٰـی (20:43) جاؤ فرعون کی طرف' وہ بڑا سرکش ہوگیا ہے۔ یااللہ! یہ کیا؟ ارے صاحب! ہم تو بکریاں چرا رہے تھے' آ گ لینے کے لیے یہاں آئے تھے' آپ نے کہا تھا کہ ہم نے اپنے لیے تمہیں چن لیا ہے' ہم نے کہا کہ بڑی موج ہوگئی اب۔ یہ لِنَـفْسِیْ کہا ہے عزیزانِ من! اس لفظ پہ غور کیجئے' اس کا تو ترجمہ ہی نہیں ہوسکتا۔ یہ تو بڑی چیز تھی۔ اور کہا یہ گیا ہے کہ وہ دیکھو! فرعون کتنا سرکش ہوگیا ہے' جاؤ اس کی طرف۔ جنہیں وہ اپنے لیے چنتا ہے' انہیں وہ ان مقاصد کے لیے چنتا ہے:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

جسے وہ اپنے لیے چن لیتا ہے' پھر اسے بھیجتا ہے کہ جاؤ فراعنۂ دہر سے جا کر ٹکر لو۔ یہ مقام' یہ منزلیں' یونہی نہیں مل جاتیں۔ ''اپنے لیے چن لیا اس نے''۔ اس سے بڑا مقرب اور کون ہوگا۔ ہمارے ہاں اس کے بعد مقربین وہ ہوتے ہیں ''جیہڑے روٹی وی منگ کے کھاندے ہیگے'' (جو روٹی بھی مانگ کر کھاتے ہیں)۔

کہا ہے کہ اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ (20:12) اے موسیٰ! ہم ہیں رب۔ وَ اَنَـا اخْتَرْتُکَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی (20:13) ہم نے تمہیں چن لیا ہے ایک مقصد کے لیے' ایک پروگرام کے لیے۔ اِسْتَـمِعْ یہ ہے جسے کان لگا کر سننا کہتے ہیں۔ ''دل کے کانوں سے سنو جو ہم کہہ رہے ہیں''۔ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ کہ اِنَّـنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ (20:14) پہلی بات یہ یاد رکھو۔ پھر وہی " ان " بھی ہے اس کے ساتھ' نی بھی ہے اس کے ساتھ' انا بھی ہے اس کے ساتھ۔

لفظ فَاعْبُدْنِیْ کا مفہوم صرف خدا کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا ہے

عزیزانِ من! وہ Gibb[1] (گب) نے ٹھیک کہا ہے کہ ''قرآن کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہوسکتا''۔ کوئی اِنَّـنِیْٓ اَنَـا اللّٰہُ (20:14) کے ان الفاظ کا کیا ترجمہ کرے گا۔ اب یہ کہا کہ ''اللہ ہم ہی ہیں''۔ تو ٹھیک ہے ہم بھی سارے یہی کہتے ہیں کہ اللہ وہی

---

[1] اس کے لیے ایچ۔ اے۔ آر۔ گب کی کتاب Modern Trends in Islam (اسلام میں رجحاناتِ جدید) دیکھیے۔ وہ قرآنِ کریم کے ترجمہ کرنے کے لیے لکھتا ہے کہ

The Koran is essentially untranslatable, in the same way that great poetry is untranslatable. The seer can never communicate his vision in ordinary language. He can express himself only in broken images, every inflection of which, every nuance and subtlety, has to be long and earnestly studied before their significance breaks upon the reader, images too, in which the music of the sounds plays an indefinable part in attuning the mind of the hearer to receive the messages. To paraphrase them in other words can only be to mutilate them, to substitute clay for fine gold, the plodding of the pedestrian intelligence for the winged flight of intuitive perception....... (P.4).

ہے۔کہا کہ سنو! ''اللہ ہم ہی ہیں'' کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا (20:14) ہمارے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔ یہ ہے ''اللہ ہم ہی ہیں'' کا مفہوم۔خود ہی بتا دیا ورنہ کافی تھا: اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا (20:14)۔کہ جی بہت اچھا! آپ صاحبِ اقتدار سہی' آپ حاکمِ مطلق سہی' ہوا کریئے اپنے ہاں! ہمیں اس سے کیا؟ کہنے لگے کہ تمہیں اس سے تعلق ہے۔فَاعْبُدْنِیْ (20:14)۔ یہ جو عربی زبان کا 'ف' ہے وہ Consequence (نتیجہ) میں جو بات ہوتی ہے اس کے لیے آتا ہے کہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم محکومیت صرف ہماری اختیار کرو' کسی اور کی نہیں۔

قیامِ صلوٰۃ کا نظامِ حیات تو بڑا پُر معنی اور ہمہ گیریت کا ترجمان ہے: ایک غور طلب نکتہ

پہلی بات تو یہ فرعون کے خلاف چیلنج ہوگئی کہ اس کی محکومیت نہیں ہے۔اور آگے یہ نظام ہے کہ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ(20:14)۔ یہ بات کہیں اور پہنچ جائے گی۔آپ دیکھتے ہیں کہ الصَّلٰوةَ کا لفظ کہاں آ رہا ہے۔کہا ہے کہ صلوٰۃ کو قائم کرو لِذِكْرِیْ ' ہمارے اس پروگرام کی خاطر۔ یہ قیامِ صلوٰۃ اتنی بڑی چیز ہے۔ بہر حال میں نے آگے چلنا ہے۔میں نے کہا ہے کہ فرعون کی فرعونیت کا تو ہمیں معلوم ہے جو وہاں بڑے عرصے سے باطل کا نظام قائم تھا۔تو یہ اس وقت کیا بات ہوئی ہے' میں جا کر کیا کروں گا؟ کہا کہ گھبراؤ نہیں! وہ سلسلہ اندر ہی اندر پک رہا تھا' چلا آ رہا تھا' وہ ساعت والی سوئی آگے چلی آ رہی تھی۔

فرعون کے خلاف ظہور پذیر ہونے والا انقلاب قدم بہ قدم اپنی منزل کی طرف

اور اب اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ (20:15) اس انقلاب کے محسوس شکل میں آنے کا وقت آ گیا ہے۔اَكَادُ اُخْفِیْهَا (20:15) وہ پہلے مخفی تھا' پوشیدہ تھا' غیر محسوس وغیر مرئی تھا' نظر نہیں آتا تھا۔اب ہم چاہتے ہیں کہ وہ ابھر کر سامنے آ جائے۔اسے السَّاعَةَ کہا گیا ہے۔غور فرمایا آپ نے کہ السَّاعَةَ کیا ہوتا ہے؟ یہ انقلاب ہے' جب وہ محسوس شکل میں انسانوں کے سامنے آ جائے۔اور یہ کتنی بڑی چیز کہی ہے کہ وہ بہت دیر سے شروع ہوا ہوتا ہے۔کوئی پھل ایک دن میں نہیں پک جاتا۔اَكَادُ اُخْفِیْهَا (20:15)۔اب یہ دیکھیے کہ السَّاعَةَ آ رہی ہے۔انقلابِ عظیم آ رہا ہے' اتنے بڑے پیغمبر کو اس کے لیے چنا جا رہا ہے۔بھیجا جا رہا ہے کہ جاؤ اس کی طرف۔ اب انقلابِ عظیم آئے گا۔وہ کاہے کے لیے آئے گا' اس انقلاب کا مقصد کیا ہے؟ انقلاب کے معنی تو ہوتا ہے ''کسی چیز کا الٹ جانا''۔ یہ فرعونیت کا تختہ الٹا دیا جائے گا' دوسرا نظام اس کی جگہ قائم کیا جائے گا۔ یہ کاہے کے لیے ہے' مقصد کیا ہے؟ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے۔

قرآنی نظام اپنے اندر جو ایک عظیم انقلاب کی نوید لیے ہوتا ہے جس میں معاوضہ کا ترجمہ ''محنت کا ماحصل'' ہے اس کی وضاحت

عزیزانِ من! سن لیجیے کہ یہ جو **السَّـاعَةَ** یعنی انقلاب خداوندی ہے' آخر اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ کہا ہے کہ **لِتُـجۡـزٰی کُلُّ نَـفۡسٍۭ بِـمَا تَسۡعٰی** (20:15) انقلاب اس لیے لایا جائے گا کہ ہر محنت کرنے والے کو اس کی محنت کا ماحصل مل جائے۔ عزیزانِ من! جسے باطل کا نظام کہتے ہیں' وہ ہوتا کیا ہے؟ وہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں کسی کی محنت کو کوئی دوسرا لے جاتا ہے۔ یہ ہے استبداد' یہ ہے فرعونیت' یہ ہے ظلم' یہ ہے باطل کا نظام۔ اب بات یہاں سمٹ کر آ جائے گی' جو جی میں آئے آپ کر لیجیے' جتنی تفصیل جی چاہے آپ اس کے لیے کر لیجیے' بات یہیں آئے گی کہ

دانہ ایں می کارد ' آں حاصل بُرد

بوتا یہ ہے' کاٹ کر وہ لے جاتا ہے۔

اُمّتے بر اُمّتے دیگر چرد

ایک قوم کی کھیتی کو دوسری قوم کی بھیڑیں چر جاتی ہیں۔

دانہ ایں می کارد ' آں حاصل بُرد

کاشت کوئی کرتا ہے' کاٹ کر کوئی لے جاتا ہے۔ یہ ہے ماحصل باطل کے نظام کا۔ اور یہ **الساعة** آتی ہے کہ **لِتُـجۡـزٰی کُلُّ نَفۡـسٍۭ بِـمَـا تَسۡعٰی** (20:15)۔ میں نے عرض کیا تھا کہ میں محنت کا معاوضہ بھی اس کا ترجمہ نہیں کیا کرتا۔ معاوضے میں تو پھر اجرت آ جاتی ہے' Wages آ جاتی ہیں۔ اس میں جو معاوضہ مقرر کیا جائے وہ دیدیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے جی! عدل کے مطابق ہے' قانون کے مطابق ہے۔ Wage Board مقرر کر لیے جاتے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں پوچھتا کہ جن کی Wages (اجرتیں) مقرر ہو رہی ہیں' نہ پہلے دور میں کوئی اس غلام سے پوچھتا تھا کہ کتنے میں تمہیں بیچیں' نہ آج کسی مزدور سے کوئی پوچھتا ہے کہ تمہاری اجرت کیا مقرر کریں۔ وہاں بھی غلاموں کو خریدنے والا قیمت مقرر کرتا تھا' آج بھی جو آجر ہے' جو کام پہ لگانے والا ہے' وہ ان کی محنت مقرر کرتا ہے۔ اس لیے میں (20:15) میں محنت کا معاوضہ ترجمہ نہیں کرتا۔ ''یہ محنت کا ماحصل (Outcome) ہوتا ہے''۔

صلوٰۃ کے نظام میں محنت کا معاوضہ نہیں بلکہ محنت کا ماحصل ہوتا ہے

قرآن حمید نے یہ جو **بِمَا تَسۡعٰی** (20:15) کہا ہے تو اس نے محنت کا معاوضہ کہا ہی نہیں بلکہ اس نے تو **مَا تَسۡعٰی** کہا ہے یعنی

جتنی کوئی محنت کرے اس کا کُل کا کُل ما حصل ہے۔ یعنی اس کا معاوضہ نہیں' اس کا جو نتیجہ' ما حصل' پھل' وہ جو کچھ اس کا ہے' وہ اس کا ہے ۔ دوسری جگہ فرعون اور اس کی قوم کے متعلق کہا ہے کہ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (27:14) وہ محض اپنی سرکشی اور تکبر کی بنا پر انؐ سے انکار کرتے ہیں' لوٹ لیتے ہیں Exploit کر لیتے ہیں ہے ان چیزوں کو سلب کر لیتے ہیں۔ یہ انقلاب لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى (20:15) ہے تا کہ ہر کام کرنے والے کے کام کا جو ما حصل ہے وہ اس کو مل جائے۔ کہا یہ ہے جو انقلاب ہم چاہتے ہیں برپا ہو۔ جاؤ! تمہارے ہاتھوں سے یہ انقلاب برپا ہوگا۔ لِنَفْسِي اور یہ ہے ہمارا وہ رکا ہوا کام جس کے لیے ہم نے تمہیں چن لیا ہے۔ جاؤ! تو آپ نے دیکھا کہ خدا کا کام کیا ہوتا ہے' روکتے اسے کون ہیں' اس میں کارفرمائی پھر کون کرتے ہیں؟

انسانیت کی تین لعنتیں اور تین قوتیں ہیں' مُلّا کی اذاں اور ہے مجاہد کی اذاں اور' الساعت یعنی ظہورِ نتائج کی گھڑی آیا ہی چاہتی ہے

عزیزانِ من! یہ حضراتِ انبیائے کرامؑ وعظ کہنے کے لیے نہیں آتے تھے۔ یہ تو نظامِ صلوٰۃ کا اتنا بڑا انقلاب لانے کے لیے آتے تھے۔ میں نے کہا ہے کہ دنیا میں تین ہی انسانیت کی لعنتیں ہیں اور دنیا کے اندر تین ہی قوتیں ہیں: (1) ملوکیت کی قوت' فرعون جس کا نمائندہ تھا' (2) مذہبی پیشوائیت کی قوت' ہامان جس کا نمائندہ تھا اور (3) نظامِ سرمایہ داری کی قوت' قارون جس کا نمائندہ تھا۔ قرآن حکیم نے دوسرے مقام پہ حضرتِ موسٰیؑ سے کہا ہے کہ ہم تمہیں ان تینوں کی طرف بھیج رہے ہیں۔ یہ نظام اکیلا کچھ کام نہیں کر سکتا۔ کھشتری یا راجہ جو سنگھاسن یا تخت پہ بیٹھتا تھا' ایسے نہیں بیٹھ جاتا تھا۔ برہمن آ کر اس کے ماتھے پہ تلک لگاتا تھا۔ یہ جتنی آپ کے ہاں کی ملوکیت چلی آ رہی ہے وہ بنو امیہ (750-132/661-41ھ) اور بنو عباس (1258-656/750-132ھ)' سارے جتنے بادشاہ تھے' جن کو آپ خلفا کہہ دیتے ہیں' وہ تخت پہ بیٹھتے تھے تو یہ ان کو ظل اللہ علی الارض کہتے تھے۔ یعنی زمین پہ خدا کا سایہ۔ ان کی اس سلطنت کے استحکام کے لیے' فروغ کے لیے' منبر و محراب سے دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ خطبوں میں ان کے نام لیے جاتے تھے۔ خالی قوت کے زور پر زیادہ دیر تک یہ سنگھاسن نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کے ساتھ مُلّا کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ خدا کا سایہ ہیں۔ ہندو بھی ایشور کا اوتار کہتے تھے۔ Divine Rights of the King ہوتے تھے۔ ہر جگہ یہی چیز ہے' الفاظ مختلف ہیں۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات و منات

ہاں تو عزیزانِ من! بات حضرتِ موسٰیؑ کی ہوئی تھی اور نبی اکرم ﷺ سے کہا ہے اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا (40:59)

اس لیے اب ہم برملا تمہیں یہ پروگرام دیدیتے ہیں کہ وہ الساعت جو اس طرح سے آہستہ آہستہ چلی آرہی تھی' غلط نظام کے نتائج اندر ہی اندر پک رہے تھے' اب وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ کھل کر سامنے آ جائیں۔ لَاٰتِيَةٌ ' آرہے ہیں۔ لاَ رَيْبَ فِيْهَا ' اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے' یقیناً ایسا ہو کر رہنے والا ہے۔

ہزار سال سے قیامت کے عذاب میں مبتلا قومِ مسلم کے غلط تصورات اور اقبالؒ کی پکار

کہا ہے کہ وَلٰـكِـنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لاَ يُؤْمِنُوْنَ (40:59) تو ان لوگوں کی مصیبت یہ ہے کہ یہ اسے مانتے نہیں ہیں۔ ان کو کیا کہیے' یہاں تو ہماری اپنی یہ صورت ہے۔ یہ چلا آ رہا تھا کہ چودھویں صدی میں قیامت آ جانی ہے۔ یعنی دوسری تیسری صدی کی کتابوں میں ہم نے پڑھنا شروع کیا ہوا تھا۔ اس سارے دوران ہزار سال کے اندر کسی نے قیامت کو دیکھا ہی نہیں۔ اقبالؒ (1877-1938ء) واعظ سے کہتا ہے کہ

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی

وہ اعمال نامے اور میزان جو قیامت میں کھڑے ہونے ہیں اس کے لیے تم نے بڑی لمبی لمبی وعظیں کیں۔

ہزار حیف نہ بینی قیامتِ موجود

او! جس قیامت میں تُو کھڑا ہے' کیا وہ اس وقت تیری آنکھوں کے سامنے نہیں ہے' کم بخت! تُو اسے کیوں نہیں دیکھتا؟

اس قیامتِ موجود کو اس امت نے ہزار سال میں نہیں دیکھا۔ جس کے اوپر ملوکیت چھائی ہوئی ہو' جس کے اوپر مذہبی پیشوائیت چھائی ہوئی ہو' نہیں دیکھا اس نے۔ اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ چودھویں صدی میں جا کر آنی ہے ''اپنی صدی تے بچ گئی ناں' نال تیرا ہوروی بچا لیاں'' (اپنی صدی تو بچ گئی' ساتھ میں تیرہ اور بھی بچا لیں) لیکن قیامتِ موجود کو کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ اب وہ چودھویں گزر گئی ہے ''تے بیٹھے نیں نموشی نال نیویں پا کے'' (بیٹھے ہیں شرمندگی سے سر جھکائے)۔

آج کی محرف تورات اور عیسائی پادریوں کے فتوؤں کا نتیجہ اور قرآن حمید کی راہ نمائی کا طریقِ کار

تورات کی رو سے تو اس میں کیلنڈر کے وہ دن بھی گنے ہوئے ہیں کہ جب یہ دنیا ختم ہو جانی ہے' ٹکراؤ ہونا ہے' یہ سب کچھ ہے۔ وہ اکتوبر کی کوئی تاریخ ہے اور وہ سال گنے ہوئے ہوتے ہیں۔ عیسائیوں کی تاریخ میں کئی دفعہ وہ ایسے پادری اٹھے' جنہوں نے کہا کہ وہ گنتی کے اعتبار سے ہم نے دیکھ لیا ہے' بس وہ فلاں دن آنے والی ہے۔ شہر اجڑ گئے' بستیاں اجڑ گئیں' لوگ باہر بھاگ گئے۔ انہوں نے بھی یہ چودھویں صدی میں قیامت مقرر کر رکھی ہے۔ گویا اس سے پہلے ان کے ہاں وہ قیامت ہی نہیں تھی۔ اور آج وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ

الحمدللہ یہ قیامت ٹل گئی۔ وَلٰـكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (40:59) اندھے ہیں' دیکھتے نہیں ہیں۔ وہ ٹل نہیں سکتی۔ کہا ہے کہ اِنَّ السَّـاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْـبَ فِيْهَـا (40:59) یادرکھو! یہ انقلاب واقع ہوکر رہے گا۔ اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کے لیے پھر ہم کیا کریں۔ وہ تو آ رہی ہے وہ ساعت' وہ قیامت' وہ انقلاب۔ کیا طریقہ ہے اس سے بچنے کا؟ وَقَالَ (40:60) اور کہا کہ اس کے لیے بھی ہم تمہیں پروگرام دیتے ہیں۔ طریقہ یہ ہے کہ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِىْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (40:60) تم زندگی کے ہر دوراہے پر' اپنی راہ نمائی کے لیے' قانونِ خداوندی کو آواز دو۔ وہ قانون تمہاری پکار کا جواب دے گا اور تمہاری راہ نمائی کرے گا۔ اس نے یہ پروگرام دیا ہے۔

فرعونی نظامِ زندگی کے عذاب سے بچنے کے لیے ہمارے ہاں کیے گئے غلط قرآنی تراجم کی عملی شکل کا نتیجہ

عزیزانِ من! اتنی بڑی السَّـاعَةَ سے' یعنی اس آنے والے انقلاب سے بچنے اور اس میں کامیاب ہونے کے لیے یہ طریقہ بتایا تھا۔ اب ہمارے ہاں یہ ترجمے ہوئے ہیں کہ اس نے کہا کہ دعا مانگا کرو اور ہم تمہاری دعا قبول کرلیں گے۔ ''گل مک گئی'' (ختم ہوا قصہ)۔ یہ حضرت موسیٰؑ کو چننا' اس کو فرعون کی طرف بھیجنا' یہ جو سارا کچھ کرنا تھا' کہا کہ یہ اس زمانے کی بات تھی۔ ہمارے لیے تو بات ہی صاف ہے کہ دعا مانگا کیجیے' ہم دعا قبول کرلیں گے۔ بس یہ ہے جو پروگرام ہے تمہارے لیے۔ عزیزانِ من! کیا بتائیں حالانکہ یہیں اس نے یہ بتادیا کہ یہ جو ادْعُـوْنِـىْ کہا ہے' جس کا ترجمہ ''ہمیں بلاؤ' ہمیں پکارو'' کیا جاتا ہے' اگلے دو لفظوں میں اس کا مفہوم موجود ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ الَّـذِيْـنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِىْ (40:60) ہماری اطاعت سے جو سرکشی اختیار کرتے ہیں' ان کو ہم جہنم میں بھیجیں گے۔ اب معلوم ہوا کہ ادھر سے یہ جو چیز ادْعُـوْنِـىْ کہا ہے' کہا یہ ہے کہ جو ہماری اطاعت کرے گا ہمارا قانون اسی کا جواب دے گا جیسے کسی کی پکار کا کوئی جواب دیتا ہے۔ عربی زبان کے اندر ''دع'' کے مـعـنـی' جسے یہ کسی کو پکارنا کہتے ہیں' اس کے معنی ''اطاعت کرنا'' ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ اس کے لیے طریق یہ ہے۔ اس آنے والے انقلاب میں محفوظ رہنا اور کامیاب ہونا ہے تو یہ' ہمارے قوانین کی اطاعت کرو اور پھر دیکھو کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ کرو۔ ہمارے ہاں بھی اس کا یہی ''دعا کرو' ہم تمہاری دعا قبول کرلیں گے'' ترجمہ کررہے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ کوئی تیس سال سے' وہ جو بنی اسرائیل کی حکومت ہے' جو چڑیا کے انڈے سے بھی چھوٹی ہے' اُس نے مسلمانوں کے اس بحرِ ذخار میں' جو مراکش سے انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے' ناک میں نکیل ڈال رکھی ہے اُس بحرِ ذخار کی ہر چوتھے دن کوئی نہ کوئی کانفرنس ہوتی ہے' سب مل کر اکٹھے ہوتے ہیں اور ہر سال حج کی تقریب پر بیس بیس لاکھ' عرفات کے میدان میں' جہاں کے متعلق ان کا یہ ایمان ہے کہ وہاں کی مانگی ہوئی دعا سب قبول ہوتی ہیں' یہ تیس سال سے وہاں (بیس بیس لاکھ

اکٹھا ہوکر) اس میدان میں بھی دعا مانگتے ہیں کہ یا اللہ! اس اسرائیل کا بیڑہ غرق کر۔اُدھر وہ دعا مانگتے ہیں اور اِدھر یہ آگے بڑھ جاتا ہے۔پھر ان کے ذہن میں یہ آتا ہے کہ (معاذ اللہ) شاید وہ سنتا نہیں ہے۔اور زیادہ تکلیف بڑھتی ہے تو کہتے ہیں کہ کوٹھے کے اوپر چڑھ کر اذانیں دو' اس کے نزدیک ہوکر اذانیں دو۔

عزیزانِ من! کیا کیا چیزیں مذہب میں آ گئی ہیں۔قرآن مجید نے کہا ہے کہ **اِنَّ الَّـذِیۡـنَ یَسۡتَـکۡبِـرُوۡنَ عَـنۡ عِبَـادَتِـیۡ سَیَـدۡخُلُوۡنَ جَھَنَّمَ دَاخِرِیۡنَ** (40:60)۔یہاں دو لفظوں کے بعد وہ خود مفہوم بیان کر رہا ہے۔کہتا ہے کہ **اُدۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ** (40:56)۔یہ ہے چیز کہ ہمارے قوانین کی اطاعت کرو' اس کا نتیجہ تمہارے سامنے آ جائے گا' یہ وہی ہے جسے آپ Positive Results کہتے ہیں' جسے جواب کہا جاتا ہے۔اور اس کے برعکس جو اس سے استکبار برتے گا' لفظ **عَنۡ عِبَـادَتِـیۡ** کہہ کر قرآن مجید نے دعا کے معنی خود کر دیئے' اس کے لیے دوسرا لفظ استعمال کر دیا۔خدا کو پکارنے کا مطلب بھی' کیا کبھی تم نے سوچا کہ کیا ہوتا ہے؟ آپ پکارتے رہیے۔آگے جو جواب والی بات ہے' کیا وہ بھی ہمارے ہاں ذہن میں آتی ہے' کیا کبھی جواب ملا ہے تم میں سے کسی کو؟ آپ نے کسی کے ہاں دستک دی' اندر سے کسی نے کہا کہ ''ٹھیک ہے' آتے ہیں'' تو وہ تو بات ہوگئی۔یہ باہر سے پکارا اور اندر سے جواب ملا مگر ان کے نزدیک تو ''دع'' کے معنی بس اتنے ہی رہ گئے ہیں کہ ''اسے پکارو' جواب کا ذہن میں نہیں آتا۔یہ ہیں وہ غلط قرآنی تراجم جو فرعونی نظام سے بچنے کے لیے یوں کیے گئے ہیں۔

کسی تباہی کا آخری حد کو چھونے سے پہلے مہلت کے وقفے کی نوعیت اور حضرت موسیٰؑ کو خدا کا فرمان

اب یہ جو چیز ہے کہ عمل اور ظہورِ نتائج کے درمیان میں ایک وقفہ آتا ہے' وہ مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔قرآن کریم اسے تیاری کا وقفہ کہتا ہے۔کہتا ہے کہ اُدھر سے تو وہ ظلم واستبداد والے' فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ نہیں او نہیں! کچھ نہیں ہو رہا ''کیہڑا کوئی بانہہ بھن دیندا ہیگا اے' لگے رہوسی'' (کونسا کوئی بازو توڑ دے گا' تم لگے رہو)۔اُن کے ہاں تو یہ ہوتا ہے کہ فریب میں ہوتے ہیں۔یہ اِدھر والوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کا تو کچھ بگڑ ہی نہیں رہا تو اس سے شاید کچھ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ واقعی ظلم کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔کہا ہے کہ یہ چیز غلط ہے۔اسے مہلت کا وقفہ مل رہا ہے کہ ممکن ہے اپنی اصلاح کر لے۔حضرتِ موسیٰؑ کو اس مقصد کے لیے خاص طور پر بھیجا جاتا ہے کہ جا کر اس سے ٹکراؤ لو کیونکہ **اِنَّـہٗ طَـغٰی** (20:24) وہ سرکش اور حدود نا آشنا ہو چکا ہے۔کہا یہ جاتا ہے کہ دیکھنا ''جاندے آں گھسن نہ مار دئیں'' (جاتے ہی مکا نہ مار دینا)۔یہ تو تھے ہی مکا مارنے والے۔آپ کو پتہ ہے کہ کسی کو انہوں نے مار ہی دیا تھا۔کہا ہے کہ جانا' پہلے بڑی نرمی سے بات کرنا' شاید وہ اس سے سمجھنے کے موڈ میں آ جائے۔واہ واہ واہ! اس قسم کا ٹکراؤ ہو رہا ہے۔''بڑی نرمی سے بات کرنا' شاید وہ

اس سے سمجھنے کے موڈ میں آ جائے''۔تو اگر سمجھنے سے معاملہ حل ہو جائے تو اس کے بعد ''جیہڑا اگڑ دتیاں مرے اوہنوں زہر کاہنوں دینا'' (جو گڑ سے مر جائے اسے زہر دینے کی کیا ضرورت ہے) پھر ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی اس طرح سے۔ یہ ہے وہ چیز جو پہلے بتائی کہ ان کے لیے مہلت کا وقفہ ہوتا ہے کہ شاید یہ اس بات کو سمجھ لیں کہ تباہی آنے والی ہے اور وہ اپنی اصلاح کر لیں۔

باطل سے مقابلہ کرنے کے لیے حق کے نفاذ کا طریق اور خارجی کائنات کی مثال

جنہوں نے مقابلہ کرنا ہوتا ہے اُن کے لیے یہ اپنے آپ کی تیاری کرنے کا وقت ہوتا ہے کہ تم اس دوران پوری تیاری کر لو۔اور پھر خارجی کائنات ہی کی مثال سے بتا رہا ہے۔کہا ہے کہ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا (40:61) روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے نہیں ہو کہ تیاری کے لیے کیا کرتے ہیں۔سارا دن تم محنت کرتے ہو' تھکے ہوئے ہوتے ہو' دوسرے دن پھر محنت کرنا ہوتی ہے۔اگر یہ اسی طرح محنت کرنے کا سلسلہ مسلسل رہے تو چار ہی دن میں تھک جاؤ۔سارے دن کی محنت کے بعد ہم خود ہی اس سورج سے کہتے ہیں کہ تم کچھ وقت کے لیے ڈوب جاؤ' تاریکی ہو جائے' ان کو سو لینے دو۔اور یہ سونا نہیں ہے' یہ لِتَسْكُنُوْا ہے۔وہ جو ڈاکٹر صاحب' آج کل Valium (خواب آور گولی) وغیرہ دیتے ہیں' جن کو Tranquilizer (مسکنِ دماغ) کہتے ہیں' اس کو مسکن دوائی کہا جاتا ہے۔یہ جو Nerves (اعصاب) کو تسکین دینے والی چیز ہوتی ہے' سکون دینے والی چیز ہوتی ہے' وہ ہے لِتَسْكُنُوْا ۔ جس کو کہا ہے کہ نیند ہم نے بنائی کہ وہ جو دن بھر کے اندر اتنی محنت سے خون کا دوران (Circulation) تیز ہوا' کوئی Irritation ہوئی' یہ سر درد ہوا' یہ Nerves کے اندر ہوا' اس سے لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ (40:61) ہو جائے۔اور اگر واقعی گہری نیند آ گئی ہو تو اس کے بعد پھر ساری انرجی' جو پہلے دن ضائع ہوئی ہوتی ہے یا صرف میں آئی ہوئی ہوتی ہے' انسان اس سے Recoup (تلافی نقصان) کر لیتا ہے۔لیل کو لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ کہنا بڑی سائنسی بات ہے حالانکہ کہنا یہی چاہیے تھا کہ تم اس میں سو جاؤ لیکن نہیں کہا یہ ہے کہ اپنی انرجی کو تم اس طرح سے Recoup (پھر حاصل) کر لو۔وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا (40:61) اور پھر اس کے بعد دن آ جاتا ہے۔

مہلت کا وقفہ تو قدرت کی طرف سے ایک بہت بڑی نعمت ہے کہ تم سکینت وسکون حاصل کر لو اور وہ اصلاح کر لیں اور اگر نہ کریں تو یہ ہے ناشکر گزاری

عزیزانِ من! کہا کہ انقلاب کے اندر بھی یہ جو درمیان میں مہلت کا وقفہ ہوتا ہے' اُس میں اُنہیں تو یہ ہوتا ہے کہ شاید اصلاح کر لیں' تمہیں یہ ہوتا ہے کہ تم اپنی پوری تیاری کر لو۔کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ (40:61)۔یہاں عَلَى النَّاسِ کہا ہے' یہ صرف مومنوں کو نہیں کہا ہے۔یہ فضل کی بات دونوں کے لیے ہے۔ہم انسانوں پہ بڑی عنایت ہے۔اُن کے اوپر عنایت ہے کہ

مہلت کا وقفہ دیدیا کہ اب بھی بچ جاؤ' اصلاح کرلو۔ اِن کے لیے یہ ہے کہ کوئی سکینت اور سکونت حاصل کرلو' تمہارے Nervous System (اعصابی نظام) کی Recoupment (تلافیٔ نقصان) ہوجائے۔ یہ اس لیے کیا ہے۔ کہا کہ **فَضۡلٍ عَلَى النَّاسِ ۔ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَشۡكُرُوۡنَ** (40:61) مشکل یہی ہے کہ دنیا کی بیشتر آبادی ان چیزوں کو اس مقصد کے لیے صرف نہیں کرتی جس مقصد کے لیے یہ چیزیں ہم تمہیں دیتے ہیں۔ یہ جو دو عالمی جنگوں کے درمیان وقفے آئے ہیں' اس میں یہ قومیں سکونت وسکینت نہیں حاصل کرتیں' وہ پہلے سے بھی زیادہ تیز بم بناتی ہیں۔ یہ ہے ناشکر گزاری۔

انسان دنیا میں آتا ہی نہیں' اگر مجبوراً آ گیا ہے تو دوسری چیز اس کے بس میں ہے کہ یہاں سے چلا جائے' روتا کیوں ہے: ایک فلاسفر کا قول

عزیزانِ من! کیا بات ہے جو آگے کہی ہے۔ یہ سارا کچھ کہہ کر' تفصیل بیان کرکے' واقعہ بیان کرکے' سرگزشتیں دے کر' خدا کے قانون بیان کرنے کے بعد' کہا کہ **ذٰلِكُمُ اللّٰهُ** (40:62) یہ ہے تمہارا رب۔ یہ **ذٰلِکَ** یہاں کیسا عمدہ آیا ہے! ورنہ وہ تو قیاس و گمان و وہم میں بھی نہیں آسکتا لیکن یہ جو **ذٰلِكُمُ اللّٰهُ** کہا ہے کہ یہ ہے تمہارا رب یعنی جو کچھ کہا گیا ہے یہ سمجھ لو کہ یہ ہے جو کچھ وہ کرتا ہے۔ **ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ خَالِقُ كُلِّ شَىۡءٍ** (40:62) واہ واہ واہ! خالق (Creator) تو وہ ہر شے کا ہے مگر تمہارے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ وہ **رَبُّكُمۡ** ہے' وہ تمہاری ربوبیت کرنے والا ہے ورنہ اگر اس کا بھی یہاں کہا جاتا کہ وہ تمہیں پیدا کرنے والا ہے' تو کہا جاتا کہ جی! ہم نے کونسی درخواست دی تھی جناب کو کہ ہمیں ضرور پیدا کیجیے۔ اب احسان جتا رہے ہیں۔ ''تے مصیبت اچ پایا ہویا ہیگا'' (تو مصیبت میں ڈالا ہوا ہے)۔ وہ کہنے والا کمہار جیسا فلاسفر ہے جو کہتا ہے کہ پہلی بات تو یہ تھی کہ انسان اس دنیا میں آتا ہی نہیں لیکن اگر مجبوراً آگیا ہے تو دوسری چیز تو اس کے بس میں ہے کہ یہاں سے چلا جائے۔ یہ بہت بڑا فلاسفر ہے۔ کہتا ہے کہ پہلی بات تو مجبوری کی ہے' اس کے بس میں نہیں تھا۔ حالاں کہ پہلی بات تو یہ ہونی چاہیے تھی کہ آدمی یہاں آتا ہی نہیں لیکن اب یہ آ ہی چکا ہے جو اس کے بس میں نہیں تھا تو یہ تو اس کے بس میں ہے کہ یہاں سے چلا جائے۔ تو پھر یہ یہاں رکا ہوا کیوں ہے' روتا کیوں ہے۔ یہ جو **خَالِقُ كُلِّ شَىۡءٍ** (40:62) ہے' یہ تو ہر شے کے متعلق کہا ہے کہ وہی ہر شے کا خالق ہے۔ عزیزانِ من! قرآن حکیم کو یوں سمجھا کریں۔

خارجی دنیا ہو یا انسانی دنیا' اِن کے ساتھ خدا کا تعلق ربوبیت کا ہے پھر کسی اور کی طرف کیوں پھرے جاتے ہو؟

خالق وہ خارجی دنیا کا بھی ہے۔ یہاں اس کے متعلق یہ کیوں نہیں ہے۔ خدا کا یہاں انسانی دنیا کے ساتھ جو تعلق ہے وہ **ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ** (40:62) کا ہے' وہ ربوبیت کا ہے۔ اور یہ تمہاری ربوبیت پھر ان انقلابات کے ذریعے ہوتی ہے۔ وہ **خَالِقُ كُلِّ**

شَیۡءٍ (40:62) ہے اور ان دونوں دنیاؤں (خارجی اور انسانی) میں ہی لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ (40:62) وہ صاحبِ اقتدار ہے اس کے سوا کوئی نہیں ہے' نہ اس باہر کی تخلیق کردہ دنیا میں' نہ تمہاری ربوبیت کے اندر۔ یہ ہے اس کا صحیح مقام۔۔۔لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ (40:62)۔اب اس سب کچھ سمجھانے کے بعد کہا کہ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ (40:62) یہ سارا کچھ ہم تمہیں بیان کر چکے' دلائل دے چکے' شواہد بیان کر چکے' تاریخی شہادتیں پیش کر چکے' یہ سب کچھ کہنے کے بعد کہا کہ پھر اس کے بعد تم کہاں خدا کی طرف آنے کے بجائے الٹے پھرتے ہو' کہاں لوٹ رہے ہو' کدھر پھر کر جا رہے ہو۔یعنی یہ سب کچھ جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا کچھ جواب تو تمہارے پاس ہے نہیں۔تو وہ چیز ہے کہ سب کچھ سننے کے بعد ''جیہڑا ایس طراں منہ پھیر کر چل دے'' (جو اس طرح منہ پھیر کر چل دے) آپ سوچیے کہ اس کے بعد اس (رویّے) Attitude کو آپ کیا کہیں گے۔او میاں! کوئی جواب دے جو میں نے کہا ہے' کوئی دلیل لاؤ جو کچھ بھی ہے۔یوں منہ پھیر کر چلنے سے تو بہتر تھا کہ تم ایک چپت لگا دیتے مجھے' پتا تو چلتا کہ کچھ ری ایکشن ہوا ہے تمہارے اندر۔اب تو کوئی ری ایکشن ہی نہیں ہوا ہے ۔فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ (40:62) حیرت ہے کہ ہم نے یہ سب کچھ کہا اور تم منہ پھیر کر چل دیئے۔اتنے بڑے سوال کا کیا مختصر جواب۔اور یہ بڑی ذلت آمیز ہوتی ہے کہ آپ کسی کے ساتھ اتنا سر کھپائیں' یہ سارا کچھ کریں اور وہ آگے سے جواب بھی کوئی نہ دے اور منہ پھیر کر چل دے۔یہ ہے فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ ۔کہا کہ یہ تمہی نے نہیں کیا بلکہ کَذٰلِکَ یُؤۡفَکُ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجۡحَدُوۡنَ (40:63) جس طرح تم قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر' دوسری راہیں اختیار کر رہے ہو' اسی طرح تم سے پہلے ان لوگوں نے بھی کیا تھا جو ان قوانین کے خلاف خواہ مخواہ جھگڑے بکھیڑے نکالتے تھے اُن کا جو انجام ہوا اس کا تمہیں علم ہی ہے۔وہی انجام تمہارا ہوگا۔تمہیں معلوم ہے کہ یہ سب ان لوگوں نے کیا تھا تو جو ان کا انجام ہوا' وہی تمہارا بھی ہوگا۔آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں قوانینِ خداوندی کا لفظ آیا ہے۔

لفظ یَجۡحَدُوۡنَ کا لغوی مفہوم

اور آگے یہ یَجۡحَدُوۡنَ بھی ہے' یہ ''ج ح د'' جو ہے' یہ ''ح'' وہ نہیں ہے جس کو دو چشمی ھ کہتے ہیں' وہ تو جہاد کے لیئے جہد کے لیئے' کوشش کے لیے آتا ہے۔یہ وہ ہے ''ح'' جو مولوی صاحب کی زبان میں ''حلوے والی'' ہوتی ہے۔جہاں بھی آپ سنیں گے وہ اس کو ''حلوے والی ح'' کہیں گے ''چلو! حلوہ نہیں تے اوہدے والی ح ای صحیح'' (کوئی بات نہیں۔حلوہ نہیں ہے تو حلوے والی ح تو ہے۔یہ بھی صحیح ہے)۔یہ وہ ''ح'' ہے پھر اس کا مطلب کیا ہے؟ یہ جو جَحۡدُ' یہ بڑا عجیب لفظ ہے یعنی ''دل سے ایک چیز کو صحیح ماننا کہ ہے تو بات ٹھیک لیکن جذبات کی وجہ سے' نموشی کی وجہ سے' کوئی اور چیزیں آ جانا کہ دنیا کیا کہے گی اتنا بڑا تخت' اتنی بڑی حکومت' یہ چھوڑنی پڑے گی۔یعنی اس قسم کے Considerations (تحفظات) کی بنا پہ ایک چیز جسے دل سے صحیح مانتے ہو'

اس قسم کی Considerations (تحفظات) کی بنا پہ اس سے انکار کردیں یا جھگڑا کرنا شروع کردیں۔'' اس کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔''اے دے لئی لفظ تے ساڈے یملا ہے' یملا بننا پیا ایں'' (اس کے لیے یہ لفظ تو ہمارے ہاں ''یملا'' ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ جان بوجھ کر بیوقوف بنتے ہو) یہاں تک تو وہ ہوتا ہے کہ جانتا سمجھتا تو سب کچھ ہے اور اس کے باوجود تمہاری کیفیت یہ ہے کہ انکار کیے جاتے ہو۔ یہاں اس سے بھی آگے ایک چیز کہی ہے کہ یہ کمبخت انکار بھی کھڑا ہو کر نہیں کرتا' منہ پھیر کر چل دیتا ہے۔ دل مانتا ہے مگر منہ پھیر کر چل دیتا ہے۔ یہ ہے یَجۡحَدُوۡنَ ۔

وقت ہوگیا۔ سورۃ المؤمن کی آیت 63 تک ہم آگئے۔ عزیزانِ من! 64 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀......❀......❀

ساتواں باب: سورۃ المؤمن (آیات 64 تا 76)

عزیزانِ من ! آج مارچ 1981ء کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمن کی آیت 64 سے ہو رہا ہے:(40:64)۔

سابقہ آیات میں مخالفین کو بتایا گیا تھا کہ تم یہ ناحق ضد کرتے ہو، جہل (جاہلانا ضد) کرتے ہو، دل تو تمہارا مانتا ہے لیکن اپنی ضد کی بنا پر زبان سے انکار ہی نہیں کیے جا رہے بلکہ سرکشی بھی برت رہے ہو، مخالفت پہ اتر آئے ہو، میدانِ جنگ تک جانے کی تیاریاں کر رہے ہو۔

انسانی زندگی کی ربوبیت کے لیے ارض وسماوات میں باہمی روابط کی نوعیت وافادیت اور تیزی سے گھومتی ارض کا مستقر ہونا

کہا یہ گیا تھا کہ کائناتی خدا کے متعلق تو تمہارا ایمان ہے، قدم قدم پہ تم سے پوچھتے ہیں تو تم کہتے ہو کہ ٹھیک ہے، زمین بھی اس نے

بنائی' آسمان بھی اس نے بنایا' بارش بھی وہ برساتا ہے تو تمہاری جو اپنی دنیا ہے' اس میں پھر خدا کیوں نہیں آ رہا۔ کیا یہ تمہاری الگ دنیا ہے اس خارجی کائنات سے؟ اسی روانی کے اندر قرآن مجید دلائل دیئے چلا آ رہا تھا کہ خارجی دنیا کا تعلق انسانوں سے ہے۔ اگر اس کا تعلق کسی اور مخلوق سے ہوتا تو تم کہتے کہ صاحب! ٹھیک ہے' خارجی دنیا میں قوانین کی کارفرمائی کے دلائل جو آپ لا رہے ہیں' ہمیں اس سے کیا واسطہ ہے۔ کہا ہے کہ یہ اس سے اتنا گہرا تعلق ہے' تمہاری زندگی کا دارومدار ان قوانین پر ہے جو خارجی دنیا کے اندر کارفرما ہیں۔ ان قوانین کے مطابق بارش نہ ہو' زندگی باقی نہ رہے' بارش ہو لیکن تھمے نہیں تو سیلاب ہو' تم ختم ہو جاؤ۔ یہ جو لگے بندھے قانون کے تابع گردشِ لیل ونہار' شمس وقمر' ہواؤں کا اختلاف' تصریف الریٰح ہے' یہ ساری چیزیں ہمارے قانون کے ماتحت چلتی ہیں۔ ان کا تعلق تمہاری زندگی سے ہے۔ اس حد تک تو تم اقرار بھی کرتے ہو اور ان سے فائدہ بھی اٹھاتے ہو۔

میں یہ عرض کر دوں کہ اللہ تعالیٰ بار بار ان قوانینِ خداوندی پر زور دیتا ہے کہ ان کی اطاعت کرو' ان کا اتباع کرو۔ وہ اس لیے نہیں ہے کہ کوئی اس کا اپنا پروگرام ہے جو رکا ہوا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اس کے مطابق کام کرو تو ہمارا کام ہو جائے۔ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (3:97) وہ تو کائنات سے مستغنی ہے۔ اس کا کوئی کام رکا ہوا نہیں ہے۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ اور تمہارا ہی بھلا ہے۔ اور یہ جو قرآن مجید نے ارض اور سماوات میں فرق بتایا ہے' وہ اس لیے ہے کہ تمہارا اور خارجی اشیا کا باہمی تعلق ہے اور اس کا تمہاری زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے مثلاً یہاں ہوا نہ رہے تو پانچ منٹ کے اندر اندر اس کرۂ ارض کی ساری مخلوق ختم ہو جائے۔ کہا ہے کہ اب یہ جو ہم نے انسانی دنیا کے لیے قوانین دیئے ہیں تو یہ اس لیے ہیں کہ انسانوں کا انسانوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس کے لیے ایک خاص عدل کے نظام کے تابع' اس نے انسانوں کے انسانوں سے معاملات کو طے کرنا ہوتا ہے۔ اس نے ان معاملات کو طے کرنے کے لیے یہ قوانین دیئے ہیں۔ تمہارا ہی اس میں فائدہ ہے' اس میں تمہارا ہی بھلا ہے۔ وہ خارجی کائنات کے نظام کو اس دلیل کے لیے سامنے لاتا ہے۔ اور یہاں سے نگاہ کا رخ اُدھر بدلتا ہے کہ پھر وہاں سے انسانوں کی دنیا کی طرف بھی تو آؤ۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ (40:62) جب اِدھر ہم تمہیں کہتے ہیں تو پھر تم الٹے کیسے پھر جاتے ہو۔

اب اس آیت میں یہاں سے درس شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید پھر وہی خارجی کائنات کے نظام اور اس کے قوانین کو سامنے لا کر یہ باور کرا رہا ہے کہ اس کا انسانوں کی زندگی کے ساتھ' ان کی ربوبیت کے ساتھ' ان کی نشوونما کے ساتھ' کتنا گہرا تعلق ہے۔ کہا ہے کہ اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ (40:64) خدا وہ ہے جس نے اس ارض کو تمہارے لیے ''مستقر'' کیا۔ اب یہ لفظ ''قرار'' آیا ہے۔ اس کے بڑے گہرے معنی ہیں۔ ویسے تو اس کے معنی ''ٹھہرنے کی جگہ' قرار آنا'' ہوتے ہیں۔ ''مستقر'' کا لفظ قرار کے لفظ سے آیا ہے یعنی ٹھہرنے کا مقام۔ ایک تو ارض کو

’’قرار‘‘ کہا۔اس کے اندر دو باتیں ہیں۔سنیے! ارض اتنی تیزی سے گھوم رہی ہے کہ باہر کی دنیا میں اگر ارض کو چھوڑ کر' کوئی شے بھی اتنی تیزی سے گھومے تو اس کے اوپر کوئی ٹھہر ہی نہیں سکتا' بیٹھ ہی نہیں سکتا' کھڑا ہی نہیں ہوسکتا۔اتنی تیز رفتاری سے یہ ہماری ارض گھوم رہی ہے۔اور ہماری یہ کیفیت ہے کہ نہ صرف یہ کہ ہم نہایت اطمینان سے اس کے اوپر چلتے ہیں' پھرتے ہیں' بیٹھتے ہیں' لیٹتے ہیں' سوتے ہیں بلکہ اس کی اس گردش کا ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ گھوم رہی ہے' چل رہی ہے۔اس قسم کی چیز کو جو اپنی گردش میں اتنی تیز رفتار ہو' اس کو ٹھہرنے کی جگہ بنا دیا۔یہ ہے پہلی چیز۔

نظامِ شمسی کے ساتھ زمین کا یہ کرہ' انسانوں کے لیے' ایک حیران کن منزل کی طرف صدیوں سے دہری گردش لیے مصروف کار ہے

غور کیجیے گا کہ یہ پہلی چیز کتنی زبردست ہے۔ہم یہی سمجھتے ہیں کہ ایک تو زمین کا گول ہونا ہی ہمارے ذہن میں نہیں آتا۔ہم یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک Flat (چوڑی ہموار) سی چیز ہے اور کسی طرح سے کھڑی ہے اور ہم اس کے اوپر رہ رہے ہیں لیکن نہ یہ Flat (چوڑی ہموار) سی کوئی چیز ہے' نہ یہ کھڑی ساکن چیز ہے۔یہ دائرے والا اتنا بڑا گولا ہے اور اتنی تیزی سے چل رہا ہے' گردش کر رہا ہے۔اور یہ گردشیں بھی دہری گردشیں ہیں۔ایک تو یہ ہے کہ یہ اپنے محور کے گرد (Axial) اس طرح سے گھوم رہی ہے اور دوسری یہ کہ یہ نظامِ شمسی کے ماتحت کسی جگہ جا بھی رہی ہے بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ پورا نظامِ شمسی کسی اور جگہ جا رہا ہے۔یہ اس قسم کی دہری گردش والی چیز' گول دائرے والی چیز ہے۔اور اس پہ ہم ٹھہرے ہوئے ہیں' رہ رہے ہیں' ساکن ہیں' سکونت پذیر ہیں۔ایک تو ارض کو کہا کہ اسے تمہارے لیے مستقر بنایا' ٹھہرنے کی جگہ بنایا' اتنی حرکت والی جگہ کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا۔کہا کہ دیکھتے ہو یہ ہمارے قانون کی کارفرمائی ہے۔اور اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے' ہمارا تو کوئی اپنا فائدہ نہیں۔دوسری چیز خود انسانوں کے لیے ہے۔قرار کے معنیٰ' ٹھیک ہے' ٹھہرنا ہے' لیکن عربی زبان میں ایک تو سکن ' ٹھہرنا ہوتا ہے' سکون ہوتا ہے' وہ مسکنت ہوتی ہے۔ساکن ہمارے ہاں بھی لفظ بولتے ہیں' جہاں کوئی رہنے والا ہو۔ایک ٹھہرنا کسی متحرک شے کا ہوتا ہے کہ وہ حرکت میں چلی آ رہی ہے' کسی مقام کے اوپر آ کر تھوڑے وقت کے لیے' یونہی ستانے کے لیے' رک گئی ہے۔یہ جو اس طرح سے کسی متحرک شے کا' چلنے والی چیز کا' کسی جگہ تھوڑے وقت کے لیے رک جانا ہوتا ہے' اسے ’’قرار‘‘ کہتے ہیں۔یہ ہے دوسری چیز۔

اس کرۂ ارض پر قرآنِ حکیم نے انسانی زندگی کے لیے ’’قرار‘‘ کا لفظ استعمال کیا ہے

اب اس میں دیکھیے قرآن ایک لفظ میں کتنی بڑی چیز کہہ گیا ہے۔انسانوں کے متعلق سورۃ بقرۃ میں کہا ہے کہ **وَ لَكُمْ فِيْهَا مُسْتَقَرٌّ**

وَّ مَتَـاعٌ اِلـٰی حِیۡـنٍ (2:36) اس ارض میں تمہارے لیے مستقر ہے' ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ کوئی متحرک شئے کسی مقام پہ آ کر رکے گی تو اسے اس کا مستقر کہا جائے گا۔ اسے قرار پذیر کہا جائے گا۔ اب ایک لفظ میں یہ کہہ دیا کہ یہ زندگی' یہ کاروانِ حیات' معلوم نہیں کہاں سے' کروڑوں سال کی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا' متحرک' حرکت میں' چلتا ہوا' آ رہا تھا تو وہ انسانی پیکر کے اندر آ پہنچا۔ اور یہاں آنے کے بعد کچھ وقت کے لیے یہ رک گیا ہے۔ اور رکنے کے بعد اس نے تو پھر آگے چلنا ہے۔ ''قرار'' تو اسی صورت میں ہوگا کہ ایک متحرک شئے کہیں آ کر تھوڑے وقت کے لیے رکے اور پھر آگے چلے۔ پھر وہیں جو قرآن حکیم نے کہا تھا کہ فِـــی الۡاَرۡضِ مُسۡتَـقَـرٌّ وَّ مَتَـاعٌ اِلـٰی حِیۡـنٍ (2:36) تھوڑے سے وقت کے لیے تم نے یہاں رکنا ہے۔ گویا یہ زندگی بھی جو انسان کی اس ارض کے اوپر ہے' یہ قرار ہے' یہ تھوڑے وقت کے لیے رکنا ہے۔ زندگی متحرک چلی آ رہی تھی۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے یہ چلتے ہوئے کسی مقام کے اوپر رکنا ہے۔

نظامِ شمسی کے متعلق آج کے دور کی تحقیق اور قرآنِ حکیم

سورۃ یٰسین میں ہے کہ وَالشَّـمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا (36:38) یہ شمس' تجری نے بتا دیا کہ اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے' اس نظامِ شمسی نے کہیں جا کر رکنا ہے۔ یہ جو چیز ذٰلِکَ تَـقۡـدِیۡـرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ (36:38) ہے' یہ خدا کے مقرر کردہ پیمانے ہیں' قوانین ہیں' جن کے ماتحت یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اس سے پیشتر نظامِ شمسی کے متعلق پہلے تو بطلیموسی نظام تھا' اس کے متعلق تو یہ کہا ہی نہیں جاتا تھا۔ یہ اس دور میں آ کر جو فلکیات کے متعلق اب تحقیقات ہوئی ہیں' ان کی رو سے یہ چیز ہے کہ یہ شمس' یہ سورج' اپنے کرّوں کو ساتھ لے کر گھوم رہا ہے۔

بطلیموسی نظام کے خلاف مرتد ہونے کے فتوے کی اصل بنیاد

یہ جسے نظامِ شمسی کہتے ہیں ایک تو یہ ہے کہ یہ اپنے محور کے گرد اس طرح سے گھوم رہا ہے اور ساتھ ہی یہ پورے کا پورا نظام کسی اور طرف بھی جا رہا ہے۔ یہ اس دور میں تحقیق ہوئی ہے۔ اس سے پہلے اس کا تصور ہی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ اگر کہا گیا تھا تو وہی تھا کہ ان کی محوری گردش ہے اور اُس کے متعلق بھی یہ تھا کہ یہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے گویا زمین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ چیز بھی غلط تھی لیکن یہ اسے مانتے چلے آ رہے تھے۔ اور جب پہلی دفعہ انہوں ❶ نے بطلیموسی نظام کی مخالفت میں کہا کہ نہیں! یہ سورج زمین کے گرد نہیں

---

❶ ان کے نام ہیں: (الف) Nicolous Copernicus (1473-1543AD) (کاپرنیکس)

(ب) Tycho Brahe (1546-1601AD) (ٹیکو براحی)

(ج) Galileo (1564-1642AD) (گیلی لیو) (د) Kepler (1571-1630AD) (کیپلر)

گھومتا بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ عیسائیوں نے ان ❶ کے خلاف مرتد ہونے کا فتویٰ عائد کیا تھا اور اس کے بعد قتل کر دینے کی سزا دی تھی۔

عزیزانِ من! وہ کیا بات تھی جس کی بنیاد پر مرتد ہونے کا یہ فتویٰ دیا اور قتل کی سزا دی؟ وہ بات یہ تھی کہ عیسائیوں کے ذہن میں یہ تھا اور وہ پہلے سے تھا جب کہا تھا کہ سارا نظام یا سورج' زمین کے گرد گردش کرتا ہے' وہ مان رہے تھے کہ زمین وہ ہے جہاں خدا یا خدا کا بیٹا آیا ہے تو اس کو ساری کائنات کا مرکز ہونا چاہیے۔ اس لیے اس حد تک تو وہ مطمئن تھے کہ یہ زمین کائنات کا مرکز ہے جس پہ خدا کا بیٹا یا خدا خود یہاں آیا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ نہیں صاحب! یہ تو باقی کرّوں میں سے ایک کرّہ ہے اور جس طرح باقی کرّے' سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں' یہ بھی اسی طرح سے گردش کر رہا ہے تو اس کی وہ خاص منفرد اہمیت ختم ہو جاتی تھی۔ اس لیے انہوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔

آپ یہ عقائد دیکھیے کہ کہاں پہنچتے ہیں۔ جب اس سے کہا گیا تھا کہ کہہ دو کہ زمین ساکن ہے' ایسے ہی ہے جیسے یہ پادری کہتے ہیں تو اس نے تو آخری وقت میں بھی کہا تھا کہ یہ کیسے کہہ دوں' جب میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ متحرک ہے اور یہ سورج کے گرد گھومتی ہے تو میں یہ کیسے کہہ دوں کہ یہ ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ سائنٹسٹ تو اس طرح سے حقائق کو دیکھتا ہے۔ اور مذہب اس طرح سے اس کی تکذیب کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ سائنٹفک طریقے سے کہتا ہے کہ آؤ' میں تمہیں دکھا دوں بلکہ دلیل یہ ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ جو زمین ہے' اس کو منفرد حیثیت حاصل نہیں ہے تو جو ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا اور خدا کا بیٹا اس زمین کے اوپر آئے اس لیے کائنات میں سب سے مرکزی مقام اس زمین کو حاصل ہے' وہ باطل ہو رہا ہے لیکن اس قسم کے عقائد کب تک ٹھہر سکتے تھے۔ اُس دور میں یہ کیا اور آج یہ سب کچھ مان رہے ہیں۔ سائنس تو حقائق پیش کرتی ہے۔

زمین اور سمآ کے متعلق چودہ سو سال پیشتر قرآنِ حکیم کا فرمان مگر مذہب میں عقائد ہیں حقائق نہیں ہیں

قرآن حکیم نے کہا ہے کہ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا (40:64) اس کرّۂ ارض کو تمہارے رہنے کے قابل بنایا۔ ارض کو دوسری جگہ کہا ہے کہ یہ ہمارا قانون دیکھتے نہیں کہ یہ کس تیزی سے گھوم رہی ہے اور کس اطمینان سے تم اس کے اوپر بیٹھے ہو۔ قرآن حکیم چودہ سو سال پہلے یہ بتا رہا ہے۔ اور یہ کل کی بات ہے جو عیسائی دنیا نے ان کے خلاف فتویٰ دیدیا تھا۔ قرار' ارض کو بنایا۔ وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً (40:64) وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً کو یعنی زمین کے اوپر ایسی فضا محیط کر دی جو تمہیں' اوپر سے گرنے والے اجرام سے محفوظ رکھے۔ یہ

---

❶ یہ اشارہ اطالوی ماہر فلکیات اور ریاضی دان گیلی لیو (1642-1564ء) کی طرف ہے۔ اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

He recanted but is said to have muttered under his breath "But it (the Earth) does move."

کرۂ ارض پر فضا(Atmosphere) ہے کہ جو خود بھی محفوظ ہے اور زمین کے رہنے والوں کو اوپر سے گرنے والے شہابِ ثاقب کی تباہی سے بھی محفوظ رکھتی ہے حوالہ دیکھیے (21:32)۔ یہ عجیب چیز ہے۔ پہلے سما کے متعلق ہمارے ہاں بھی تو یہی کچھ تھا جیسا کہ ان عیسائیوں کے ہاں تھا۔ دراصل مذہب کی دنیا میں تو صرف عقائد ہی ہوتے ہیں' حقائق نہیں ہوتے۔

ہمارے ہاں کی کتب میں عرش کے متعلق پایا جانے والا عقیدہ کہ مذہب تو چلتا ہی توہم پرستی پر ہے

ہمارے ہاں آج تک یہی مانا چلا جا رہا ہے کہ یہ جو آسمان ہے' یہ اس طرح سے ہمارے اوپر سورج کا ڈل ہے۔ پھر اوپر نیچے سات آسمان ہیں۔ ایک آسمان کے اور دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔ ایک سے دوسرا اور سات اوپر تلے اس طرح سے ہیں۔ اور وہ ساتویں کے اوپر پھر ایک اتنا بڑا سمندر ہے۔ اور سمندر کے اندر پہاڑی بکرے کھڑے ہیں۔ اور اس کا پانی بھی اتنا گہرا ہے جو پانچ سو سال کا راستہ ہے۔ یہ اتنا گہرا ہے۔ اور وہ بکرے اتنے اتنے بڑے ہیں کہ ان کے گھٹنوں تک پانی آتا ہے۔ اور ان بکروں کے سینگوں کے اوپر خدا کا عرش ہے۔ عیسائیوں کی بات کی تو ہمارے چہرے پر کچھ خوابیدہ سے تبسم کی لہریں ابھر آئیں۔ اس کو کیا کہیں گے آپ؟ مذہب تو چلتا ہی توہم پرستی پر ہے۔ آج بھی اگر یہ چیز کہنے والا ہو کہ نہیں صاحب! یہ اس طرح سے آسمان نہیں ہے' اس قسم کا نہیں ہے تو آج بھی اس کے خلاف وہی ارتداد کا فتویٰ لگ جائے گا۔

قرآنِ حکیم کے مطابق ارض و سما کی کیفیت اور سقفِ محفوظ کی نوعیت و افادیت

سما عجیب چیز ہے۔ سما' ہر اونچی چیز کو کہتے ہیں۔ اب پھر اونچی چیز کے متعلق بھی ذہن میں یہ آ سکتا تھا کہ بہر حال پھر زمین ان سے نیچے ہے اور یہ اس کے اوپر ہیں۔ اوپر اور نیچے کا یوں تصور آتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ یہ بات یوں نہیں ہے۔ ہر سما کی ایک ارض ہے اور ہر ارض کا ایک سما ہے۔ یہ Relative (اضافی) چیزیں ہیں۔ ہماری زمین سے اوپر کوئی چیز ہے جو اس کا سما ہے۔ اس سما کے نیچے یہ ارض ہے۔ ہمارے کرّے سے جو نیچے ہے' یہ ہماری ارض ہے اور اس کے لیے ہم سما ہیں۔ عزیزانِ من! چودہ سو سال پیشتر کون کہہ سکتا تھا کہ ہر سما کی ایک ارض ہوتی ہے۔ اگر تمہاری ارض کا ایک سما ہے تو کسی ارض کے تم بھی سما ہو۔ تو سما کے متعلق تو یہ کہا کہ یہ کرّے ہیں' گردش کر رہے ہیں۔ اب یہ جو چیز تھی کہ ہر چیز جو اوپر ہو' اس کو عربی زبان میں سما کہتے ہیں تو ہمارے اوپر جو کچھ بھی ہے اس کے متعلق قرآن حکیم نے کہا تھا کہ یہ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (21:32) ہے۔ کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا کہ اس کو سَقْفًا کیوں کہا ہے؟ چھت کہا ہے۔ اور ایسی چھت جو خود محفوظ ہے اور تمہیں حفاظت میں رکھے ہوئے ہے۔ یہ چھت پھر کیسی ہو سکتی ہے؟ کس طرح سے اس نے ہمیں حفاظت میں رکھا ہوا ہے؟ قرآن حکیم نے تو یہ کہہ دیا کہ خدائے علیم کا کلام ہے لیکن اس دور سے پہلے کے جو انسان تھے وہ تو اس کو

ایسے نہیں سمجھ سکتے تھے۔ہم بھی جو آج اس حقیقت کو سمجھ رہے ہیں تو کوئی ہماری کاری گری نہیں ہے بلکہ علمِ انسانی اس سطح پہ پہنچ چکا ہے کہ اس نے ان حقائق کو بے نقاب کر دیا ہے۔اور ہم ان لوگوں کے شکرگزار ہیں جن کو ہم دہریہ اور ملحد اور فاسق اور فاجر کہتے ہیں کہ ان کی علمی تحقیقات نے قرآن حکیم کے ان حقائق کا ثبوت بہم پہنچا دیا ہے۔

یہ بات کہ یہ جو سما ہے' یہ سقفِ محفوظ ہے' تمہاری حفاظت کر رہا ہے' خود بھی محفوظ ہے تو اب تحقیق کی رو سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ جو ہمارے اوپر Atmosphere (فضا) ہے یہ ہے ہمارا سما۔کرّے تو آگے جا کر آئیں گے۔اور یہ خاصا دبیز ہے۔اگر میں غلطی نہیں کرتا تو دس یا بارہ میل تک یہ جاتا ہے۔یہ وہ ہے جس کے اندر ہماری زمین کی کشش ابھی باقی رہتی ہے۔اس سے اوپر چلے جایئے تو یہ کشش کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے لیکن بات یہ نہیں جو قرآن حکیم نے محفوظ کہا ہے۔کہا یہ گیا ہے کہ اوپر کے جتنے یہ بڑے بڑے کرّے ہیں' سورج جیسے آتشیں بھی ہیں' اس میں سے یہ شہابِ ثاقب ہیں' یہ ٹوٹنے والے تارے ہیں' جن کو ہم دم دار تارے کہتے ہیں' یہ ہمیں ان سے محفوظ رکھتا ہے۔

اس کرّہ ارض کو روشن کرنے کے لیے نظامِ قدرت کی کارفرمائی

یہاں سے تو یوں نظر آتا ہے کہ وہ ٹوٹنے والے تارے بس روشنی کی ایک لکیر ہے جو اس طرح سے پھر رہی ہے۔یہ دراصل اوپر کے کرّوں میں سے ان کرّوں کے کچھ ٹکڑے ٹوٹ کر نیچے گرتے ہیں' تو اُن سے پیدا ہوتی ہے۔ان نیچے گرنے والے ٹکڑوں میں سے بعض اتنے بڑے بڑے ہوتے ہیں کہ ایک ایک کا وزن ہزاروں من کا ہوتا ہے۔اب آپ سوچیے کہ اوپر کے کرّے سے اس قسم کا کوئی ٹکڑا گرے اور وہ اتنی تیزی سے وہاں سے نیچے آئے تو ہمارا کیا حال ہوگا۔اتنی تیزی سے تو اگر ایک ناریل درخت سے ٹوٹ کر آ جائے تو وہ سر پھاڑ دیتا ہے' یہ جو اتنا بڑا کرّے کا ٹکڑا وہاں سے ٹوٹ کے زمین کی طرف اس تیزی سے آئے' زمین کے اوپر گرے تو زمین تو رہنے کے قابل ہی نہیں رہ سکتی۔اور اِدھر تو ان کرّوں سے یہ ٹکڑے بارش کی طرح ہر آن ٹوٹتے رہتے ہیں۔

اب یہ جو ہمارے اوپر Atmosphere (فضا) ہے' جب وہ اس کے اندر پہنچتے ہیں تو وہ ان کو پیس دیتا ہے۔اب اس کے پیسنے سے ایک تو یہ ہے کہ یہاں وہ پتھر' وہ اتنی اتنی بڑی چٹانیں' ہمارے اوپر گرتی نہیں ہیں کہ ہم ختم ہو جائیں' وہ اس Atmosphere (فضا) کے اندر پس کر رہ جاتی ہیں۔اور دوسرے یہ کہ یہ جو روشنی ہم تک پہنچتی ہے' اگر میں اس کی وضاحت کرنے لگوں تو میں دوسری طرف چلا جاؤں گا' یہ Subject (مضمون) بڑا دلچسپ ہے۔سوال یہ ہے کہ یہ روشنی' جو ایک جگہ سے دوسری جگہ Travel (سفر) کر کے پہنچتی ہے' یہ کس چیز کے Through (ذریعہ) آتی ہے؟ ہمیں تو یہ معلوم ہی نہیں' ہم تو یوں سمجھتے ہیں کہ وہاں سے روشنی نکلتی

ہے تو ہم تک پہنچ جاتی ہے' یہ مجھ تک بھی آ رہی ہے۔ یہ اس طرح سے نہیں ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ہوا کے اندر یہ جو ذرّے ہوتے ہیں' ان کو اب خاک کے ہی ذرّے کہا جائے گا' یہ ان ذرّوں کی چمک ہوتی ہے' جو دوسری جگہ پہنچتی ہے۔ یہی Meteors ❶ (شہابِ ثاقب) جو اس فضا کے اندر آ کر پستے ہیں' پسنے کے بعد سرمے سے بھی باریک گرد بن جاتے ہیں۔ یہ ان کے ذرّے ہیں جو سورج چاند کی روشنی زمین تک پہنچاتے ہیں۔

ایک طرف تو سائنس کے انکشافات سے ہر آنے والا دور قرآنِ حکیم کے حقائق کی وضاحت کا باعث بنے گا اور دوسری طرف ہماری کم مائیگی کہ آسمان آج بھی شیشے کے ڈل سمجھے جا رہے ہیں

عزیزانِ من! ہم کیا پہچانیں خدا کو! یہ (سائنسدان) لوگ پہچان سکتے ہیں۔ یہ بتا سکتے ہیں کہ اس نے اس فضا کو "سقفِ محفوظ" کیوں کہا تھا۔ میں دوسری جگہ آؤں گا تو کہوں گا کہ اس نے نور اور ضیا کے دو الفاظ Light (روشنی) کے لیے کیوں استعمال کیے ہیں۔ یہ اور باتیں ہیں۔ یہ ساری چیزیں Scientific (سائنسی) ہیں۔ اور آج کا سائنسدان ہی ان کو اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہے۔ اور ان کے سمجھانے سے ہم لوگ سمجھے ہیں' ہم تو ان کے رہینِ کرم ہیں۔ اور قرآن حکیم نے یہی کہا تھا کہ کائنات کے چھپے ہوئے حقائق جوں جوں بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے ہر حقیقت قرآن حکیم کے کسی نہ کسی دعوے کا ثبوت بنتی چلی جائے گی۔ ان الفاظ کے معنی تو وہ جانتے ہیں۔ انہوں نے تحقیق کی تو ہماری سمجھ میں بھی بات آئی کہ قرآن حکیم کیا کہہ گیا ہے۔ اسی لیے وہ وجد میں آ جاتے ہیں جب ان الفاظ پہ غور کرتے ہیں۔ اور ہم انہیں اسی طرح سے مانتے ہیں کہ اوپر وہ سات آسمان' ڈلوں کی طرح ہے۔ اور پھر یہ سارے کہتے ہیں کہ یہ سارے آسمان شیشے کے ڈل ہیں اور ان میں یہ جواہرات کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ ہم تو یہیں ہیں۔ یہ لوگ بتا سکتے ہیں کہ خارجی کائنات کیا ہے۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ یہ ہے خارجی کائنات۔ اور یہ اس ساری خارجی کائنات کو کسی سائنس کی کتاب کی طرح نہیں بتا رہا بلکہ کہتا ہے کہ تم دیکھو کہ اس کا تمہارے ساتھ کتنا تعلق ہے۔ ابھی وہ لفظ آئے گا کہ یہ نظام اس طرح سے کیوں چل رہا ہے۔

---

❶ یہ وہ ہیں جنہیں ہم "ٹوٹنے والے تارے" (Meteors) کہتے ہیں۔ یہ درحقیقت نظامِ شمسی کے چھوٹے چھوٹے اجرام ہوتے ہیں جو کششِ ثقل کی قوت سے ٹوٹ کر نیچے گرتے ہیں اور ان کے پتھریلے ٹکڑے بارش کی طرح برستے ہیں۔ بعض اوقات یہ کرۂ ارض اس 'بارش' کے راستے میں آ جاتا ہے لیکن اس کے اوپر کی فضا ان ٹکڑوں کو پیس کر رکھ دیتی ہے اور جسے ہم "ٹوٹا ہوا تارہ" کہتے ہیں وہ ان کی چمکنے والی راکھ ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ پتھر اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ فضا سے پس کر راکھ نہیں ہوتے۔ اس طرح ان کے بعض ٹکڑے زمین پر گرتے ہیں لیکن یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ فضا میں پس جاتے ہیں۔ اگر فضا ان "پتھروں کی بارش" کو راکھ نہ بنا دے تو زمین پر زندگی محال ہو جائیے۔ یوں یہ فضا' ہمارے لیے "محفوظ چھت" کا کام دیتی ہے (ماخوذ از پرویزؒ: مفہوم القرآن' فٹ نوٹ 1' ص۔ 734)۔

زندگی جو ایک توانائی ہے' ہم اس کو جسمانی شکل کے بغیر محسوس ہی نہیں کر سکتے

عزیزانِ من! کہا ہے کہ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (40:64) تمہیں ایک صَوَّرَدی' کتنی احسن تھی وہ صَوَّرَ! اب پھر یہ ایک بڑا گہرا مسئلہ آجاتا ہے۔ کوئی شے محسوس طور پر' مرئی طور پر' ہمارے سامنے اسی صورت میں آسکتی ہے جب وہ کوئی Form (شکل) اختیار کرلے۔ جس چیز نے (مثلاً) توانائی نے' کوئی محسوس Form (شکل) نہ اختیار کی ہو' وہ محسوس بھی نہیں ہوسکتی' مرئی بھی نہیں ہوتی۔ زندگی ایک Form (صورت وشکل) کے اندر جب آئی ہے تو اس وقت ہمیں پتہ چلا ہے کہ یہ Life (زندگی) ہے۔ یہ قرآن مجید نے جو خدا کے لیے لفظ المصوّر کہا ہے تو اس کے معنی Painter (پینٹر) نہیں ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جو Abstract (غیر محسوس) سی چیزیں ہیں جو اس طرح سے محسوس شکل میں تمہارے سامنے نہیں آتیں' ان کو Form (شکل) دیدی گئی ہے تب یہ چیزیں تمہارے سامنے محسوس بنی ہیں۔ اس لحاظ سے قرآنِ کریم نے خدا کے لیے لفظ المصوّر کہا ہے۔

قدرت نے انسان کو بہترین تناسب کے ساتھ پیدا ہی نہیں کیا بلکہ اس کے لیے رزق بھی عطا کیا ہے

اور تمہیں جو Form (شکل وصورت) دیا ہے وہ اَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (40:64) ہے' اس میں Proportion (تناسب) نہایت صحیح رکھی ہے۔ دوسری جگہ انسان کے متعلق احسن تقویم (95:4) بھی آیا ہے۔ احسن کے معنی ہیں: بہترین Proportion (تناسب) لیے ہوئے' اعتدال کو لیے ہوئے۔ صحت کی Definition (تعین حدود) طبیب یہی کرتے ہیں کہ انسان کے اندر جتنی اخلاط ہیں' اگر ان کی Proportion (تناسب) صحیح ہے تو اسے صحت کہتے ہیں۔ اور جب کسی چیز کا توازن بگڑتا ہے تو اسے بیماری کہتے ہیں۔ علاج یہ ہے کہ بگڑے ہوئے توازن کو درست کرلیا جائے۔ اسے احسن کہا ہے کہ ہم نے جو انسان کو پیدا کیا ہے تو یہ بہترین اعتدال پہ' بہترین توازن لیے ہوئے ہے' یہ Form (شکل) اس کو ہم نے عطا کی ہے۔

آگے کہا کہ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ (40:64) اسے پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا' تمہارے لیے سامانِ ربوبیت فراہم کیا' رزق فراہم کیا۔ اور یہ رزق مِّنَ الطَّيِّبٰتِ نہایت خوشگوار ہے۔ طیّب کے معنی ہیں' مزاج کے مطابق' نشوونما دینے والا' خوشگوار۔ اس کے اندر Aesthetic Taste (جمالیاتی ذوق) بھی آجاتا ہے۔ اس کے اندر نشوونما کے سامان بھی ہوتے ہیں۔ اور عجیب چیز ہے کہ عربوں کے ہاں رزق اس سامانِ نشوونما کو کہتے تھے جو بروقت مل جائے۔ کیا بات تھی اس قوم کی! بروقت ملنا بھی بڑا ضروری ہے۔ ایک اس کا طیّب ہونا ضروری ہے اور دوسرا اس کا بروقت مل جانا۔ بچے کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی پہلی چیز تو ہوا ہوتی ہے جس میں وہ سانس لیتا ہے۔ ہوا پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ رحمِ مادر کے اندر تو اب تک (مکمل) پتا ہی نہیں چلا کہ بچہ سانس کیسے لیتا ہے۔ رحمِ مادر میں معلوم

نہیں ہے کہ وہاں اس کی پرورش کس چیز سے ہوتی ❶ ہے' دودھ تو وہاں ہوتا نہیں ہے۔ پیدا ہونے کے ساتھ ہی دودھ کے چشمے ابل پڑتے ہیں۔ کل تک جو وہاں دودھ نہیں تھا' اس کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی دودھ آ گیا۔ اور اس کے اندر یہ Instinct (جبلت) بھی کہ وہ فوراً لپک کر اُدھر ماں کے دودھ کے سرچشموں کی طرف چلا جاتا ہے۔ اسے کس نے یہ بتا دیا؟۔ یہ ہے جسے رزق کہیں گے کہ سامانِ نشوونما کا بروقت مل جانا اور اس کا طیّب ہونا۔ کہا کہ دیکھتے ہو یہ چیزیں' جنہیں تم نے کہہ دیا کہ یہ تو خارجی کائنات ہے' اس میں اُس کے قوانین ہیں' تو ہوں' پر ہمیں ان سے کیا تعلق!! کہا کہ دیکھو تو سہی! شمس و قمر سے لے کر دودھ کی ان دھاروں تک کا تعلق تم سے نہیں تو کس سے ہے۔ یہ نظام اگر ذرا بگڑ جائے تو کیا تم باقی بھی رہ سکتے ہو؟ یہ سب کچھ کہنے کے بعد کہا کہ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ (40:64) یہ ہے تمہارا اللہ جس کی طرف ہم تمہاری توجہ دلاتے ہیں۔ اور اس کی صفت رَبُّكُمْ ہے کہ تمہیں نشوونما دینے والا ہے۔ ان ذرائع سے وہ تمہیں نشوونما دیتا ہے۔

لفظ برکت کے علاوہ ''الحی القیوم'' کا مفہوم اور کائنات کی نشوونما کا ذکر

عزیزانِ من! یہ ہے تعلق اس خارجی کائنات کا انسانی زندگی کے ساتھ۔ رَبُّكُمْ (40:64) کہا ہے کہ وہ تمہارا رب ہے۔ بہت اچھا جی! کیا وہ ہمارا ہی رب ہے؟ کہا کہ نہیں! فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ(40:64) تمہارا ہی نہیں' تمام کائناتوں کا' تمام اقوامِ عالم کا رب ہے۔ اور پھر وہ تَبٰرَكَ بھی ہے۔ میں نے آپ کو اگلی دفعہ بتایا تھا کہ ''برکت'' کا لفظ ان عربوں کے ہاں عجیب چیز ہے۔ ''کوئی شے جو اپنے مقام پر مستحکم بھی ہو اور اس میں نشوونما بھی ہو رہا ہو جیسے پودا اپنے مقام پہ مستحکم ہوتا ہے اور بڑھتا بھی چلا جاتا ہے' اسے ''تبرک'' کہتے ہیں۔ یہ جو اس قسم کی نشوونما ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقام پر مستحکم ہو اور اس کے ساتھ بڑھتا' پھولتا' پھلتا بھی چلا جائے' اس کو ''برکت'' کہتے ہیں۔

کہا ہے کہ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ(40:64) خدا کا کائناتی قانون اپنے مقام پر محکم' اٹل' مستحکم ہے اور اس کے ساتھ ہی' ثبات کے ساتھ مستقل اور تغیر (Permanence and Change) کا مرکب بھی ہے۔ یہ ہے کائنات کا بنیادی اصول۔ یہ ایک لفظ برکت کے اندر سب کچھ آ جاتا ہے۔ اسی لیے کہا ہے کہ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ(40:64) ربوبیتِ عالمینی کے لیے اس نے یہ سارا نظام مقرر کیا ہے۔ اپنی اپنی جگہ ہر شے اٹل' مستحکم اور سامانِ نشوونما دینے کے لیے بڑھتی' پھولتی' پھلتی رہتی ہے۔ اور اس کی بنیادی چیز یہ ہے

---

❶ یاد رہے یہ بات مارچ 1981ء کی 6 تاریخ کو کہی گئی تھی۔ یہاں مختصراً یہ کہا ہے کہ رحمِ مادر میں بچے کا سانس لینا اور نشوونما پانا اس انداز و متاع سے نہیں ہوتا جس انداز سے پیدا ہونے کے فوراً ہی بعد شروع ہو جاتا ہے۔

کہ هُوَ الْحَیُّ (40:65) جوخود زندہ ہو' اپنی زندگی یا حیات کے لیے کسی کامحتاج نہ ہواور دوسروں کوحیات دے۔قرآن حمید میں خدا کی دو صفتیں ''الحی'' اور ''القیوم'' آئی ہیں۔''الحّی'' یعنی اسے نہ کسی نے زندگی دی ہو' وہ تو ازخود زندہ ہو۔اور ہر زندگی کا سہارا' زندگی دینے والا وہ ہو۔اور ''القیّوم'' یعنی جو اپنے مقام پر خود مستحکم ہواور ہر ایک کو قیام کا سہارا دینے والا ہو۔ایک ہی لفظ کے اندر یہ دونوں معنی ہوتے ہیں۔کہو کہ هُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ (40:65) اس کے سوا کوئی اور بھی ہے جس کا اقتدار اس کائنات کے اندر ہو؟ نہیں' بالکل نہیں۔

یورپ کے دانشوروں کی کم مائیگی کی کیفیت مغربی جمہوریت کے آئینہ میں

اب یہ جتنی چیزیں پہلے کہی گئی ہیں' کوئی بھی اِن سے انکار نہیں کر سکے گا۔یہ تو یوں ہے کہ واقعی یہ صاحبِ اقتدار وہی ہو سکتا ہے جس نے یہ قوانین بنائے اور جو ان کو اس حسن وخوبی سے چلا رہا ہے۔میں نے عرض کیا ہے کہ یورپ کے Irreligious لوگ یعنی جو مذہب پرست نہیں ہیں' وہ سب کے سب اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ قوانین جو کسی کے بنائے ہوئے ہیں' وہ اس قدر اٹل اور مستحکم طریق سے چل رہے ہیں۔یہ ہے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ (40:65)۔بس فرق اتنا ہی ہے کہ وہ خارجی کائنات میں ان قوانین کی ہمہ گیری اور اقتدار کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن انسانوں کی دنیا کے اندر آتے ہیں تو یہاں آنے کے بعد پھر وہ یہ کہتے ہیں کہ نہیں! یہاں کسی بلند و بالا قانون کی ضرورت نہیں' یہاں انسان اپنے بنائے ہوئے قوانین کے تابع زندگی بسر کرے گا۔یہ جسے Democracy (جمہوریت) کہا جاتا ہے یعنی انسان خود مل کر' خود قوانین بنا کر' ان کے تابع چلے' ان سے بالا کوئی قانون نہ ہو' وقت ہوا تو میں عرض کروں گا کہ یورپ نے جو اتنی زیادہ ٹھوکریں کھانے کے بعد آخر میں Democracy (جمہوریت) کا تصور دیا تھا' اسے وضع کیا یا اختیار کیا تھا' اور اس پر اتنے جشن منائے تھے کہ جیسے فردوسِ گم گشتہ کو پا لیا ہو' یہ ابھی کل کی بات ہے' آج یورپ کے دانشور' مدبر' سیاستدان' اس نظام کے ہاتھوں چیخ اٹھے ہیں۔بیک زبان کہہ رہے ہیں کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کتنے بھی اچھے کیوں نہ ہوں' وہ انسانوں کو محکوم رکھتے ہیں۔وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی اطاعت کی جائے۔قانون وہ ہونا چاہیے جو انسانوں سے اوپر کہیں سے ملے۔یہ مطالبہ وہ لوگ آج کر رہے ہیں۔یہ اسی جمہوریت کے متعلق ہے جسے انہوں نے کہا تھا کہ وہ ان کے ہاں حدِ آخر تھی۔

انسانوں کی شکستہ حال فکر کے لیے وحی کا پیش کردہ ایک انقلابی پروگرام نیز لفظ دعا کا مفہوم

پہلے تجربے تو پھر بھی ہزاروں سال لے لیتے تھے تو پھر کہیں تبدیلی آتی تھی' اس جمہوریت کے تجربے کو تو ابھی سینکڑے سال بھی نہیں

ہوئے ہیں۔ کل ہی جین جیکس روسو ❶ (78-1712) کے تصورات سے انقلابِ فرانس (1789ء) کے بعد یہ تصور درآیا تھا۔ اور آہستہ آہستہ ابھی تو کوئی سوسال بھی نہیں ہوا کہ یہ مغرب کے اندر نافذ ہوا ہے اور پختگی تک نہیں پہنچا بلکہ وہ گھٹنوں تک چلنے سے پہلے ہی اس کے ہاتھوں تنگ آ گئے ہیں۔ خیر کہا ہے **لَآ اِلٰـــهَ اِلَّا هُوَ** (40:65)۔ وہ مفکرین و مدبرین یہاں تک آئے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین خواہ ان کی شکل Democracy (جمہوریت) بھی کیوں نہ ہو' اس سے بھی انسان کو وہ زندگی نہیں ملتی جس کی آرزو اس کے دل میں ہے۔ کہا کہ **لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ** (40:65) خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو' خالص اسی کی اطاعت' اس میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔ الدین کے معنی یہاں اطاعت کے ہیں۔ یہ **مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ** ہے۔

اور پھر وہ **فَـــادْعُـوْهُ** کے متعلق میں نے کہا تھا کہ یہاں سے ہمارے ہاں لفظ ''دعا'' نکلا ہے۔ ہمارے ہاں تو ''دعا'' کے معنی آپ جانتے ہیں کہ یہ کس معنی میں آتا ہے۔ ''دع'' کے معنی ہی عربوں کے ہاں ''اطاعت اختیار کرنا اور فرماں برداری اختیار کرنا'' ہوتا ہے۔ ہم تو خدا سے کچھ ''دعا'' مانگتے ہیں۔ وہ بھی ہم کبھی نہیں سوچتے کہ اس فقرے کے ویسے بھی معنی کیا ہیں کہ ''خدا سے دعا مانگو''۔ یعنی ویسے تو تم خود کچھ مانگ رہے ہو اور اسے کہتے ہو ''دعا''۔ اور خدا سے آپ دعا مانگتے ہیں۔ اور وہ ''دع'' کے معنی کہتا ہے کہ ''ہمارے قوانین کی اطاعت کرو' **فَـلْيَسْتَـجِيْبُـوْا لَـكُـمْ** (7:194) تم دیکھو کہ میں کیسے اس کا جواب دیتا ہوں۔ ہمارے ذہنوں کے اندر ہے کہ ''یا اللہ یہ کردے' یا اللہ فلاں کے صدقہ یہ کردے''۔ یعنی خود نہیں کچھ کر کے دیتا' تُو اسی کے صدقے میں کچھ کردے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ** (40:65) لہٰذا تم خالصتاً اُسی کے قوانین کی اطاعت کرو۔

خدا تعالیٰ کے لیے لفظ حمد کی اہمیت: مدح اور ثنا کیوں نہیں؟

اس کے بعد وہ بات آئی کہ کیوں اسی کو پکارو اور اسی کو مانو؟ کہا کہ **اَلْحَـمْـدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (40:65) جہاں سے بات شروع کی ہے' وہ وہیں آ جاتا ہے کہ وہ رب العٰلمین ہے۔ وہ کسی گروہ کا نہیں' فرقے کا نہیں' قوم کا نہیں' اہلِ مذہب کا نہیں' ہمارا نہیں' تمہارا نہیں' وہ عالمین کا رب ہے اور وجۂ حمد و ستائش ہے۔ اب ہمارے پاس ''حمد'' کے لیے دوسرے الفاظ نہیں ہیں ورنہ آپ کو تو

---

❶ روسو (78-1712ء) نے اپنی سیاسی کتاب On the Social Contract (1762AD) میں کہا تھا کہ

.....individuals surrendered their natural rights to society and that these should find expression through the general will (Reader's Digest (1990). Universal Dictionary, p.1334).

معلوم ہے کہ ''حمد'' کے کیا معنی ہیں ➊۔ اگر نہیں معلوم ہے تو میرے لغات القرآن میں دیکھ لیجیے۔ یہ حمد کا لفظ بڑی اہم چیز ہے۔ اور وہیں سے یہ بات آئے گی کہ عربی زبان میں تو آپ یہ جسے تعریف کرنا یا Praise کرنا کہتے ہیں اس کے لیے تو کتنے ہی الفاظ ہیں۔ اور پھر مدح کا لفظ تو عام ہے' ہمارے ہاں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ثنا کا بھی لفظ ہے لیکن قرآنِ کریم میں خدا کے لیے صرف ''حمد'' کا لفظ آیا ہے۔ اور یہ پھر معلوم ہوتا ہے جب ہم بنیادی طور پر عربوں کے ہاں دیکھتے ہیں کہ حمد اور مدح میں کیا فرق تھا۔ کہا ہے کہ جب تم صرف اور صرف اللہ کے قوانین کی اطاعت کرو گے تو اس طرح اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (40:65) تمہارے معاشرے میں وہ عالمگیر نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے گا جسے دیکھ کر ہر شخص پکار اٹھے گا کہ فی الواقعہ وہ ذات' جس کے قوانین ایسے خوشگوار نتائج مرتب کرتے ہیں' درخورِ ہزار توصیف و ستائش ہے۔

امروا بالمعروف کی تاکید کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا حکم' عالمِ امر اور عالمِ خلق میں فرق

اب یہاں تک پہنچانے کے بعد حضورﷺ سے کہا قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (40:66) ان سے کہہ دو میں تمہیں منع کرتا ہوں' روکتا ہوں اس بات سے کہ جن کی اطاعت کرنے کے لیے تم بے چین ہو یا خدا کو چھوڑ کر اطاعت کرتے ہو' میں روکتا ہوں کہ ان کی اطاعت مت کرو' منع کرتا ہوں۔ وہ جو نَهٰی کا لفظ آتا ہے کہ وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ (16:90) تو اس کے معنی ''روکنے'' کے ہوتے ہیں اور روکنا صرف وعظ و نصیحت سے نہیں ہے۔ جس طرح اَمُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ کے اندر حکم دینے کی بات ہے' معروف کو قانوناً منوانے کی بات ہے' نَهٰی کے معنی بھی یہی روکنے کے' حکم دینے کے ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ (40:66) پہلی چیز تو اپنے متعلق ہے کہ مجھے روکا گیا ہے' اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ میں ان کی اطاعت کروں جن کی اطاعت تم کرتے ہو۔

عزیزانِ من! یہاں پھر آگے دو الفاظ آتے ہیں جو بتاتے ہیں کہ ایک ڈکٹیٹر کے روکنے میں اور وہ جو قرآنِ حکیم کے مطابق روکنے اور امر (حکم) کرنے کا اختیار رکھتا ہے یا یہ ذمہ داری دیتا ہے' ان دونوں میں کتنا فرق ہے۔ قرآنِ حکیم تو اشاروں کنایوں میں بات کہہ جاتا ہے جو بنیادی اور اصولی ہوتی ہے۔ یہاں سیاسی نظام کی لِم بتا دی۔ ایک طرف خدا کی' اگر یہی لفظ بولنا ہے تو ڈکٹیٹر شپ کی یہی کیفیت ہے کہ یَحْكُمُ مَا یُرِیْدُ (5:1) اور یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (3:40) جیسے چاہتا ہے حکم دیتا ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ ٹھیک

➊ اس کے لیے انگریزی مادری زبان والے یہ Consult کریں:

Ghulam Ahmad Parwez (Tr. by Haji Habub-ur-Rehman Khan): EXPOSITION OF THE HOLY QURAN, Tolu-e-Islam Trust(R), Lahore, 2010, PP.23,28.

ہے لیکن کہا ہے کہ یہ ہمارا عالمِ امر ہے' جہاں ہم ان چیزوں کے فیصلے کرتے ہیں' یہ وہاں کی بات ہے۔ وہاں خدا کے اقتدار کی کیفیت یہی ہے۔ اس کا سوال ہی نہیں کہ وہ کسی سے مشورہ کرے۔ سوال ہی نہیں کہ وہ کسی کو بتائے کہ میں یہ کیوں کرتا ہوں۔ وہ تو عالمِ امر ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جو ہمارا عالمِ امر ہے' جہاں خدا یہ سارے Plans تیار کرتا ہے' یہ وہاں کی بات ہے۔ یہاں جب اس نے عالمِ خلق میں' مخلوق پیدا کر دی ہے تو یہاں ساتھ ہی کہا کہ ہم نے یہ کائنات کی تخلیق کی اور فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا (25:2) اور اس کے لیے قوانین بنا دیئے۔ وہی میں پھر Quotation میں ڈکٹیٹر' آمر کہتا ہوں کہ وہ یَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (5:1) والا ہے۔ وہ جب یہاں تمہارے لیے حکم دے گا تو ٹھیک ہے اس کا ایک حکم ہے' ڈکٹیٹر کا حکم ہے مگر اس حکم میں ایک اور اہم چیز بھی ہے۔ اور وہ ہے اس حکم کی حکمت۔

قرآنی قوانین کے ساتھ حکمت کا نزول لازم وملزوم ہونے کی بنا پر بڑی اہمیت کا حامل ہے

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ اس نے یہ کیا کہا ہے؟ اس نے کہا ہے کہ ہم نے کتاب نازل کی' احکام وقوانین کا مجموعہ دیا۔ اور ساتھ حکمت بھی ہم نے نازل کی۔ ہر قانون کی "The why of it" (اس کی وجہ جواز) بھی ہم نے ساتھ ہی بتا دی' اس کے لیے Reason (عقل) دیا۔ یہ بتایا کہ کیوں ہم نے یہ حکم دیا ہے۔ اب یہاں فرق آ گیا۔ ڈکٹیٹر یہ نہیں بتاتا کہ حکم کیوں دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ہمارا حکم ہے اور یہ ماننا ہوگا۔ وہ کتاب تو دیتا ہے' حکمت نہیں دیتا۔ وہ جو عالمِ امر میں خدائی ہے وہ اس عالمِ خلق میں ڈکٹیٹر اپنی خدائی کرتا ہے۔ یَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (5:1) ہے اور یَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (3:40) ہے۔ ہم جیسا چاہیں حکم دیں گے' جو جی میں آئے گا ہم کریں گے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تو اختیارِ خداوندی ہے اور خدا نے بھی اس کو اپنے ہاں عالمِ امر کے لیے محدود رکھا ہے۔ خدا بھی تمہاری انسانوں کی دنیا کے لیے جب قانون بناتا ہے تو کتاب کے ساتھ حکمت نازل کرتا ہے۔ آہاہاہا! آہاہاہا!!

آمریت ہمیشہ حکمت کی سوچ سے محروم ہوتی ہے: ایک اہم نکتہ "کتاب کے ساتھ حکمت بھی"

عزیزانِ من! جس قانون میں حکمت نہ بتائی جائے وہ آمریت ہے۔ اور ہماری انسانوں کی دنیا میں تو خدا جیسا آمرِ مطلق بھی اپنے آپ کو آمر کی حیثیت سے نہیں لاتا بلکہ وہ کتاب کے ساتھ حکمت خود نازل کرتا ہے۔ یہ ہم نے کہا ہے تو کیوں کہا ہے' آؤ تمہیں بتائیں کہ کیوں کہا ہے' اس کے لیے کیا Reason (وجہ جواز) ہے' اس کے لیے کیا دلیل ہے۔ میں نے کہا تھا کہ کسی قوم میں جس قسم کا خدا کا تصور ہے' اسی قسم کا اس قوم کا معاشرت کا' معیشت کا' سیاست کا' نقشہ ہوتا ہے۔ میں اُس قوم کا کہہ رہا ہوں جو خدا کے حکم پہ چلنے والی قوم ہے۔ میں اپنا نہیں کہہ رہا۔ ہم میں سے تو ہر شخص اپنے آپ کو خدا سمجھ رہا ہے۔ جس قوم کے سامنے خدا کا یہ تصور ہو کہ وہ کتاب دیتا ہے اور ساتھ حکمت دیتا ہے' عزیزانِ من! ان کا سیاسی نظام دو لفظوں کے اندر طے ہو جاتا ہے۔ کتاب اس قوم کی یعنی قانون کا ضابطہ'

خدا کا دیا ہوا ہوتا ہے' انسانوں کا نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق ہی حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے حتیٰ کہ وہ کہتا ہے کہ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَہُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَ الْحُکْمَ وَ النُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں' خواہ اسے قانون سازی کے اختیارات ہوں' انتظامیہ کے ہوں یا خواہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہیں کہ تم میرے محکوم بن جاؤ۔ اللہ اکبر! کتاب تو یہ اور اس کے ساتھ حکمت تو اس طرح کی!

خالقِ کائنات نے اپنے محکم قوانین کو حکمت کے ساتھ مشروط کر رکھا ہے

اس نے ایک حکم دیا ہے کہ ایسا نہ کروں اور ساتھ ہی اس نے مجھے اس کے لیے دلائل بھی دیئے ہیں کہ ایسا کیوں نہ کروں۔ لَمَّا (40:66) کہا ہے۔ یہاں قرآن مجید یہ کہہ رہا ہے کہ جب اس نے اس کے لیے Reason (دلیل) دی' "The why of it" (اس کی وجہ جواز) دی' اس کی حکمت دی' اس کے دلائل دیئے تو یہ دینے کے بعد مجھے منع کیا ہے کہ ایسا نہ کرنا کیونکہ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ (40:66) میرے نشوونما دینے والے کی طرف سے واضح احکامات و دلائل آ چکے ہیں۔ اور یہاں پھر کہا گیا ہے کہ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (40:66) مجھے یہاں پھر حکم دیا گیا ہے کہ میں خدائے رب العالمین کے احکام کے سامنے جھک جاؤں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ خدائے قادر و مطلق ہے' وہ انسانوں سے جب اپنے احکام کی اطاعت کراتا ہے تو کس انداز سے کراتا ہے؟ رسول تک کو وہ بینات دیتا ہے' دلائل دیتا ہے' اس کی "The why of it" (وجہ جواز) بتاتا ہے' اس کی حکمت بتاتا ہے' قائل کرتا ہے۔ اور یہ کچھ کہنے کے بعد انسانوں سے کہتا ہے کہ تمہارا جی چاہے تو مانو' نہیں جی چاہتا نہ مانو۔ مانو گے تو کچھ تمہارا ہی بھلا ہوگا' نہ مانو گے تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ اب یہ دیکھیے ان کے بھلے اور ان کے نقصان کی بات کر رہا ہے۔ قانون دے رہا ہے' ساتھ حکمت دے رہا ہے۔ اس کے اغراض سمجھا رہا ہے' اس کے دلائل دے رہا ہے۔ کاہے کے لیے دے رہا ہے؟ اِن کے بھلے کے لیے کیونکہ رب العالمین جو ہوا۔ اب پھر آ گیا اسی ربوبیت کی طرف۔

انسانی زندگی کی ابتدا کے سلسلہ میں قرآنی حقائق کی وضاحت اور " کُنْ فَیَکُوْنُ " کے لیے خدا کی ہمہ گیر قوتوں کا عالم

اس خدا کے نظامِ ربوبیت کی زندہ شہادت تو خود تمہارا اپنا وجود ہے۔ کہا ہے کہ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَۃٍ (40:67)۔ چودہ سو سال پہلے یہ بات کون کہہ سکتا تھا۔ وہ فرانسیسی ڈاکٹر[1] جب ان آیات پہ پہنچتا ہے تو وجد میں آتا ہے۔ وہ عجیب بات ہے' یہ آیتیں لاتا ہے اور اس کے بعد پکار کر کہتا ہے کہ او دنیا کے دانشورو! خدا کے لیے مجھے بتاؤ! چودہ سو سال پیشتر کوئی

انسان یہ بات کہہ سکتا تھا؟ وہ اپنی کتاب ❶ میں بار بار یہ لکھتا ہے۔ یہ کہ زندگی کی ابتدا' تراب یا طین سے ہوئی' چپچپی مٹی سے زندگی کی ابتدا ہوئی۔ چودہ سو سال پیشتر کس انسان کے ذہن میں آ سکتا تھا۔ ساری دنیا کے اندر مذاہب کا غلبہ تھا اور مذاہب بھی وہاں یہود اور عیسائیوں کے تھے۔ ان کے ہاں تو وہی چیز تھی جو وہ تورات کے مطابق مانتے تھے کہ ایک پتلا کسی طرح سے اللہ میاں نے بنایا جس کو بابا آدم کہتے ہیں۔ ان کی پسلی سے ایک عورت نکالی۔ اب یہ جوڑا بنا۔ تو جب جوڑا بن گیا تو پھر تو آگے معاملہ آسان ہو گیا۔ پہل کرنی اصل میں مشکل تھی۔ وہ انہوں نے اس طرح سے وہاں حل کیا ہوا تھا۔ ساری دنیا میں تو یہی چیز پھیلی ہوئی تھی۔

قرآن مجید نے یہ چیز کہی ہے کہ نفسِ واحدہ (Unilateral Cell) سے تمہاری تخلیق کی ابتدا ہوئی۔ اور وہ سیل مٹی اور پانی کے امتزاج سے بنا تھا۔ یہ جو جوہڑوں کے کنارے چپچپی مٹی بن جاتی ہے' قرآن مجید نے اس کو طینِ لازب کہا ہے کہ اس سے پہلا لائف سیل وجود میں آیا۔ اور پھر وہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے گیا۔ یہ ہے مِن تراب (40:67)۔ اور پھر وہ منازل طے کرتا ہوا' اس منزل میں آ گیا' جہاں پھر یہ نر اور مادہ کے اختلاط سے پیدائش سے چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ یہ ہے نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ❷ (40:67)۔ یہ رحم (Womb) کے اندر کی کیفیتیں بیان کر دیں۔ اس زمانے میں تو یہ چیزیں ابھی طبیب اور حکیموں کے ذہنوں میں نہیں تھیں کہ رحم کے اندر کیا تغیرات ہوتے ہیں؟ کس طرح سے پھر یہ بچہ وجود میں آتا ہے' یہ شکل اختیار کرتا ہے؟ قرآن مجید نے یہ Stages (مراحل) بھی دی ہیں۔

آگے کہا کہ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (40:67) پھر اس کائنات کی دنیا کے اندر ایک بچے کی شکل میں تم باہر آتے ہو۔ ثُمَّ لِتَبْلُغُوٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا (40:67)❸۔ اب دیکھیے! ایک فرد کی ارتقائی زندگی کی منازل شروع کیں کہ بچہ ہے' بڑا ہوا' جوانی تک پہنچا' بڑھاپے تک پہنچا۔ آہستہ آہستہ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آ گئے۔ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (40:67) بہت سے تم میں سے اس سے پہلے ہی وفات پا جاتے ہیں۔ بہت سے جوانی تک پہنچتے ہیں۔ بہت سے بڑھاپے تک پہنچتے ہیں۔ نشوونما ہوتی ہے' عقل و شعور کی منزلیں آتی ہیں۔ سب سے بڑی چیز جو انسان کو دی گئی ہے وہ تو عقل و

---

❶ یہ اشارہ ڈاکٹر موریس بوکائی (1911-1989ء) کی طرف ہے۔ اس کے حوالے کے لیے دیکھیے:

Bucaille, Maurice: The Bible, The Qur'an and Science, Islamic Book Service, Lahore, 1998.

❷ (پھر زندگی کو مختلف مراحل سے گزارتے ہوئے' اُسے اس منزل میں لے آیا) جہاں پیدائش' نطفہ کے ذریعے ہوتی ہے۔ پھر اس نطفہ کو (رحم مادر میں) ایک جونک کی قسم کا لوتھڑا بنا دیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1103)۔

❸ پھر تم اپنی جوانی کی عمر تک پہنچتے ہو۔ پھر بوڑھے ہو جاتے ہو (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1103)۔

شعور ہے۔حیوانات تک تو صرف Instinct (جبلت) ہوتی ہے' جوان کے اندر ہوتی ہے۔ یہ انسان ہے کہ جس کو عقل وشعور دیا گیا ہے۔اس کی یہ خصوصیت بتائی گئی۔

کہا ہے کہ یہ چیزیں تو سب تمہارے سامنے ہوتی ہیں۔سنو! هُوَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ (40:68) اب وہی ہے جس نے زندگی اور موت کا قانون بنایا ہے۔زندگی حاصل کیسے ہوتی ہے' کیسے قائم رہتی ہے' پھر یہ چنگاری کیسے بجھ جاتی ہے؟ وہ بجھتی نہیں ہے' راکھ کے نیچے دب جاتی ہے' آگے چلتی ہے۔زندگی تو ختم نہیں ہوتی۔ یہ تو زندگی کا پیکر' جسے انسان کا جسم کہتے ہیں' یہ Disintegrate (منتشر) ہوتا ہے۔اسے موت کہا جاتا ہے۔یہ کہا ہے کہ هُوَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ فَاِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ (40:68) اللہ وہ ہے جس کے قانون کے مطابق زندگی ملتی ہے۔اور اسی کے قانون کے مطابق موت واقع ہوتی ہے۔اس کی ہمہ گیر قوتوں کا یہ عالم ہے کہ جب وہ کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ (اپنی ابتدائی صورت میں) وجود میں آجاتی ہے۔(پھر وہ' اس کے قانونِ ربوبیت کے مطابق نشوونما حاصل کرتی ہوئی اپنی آخری شکل تک پہنچ جاتی ہے)۔

عقلِ انسانی کی نارسائی کی کیفیت اور خدائے علیم کا عالمِ امر اور کُنۡ فَیَکُوۡنُ کی وضاحت

کہا یہ ہے کہ یہاں تک کی Stages (منازل) تو وہ ہیں جنہیں تم دیکھ سکتے ہو' دکھا سکتے ہو' سائنس کے دائرے میں آجاتی ہیں' Instruments (آلات) کے ذریعے تم آنکھوں سے بھی ان چیزوں کو دیکھ سکتے ہو لیکن جب یہاں پہنچتے ہو کہ صاحب! اس کائنات کی ابتدا کیسے ہوئی تھی؟ یہاں تمہارا کوئی علم' کوئی حکمت' کوئی آنکھ' اس کو نہیں دیکھ سکتی۔بتا نہیں سکتی کہ ایک شے عدم سے کیسے وجود میں آتی ہے۔کہا یہ ہے ہمارا وہ عالمِ امر ہے' جس کو ہم نے کہا ہے کہ وہاں ہماری کیفیت یہ ہے۔اب یہ جو اِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ (40:68) میں کُنۡ فَیَکُوۡنُ ہے' اس میں ہمارے ہاں کُنۡ فَیَکُوۡنُ کے معنی تو یہی لیے جاتے ہیں کہ مثلاً اس نے یہ کہا کہ آدمی بن جائے تو وہ اس طرح سے ایک آدمی بن گیا۔اس نے کہا کہ حضرت صاحب! آم چاہیے تو آم کا پودا یوں سامنے آگیا۔

عزیزانِ من! کُنۡ فَیَکُوۡنُ میں یہ بات نہیں ہے۔اس کُنۡ فَیَکُوۡنُ کے معنی یہ ہیں کہ ''جب ہم کسی شے کا پلان کر لیتے ہیں تو اس کی پیدائش کا آغاز ہو جاتا ہے''۔یہ جو اس کی پیدائش کا آغاز ہے' یہ تمہارے حیطۂ علم میں نہیں آسکتا کیونکہ وہ Nothingness (عدم) سے Being (وجود) میں آیا ہے۔تو جو شے عدم تھی' وہ تمہارے ذہن میں کیسے آسکتی ہے۔تم تو موجود کے متعلق ہی کچھ کہہ سکتے ہو۔یہ ہے وہ ہمارا عالمِ امر جس سے کسی شے کی ابتدا ہوتی ہے' بنی بنائی ہوئی شے وجود میں نہیں آجاتی۔کہا کہ یہ ہیں وہ ہمارے قوانین' یہ ہے کائناتی دنیا کا قانون جس کو یہ سارے مانتے' تسلیم کرتے' ثابت کرتے چلے آرہے ہیں۔اور جب تم ان کی اپنی دنیا کی

طرف آ کر ان سے کہتے ہو تو یہاں یہ پیٹھ موڑ کر چل دیتے ہیں اور ان قوانین سے اغماض برتتے ہیں۔

دنیا بھر کے انسانوں کے لیے ایک قابلِ غور بات جو روزِ اول سے حقیقت پر مبنی ہے

عزیزانِ من! سارا جھگڑا ہی اتنا ہے۔ زندگی کا وہ ایک حصہ (خارجی کائنات) ایسا ہے جس کو سب مانتے ہیں کہ وہاں قوانینِ فطرت یعنی خدا کے قوانین کارفرما ہیں۔ وہاں سے وہ بات ہی اتنی کرتا ہے کہ جب یہاں تم قانون کی کارفرمائی اس طرح سے دیکھتے ہو' اعتراف کرتے ہو' تسلیم کرتے ہو' اقرار کرتے ہو تو انسانوں کی دنیا میں آ کر پھر تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔ وہاں تم خدا کے ان قوانین کو کیوں نہیں مانتے۔ کہا ہے کہ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِ اللّٰہِ (40:69) ان لوگوں کو دیکھو کہ وہاں تک تو خدا کے قوانین کو مانتے چلے آئے جونہی ہم نے انسانوں کی دنیا میں آ کر کچھ کہا تو یہاں انہوں نے جنگ وجدل شروع کر دی۔ ان سے کہو کہ اَنّٰی یُصۡرَفُوۡنَ (40:69) کہاں لوٹ کر چلے جا رہے ہو۔ کائناتی قوانین سے اور یہاں کی کارفرمائیوں سے تو تم لوٹ کر' کہیں پلٹ کر' جا ہی نہیں سکتے۔ تم نے یہیں رہنا ہے۔ نہ تم انکار کر سکتے ہو کہ ہوا کے بغیر ہم زندہ رہ سکتے' نہ زندہ رہ سکو گے لہٰذا کہاں جا سکتے ہو لیکن یہاں آنے کے بعد پھر تم پلٹ جاتے ہو۔ یہ ہے وہ تکذیب۔ کہا ہے کہ اَلَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِالۡکِتٰبِ وَ بِمَاۤ اَرۡسَلۡنَا بِہٖ رُسُلَنَا (40:70) یہی جو قرآن حمید' یہ جو ضابطۂ قوانین سامنے ہے' یہ اسی کی تکذیب نہیں کر رہے۔ قرآن حمید یہ کہتا ہے کہ دین کے اصول پہلے دن سے آخری وقت تک وہی تھے جو ہم دیتے چلے آ رہے تھے۔ پہلی وحی میں بھی دین کے وہی اصول دیئے تھے جو آخری وحی میں دیئے گئے ہیں۔ ان کی تفاصیل میں' جزئیات میں' فرق ہوتا گیا ہے۔ قرآن حمید نے کہا کہ جب یہ اس ضابطۂ قانون کی تکذیب کرتے ہیں' انکار کرتے ہیں' جھٹلاتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ پہلے رسول سے آخری رسول تک جو کچھ ہم نے دیا تھا' یہ ان سب کا انکار کرتے ہیں اور سب کی تکذیب کرتے ہیں' ایک کو بھی نہیں چھوڑتے۔ اہلِ کتاب تو سب سے پہلے اس کے اندر آ گئے۔ ان سے پوچھیے کہ یہ صحفِ ابراہیم وموسیٰ اور حضرتِ عیسیٰ تک کا زبان سے مانتے ہیں مگر ان کے پاس وہ اصلی شکل میں نہیں ہیں۔ خود تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے پاس وہ اپنی اصلی شکل میں نہیں ہیں۔ یہ جو اصلی شکل میں پیش کیا جاتا ہے تو اس سے انکار کرتے ہیں۔ اس کے معنی وہی ہیں کہ وہ جو اصلی شکل میں ان پہ آیا تھا' اس سے انکار کرتے ہیں' اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ ان کی اس تکذیب سے اس تعلیم کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ نقصان خود ان کا اپنا ہی ہوتا ہے۔

انسانیت کے ہر عمل کا نتیجہ صرف قیامت پر ہی موقوف نہیں' وہ یہاں بھی ظہور میں آتا ہے

عزیزانِ من! کہا ہے کہ فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ (40:70)۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہم تو ہر کام کے نتیجے کو قیامت پر اٹھاتے ہیں۔

قرآن مجید تو ''سَــــوْفَ '' کہتا ہے۔عربی زبان والے جانتے ہیں کہ اس کے معنی ''جلدی معلوم ہو جائے گا' عنقریب یہ بات ہو جائے گی'' ہوتے ہیں۔تو جلدی ان کو پتہ چل جائے گا کہ ان قوانین کی تکذیب سے کیا ہوتا ہے' کیا نتیجہ نکلتا ہے۔بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔آگے کہا کہ **اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ. فِی الْحَمِیْمِ ثُمَّ فِی النَّارِ يُسْجَرُوْنَ** (40:71-72) جب ان کی گردنوں میں طوق ہونگے اور یہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے کشاں کشاں' جہنم کے کھولتے ہوئے پانی میں ڈالے جائیں گے اور پھر آگ میں جھونک دیئے جائیں گے۔عزیزانِ من! یہ وہی اس کا تمثیلی انداز ہے کہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے' طوق پہنے ہوئے' یہ حاضر ہونگے۔ یہاں تو یہ بتایا کہ وہ جہنم کی زندگی ہے۔

انسانوں کا انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں جکڑے رہنے کا نتیجہ ہر دو جہانوں میں دوزخ کا عذاب ہے

جہنم کا تو میں اس سے پہلے آپ کو بتا چکا ہوں۔قرآنِ کریم اس دنیا کے اندر بھی جہنم کی زندگی بتاتا ہے۔یہ ذلت اور پستی کی زندگی ہے' محکومیت کی زندگی ہے' خواری کی زندگی ہے **خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا** کی زندگی ہے' یہ دوسرے انسانوں کے احکام کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے' ان کی محکومیت کے طوق پہنے ہوئے' جینے کی زندگی ہے۔کہا ہے کہ ان میں **يُسْحَبُوْنَ** (40:71) ہے یعنی وہاں سے ان کو اس قدر دہشت واقع ہوگی کہ وہاں چل کر نہیں جاسکیں گے ان کو گھسیٹ کر وہاں لایا جائے گا۔جی! خدا بن جانے کے یہ نتائج ہوتے ہیں کہ انہیں گھسیٹ کر لایا جائے گا[1]' وہ اس تباہی کے جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔کہا ہے کہ **ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ** (40:73) اور پھر ان سے کہا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ جنہیں تم اپنے ہاں خدا بنا بیٹھے تھے' جن کے احکام کی اطاعت بغیر یہ پوچھے کہ اس کی حکمت اور Reason (دلیل) کیا ہے تم تسلیم کیے جاتے تھے۔ہم پوچھیں گے کہ بتاؤ' **مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (40:74) وہ کہاں ہیں جن کی تم خدا کو چھوڑ کر اطاعت کیا کرتے تھے' تم خدا کے احکام کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔

عزیزانِ من! قرآن حمید نے ہر جگہ یہ کہا ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کے قانون اور حکم کی اطاعت شرک ہے۔وہ اس میں کوئی تفریق اور امتیاز نہیں کرتا کہ فلاں کی ہے' فلاں کی نہیں ہے۔ہر جگہ **مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** ہے۔اطاعت اور فرماں پذیری تو صرف خدا کے احکام کی ہے اور وہ قرآن حمید کے اندر ہے۔اسی لیے اس نے اسلام اور کفر میں امتیاز بتا دیا کہ **مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ**

---

[1] خود پاکستان کی آج تک کی تاریخ' قدم قدم پر' ان حقائق کا زندہ ثبوت ہے۔جس وقت تک ہم مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی میں الجھے رہیں گے اس وقت تک امتِ واحدہ کی شکل میں جنتِ ارضی کا خواب پورا نہیں ہو سکے گا۔

الْكٰفِرُوْنَ (5:44) جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان کو کافر کہا جاتا ہے۔ یہاں **مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (40:74) ہے۔ یہاں تو کوئی مدارج ہی مقرر نہیں کیے گئے۔ یہاں تو یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ اس حد تک فلاں کی اور اُس حد تک فلاں کی اطاعت کرو۔ یہ **مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** ہے۔ ان میں سے کسے باشد' کسی انسان کی بھی اطاعت توحید نہیں کہلا سکتی۔ کہا کہ **قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا** (40:74) وہ کہیں گے کہ آج تو وہ سارے جن کی ہم اتنی اطاعت کیا کرتے تھے ہم سے منہ موڑ کر چلے گئے۔ وہ تو اپنے آپ کو اتنے صاحبِ اقتدار بتایا کرتے تھے۔ آج ہمیں کوئی نظر نہیں آ رہا۔ اور کہیں گے کہ آج ہمیں یہ معلوم ہو گیا' یہ حقیقت ہم پہ کھل گئی کہ درحقیقت وہ کوئی شے ہی نہیں تھے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کس وقت یہ حقیقت کھلتی ہے؟

خدا تعالیٰ کی ذات تو کسی کو گمراہ نہیں کرتی' وہ تو سراپا راہنمائی کا سرچشمہ ہے

کہا ہے کہ **كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ** (40:74)۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ جو کہتے ہیں کہ خدا گمراہ کرتا ہے (معاذ اللہ) جبکہ قرآن مجید کہتا ہے کہ ''اس طرح سے یہ لوگ خدا کے راستے سے گمراہ ہوتے ہیں' ان سے کہا جائے گا کہ **ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ** (40:75) اس لیے تمہارا حشر ہوا ہے کہ تم زمین میں تکبر کرتے تھے' اکڑے ہوئے پھرتے تھے۔ دنیا میں بڑائی اور کبریائی حاصل کرنا بری بات نہیں ہے۔ یہ تو عیسائیت اور تورات کا تصور ہے جو اس چیز کو کہتا ہے کہ یہ بری بات ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ **بِغَيْرِ الْحَقِّ** یعنی الحق کو چھوڑ کر جو انسان کبریائی حاصل کرتے ہیں وہ قابلِ مذمت ہے۔ الحق ساتھ رکھا جائے اور الحق خدا کی کتاب ہے۔ خدا کی کتاب کے مطابق تم دنیا میں بڑائی حاصل کرو تو یہ تو ایسی چیز ہے کہ جو ضرور کرنی چاہیے۔

خودساختہ قوانینِ حیات کے تحت انسانوں کی معاشرتی زندگی کا جہنمی نقشہ: جہنم ایک ہی ہے مگر اندر آنے کے دروازے مختلف ہیں

قرآن حکیم کہتا ہے کہ **اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ** (3:139) تم سب سے زیادہ بلند ترین مقام پر ہوا گر تم کتاب اللہ کی اطاعت کرو گے۔ تو یہ جو **عـلـو** ہے' یہ الحق کے ساتھ' جو کبریائی حاصل ہوتی ہے' تو نہ صرف یہ کہ وہ جائز ہے بلکہ یہ تو اس امت کا فرض ہے کہ اس مقام کو حاصل کرے لیکن الحق کو چھوڑ کر جو کسی قسم کی بڑائی' کبریائی' حکومت' تکبر' اقتدار' حاصل کیا جائے تو وہ ہے جسے کہا ہے کہ اے رسول! تم ان سب سے واضح طور پر کہہ دو اور ہم ان سے کہیں گے کہ **اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ** (40:76) اب تم مختلف دروازوں سے جہنم میں داخل ہو جاؤ اور اسی میں رہو۔ ناحق تکبر کرنے والوں کا یہ ٹھکانہ کس قدر بُرا ہے! دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ الحق کے بغیر' خدا کے احکام کے بغیر' دنیا کے اندر بڑائی اور کبریائی اور تکبر اور اقتدار حاصل کرنے

والوں کو کہا جائے گا کہ جاؤ جہنم کے دروازوں پہ۔ جہنم کا ایک دروازہ نہیں ہے' کئی دروازے ہیں۔ شاید اس لیے کہ بہت ہی بھیڑ ہو گی یا ان کے بھی درجے اور طبقات ہوتے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ ان اہلِ تکبر کو' اہلِ اقتدار کو' مختلف مدارج میں تقسیم کر کے الگ الگ دروازوں سے داخل کیا جائے گا لیکن دروازے ہی الگ ہیں' اندر جہنم ایک ہی ہے۔ کسی طریق سے اور کسی دروازے سے بھی وہاں داخل کیا جائے تو اندر پہنچ کر تو پھر جہنم ایک ہی ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ المؤمن کی آیت 76 تک ہم آ گئے' 77 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔ اب وقت ہو گیا۔ یہ موسم کی خرابی' ہر دفعہ ہم سے تھوڑا سا وقت چھین لیتی ہے۔ خیر!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

آٹھواں باب: سورۃ المؤمن (آیات 77 تا اختتام)

عزیزانِ من! آج مارچ 1981ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمن کی آیت 77 سے ہو رہا ہے:(40:77)۔

نبی اکرم ﷺ اور آپ ؑ کی جماعت کے ساتھ مخالفین کے تصادمات کی لمبی داستان کا بنیادی نقطہ

سابقہ آیات میں ذکر ہو رہا تھا اس کشمکش اور تصادم کا، جو نظری طور پر حق اور باطل میں اور عملی طور پر حضور نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کی جماعت اور مخالفین کی جماعت میں آ رہا تھا اور بڑی شدت اختیار کیے چلا جا رہا تھا۔ حضور ﷺ اور آپ کے ساتھ کی جو جماعت تھی، اُس کے ساتھ اس کشمکش کی مدت بڑی لمبی تھی۔ اور انہیں اس میں بڑی ہی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، مشقتیں اور صعوبات اٹھانی پڑیں، اذیتیں اور کرب برداشت کرنا پڑے۔ وہ جو مخالفین تھے ان کا تو پہلے سے جتھہ بھی تھا، ان کے پاس مال و اسباب بھی تھا، گھر بار بھی تھا۔ اِنہیں گھر بار بھی چھوڑنا پڑا تھا، دوسری جگہ آ کر پناہ لینا پڑی تھی، تعداد بھی بڑی کم تھی، ساز و سامان بھی بہت تھوڑا سا تھا لیکن کیا بات تھی کہ

اس کے باوجود یہ ان کے مقابلے میں جم کر کھڑے رہے۔ عام دنیاوی اعتبار سے یہ چیز ہوتی تو جو بھی آپس میں کمزور جماعت ہوتی وہ سرنڈر کر دیتی' ہتھیار ڈال دیتی۔ ملکوں میں' سلطنتوں میں' روز لڑائیاں ہوتی ہیں' تصادمات ہوتے ہیں۔ جو قومیں اپنے آپ کو کمزور محسوس کر لیتی ہیں وہ سرنڈر کر دیتی ہیں۔ جو قریب قریب برابر کی ہوتی ہیں' وہ ایک دوسرے کے ساتھ مصالحت یا مفاہمت کر لیتی ہیں تو کشمکش ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن یہاں یہ صورت ہے کہ کمزور بھی ہیں' ناتواں بھی ہیں' بے سروسامان بھی ہیں لیکن اس کے باوجود نہ تو یہ سرنڈر کرتے ہیں' نہ یہ مفاہمت ہی کرتے ہیں۔ کیا چیز تھی جس کی بنا پہ یہ اس طرح سے عام دنیا کے تمام نہج اور اسلوب کے خلاف ڈٹ کر کھڑے ہوئے ہیں۔ یہی ہے وہ بنیادی نقطہ جسے ایمان کہتے ہیں۔

صبر کا مروّجہ اور قرآنی مفہوم اور عملی تفسیر

عزیزانِ من! ان سے کہا تھا کہ فَـاصْبِرْ (40:77)۔ یہاں سے وہ آیت شروع ہوگئی جہاں سے درس کی ابتدا ہوتی ہے۔ ان تمام تصادمات میں' اس کشمکش کے اندر' نظر بظاہر ان تمام ناکامیوں کے باوجود کہا گیا ہے کہ فَـاصْبِرْ (40:77)۔ اور ایک مقام پہ نہیں' جہاں بھی ایسا مقام آیا ہے وہاں یہ چیز کہی گئی ہے۔ اور پھر وہی بات جو میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ جونہی ہم نے ترجمہ دیکھا اور بات کہیں سے کہیں چلی گئی۔ وہ صبر کا جو مفہوم ہمارے ہاں ہے کہ ''اچھا بھئی! صبر کرو یعنی جب کچھ نہ ہو سکتا ہو' بے بسی انتہا درجے کی ہو' بے کسی ہو' کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی ہو' کچھ سوجھتا نہ ہو تو وہاں یہ چیز ہوتی ہے کہ اچھا بھئی! اب کیا کیا جا سکتا ہے؟ میاں! صبر کر''۔ تو اگر یہی بے بسی کی تلقین تھی' یہی تعلیم تھی تو اتنی مشقتیں اٹھانے کے بعد پہلے ہی کیوں نہ ہوا کہ میاں! کچھ نہیں ہو سکتا' آرام سے بیٹھو۔

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ فَاصْبِرْ (40:77) ''استقامت سے اپنے مشن پر قائم رہو''۔ اس کے معنی ''استقامت'' ہوتا ہے۔ اپنے مقام سے ہلنا نہیں' اپنے مقام پہ جم کر کھڑے رہنا ہے۔ ہمارے ہاں جسے کہتے ہیں کہ ''ڈولنا'' بھی نہیں۔ وہ عرب اس کو اس معنی میں استعمال کرتے تھے۔ ''صابورہ'' ان کے ہاں وہ پتھر ہوتا تھا کہ جب وہ کشتی طوفانوں میں یا موجوں کے تلاطم میں پہنچتی ہے تو وہ اس طرح سے ڈولتی ہے تو وہ اس واسطے ہوتا ہے کہ اس میں وزن پورا نہیں ہوتا' وہ کشتی کے وزن کو برابر کرنے کے لیے ایک بڑا سا پتھر ایک طرف رکھ دیتے تھے تو وہ اس توازن میں پھر ان موجوں کے ''ہلکوروں'' (ہچکولوں) سے ڈولتی بھی نہیں تھی۔ اس لفظ سے یہ چیز اس قوم نے وضع کی تھی۔ یہاں سے نظر آتا ہے کہ کتنی دور تک ان کی نگاہ جاتی تھی۔ اور یہ جو قرآن حمید کے الفاظ ہیں ان کے معنی کہاں سے لیے جاتے ہیں۔ یعنی میدان کو چھوڑ دینا' ناکامی کا تسلیم کر لینا' شکست مان لینا' مفاہمت میں آ جانا تو ایک طرف رہا' جسے کہتے ہیں کہ ایسے مقام پر ذرا سا دل ڈولے بھی نہیں۔ صبر کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ ''کسی مقام پہ اس طرح سے جم کر کھڑے ہو جانا کہ پاؤں ذرا ہلنے

نہ پائیں' دل میں ذرا لغزش نہ آنے پائے''۔ یہ ہے فَاصْبِرْ جو کہا ہے۔

زندگی کے ہر میدان میں استقامت دل ودماغ کی رضامندی کے متقاضی ہونے کا ثبوت ہے

قرآن حکیم پھر حکم تو نہیں دیتا' وہ تو کتاب کے ساتھ حکمت بھی نازل کرتا ہے۔ یہ اتنی سی تو بات ہے' اب تو یہ ہے کہ صاحب! خدا نے چونکہ کہہ دیا ہے کہ استقامت رکھو اس واسطے ٹھیک ہے' استقامت رکھیں گے۔ اس قسم کی اطاعت میں انسان کا سر تو جھکتا ہے' دل نہیں جھکتا۔ اور استقامت' اسی اطاعت میں کی جاسکتی ہے جس میں ساتھ دل بھی جھکے۔ یعنی یقین وہ ہو کہ جس میں دل اور دماغ دونوں کی رضامندی آجائے۔ اسی لیے زندگی کے ہر میدان میں' دل ودماغ کی رضامندی' ہم آہنگی کے ہونے کا ثبوت استقامت ہے۔

حکمِ خداوندی کی اور آمریت کی اطاعت میں ایک بنیادی فرق ہوتا ہے

عزیزانِ من! اس استقامت سے یہ اطمینان اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کسی حکم کے ساتھ' اس کی علت' اس کی غایت' اس کی وجہ' اس کا سبب' بیان کیا گیا ہو۔ بتایا گیا ہو کہ ہم ایسا کیوں کہتے ہیں۔ جب اطمینانِ قلب سے سمجھ میں بات آجائے گی' اس کا جو Reason (دلیل) ہے' اس کا جو The why of it (وجہ جواز) ہے' وہ جب سمجھ میں آجائے گا تو کوئی شخص اس کو اس مقام سے نہیں ہٹا سکتا جہاں وہ Reason (دلیل) کے اعتبار سے کھڑا ہوا ہوتا ہے اور اگر اندھی تقلید کی بنا پہ ہو یا کوئی ایسا حکم آمریت کا ہو کہ جس میں حکم تو آجائے اور یہ نہ معلوم ہو کہ یہ حکم دیا کیوں گیا ہے' اس کی غایت کیا ہے' اس کی علت کیا ہے' تو یہ آمریت ہوتی ہے۔ یاد رکھیے! ڈکٹیٹر شپ ہوتی ہے جب اس کے ساتھ اس کی "The why of it" (وجہ جواز) نہ بتائی جائے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ایسے احکام کی اطاعت وقتی طور پر تو ہو جاتی ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اس کے سامنے سر جھکتے ہیں' دل نہیں جھکتا۔ دل کیا کرتا رہتا ہے؟ وہ ہر وقت اس تلاش میں رہتا ہے کہ کسی طرح سے ایسا راستہ مل جائے کہ میں اس کو Avoid (بچ) کر جاؤں۔ پھر عقل بہانہ ساز تو اس کو اس سے نکلنے کی سو ترکیبیں سجھا دیتی ہے لیکن اگر اسے اس کے قلب کے اطمینان کے ساتھ منوایا جائے' منوایا نہیں جائے بلکہ یہ اپنے قلب کے اطمینان کے ساتھ مانے تو یہ Reason (دلیل) اور سبب بتانے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ پھر یہ اس پر جم کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ قانون پر مبنی حکومت اور انسانوں کی حکومت میں فرق

قرآن حکیم کا انداز یہی ہے کہ اس نے کتاب کے ساتھ حکمت کو بھی کہا ہے کہ یہ منزل من اللہ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ صرف قانون ہی ہم نے نازل نہیں کیا بلکہ اس قانون کی علت اور غایت "The why of it" بھی ساتھ بتائی ہے کہ کیوں ہم ایسا کہتے ہیں۔ یہاں تو جو احکام دیئے جاتے ہیں دنیا کی کوئی بھی نہج حکومت ہو' اس میں پہلی چیز یہ ذہن میں رکھی جاتی ہے کہ حکومت مستحکم رہے'

قائم رہے' باقی چیزیں اس کے بعد آتی ہیں حتیٰ کہ اگر ملک کے باشندوں کو مطمئن بھی رکھا جاتا ہے' ان کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں تو اس لیے کہ وہ حکومت کے خلاف اٹھ نہ کھڑے ہوں۔ خدا کے احکام وقوانین میں تو یہ بات نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ کو تَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (29:6) کہتا ہے کہ ہماری حکومت تمہارے ووٹس کی رہینِ منت نہیں ہے کہ ہم تمہیں خوش رکھنا چاہتے ہیں تا کہ ہماری حکومت قائم رہے۔ یہ تو **لعلکم** ہے ''تا کہ تمہیں یہ چیز مل جائے''۔

''قانون'' کے تصور سے دل و دماغ کی عملی ہم آہنگی انسان کو جرأت اور یقینِ محکم کی دولت سے نوازتی ہے: یہ ہے وعدہ کی عملی تفسیر

قرآنِ کریم حکمت کے سلسلہ میں بھی بتاتا ہے کہ یہ قانون کیوں دیا اور اس کو حکمت سے کیوں نوازا کہ اس میں تمہارا کیا فائدہ ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ انسان میں اس سے جم کر کھڑے ہونے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ثُمَّ لَايَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ (4:65) اس کے بعد اس حکم کے خلاف دل کے اندر بھی کوئی گرانی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ تو اس نے خود دل اور دماغ کی رضامندی سے قبول کیا ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جس کے لیے فَاصْبِرْ (40:77) کہا' آگے کونسی بات کہی جس پہ وہ مطمئن ہوں' انہیں یقین ہو کہ ہاں! واقعی ہمیں یہ راستہ چھوڑنا نہیں چاہیے۔ اس میں ہزیمت تو ایک طرف رہی' ہمارے پاؤں میں لغزش بھی نہیں آنی چاہیے۔ کہا کہ یہ اس لیے ہے کہ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (40:77)۔ کیا بات ہے صاحب! یہ ہے اصل لِمْ' کہ ''اللہ کا وعدہ حق ہے''۔ اسے ایمان کہتے ہیں۔ اب یہاں جو وعدہ ہے' اس کے معنی تو وعدہ ہی لیا جاتا ہے۔ ''خدا کا وعدہ سچا ہے''۔ ٹھیک ہے' یہ بات بھی ہے۔

عزیزانِ من! سنیے' وعدے کے یہ معنی نہیں ہیں۔ یہ معنی ہمارے ہاں رائج ہوئے ہیں۔ یہ نظر آتا ہے کہ عربوں کے ہاں غالباً یہ Concept (تصور) نہیں تھا جو لفظ وعدے کا آج ہمارا ہے۔ قرآنِ کریم میں ''قانون'' کا لفظ نہیں آیا ہے۔ اُس دَور میں یہ بات تو نہیں تھی۔ اس کے لیے' خدا کی طرف سے جہاں قوانین دیئے جانے کا حکم ہے' اسے اس نے ''وعدے'' کے لفظ سے ہی تعبیر کیا ہے ❶۔ اب ایک تو ''وعدہ'' ہمارے ہاں وہ ہوتا ہے کہ وعدہ کیا' پورا ہوا یا نہ ہوا' کوئی بات نہیں یا اس وقت کوئی وعدہ کیا' شام کو کوئی

---

❶ تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ خدا کے قانون پر عمل کرنے کا لازمی طور پر یہ نتیجہ ہوگا۔ گویا ''اپنے وعدے'' سے خدا' اپنے قانون اور اس قانون کے فطری اور حتمی نتیجہ کا اظہار کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ جس طرح ہم ایک دوسرے سے کسی بات کا وعدہ کرتے ہیں اسی طرح خدا بھی انسانوں سے وعدہ کرتا ہے۔ اسی سے یہ بھی واضح ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ ''خدا کے وعدے سچے ہیں'' تو اس کا مطلب بھی یہی ہوگا کہ قوانین خداوندی اپنے ٹھیک ٹھیک نتائج پیدا کر کے رہتے ہیں، ان میں کبھی خلاف ورزی نہیں ہوسکتی۔ (پرویزؒ: لغات القرآن (جلد چہارم)، 1961ء ص ص، 1723 .1722)

دوسرا کرلیا مگر وہاں اِن عربوں کے ہاں اُس وعدے کو حقٌّ کے ساتھ مشروط کر دیا جاتا ہے' محفوظ کر دیا جاتا ہے۔

اب حقٌّ کا ترجمہ بھی عام طور پہ کیا جاتا ہے کہ ''وہ سچا ہے''۔ وہ ٹھیک ہے' سچا ہونا بھی ہے لیکن عربی زبان کے اعتبار سے حقٌّ کا جو لفظ ہے' وہ کسی تھیوری' کسی نظریئے' کسی فارمولے' کسی قانون' کو اس وقت کہتے ہیں جب اس کی صداقت کا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ جو حقٌّ کے لفظ کے اندر ہے وہ عملی طور پر سامنے آ جائے۔ وہ حقٌّ اس وقت ہوتا ہے' جب محسوس شکل میں اس کا نتیجہ سامنے آئے۔ ہمارے ہاں بھی اردو زبان میں لفظ ''حقیقتِ ثابتہ'' استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمارے ذہنوں میں حقیقت کے یہ معنی نہیں لیے جاتے۔ حقیقت کے معنی ہوتے ہیں کہ جو نظریہ عمل میں آ کر محسوس شکل میں اپنے نتائج سامنے دیدے تو اس طریق سے جو اس نظریئے کی تصدیق ہوتی ہے یا ثبوت بہم پہنچتا ہے اسے حقیقت کہتے ہیں۔ آپ یہ ترجمہ کیا کریں۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ Truth کر لیا گیا ہے' ہمارے ہاں بھی سچائی کر لیا ہے۔ بات ذہن میں نہیں آتی کہ اس نظریئے کو کس وقت حق کہا جائے گا؟ سنیے! یہ اُس وقت کہا جائے گا جب اس کے اندر جو دعویٰ کیا گیا ہے' وہ ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ جائے۔ یہ وہ چیز ہے جو اقبالؒ (1877-1938ء) نے یوں کہی ہے:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

خدا تعالیٰ کی طرف سے کیے گئے وعدہ سے مراد ''خدا کا متعین کردہ قانون ہے اور وہ اپنے نتائج سامنے لا کر رہتا ہے''

یاد رکھیے! ''وعدے'' کے معنی ہی یہ ہیں کہ کوئی فارمولا' کوئی نظریہ' کوئی قانون' کوئی تھیوری' اس وقت تک حقیقتِ منتظر ہی ہوتی ہے جب وہ دعویٰ کیا جاتا ہے یا وعدہ کیا جاتا ہے' ابھی وہ نتیجے کے لحاظ سے محسوس شکل میں سامنے نہیں آتا' ابھی اس کا انتظار ہی ہوتا ہے۔ یاد رکھیے! یہ قرآنِ کریم The Most Scientific چیز ہے۔ وہ ایک فارمولا دیتا ہے اور اس کے بعد کہتا یہ ہے کہ جاؤ اور لیبارٹری میں اس پر جا کر ٹیسٹ کرو۔ اب جس دوران اس پہ ٹیسٹ ہو رہا ہوتا ہے' ابھی وہ اس کو فارمولا یا دعویٰ یا وعدہ ہی کہتا ہے کہ ابھی تک یہ دعویٰ ہی ہے کہ ایسا ہوگا۔ جس وقت ٹیسٹ ٹیوب کے اندر وہ کچھ بن جاتا ہے جو پہلے کہا گیا تھا تو اس وقت وہ اس کو حقٌّ کہتا ہے۔ اب اگر آپ لیبارٹری میں تو اس چیز کو یہاں لے جائیں اور اس کے اندر جو محسوس شکل میں نتیجہ سامنے آنا ہے اس کو قیامت پہ اٹھا رکھیں تو

کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

(مرزا اسداللہ خاں غالب)

اب اسے آپ ایک عقیدے کی رو سے تو مانتے رہیں' یہ حقیقت بن کر آپ کے سامنے نہیں آیا۔ قرآن حمید یہاں کے انسانوں کو' دنیا کے

انسانوں کو' انسانوں کی زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے۔ وہ تو تمہارے یہاں کے معاملات سنوارتا ہے۔ یہ الگ بات ہے جو میں آگے چل کر عرض کروں گا کہ ان کے سدھرنے کے ساتھ ہی' انسان کی زندگی جو مسلسل آگے چلتی ہے' وہ بھی سدھرتی چلی جاتی ہے لیکن پہلی چیز اس کا یہاں سدھرنا ہے۔ وہ ''حقیقتِ منتظر لباسِ مجاز میں'' یہاں سامنے آئے گی۔ اور میں ابھی عرض کرتا ہوں' ابھی تو میں نے آیت کے چار ہی الفاظ پڑھے ہیں' بات آگے آتی ہے۔ وہ بات ہے کہ ''نظر آ لباسِ مجاز میں''۔ یہ تھی وہ چیز جو کہا کہ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ (40:77) ان کا اس پہ یقین تھا کہ یہ جو قانونِ خداوندی (وعد اللہ کا ترجمہ قانونِ خداوندی کیجیے) ہے' یہ ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آئے گا۔ اس کے متعلق جو وعدہ کیا گیا ہے' اس کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا' وہ ہو کر رہے گا۔ انہیں یہ یقین تھا۔ اس یقین کی بنا پہ ان سے یہ کہا کہ فَاصۡبِرۡ (40:77) اب اس کشمکش کے اندر نہ تمہارے پاؤں میں لغزش آئے' نہ دل میں کسی قسم کا اضطراب یا شک پیدا ہو۔ جم کر کھڑے رہو۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر وہ کیوں جم کر کھڑے رہیں؟ اس لیے کہ انہیں اس کا یقین تھا کہ جو کہا جا رہا ہے' اس نے حقیقت بن کر ہمارے سامنے آنا ہے۔ ان کو اس چیز پر یقین تھا اور وہ اپنے وعدے پر جم کر کھڑے رہتے تھے۔

حضورﷺ کی بیس سالہ زندگی کی جدوجہد اور اس کے ماحصل کو دیکھنے کی آرزو: ایک معصوم سا سوال

اگلی آیت میں یہ حقیقت بن کر سامنے آنے کا یقینِ محکم اور اس پر جم کر کھڑے ہونے کی بات بڑی خوبصورتی سے سامنے آ گئی ہے۔ یہ عرصہ بڑا لمبا تھا۔ حضورﷺ کی تیرہ سال کی مکی زندگی' اس کشمکش کے اندر مسلسل تکلیفیں برداشت کرتے ہوئے' صعوبات سہتے ہوئے گزری۔ یہ تیئس سال تو ساری نبوت کی زندگی ہے۔ اور تیئس سال بھی قیامت تک کے لیے نبوت ہے۔ یعنی اس نبوت کی زندگی کا ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری ہے۔ اب اس تیئس میں سے جو تیرہ سال مکے کی زندگی میں' مصیبتیں جھیلتے نکل جائیں' بظاہر کوئی نتیجہ سامنے ہی نہ آ رہا ہو تو یہ چیز ہماری زبان میں وہ ہے جسے صبر آزما کہتے ہیں۔ یہ تھکا دینے والی ہے۔ اس کے لیے بڑے ہی محکم یقین کی ضرورت ہے۔

اب ایسے مقام میں وہ آیت اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ (40:77) سامنے آتی ہے۔ تین چار مقامات کے اوپر یہ آیت آئی ہے۔ اس کے سباق کو یا پس منظر کو تصور میں رکھ کر نبی اکرمﷺ یا صحابہ کبارؓ کے دل میں یا ذہن میں ایسا آتا ہے کہ خدا کا وعدہ کب پورا ہوگا۔ یہاں قرآن مجید نے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ یہ دل میں آرزو بڑی معصوم ہے۔ اور میں نے عرض کیا ہے کہ مکے کی زندگی کے بعد مدینے کی زندگی کے اندر بھی شروع میں دوسرے ہی سال لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے' اب یہ میدانِ جنگ میں آ گئے۔ فتحِ مکہ تک سات

سال❶ اس میں لگ گئے۔ وہاں کی مخالفت میں کامیابی کا آخری دور توفتحِ مکہ کا آیا تھا۔ تیرہ سال پہلے مکہ میں اور سات سال اس مدینہ میں لگے' اس سات سال کے اندر (اگر تاریخ کا یہ بیان صحیح ہے تو) وہ غزوات ہوتے تھے اور چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی تھیں' ان سب کو شمار کرتے ہیں تو وہ اسی بیاسی کے قریب گناتے ہیں۔ یعنی ہر روز کوئی نہ کوئی جنگ ہے۔ اور جنگ ویسے نہیں ہو رہی' تو وہ کونسا گھر میں چین سے بیٹھنے دیتے تھے۔

عزیزانِ من! یہ سات سال ہیں جوان صعوبتوں میں گزرے۔ نظر آتا ہے کہ حضورﷺ کے قلبِ مطہر میں یہ ایک معصوم سی آرزو تھی جس نے شاید انگڑائی لی ہو کہ یا اللہ! مجھے اور میرے ان ساتھیوں کو بھی یہ یقین تو ہے کہ تُو نے جو کہا ہے کہ اس دعوے نے' اس نظام نے' غالب آکر رہنا ہے' اس پہ تو ہمیں یقین ہے لیکن یہ کب ہوگا۔ اس لیے کہ بہرحال طبعی طور پر عمر بڑھتی جا رہی تھی' زندگی وہاں پہنچ چکی تھی جہاں اگلا کنارا زیادہ قریب ہوتا ہے۔ کشمکش کا یہ مرحلہ طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا تو اس چیز کا دل میں آ جانا بعید از قیاس نہیں تھا کہ بارِالہا! یہ جو کچھ ہو رہا ہے' کیا اس کے محسوس نتائج میری زندگی میں سامنے آ جائیں گے یا میری ساری عمر اسی طرح سے مار کھاتے ہوئے ہی گزر جائے گی؟

حضورﷺ کی مقدس آرزو کے اظہار پر خدائے علیم کی طرف سے کھرا جواب

عزیزانِ من! یہ بڑی معصوم سی آرزو ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کے متعلق قرآنِ کریم میں تین چار جگہ کشمکش کے ایسے مقام آئے ہیں کہ جہاں یہ کہنا پڑا۔ اب میں اپنی ایک جذباتی چیز یونہی عرض کر دوں کہ جہاں رسول اللہﷺ کے دل میں یہ آرزو بیدار ہوئی کہ یا اللہ! میری زندگی میں یہ ہو جائے یا نہیں' تو جی چاہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کم از کم اتنا تو کہہ دیتا' اس کو تو پتا تھا کہ یہ ہو جانا ہے' انہیں کہہ دیتا کہ اطمینان رکھو' تمہاری زندگی میں ہی ہو جائے گا تو کچھ تسلی تو ہوتی لیکن صاحب! وہ تو ایسا سخت قانون والا ہے' اتنی رعایت بھی نہیں برتی کہ ایسے موقع پہ یہ کہہ دے کہ ''اطمینان رکھو' ہو جائے گا''۔ اس کے بعد حضورﷺ کی اگلی زندگی جو باقی تھی اس میں یہ ہو جاتا کہ اللہ نے کہہ دیا ہے کہ یہ ہو جائے گا۔ اللہ نے تو یہ چیز بھی نہیں کہی۔ کہا تو یہ کہا کہ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ (40:77) تمہیں اس سے غرض نہیں ہے کہ تمہاری زندگی میں اس کے نتائج سامنے آتے ہیں یا بعد میں آتے ہیں کیونکہ اس نظام کا اور

---

❶ ان سات سالوں میں بڑی بڑی یہ ہیں:

1۔ جنگِ بدر (17 رمضان 2ہجری مطابق 13مارچ 624ء)
2۔ جنگِ احد (14 شوال 3ہجری مطابق 29 مارچ 625ء)
3۔ جنگِ احزاب (ذیقعدہ 5ہجری)
4۔ جنگِ حدیبیہ (ذیقعدہ 6ہجری)
5۔ غزوۂ خیبر (7ہجری)
6۔ فتح مکہ (رمضان 8ہجری مطابق جنوری 630ء)

اس کے نتائج کا تعلق تنہا تمہاری زندگی سے نہیں ہے۔ یہ تو انسانیت کے لیے ہے اور انسانیت نے تو قائم رہنا ہے' بڑھتے چلے جانا ہے۔ اس میں کیا حرج ہوتا ہے کہ ایک فرد رہتا ہے یا نہیں رہتا۔ میرے اللہ! اف! یعنی انسانی اعتبار سے (معاذ اللہ) میں کہوں گا کہ کتنا ''رُوکھا'' جواب ہے جو دیا جا رہا ہے۔ لیکن کتنا یقینِ محکم تھا! یہ ہے اصل جوہر۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والے ''روکھے'' جواب پر ہمارے ہاں کے تراجم اور اصل صورتِ حال

اب یہ جو مقام ہیں' یہاں تو کہا ہے کہ فَاِلَیۡنَا یُرۡجَعُوۡنَ (40:77)۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ کرتے ہے کہ کوئی بات نہیں! اگر یہاں نہیں ہوتا تو نہ ہو' یہ بھاگ کر کہاں جائیں گے ''آونڑاں اوناں ساہڈی گلی اچ اخیر تے' اوتھے پھڑاں گے ایناں نوں'' یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے قیامت میں ہمارے ہاں ہی آنا ہے' یہاں تو ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے' کوئی بات نہیں' یہ وہاں آئیں گے تو وہاں ہم ان کو پکڑ لیں گے۔

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ فَاِلَیۡنَا یُرۡجَعُوۡنَ (40:77)۔ یہ رَاجِعُوۡنَ اور یُرۡجَعُوۡنَ کی قرآن مجید کی بات ہی کچھ اور ہے۔ کہا ہے کہ یہ بھاگ کر کہیں جا ہی نہیں سکتے' ان کا تو ہر قدم اس انجام کی طرف اٹھ رہا ہے جو اس کشمکش کا فطری طور پر ہونا ہے۔ یہ یُرۡجَعُوۡنَ یا رَاجِعُوۡنَ اسمِ فاعل ہے جس کے معنی ہیں کہ یہ ہو رہا ہے۔ یہی نہیں کہ یہ کسی زمانے میں جا کر ہوگا' یہ آئیں گے ہماری طرف۔ کہا کہ ان کا تو ہر قدم ہماری طرف اٹھ رہا ہے۔ اس لیے یہ سوال ہی نہیں کہ یہ ہو کر نہ رہے۔

حضور ﷺ کی یہ خواہش کب پوری ہوگی؟ کے جواب میں خدا تعالیٰ کا ارشاد

اب یہ جو بات ہے کہ یہ کب ہو کر رہے' اس کا جواب دوسرے مقام پہ آیا ہے۔ کہا ہے کہ اِنۡ مَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُھُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ (13:40)۔ یہاں تک تو وہی الفاظ ہیں کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کے محسوس' مرئی' نتائج تمہاری زندگی میں سامنے آ جائیں یا اس کے بعد آئیں۔ آگے کہا ہے کہ فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ(13:40) آہاہاہاہا! یہ اس کا جو حساب ہے کہ یہ فصل کب پکے گی' یہ ہمارا مقرر کیا ہوا ہے' ہم جانتے ہیں اور ایک ایک دن اس کا حساب ہم کر رہے ہیں۔ یہ تو ہمارے ذمے ہے تم یہ نہیں کر سکتے کہ اتنے دنوں کے بعد تمہاری خواہش کے مطابق یہ فصل پک جائے۔ کسان کے بچے کتنا بھوکا مر رہے ہوں' کتنا ہی اس کا جی چاہے کہ آج شام کو کسی طرح سے اس میں سے دانے نکل آئیں' اس گیہوں نے تو چھ مہینے کا عرصہ لینا ہے۔ کہا ہے کہ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ (13:40)۔ اس کے تو معنی یہ ہیں کہ یہ جو ہمارا مقرر کردہ قانون ہے یعنی جسے آپ کی اصطلاح میں Calculated (حساب شدہ) کہتے ہیں' یہ حساب کی بڑی عجیب چیز ہے یعنی یہ نہیں ہے کہ خدا کے ہاں بھی یہ چیز ہوتی ہے کہ اچھا کوئی نہیں' یہ ذرا

جلدی کردو' آج ایسے ہی کردو' کچاپکا ہی سہی۔نہیں' یہ تو اس حساب کے مطابق ہونا ہے کہ کب یہ سامنے آنا ہے۔اب رہے تم' تو تمہارا کام یہ ہے کہ فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ(13:40) تم اسے پہنچائے چلے جاؤ۔ یہ کیسا عجیب پروگرام ہے کہ ساری زندگی جس کی اس کشمکش کے اندر گزر رہی ہے' اس کی اس آرزو پر بھی اتنی سی رعایت نہیں برتی جاتی کہ جسے ہم کہتے ہیں کہ کہہ دیا جائے کہ کوئی بات نہیں' تمہاری زندگی میں ہی ہو جائے گا۔کہا ہے کہ تمہارا کام یہ ہے کہ اس پر یقین رکھو' جم کر کھڑے رہو۔عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ(13:40) تمہارا کام یہ ہے کہ اس کو پہنچاتے چلے جاؤ' عام کرتے چلے جاؤ۔ہم جانتے ہیں کہ یہ کب محسوس شکل میں سامنے آئے گا۔

ذاتِ خداوندی' قادرِ مطلق ہونے کے باوجود' عالمِ امر میں عالمِ خلق کے لیے بنائے ہوئے قانون میں' کوئی تبدیلی نہیں کرتی بس تم اسے پہنچائے چلے جاؤ

یہاں تو یہ اتنی سی بات کہی ہے۔دو ایک مقام ہیں جہاں اس سے زیادہ وضاحت سے بات کہی گئی ہے۔ذہن میں یہ چیز آتی ہے کہ خدا کی قدرتِ مطلقہ (Absolute Power) ہے' اُس میں کوئی دوسرا نہ دخل دے سکتا ہے' نہ اس میں کوئی اس سے یہ پوچھ ہی سکتا ہے کہ تم نے یہ جلدی کیوں کر دی' یا یہ تاخیر کیوں کر رہے ہو' وہ اگر چاہے تو وہ اپنے ان قاعدوں کے خلاف بھی' جس وقت چاہے فصل پکا سکتا ہے تو پھر یہ چیز کیوں نہیں کہہ دی کہ ہاں یہ تمہاری اسی دنیا کی زندگی میں ہو جائے گا' یہاں یہ بات کہی کہ وَاِنَّا عَلٰۤی اَنۡ نُّرِیَکَ مَا نَعِدُھُمۡ لَقٰدِرُوۡنَ (23:95) تمہارے ذہن میں یہ آ رہا ہوگا کہ خدا تو قادرِ مطلق ہے' وہ جو جی میں آئے' جب جی میں آئے' کر سکتا ہے تو پھر اس میں کیا تردد ہے کہ حضورﷺ نے جو یہ کہا یا یہ آرزو دل میں آئی کہ اس کے مطابق میری زندگی میں یہ نتائج پیدا ہو نگے یا نہیں' یہ تو اس کے لیے ہو کہ جو ایسا کر نہ سکتا ہو۔کہا کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں (مگر کرتے نہیں ہیں)۔سوال یہ ہے کہ ''کر سکتے ہیں'' تو پھر کیوں نہیں کرتے؟ ایک اور ریفرنس لیجیے تو پھر بات سمجھ میں آئے گی کہ ایسا کیوں نہیں کرتے۔

کہا ہے کہ فَاِمَّا نَذۡھَبَنَّ بِکَ فَاِنَّا مِنۡھُمۡ مُّنۡتَقِمُوۡنَ اَوۡ نُرِیَنَّکَ الَّذِیۡ وَعَدۡنٰھُمۡ فَاِنَّا عَلَیۡھِمۡ مُّقۡتَدِرُوۡنَ(43:41-42) ہم اس پہ قادر ہیں کہ وہ جو ہم نے اپنا قاعدہ' قانون مقرر کیا ہے کہ مثلاً فصل بونے اور اس کے پکنے کے درمیان کا ایک جو وقفہ ہے' وہ جو قانون کے مطابق ہم نے مقرر کیا ہوا ہے' ہم اس پر قادر تو ہیں کہ اس کے خلاف بھی کریں لیکن قرآنِ کریم نے یہ بار بار کہا ہے کہ وہ جو ہمارا عالمِ امر ہے' اس میں تو ہم پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے' وہ ہماری مشیت ہوتی ہے' اس کے مطابق ہم قانون بناتے ہیں' مثلاً یہ قانون کہ گیہوں کے بونے اور پکنے میں چھ مہینے ہوتے ہیں' میں مثال کے طور پہ کہا کرتا ہوں' قرآن حمید میں زراعت کی مثالیں زیادہ دی ہیں' اس گیہوں کے پکنے میں اتنا وقفہ کیوں ہے' یہ جو 'کیوں' ہے' تم اس کے متعلق ہم سے نہیں پوچھ سکتے' یہ ہمارے عالمِ امر کی

بات ہے' ہم نے قانون ایسا بنایا ہے۔ تم یہ پوچھ سکتے ہو کہ اس قانون کے مطابق وہ چھ مہینے میں پکی کیوں نہیں۔ اب یہ جو چیز ہے کہ ہم اس پہ تو قادر ہیں کہ جب جی چاہے' ایسا کر دیں لیکن وہ جو ہمارا پروگرام ہے کہ یہ ایسا ہو کر رہے گا' ہمارا قانون ہے ایسا ہو کر رہے گا' اس کے مطابق اس کے نتائج نکلیں گے۔ اور وہ کیا ہے؟ وہاں تو کہا ہے کہ عَلَیْکَ الْبَلٰغُ (13:40) تم پہنچائے چلے جاؤ۔ یہاں کہا ہے کہ یہ جو چیز ہے کہ فَاسْتَمْسِکْ بِالَّذِیْٓ اُوْحِیَ اِلَیْکَ (43:43) یہ جو قوانین تمہیں دیئے جا رہے ہیں یا دیئے گئے ہیں ان کے ساتھ تم متمسک رہو' ان کے مطابق تم کام کرتے چلے جاؤ۔ تم کام کرتے چلے جاؤ' یہ ایسے ہی ہو کر رہے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ خدا کا وہ قانون کیا ہے؟

قرآنِ حکیم کے پیش کردہ حقائق کو سمجھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ تقلید پرستی پر مبنی ہمارے عقائد ہیں' قوانینِ خداوندی پر عمل تو ہم نے خود کرنا ہوتا ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ اگر قرآن حکیم کی تعلیم کی اتنی سی لم سمجھ میں آ جائے' سمجھ میں تو آ جاتی ہے مگر وہ جو ہمارے ہاں کے عقائد متوارث چلے آ رہے ہیں' وہ انسان کو سمجھنے نہیں دیتے۔ اتنی سی بات اگر سمجھ میں آ جائے تو ہمارا نقشہ بدل جائے۔ اور وہ یہ ہے کہ خدا اپنے غیر متبدل قانون تو دیتا ہے' ان قوانین کے مطابق عمل ہم نے کرنا ہوتا ہے۔ وہ جماعت' وہ افراد' جو ان قوانین پر عمل کرنے کے لیے اٹھتے ہیں' ان سے پھر یہ ہوتا ہے کہ وہ قوانین کے نتائج کو عملی شکل میں انسان کے سامنے لے آئیں۔ اس لیے یہ کہا ہے کہ تم اس وحی کے قانون کے مطابق عمل کرتے چلے جاؤ' ان کے ساتھ تمسک رکھو۔ میں نے کہا تھا کہ ایک نقطہ یاد رکھیے کہ انسانوں کی دنیا میں خدا اپنا پروگرام انسانوں کے ہاتھوں سے کامیاب کراتا ہے' از خود نہیں کرتا۔ اور ان قاعدوں کے مطابق انسانوں کے ہاتھوں سے کراتا ہے جو اس نے قانون کی رو سے مقرر کیے ہیں۔ یہاں بھی کوئی فوق الفطرت چیز نہیں آتی' کوئی Super-human (مافوق البشر کی) چیز اس میں نہیں ہوتی۔ خدا خود اس میں دخل نہیں دیتا۔

خدا کے دائرۂ اختیار اور انسانوں کے دائرۂ اختیار کی حدود کے تعین میں خود عائد کردہ پابندیاں کوئی مجبوری نہیں ہیں

وہ کہتا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (41:40) ہمارا عالمِ امر تھا' اس میں ہم نے اپنی مشیت کے مطابق جو کچھ کرنا تھا' کیا۔ تمہاری یہ جو دنیا کی زندگی ہے' اس میں تم اپنی مشیت کے مطابق کرو' جو کرنا ہے' ہم دخل نہیں دیں گے۔ اب یہ جو چیز تھی کہ وہ انقلاب سامنے آئے گا' تمہاری زندگی میں آئے یا بعد میں آئے' اس میں ایک تو یہ قانون کی چیز تھی کہ یہ قانون ایسا ہے' یہ اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہے گا'

اور دوسری چیز یہ ہے کہ یہ اپنا نتیجہ کب پیدا کرے گا؟ وہ تو کہا ہے کہ یہ نتیجہ قانون کے اندر ہے' یہ قانون کا فطری نتیجہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ یہاں کیسے ہوگا؟ یہ ہے جو قرآن حکیم نے بتایا ہے۔ میں اس مثال کو پھر دہرا دوں' وہ اس معاملے میں بڑی نمایاں ہے۔ انسانوں کی دنیا کے لیے خدا نے جو قوانین بنائے ہیں وہ ان کی پابندی خود بھی کرتا ہے حالانکہ خدا اور اس کی پابندی!!! حیرت زا ہی تو ہے لیکن اگر وہ کسی دوسرے کی عائد کردہ پابندی ہو تو اسے تو مجبوری کہتے ہیں اور جو اپنے اوپر آپ پابندی عائد کرتا ہے اسے مجبوری نہیں کہتے۔ اس نے یہ پابندی اپنے اوپر خود عائد کی ہے۔

کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانے کی کیفیت کو سمجھنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور دوسری یہ بات کہ بیوی نہیں تو بیٹا کیسے ہو؟

آپ کو وہ آیت یاد ہے' وہ بڑی اہم ہے کہ وہ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (2:117) سے بات شروع کرتا ہے کہ ہم اس پوری عظیم کائنات کو عدم سے وجود میں لائے یعنی یہ تھی ہی نہیں' اس کا وجود ہی نہیں تھا جسے وہ Nothingness (عدم) کہتے ہیں' یہ Nothingness (عدم) سے Being (وجود) میں لانا ہے۔ تو یہ دنیا کی عظیم سے عظیم سائنس بھی یہاں آ کر حیرت کی وادی میں گم ہو جاتی ہے۔ Nothingness (عدم) سے جو وجود میں لانا ہے' یہ سائنس کے بس کی بات نہیں کہ سمجھ جائے لیکن یہ سائنٹسٹ اس کو تو سمجھتے ہیں کہ واقعی یہ Nothingness (عدم) سے وجود (Being) میں آئی ہے تو گویا اتنی بڑی چیز تو خدا نے کی۔ کہا کہ یہ ہم نے کیا' اب تم ہمیں کہتے ہو کہ خدا کے ہاں بیٹا بھی ہے۔ یہ ہے اگلی بات جو وہ کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہماری تو بیوی نہیں ہے تو بیٹا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ہوا ایک تضاد جو بظاہر نظر آتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ بیٹے کا بیوی کے بغیر پیدا نہ ہونا کیوں کہا ہے؟

انسانوں کے متعلق خدا کا پروگرام انسانوں کے ہاتھوں ہی بروئے کار لایا جاتا ہے' اس کا اپنا ایک پروسیس ہے

عزیزانِ من! یہ کائنات تو عدم سے وجود میں آ سکتی ہے یہ ہمارا عالمِ امر ہے لیکن اب جو یہاں عالمِ خلق میں ہم نے قانون مقرر کیا ہے کہ اولاد پیدا ہونے کے لیے نر اور مادہ کی ضرورت ہے' ان کا اختلاط ضروری ہے' اس کے خلاف ہم بھی نہیں کرتے۔ میری بیوی نہیں ہے تو بیٹا کیسے ہوگا۔ کہا کہ او! تُو تو کائنات کو عدم سے وجود میں لے آیا' تجھے یہاں کیا مشکل ہے؟ کہنے لگے کہ وہ لے آیا' وہ عالمِ امر کی بات تھی۔ یہ تمہاری دنیا کی جو بات ہے یہ عالمِ خلق کی ہے' اس میں وہ جو تمہارے لیے قوانین ہیں' ان کی ہم بھی پابندی کرتے ہیں۔ اب ہمارے ہاں بیٹا بیوی کے بغیر نہیں ہو سکتا اور بیوی ہے نہیں' تم مانتے ہو۔ کئی دفعہ یہ آ چکا ہے۔

یہ ہے وہ نقطہ جو میں عرض کر رہا تھا کہ انسانوں کی دنیا میں خدا اپنے پروگرام کو انسانوں کے ہاتھوں سے بروئے کار لاتا ہے۔ اور اسی کے لیے یہ جماعت ضروری ہے جو اس نے تیار کی۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ جو ہیں' یہ ہے وہ جماعت جو یہ انقلاب پیدا کرے گی۔ کس طریق سے یہ ہوتا ہے؟ یہ عجیب بات ہے۔ باطل کا نظام' باطل کی قوتیں' برسرِ اقتدار آ جاتی ہیں' یہ باطل کا ایک نظام قائم کر لیتی ہیں۔ اب اس نظام کی جگہ اس کو اکھیڑ کر ایک صحیح نظام مسلط کرنا ہوتا ہے۔ یہ پروسیس بڑا لمبا ہے۔ اب یہ ہوتا کیسے ہے؟ وہ جو باطل نظام والے ہیں' وہ تو ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ وہ نظام محکم سے محکم تر رہے' کوئی شخص اس میں کسی قسم کی تخریب نہ کر سکے لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ اس باطل کے نظام کے لیے کتنی کوششیں بھی کیوں نہ کی جائیں (میں آگے چل کر عرض کروں گا کہ اس کی تائید میں ہمارے سامنے کیا چیزیں آ رہی ہیں)' ہوتا وہی ہے جو (مرزا اسد اللہ خاں) غالب (1869-1797ء) نے کہا تھا کہ

مِری تعمیر میں مضمر ہے اِک صورت خرابی کی

باطل کے نظام کی تعمیر کے اندر' جو اس کی بنیادیں ہوتی ہیں' وہ متزلزل ہوتی ہیں' وہ محکم نہیں ہوتی ہیں۔ اس کو (مرزا اسد اللہ خاں) غالب نے کیسے حسین الفاظ میں ادا کیا ہے۔

باطل نظام کی بنا ہمیشہ ریت کے تودوں پر استوار کی جاتی ہے اور جماعتِ مومنین کا ہاتھ اس کی رہی سہی کسر بھی نکال دیتا ہے

سورۃ الحشر میں آپ دیکھیے۔ یہودیوں کے ساتھ مقابلہ ہو رہا تھا۔ کہا کہ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ (59:2) گھبراؤ نہیں' یہ تو اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو ڈھا رہے ہیں۔ واہ واہ واہ! باطل نظام کی اصل اور بنیاد کے اندر جو تخریب مضمر ہوتی ہے اس کے متعلق یہ کہنا کہ گھبراتے کیوں ہو! دیکھتے ہو کہ یہ نظام کس طرح سے اپنی تکمیل کے نقطے تک پہنچ رہا ہے۔ یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر برباد کر رہے ہیں۔ آہاہاہا! اے کاش! غلط نظام والوں کی آنکھیں یہ دیکھ لیں کہ ٹھیک ہے' مکان کے اوپر کے حصے کی آرائش اور زیبائش کے اندر تو ان کی ساری کوششیں صرف ہوتی ہیں لیکن بنیادیں متزلزل ہو رہی ہوتی ہیں' وہاں نگاہ نہیں جاتی۔ یہی نہیں کہ وہاں وہ خود متزلزل ہو رہی ہوتی ہیں' کہا ہے کہ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ (59:2)۔ ایک تو اُدھر یہ ہو رہا ہے کہ وہ تخریبی نظام اپنے اصل کے اعتبار سے ایسا ہے کہ اس میں تخریب ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے بھی ڈھا رہے ہیں لیکن اس میں عرصہ ذرا لمبا لگتا ہے۔ تو کہا کہ وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ (59:2) اور اس کے ساتھ جماعتِ مومنین' رہی سہی کسر نکال دیتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ باطل کے نظام نے خود اپنے ہاتھوں سے ہی اپنی تخریب بھی کر لینی ہے۔

اگر خدا کے قانون کے ساتھ انسان کا ہاتھ شامل ہو جائے تو کامیابی نزدیک تر ہو جاتی ہے

عزیزانِ من! اس کی نتیجہ خیزی کے لیے لمبا عرصہ لگ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اگر اَیۡدِی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (59:2) شامل ہو جائیں تو پھر صدیوں کا کام برسوں میں، برسوں کا مہینوں میں، مہینوں کا دنوں میں، ہو جاتا ہے۔ اس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید کی رو سے یہ جو باطل کے نظام کو الٹ کر صحیح نظام لانے کا Process (طریق) ہے، ایک تو یہ ہے کہ باطل کے نظام کے اندر خود یہ چیز موجود ہوتی ہے کہ اس کی بنیادیں کمزور ہوتی ہیں، اس نے متزلزل ہونا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو ویران کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ جماعت مومنین کے ہاتھ جب جا کر لگ جائیں گے تو پھر یہ پروسیس اور بھی جلدی اپنے نتائج برآمد کرلے گا۔

خدا کی ذات قانون کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں انسانوں کی تباہی کو اپنی طرف منسوب کرتی ہے

سورۃ التوبہ کی آیت 14 میں تو بڑی عجیب چیز سامنے آئی ہے۔ یہ جسے ہم عذاب خداوندی کہتے ہیں وہ یہی سمجھا جاتا ہے کہ فلاں قوم پر اللہ کا عذاب آ گیا، اور ادھر ہمارے ذہنوں میں یہی ہوتا ہے کہ یہ دوسری جو اللہ والی قوم ہوتی ہے، جو اس کے محبوب کی امت ہوتی ہے، یہ آرام سے اپنے گھروں کے اندر بیٹھی رہتی ہے، مزے لوٹتی رہتی ہے اور اللہ خود ہی اپنا عذاب اس قوم پر نازل کر دیتا ہے تو وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے اور پھر ان سے کہا جاتا ہے کہ جاؤ اٹھو! تھام لو، ہندو چلے گئے، لوٹ لو جا کر سب کچھ۔ ''ساڈے نال تے اے ہویا سی'' (ہمارے ساتھ تو یہی ہوا تھا)۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم کہتا ہے کہ خدا کا عذاب یوں نہیں آتا۔ کیا بات ہے! کہا کہ قَاتِلُوۡهُمۡ (9:14) اٹھو! ان کے ساتھ جنگ کرو۔ یُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ (9:14) خدا کس طرح انہیں عذاب دلواتا ہے۔ آپ الفاظ دیکھیے، اللہ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے کہ خدا ان کو عذاب دے گا، خدا ان کو تباہ کرے گا اور ساتھ ہی کہا کہ بِاَيۡدِيۡكُمۡ (9:14) یہ کچھ تمہارے اپنے ہاتھوں سے ہوگا۔ اچھا جی! خدا نے تباہ کرنا تھا تو اس نے ہمیں قَاتِلُوۡهُمۡ (9:14) کاہے کے لیے کہا ہے۔ کہا کہ تم سمجھتے نہیں ہو کہ ہمارا عذاب کس طرح سے آتا ہے۔ آپ الفاظ پر غور کیجیے۔ پہلے ان کو قَاتِلُوۡهُمۡ (9:14) کہا ہے۔ یُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ (9:14) خدا ان کو تباہ کرے گا۔ آگے کہا ہے کہ بِاَيۡدِيۡكُمۡ (9:14) خدا تمہارے ہاتھوں سے ان کو تباہ کراتا ہے۔ اور اس تباہی کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔

خدا کی قضا یعنی خدا کے قوانین کے تیر تو جماعتِ مومنین کی کمان کے منتظر ہوتے ہیں

عزیزانِ من! یہ ہے اصل چیز۔ وہ (مرزا اسد اللہ خاں) غالب (1797-1869ء) کا نعت کا شعر ہے، یہ جتنی آیات ہیں، وہ ان کی تفسیر اپنے اندر لیے ہوئے ہے، بڑا ہی جامع ہے۔ بڑا اونچا تھا یہ شخص۔ کہتا ہے کہ

تیرِ قضا ہر آئینہ از ترکشِ حق است

خدا کی قضا کے تیر تو اللہ کے ترکش کے اندر پہلے سے ہوتے ہیں

لیکن کشودِ آں ز کمانِ محمدؐ است

جب وہ تیر چلتا ہے تو محمد ﷺ کی کمان سے چلتا ہے' اکیلا ترکش میں رکھا ہوا نہیں چلتا۔ آہاہاہا! اس کی ترکش کے تیر انتظار میں ہوتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کی جماعت پیدا ہو۔ ان کے تیر نہیں ہوتے' قضا کا تیر تو اسی کے قانون کا ہوتا ہے۔ وہ ترکش میں رکھے ہوئے ساری عمر رکھے رہیں تو کوئی تیر چل نہیں سکتا۔ اس کے لیے کمان کی ضرورت ہوتی ہے اور کمان خدا اپنے ہاتھ سے نہیں چلاتا' وہ کمانِ محمدؐ سے چلتے ہیں۔ یہ جو کہتے ہیں کہ اسلام پہ ہمارا ایمان ہے اور اس کے دعوے سچے ہیں اور خدا کا سب کچھ سچ ہے۔ وہ کہتے رہیے' بس اس ترکش کے اندر رکھے ہوئے تیروں کی تعریف کرتے چلے جایئے۔ سبحان اللہ! کیسی خوبصورت ہے صاحب! وہ تو ہیرے کا جوڑ اس میں لگا ہوا ہے' زہر میں بجھا ہوا ہے۔ ترکش میں رکھا ہوا ہے۔ اگلی بات کرو کہ لیجیے یہ کمان آ گئی' اب اس میں وہ ترکش کا تیر چلے گا' پھر جا کر ہدف پہ لگے گا۔ دیکھا! کتنے خوبصورت یہ الفاظ ہیں! کہ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ (9:14)۔ (تم ان کے خلاف جنگ کے لیے نکلو' اور پھر دیکھو کہ خدا کس طرح انہیں' تمہارے ہاتھوں سے سزا دلواتا ہے' انہیں ذلیل و رُسوا کرتا ہے)۔

انسان ہو یا کوئی قوم اس کا مقامِ انسانیت سے گر جانا بہت بڑے عذاب کا موجب ہے

عزیزانِ من! اس کا جو عذاب ہوتا ہے' یہ ٹھیک ہے کہ اس طرح سے تباہیاں آتی ہیں۔ لیکن کسی قوم کا اصل عذاب تو دنیا میں ذلیل ہو جانا ہوتا ہے۔ اس کے لیے یہ عذاب بتایا ہے۔ یہ مملکتوں کا چھن جانا' سلطنتوں کا نہ رہنا' یہ تو آنی جانی چیز ہے۔ مملکتیں چھنتی بھی ہیں' آ بھی جاتی ہیں' یہ چیزیں ہوتی رہتی ہیں لیکن اصل عذاب یہ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (41:16) ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں ہی ذلت آمیز عذاب ہے۔ کہا ہے کہ اس طرح اللہ يُخْزِهِمْ (9:14) انہیں ذلیل و رُسوا کرتا ہے۔ یہ ہے خدا کا عذاب۔ یہ اس لیے ہے کہ اس نے تو وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) کہا تھا۔ انسان بحیثیت انسان ہونے کے' خدا کے قانون کی رو سے واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ انسان جب دوسرے انسانوں کی نظروں میں یا ان کے ہاتھوں میں ذلیل ہوتا ہے تو وہ انسانیت کی سطح سے نیچے گر جاتا ہے۔ یہ ہے عذابِ خداوندی۔ مملکت تو آتی ہے اور جاتی ہے۔ انسانیت کی سطح سے نیچے گر جانا عذابِ خداوندی ہے۔ یہ ہے يُخْزِهِمْ (9:14)۔ آپ کو شاید وہ واقعہ یاد ہو یا نہ یاد ہو' مجھے یاد ہے۔ عزیزانِ من! قرآن حمید کی رو سے جو نظام قائم ہوتا ہے' یہ چیزیں تو اس کے اندر بہت اہم ہوتی ہیں۔ وہ جسے آپ By Product (ضمناً) کہتے ہیں کہ اس میں کسی فرد کو روٹی کی فکر نہیں ہوتی' حزن نہیں

ہوتا' اس میں اصل چیز یہ ہے کہ جو شرف وتکریمِ انسانیت ہے' اس کو ضعف نہیں پہنچتا۔

مصر کے گورنر حضرت سعدؓ کے نزدیک کسی کو ذلیل کہنا بھی بہت بڑا جرم تھا

عزیزانِ من! میں وہ واقعہ پھر دہرا دوں۔ مجھے تو کبھی بھول ہی نہیں سکتا۔ جب یہ نظام قائم ہوا تھا تو شرفِ انسانیت کا کس قدر لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اس کے لیے آپ کو یاد ہوگا کہ سعدؓ مصر کے گورنر تھے۔ وہ بڑے ہی قابل' بڑی بلند سیرت کے انسان تھے۔ ایک یہودی' ذمی تھا۔ کسی بات پہ غصے میں آ کر وہ اسے کہہ بیٹھے کہ اخزك الله خدا تجھے ذلیل کرے۔ کہہ تو دیا اور اس کے بعد جب غصہ ٹھنڈا ہوا' آپ حیران ہونگے کہ اپنا استعفیٰ لے کر بارگاہِ خلافت میں آ گئے۔ کہا کہ گورنری تو ایک طرف رہی' میں تو انسان کہلانے کا بھی حقدار نہیں ہوں۔ میں نے ایک انسان کے متعلق یہ کہا ہے کہ تجھے اللہ ذلیل کرے۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔ آپؓ (حضرت عمر فاروقؓ) بھی اور ساتھی بھی بہتیرا کہتے رہے کہ جذبات کی شدت میں یہ بات ہوگئی ہے' ایسا تو نہ کرو کہ تم استعفیٰ دے کر ہی چلے آؤ' کوئی اور سزا اپنے اوپر وارد کرلو' وہ کہنے لگے کہ یہ تو کم از کم سزا ہے جو میں اپنے اوپر وارد کر رہا ہوں' جرم بھی تو دیکھو میں نے کتنا بڑا کیا ہے: جسے خدا واجب التکریم کہتا ہے' میں اس کی تذلیل کا سبب بن رہا ہوں۔ کیا کہتے ہو آپ مجھے! گورنری' حکومت! یہ تو بڑی چیز ہے میں تو انسان کہلانے کا بھی حقدار نہیں ہوں۔ یہ ہے وہ چیز یُخْزِهِمْ (9:14) یہ اصل عذابِ خداوندی ہے کہ انسانیت کو انسانیت کی سطح سے گرا دیا جائے' وہ ذلیل ہو جائے۔

کائناتی قوتوں کے ساتھ انسانی ہاتھ کی ہم آہنگی نتائج لانے کے عمل کو سرعت بخشتی ہے

بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ کہا یہ ہے کہ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (40:77) اپنے پروگرام پہ جم کر کھڑے رہو۔ جو کچھ تم سے کہا گیا ہے کہ قانونِ خداوندی ایک مثبت حقیقت بن کر سامنے آئے گا' اس پر یقین رکھو۔ ٹھیک یقین تھا۔ باقی رہا یہ کہ یہ انقلاب کب برپا ہوگا؟ اے رسول! تمہاری زندگی میں ہو' تمہاری زندگی کے بعد ہو' اس سے کچھ فرق نہیں پڑنا چاہیے اس لیے کہ یہ تمہارا ذاتی کاروبار نہیں ہے کہ

پس از اں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد

میرے بعد اگر اس سودے نے اتنی دولت دی تو مجھے کیا حاصل ہوا' میں تو غریبی میں ہی مر گیا۔ سنو! یہ سوال کہ انقلاب کب آئے گا تمہاری ذات کا نہیں ہے' یہ تو انسانیت کے لیے ہے۔ یہ تمہاری زندگی میں ہو جائے' تمہارے بعد ہو جائے لیکن ہمارے حساب کے مطابق ہی ہوگا اور اس میں کچھ فرق نہیں آئے گا۔ بس اتنی سی بات ہے کہ ہمارے جو کائناتی قانون ہیں' جسے وہ ملائکہ کی نصرت کہتا ہے'

اگر از خود ان کے مطابق ہوتا رہے تو ہوتا جائے گا لیکن دیر لگے گی۔ اگر تمہاری جماعت ساتھ آ جائے گی جسے وَ اَیۡدِیۡکُمۡ کہا ہے تو جلدی ہو جائے گا۔ یہ ضروری ہے کہ اگر وہ خدا کے ترکش کے تیر' اس جماعت کی کمان کے اندر سے نکلیں' تو پھر یہ جلدی ہو جائے گا۔ ویسے اس نے کہا ہے کہ یہ کوئی بات نہیں ہے' اگر یہ نہ بھی ہو تو بھی فَاِلَیۡنَا یُرۡجَعُوۡنَ (40:77) یہ مجرم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ یہ مفرور ہے' اشتہاری مجرم ہے' لیکن یہ جو بھاگ رہا ہے یُرۡجَعُوۡنَ یہ ہمارے ہی قانون کی طرف لوٹ آئے گا۔ نتائج پیدا کرنے کے عمل میں تیزی پیدا کرنے کے لیے کائناتی قوتوں کے ساتھ انسانی ہاتھ کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے ورنہ آنا تو اسے ہمارے ہی قانون کی طرف ہے۔

ذاتِ خداوندی کے لیے کسی ایک مقام و جگہ کا تعین کرنا دنیائے تصوف کی پیداوار ہے' انسان کا ہر قدم قانونِ مکافاتِ عمل کی طرف اٹھتا ہے

عزیزانِ من! یہ رجع' راجعون' ترجعون کیا خوبصورت الفاظ ہیں! رجع کے جو معنی ہمارے ہاں لیے جاتے ہیں ان سے مفہوم صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آتا' بلکہ غلط فہمی کا سبب بھی بنتا ہے۔ یہ بات ضمناً آ گئی تو دو ایک الفاظ میں اس کا ازالہ بھی کر دوں کہ اگر اس کے یہ معنی لیں ''ہماری طرف آئیں گے'' تو اس سے ہمارے ذہن میں کچھ ایسا تصور پیدا ہوتا ہے کہ خدا کہیں بیٹھا ہوا ہے۔ قیامت کا نقشہ ایسا ہی ہے کہ وہ بہت بڑا میدان ہوگا' اس میں پھر خدا ایک جگہ بیٹھا ہوا ہوگا۔ اِلَیۡنَا یُرۡجَعُوۡنَ کے معنی ہیں ''ہماری طرف آئیں گے''۔ یعنی خدا کسی جگہ ہے' اس کی طرف یہ جائیں گے۔ خدا کی طرف جائیں گے' وہاں اُس کے ہاں جائیں گے۔ بات دور چلی جائے گی ورنہ میں بتاتا کہ یہ تو تصوف کا باطل عقیدہ ہے کہ ہر انسانی نفس کا منتہا یہ ہے کہ وہ ذاتِ خداوندی میں جا کر مل جاتا ہے۔ ''ہماری طرف آنے کی'' یہ بات نہیں ہے۔ خدا کی طرف کے معنی یہ ہیں کہ وہ عدالتِ خداوندی جہاں سے یہ بھاگا بھاگا پھر رہا ہے کہ گرفت نہ ہو جائے' وہاں سے سزا نہ مل جائے' رات کی تاریکیوں کے اندر یہ چکر لگا رہا ہے' اپنے ذہن میں سمجھ رہا ہے کہ میں اس سے دور جا رہا ہوں' اس کو پتا نہیں ہے کہ اس کا ہر قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہے کہ اس نے تو خود آ کر' حاضر ہو کر' کہہ دینا ہے کہ لیجیے سرکار! میں آ گیا۔ قانونِ مکافاتِ عمل کے معنی یہ ہیں کہ اس سے مفر نہیں ہے' اس سے کوئی شخص بھاگ نہیں سکتا' ہر شخص کا قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہے۔

اور عزیزانِ من! کہا کہ یہ سلسلہ جو ہم نے بیان کیا ہے' اے رسول! تنہا تمہارے ساتھ ہی نہیں ہے۔ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِکَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ قَصَصۡنَا عَلَیۡکَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّمۡ نَقۡصُصۡ عَلَیۡکَ وَمَا کَانَ لِرَسُوۡلٍ اَنۡ یَّاۡتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ (40:78) یہ بات تمہارے ہی ساتھ نہیں ہے۔ رسولوں کا یہ سلسلہ شروع سے جاری رہا اور وہ سب انہی مراحل سے گزرتے رہے۔ وہ جو اقوامِ سابقہ کی داستانیں قرآن حکیم بیان کرتا ہے تو وہ انبیائے سابقہؑ کی اسی سنت کو بیان کرتا ہے کہ یہ کچھ اسی طرح سے ہوتا چلا آ رہا ہے' یہ کوئی نئی بات

نہیں ہے:

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی' نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسداللّٰہی' وہی مرحبی' وہی عنتری

(اقبالؒ: بانگِ درا)

یہ تو ہوتا چلا آ رہا ہے۔ایسے رسول جن کا ہم نے یہاں قرآن مجید میں نام لے لیا' ایسے بھی ہیں کہ جن کا ہم نے یوں ذکر نہیں کیا ہے۔ قرآن حمید کہتا ہے ہم نے ہر قوم کے اندر اپنے رسول بھیجے تھے۔ باقی رہا یہ کہ وہ جو نتیجہ ہے وہ رسول خود برآمد کر لے' کسی رسول کے ساتھ یہ نہیں ہوا۔ یہ اقتدار' یہ اختیار' یہ قوت' کسی رسول کو بھی حاصل نہیں تھی۔ وہ تو قانونِ خداوندی کے مطابق ہی وہ نتیجہ برآمد ہوتا تھا۔ وہاں بھی یہی ہوا تھا' تمہارے ساتھ بھی یہی ہوگا۔

قرآنِ حکیم کے انسانی اعمال کے نتائج کو سامنے لانے کے طریق کی وضاحت: نظامِ ربوبیت اور انسان کے وضع کردہ نظام کی مثالوں سے

کہا ہے کہ فَاِذَا جَآءَ اَمۡرُ اللّٰہِ قُضِیَ بِالۡحَقِّ وَخَسِرَ ھُنَالِکَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ (40:78) جب خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق وہ آخری وقت آ جاتا ہے کہ جب کشتی نے ڈوبنا ہوتا ہے پھر اس وقت یہ حقیقت مرئی اور محسوس طور پر سامنے آ جاتی ہے۔ اور وہاں پھر یہ جو باطل کے نظام والے ہیں' نظر آتا ہے کہ ان کی کیسے تباہی ہوئی' کتنا ان لوگوں کا نقصان ہوا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ نظری حقائق بیان کرتا ہو اور میان میں اس کے اثبات کے لیے جو مرئی' محسوس' مثالیں بیان کرتا ہے' وہ خارجی کائنات کی ہوتی ہیں۔ کہا ہے کہ تم ہماری ربوبیت کا قانون دیکھنا چاہتے ہو تو وہ تم دیکھو کہ اَللّٰہُ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَنۡعَامَ لِتَرۡکَبُوۡا مِنۡھَا وَمِنۡھَا تَاۡکُلُوۡنَ [40:79] وَلَکُمۡ فِیۡھَا مَنَافِعُ وَلِتَبۡلُغُوۡا عَلَیۡھَا حَاجَۃً فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ وَعَلَیۡھَا وَعَلَی الۡفُلۡکِ تُحۡمَلُوۡنَ (40:80)۔ یہ پوچھتے ہیں کہ خدا کے اس نظامِ ربوبیت کی نشانیاں کیا ہیں' علامات کیا ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ یہ علامات کے طور پر تمہارے ہاتھ سے کچھ معجزے دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ معجزات تو بکھرے پڑے ہیں۔ کہا کہ انسانوں کو پیدا کیا۔ ذرا سوچیے! کہتا ہے کہ انسان پیدا ہوئے' اگر ان کے ساتھ یہ جتنے جانور ہیں' یہ سارے بھیڑیئے پیدا ہو جاتے۔ گائے' بھینس' گھوڑا' بکری' بھیڑ' کی بجائے بھیڑیئے ہی سارے ہوتے تو انسانوں کا کیا حشر ہوتا۔ یہ اسی پہ نہیں دیکھتے کہ یہ کتنا ہمارا نظامِ ربوبیت ہے کہ انہیں پیدا کیا تو اس کے ساتھ گائے' بھینس' گھوڑے' بکریاں' پیدا کیں۔ یہ سارے اس کے کام آتے ہیں' اس کی پرورش کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس کی تخریب

کا ذریعہ نہیں بنتے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ خدا کا کتنا بڑا انعام ہے۔ اس لیے کہ اس نے جوان کی پرورش کا ذمہ لیا تھا' وہ نظام ایسا پیدا کیا ہے کہ ان سے تم کتنے فائدے اٹھاتے ہو' ان پہ سوار ہوتے ہو' ان کا گوشت کھاتے ہو' ان کا دودھ پیتے ہو۔ اور پھر وہ کشتیاں ہیں جن پہ سوار ہوتے ہو۔ کہا کہ یہ کہتے تھے کہ اس کی کچھ نشانیاں دکھانی چاہئیں۔ کہا کہ وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ (40:81) دیکھو تو سہی' یہ اس کے نظامِ ربوبیت کی کتنی محسوس نشانیاں ہیں۔ فَاَیَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ (40:81) کہو تو سہی انکار کر سکتے ہو تم ان نشانیوں کا؟ یہ ہیں اس کے صحیح نظام کی نشانیاں۔ ایک تمہارا باطل کا نظام ہوتا ہے کہ جس میں

قیامت ہے کہ انساں نوعِ انسان کا شکاری ہے

ایک یہ ہمارا نظام تھا اور ہے جو تمہاری ربوبیت کا تھا اور ہے۔ ایک وہ تمہارا نظام ہوتا ہے کہ

دانہ ایں می کارد ' آں حاصل بُرد
اُمّتے بر اُمّتے دیگر چرد

ایک قوم دوسری قوم کو کھائے جا رہی ہے' بوتا یہ ہے کاٹتا وہ ہے۔ اور ایک ہمارا نظام ہے کہ تمہیں بھیجا ہے بغیر تمہاری مرضی اور ارادے کے یہ سارا سامانِ نشوونما ہم نے پیدا کر دیا ہے۔ دیکھتے ہو دونوں نظاموں میں کتنا فرق ہے!

اب آگے بات آ گئی کہ رسول بھی پہلے سے آتے رہے' قومیں بھی پیدا ہوتی رہیں۔ وہ باطل کا نظام بھی انہوں نے قائم کیا' وہ بڑا شان و شوکت و عزت و حشمت کا بے نظیر نظام تھا' روما کی سلطنت کی تہذیب اور ایران کی ملوکیت کی تہذیب اس کی بڑی مثالیں ہیں۔ ہزار ہا سال سے وہ اس قسم کی بڑی بڑی تہذیبیں چلی آ رہی تھیں۔ اور بھی دنیا میں بڑے بڑے نظام قائم ہوئے۔ قرآن کریم اس کے بعد تاریخی شواہد کو پیش کرتا ہے۔ اور یہ بڑی اہم چیز ہے۔ کہتا ہے کہ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ (40:82) یہ تو ان کے مقابلے میں کچھ شے ہی نہیں ہیں' اُن کی تو مملکت کی بڑی وسعت تھی' بڑے ساز و یراق تھے' بڑی دولت و حشمت ان کے پاس تھی۔ یہ زمین کے خزانے کھود کھود کر نکالنے والی قومیں تھیں۔ یہ اتنی اتنی بڑی قومیں تھیں۔ پھر کیا ہوا انجام ان کا؟ کہا کہ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (40:82) اس کے باوجود چونکہ وہ باطل کے نظام کی بنیادیں کمزور تھیں' جب وہ اپنی چھت کے بوجھ سے نیچے آ کر گری ہیں تو ان کو کوئی بچا ہی نہیں سکا۔ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا (40:82) تم چلتے پھرتے ہو ناں' جن راستوں پہ تم چلتے ہو' وہاں راستوں میں ان قوموں کے تباہ شدہ مساکن کے کھنڈرات تمہیں ملتے ہیں۔ دیکھتے نہیں ہو تم ان کو کہ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (40:83) صحیح نظام کی طرف دعوت دینے والے رسول آئے۔ انہوں نے آ کر کہا کہ یاد رکھو! تمہاری تہذیب اپنے

ہاتھوں سے آپ خودکشی کرے گی۔تم اس پہ مسکرا دیئے' تم نے ان کا استہزا کیا' مذاق اڑایا کہ ہائیں! ہمیں کوئی نہیں چھیڑ سکتا ہے۔ یہ تو اُس دَور کے شہنشاہوں کی خام خیالی تھی۔ وہ مملکتیں تباہ ہوگئیں۔

عزیزانِ من! یہ ہمارے دور میں جو تباہ ہونے والے بادشاہ وغیرہ ہیں' ان کے تباہ ہونے سے چند دن پہلے کے ان کے اقوال دیکھیے۔ کہتے ہیں کہ ''یہ کس کی جرأت ہے جو ہمارے خلاف یہ کچھ کردے!'' ہر ایک یہی کہتا تھا۔ کہا کہ ان کی بھی یہ صورت تھی کہ رسول ان سے آ کر یہ کہتے تھے اور وہ مذاق اڑاتے تھے: ''کیا کہتے ہو! ہم تباہ ہوجائیں گے' کس کی جرأت ہے جو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے''۔ کہا کہ یہ تھا ان کے ہاں کا طریق اور فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ (40:84) جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا تو چلاّ اُٹھے اور کہنے لگے کہ ہم خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے جو قرآن کریم نے بتائی ہے؟ ان کے پاس دولت ہے' حشمت ہے' قوت ہے' سلطنت ہے' مملکت ہے' نظام ہے تو پھر وہ کونسی چیز تھی جس کی وجہ سے یہ تباہی آئی؟ ہمارے ہاں یہ جو آجکل کی تہذیب آئی ہے' جسے عام طور پہ تہذیبِ مغرب کہا جاتا ہے' اب تو مغرب کیا مشرق کیا! سب کا ایک ہی حال ہے' اس کے بارے میں کیا خوب کہا ہے:

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
مشرق کے ثوابت ہوں یا مغرب کے سیّار

اس سے ساری دنیا ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ (30:41) ہے' برّ و بحر میں کوئی علاقہ بھی اس کی ناہمواریوں سے بچا ہوا نہیں ہے۔ کہا کہ یہ کیا چیز ہے جس سے اِن ناہمواریوں نے جنم لیا ہے؟ اس کو کہتے ہیں سیکولرازم کا نظام یعنی یہ نظام کہ جس میں انسان خود اپنے لیئے' اپنی معاشرت کے لیئے' اپنی سوسائٹی کے لیئے' آپ قوانین بنا سکتا ہے۔ یہ ان قوانین کے مطابق حکومت کا نظام قائم کر لیتا ہے۔ ان کے ہاں کی تنہا فکر' آخری عقلِ انسانی یہاں تک پہنچی ہے کہ انسانوں کی جماعت' قوم کے نمائندے' اکٹھے ہوکر' کوئی قانون بنالیں وہ جو کچھ بھی ہے' بہترین قانون ہے۔ یہ انسانوں کے قانون ہیں اور انسانوں کے ہاتھوں سے بنے ہیں۔ وہ عقل یہاں تک چلی ہے۔ یہ جو انسانی عقل کے وضع کردہ قوانین ہیں تو یہ بات قوانین کی نہیں ہے بلکہ اصل میں نظریہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی' یہی طبعی زندگی (Physical Life) ہی ہے' جس میں بقول اکبر الہ آبادی (1846-1921ء)

بی اے کیا' نوکر ہوئے' پنشن ہوئی اور مر گئے

قصہ ختم ہوا۔ یہ ہے زندگی کا اصل تصور جس پر اس نظام کی یہ بنیاد اُٹھی ہے۔ یہ وہی ہے جسے آپ کہتے ہیں کہ عقلِ انسانی سب کچھ کرسکتی ہے۔ وہ انسان سے ماروا کسی ہستی کو مانتے نہیں ہیں اور انسان کی زندگی کو اسی طبعی دنیا کی زندگی مانتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں سیکولرازم۔ اس

کے اندر قوت‘ دولت‘ اسلحہ‘ تدبیریں‘ ان ساری چیزوں پہ توجہ رہتی ہے۔ اگلی بات غور سے سنیے! جسے اقدار (Values) کہتے ہیں‘ وہ اس میں نہیں ہوتیں۔ یعنی ’’ایک بات سچائی کے ساتھ ہم نے کرنی ہے‘‘ یہ نہیں ہے۔ کرنی ایسے ہے جس میں ہماری کامیابی ہو جائے خواہ کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے۔ کامیاب سیاستدان وہ ہے جو دوسرے سے اپنی منوالے۔ کیسے منواتا ہے‘ کیا کہتا ہے‘ کتنا جھوٹ بولتا ہے‘ کتنے فریب دیتا ہے‘ کچھ نہیں۔ چاہت یہ ہے کہ صرف اس کا مجسمہ کھڑا ہو جائے گا۔ یہ ہے انسانوں کے وضع کردہ آج کے نظام کی صورتِ حال۔

عقل وفکر سے ماوراقرآنی اقتدار کی قدر ومنزلت اقدار کی عملی شکل میں نکھر کر سامنے آجاتی ہے‘ سیکولرازم میں نہیں آتی

یہاں سیکولر نظام میں Values (اقدار) کہیں درمیان میں نہیں آتیں۔ یہ Values (اقدار) انسانیت کی سطح کی بات ہے‘ حیوانوں کی سطح میں اقدار نہیں ہوتیں۔ بیل اپنے گاؤں سے نکلتا ہے‘ بھوکا ہوتا ہے‘ سامنے جو سب سے پہلے کھیت آجاتا ہے‘ اس میں چرنے لگتا ہے‘ خواہ وہ اپنے مالک کا ہو یا کسی غیر کا ہو۔ اس کو پیٹ بھرنے سے غرض ہوتی ہے۔ اقدار کے معنی یہ ہیں کہ انسان آئے تو وہ یہ دیکھے کہ نہ بھئی! یہ میری نہیں ہے‘ کسی اور کی ہے۔ اس لیے کسی اور کے اوپر سلب ونہب‘ صحیح نہیں ہے۔ اسے قدر کہتے ہیں۔ سیکولرازم کے اندر اقدار نہیں ہوتیں‘ طبعی مفاد ہوتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ سب سے بڑا محبّ وطن (Patriot) وہ ہوتا ہے جو اپنی قوم کے مفاد کا تحفظ کرے۔ کس طریقے سے بھی کرے‘ اُسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ یہ جو قرآن حمید نے کہا ہے کہ ان کے پاس بڑی قوت تھی‘ بڑی دولت تھی‘ بڑے ذرائع تھے‘ آبادی کی بھی کثرت تھی‘ اس کے باوجود وہ تباہ ہوئے تو وہ کونسی چیز نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ تباہ ہوئے؟ ان کے پاس اقدار (Values) نہیں تھیں۔

عزیزانِ من! اب قرآن حمید کی رو سے بات یہ ہوئی کہ کسی نظام کی کامیابی اور کامرانی جانچنے کا صرف یہی طریقہ ہی نہیں ہے کہ اس کے پاس دولت‘ حشمت اور قوت کتنی ہے۔ یہ ہے تو اسی طرح نہایت ضروری‘ جس طرح طبعی زندگی کے اندر سانس لینا ضروری ہے‘ سانس نہیں لیں گے تو موت واقع ہو جائے گی۔ دولت وقوت اس لیے ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ اگر اقدارِ خداوندی بھی موجود ہیں تو پھر اس نظام کی بنیادیں مستحکم اور محکم ہونگی۔ اگر یہ اقدار نہیں ہیں‘ سیکولرازم ہے تو وہ تباہ ہو کر رہے گا۔ اس میں اس کا سوال ہی نہیں ہے کہ وہ جو سیکولرازم ہے‘ غیر مسلموں کا ہے یا مسلمانوں کا ہے۔ اگر کوئی قوم زبان سے اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتی ہے اور اقدار کا زبان سے کہتی بھی رہتی ہے مگر ان کے اپنے نظام میں ان اقدار کا کوئی دخل نہیں ہوتا تو وہ تو اسی سطح پہ ہی نہیں بلکہ ان سے بھی گئی گزری سطح پہ ہوتی

ہے۔ان کے ساتھ منافقت بھی شامل ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! یہ جو سیکولرازم کا نظام ہوتا ہے اس میں یہ اقدار نہیں ہوتیں۔ میں آپ کو دو ایک حوالے دیتا ہوں۔قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود فرق کیا ہوتا ہے۔کہا کہ وہ جو پہلی قومیں تباہ ہوئی تھیں' جن کے کھنڈرات سے تم دن رات گزرتے ہو وہ کوئی ایسی ویسی قومیں نہیں تھیں وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ (46:26) جس قدر جاہ وجلال اور غلبہ واقتدار اُنہیں حاصل تھا' ویسا تمہیں بھی حاصل نہیں' جتنا تمکن انہیں حاصل تھا تمہیں بھی حاصل نہیں ہے۔وہ تمکن میں بہت آگے تھیں۔یہ بھی نہیں کہ وہ جاہل تھیں یا یونہی وحشی تھیں۔وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً (46:26) علم وفضل بھی ان کے پاس تھا' ان کے پاس تہذیب بھی تھی' متمدن بھی تھیں۔سمع اور بصر اور افئدہ' علم ودانش کے یہ تین ہی تو ذرائع ہوتے ہیں' یہ تین ہی تو چیزیں ہوتی ہیں یہ انہیں حاصل تھیں' لیکن یہ تینوں چیزیں عقلِ انسانی سے متعلق ہیں۔میں نے کہا ہے کہ جو اگلی بات ہے وہ یہ ہے کہ یہ جو اقدار ملتی ہیں یہ فکر اور عقلِ انسانی سے ماوراسرچشمہ ہے جس کو آپ وحی کہتے ہیں' یہ وہاں سے ملتی ہیں' سیکولرازم میں یہ نہیں ہوتیں۔

کرۂ ارض پر تہذیب وتمدن سے آراستہ قوموں کی تباہی کا بنیادی سبب قرآنی بصیرت سے محرومی تھی

قرآن حکیم بتاتا ہے کہ عقلِ انسانی کی یہ ساری چیزیں تو ان کے پاس تھیں لیکن فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (46:26) فکرِ انسانی سے ماوراسرچشمے سے جو وہ ہدایت ملی تھی جب انہوں نے اس کے خلاف کٹ حجتیاں کیں۔يَجْحَدُوْنَ کے معنوں میں ایک تو وہ انکار کرنا ہوتا ہے اور ایک کسی کے ساتھ کٹ حجتیاں کرنا ہوتا ہے۔تو یہاں يَجْحَدُوْنَ کے معنی ''کٹ حجتیاں کرنا'' ہے۔کہنے لگے کہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جو اقدارِ خداوندی تھیں وہ نہ صرف یہ کہ ان پہ عمل نہیں کرتے تھے بلکہ جب وہ ان کے سامنے پیش کی جاتی تھیں تو وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (46:26) وہ ان کا مذاق اڑاتے تھے کہ ہیں ہیں! ہم نے دیانتدار بن کر بھی دیکھ لیا' کچھ نہیں بنا۔وہ یہ بھی کہتے تھے کہ امانت بڑی چیز ہے لیکن دیکھا کہ کاروبار کیسے فیل ہوا ہے۔وہ یوں مذاق اڑاتے تھے۔ان پر مفاد پرستی کے جذبات غالب تھے جس کی وجہ سے قوانینِ خداوندی کی مخالفت کرتے تھے' گویا ان کے ہاں اقدارِ خداوندی نہیں تھیں۔یہاں یہ چیز پہلے کہی ہے اور دوسری جگہ بنیادی حقیقت بیان کر دی کہ جب عقلِ انسانی' وحی کی روشنی میں کام کرے تو اس کے نتائج بڑے خوشگوار ہوتے ہیں لیکن جب انسان اپنے جذبات سے مغلوب ہو جائے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے اور اس کی عقل ودانش ماؤف ہو جاتی ہے' جس طرح نشے کی حالت میں وہ ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے۔یہ ہے تہذیب و تمدن سے آراستہ قوموں کی تباہی کا بنیادی سبب۔

اصل سوال مرنے کے بعد صرف زندہ ہونے کا نہیں بلکہ یہاں کی تمدنی زندگی میں بدعملیوں کی گرفت کا ہے

عزیزانِ من! میں پھر عرض کردوں کہ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ یہ جو حیاتِ آخرت ہے' یہ ہے دین کی اصل و بنیاد تو اسے غور سے سنیے۔ یہ زندگی کا کوئی Biological (حیاتیاتی) مسئلہ نہیں ہے کہ مرنے کے بعد مردہ بھی زندہ ہوسکتا ہے۔یعنی یہ کوئی یونہی سائنس کا فارمولا نہیں ہے' ہوجاتا ہے تو کیا' جو نہیں ہوجاتا تو کیا۔اگر بحث اتنی ہی ہے کہ اگر وہ مان لے کہ ہاں صاحب! مرنے کے بعد بھی مردہ زندہ ہوجاتا ہے تو فرق کیا پڑتا ہے۔ایک کہتا ہے نہیں ہوتا' دوسرا کہتا ہے وہ ہوجاتا ہے اِس اتنے سے جواب سے فرق کیا پڑتا ہے۔دراصل قرآن مجید نے حیاتِ آخرت پہ جو اتنا زور دیا ہے تو اس کا سارا نظام اسی بنیاد کے اوپر استوار ہے۔اصل یہ چیز ہے کہ اس زندگی کے اندر یہ جو غلط کوش اور غلط کار لوگ ہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں' انہوں نے اگر ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ ان کی گرفت نہ ہوسکے تو ان کے ہاں اس کی کوئی پاداش نہیں ہوتی' اس کی ان کو کوئی سزا ہی نہیں ملتی۔اگر وہ اقتدارِاعلیٰ کے حاکم ہیں جن کو Sovereignty (اقتدارِ مطلق) کہتے ہیں تو اس کے معنی Accountability to none (کسی کے سامنے جواب دہ نہیں کے) ہیں یعنی کوئی ان سے باز پرس نہیں کرسکتا۔ یہ جو مادہ پرستی' دنیاداری' کہتے ہیں لوگوں کے ذہنوں میں نہیں آتا کہ ہم یہ کیا لفظ بول رہے ہیں۔اصل یہ چیز ہوتی ہے' یہ ایسا تصور ہوتا ہے کہ جو میں کرتا ہوں' سوسائٹی کے انتظام کی جو چیزیں ہیں' میں ان کی گرفت میں نہیں آتا یا جس کو Sovereignty (اقتدارِ مطلق) حاصل ہے وہ تو اس سے ہوتا ہی بلند ہے کہ مجھے کوئی پوچھ نہیں سکتا۔یہ ہے اصل چیز جس کو آپ مادہ پرستی یا سیکولرازم کہتے ہیں۔اس کے لیے جو چیز ہے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے' وہ اس سے یہ معنی لیتے ہیں۔

قرآنی نظامِ حیات یا قرآنی اقدار پر ایمان اور سیکولرازم میں بنیادی فرق کی وضاحت

عزیزانِ من! اس پہ قرآن کریم کہتا ہے کہ تمہاری بدعملیوں پر یہ سوال نہیں ہے کہ کوئی پوچھ نہیں سکتا۔تم مر گئے ہو تو اپنی بدعملیوں کے عواقب سے چھوٹ گئے۔سوال یہ نہیں ہے۔تم سے یہ پوچھا جائے گا اور اس پوچھنے کے لیے زندگی کا خاتمہ یہیں نہیں ہوجاتا۔اصل چیز اس پوچھنے کی ہے۔یہ ہے وہ ایمان جو سیکولرازم کے مقابلے میں آپ کو اقدار دیتا ہے۔پوچھا یہ جائے گا کہ تم نے فلاں ''قدر'' کے خلاف کیا' فلاں Value (قدر) کو جھٹلایا۔یہ ہے اصل چیز کہ پوچھا جانا ہے۔قرآن کریم نے جو Sovereignty (اقتدارِ مطلق) کے متعلق کہا ہے وہ بات دوسری طرف نکل جائے گی۔اس نے کہا ہے کہ یہ صرف خدا کی ذات ہے جس سے پوچھا نہیں جاسکتا' باقی سب سے پوچھا جائے گا۔تو بات یہ ہوگئی کہ صاحب! یہاں تو دندناتے ہوئے چلے گئے' ظلم کرتے رہے' سلب و نہب کرتے رہے' لوٹتے رہے' مزے کرتے رہے' عیش اڑاتے رہے' کسی نے پوچھا ہی نہیں۔اور پوچھا تو انہوں نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ صاف چھوٹ

گئے تو معاملہ ختم ہوگیا۔ اس نے کہا ہے کہ معاملہ ختم نہیں ہوگیا۔ عزیزانِ من! یہ ہے سیکولر نظام اور اسلام کے نظام میں فرق۔ اول تو وہ یہاں ایسا نظام قائم کرتا ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں کہ کوئی فرد ایسا ہو کہ اس سے پوچھنے والا کوئی نہ ہو۔ یہ ہے قرآنی نظامِ حیات اور اگر ایسا انتظام کرلیا جائے کہ کوئی اس سے پوچھنے ہی نہ پائے تو یہ ہے سیکولرزم کا نظامِ حیات۔

خالقِ کائنات کی طرف سے حضور نبی اکرم ﷺ انسانیت کے امام کے لیے خدا تعالیٰ کا ارشاد اور انسان کا اپنے ہی مفاد پرستی کے جذبے کے آگے جوابدہ ہونا

کائنات کی بلند ترین ہستی جو واجب الاحترام ہے ان ﷺ کی زبان سے قرآن حکیم نے یہ کہلوا دیا ہے۔ حضور ﷺ قرآن حکیم میں یہ فرماتے ہیں کہ تم تو ایک طرف رہے' اگر میں بھی خدا کے کسی قانون کی معصیت کروں تو میں بھی اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتا۔ یہ ہے اسلام کا نظام۔ اور یہ ہے آخرت پر ایمان۔ اب یہ سنیے کہ قرآن حکیم کیا کہتا ہے۔ بات تو بڑی لمبی اور بڑی عجیب ہے۔ کہا ہے کہ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (45:22) یہ سارا کارگہٗ کائنات اس لیے ہم نے بنایا ہے کہ ہر فرد کو اس کے عمل کا بدلا مل کر رہے۔ یہ کائنات تو اس کام کے لیے گردش میں ہے۔ فرمان الٰہی ہے کہ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (45:23) جو شخص اپنے مفادات کو' اپنا خدا بنالے تو پھر اس کے بعد اس کی آنکھ' کان' دل' قلب' اس کو کوئی کام نہیں دیا کرتا۔ یہ اس کے اوپر ایسے چھا جاتے ہیں جیسے نشے میں انسان ان سے کام ہی نہیں لے سکتا' وہ بدمست ہوجاتا ہے۔ قوت کا نشہ اس کو بدمست کردیتا ہے' ان کے کانوں پر اور دل پر مہریں لگ جاتی ہیں' ان کی آنکھوں پر اُسے نہ کچھ سنائی دیتا ہے' نہ دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی اس کی سمجھ بوجھ کچھ کام کرتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ عَلٰى عِلْمٍ یعنی علم ہونے کے باوجود' کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جذبات کا نشہ ان چیزوں کو معطل کرکے رکھ دیتا ہے۔ تو جب وہ اپنے پہ ایسی کیفیت طاری کرلے تو فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ (45:23) پھر اس کے بعد کون اس کو صحیح راستہ دکھائے گا۔ اس نے تو خود ہی اپنی آنکھوں کے اوپر پردہ ڈال رکھا ہے۔ اس اندھے کو کون صحیح راستہ دکھائے گا۔ کہا کہ اگلی جو بات ہے کہ یہ ایسا کیوں کرتا ہے کہ یہاں کے ہی مفاد کو اپنا الٰہ ' خدا' بنالیتا ہے؟ وہ اگلی بات یہ ہے کہ میری یہ بازپرس میرے اسی مفاد پرستی کے جذبے نے کرنی ہے کہ ''کیوں بھئی! وہ حاصل کیا یا نہیں' وہ لوٹ کے لائے ہو جو صبح کہتے تھے کہ میں لینے جا رہا ہوں''۔ بس یہی میرا مفاد پرستی کا جذبہ مجھ سے پوچھے گا۔ میں اسی جذبے کے سامنے جواب دہ ہوں۔

جہانِ فردا سے لاتعلقی کی بنیادی وجہ اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے سے انکاری ہونے میں ہے

کہا کہ یہ اس لیے ہے کہ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ (45:24) ان کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے' اس کے بعد کچھ نہیں۔ یہاں ہمیں زمانے کے مرور نے مار دیا' ہمارے ہاں کے جسم کی Disintegration ہوگئی تو معاملہ ختم ہوگیا۔ کہنے لگے یہ ہے وہ چیز جس کی بنا پہ یہ علم رکھنے کے باوجود اقدار کے منکر ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ بات ہو کہ یہاں سے چھوٹ نہیں سکتے' بات آگے بھی چلنی ہے تو پھر یہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ آپ نے دیکھا کہ یہ جو قومیں جن کو قرآن حمید سیکولرزم کہتا ہے یہ کیا ہوتی ہیں؟ یہ ہے ان کے ہاں ایمان کا نہ ہونا کہ میرے ہر عمل کا بلکہ دل میں گزرنے والے خیالات اور نگاہوں کی خیانت کا بھی محاسبہ ہونا ہے' مجھ سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا' اس کے نتائج بھی مجھے بھگتنے پڑیں گے۔ یہ ہے صحیح نظام کی بنیاد۔ اور اگر یہ عقیدہ نہیں ہے تو آپ اپنے آپ کو ہزار مسلمان کہیے' لاکھ نمازیں پڑھتے چلے جایئے' اسلام کو اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ ہے بنیاد اس نظام کی۔ کہا کہ ان کے ہاں ان قوموں کی صورت یہ تھی' یہ جن کے اجڑے ہوئے کھنڈرات کی ٹھیکریوں پہ ان کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں جو تم پڑھتے ہو' یہ تھا ان کا عقیدہ جس نے ان کو تباہ کیا ہے۔

ظہورِ نتائج کے وقت انسان کی لاچار زبوں حالی کی کیفیت اور قرآن حکیم کا فیصلہ

اب وہ بات سامنے آئی کہ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا (40:84) جب وہ تباہی ان کے سامنے آئی قَالُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ (40:84) کہا کہ پھر ان کے حوصلوں کی' ان کی ہمت کی' کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ویسے تو پھنے خاں بنے ہوتے ہیں لیکن جب تباہی سامنے آتی ہے تو اس وقت ان کی بزدلی کا عالم ہے کہ فرعون کی طرح پکار اٹھتے ہیں کہ میں ایمان لایا' ایمان لایا۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ ''فٹے منہ'' (تُف! لعنت تجھ پر):

در کفر ہم پختہ نہ زنّار را رسوا مکن

او! ایمان میں تُو پختہ نہیں تھا تو کفر میں تو پختہ رہ۔ کہتا ہے ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ جو بڑے بڑے ڈکٹیٹر بنے پھرتے ہیں' یہ بڑے بزدل ہوتے ہیں۔ ذرا موت ان کے سامنے آئے پھر دیکھیے! ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا (40:85) یہ جسے آپ توبہ کہتے ہیں' وہ اس لیے ہوتی ہے کہ اگر ابھی اس کا موقع ہو کہ تم اپنے اچھے اعمال سے اپنے غلط اعمال کے تباہ کن نتائج کا ازالہ کر سکو تو اس میں تو اس کو توبہ کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ جب اس کا موقع ہی نہ رہے تو اس کے بعد تم ہزار کہتے رہے کہ استغفر الله ربی من کل ذنب تو فائدہ ہی کچھ نہیں۔ اب تو موقع رہا ہی نہیں ہے کہ تم اس کا ازالہ کر سکو۔ یہ مہلت کا وقفہ اس لیے ملتا ہے کہ ازالہ کر سکو۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا (40:85) جب سامنے تباہی آ جائے

تو پھر یہ گڑ گڑاہٹ کوئی کام نہیں دے سکتی' مہلت کا وقفہ ختم ہو گیا۔

عزیزانِ من! آگے وہ بات ہے جو رسول اللہ ﷺ سے کہی تھی کہ نئی بات نہیں ہے' نہ تم نئے رسول ہو' نہ یہ قوم نئی ہے' نہ یہ دشمنیاں اور تزاحم نئے ہیں' یہ تو ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اور نہ ہی ان کی یہ تباہیاں کوئی نئی یا ہنگامی چیزیں ہیں۔ سُنَّتَ اللّٰـهِ الَّتِیۡ قَدۡ خَلَتۡ فِیۡ عِبَادِهٖ (40:85) یہ خدا کی ایک روش ہے' جو اس کے بندوں میں شروع سے چلی آرہی ہے' ہمیشہ اس کی یہی روش رہے گی۔ یہ ہے سُنَّتَ اللّٰهِ۔

کلمت اللہ اور سنت اللہ میں فرق کی وضاحت

عزیزانِ من! ایک تو قرآن مجید نے کلمت اللہ کہا ہے کہ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ (10:64)۔ یہ جو سنت اللہ ہے میں آپ کو دو ایک ریفرنسز (حوالے) دیدوں جس میں یہ کہا ہے کہ ان میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ کلمت اللہ میں بھی آپ نے دیکھا کہ تبدیلی نہیں ہوتی۔ ابھی عرض کروں کہ دونوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ کہا کہ فَهَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا سُنَّتَ الۡاَوَّلِیۡنَ فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبۡدِیۡلًا ج وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِیۡلًا (35:43) خدا کی یہ جو روش ہے' اس کے اندر کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ تبدیلی تو ایک طرف رہی' یہ بھی نہیں ہوتا کہ اس کا رخ ہی کسی دوسری طرف ہو جائے۔ ٹھیک نشانے پہ جا کر لگتی ہے۔ کلمت اللہ بھی غیر متبدل ہوتے ہیں' سنت اللہ بھی غیر متبدل ہوتی ہے۔ ریفرنسز لکھ لیجیے: (33:62;17:77)۔

عزیزانِ من! کلمت اللہ ہے کہ جب خدا کا قانون نظری طور پر ہو۔ جو خدا کا Law (قانون) ہے وہ In Letters (بہ شکل حروف' نظری طور پر) ہو۔ اور جب وہ عملاً (In Practice) ہو جائے تو اسے سنت اللہ کہتے ہیں۔ Law جو ہے الفاظ کے اعتبار سے' وہ بھی غیر متبدل ہے۔ اور اس کے بعد اس قانون کی رو سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے' یہ بھی غیر متبدل ہوتا ہے۔ وہاں تک (نظری طور پر) وہ کلمہ کہلاتا ہے اور جب وہ عمل میں آکر نتائج برآمد کرتا ہے تو یہ سنت اللہ ہوتی ہے۔ نہ کلمت اللہ میں تبدیلی ہوتی ہے' نہ سنت اللہ میں تبدیلی ہوتی ہے۔ اسی لیے کہا ہے کہ قَدۡ خَلَتۡ فِیۡ عِبَادِهٖ (40:85) شروع سے آخر تک کوئی تبدیلی نہیں۔ اور اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وَخَسِرَ هُنَالِکَ الۡکٰفِرُوۡنَ(40:85) اس سے انکار کرنے والے ہمیشہ نقصان میں رہتے ہیں۔

باطل نظام کی ابدی ناکامی کے برعکس سنت اللہ کا نفاذ اور ''انسان نے کیا سوچا'' کی ایک حقیقت

یہ بات جو اس نے کہی ہے کہ یہ سنت اللہ ہے' اب ہم تو اس کو صرف اپنے عقیدے کی بنا پہ کہہ سکتے ہیں کہ جی! خدا کے احکام یا اقدار کی خلاف ورزی کرنے سے یہ ہوتا ہے' یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ اور ہم کہیں گے کہ ہمیشہ ہوتا ہے' اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔ وقت تو تھوڑا ہے لیکن میں دو ایک ریفرنس (حوالے) ضرور دونگا۔ یعنی یہ جو چیز ہے کہ جس نظام کی بنیاد باطل پر اٹھتی ہے' وہ ہزار ہا اپنی تدبیروں کے

باوجود قائم نہیں رہ سکتا' تباہ ہوجاتا ہے۔ یہ تو ہوئی سنت اللہ۔ یوں کہیے کہ عقیدے کی رو سے ہم اسے مانتے ہیں۔ غیر مسلم اقوام کے بڑے بڑے دانشور بھی کہتے ہیں کہ یہ سنت اللہ ہے اور اس کے خلاف کبھی نہیں ہوتا۔ عزیزانِ من! ہم تو بس یونہی زبان سے ہی کہہ دیتے ہیں۔ میری کتاب ہے "انسان نے کیا سوچا" ❶۔ اللہ کبھی توفیق دے تو اسے پڑھ چھوڑیئے گا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ ایک کتاب آپ کے ہاں کے کالجز کے نصاب میں' اوپر کی کلاسز کے اندر' کہیں آ جاتی تو ہماری نئی نسل آج کچھ اور ہوتی۔ "انسان نے کیا سوچا" میں بات یہی آئی ہے کہ انسان کو جو اجتماعی طور پر مشکلات آئی ہیں' ان میں فکرِ انسانی نے ان کے حل میں کیا تدبیریں سوچیں اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ اور آخر میں آ کر یہ بتایا ہے کہ آج وہ کہہ رہے ہیں کہ فکرِ انسانی تو ان کا حل نہیں دے سکا' فکرِ انسانی سے ماورا کوئی سرچشمہ علم کا ہے' وہاں سے حل ملے گا۔ اس کتاب میں یہ ہے جو میں نے بتایا ہے۔ یونان کے حکما' بقراط اور سقراط سے لے کر آج تک کے ان تمام بڑے بڑے دانشوروں کے' ان کی اپنی کتابوں کے اقوال' اس کے اندر موجود ہیں۔ اپنی طرف سے میں نے اس میں ایک لفظ نہیں لکھا۔

رابرٹ برفو جیسے مفکر کے الفاظ میں دنیائے انسانیت میں تنہا عقلِ انسانی کی ناکامی کی بنیادی وجہ

رابرٹ برفو کی کتاب کا نام ہے ❷ "The Making of Humanity" (تشکیلِ انسانیت)۔ اس کتاب میں رابرٹ برفو نے رومن امپائر پر لمبی چوڑی گفتگو کی ہے' تہذیبوں پر بحث کی ہے اور ان کا تجزیہ کیا ہے۔ اس کے بعد وہ جس نتیجے پہ پہنچا ہے' سنیے! وہ کیا لکھتا ہے' کیا کہتا ہے؟ یہ کہ

> "انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو' کبھی قائم نہیں رہ سکتا' خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے ❷ (ص۔159)"

---

❶ "انسان نے کیا سوچا" علامہ پرویز صاحبؒ کی یہ کتاب 1956ء میں پہلی مرتبہ زیورِ طباعت واشاعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی تھی اور اب (2002ء) تک اس کے سات ایڈیشن طلوعِ اسلام ٹرسٹ 25-B گلبرگ۔2' لاہور' سے شائع ہو چکے ہیں۔

❷ اس کتاب کا مکمل حوالہ یہ ہے:

Briffault, Robert: The Making of Humanity, George Allen & Unwin Ltd. 1928, PP. 159, 259, 262.

2. No System of human organization that is false in its very principle, in its very foundation, can save itself by any amount of cleverness and efficiency in the means by which the falsehood is carried out and maintained, by any amount of superficial adjustment and tinkering. It is doomed root and branched as long as the root remains what it is. The Roman Empire was.... a device for the enrichment of a small class of people by the exploitation of mankind. The business enterprise was carried out with all the honesty, all the fairness and justice compatible with its very nature and with admirable judgment and ability. But all those virtues could not save the fundamental falsehood, the fundamental wrong from its consequences. Their effects work inexorbaly. (P.159).

دیکھتے ہیں یہ ہے سنت اللہ اور آگے لکھتا ہے کہ

''اس کی بنیادی کمزوری' خارجی نظم وضبط اور اِدھر اُدھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہوسکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لیے تباہی مقدر ہے۔ روما کی سلطنت' عام انسانوں کی لوٹ کھسوٹ سے ایک خاص جماعت کو متمول بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے اس ''سوداگری'' کو نہایت قابلیت اور تدبر' خلوص اور دیانتداری سے چلایا لیکن (حسنِ انتظام کی) یہ تمام خوبیاں' بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا رورعایت نتیجہ خیز ہوکر رہے (ص۔159)''[2]

اس کے بعد وہ Values (اقدار) کے متعلق لکھتا ہے کہ

''اگر انسان بادلوں سے اونچا اڑنے لگ جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی ہی بلند ہوگئی ہے۔ نہ ہی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار کے معنی ترقی ہیں۔ انسان اگر ستاروں کو تولنے کے قابل بھی ہوجائے اور علوم وفنون کے وسیع میدانوں میں گھوڑے دوڑانے لگ جائے تب بھی اس کے جوہرِ ذاتی میں قلبِ ماہیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ انسانی معاملات اس سے کہیں گہرے ہوتے ہیں۔۔۔قوت' تہذیب' کلچر' بے معنی چیزیں ہیں اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں۔ وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدروقیمت ماپی جاسکتی ہے' اخلاقی پیمانہ ہی ہے (ص۔259)''❶

اور اس قسم کے باطل نظام کے مآل کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ

''وہ نظامِ تہذیب جس میں حق وصداقت کو عادی طور پر نظرانداز کر دیا جاتا ہو آخرالامر تباہ ہوکر رہتا ہے۔ ناانصافی سے کوئی فرد کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے' وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے' اس ناانصافی کی وجہ سے انجام کار برباد ہوجاتی ہے۔ انتخابِ طبعی کے

---

❶ Humanity does not necessarily stand upon a higher plane of being when riding above the clouds, nor does a hundred miles an hour constitute progress; man is not even intrinsically transformed by being able to weigh the stars and disport his mind over wider spheres of knowledge. There is a deeper aspect of human affairs...... Power, civilication, culture count for nought if they are associated with moral evil. The real standard by which the worth of the human world is to be truly computed is a moral standard (P.259).

اٹل قانون کی بنا پر گناہ کی اُجرت موت ہے (ص۔262)"❶

امریکا کے مؤرخ ڈارسے کی نگاہِ بصیرت

عزیزانِ من! ایک اور چھوٹا سا اقتباس بھی ہے۔ یہ امریکا کا مؤرخ❷ جارج اے۔ ڈارسے (George A.Dorsey) ہے اس کی کتاب کا نام "Civilization" ہے۔ یہ چند الفاظ میں بات کہہ گیا ہے کہ

"(ہماری تباہی کا باعث) نہ تو بڑے بڑے مجرم ہیں، جن سے ہم لرزاں رہتے ہیں۔ اور نہ ہی ہمارا افلاس، جس پہ ہم نادم ہیں۔ (اس کا اصل باعث) وہ معاشرتی نظام ہے جو منافقت اور فریب کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اور (اس کے ساتھ) یہ قانون ہے کہ 'جس کی لاٹھی، اس کی بھینس' اس قانون پر مبنی نظام کے مقدر میں تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا❸ (ص۔870)"

یہ ہے سُنَّتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ قَدۡ خَلَتۡ فِیۡ عِبَادِہٖ (40:85) یہ خدا کا وہ اٹل قانون ہے جو دنیائے انسان میں شروع سے چلا آ

----

❶ What really happens is that the phase of society, the order of things in which disregard of right is habitual and accepted, inevitably deteriorates and perishes. However much the individual may temporarily benefit by iniquity, the social organism of which he is a part, and the very class which enjoys the fruits of that iniquity, suffer inevitable deterioration through its operation. They are unadopted to the facts of their environment. The wages of sin is death, by the inevitable operation of natural selection (P.262).

رابرٹ برفو اپنی اس کتاب The Making of Humanity کے پہلے حصے کا اختتام ان الفاظ پر کرتا ہے کہ

"Throughout the entire course of human culture, the vitality, the power, the energy, the worth, the success of a civilization, mean its sincerity, its honesty of thought". (P.101)

قارئین کی سہولت کے لیے اس کا رواں اردو ترجمہ درج ہے: "انسانی کلچر کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ کسی تہذیب کی قوت، توانائی، زورِ دروں، اس کی قدر و قیمت اور کامیابی و کامرانی کا راز اس کے خلوص اور دیانتِ فکر میں ہوتا ہے"۔

❷ جارج۔اے۔ڈارسے (1869-1931ء) کی یہ کتاب یکم جنوری 1931ء میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آئی اور وہ 6۔ اپریل 1931ء کو فوت ہو گیا۔ اس کی اس کتاب کی طباعت و اشاعت کا مکمل حوالہ یہ ہے:

Dorsey, George.A. (1931). MAN'S OWN SHOW: CIVILIZATION. NEW YORK: Harper & Brothers Publishers.

❸ جارج۔اے ڈارسے کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

It is not criminals that bedevil us or poverty which shames us, but a social order which is founded on hypocrisy and deceit and the infamous rule that possession is nine points of the law, that property is sacred and transmissible, and that mere possession is the mark of divine approval (P.870).

رہا ہے۔عزیزانِ من! دیکھتے ہیں کہ کہاں سے شہادات مل رہی ہیں۔اورآج یورپ اورامریکا کے تمام دانشورکسی ایسے نظام کی تلاش میں چیخ رہے ہیں جوان اقدار کے اوپر مبنی ہو۔میں کبھی اس کے متعلق بھی درس میں عرض کروں گا۔وہ کہتے ہیں کہ

''اس وقت چرچا یہ ہے کہ یہ جو ایٹم بم ہے یہ دنیا کو تباہ کردے گا۔اس نے کہا کہ یہ تو انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارے گا' یہ کوئی تباہی نہیں ہے۔تباہی وہ ہے کہ انسان زندہ رہیں اور تباہ ہوں۔اور یہ تباہی ہمارے غلط نظام کی بنا پہ آئے گی''۔

وہ لکھتے ہیں کہ ''اس میں انسان طبعی موت نہیں مرتا' انسانیت مرجاتی ہے۔اور جب انسانیت مرجائے اور انسان زندہ رہے تو وہ کہتے ہیں کہ اس سے زیادہ عذاب کوئی نہیں ہوسکتا''[1]۔قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیۡ قَدۡ خَلَتۡ فِیۡ عِبَادِهٖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الۡكٰفِرُوۡنَ (40:85) یہ خدا کا وہ اٹل قانون ہے جو دنیائے انسان میں شروع سے چلا آرہا ہے اوراس کا ماحصل یہ ہے کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی کے مطابق چلنے سے انکار کرتے ہیں وہ ہمیشہ نقصان میں رہتے ہیں اور آخرالامر تباہ ہوجاتے ہیں۔۔

عزیزانِ من! سورۃ المؤمن اس آیت پہ ختم ہوگئی۔آئندہ درس ہم اگلی سورۃ سے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ

❀......❀......❀

---

❶ جی۔اے۔پرویزؒ(1903-1985ء) کے الفاظ میں

''زندگی کے اقدار پر یقین نہ رہے تو قلبِ انسانی میں ایک ایسا خلا پیدا ہوجاتا ہے جسے اور کوئی جذبہ پُر نہیں کرسکتا''۔

(پرویزؒ: ''انسان نے کیا سوچا'' طلوعِ اسلام ٹرسٹ' لاہور' 2002'ص۔306)

سورة حٰمٓ السجدة

پہلا باب: سورۃ حٰمٓ السجدۃ (آیات 1 تا 8)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1981ء کی بیس تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی پہلی آیت سے ہوتا ہے۔ یہ 24 ویں پارے کی 41 ویں سورۃ ہے: (41:1)

حروفِ مقطعات کی حقیقت

اس سورۃ کو سورۃ فُصِّلَتْ بھی کہتے ہیں، حٰمٓ بھی کہتے ہیں اور حٰمٓ السجدۃ بھی کہتے ہیں۔ عام طور پر حٰمٓ السجدۃ سے ہی یہ معروف ہے۔ اس کی ابتداء ہی حٰمٓ سے ہوتی ہے۔ حروفِ مقطعات کے متعلق اس سے پیشتر جہاں جہاں بھی یہ آئے میں نے ابتداً عرض کر دیا تھا کہ یہ عربوں کے ادب کا ایک طریق تھا۔ یہ حروف کی Abbreviations (مخففات) ہوتی ہیں۔ وہ ان کو ملا کر ایک لفظ بناتے تھے تو ان حروف سے ہی ان کے معنی لیے جاتے تھے۔ میری بصیرت کے مطابق یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے مختلف حروف ہوتے ہیں جو لکھے جاتے ہیں۔ حٰمٓ سے مطلب ''خدائے رحیم و مجید کا ارشاد ہے۔'' یہ انداز ہے کہ **تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ** (41:2)۔ اس سورۃ کی ابتداء ہی کیسی عجیب ہے کہ یہ چیز کہی ہے۔ اسے پھر دہراؤں کہ حٰمٓ کا مطلب ہے ''خدائے حمید و مجید کا ارشاد ہے'' کہ **تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ** (41:2)۔ جیسا کہ اب میرا خیال ہے کہ یہ چیزیں آپ کو حفظ ہو جانی چاہییں۔

درس اور تنزیل کا قرآنی مفہوم

درس کے معنی کے لیے دَرَسَ الْحِنْطَۃَ کے معنی یاد رکھیے۔ اس کے معنی ہیں گیہوں کو گاہ دینا۔ یہ جو گیہوں کی کٹائی کرتے ہیں اس میں سے دانہ الگ کرنے کے لیے اب تو یہ تھریشر نکل آئے ہیں ورنہ اس سے پیشتر گیہوں کو کاٹ کر زمین پر بچھا دیتے تھے اور اس پہ سارا سارا دن اس دھوپ میں بیل چلاتے رہتے تھے تو وہ پاؤں سے اس کو مسلتے تھے۔ اس سے وہ دانے ان خوشوں سے الگ ہو جاتے تھے۔ یہ جو الفاظ میں چھپے ہوئے معنی کو باہر نکالنے کا طریق ہوتا تھا' عرب اسے درس کہتے تھے۔ اسی طرح یہ طریق جو گاہنے کا تھا' یہاں سے انہوں نے درس اور تدریس کا لفظ بنایا تھا۔ ان لوگوں کی زبان کے اندر کتنی جامع چیزیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سمجھانے کا اس سے بہتر کوئی طریق ہی نہیں کہ وہ جو چھلکا ہے اس سے الگ ہو جائے اور اس میں سے دانے الگ ہو جائیں۔ اور طریق وہ ہے کہ وہ بار بار گھوم کر پھر اس کے اوپر وہ بیل آئے۔ اسے قرآن مجید نے تصریفِ آیات کہا ہے کہ ہم بار بار تکرار سے اس لیے بیان کرتے ہیں تاکہ یہ معنی جو الفاظ کے چھلکوں میں چھپے ہوئے ہیں' وہ اس طرح سے باہر آ جائیں' مغز اور دانے تمہارے ہاتھ میں آ جائیں۔ اسے تدریس کہا جاتا ہے۔

وحی کی بنیادی خصوصیت خارج سے ملنا ہے

قرآنِ کریم نے وحی کے لیے لفظ نزول' جسے انزال بھی کہتے ہیں' استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ اب آپ کو تو معلوم ہوگا کہ یہ وحی کی Objectivity (خارجیت) ہے۔ یہ انسان کے اندر سے خود کوئی علم باہر نہیں آتا' اس کی اپنی فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ یہ Objectively (خارج سے) ہے' باہر سے اس نبی کے اوپر القا ہوتا ہے۔ اب جس کے لیے بھی ان کے ہاں کا یہ لفظ ہے' اس میں نازل ہونا ہے' کوئی چیز جو' باہر سے' اوپر سے' نیچے آئے وہ ہے جسے نزول کہا جائے گا۔ تو گویا یہ جو کہا ہے کہ **مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى** (53:3) یہ جو رسول ہے یہ اپنی فکر سے کچھ نہیں کہتا بلکہ یہ Objectively' خارج سے' ایک علم ہے جو اس کو ملتا ہے اور اس کے لیے یہ نزول کا لفظ ہے۔

وحی کے علاوہ ہر علم انسانی کوشش کا ہی رہینِ منت ہوتا ہے

وحی کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ انسانی فکر کی پیدا کردہ تعلیم نہیں ہوتی بلکہ وہ خارج سے نبی کو ملتی تھی اور یہ صرف وحی کے لیے خصوصیت تھی: خارج سے بغیر کسی درمیانی ذریعے یا Medium (واسطے) کے کسی علم کا ملنا۔ باقی جتنے علوم ہیں وہ انسان کی اپنی کوشش' کاوش' اکتساب کے پیدا کردہ ہوتے ہیں لیکن وحی میں نبی کی اپنی کاوش' محنت' فکر کا دخل نہیں ہوتا تھا اور وہ خارج سے اس کو ملتی تھی۔ اس کے لیے لفظ نزول تھا جو عربی زبان میں آیا ہے۔ وحی کے سوا کوئی اور ایسا علم نہیں ہے جو انسان کو اس طرح سے ملے کہ وہ خارج سے اس کے اوپر نازل ہو اور اس کی اپنی فکر کا دخل نہ ہو۔

الہام اور کشف وغیرہ سب غیر قرآنی تصورات ہیں، ابواب کا ذکر اور الرحمٰن الرحیم کا بھی

یہی وجہ ہے جو میں نے کہا ہے کہ اس کے بعد جو ہمارے ہاں الہام اور کشف کے متعلق کہا کہ وہ باہر سے ایک علم ہے جو ملتا ہے، اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ یہ دوسرے معنوں میں ختم نبوت کو توڑنے کی ایک کوشش ہے۔ قرآن حکیم کے اندر وحی کے علاوہ کوئی شے نہیں ہے، کسی الہام کا، کسی کشف کا، قرآن حکیم کے اندر کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس قسم کا دعویٰ کرنا کہ یہ میری فکر کی پیدا کردہ چیز نہیں بلکہ باہر سے خدا کی طرف سے براہِ راست مجھے یہ علم ملا ہے، غلط ہے، یہ وحی کا دعویٰ کرنا ہے، یہ ختم نبوت کی مہر کو توڑنا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب یہ جو طریق علم ہے، یہ ختم ہو گیا، اب کسی کو کوئی علم اس طرح سے نہیں مل سکتا۔ اب علم قرآن حکیم کے اندر ہے جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی نازل ہوا ہے اور اس کو بھی جو سمجھا جائے گا تو اس کے لیے انسان کی اپنی علمی کوشش ہوگی۔ قرآن حکیم میں کوئی لفظ بھی ایسا داخل نہیں کیا جا سکتا جس کو آپ کہیں کہ یہ وحی ہے۔ اس کو علمِ انسانی کی رو سے سمجھا جائے گا۔ یہ تنزیل ہے۔ عربی زبان میں ایک یہ ہے جسے عرب باب کہتے ہیں یعنی جس وزن سے کوئی لفظ آیا ہے، ہر لفظ کا ایک مادہ (Root) ہوتا ہے۔ یہ اس ایک لفظ کے لیے تو ایک ہی مادہ ان کے ہاں ہوتا ہے، آگے اس کے باب یا اس کے وزن آتے ہیں جو بدلتے جاتے ہیں۔ اس کے اعتبار سے معنی بدلتے جاتے ہیں۔ مثلاً عربی لفظ تنزیل ہے۔ اس کا مادہ ''ن ز ل'' ہوتا ہے۔ اب اس میں یہ جو تنزیل ہے اس کے مادے کے باب کی خصوصیت یہ ہے کہ رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ بتدریج جو کوئی چیز ہو۔ اس آہستہ آہستہ بتدریج ہونے کے لیے یہ تنزیل آتا ہے۔ یعنی یہ نازل ہوا ہے تو یہ نہیں کہ ایک ہی دفعہ ایک ہی دن یہ نازل ہو گیا ہے بلکہ یہ بتدریج آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ نازل ہوا ہے جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے کہ تئیس سال کی عمرِ نبوت میں حضورؐ پر خدا کی طرف سے یہ وحی نازل ہوئی۔ اس لیے یہ تنزیل ہے۔ نازل ہوا ہے اور بتدریج نازل ہوا ہے، آہستہ آہستہ تکمیل تک پہنچا ہے۔ یہ ہے تنزیل۔

یہ کس کی طرف سے نازل ہوا ہے؟ کہا کہ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ (41:2) رحمٰن اور رحیم کی طرف سے۔ اب بیچ میں ذہن میں پھر وہ بات آ جاتی ہے کہ یہ تو شروع میں ہی بسم اللہ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ہے۔ اور اس کے بعد سورۃ فاتحہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ (1:1.2) ہے۔ اس میں رَحۡمٰنِ رَحِيۡمِ آیا ہے۔ اب آپ ان الفاظ رَحۡمٰنِ رَحِيۡمِ کے ترجمے ان کے ہاں کہیں بھی دیکھیں گے تو لکھا ہوگا کہ وہ مہربان، بہت بڑا مہربان ہے۔ یہ تو عام طور پہ ہوا۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! ان کو زیادہ علم نہیں تھا تو پھر کیا کیا جائے؟ درمیان میں بات ضرور آ جاتی ہے: بنتی نہیں ہے مینا و ساغر کہے بغیر۔ یہ کسی جاہل یا مسجدوں کے آئمہ کی بات نہیں ہے کہ انہوں نے الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کا یہ ترجمہ کیا ہے: مہربان بڑا مہربان۔ اس پہ حیرت ہوتی ہے۔

مودودیؒ کی تفسیر میں الرحمٰن، الرحیم کا دیا گیا مفہوم

ہمارے اس دور کے جن کو سب سے بڑا مفکر سمجھا جاتا ہے مرحوم مودودی صاحب ہیں۔ ان کی تفسیر اٹھائیے۔ پہلے ہی صفحے کے اوپر جو یہ رحمٰن اور رحیم ہے، تو وہ کہنے لگے کہ وہ ذرا ایک بات پہ زور دینے کے لیے ایسے کہتے ہیں جیسے ہمارے ہاں لمبا تڑنگا کہتے ہیں، انہوں نے رحمٰن اور رحیم کا مفہوم یہ ''لمبا تڑنگا'' [1] لکھا ہوا ہے، تو یہ جو لفظ کے ساتھ ہوتا ہے اس کو مہمل کہتے ہیں یعنی یہ یونہی ایک لفظ ساتھ ہوتا ہے جیسے تڑنگا، اس کے معنی کچھ نہیں ہوتے کہ جی وہ جو لمبا ہے تو اس کو ذرا زور دینے کے لیے تڑنگا ساتھ کہہ دیا تو رحمٰن اور رحیم کے معنی یہ ہیں، اصل میں تو اس کے معنی وہی مہربان کے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ اس لیے لگا دیا ہے جیسے لمبا کے ساتھ تڑنگا لگا دیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم کے یہ ہمارے اس دور میں معنی بیان ہو رہے ہیں: لمبا تڑنگا۔ کیا کہا جائے!! اقبالؒ (1877-1938ء) نے ہی کہا تھا کہ

تری نگاہ فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ
ترا گنہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ

(بال جبریل)

کھجور کا درخت بہت اونچا ہے، خوشے اوپر لگے ہوئے ہیں۔ کہتا ہے کہ یہ بہت بڑی چیز ہے کہ اتنا اونچا جا کر پھل لگایا ہوا ہے۔ یہ درخت کے اونچے ہونے کا نقص نہیں ہے بلکہ تیرے ہاتھ کی کوتاہی ہے، یہ اس کا نقص ہے کہ یہ وہاں تک نہیں پہنچ سکا۔ لیکن انہیں یہ کیسے اعتراف ہو کہ ہمارے علم کا نقص ہے جو وہاں تک نہیں پہنچ سکا۔ کہا کہ اگر خدا کی طرف اس قسم کی چیز منسوب کی جائے تو کوئی بات نہیں ہے، مولانا صاحب کے خلاف تو نہیں جاتی کہ جو اعتراض ہو کہ وہ جو خدا ہے اس کو تو یہ جو وہ کہنے والا رحمٰن ورحیم کہہ دیا۔ وہ ایسا ہی ہے جیسے ''لمبا تڑنگا'' کہہ دیا صاحب! یہ بات نہیں ہے کہ ہم نہیں سمجھ سکے۔ کیا بات ہے ان کی!!! اور اسے سمجھنے کے لیے کسی وحی کی ضرورت نہیں ہے۔

اعترافِ حقیقت کے راستے میں مقبولیت عامہ کے بُت کے ٹوٹنے کا خوف سب سے بڑی رکاوٹ ہوتا ہے

عزیزانِ من! وہ تو زبان خود سمجھاتی ہے، صرف تقلید کی رٹ سے نکلنا ہوتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ عوام کے اعتراضات سے اس کی پرواہ نہ کرنا کہ وہ کہیں گے کہ صاحب! ہزار برس سے یہ معنی ہمارے ہاں اسلاف سے ہوتے چلے آئے، آپ نے یہ نئے معانی کیسے

---

[1] مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979) کے اپنے الفاظ یہ ہیں: ''رحمان عربی زبان میں بڑے مبالغہ کا صیغہ ہے۔۔۔۔۔۔اس کی مثال ایسی ہے جیسے۔۔۔۔۔۔ درازئی قد کے ذکر میں جب ''لمبا'' کہنے سے تسلی نہیں ہوتی تو اس کے بعد ''تڑنگا'' بھی کہتے ہیں'' (تفہیم القرآن جلد اول، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، 1993، ص۔ 34)۔

کر دیئے۔تو یہ جو مقبولیتِ عامہ ہوتی ہے' یہ آدمی کو صحیح معنی پہ پہنچنے نہیں دیتی۔اور پھر جو تقلید ہے اس سے آدمی نکل ہی نہیں سکتا۔یہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔

رحمٰن ورحیم کا قرآنی مفہوم: رحمِ مادر کی مثال اور ابواب کا ذکر

میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ عربی زبان کے اندر کسی لفظ کا مادہ ایک ہی ہوتا ہے۔اس کے اندر جب باب یا وزن بدلتا ہے تو اس کے معنی بدلتے ہیں۔یہ رحمٰن ورحیم کا ایک ہی تو مادہ ''رح م'' ہے۔اور پھر ان عربوں کے ہاں بنیادی چیز یہ ہے کہ انہوں نے یہاں سے رحمِ مادر بنایا ہے۔اس قسم کی نشوونما جیسی بچے کی نشوونما رحمِ مادر میں ہوتی ہے۔کیا بات ہے اس قوم کی صاحب! اگر میں رحمِ مادر میں نشوونما کے اوپر ہی آ جاؤں تو آپ دیکھیں گے کہ کتنے مراحل اس کے اندر آتے ہیں۔بظاہر ماں کی اپنی کوشش کا کوئی نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اندر سے خود ہو رہا ہوتا ہے۔اور نشوونما کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہاں ہڈیاں بھی بن رہی ہیں' گوشت بھی بن رہا ہے' اعصاب بھی بن رہے ہیں' Nerves بھی بن رہے ہیں' دل دھڑک رہا ہے' خون کی گردش ہو رہی ہے اور ذریعہ خوراک کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہے۔سانس تک لینے لیے کچھ ذریعہ نہیں۔اور نشوونما غیر شعوری طور پہ اس انداز سے ہو رہی ہے کہ بچے کی ہر چیز پوری ہو رہی ہے' آنکھ بن رہی ہے' بینائی آ رہی ہے' دماغ بن رہا ہے' خلیے پیدا ہو رہے ہیں' خون میں گردش ہو رہی ہے' قلب دھڑک رہا ہے اور اس ماں کو بھی کچھ پتہ نہیں کہ کیسے ہو رہا ہے۔وحی یہ ہوتی ہے۔اس نبی کو بھی یہ علم نہیں ہوتا تھا کہ یہ ہو کیسے رہا ہے۔اور یہ چیز ہے جس کے لیے مقصد وحی انسانیت کی نشوونما کرنا تھا۔یہ ٹھیک ہے کہ اس کے لیے ان کے ہاں رزق بھی لفظ تھا' ان کے ہاں ربوبیت بھی لفظ تھا۔یہ ساری وہ چیزیں تھیں جس میں بظاہر محسوس طور پہ کوئی نہ کوئی ذریعہ ہوتا ہے۔ایک ایسی چیز جس میں آپ کو محسوس طور پہ نظر نہ آئے کہ روٹی کھا رہے ہیں' پانی پی رہے ہیں اور وہ نشوونما ہو رہی ہے۔یہاں سے رحم کے لفظ سے یہ چیز آئی۔

رحم کے معنی ہمارے ہاں پھر Mercy ہو گیا جناب! اس نے اور ہی ستیاناس کر دیا۔ہم نے Mercy کا لفظ عیسائیت سے لے لیا۔کہا کہ God is mercy [1]۔تو سب کچھ اس کے رحم پہ موقوف ہے' انسان کے کچھ کرنے سے وہ نہیں ہو سکتا' وہ بات ادھر چلی گئی۔یہ سوال ہی نہیں ہے یہ تو سوال انسانیت کی نشوونما کا ہے' اس کی جو Physical Body (طبعی جسم) ہے' جسمِ انسانی جو ہے' اس کی نشوونما رزق سے ہوتی ہے' محسوس چیزوں سے نشوونما ہوتی ہے' رازق بھی وہی ہے' اس نے پیدا کیا ہے اور پھر یہ سارا سامانِ رزق ساتھ پیدا کر دیا ہے۔لیکن انسانیت کی جو نشوونما ہوتی ہے' وہ ان اقدار کی رو سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے قرآن کریم نے دیئے ہوئے ہیں۔اس کے لیے

---

[1] خدا رحم ہے۔

قرآن میں صاحب !لفظِ رحیم آیا ہے۔اب مادہ وہی ''رح م'' ہے'اس کی دو شکلیں آپ کے سامنے ہیں' ایک تو اسی سے رحمٰن ہے اور دوسرا' رحیم اسی سے ہے' صرف باب بدلا ہے' یہ رحمٰن کے وزن کے اوپر ہے اور وہ وہی جو رحیم ہے' جو میں نے ابھی کہا ہے' رحیم کے وزن کے اوپر ہے۔اب یہ جو اس کا وزن ہے یا جسے باب آپ کہیں گے تو اس کے بدلنے سے آپ دیکھیے معنی کیسے بدل جاتے ہیں۔

کائنات میں نظریہ ارتقا بڑی اہمیت کا حامل ہے اور بڑے غور و فکر کا متقاضی ہے

ایک چیز کڑی سے کڑی ملتے ہوئے Gradually یعنی بتدریج ہوتی چلی آتی ہے' اور یہ چیز جو تھی' وہ ہمارے اس دور میں علمی طور پہ سامنے آئی کہ قرآن حمید یہ کہہ کیا گیا ہے۔یہ جو ارتقا کا نظریہ یا جسے آپ Theory of Evolution کہتے ہیں' اس میں ایک Evolution (ارتقا) تو یہ ہے جس کی تحقیق انہوں نے کی ہے کہ اس طرح سے پہلے زندگی نے یہ شکل اختیار کی' یہاں سے Gradually آہستہ سے' وہ بدل کے پھر اس میں آئی' پھر اس سے آگے بڑھی تو اس میں آئی' سلسلہ ارتقا یا Evolution کی کڑیاں ملتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔اسے ان لوگوں نے Normal Evolution کہا' یعنی عام قاعدے کی رو سے کڑی سے کڑی ملتے ہوئے آگے چلے جانا' بتدریج آگے چلے جانا۔ان کی تحقیق میں ایسا ہوا۔بعض مقامات ایسے تھے' جن میں ایک کڑی کے بعد دوسری کڑی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ یہ چیز کیسے بن گئی' درمیان کی کڑی نہیں تھی' جسے آپ ان کے ہاں Missing link (گم شدہ کڑیاں) کہتے ہیں۔میں نے عرض کیا' بار بار کہا کرتا ہوں درس میں یہ چیزیں مشکل ہو جاتی ہیں: کہیں ایسی صورت ہوتی' نصاب ہوتا' طالبعلم ہوتے تو پھر میں یہ ایک ایک چیز عرض کرتا کہ Evolution (ارتقا) کے متعلق قرآن حمید نے کیا کچھ کہہ دیا ہے۔تو انہوں نے یہ کہا ہے کہ ان کے اندر بعض مقام ایسے آتے ہیں جہاں درمیان سے کڑیاں پھاند کر کوئی چیز آگے جا پہنچتی ہے اور ہمیں پتہ نہیں کہ درمیان میں وہ کس طرح سے پھاند جاتی ہیں' یہاں سے یہ کیسے ہو گیا؟ یہ جو اس Evolution (ارتقا) کی تھیوری کے اندر Process (طریق) ہے' وہ اسے Emergent Evolution[1] کہتے ہیں۔یعنی ہنگامی طور پہ یک لخت کچھ ہو گیا ہے۔مجھے تو یاد ہے شاید ایک دفعہ بات آئی تھی تو ایک شعر بھی آیا تھا وہ پھر دماغ میں' یک لخت نازل ہو گیا' آ جاتا ہے کہ

بدلے کچھ ایسے طور سے بے طور ہو گئے
تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہو گئے

یہ ''کچھ اور ہو گئے''' سلسلہ ارتقا کی نارمل کڑی نہیں ہے' یہ وہ کہتے ہیں کہ Evolution (ارتقا) میں بعض ایسے Links (کڑیاں) ہمیں نظر آتے ہیں کہ وہ درمیان میں پتہ نہیں چلتا کہ Gradually (بتدریج) تبدیلیوں کے بعد کیسے ہو گا' وہاں کچھ اور ہو جاتا ہے۔یہ ان کے ہاں کا Emergent Evolution[1] (فجائی ارتقا) ایک الگ شعبہ ہے اور اس پہ بھی ان کے ہاں بڑی تحقیق ہو رہی ہے۔اس کا مطلب ہے

---

[1] فجائی ارتقا۔اس نظریئے کا امام C.L.Morgan ہے۔اس کی کتاب کا نام Emergent Evolution (Edition 1923) ہے۔

ہنگامی طور پہ کچھ ہو جانا۔ اب یہ جو نشو و نما پا کر ارتقا کے ذریعے سے کسی چیز کا کچھ اور بن جانا ہے اس میں ایک تو یہ ہے کہ جو Normally (معمولاً) کڑی در کڑی ہوتا چلا جائے اس کے لیے عربی زبان میں رحیم آئے گا۔ اس ''باب'' فعیل کے معنی ہی یہ ہیں کہ کڑی در کڑی Gradually (بتدریج) کسی چیز کا بتدریج ہوتے چلے جانا۔ اور عملِ ارتقا کی ایک دوسری کڑی بھی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ دوسری کڑی کیا ہے؟

قرآنِ حکیم خدا تعالیٰ کی صفتِ رحمٰن کا مظہر بھی ہے، وہ بتدریج وہاں تک نہیں پہنچا جس طرح فکر انسانی پہنچتا ہے

یہ جو درمیان میں تدریج کی کڑیوں کو پھلانگ کر کسی چیز کا یک لخت ہنگامی طور پہ اس طرح سے ابھر کر آ جانا ہے عمل کے اس طریق کے لیے ''فعلان'' کا وزن ہے اور رحمٰن کا لفظ اس پر آیا ہے۔ انہوں نے اس باب کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ کسی چیز کا شدت سے یک لخت ہو جانا، یہ خصوصیت رحمٰن ہے۔ اور دوسرا جو رحیم ہے وہاں ان کے ہاں اس باب میں زبان کے اعتبار سے یہ بات ہے کہ کسی چیز کا بتدریج آہستہ آہستہ بڑھتے چلے جانا۔ اب یہ جو تنزیل ہے اس کے لیے قرآن حکیم کی خصوصیت بتائی ہے۔ ایک تو اس کی یہ رحمٰن و رحیم کی صورت ہے۔ اب جو رحمٰن ہے اس کے لیے وہ بتدریج کسی Evolution (ارتقا) کے ذریعے سے وہاں تک نہیں پہنچتا، جو فکر انسانی پہنچتا ہے وہ تو کسی چیز پہ بتدریج پہنچتا ہے اسے Detecting Knowledge (علم شناخت) کہتے ہیں یعنی ایک چیز کی تحقیق کی پھر آگے پہنچے۔ آپ دیکھیے، کسی تدبیر یا اسکیم کے متعلق سوچیے تو آپ کڑی در کڑی اس Plan (اسکیم) کے ماتحت آپ آخر تک پہنچیں گے: اسے یوں کیا جائے گا، پھر یہ بلڈنگ کی بنیادیں یوں بنے گی، اس کے اوپر اس طرح سے ڈھانچہ Gradually (آہستہ آہستہ بتدریج) اٹھتا چلا جائے گا۔ یہ سارا Process (طریق) جتنا بھی ہے، یہ بتدریج کسی تک پہنچنے کا Process (عمل) ہے۔ یہ ہے جس کے لیے وہ وزن رحیم کا آپ کے ہاں آئے گا۔ [1] ایک تو یہ چیز ہوئی۔

وحی کے ملنے سے پہلے نبی کو بھی وحی کی ماہیت اور افادیت کا علم نہ تھا

اب وحی کے متعلق یہ ہوا کہ یہ اس فکر انسانی کے Process (طریق) کا نتیجہ ہی نہیں، یہ تو کوئی چیز نبی کے اوپر یک لخت ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ تو تو کل تک بھی اس کے متعلق جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے، ایمان کسے کہتے ہیں، تو وحی کا تجھے کیا علم ہو سکتا تھا۔ یعنی کل تک وہ نبی بھی اس Process (طریق) سے آگاہ نہیں تھا۔ کل تک کے معنی ہیں ابھی اس وحی ملنے سے پہلے خود نبی کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ تو جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں۔ تو جس کی کیفیت یہ ہو کہ وہ اتنا بھی نہ جانے اور یک لخت اس کو ایسا علم

---

[1] نظریہ ارتقا کی زبان میں یہ تحول و تقلب کچھ ایسے غیر محسوس انداز سے عمل میں آتا ہے کہ سطحی آنکھ (Naked Eye) اسے محسوس طور پر دیکھ بھی نہیں سکتی۔

ملے جو ساری کائنات کو مشہود کر دینے والا ہو' یہ جو اس طرح سے یک لخت ملتا ہے' یہ Evolution (ارتقا) کی Gradual (تدریجی) کڑیوں کا نام نہیں ہے' یہ Emergent Evolution (فجائی ارتقا) [1] ہے اگر آج کی کوئی اصلاح کے لیے یک لخت ہو جانے والی بات آپ نے استعمال کرنی ہے تو یہ ہے وہ چیز جہاں اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (55:1.2) [2] آیا ہے۔

وحی ملنے کا خاصہ ہی رحمانیت ہے' رحیمیت نہیں ہے

سورۃ الرحمٰن میں اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (55:1.2) آیا ہے۔ آپ اس کے اوپر غور کیجیے کہ یہاں خصوصیت سے رحمٰن کہا ہے کہ رحمٰن ہے جس نے قرآن کا علم نبی کو دیا ہے۔ یہ خاص صفت کیوں آئی؟ اس لیے کہ اس کے اندر Emergent Evolution (فجائی ارتقا) کی بات ہے کہ رسول میں یہ جو چیز قرآن ہے' یہ Gradually (تدریج سے) اپنے اکتساب' اپنے فکر' اپنی سوچ و بچار کا نتیجہ نہیں ہے۔ اسے کسی نے سکھایا ہے اور وہ جو سکھانے والا ہے' اس کی رحمٰن کی صفت آئی ہے کہ وہ بھی الف ب ت سے اس کو ایم اے تک نہیں لے کر گیا۔ یہ عمل تو رحیمیت کا خاصہ ہے۔ بچے کو آپ ابجد سے ایم اے تک لے جاتے ہیں تو یہ رحیمیت کے اندر آئے گا۔ یہ جو رحمانیت والی بات ہے یہ تو صرف وحی کے لیے تھی اور اسی لیے کہا کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (55:1.2)۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم کے تو ایک ایک لفظ پہ آپ دیکھیے اس سے دین کے اصول واساس سامنے آتے ہیں۔ وحی کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ فکر انسانی کا نتیجہ نہیں' Gradually (تدریجاً) نہیں ملتا' یہ Detective Knowledge (شناختی علم) نہیں ہے جس کے ذریعے سے وہ نبی اس نتیجے پہ پہنچتا ہے۔ یہ ہے ہی رحمٰن کا سکھایا ہوا۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ کسی اور کا سکھایا ہوا علم ہے' اور سکھانے والے نے اس کو بتدریج نہیں سکھایا ہے کہ یہ بچہ ابجد سے ایم اے تک پہنچا ہے۔ یہ رحمٰن کا سکھایا ہوا قرآن ہے [2] تو بہت اچھا! سکھایا تو ہے اس انداز سے اور آگے اس کی تعلیم جو نتائج پیدا کرے گی اس کے متعلق کہا کہ وہ رحیمیت کی رو سے پیدا کرے گی' اب بتدریج (Gradually) یہ چیز پیدا کرے گی' جس آخری منزل تک اس نے پہنچانا ہے۔ اب یہ Gradually (بتدریج) ہے۔

---

1. سی۔ایل۔مارگن (C.L.Morgan) اپنی کتاب Emergent Evolution (فجائی ارتقا) میں لکھتا ہے کہ "اگر یہ پوچھا جائے کہ جس چیز کو تم فجائی (Emergent) کہتے ہو وہ بالآخر ہے کیا؟ تو اس کا مختصر جواب فقط اتنا ہے کہ یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ ان کی خصوصیات کے متعلق ان کے ظہور پذیر ہونے سے پیشتر کچھ نہیں کیا جاسکتا۔" (ماخوذ از پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا' (ایڈیشن ہفتم) طلوع اسلام ٹرسٹ لاہور' 2002ء' ص 110) اس نظریہ نے میکانکی تصور (Mechanistic Theory) کی بنیادیں ہلا دیں۔ اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ علت و معلول (Cause and Effect) کی زنجیر میں بعض اوقات ایسے مستثنیات (Exceptions) آتے ہیں جنہیں صرف دستِ قدرت ظہور میں لا سکتا ہے۔
2. اس کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ الرحمٰن (پہلا باب)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور۔

نبی علیہ السلام نے وحی کا علم رحمانیت کے طریق پر حاصل کیا اور رحیمیت کے تحت لوگوں کی رہنمائی کی گئی

اب وہ علم جو نبی کو اس طرح ہنگامی طور پر' وحی کے ذریعے سے' یک لخت ملا ہے' جس میں اس کی اپنی فکر کا کوئی دخل نہیں تھا' وہی نبی اب یہ علم یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ (2:129) ان کو Gradually (بتدریج) سکھائے گا' پڑھائے گا' تو وہ ''رحیمیت'' کے ذریعے سے ان کو آخر تک پہنچائے گا۔ رحمانیت کی رو سے اس کو ملا' رحیمیت کی رو سے اب یہ ان کی تعلیم کا انتظام کرے گا اور آخر تک' تکمیل تک' ان کو پہنچائے گا جو اس طرح تعلیم حاصل کرنا چاہیں گے۔ اب یہاں کہا ہے کہ تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ (41:2)۔ عزیزانِ من! غور کیجیے کہ اس کے اندر کیا کچھ نہیں آ گیا۔ کیا بتائیں:

ایں کتابے نیست' چیزے دیگر است [1]

یہ قرآن حمید عظیم کتاب ہے۔

مجھے قرآنِ حکیم کی گل بہار وادی تک پہنچنے کے لیے کئی ایک سنگلاخ منازل طے کرنا پڑیں: پرویزؒ

میں یہاں یہ عرض کر دوں کہ میں یہ چیز محض عقیدتاً نہیں کہہ رہا۔ میں تو ان وادیوں سے بھی گھوم کر آیا ہوں جہاں میں ابھی کچھ بھی نہیں مانتا تھا۔ یہ ساری چیز' جتنی بھی ہے' جیسے میں کہا کرتا ہوں' میں تو از سرِ نو مسلمان ہوا تھا اور قرآن حکیم نے یہ چیز کی۔ عزیزانِ من! قرآن حکیم کو اس انداز سے میں نے سمجھا ہے۔ یہ جو سارے مذاہب ہیں ان تمام کا مطالعہ کیا اور باہر کی شاید ہی کوئی بڑے پائے کی کتاب ہو جس کو میں نے چھوڑ دیا ہو۔ ٹھیک ہے وہ میرے سامنے ہے۔ ایک ایک کتاب کی خصوصیت میں جانتا ہوں لیکن جس جامعیت کے ساتھ یہ قرآن حکیم ایک لفظ کے اندر بات کہہ جاتا ہے' نہ مجھے مذاہب عالم میں کسی دوسری کتاب میں یہ چیز نظر آئی ہے' نہ انسانی فکر کی کسی کتاب میں میرے سامنے یہ چیز آئی ہے۔

لفظ ''مفصل'' کے غلط مفہوم کے باعث ہمارے ہاں پیدا ہونے والی پیچیدگیاں' ان میں فرقہ اہلِ قرآن بھی آتا ہے

کہا ہے کہ تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ o كِتٰبٌ (41:2-3)۔ اب بتا دیا ہے کہ وحی آ گئی۔ یہ کتاب بطور ضابطہ قوانین مدون ہے۔ کتاب کی شکل ہے جیسے وہ ہوتی ہے۔ اب یہ بکھری ہوئی چیز نہیں رہی' یہ جو مدون چیز ہے یہ آ گئی ہے۔ پھر یہاں قانون کی چیز

---

[1] مفکر قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء) نے ''جاوید نامہ'' میں' قرآنِ حکیم کی حقیقت وعظمت کو بڑے وجد آفریں انداز میں بیان کیا ہے:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت' جاں دیگر شود جاں چوں دیگر شد' جہاں دیگر شود

آ گئی۔ فوراً ہی وحی کو کتاب بتایا۔ اب اس کی خصوصیت آ گئی۔

ضابطہ قوانین کی جو خصوصیت اس میں ہے، وہ یہ ہونی چاہیے کہ فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ (44:2)۔ فُصِّلَتْ لفظ کا مادہ ''ف ص ل'' ہے ہمارے ہاں یہیں سے تفصیل کا لفظ آتا ہے۔ تفصیل کے معنی ہمارے ہاں Details (وضاحتیں، تشریحات) ہوتی ہیں۔ جب قرآن مجید کے متعلق کتابِ مفصل کہا تو یہ اس معنی میں تفصیل نہیں ہے کہ وہ ہر حکم جو اس نے دیا ہے اس کی تمام جزئیات اور Details (وضاحتیں، تشریحات) بھی اس نے خود ہی دے دی ہیں۔ اب یہ ہے جو عام طور پر کوتاہی فہم کی وجہ سے جسے گھپلا کہتے ہیں، قرآن مجید میں مچایا جاتا ہے یا مچتا ہے۔ اس پر کچھ تو وہ آئے جنہوں نے کہا کہ یہ ہے ہی نامکمل قرآن، صاحب! اس نے اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ تو کہہ دیا ہے اور یہ بتایا ہی نہیں ہے کہ کیسے کھڑے ہوں، کہاں ہاتھ باندھیں، کتنی رکعتیں پڑھیں، کیا اس میں پڑھیں، یہ ساری Details (تشریحات) تو آئی نہیں ہیں تو یہ کتابِ مفصل کیسے ہوئی؟ انہوں نے تو یہ اعتراض کر دیا۔ اب (معاذ اللہ) قرآن مجید کا یہ نقص دور کرنے کے لیے انہوں نے Details (تشریحات) اکٹھی کیں۔ انہیں کہا کہ یہ تو وحی کی نہیں ہیں تو انہوں نے کہا کہ وحی کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ یعنی ایک ناقص قسم ہے، جس کے اندر یہ نہیں دیا اور اس نقص کو دور کرنے کے لیے، اس کی کمی کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے، ایک اور وحی کی ضرورت آ گئی:

چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند ❶

اگر کھڑے ہو کر بات سوچ لیتے تو اس کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ اب ہمارے دور میں فرقہ اہل قرآن ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو غلط ہے کہ دوسری وحی تھی۔ اب انہوں نے کہا کہ اسی قرآن مجید سے سب کچھ نکالا جائے۔ یعنی جس میں وہ کچھ ہے نہیں یہ کہتے ہیں کہ اس میں سے ہی وہ سب کچھ نکالا جائے۔ یہ ہے فرقہ اہل قرآن۔

نماز کے سلسلہ میں فرقہ اہل قرآن کی متضاد خیالی کی ایک واضح مثال

انہوں نے نماز سے بات شروع کی کہ صاحب! اعتراض یہ تھا کہ نماز کے تو وقت بھی قرآن میں نہیں دیئے ہوئے چہ جائیکہ پانچ وقت کی نماز جو انہوں نے کہا کہ اس کے متعلق تو آپ کو روایات میں ملے گا، انہوں نے کہا کہ نہیں، قرآن ناقص نہیں ہے، قرآن تو کامل ہے، مکمل ہے۔ میں نے کہا کہ اگر مکمل ہے تو پھر بتایئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو نکال کر بتاتے ہیں۔ اب اس قرآن کریم سے نماز کے اوقات نکالے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہو گئے ہیں جو کہتے ہیں کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ اور انہوں نے لوگوں کو گمراہ کیا۔ انہوں نے تو پھر بھی اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا تھا، ایک غلط عقیدہ ہی سہی یہ کہا تھا کہ صاحب! یہ ایک دوسری قسم کی وحی تھی، باقی

---

❶ یہ ذہنِ انسانی کی افسانہ تراشی ہے۔

تفصیل تھی۔انہوں نے کہا کہ نہیں' وہ وحی نہیں ہے' وہ دوسری قسم کی چیز نہیں' بلکہ قرآن کے اندر ہی سب کچھ ہے' ہم اسے قرآن سے نکال رہے ہیں۔آپ کو اس میں ایک مثال دے رہا ہوں کہ نماز کے اوقات کتنے ہیں۔سب سے پہلے ان کے ہاں جو فرقہ اہل قرآن [1] کا بانی تھا جسے مولانا عبداللہ چکڑالوی (وفات 1930) کہتے ہیں' انہوں نے کہا کہ پانچ ہیں اور وہ پانچ اوقات نکالے۔اب وہی فرقہ ہے' انہی کے ہاں کے جو باقی اس کے بعد' ان کے شاگرد ہیں' انہوں نے کہا کہ نہیں' صاحب! یہ تین اوقات ہیں۔ان کے ہاں کا ایک اور خلیفہ چلا' اس نے کہا کہ نہیں صاحب! یہ دو اوقات ہیں۔اور آگے چلے تو انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! ایک ہی وقت کی نماز ہے۔وہ یہ سب کچھ اسی قرآن سے نکال رہے ہیں' یعنی یہ اپنے زعم میں اس قرآن کو اس اعتراض سے بچا رہے ہیں کہ یہ مکمل کتاب نہیں ہے' حکم دیا ہے کہ اس میں یہ چیزیں نہیں ہیں' اس سے تو اسے بچا رہے ہیں۔آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔یعنی اب بچا رہے ہیں اور اعتراض اس پہ یہ پڑ رہا ہے کہ اسی قرآن سے پانچ وقت ثابت ہو رہے ہیں' تین ثابت ہو رہے ہیں' دو ثابت ہو رہے ہیں' ایک ثابت ہو رہا ہے۔میں نے کہا ہے کہ شکر ہے آگے قصہ ختم ہو گیا ورنہ انہوں نے کہنا تھا کہ ایک بھی ثابت نہیں ہو رہا۔چلو جی گھوڑا اَی مک گیا (قصہ ہی ختم ہوا)۔یہ مذاق ہو رہا ہے۔

فصل کا لغوی اور قرآنی مفہوم' نگینوں کی طرح جڑے ہوئے الفاظ کا قرآنِ کریم

عزیزانِ من! یہ جو لفظ فصلت یا تفصیل ہے' اس معنی کے لیے انہوں نے زبانِ عربی سے نہیں پوچھا کہ اس کے معنی کیا ہیں۔وہ اپنے ہی ہاں کے' جو تفصیل کے اردو میں معنی ہوتے ہیں' لے رہے ہیں۔اردو میں بھی تفصیل کے معنی تفاصیل اور اس کے انگریزی میں معنی Details لیتے ہیں اور اب قرآن حکیم کے اندر سے Details (تشریحات) ڈھونڈنے لگے۔

فصل [2] (ف ص ل) کے معنی بنیادی طور پہ ہوتے ہیں ''الگ الگ کرنا'' وجہ مفاصل آپ نے سنا ہوگا۔یہ طب میں ایک لفظ ہے۔یہ جو جوڑ ہوتے ہیں' وہ ان کو کہتے ہیں' جو الگ الگ ہوتے ہیں اور جڑے ہوئے' ساتھ رکھے' ہوتے ہیں۔فصل کے معنی ہوتا ہے ''کسی چیز کا

---

[1] فرقہ اہل قرآن: اس فرقہ کا بانی (مولانا) عبداللہ چکڑالوی (مرحوم) ہے۔اس فرقے کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کریم کے تمام احکام کی جملہ تفصیلات و جزئیات خود قرآن کے اندر موجود ہیں اس لیے انہوں نے پہلے نماز کی جزئیات کو لیا۔ان کے متبعین کا ایک گروہ لاہور میں مقیم ہے۔ان دونوں گروہوں کی دریافت کردہ جزئیات یہ ہیں:

مولانا چکڑالوی: (۱) پانچ وقت کی نماز (۲) نماز میں 4,3,2 رکعتیں (۳) ہر رکعت میں دو سجدے۔

لاہوری فرقہ: (۱) تین وقت کی نماز (۲) نماز میں صرف دو رکعتیں (۳) ہر رکعت میں صرف ایک سجدہ۔

(حوالہ پرویزؒ: مطالب القرآن جلد اول' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1987' ص۔135)

[2] الفصل۔دو چیزوں کے درمیان روک' جو یہ بتادے کہ یہاں تک پہلی چیز ختم ہو گئی اور اسی کے بعد دوسری چیز شروع ہو گئی (لطائف اللغة)۔دو چیزوں میں سے ایک کو دوسری سے اس طرح الگ کر دینا کہ ان کے درمیان فاصلہ ہو جائے اور اس طرح ایک سے دوسری الگ اور متمیز ہو جائے (تاج العروس اور محیط المحیط) مزید تشریح کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد سوم' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961' ص ص۔1285 تا 1286۔

الگ الگ ہونا''۔ کتاب کا جو بہترین اسلوب نگارش ہوتا ہے جس کے معنی توضیح اور تشریح کے ہیں' یہ تفصیل ہے اور مفصل کے معنی واضح' متمیز' صاف' نکھرا ہوا Distinct ہوتا ہے' نہ کہ Detailed (تشریحات سے بھرا ہوا)۔ اب بہرحال میں خود یہ کہہ سکتا ہوں' میں کم از کم پچاس کتابیں اس وقت تک شائع کر چکا ہوں کہ کتاب کی بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں التباس نہ ہو' یعنی اس کے الفاظ اس قدر الگ الگ ہوں کہ اس میں کسی قسم کا التباس Confusion (الجھاؤ) نہ ہو' کسی قسم کا اختلاف نہ ہو' اس میں ابہام نہ ہو۔ یہ وہی ہے جسے الگ الگ' نکھار کر بیان کرنا کہتے ہیں' یعنی نکھار کر' ابھار کر کسی چیز کو اس طرح بیان کرنا کہ الگ الگ الفاظ ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ بات کرنے کی اور تقریر کی بھی خوبی یہ ہوتی ہے کہ الگ الگ لفظ بولا جائے جو دوسرے کی سمجھ میں آ جائے۔ بہت سی تقریریں آپ نے سنی ہونگی یا آپ کے کانوں میں آواز پہنچی ہوگی۔ آپ کہتے ہیں کہ صاحب! اس کا پتہ ہی نہیں لگتا' الفاظ سمجھ میں نہیں آتے' وہ الفاظ ایک دوسرے کے ساتھ ایسے ملے ہوئے ہوتے ہیں کہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ جو فصل ہے یہ اس اندازِ بیان کو کہتے ہیں کہ جس میں ہر لفظ الگ اپنے اپنے معانی واضح طور پہ دے رہا ہو۔ اسے کہتے ہیں کتابِ مفصل۔ یہ Detailed Book نہیں ہے بلکہ اس انداز کی کتاب ہے جس میں انداز اور اسلوبِ تحریر یہ ہے کہ اس میں ایک ایک لفظ الگ الگ بیان کیا ہوا ہے۔

عزیزانِ من! یہاں **فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ** (41:3) آیا ہے۔ آیت الفاظ کے مجموعے کا نام ہے لیکن اس میں الفاظ اس طرح نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ایک ایک نگ الگ الگ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کیا ہے' کیا رنگ ہے' کیا خوبی ہے' اس کی کیا قیمت ہے؟ یہ الگ الگ' جڑے ہوئے نگینوں کی طرح ہیں۔ نگینوں کی طرح جڑے ہوئے یہ الفاظ ہمارے ہاں زبان کا محاورہ ہے' یہاں یہ الفاظ آئے ہیں **فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ قُرْاٰنًا** (41:3)۔ اور اس کے بعد اگلی چیز ''قرانًا'' ہے' کتاب تو پہلے کہی ہے۔ ہمارے ہاں اس لفظ **قرانًا** (41:3) کے بنیادی معنی بھی پڑھنے کے لیے جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے یہ معنی بھی انہوں نے بعد میں لیے ہیں' قرآت کے معنوں میں قاری پڑھنے والا ہے۔ اسی سے قاری بھی لفظ ہے' ٹھیک ہے۔ اس لیے قرآن کریم کے معنی عام طور پہ کیے جاتے ہیں ''جس کتاب کو بہت زیادہ پڑھا جاتا ہو'' پڑھے جانے کے اعتبار سے تو یہ چیز ہے لیکن اس کے اندر بڑی عظیم چیز ہے۔

نزولِ قرآن کریم کے سلسلہ میں روایات کا بیان

یہاں کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلی آیت جو غارِ حرا میں نازل ہوئی تھی' وہ **اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ** (96:1) تھی۔ مگر یہ سب کچھ تاریخ ہے' قرآن کریم میں نہیں ہے۔ اس آیت میں اقراء آیا ہے۔ اقراء کا ترجمہ کیا: پڑھ۔ تو پہلی آیت جو بقول تاریخ وحی کے ذریعے آئی' اس میں پہلا ہی لفظ یہ آیا کہ اقرأ ''پڑھ''۔ اب یہ جو سارا واقعہ ہے' وہ کسی طرح ان روایت والوں نے ذہن میں رکھا کہ

وہ غارِ حرا میں حضورؐ کو لے جاتے ہیں اور وہاں جا کر وہ جس طرح یہ ہمارے ہاں کے تصوف میں ہے کہ خلوتوں میں جا کر وہاں ریاضتیں کرنا، چلّے کرنا، مراقبے کرنا، گیان دھیان کے ذریعے سے آٹھ آٹھ دن وہاں بیٹھے رہنا، ہوتا ہے۔ یہ سارا تصور بعد میں ان تصوف والوں نے یہ دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی وحی اسی طریقے سے ملی (معاذ اللہ) کہ آپ آٹھ آٹھ دس دس دن تک چلے جایا کرتے تھے، وہ اپنے ساتھ ستو پانی لے جایا کرتے تھے، خلوت میں، غار میں، جا کر یہ مراقبے کیا کرتے تھے اور اس طرح سے ایک دن جیسے ان کو کشف ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک دن وحی آ گئی (معاذ اللہ)۔ بہرحال اس کو چھوڑ دیجیے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جی! وہ فرشتہ آیا اور اس نے ایک کاغذ آپ کے سامنے رکھا اور کہا: اقراء یعنی پڑھ۔ یہ ساری تفسیر آپ کے ہاں حدیث کی کتابوں میں ملے گی بلکہ بخاری شریف میں تو سب سے اہم حدیث ہے اور ہر ایک میں قریباً جو نزولِ وحی کی ابتدا ہے کہ پڑھ، یہی ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ حضورؐ نے کہا کہ میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ یعنی خدا نے کچھ لکھ کر بھیجا ہے، جبریل ساتھ لائے اور انہیں معلوم نہیں ہے کہ آپؐ پڑھنا نہیں جانتے اور کہا جاتا ہے کہ پڑھ۔ وہ کہتے ہیں کہ میں تو نہیں پڑھنا جانتا، اور اس کے باوجود وہ تاکید کرتے ہیں کہ پڑھ۔ وہ جانتے نہیں ہیں کہ کیا کیا جائے؟ اوپر سے لکھا ہوا وہ لے آئے ہیں۔ جس کی طرف لے کر آئے ہیں، ان سے کہتے ہیں: پڑھ۔ وہ کہتے ہیں کہ میں پڑھنا ہی نہیں جانتا۔

عزیزانِ من! خون کے آنسو رویئے۔ مجھ سے نہ پوچھیے، یورپ کے اعتراض کرنے والوں سے پوچھیے کہ وہ اس کے بعد کیا کہتے ہیں۔ اب اس فرشتے کے لیے مشکل آئی کہ اگر یہ کاغذ کو واپس لے جائیں اور جا کر بتائیں اور پھر معلوم نہیں کہ کس طرح ڈانٹ پڑے۔ مسئلہ یہ آ گیا کہ وہ پڑھنا نہیں جانتے جن کو کہا جا رہا ہے کہ پڑھ، لکھا ہوا کچھ لے آئے ہیں، اس کو لے کر واپس جا نہیں سکتے کہ اس کے لیے Duty Bound (پابندِ فرض) تھے کہ ان کو پڑھائے۔ تو کیا کیا؟ جبریل نے حضور ﷺ کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اس طرح سے آپ کو ایم اے پاس کرا دیا اور آپ نے پڑھنا شروع کر دیا۔ یا للعجب!!

خدا کا مقام اور مقامِ نبوت ہمارے ان خود ساختہ تصورات سے بہت بلند ہے، ان تصورات میں تو خوف ہے، کپکپی سے اور بیوی کی تسلیاں ہیں

قرآن حکیم نے تو کہا کہ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ (6:91) انہوں نے خدا کے مقام کا صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا۔ میں کہونگا کہ انہوں نے مقامِ نبوت کا بھی صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ اور پھر جو اگلا حصہ ہے میں دوسری طرف نکل جاؤنگا وہ تو بڑی لمبی بات ہے کہ آپ ڈر گئے، کانپ رہے ہیں، بھاگے بھاگے چلے آ رہے ہیں، مجھے لحاف اوڑھا دو، مجھے سردی لگ رہی ہے، مجھے تو خوف آیا ہے، غار کے اندر پتہ نہیں وہ کون آ گئے۔ وہ جیسے کسی کو جن بھوت کا کچھ ہو رہا ہو، یہ ہو رہا ہے۔ بیوی سے آ کر کہہ رہے ہیں، وہ لحاف اوڑھا رہی ہے، بیوی تسلیاں دے

رہی ہے کہ کوئی بات نہیں' آپؐ تو بڑے نیک ہیں' آپؐ تو غریبوں کی ہمدردی کرتے ہیں' کچھ ایسی بات نہیں' خدا آپؐ کے ساتھ ہے۔ یعنی آپؐ کو وہ معلوم نہیں ہو رہا' وہ بیوی سمجھا رہی ہے لیکن اس کے باوجود حضورؐ کا جو خوف ہے' جو وہ کپکپی ہے' وہ نہیں جا رہی۔ کیا کہہ گیا ہے جگر: ❶

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں
مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

نبوت ملنے کے سلسلہ میں ورقہ بن نوفل عیسائی کی کہانی اور ہماری ذہنی پس ماندگی

عزیزانِ من! صد افسوس کہ اس روائت کی رو سے نبی کا مقام دیکھیے۔ بیوی کہتی ہے کہ چلو' یہاں میرا چچا نوفل ہے' اور چچا نوفل کا بیٹا ورقہ یعنی ورقہ بن نوفل وہ ایک عیسائی عالم تھا' عیسائی بوڑھا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ ان کے پاس چلو۔ وہ بتائے گا۔ اب دیکھیے کہ یہ مقام نبوت ہے' وحی نازل ہوگئی ہے' یہ اس سے پہلے کا دور نہیں ہے۔ آپؐ ان کے ساتھ اٹھ کر اس کے پاس پوچھنے کے لیے چلے جاتے ہیں کہ میرے ساتھ یہ ہوا کیا ہے۔ وہ ان کا عیسائی عالم یا راہب ہے' وہ کہانی سن کر کہتا ہے کہ اس میں ڈرنے کی بات نہیں' یہ تو وہی ناموس جبریل تھا جو موسیٰ پہ آیا جو عیسیٰ پہ آیا' خدیجہ تمہیں مبارک ہو کہ یہ تو نبی بن گئے۔ ایک عیسائی عالم کی شہادت سے آپؐ کو پتہ چلا کہ میں تو نبی بن گیا ہوں۔ اس نے کہا کہ یہ قوم تیرے ساتھ یہ کرے گی' وہ کرے گی' مخالفت کرے گی' مارنے تک چلی آئے گی اور کہا کہ اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو میں تمہاری ضرور مدد کرونگا۔ یعنی وہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ آپؐ نبی ہیں' اور وہ خود نبوت پہ ایمان نہیں لا رہا' وہ عیسائی کا عیسائی رہ رہا ہے' کہہ یہ رہا ہے کہ اگر مخالفت کے وقت میں زندہ رہا تو میں تمہاری مدد کرونگا' وہ خود نبوت کے اوپر ایمان نہیں لا رہا' جس نبوت کی شہادت دے رہا ہے' جس شہادت کی بنا پہ یہ بننے والے نبی سمجھ رہا ہے کہ میں نبی ہوں۔ اب کیا کہا جائے صاحب! کیا کچھ زبان کشائی کی جائے!!

ورقہ بن نوفل تو ایمان نہ لایا کیوں؟ مگر اسلام کی تاریخ میں سب سے بڑا کفر کا فتویٰ میرے خلاف تھا: پرویزؒ

آپ کو معلوم ہے کہ اسلام کی تاریخ میں سب سے بڑا کفر کا فتویٰ مجھ پہ لگا ہے۔ کہتے ہیں' جی! بڑے فخر سے اعلان کرتے ہیں جی' کہ ہزار علمائے کرام نے کفر کا فتویٰ دے دیا ہے۔ کس بات پہ فتویٰ دے دیا ہے؟ کہ وہ یہ کہتا تھا کہ ورقہ بن نوفل کی شہادت کے اوپر نبیؐ

---

❶ جگر مرادآبادی (1960-1890ء)۔ علی سکندر نام اور جگر تخلص' مرادآباد میں 1890ء میں پیدا ہوئے۔

نبی نہیں بنتا' مقامِ نبوت بہت بلند ہے' نبی تو عالم الناس ہوتا ہے' وہ تو ہزار ورقہ بن نوفل کو پڑھانے سمجھانے کے لیے آتا ہے۔ اور پھر اس اعتراض کا جواب کیا؟ کہ ہوسکتا ہے کہ ورقہ نے انہیں بہکا ہی دیا ہو۔ میرے پاس تو وہ آتے رہتے ہیں۔ اعتراض یہ تھا کہ کیوں جی' اس کا کوئی ثبوت ہے کہ ورقہ نے بہکا ہی نہ دیا ہو اور یہ سمجھ بیٹھے ہوں کہ میں نبی ہوں؟ اور پھر یہ بات کہ ورقہ خود ایمان نہیں لایا۔ کیوں؟ اس چیز کی تو شہادت ہے کہ تم نبی بن گئے ہو مگر وہ دل سے یہ نہیں مان رہا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ اس انداز سے آیا ہے تو ٹھیک ہے چلاؤ (معاذ اللہ)۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ بتاؤ اس کا جواب تمہارے پاس کیا ہے کہ وہ کس لیے خود ایمان نہیں لایا تھا اور یہ ساری عمر اس فریب میں رہے جو ورقہ نے دیدیا تھا (معاذ اللہ)۔

قرآنِ حکیم کے ایک لفظ اقراء کے معنی ''پڑھ'' کرنے سے یہ کہانی بنی

اب سوال یہ ہے کہ یہ بات کہاں سے آئی؟ وہ ہوا یوں کہ اقراء کے معنی کیے کہ پڑھ اور پڑھ سے بات آگے چلی' کہانی بنی کہ کاغذ آیا' غارِ حرا میں آیا' جبریل نے کہا: پڑھ' آپؐ نے کہا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس طرح سے یہ قرآت ہوئی۔ پھر یہ یکلخت سینے سے لگے اور اس طرح سے یہ جو اندر کی کیفیت پیدا ہوئی تو گھبرائے' کپکپی ہوئی۔ اس کے بعد وہ لحاف اوڑھا۔ یہ سارا قصہ اس اقراء کے بعد کا ہے۔ کاش! ہم انہی عربوں سے پوچھ لیتے کہ وہ اقراء کے کیا معنی لیتے تھے۔

لفظ ''قراء'' کا مفہوم اور دنیائے تصوف کا نظریہ حیات

''قراء'' کے معنی ہوتا ہے اعلان کر' قرآن حکیم کے الفاظ میں ''بانگِ دہل کسی چیز کا اعلان کرنا''۔ یہ وہی ہے جسے آج ہم Proclamation (اعلامیہ) کہتے ہیں۔ یہ ہے اس کا صحیح ترجمہ کہ قم: اٹھ اور ساری دنیا کے اندر اعلان کر' ساری دنیا میں Proclaim (اعلان) کردو۔ کیا اعلان کردو؟ یہ کہ **بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ**[1] (96:1)۔ اس کے[2] نام سے' اس کے مقصد سے' جس نے خلق کیا' پیدا کیا' ربک: سامانِ ربوبیت عطا کیا۔ اس کی صفتِ ربوبیت اور خالقیت کا ساری دنیا میں اعلان کردو۔ اٹھ! تیرے ذمے یہ فریضہ عائد ہے۔ اقراء: اعلان کردو۔ یعنی یہ جو عام اعلان کرنے کی چیز تھی اس نے آکر تصوف اور وحی میں ایک فرق کردیا۔ تصوف والوں کی کیفیت جو یہ بیان کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ انہیں یہ جو چیز مل جاتی ہے' یہ انفرادی اور ذاتی ہوتی ہے اور اسی شخص کی ہے جس کو یہ چیز ملتی ہے'

---

[1] اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ (96:1) اے رسول! تو اس خدا کی صفتِ ربوبیت کا عام اعلان کردے' جو تمام اشیائے کائنات کا خالق ہے۔ یہ اعلان کردے کہ جس خدا نے مخلوق کو پیدا کیا ہے اسی نے سامانِ نشوونما کی بھی تخلیق کردی ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1465)۔

[2] بِاسْمِ کے مفہوم کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الفاتحۃ' ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' 2007' ص ص۔ 74 تا 77۔

اگر کوئی دوسرا کہے کہ بھئی! کچھ مجھے بھی سمجھا دو کہ یہ کیا چیز ہے جو خدا نے آپ کو کشف اور الہام کی' یہ کیفیت اور روحانیت عطا کر دی ہے' کچھ ہمیں بھی بتائیے' وہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب!

ذوقِ ایں بادہ نہ دانی' بخدا! تا نہ چشی!

یہ تو بھائی صاحب! شراب کا نشہ ہے' جو پیے گا اسے ہی نشہ آ سکتا ہے' نشہ سمجھایا نہیں جا سکتا۔ جی! تو یہ جو چیز تھی کہ یہ ذاتی انفرادی چیز ہے۔ سنیے! وحی انفرادی چیز نہیں ہے کہ جس کو ملے اسی کو اس کا نشہ چڑھے اور پھر وہ نہ سمجھا سکے اور نہ دوسرے کو پلا سکے۔ کیا بات ہے جو[1] وہ کہہ گیا ہے!

واعظ! نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو

کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

یہ واعظ کی نہیں' یہ تو ان کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ

ذوقِ ایں بادہ نہ دانی' بخدا! تا نہ چشی!

یہ پیو گے تو پتہ چلے گا کہ نشہ کیا ہے۔ میں تمہیں کیا سمجھاؤں کہ نشہ کیا ہوتا ہے۔

نبوت اور جسے یہ ولایت کہتے ہیں' میں فرق ہوتا[2] ہے۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن حکیم کا ایک ایک لفظ ان چیزوں کو

---

[1] یہ اشارہ مرزا اسد اللہ خاں غالب (1869-1797ء) کی طرف ہے۔

[2] علامہ اقبالؒ (1938-1877ء) نے نبی کے اس منصب کو نہایت حقیقت کشا اور بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ اپنے خطبات ''تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' کے پانچویں خطبہ کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

''محمد عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پہ پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔'' یہ الفاظ ایک بہت بڑے مسلمان صوفی بزرگ (عبد القدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔ تصوف کے لٹریچر میں ان جیسے الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے جو ایک فقرہ کے اندر شعور نبوت اور تصوف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ گاہ کی تجردگاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لیے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ایک نبی کی مراجعت تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانے کے طوفان پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے اور اس طرح مقاصد و مطامح کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لیے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس کی آنکھ نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے' نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے اسی لیے ایک صاحب وحی کے ''تجربہ'' کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی رو سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آ گئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

(Iqbal, Allamah Muhammad (1989). The Reconstruction of Religious Thought in Islam, M.Saeed Sheikh (Ed. Annotated). Lahore: Iqbal Academy Pakistan, PP. 99-100)

نیز سید نذیر نیازی (1958)۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ یعنی حکیم الامت حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے انگریزی خطبات کا اردو ترجمہ معہ مقدمہ حواشی اور تصریحات۔ لاہور: بزم اقبال' ص ص۔ 188 تا 189) (نوٹ: یہ اردو رواں ترجمہ پرویزؒ کا لیا گیا ہے)

واضح کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ جو سارا تصوف ہے وہ اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ اقـراء (96:1) یہ جو تمہیں خدا کی صفتِ ربوبیت اور خالقیت کا علم دیا جاتا ہے' اس کا ساری دنیا میں اعلان کردو۔ یہ ہے جو منصبِ نبوت ہے' بلکہ اس کو منصبِ رسالت کہیں گے۔ یہ تھا اقراء' یہ تھا فُصِّلَتْ (41:3)۔ اور یہ تھا قُرْاٰنًا (41:3)۔ فصلت کے ساتھ کہا عَـرَبیاً (41:3)۔ یہ جو لفظ عربی ہے' ویسے تو زبانِ عربی کو بھی کہتے ہیں لیکن یہ جو عرب تھے یہ اپنے آپ کو بڑے فصیح البیان کہتے تھے اور باقی ان کے علاوہ غیر عرب جتنے تھے وہ ان سب کو عجمی کہتے تھے جس کے معنی ہیں ''گونگے' حیوان''۔ ان کے ہاں یہی ایک سب سے بلند' قابلِ فخر بات یا خصوصیت تھی' یہ ان عربوں کے ہاں زبان تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ ان بلندیوں پہ پہنچائی ہوئی زبان قابل فخر تھی' کہ خدا نے بھی اپنی وحی کے لیے اسی کا انتخاب کیا اور آخر الزمان کی وحی کے لیے یہ انتخاب کیا۔ اس کے اوپر ان کو یہ فخر تھا' اس لیے لسانِ عربی مبین بھی قرآن حکیم میں آیا ہے کہ زبانِ عربی کے اندر یہ آیا ہے۔ یہاں اس کی صفت قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (44:3) بتائی ہے۔ یعنی نہایت فُصِّلَتْ بھی ہے اور عَـرَبِيًّا بھی ہے۔ یہ ہے کتاب' یہ ہے اس کی کیفیت' اور اس کے اوپر سو سو جلدوں کی تفسیریں بھی لکھی جا رہی ہیں۔

قرآن حکیم کا نزول عربی زبان میں کیوں ہوا؟

اسے عَرَبِيًّا کہا ہے۔ اسی سورۃ کے اندر آگے جا کر ساری آیات سامنے آ گئیں۔ وہاں بھی فُصِّلَتْ آیا ہے' وہاں بھی عَرَبِيًّا آیا ہے لیکن وہاں بڑا ہی حسین انداز ہے' اسی سورۃ میں آیت ہے کہ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ [1] (41:44)۔ دیکھیے فُـصِّـلَـتْ یہاں بھی آ گیا' اس نے بات صاف کر دی کہ اگر یہ عرب جو مخاطب تھے اور اس کی زبان غیر عربی ہوتی' کوئی غیر عرب زبان ہوتی' مثلاً یہ فارسی زبان میں ہوتا یا یہ عجمی زبان میں ہوتا' تو یہ کہتے کہ یہ ایسی کتاب ہے جس کو ہم سمجھ ہی نہیں سکتے' یہ کتاب ہماری طرف کیسے آ گئی؟ کہا ہے کہ لَـوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ (41:44) ایسی کیوں نہ کتاب ہوئی' جس کے معنی واضح ہوتے اور ہم ان کو سمجھ سکتے۔ یہاں دیکھیے فُصِّلَتْ کے معنی تفصیل نہیں ہیں۔ لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ (41:44)۔ اگر ہم اسے اس عربی زبان میں نہ نازل کرتے تو یہ اعتراض کرتے کہ ہم تو اسے سمجھ ہی نہیں سکتے' کوئی کتاب لانی تھی تو ہماری زبان میں لاتے کہ جسے ہم سمجھ تو سکتے۔

---

[1] (ہم نے اس قرآن کو انہی کی زبان میں نازل کیا تا کہ اس کی ہر بات واضح طور پر سمجھ میں آ جائے لیکن انہیں اس پر اعتراض ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ انسان کا کلام نہیں' خدا کا ہے تو اسے جنتر منتر کی سی مبہم زبان میں ہونا چاہیے تھا جس طرح ان کے کاہن بولتے ہیں۔ لیکن) اگر یہ قرآن مبہم زبان میں ہوتا تو یہ اعتراض کر دیتے کہ یہ واضح اور نکھری ہوئی زبان میں کیوں نہیں نازل ہوا؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1120)

اصل بات عجمی یا عربی ہونے کی نہیں بلکہ قرآنی تعلیم کو نہ ماننے کی ہے

عزیزانِ من! آگے کیا بات ہے جو قرآن حکیم کہہ گیا ہے! کہا کہ عجمی و عربی (41:43,44) یہ جو کہہ رہے ہیں کہ ہماری سمجھ میں بات نہیں آتی' تو اس میں زبان کی بات نہیں ہے کہ عجمی ہوتے تو پھر تو سمجھ میں نہ آتا' تو یہ تو عربی ہے جس میں یہ عجمی اور عربی کا قصہ ہی بیان کرنے کی کیا بات ہے!! یہ عربی اور عجمی کا قصہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خوئے بد را بہانہ بسیار۔ سوال اس قرآن حکیم کی زبان کا نہیں ہے۔ چونکہ ان کی نیت خراب ہے اس لیے انہیں اس قرآن حکیم میں ہزار نقص دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے کہا کہ **قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ** [1] (41:44) ان سے کہہ دو کہ یہ زبان کی بات نہیں ہے یہ تو Approach کی بات ہے کہ کس زاویہ نگاہ سے تم اس کی طرف آتے ہو۔ **وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى** (41:44)۔ جو اس Angel of Vision یعنی اس زاویہ نگاہ سے آتا ہے کہ میں دیکھوں کہ اس میں کیا صداقتیں ہیں' ان کا Prejudice Mind (تعصبی ذہن) نہیں ہے' اس کے خلاف تعصب نہیں ہے' خالص تحقیقِ صداقت کے لیے آ رہا ہے' وہ تو اس پہ ایمان لائے گا۔ کہا کہ اگر یہ کتاب قرآن عربی میں ہوتی یا یہ عجمی میں ہوتی' اگر اس کی یہ Approach ہوتی تو کوئی Difficulty (مشکل) نہیں تھی' لیکن یہ عرب ہے' زبان بھی عربی ہے' شروع سے ذہن میں فیصلہ بھی ہے کہ ہم نے اسے ماننا ہی نہیں ہے تو کہا کہ ان کی تو آنکھوں پہ پردے' کانوں کے اندر ڈاٹ لگے ہوئے ہیں۔ **عَلَيْهِمْ عَمًى** (41:44)۔ کھلی ہوئی آنکھوں سے نابینائی ہے۔ تو یہ سوال نہیں ہے کہ یہ زبان کونسی ہے جس میں یہ قرآن ہے' یہ تو جو اٰمنوا ہے' اس زاویہ نگاہ سے اس کی طرف آئیں گے تو یہ سارے معنی واضح کر کے رکھ دے گا۔ اگر اس کی طرف Prejudice Mind (تعصب کے ذہن) سے آنا ہے' پہلے ہی سے یہ طے کر کے آنا ہے کہ یہ قرآن حکیم تو میں نے ماننا نہیں ہی ہے' اس میں یہ نقص نکالنا ہے' اس کو یہ کچھ کہنا ہے' تو پھر عربی میں ہو یا عجمی میں ہو' اس سے تو فرق ہی نہیں پڑے گا۔ دونوں میں ایسی چیز ہوگی۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کو سمجھانے کے سلسلہ میں اقبالؒ اپنی مثال آپ تھے اور یہ زندگی کی تمام بیماریوں کے لیے شفا ہے

عزیزانِ من! دیکھیے' فطرت نے اقبالؒ (1877-1938ء) کو کتنا بلند مقام دیا ہے! قرآن حمید کی آیت کو سمجھنے اور پھر اس کو اپنے انداز میں بیان کرنے کا جو ملکہ ان کو ملا تھا' وہ قابلِ رشک تھا۔ آپ نے دیکھا' قرآن حمید کہتا ہے کہ عجمی ہو' عربی ہو' بات تو Approach

---

[1] ان سے کہہ دو کہ یہ قرآن' ان لوگوں کے لیے' جو اس کے منجانب اللہ ہونے پر یقین رکھتے ہیں' صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کا ذریعہ ہے اور زندگی کی تمام بیماریوں کے لیے شفا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1120)۔

(زاویہ نگاہ) کی ہے کہ اس کی طرف کس نکتہ نگاہ سے آتے ہیں۔ یہ کہتا ہے کہ

تُو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الہ الا
لغتِ غریب، جب تک ترا دل نہ دے گواہی

(بالِ جبریل)

دیکھتے ہیں آیت کا ترجمہ کیسے ہو رہا ہے! قرآن حکیم کی مثل تو کسی چیز کو کہا ہی نہیں جا سکتا لیکن قرآن حکیم کے بعد، عزیزانِ من! پھر اس کی مثل بھی نہیں کہا جا سکتا۔ جس انداز سے یہ بات سمجھا گیا ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ قرآن حکیم نے کہا تھا کہ ءَ اَعْجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ (41:41) سوال اس قرآن کی زبان کا نہیں ہے کہ اعتراض کیا جائے کہ کیا یہ منتر جنتر جیسی مبہم زبان میں ہے یا واضح اور نکھری ہوئی زبان میں۔ چونکہ ان کی نیت خراب ہے اس لیے انہیں اس قرآن حکیم میں ہزاروں نقائص دکھائی دیتے ہیں۔ کہا کہ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ [1] (41:44):

تُو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الہ الا
لغت غریب، جب تک ترا دل نہ دے گواہی

''غریب'' کے معنی ''اجنبی'' ہوتا ہے ہمارے لیے Foreigner (غیر ملکی) ہوتا ہے خواہ یہ عربی میں ہو یا اردو میں۔ یہ لغتِ غریب ہے جب تک ترا دل نہ دے گواہی۔ Approach (زاویہ نگاہ) کی بات ہے۔ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ (41:44)۔ وہ یہ بات نہیں کہیں گے کہ صاحب! عربی میں ہے یا یہ عجمی قرآن ہے۔ وہ تو یہ کہیں گے کہ یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کا ذریعہ ہے اور زندگی کی تمام بیماریوں کے لیے شفا ہے۔

قرآنِ حکیم صفات کے لحاظ سے، اور حقائق کے لحاظ سے ایک ضابطۂ حیات ہے

عزیزانِ من! میں قرآنِ حکیم کی یہ بات کہہ رہا تھا کہ یہ لغت فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا [2] (41:3)۔ کیا کچھ نہیں کہہ گیا قرآن! کہا ہے کہ یہ قرآن تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (41:2) یہ ضابطہ حیات اس خدا کی طرف سے نازل کیا گیا ہے جو

---

1. ان سے کہہ دو کہ یہ قرآن، ان لوگوں کے لیے، جو اس کے منجانب اللہ ہونے پر یقین رکھتے ہیں، صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کا ذریعہ ہے اور زندگی کی تمام بیماریوں کے لیے شفا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1120)۔
2. ایک ایسی کتاب نازل کر دی جس کے احکام الگ الگ، نکھار کر بیان کیے گئے ہیں تا کہ اس میں کسی قسم کا ابہام اور التباس نہ رہے۔ اس کی زبان بھی بڑی فصیح اور صاف ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1108)

بلا مزد و معاوضہ تمام کائنات کو سامانِ نشوونما بہم پہنچاتا ہے اور چونکہ انسانی ذات کی نشوونما کے لیے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت تھی اس لیے اس راہ نمائی کو بھی وہبی طور پر عطا کر دیا۔ اب اس قرآن حکیم نے Gradually (بتدریج) آگے چلنا ہے' یہ کتاب ہے' ضابطہ قوانین اور ضابطہ ہدایت ہے جو فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ (41:3) ہے۔ اس میں نکھار کر' ابھار کر' الگ الگ کر کے بات کہی ہے۔ یہ قُرْاٰنًا یعنی Proclamation (اعلامیہ) ہے۔ اس کا اعلان کرنا ہے' اسے اپنے آپ تک نہیں بلکہ عام کرنا ہے۔ یہ عربیاً ہے۔ اس کتاب کی زبان بھی عربی یعنی واضح اور فصیح ہے۔ اس میں اتنی خوبیاں ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ضابطہ حیات کس کے لیے ہے؟

اہل عرب عربی ہونے کے باوجود قرآن مجید کو کیوں نہیں سمجھتے؟

قرآن مجید نے کہا کہ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (41:3) یہ اس قوم کے لیے ہے جو علم سے کام لے کر اس کی طرف آئے گی۔ یہ محض زبان کی بات نہیں ہے۔ عام طور پہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! اگر یہ قرآنِ کریم اسی طرح سے ایسا سمجھ میں آنے والا ہے' ایسی ہدایت ہے' تو پھر یہ عرب جن کی زبان عربی ہے' وہ اس کو کیوں نہیں سمجھ سکتے۔ قرآن مجید نے تو خود کہہ دیا ہے کہ اس میں عربی اور عجمی کی بات نہیں ہے۔ اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (41:3) یہ علم کی بات ہے اور علم بھی وہ جو قرآنِ کریم نے بتایا ہے۔ کتنے ہیں وہ عرب جو محض زبان کے اعتبار سے علم رکھتے ہیں۔ آپ ہمارے ہاں دیکھیے اردو بولنے والے' اردو سمجھنے والے کتنے ہیں جو (مرزا اسداللہ خاں) غالب (1797-1869) کو سمجھتے ہیں جو ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء) کو سمجھتے ہیں۔ انگریزی بھی پڑھے ہوئے ہیں لیکن کتنے ہیں جو ہمارے ہاں ولیم شیکسپیئر (1564-1616ء) کو سمجھتے ہیں۔ زبان پہ اعتبار ہی صرف کیا جائے تو کتاب کو بھی دیکھنا ہوگا کہ کتاب کی نوعیت کیا ہے۔ پھر اگلی بات یہ ہے کہ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (41:3) یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو علم و بصیرت سے کام لے کر اسے سمجھنا چاہیں تو ان کے سامنے ان کے مطالب واضح طور پر آ جائیں۔ یہ Approach یعنی زاویہ نگاہ کیا ہے جس کی طرف آپ آئیں' پھر اس کے بعد آپ سمجھیں۔ جن عربوں کے ہاں' عربوں ہی نہیں بلکہ سارے ہی مسلمانوں کے ہاں ہزار تیرہ سو سال سے ملوکیت چلی آ رہی ہو وہ قوم قرآن مجید کی طرف کیسے آ سکتی ہے۔ اس تنزیل کا' اس قرآن کریم کا مقصد کیا تھا؟ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (41:4)۔ نذیر ہے' غلط نظام کی تباہ کاریوں سے آگاہ کرنے والا ہے' دوسرا ہے بشیر۔ اب دونوں چیزیں ہیں لیکن نذیر ہونے کی یہ بات صرف منفی ہے۔ اتنی سی بات کہنے سے وہ مسافر منزل پر نہیں پہنچ سکتا کہ یہ راستہ غلط ہے۔ اس کو آگے بتانا چاہیے کہ پھر وہ صحیح راستہ کونسا ہے جس پہ چل کر تم منزل پہ پہنچ جاؤ گے۔ یہ بتانے والا ہے بشیراً جب تک پہلے یہ جو غلط چیز ہے اس سے آگاہ نہ کیا جائے تو بشیراً آتا ہی نہیں ہے۔ حکیم کو' طبیب کو' ڈاکٹر کو یہ بتانا پڑے گا کہ یہ یہ چیزیں تھیں جن کی وجہ سے تمہارے ہاں یہ مرض ہوا ہے' ان سے پرہیز لازم ہے۔ اور یہ ہے وہ دوائی جس سے تمہیں آرام ہوگا' اور یہ

ہے علاج۔ یہ بشیر و نذیر ہے۔ تو پہلی چیز یہ ہے کہ جس معاشرتی نظام میں آپ موجود ہیں اس میں جو چیزیں خلافِ قرآن ہیں' جن کا نتیجہ تباہی کا آنا ہے' ان کے متعلق دیکھنا ہوگا کہ جو چیزیں اس کے خلاف ہیں' ان سے آگہی کی ضرورت ہو۔ یعنی پہلی چیز دوائی ہے جو اس نے دی ہے' Dose (خوراک) نہیں ہے وہ تو آپ کے ہاں' اگر غلط اور بد پرہیزیوں سے سارا سسٹم بگڑا ہوا ہے' تو دوائی کی پہلی Dose (خوراک) کیا کرے گی۔ پہلے تو جو یہ چیز ہے اس کو سمجھنے اور دور کرنے کی ضرورت ہوگی یعنی جو ان تباہیوں کے' خرابیوں کے' اسقام کے اسباب ہیں پہلے ان کی تشخیص کی ضرورت ہوگی' پھر ان کے ازالے کی ضرورت ہوگی' پھر جو تعمیری کام ہے وہ آئے گا۔ یہ ہے بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا (41:4) یعنی اس سے یہ معلوم ہوگا کہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے نتائج کس قدر خوشگوار ہوتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنے سے کیسی تباہیاں آتی ہیں۔ لیکن اے رسول! جن لوگوں کے سامنے تُو اس قرآن حکیم کو پیش کر رہا ہے وہ فَاَعۡرَضَ اَکۡثَرُہُمۡ فَہُمۡ لَا یَسۡمَعُوۡنَ (41:4) ان میں سے اکثر اس کتاب سے اعراض برتتے ہیں۔ کیوں اعراض برتتے ہیں؟ کہنے لگے کہ وہ سننا ہی نہیں چاہتے۔ یہاں قرآن حکیم نے آدھی بات بتا دی۔ سمجھنے اور سمجھ کر اس پر عمل کرنے کی بات یہیں آگے جا کر آئے گی۔ وہ اس کو سننا ہی نہیں چاہتے۔ یہ ان کی کیفیت ہے۔

صدیوں سے امتِ مسلمہ نے اپنے آپ کو صرف قرآن کریم کے پڑھنے اور سننے تک محدود کر رکھا ہے' سمجھے نہیں ہیں

وہ جس کو ہم اصطلاحاً ایمان کہتے ہیں' ہمارے ہاں وہ قومیں اگر نہیں بھی لائیں لیکن یہ بات ضرور ہے کہ وہ قرآن کریم کو سنتی ہیں۔ سمع کے معنی (س م ع) کے معنی غور و فکر کرنا ہیں۔ وہ اس کے حقائق کے ماننے والے بنتے چلے جا رہے ہیں اور ہم اس کے الفاظ کو دہراتے چلے جا رہے ہیں لیکن وہ جیسے قرآن کریم نے کہا ہے کہ سنتے نہیں ہیں' یونہی منہ پھیر کر چل دیتے ہیں' غور و فکر نہیں کرتے' سمجھ سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ کیوں نہیں سنتے ہیں؟ وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا فِیۡۤ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَیۡہِ وَفِیۡۤ اٰذَانِنَا وَقۡرٌ (41:5) ان کی کیفیت یہ ہے۔ ویسے تو قرآن حمید نے کہا ہے کہ وقالوا (41:5) یہ کہتے ہیں۔ یہ کہنے کا انداز ہوتا ہے' زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں' ہمارے ہاں کہنے کا یہ ایک انداز ہے یعنی اس کا تو انداز بتا رہا ہے کہ یہ کیسے ہیں' یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ قالوا کے یہی معنی ہوتے ہیں' یہ نہیں کہ وہ لفظاً یہ بات کہتے ہیں بلکہ ان کا جو انداز ہے یہ سارا بتا رہا ہے' یہ کیفیت ان کی ہے۔ کہتے ہیں کہ تیری دعوت کی طرف سے ہمارے جو دل ہیں' ان کے اوپر غلاف چڑھے ہوئے ہیں' وہاں تک یہ بات ہم پہنچنے ہی نہیں دینا چاہیے' وہ اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے' انہوں نے کانوں کے اندر

ڈاٹ لگا رکھے ہیں تا کہ اس کو سننے ہی نہ پائیں' ان کے کانوں میں ثقل ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ وَمِنۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ (41:5) تمہارے اور ہمارے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔

قرآنی معاشرے کے لیے حیاتِ آخرت کا تصور اور اس پر ایمان ایک بنیادی نظریہ ہے

اب سوال یہ ہے کہ یہ کس قسم کا پردہ ہے؟ کیا انہوں نے قنات کھڑی کر رکھی ہے' دیوار بنالی ہوئی ہے؟ کیوں ایک وسیع خلیج حائل ہے جو پاٹی ہی نہیں جاسکتی؟ قرآن مجید اس کا جواب دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (17:45) جب تُو قرآن مجید کو پیش کرتا ہے تو بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ زندگی کو' طبعی زندگی' کو اسی دنیا کی زندگی نہ سمجھیں بلکہ یہ سمجھیں کہ حیاتِ آخرت تک چلنی ہے۔ عزیزانِ من! یہ ایمان کی بڑی بنیادی شرط ہے۔ پوچھتے ہیں کہ جو لوگ اس پہ ایمان نہیں رکھتے ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ قرآنِ حکیم کے جواب پر جھوم جائیے۔ کہا کہ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا (17:45) ان کے اور تمہارے درمیان ایک پردہ ہوتا ہے۔

اس زندگی اور اُخروی زندگی میں نظر نہ آنے والا ایک پردہ ہے

عزیزانِ من! ایک وہ (نفسیاتی) پردہ ہے جو خود نظر نہیں آتا لیکن پردہ تو یہ ہے جو پس پردہ ہے' وہ نظر نہ آئے۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا (17:45) ایسا پردہ جو نظر نہ آئے۔ جذبات کی بنا پہ انسان کا جو اندر زاویہ نگاہ بدلتا ہے' وہ چیزیں جو Physically (طبعی) ہوتی ہیں' نظر آتی ہیں ان میں تو کچھ فرق نہیں پڑتا' آنکھیں بھی ویسی ہوتی ہیں' کان بھی ویسے ہی ہوتے ہیں' دل کی دھڑکن بھی ویسے ہی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اس میں' وہ بات کہنے والے میں اور اس بات کے اندر ایک پردہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم اسے حِجَابًا مَّسْتُوْرًا کہتا ہے۔ وہ طبعی پردہ نہیں ہوتا کہ دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں' کپڑے ٹانگ دیئے گے ہیں' حجاب ہے' یہ حجابِ مستور ہے۔ جذبات کی رو سے یہ جو ایسی کیفیت پیدا ہو جائے کہ ان کے درمیان میں ایک پردہ حائل ہو جائے' یہ ہے جو حجابِ مستور ہوتا ہے۔ آپ کے ذہن میں بھی یہ بات آئی ہوگی کہ کسی کے ساتھ تعلقات ہیں' اس میں کچھ تھوڑی سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں یا ویسے ہی کوئی چیز درمیان میں آ گئی تو آپ دیکھتے ہیں کہ آپ میں اور اس میں ایک پردہ حائل ہو جاتا ہے حالانکہ اگر دوستی ہے تو پھر پردہ کاہے کا؟

قرآنِ حکیم کے نزدیک حجاب مستور کا مفہوم

قرآن حکیم نے جسے حجابِ مستور کہا ہے۔ وہ ہے کہ جب جذبات غالب آ جائیں تو ان کی بنا پر پھر یہ آپ کے ہاں کسی چیز کو دیکھنے کے' سننے کے جو Physical (طبعی) ذرائع ہیں' یہ کام نہیں دیں گے۔ اس کو قرآن حکیم نے حجابِ مستور کہا ہے۔ یہ تو بہر حال بڑے برے

معنی ہیں۔لیکن جذبات کیا کچھ کرتے ہیں' حجاب کس طرح سے بنتے ہیں؟ ان کے لیے فوراً ذہن میں ایک چیز آ گئی۔کیا کہہ گیا ہے (مرزا اسداللہ خاں) غالب(1869-1797ء)!اس نے بات اتنی سی کی ہے' کہنا یہ چاہا ہے کہ جو جذبات کی شدت ہے' وہ حجاب کیسے بنتی ہے۔

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

کیا بات ہے! یہ ہے جذبات کی بنا پہ: مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی۔ یہ وہ پردہ ہوتا ہے'اوسہریاں دیاں لڑیاں جس طراں نال اور کھ دیندے نیں۔ ❶ اصل میں تو یہ بات تھی کہ دولہا کو کہنا یہ تھا کہ اب اس کے بعد تم نے کچھ اور نہیں دیکھنا۔تو یہ ہے کہ بکھر جانے والی چیزیں ایک پردہ بن گئیں' مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی۔ یہ ہے حجابِ مستور جسے قرآن حمید نے کہا ہے۔قرآن حمید کی طرف آنا ہو تو پہلی بات یہ ہے' عزیزانِ من! کہ Approach (زاویہ نگاہ) جو ہے وہ مادی نہیں ہونا چاہیے ورنہ تمہارے اور قرآن حمید کے درمیان ایک پردہ حائل ہو جائے گا اور وہ پردہ حجابِ مستور ہوگا۔ یہ تمہیں کہتے ہیں کہ نہیں' تمہارے اور ہمارے درمیان ایک پردہ ہے' بات ہی ہم تک نہیں پہنچ سکتی' ہم یہ دیکھ ہی نہیں سکتے۔

قرآنِ حکیم سے بے اعتنائی کا انداز بھی ایک عجیب انداز ہے مگر کوتاہیوں سے جو نقصان پہنچتا ہے' اس سے محفوظ رہو

کہا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے کہ تُو بار بار آ کر ہم سے کہے کہ یہ غلط ہے' یہ سمجھو' یہ نہ سمجھو' لہٰذا یہ بات نہیں ہے۔تم ہمیں نصیحتیں کر کے کیوں اپنا مغز کھپاتے ہو؟ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ (41:5) جاؤ تم اپنا کرو' ہمیں اپنا کام کرنے دو۔کیا انداز ہے! کسی کی طرف سے بے اعتنائی برتنے کے لیے یہ الفاظ کہ جا جا میاں! اپنا کم کرتوں' تے مینوں اپنا کم کرن دے' ہن روز آ کے سویر توں بیہہ جانا ہیگا ایں دو دو گھنٹے' میں جو تینوں کیا ہیگا اے پئی میں نئیں او گل تیری سُننی' تے میری سمجھ نئیں اوندی' تے میں نئیں او چھڈنا جو کچھ میں کرنا ایں۔ ❷ یہ ہے انداز۔کیا بات ہے: فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ (41:5) جاؤ اپنا کام کرو' ہمیں اپنا کام کرنے دو۔کہا کہ ان سے یہ بات کہتے ہوئے جاؤ کہ بھائیو! ایک بات سن لو۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے' میں تم میں سے ہوں اور تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ یہ تو کہیں سے

---

❶ وہ سہرے کی لڑیاں جس طرح وہ انہیں ساتھ رکھ دیتے ہیں۔

❷ جاؤ میاں! اپنا راستہ لو۔ مجھے اپنا کام کرنے دو۔اب روزانہ علی الصبح آ کر دو دو گھنٹے بیٹھے رہتے ہو۔ میں نے جو آپ کو کہہ دیا ہے کہ مجھے تمہاری بات ہی نہیں سننی۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ جو کچھ میں کرتا ہوں وہ میں قطعاً نہیں چھوڑنے کا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

ایک بات آئی اب مجھ پہ فریضہ عائد کیا گیا کہ اسے جا کر پہنچاؤ' اس کی بات تم تک آگے پہنچا رہا ہوں۔ نہ میری یہ بات' نہ میں تم میں سے الگ تھلگ ہو گیا: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (41:6) تمہارے جیسا ایک انسان ہوں' فرق یہ ہے کہ مجھ پر یہ وحی ہوئی ہے' میں وحی کا یہ پیغام تم تک پہنچاتا رہوں گا خواہ تمہارا ردعمل کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ وحی یہ آئی ہے کہ تمہارے لیے اقتدار و اختیار صرف خدائے واحد کا ہے اس کے علاوہ کوئی اور ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اور محکومیت اختیار کی جائے۔ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ (41:6) اس راہ پر جم کر استقامت سے قائم رہو۔ دیکھیے یہاں یہ الیہ ہے' یہ نہیں ہے کہ خدا کسی مقام پہ ہے اس کی طرف جاؤ' بلکہ اس کی طرف جانے والا جو راستہ ہے اس کے اوپر جم کر کھڑے ہو جاؤ۔ وَاسْتَغْفِرُوْهُ (41:6) اپنی کوتاہیوں' لغزشوں کی وجہ سے یہ جو کچھ نقصان پہنچتا ہے' یہ تمنا کرو' یہ آرزو کرو کہ ان کے نقصانات سے تم محفوظ رہ جاؤ۔ یہ ہے وہ چیز۔

قرآن حکیم میں حجابِ مستور سے ربط کی صفاتِ عظمیٰ نظر نہیں آتیں کہ وہ آخرت کے منکر ہیں

اور آگے کہا ہے کہ یاد رکھو! وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ (41:6)۔ تباہی ہے مشرکین کے لیے۔ میں آیت پڑھوں تو پھر بالآخر جیسا کہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم میں کوئی ربط نہیں نظر آتا' میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیوں نظر آئے؟ وہ تو حجابِ مستور ہوتا ہے لیکن وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ (41:6) جو لوگ خدائی اختیار و اقتدار میں دوسروں کو بھی شریک سمجھتے ہیں' تباہ ہو جاتے ہیں۔ شرک انسانیت کے لیے وجہ تذلیل ہے اور شرفِ انسانیت سے محرومی سے بڑھ کر اور کونسی تباہی ہو سکتی ہے۔ جو لوگ خدا کی تجویز کردہ راہ کو چھوڑ کر اور راستہ اختیار کر لیتے ہیں ان کی عملاً یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (41:7) وہ سب کچھ اپنے لیے ہی سمیٹتے چلے جاتے ہیں اور نوعِ انسانی کی نشوونما کی فکر نہیں کرتے۔ وہ درحقیقت مستقبل کی زندگی (حیات اخروی) سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔

عزیزانِ من! یہاں زکوٰۃ کا لفظ آ گیا۔ کہا ہے کہ تباہی ہے مشرکوں کے لیے یعنی ان لوگوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت سے منکر ہیں۔ تو یہ بظاہر نظر آتا ہے کہ ان میں کچھ ربط ہی نہیں آتا۔ زکوٰۃ نہ دینے والے مشرک ہیں' آخرت کے منکر ہیں۔ زکوٰۃ دینے کا فریضہ تو وہ ادا کرے گا۔ پہلی چیز یہ ہے کہ اس کا آخرت پر ایمان ہے اور مشرک نہ ہو' ایک خدا کے اقتدار کا وہ قائل ہو' تو وہ ہے جو زکوٰۃ دے سکے گا۔ تو بات کیا ہوئی؟ زکوٰۃ اگر یہی ہے کہ سال بھر کے لیے جتنا جی چاہے مال جمع کر و اور اس میں سے کچھ Percentage (فی صد) شیئر جو ہے وہ نکال کے دیدو' اپنے طور پہ دیدیجیے یا جو حکومت نے کہا تھا ان کے انداز میں جمع کر دیجیے۔ انہوں نے بھی اجازت دیدی ہے کہ اپنے طور پر بھی تم یہ دے سکتے ہو' جیسے خیرات دیتے ہیں۔ تو یہ جو چیز ہے اس میں سے اتنے پیسے دینے کے لیے یہ چیز ہوئی کہ

یہ تو ایک وہی کرسکتا ہے جو مشرک نہ ہو، صرف خدائے واحد کے اقتدارِ مطلق کا قائل ہو اور اسی کے تابع زندگی بسر کر رہا ہو اور حیاتِ آخرت کا قائل ہو۔ یہ غور طلب چیز ہے کہ اگر یہ اتنی سی چیز ہی ہے اور پھر ہمارے ہاں آج جو قانون رائج ہے اس میں تو یہ ہے کہ آپ کے ہاں جو روپیہ بنک میں جمع ہے آپ کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا، نہ علم ہونے کی ضرورت ہے، وہ تو وہیں کٹ جاتا ہے۔ تو زکوٰۃ کے لیے یہ شرطیں ہوئیں کہ وہ مشرک نہ ہو، وہ حیاتِ آخرت کا منکر نہ ہو، تو وہ دے سکتا ہے۔

قرآنِ حکیم کا تو ایک ایک لفظ غور وفکر کا متقاضی ہے

عزیزانِ من! یہ چیزیں بڑی گہرے غور وفکر کی متقاضی ہیں، یہ محض Mechanically (میکانکی طور پر) کرنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ قرآن حکیم زکوٰۃ کے معاملے میں کیا کہتا ہے؟ کہتا ہے کہ یہ جو زکوٰۃ ہے، یہ تو آپ کے ہاں کے معاشی نظام کی بنیاد ہے اور یہ وہی کرسکتا ہے جو قرآن حکیم نے کہا ہے کہ مشرک نہ ہو اور حیاتِ آخرت کا قائل ہو، وہی یہ کرسکتا ہے اور اسی سے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ پھر الزکوٰۃ ہے کیا؟ مختصر الفاظ میں ہی عرض کرسکتا ہوں، وقت تھوڑا ہے۔ کارل مارکس (1818-81ء) نے ایک نظریہ دیا۔ اس نے کہا کہ انسانیت کی مشکلات کا حل اس قسم کے معاشی نظام میں ہے کہ ''ہر شخص اپنی پوری محنت سے کمائے، اس میں سے صرف جو اس کی ضروریات کے لیے ہے وہ اس کو دیا جائے اور باقی سب کا سب وہ دوسروں کی نشوونما کے لیے دیدے''۔ عربی زبان میں اس نشوونما کے لیے لفظ ''زکوٰۃ'' آتا ہے۔ اس لفظِ زکوٰۃ کے معنی ہوتے ہیں سامانِ نشوونما۔ کارل مارکس (1818-81ء) کے اس نظریئے کو، عزیزانِ من! غور سے سنیے گا، بڑی اہم چیز اتفاق سے آیت کے سامنے آگئی ہے۔ کارل مارکس کا نظریہ یہ تھا کہ انسانیت کی مشکلات کا حل اس قسم کے نظام میں ہے کہ ''ہر شخص اپنی پوری محنت سے کام کرے اور اس محنت کے ماحصل میں سے صرف اپنی ضروریات کے لیے لے کر باقی سارا دوسروں کی زکوٰۃ کے لیے دیدے یعنی دوسروں کی نشوونما کے لیے دیدے''۔ اس نے کہا کہ یہ بات میری سمجھ میں آئی ہے۔ یہ ہوگا کیسے؟ کیوں وہ پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر محنت کریں اور اپنی ضرورت کے مطابق رکھ کر باقی سب دوسروں کی نشوونما کے لیے دے دیں؟ اس کا جذبہ محرک کیا ہوگا؟ تو نظر آتا ہے کہ ذہنی طور پر، واقعی اس کا تاریخ کے سلسلہ میں بڑا گہرا فکری طور پر مطالعہ تھا۔ میں نے جو اس شخص کو دیکھا ہے تو واقعی اس کی نگاہ تاریخ پہ بہت آگے گئی تھی۔

جہاں کارل مارکس ناکام رہ گیا، اس سے آگے

عزیزانِ من! اس نتیجے پہ وہ خود فکری طور پہ پہنچا ہے، تو یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔ اس کے ساتھیوں نے کہا کہ صاحب! اگر بات یہی ہے تو پھر اس کے بعد آپ اس کو شروع کیوں نہیں کرتے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بات تو میری سمجھ میں آگئی لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک

شخص جان مار کر محنت کرے اور اس کے بعد اس میں سے صرف اپنی ضرورت کے لیے کم از کم رکھے اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کے لیے دیدے اور ایک آدھ دن کے لیے یہ کچھ نہ کرے، ساری عمر کے لیے یہ کرتا چلا جائے، مجھے وہ Incentive یا جذبہ محرکہ نہیں سمجھ میں آتا کہ یہ آدمی ایسا کیوں کرے۔ یہ اس کے ہاں کی ساری Discussion (بحث و تمحیص) ہے کہ وہ ایسا کیوں کرے، مجھے اس ''کیوں'' کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس نے کہا کہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی تو اس پر اس کے رفیق، اس کے Companions (رفقا) چلا اٹھے کہ عجیب شخص ہے، تمہیں ہم نے اپنا اس طرح سے لیڈر بنایا ہے، اتنی بڑی تحریک کا تُو بانی ہے، ایک اصول، ایک نظریہ، ایک معاشی نظام دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نہیں بتا سکتا کہ اس کے اوپر عمل کیسے ہوگا، تُو کس قسم کا آدمی ہے۔ وہ ساتھی پارٹی کو چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ اس نے کہا کہ جو جی میں آئے تم کرو، میں ایمانداری سے کہتا ہوں کہ انسانیت کی مشکلات کے حل کی بات یہی ہے لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اس کے لیے کوئی جذبہ محرکہ نہیں مل سکا۔ اس نے کہا کہ جس کی سمجھ میں یہ جذبہ محرکہ آئے گا وہ اس نظام کو چلا سکے گا۔ قرآن حکیم نے کہا کہ آؤ میں تمہیں سمجھاؤں کہ جذبہ محرکہ کیا ہے۔ جذبہ محرکہ کی پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس کو مشرک نہیں ہونا چاہیے۔ صاحب! بات معاشی نظام کی ہو رہی تھی اور اس میں آ گئی بات بت پرستی کی، ہمارے ہاں تو مشرک کے معنی یہی ہیں۔ قرآن حکیم سے پوچھیے۔ سنتے جائیے کہ کیا کہتا ہے۔

کارل مارکس کی ناکامی کی وجہ جواز اور اس کا علاج

عزیزانِ من! بات بڑی اہم سامنے آ گئی ہے۔ کارل مارکس کے نظریئے کو عمل میں نہ آنے کے لیے کیا چیز حائل ہو رہی تھی۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ اَفَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰٮهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمۡعِهٖ وَقَلۡبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنۡ يَّهۡدِيۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰهِ (45:23)۔ اس شخص کی حالت پہ تم نے نگاہ کی ہے کہ وہ کسی اصول، کسی قانون، کسی ہدایت کی نہیں، اپنے ہی مفاد کو اپنا خدا بنا لیتا ہے۔ جو میں کماؤں میرا ہے، وہ میری ذات کے لیے ہے۔ کسی اور کا اس میں کیا حق ہے کہ وہ لے جائے، میں کیوں کسی دوسرے کو دیدوں؟ یہ کون کہہ رہا ہے؟ وہ جس نے اپنی ذات کے مفاد کو ہی اپنا خدا بنا لیا ہے۔ یہ ہے شرک۔ توحید کیا ہے؟ خدا کے دیئے ہوئے قانون کو وہ اپنا خدا بنائے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ پوری پوری محنت کرو، اپنی ذات کے لیے صرف اتنا رکھو جتنی تمہیں ضرورت ہے اور باقی دوسروں کو دے دو: يَسۡـئَلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ قُلِ الۡعَفۡوَ (2:219)۔ یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ پھر کتنا دوسروں کے لیے دیدیں، کہا کہ جتنا تمہاری ضرورت سے زائد ہے وہ سارے کا سارا۔ اب اس کے اوپر جو ایمان رکھنا ہے، یہ ہے خدا پر ایمان رکھنا اور یہ جو ہے کہ میں اپنے ہی مفاد کے لیے سب کچھ کرونگا، اپنا مفاد ہے میرا ہے، کسی کا کیا حق ہے کہ اس میں سے

چھین لے' یہ ہے شرک۔ تو یہ اتنی محنت کرنے کے بعد سب کچھ دوسرے کے لیے دے جاتا ہے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ جو کوئی اپنے ہی مفاد کو اپنا خدا بنا لیتا ہے وہ تو یہ نہیں کر سکتا' وہ زکوٰۃ نہیں دے سکتا۔ ٹھیک کہا تھا کارل مارکس (1818-81ء) نے۔ یہ وہ کرے گا جو یہ مانے کہ میرے خدا نے یہ اصول میرے لیے دیا ہے میں اس پہ ایمان رکھتا ہوں' میں اپنے جذبات کو درمیان میں آنے نہیں دیتا۔ وہ یہ کرے گا۔ اب یہ بات رہی کہ خدا نے جو یہ کہہ دیا تو میں پھر اس طرح مانوں؟ کیا ایسے جیسے ایک ڈکٹیٹر کے حکم کو مانتے ہیں؟ خدا تو کہتا ہے کہ میں جو ہر حکم دیتا ہوں' اس کی حکمت (The why of it) بھی بتاتا ہوں کہ ایسا کیوں کرو۔ اگلی بات اس میں آ گئی کہ اگر تمہارا ایمان یہ ہے کہ زندگی یہی زندگی ہے' یہی Physical Life (طبعی زندگی) اس کے بعد Disintegration of body (انتشارِ جسم) سے' جسم ختم ہوا' انسان کا معاملہ ختم' وہ دوسروں کی نشوونما کے لیے نہیں دیں گے۔

اس دنیا کی زندگی جسم کی ضروریات کو پورا کرنے تک محدود ہے اور زندگی آگے بھی چلتی ہے

قرآن کریم نے کہا ہے کہ جس کے نزدیک زندگی کا تصور یہ ہے کہ جسم کے ختم ہو جانے سے زندگی ختم ہو جاتی ہے وہ یہ زکوٰۃ والی بات نہیں کر سکتا۔ اس کو وہ جذبہ محرکہ نہیں مل سکتا کہ زیادہ سے زیادہ محنت کرتا چلا جائے اور دیتا چلا جائے' یہ نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے اس ایمان کی ضرورت ہے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے' اس دنیا کی زندگی یہ جسم ہے' جس کے لیے صرف روٹی کپڑے کی ضرورت ہے۔ انسان کے اندر ایک اور شے ہے اور وہ ہے انسان کی ذات' اس کا نفس' اس کی نشوونما ہوتی چلی جائے گی تو پھر اس کے بعد زندگی باقاعدہ آگے بھی چلے گی۔ یہ ایمان ضروری ہے کہ زندگی اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی آگے بھی جاتی ہے۔

انسانی ذات پر ایمان اور اس کی نشوونما کا اصول

دنیا کی اس زندگی کے بعد اگلی زندگی کے لیے قرآن مجید نے کہا ہے کہ **وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ** (41:7) یہ ایمان ضروری ہوگا کہ زندگی آگے بھی چلنی ہے اور اس ایمان کے ساتھ یہ ہے کہ وہ جو انسان کے نفس یا ذات کی نشوونما ہے وہ بھی ضروری ہے۔ جسم کی نشوونما تو ہر اس چیز سے ہوتی ہے جو آدمی خود لیتا ہے اور کھاتا ہے' ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جو وہ سب کچھ دوسروں کے لیے دیتا ہے تاکہ اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔ بتاؤ اس پہ ایمان لاتے ہو؟ پہلی بات تو یہ ہے۔ بطیبِ خاطر اس پہ ایمان رکھتے ہو کہ خدا کا جو حکم ہے وہ میرے لیے ہے' میرے جذبات درمیان میں حائل نہیں ہوں گے۔ حکم اس نے سمجھایا کہ زندگی یہیں ختم نہیں ہوتی' آگے جائے گی اور آگے جانے والی کی نشوونما اس چیز سے ہوگی جو دوسروں کو دیتے چلے جاؤ گے۔ قرآن مجید نے کہا کہ کارل مارکس! یہ ہے وہ Incentive (جذبہ محرکہ) جو تمہیں نہیں مل سکتا تھا۔ اس لیے نہیں مل سکتا تھا کہ کارل مارکس (1818-81ء) صرف Physical Life (طبعی زندگی) کا قائل تھا' وہ

حیاتِ آخرت کا بھی قائل نہیں تھا اور خدا کا بھی قائل نہیں تھا۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ تُو حیاتِ آخرت کا بھی قائل نہیں، خدا کا بھی قائل نہیں، تجھے Incentive (جذبہ محرکہ) کہاں سے مل سکتا ہے۔ بات جو تم نے کہی ہے، بات وہی صحیح ہے کہ انسانیت کی نجات اس نظام کے اندر ہوگی جس میں جو تم نے کہا ہے کہ جان مار کر محنت کریں کم از کم اپنے لیے رکھیں اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی ضرورتوں کے لیے دیدیں اور اس کا کسی پہ احسان نہ رکھیں۔ اس لیے کہ خدا کے حکم پہ اس کا ایمان ہے۔ خدا کا حکم اس لیے اس نے سچا مانا ہے کہ یہ ایمان ہے کہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی، زندگی آگے بھی جاتی ہے۔ کہا کہ یہ جو چیز سمجھے گا تو یہ نظام قائم ہو جائے گا۔ آپ وَوَيۡلٌ لِّلۡمُشۡرِكِيۡنَ (41:6) کی بات سمجھ لیجیے۔ جو یہ بات ہے کہ صرف خدا کے اقتدارِ اعلیٰ پہ نہیں بلکہ اپنے جذبات کو بھی انہوں نے خدا بنا رکھا ہے، اپنے مفاد کو بھی خدا بنا رکھا ہے۔ یہ مشرک ہیں، تباہی ہے ان کے لیے۔ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ (41:7) یہ لوگ زکوٰۃ نہیں دے سکیں گے اس لیے کہ وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ (41:7) یہ زندگی کی Continuity یعنی تسلسلِ حیات ہی کے قائل نہیں ہیں اور جو شخص بھی زندگی کو یہیں تک ختم سمجھتا ہے، اپنے ہی مفاد کو خدا سمجھتا ہے، وہ زکوٰۃ نہیں دے سکتا۔ کارل مارکس (1818-81ء) کی سمجھ میں یہ بات تو آتی لیکن وہاں اس کام کرنے کے Incentive (جذبہ محرکہ) کی یہ چیز نہیں تھی۔ لہٰذا یہ وہ چیز ہے جو اسلام اور مارکس ازم میں فرق پیدا کرتی ہے۔ اس لیے وہ اسلامی سوشلزم اور اسی قبیل کی یہ ساری چیزیں بکواس ہیں، بے معنی ہیں، یہ کچھ نہیں ہیں اسلام اور مارکس ازم دو متضاد چیزیں ہیں۔ یہاں بتایا قرآن کریم نے کہ آ و مارکس! میں تمہیں سمجھاؤں۔ سمجھ لیا۔ یہ ہیں اس کے معنی جو قرآن کریم نے کہا، یہی چیز ہے جو آگے کہی کہ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ اَجۡرٌ غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ (41:8)۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو اس چیز پہ ایمان رکھیں کہ اطاعت اس کی ہے جو خدا کے قوانین ہیں، ایمان میرا یہ ہے کہ زندگی یہیں ختم نہیں ہوتی وہ آگے بھی چلنی ہے، وہ زیادہ سے زیادہ محنت کریں گے، کم از کم اپنے لیے رکھیں گے، زیادہ سے زیادہ دوسرے ضرورت مندوں کے لیے دیں گے اور دیتے چلے جائیں گے۔

یہ نظام اس وقت تک قائم رہے گا جب تک تم ان خطوط پر عمل کرتے رہو گے

کہا یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ دینا ہے جس کا نتیجہ، جس کا اجر غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ (41:8) ہے۔ قرآن حمید یہاں یہ غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ایک عجیب لفظ لے آیا ہے۔ اس کے ایک معنی تو ہوتے ہیں ''غیر منقطع''، یعنی جب تک یہ کرتے چلے جاؤ گے اس کا اجر ملتا چلا جائے گا۔ یہ بڑا عجیب لفظ ہے، کہ یہ کرتے جاؤ گے تو اس کا یہ نتیجہ منقطع نہیں ہوگا، یہ نہیں ہوگا کہ تم یہ کچھ کرو گے اور اس کا اجر ہونا بند ہو جائے لیکن جب یہ کچھ تم چھوڑ دو گے تو اجر بند ہو جائے گا اور جب وہ اجر بند ہو، سمجھ لیجیے کہ وہ جو نظام تھا، ہم نے قائم نہیں رکھا۔ ایک یہ ہے کہ یہ غیر منقطع ہے اور

صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے مشروط ہے۔

خدا کی طرف سے یہ اجر انسان کی محنت کا ہی معاوضہ ہوگا اور وہ تو ہماری بات ہے کہ ہم کام کی بات کہہ سکیں

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ جو تمہیں اجر ملے گا یہ خدا کی طرف سے تم پر احسان نہیں ہوگا' یہ تو تمہاری اپنی ہی محنت کا ماحصل ہوگا۔ یہ غیر ممنون ہے' اس کے لیے ہم بھی تمہارے اوپر احسان نہیں رکھیں گے۔ واہ واہ او جیتا رہ او تو جیون والا لفظ ہے اونوں کیہناں او جیندا رہو۔ ❶

عزیزانِ من سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی آیت 8 تک ہم آ گئے۔ 9 ویں آیت سے ہم بعد میں لیں گے۔ میرا خیال ہے کہ کچھ باتیں آج کام کی سامنے آ گئیں ویسے تو قرآن کریم کی کون سی آیت ہے جس میں کام کی بات نہیں ہے۔ وہ تو ہماری بات ہے کہ ہم کام کی بات کہہ سکیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

---

❶ تبریک و تہنیت ہو تم پر۔ سدا بہار رہو۔ وہ تو اسے سدا جیتے رہو والا لفظ ہے' اسے کہنا: ارے بھائی: جیتے رہو۔

دوسرا باب: سورۃ حٰمٓ السجدۃ (آیات 9 تا 12)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1981ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی آیت 9 سے ہو رہا ہے:(41:9)۔
سابقہ درس کی آیت کے آخری الفاظ تھے بلکہ آیت ہی یہ تھی کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَھُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ (41:8) ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ، اجر، صلہ، ماحصل، جو کچھ قرآن حمید نے کہا ہے، وہ غیر ممنون ملے گا۔ غیر ممنون کے بارے میں پچھلی دفعہ میں نے عرض کیا تھا کہ ایک تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ یہ غیر منقطع ہے یعنی جب تک تمہارا یہ سلسلہ جاری رہے گا یہ اس طرح سے ہی ملتا رہے گا، یہ ہنگامی چیز نہیں ہے کہ یونہی کسی وقت، اللہ میاں کی خوشی ہوئی، یہ موج آ گئی، اس نے دیدیا اور یہ نہ ہوا تو کوئی بات نہیں ہے۔ کہا ہے کہ یہ غیر منقطع ہے یعنی اگر یہ کرتے رہو گے تو یہ ہوتا رہے گا۔ اور اسی لفظ کے دوسرے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ چیز احسان کے طور پر نہیں کی جائے گی بلکہ یہ تمہارے اپنے کام کا صلہ ہوگا۔ جو کام کا صلہ ہو، محنت کا ماحصل ہو، اس کے لیے یہ کہا ہے۔ یہ احسان نہیں ہوتا، یہ چیز تمہیں بطورِ احسان نہیں ملے گی، یہ تمہارے اپنے کام کا اجر ہوگا جو تمہیں ملے گا۔ یہ تو ہوا انسان کے خود اعمال کا اجر۔

خارجی کائنات کی تخلیق اور انسان کے متعلق ارتقائی مراحل کا ذکر

اب اگلی آیت میں آپ دیکھیے۔ پہلے میں آیت سامنے لے آؤں تو پھر اس کا جو نکتہ ہے وہ واضح ہوگا۔ کہا کہ قُلۡ اَئِنَّکُمۡ لَتَکۡفُرُوۡنَ بِالَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ وَ تَجۡعَلُوۡنَ لَہٗۤ اَنۡدَادًا ؕ ذٰلِکَ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ (41:9) کیا تم اس خدا کا

انکار کرتے ہو‘اس سے سرکشی برتتے ہو‘اس کے خلاف چلتے ہو اور اس کا ہمسر اوروں کو ٹھہراتے ہو جس کی قوتوں کا عالم یہ ہے کہ اس نے زمین کو دو مراحل میں سے گزار کر (موجودہ شکل) میں پیدا کیا ہیں۔ یہ نہیں کہ جس قسم کی آج یہ ہے یہ پہلے دن سے اسی قسم کی وجود میں آ گئی تھی۔ جس طرح انسان کے متعلق یہ ہے کہ جس شکل میں آج تمہیں یہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں‘ یہ نہیں تھا کہ پہلے ہی دن اسی قسم کے انسان ہم نے بنا دیئے تھے اور آگے چل پڑے‘ یہ بھی مختلف مراحل (Evolutionary Stages) سے گزر کر‘ زندگی یہاں تک پہنچی ہے۔ اسی طرح خارجی کائنات کے متعلق بھی قرآن حمید نے جو اس کے مختلف مراحل گنائے ہیں وہ عربی زبان میں ''یوم'' ہیں۔ یوم کا یہ لفظ مرحلہ‘ Stage, Period کے لیے بھی آتا ہے۔

آج کا سائنسدان اور محقق قرآنی حقائق کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور ہے

یہ جو قرآن مجید نے اس کی مختلف Stages یا مرحلے گنائے ہیں‘ آج سائنس کے یہ انکشافات بتا رہے ہیں کہ کس طرح قرآن مجید نے ایک ایک چیز صحیح بتائی۔ یہ اس دور میں بتائی جب ابھی بڑے سے بڑے سائنسدان کا ادھر تصور بھی نہیں جا سکتا تھا کہ یہ کائنات ان ادوار اور مراحل سے گزر کر اس Shape (شکل) میں وجود میں آ رہی ہے۔ یعنی اس کا یہ کہنا کہ اس کی جو سب سے پہلی Stage (مرحلہ) تھی وہ دھواں تھا‘ یہ Gases (گیسوں) کی شکل میں تھی جسے آج سائنس نے Nebula (ہیولیٰ) کہا ہے۔ دنیا بھر کے سائنسدان یا دنیا بھر کے دانشور اس دور میں یا انسانی علم کی جو سطح تھی‘ اس کا اُدھر تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا اور یہی چیز ہے کہ آج کے جو غیر متعصب سائنسدان ہیں وہ جب ان مقامات پہ غور کرتے ہیں تو وہ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ یہ وہ مقامات ہیں‘ جو ہمیں یہ کہنے کے لیے مجبور کرتے ہیں کہ یہ قرآن حمید کسی انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہو سکتا‘ اس لیے کہ انسانی فکر اس دور کے اندر اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی جسے یہ اس قدر متعین اور واضح الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔ کائنات کے متعلق یہ کہنا کہ یہ اسی شکل میں پہلے دن وجود میں نہیں آ گئی تھی‘ یہ مختلف مدارج و مراحل سے گزر کر‘ اس شکل میں آئی اور جسے اب میں نے پہلا مرحلہ کہا ہے‘ جس کو Nebula (نیبولا: ہیولیٰ) کہتے ہیں‘ وہ Pure Energy (مطلق توانائی) کے بعد Gases (گیسوں) کی شکل کے اندر ہے۔ وہ ایام (ادوار) جب آئیں گے تو میں عرض کرونگا کہ قرآن حمید نے اس کے کون کون سے مراحل گنائے ہیں اور آج کی سائنس کس طرح ایک ایک مرحلے کی تائید کر رہی ہے‘ اتنی جانفشاں کوششوں اور تحقیقات کے بعد وہ اس مقام پہ پہنچی ہے جو قرآن حمید نے چودہ سو سال پہلے بتائے تھے۔ میں نے کئی دفعہ ڈاکٹر مورس بوکائے (Dr. Maurice Bucaille:1911-1989) کی کتاب The Bible, The Qur'an and Science [1] کا ذکر کیا ہے۔ وہ مسلمان نہیں ہے‘ عیسائی ہے لیکن ان مقامات پہ پہنچ

---

[1] Bucaille, Maurice (Dr.) (1998). The Bible, The Qur'an and Science.Lahore: Islamic Book Service.

کرو ہ بے ساختہ یہ کہتا ہے کہ بائبل کے اندر تو تحریف ہو چکی ہے' وہاں تو یہ کچھ نہیں ملتا' وہاں تو افسانے ملتے ہیں اور قرآن حمید میں یہ جو چیزیں کہی گئی ہیں' وہ چودہ سو سال پہلے کے دور کی ہیں' اس دور کا علم انسانی ابھی اس سطح پہ پہنچا ہی نہیں تھا۔ جو کچھ اس نے کہا ہے' اس کے لیے میں تو یہ کہنے کے لیے مجبور ہوں کہ یہ فکر انسانی کی تخلیق نہیں ہے' فکرِ انسانی اس دور میں یہاں تک پہنچا ہی نہیں تھا۔ کسی ایک فرد کا تو ذکر نہیں ہے' پوری فکر انسانی اس سطح پر نہیں پہنچی تھی۔

یہ جو جہاں (41:9) میں اس نے ارض کے متعلق کہا ہے اور دو آیات آگے چل کر بھی ارض و سما کے متعلق آئے گا' اس میں ارض و سما کی تخلیق کے متعلق سبع ❶ کہا ہے۔ یہ لفظ سات کے علاوہ ''کئی ایک یا متعدد'' کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ یہ ارض و سما مختلف مدارج سے گزر کر یہاں تک آئی' اس نے وہ مدارج بھی گنائے ہیں۔ المختصر زمین کے متعلق صرف یہاں بات آئی ہے۔ یہ تو تخلیق ہو گئی۔ پہلی چیز یہ ہے کہ سابقہ آیت میں تھا کہ یہ جو کچھ تمہیں ملے گا' جسے اس نے اس دنیا میں بھی اور آگے آنے والی زندگی میں بھی' جنت سے تعبیر کیا ہے' یہ تمہیں مفت میں نہیں ملتا' یہ تو تمہارے اپنے کاموں کے معاوضے میں ملے گا' معاوضہ بھی نہیں' قرآن حمید تو اسے ماحصل کہتا ہے: یہ تمہاری اپنی محنت کا ماحصل ہے۔ قرآنِ حکیم کسان کی مثال اسی لیے دیتا ہے۔

انسان کے لیے زندگی میں اعمال کا معاوضہ نہیں بلکہ ماحصل ہے جیسے کسان کے لیے اس کی کھیتی اس کی محنت کا ماحصل ہے

میں عرض کرتا ہوں کہ قرآن حمید کے تو چھوٹے چھوٹے نکات سے بھی یوں آگے نہیں گزر جانا چاہیے' عزیزانِ من! بڑی عظیم حقیقتیں اس میں پوشیدہ ہیں۔ آپ کو یاد ہے کہ میں نے کہا تھا کہ میں معاوضہ یا صلہ بھی اس کا ترجمہ نہیں کرونگا' وہ Wages (اجرتیں) ہوتی ہیں۔ یہ وہی ہے جسے آج ہم اجر کہتے ہیں' وہ کسی کام کا معاوضہ ہوتا ہے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ یہ معاوضہ نہیں ہے جب کسان کھیتی کرتا ہے تو اس کے بعد جو وہ کھیتی پکتی ہے وہ کاٹ کر اپنے ہاں جو گندم گھر میں لاتا ہے تو یہ کوئی اس کا معاوضہ نہیں ہوتا بلکہ محنت کا ماحصل ہوتا ہے یعنی جو کچھ اس نے کیا ہے یہ اس کا حاصل ہے۔

---

❶ لین (Edward William Lane) نے بیضاوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ عربوں میں سبعة سات ہی کو نہیں کہتے بلکہ وہ اسے ان معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں جن معنوں میں ہم کہتے ہیں ''کئی ایک'' (Several) یا ''متعدد'' (Many)۔ لین کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

سبعة is also used…… as meaning Seven or more; or several; or many; as Bd (El-Beydawee) says in 'Exposition of the Kur'an in ix, 81,(Lane, E.W.(1968). An Arabic- English Lexicon (Part 4). Beirut. Lebanon: Librairie Du Liban. p. 1297

سبع (س ب ع) کی مزید تشریح و تصریح کے لیے دیکھیے: پرویزؒ (1960)۔ لغات القرآن جلد دوم۔ لاہور: طلوعِ اسلام' ص ص۔ 838-837۔

معاوضے اور ماحصل میں ایک بنیادی فرق ہے: اُجرت کا معاوضہ ہے اور محنت کا ماحصل ہے

معاوضے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ زمین کسی اور کی ہو اور یہ اس پہ کاشت کرے۔ ہمارے ہاں پنجاب میں اسے کھیتی (Farming) کہا کرتے تھے' وہ جتنا کچھ زمین پیدا کرے' وہ تو زمیندار یعنی زمین کا مالک لے جاتا تھا اور اس کے ساتھ جو طے کیا ہوتا تھا کہ تم نے جو میری زمین پر محنت کی ہے' اس کے معاوضے کے طور پر' میں تمہیں اتنا دونگا۔ یعنی اس پیداوار سے اس کا تعلق نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ تو جو محنتانہ' طے کیا ہوا ہوتا تھا' وہ ملتا ہے۔ جیسے مزدور کو تین روپے روز' دس روپے روز' پندرہ روپے روز پر ہم لے آتے ہیں۔ وہ فیکٹری کے اندر روز کا پچاس روپے کا کام کرے' اسے آپ وہی دس روپے دیتے ہیں۔ یہ تو ہوتا ہے' معاوضہ یا کسی چیز کی Wages اور دوسری چیز محنت کا ماحصل ہوتی ہے' یعنی جو کوئی محنت کرتا ہے تُو جو کچھ اس سے پیدا ہوتا ہے' یہ قرآن کی اکنامکس میں وہ ہوتا ہے۔ یہ معاوضے اور ماحصل میں ایک بنیادی فرق ہے۔ آپ غور کیجیے کہ یہ کتنا چھوٹا سا پوائنٹ ہے لیکن آج کی اکنامکس سے پوچھیے کہ وہ جھوم جاتے ہیں جب وہ یہ فرق دیکھتے ہیں' یہ جو سارا نظامِ سرمایہ داری ہے' یہ Wages (اجرتوں) پر قائم ہے۔ جو کام لینے والا ہے' وہ محض سرمایہ لگا کر فیکٹری کے دس ہزار مزدور یا جتنے بھی کام کرنے والے ہوتے ہیں' وہ جو کروڑوں روپے کا وہاں سے سالانہ Produce (پیدا) کرتے ہیں' اُن کا اس کروڑ میں اتنا ہی ہوتا ہے جتنی ان سے Wages (اجرتیں) طے ہوگئی ہوتی ہیں' یہ باقی سارا سرمایہ دار لے جاتا ہے۔ اور اگر یہ ہو کہ تم جو محنت کرتے ہو' اس سے جو بھی پیدا شدہ چیز ہے' جو بھی اس کا ماحصل ہے' جو بھی وہ تمہاری محنت پیدا کرے گی' وہ تمہارا ہوگا تو یہ ہے قرآن کی اکنامکس کا راز' یہ ہے قرآن حکیم کا معاشی نظام۔

سرمایہ داری نظام میں بھاؤ اس نے خراب کیا جو رات کو بھوکا سویا

عزیزانِ من! یہ سسٹم موجود ہے لیکن دنیا بھر کا جو Capitalistic (سرمایہ داری) نظام ہے وہ اس پہ آنے نہیں دیتا۔ وہ جو لیبر ہے' یعنی جو ان کے ساتھ ان کی محنت کا مقرر کرلیا جاتا ہے' وہ اس کا معاوضہ دیتا ہے۔ وہ معاوضہ مقرر کرنا بھی تو کیا عجیب ہے! وہ ہمارے یہاں پنجاب کا بڑا عجیب انداز ہے: ''بھاہ کن وگاڑیا؟ رات دیاں بھوکیاں نیں''[1] کہ صبح جو آپ مزدوری کے لیے گئے تو ایک نے کہا کہ پانچ روپے' آپ نے کہا کہ نہیں' یہ بہت زیادہ ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ وہ جس کے گھر میں رات روٹی نہیں پکی تھی اور آج دوپہر کو بھی نہیں پکنی تاوقتیکہ اس کو کچھ ملے نہیں' اسے جو دو گے وہ اس پر راضی ہو جائے گا۔

---

[1] بھاؤ کس نے خراب کیا؟ جی' انہوں نے جو رات کو بھوکے سوئے تھے۔

سرمایہ داری نظام میں محنت کا معاوضہ مقرر کرنے کا حق سرمایہ دار اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے

عزیزانِ من! Capitalistic System (نظام سرمایہ داری) کا راز یہ ہے کہ مزدور کو بھوکا مارو تا کہ وہ تمہاری شرائط کے اوپر کام کرنے کے لیے آ جائے۔ یہ ہے wages (اجرتیں) کا راز اور یہ لیبر (مزدوروں) کے اور Capitalistic (سرمایہ دار) مالک کے جس قدر یہاں جھگڑے ہوتے ہیں، وہ یہی ہوتے ہیں کہ صاحب! ہمارا معاوضہ زیادہ کرو، اس میں کچھ زیادہ سہولت دو، کچھ زیادہ بونس دو، یعنی Wages (اجرتیں) بڑھاؤ اور آپ ہیں کہ جو جی میں آئے کرتے جاؤ، Wages (اجرتوں) کے اعتبار سے آپ دیکھیں گے کہ وہ System (نظام) وہی رہے گا۔

ماحصل کے سلسلہ میں قرآن حکیم زراعت کی مثال پیش کرتا ہے۔ کیوں؟

زراعت کا سسٹم قرآن حکیم نے قائم کیا کہ اچھی زمین ہو، اچھا بیج ہو، قانونِ زراعت کے مطابق محنت ہو اور اس کے بعد اس زمین سے جو پیدا ہوگا وہ اس کا ہوگا جس نے یہ محنت کی ہے۔ وہ ہر جگہ مثال ہی یہ دیتا ہے۔ اس سے پہلے ذہن میں نہیں آتا تھا کہ وہ یہ خاص مثال کیوں بار بار دیتا ہے؟ وہ اسی لیے دیتا ہے۔ آج اکنامکس سے پوچھیے۔ انہوں نے اس وقت Wages (اجرتوں) میں اور محنت کے ماحصل میں، یہ فرق بتایا ہے۔ جو محنت سے Produce ہوتا ہے، وہ Production ہے۔ آج کے جو اکنامسٹ ہیں، وہ Production میں اور Wages میں فرق کرتے ہیں، اس فرق سے اکنامکس کے دو الگ الگ سسٹم بنتے ہیں۔ یہ ہیں قرآن حکیم کے وہ نکات، عزیزانِ من! جہاں کھڑے ہو کر سوچنا پڑتا ہے۔ محنت کا اگر آپ معاوضہ کہتے ہیں تو معاوضے میں ہی، یہ اس سے پہلی آیت میں جو کہا ہے کہ جو تمہارے ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں پیدا ہو کر تمہیں ملتا ہے، وہ تم پر احسان نہیں ہے، وہ تو تمہاری محنت کا ماحصل ہے۔

پہلی چیز تو یہی ہوگئی کہ خدا بھی اپنا احسان نہیں گنا تا کہ جو ہم دے رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تم نے یہ محنت کی تھی، تمہارے کام کا یہ نتیجہ ہے۔ وہ اسے اس کا معاوضہ نہیں کہتا، اسے Wages نہیں کہتا۔ کہتا ہے کہ یہ اس کا نتیجہ ہے۔ آپ دیکھیے گا کہ بظاہر ایسا نہیں نظر آتا تھا کہ اس میں بھی کوئی اہم نکتہ مضمر ہے کہ Wages (اجرتوں) کی بجائے اس نے ماحصل کہا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ Age of Economics (معاشیات کا زمانہ) ہے۔ آج ہمارے ہاں کی اکنامکس (معاشیات) سے پوچھیے کہ وہ ان دونوں کے فرق سے دو سسٹم آف اکنامکس کی عمارت Build (تعمیر) کرتے ہیں۔ اب اس سے پہلی بات سمجھ میں آ گئی کہ وہاں تو عمل کے نتیجے میں یہ کہا ہے۔

ہر وہ شے جو خدا اپنی طرف منسوب کرے وہ پوری انسانیت کے لیے مشترکہ طور پر باعثِ منفعت ہوتی ہے

اگلی آیت میں یہ کہا کہ یہ جو زمین ہے ہم نے بنائی ہے۔ اب سیدھی سی بات ہے کہ اس کے اندر، اس زمین کے وجود میں آنے میں، اپنی صلاحیتوں کے ساتھ جو کچھ زمین پہ ہے، اس میں تمہارا تو کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ تو ہم نے بنائی ہے۔ اب جو کسی کی ملکیت ہی نہیں ہے،

اس میں وہ دخل کی بات ہی نہیں کرتا۔ وہاں کہا ہے کہ اس میں ہم کوئی احسان بھی نہیں کر رہے جو کچھ تمہیں دے رہے ہیں۔ یہاں کہہ رہے ہیں کہ یہ جو چیز ہم تمہیں بتا رہے ہیں' اس میں تمہارا کوئی دخل ہی نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ یہ تو ہم نے بنائی ہے' تمہارا اس میں کیا ہے۔ دیکھا کیا فرق ہے! اور یہ کچھ کہنے کے بعد آگے یہ کہا ہے کہ **تَجۡعَلُوۡنَ لَہٗۤ اَنۡدَادًا** (41:9)۔ سطحی نگاہوں کو اس میں ربط نہیں نظر آتا کہ ہم نے زمین کو بنایا ہے' دو مرحلوں میں سمجھیے' اس قابل بنا دیا ہے کہ تم وہ پیداوار کر سکو اور اس میں سے یہ چیزیں پیدا ہو جائیں۔ یہ ہم نے دو مراحل میں کیا ہے۔ چلیے مراحل کی بات تو طبیعات کے متعلق آ گئی۔ اگلی بات اس کے ساتھ ہی' اسی سانس میں قرآن حکیم کہہ رہا ہے کہ پھر تم کسی کو خدا کے شریک نہیں ٹھہرا سکتے۔ کھڑے ہو کر حیرت میں گم ہیں کہ ان میں ربط کیا ہے۔

خدا کی پیدا کردہ زمین پر ذاتی ملکیت کا تصور شرک ہے' پھر زمین کی خرید و فروخت کیسے اور وراثت کیسی؟

پہلا حصہ عمل کا ہے کہ جو تمہارے کام کا نتیجہ ہے اس میں ہمارا بھی کوئی احسان نہیں۔ اگلا ٹکڑا یہ ہے کہ یہ جو زمین ہے بمعہ اپنی تمام صلاحیتوں کے اور جو کچھ اس کے اندر ہے' وہ ہم نے پیدا کیا ہے' تمہارا اس میں دخل ہی نہیں۔ اس کے ساتھ یہ چیز ہے کہ اب خدا کے ساتھ تم شریک نہیں بنا سکتے۔ اب یہ تو ٹھیک ہے کہ زمین تو اس نے پیدا کی ہے' تو کون یہ کہہ سکتا ہے کہ نہیں صاحب! اس اکیلے خدا نے پیدا نہیں کی تھی' اس کے ساتھ اور بھی شریک کر لیتے ہیں مثلاً ہندوؤں کے ہاں تو وہ پہلے ہی تین خدا برہما' شِو اور وشنو بنا لیتے[1] ہیں' وہ کہہ رہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔ زمین کی تخلیق میں یا کائنات کی تخلیق میں تو کسی کو شریک کرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ تم پھر اس کے شریک بنا دیتے ہو۔ یہ شرکت کیا ہے جس سے منع کیا گیا ہے؟ ایک سیکنڈ میں کھڑے ہو کر آپ کا ذہن اس سوال کا جواب دیدیگا کہ خدا کہتا ہے کہ زمین ہم نے بنائی ہے' تم میں سے کوئی اس میں شریک نہیں تھا' اس لیے ہم اس کے واحد مالک ہیں۔ زمین میں کسی کو مالک تصور کرنا شرک ہے۔ زمین کو ذاتی ملکیت میں دیدینا شرک ہے۔ ویسے تو یہ ساری کائنات خدا کی ہے لیکن جس چیز کو خاص طور پہ اس نے کہہ دیا کہ یہ خدا کی ہے تو اس کے معنی ہیں کہ اس کی ملکیت کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے۔ کعبہ کو اس نے کہا کہ یہ بیت اللہ ہے' یعنی ہمارا گھر ہے۔ ویسے تو وہ ساری کائنات تمہارا گھر ہے' خاص طور پہ اس کے لیے کیوں کہا کہ یہ ہمارا گھر ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی انسان کی ملکیت میں نہیں جا سکتا وہ تو اس لیے ہے کہ **قِیٰمًا لِّلنَّاسِ** (5:97) تمام نوع انسانی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے۔ ساری دنیا کے انسانوں کے لیے اس کے دروازے کھلے ہونے چاہئیں۔ دیکھا ''بیت'' کے معنی کیا ہو گئے۔ یہ عجیب قسم کا مالک ہے کہ آپ تو کبھی ایک دن بھی آ کر اس میں نہیں رہتا لیکن کہتا یہ ہے کہ صاحب! اس کے دروازے ساری دنیا کے لیے کھلے ہونے چاہئیں۔ جہاں بھی قرآن کریم

---

[1] حوالے کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں' طلوع اسلام (ٹرسٹ رجسٹرڈ)' لاہور' 1996' ص۔ 96۔

نے کوئی چیز خدا کی طرف منسوب کی ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ اب یہاں جو کہا ہے کہ ہم نے زمین کو بنایا ہے تو زمین اس کی واحد ملکیت ہوگئی۔ اب اس زمین کے اوپر کسی انسان کی ملکیت تصور کرنا یا اس کی جو ملکیت ہے اس پر اس کا حق قرار دیدینا' As of right (بطورِ حق) دیدینا' صحیح نہیں ہے۔ حقوقِ ملکیت کی سی ہمارے ہاں بھی اصطلاحیں ہیں۔ یہ تصور میں نہیں آسکتا کہ اس کی جو تخلیق ہے' جس میں انسان کا کوئی حصہ نہیں ہے' پھر وہ انسان کی ملکیت کیسے ہوگئی۔ آپ یہی کہیں گے کہ میں نے فلاں سے خریدی ہے تو وہ تو اس کے پاس چوری کا مال تھا' جس نے بیچی ہے اس کو حقِ ملکیت کس نے دیدیا تھا۔ چوری کا مال خریدنا اسی طرح جرم ہے جیسے چوری جرم ہوتی ہے۔ خریدتے وقت پہلے دیکھتے ہو کہ بھئی! وہ زمین کا ٹکڑا جو میں خرید رہا ہوں' اس کی جائز ملکیت میں بھی ہے۔ یہ روز ہوتا ہے۔ دفترِ مال کے کاغذوں میں دیکھتے ہو' پٹواری سے پوچھتے ہو' رجسٹرار سے پوچھتے ہو کہ جی! وہ کسی اور کا اس کے اوپر حق تو نہیں ہے' یہ اس کی واحد ملکیت ہے۔ اس کی واحد ملکیت ہو تو پھر خریدتے ہو ورنہ وہ تمہاری نہیں ہوسکتی۔ جس سے تم نے خریدی ہے اس کی ملکیت سے متعلق تم نے اطمینان کرلیا ہے کہ یہ اس کی ملکیت ہے۔ خدا کہتا ہے کہ یہ کس طرح سے ہے؟ یہ تو ہم نے بنائی تھی' کوئی انسان ایسا نہیں تھا جو اس کے اندر شریک ہو۔ ہماری زمین ہے تو اس نے تمہارے ہاں بیچی کیسے اور تم نے وہاں سے خریدی کیسے؟ کہ جی نہیں' خریدی نہیں' مجھے تو باپ کے ترکے میں' وراثت میں ملی ہے۔ پوچھو کہ تمہارے باپ نے کہاں سے لی تھی؟ چوری کا مال' ڈاکے کا مال' وہ وراثت میں آگے جا کر کیسے اس کی ملکیت ہوگیا۔ اتنی سی بات ہے کہ ارض ہماری تخلیق ہے' کوئی اس میں شریک نہیں ہے۔ ہماری ملکیت ہے' یہ کسی کی ملکیت نہیں ہوسکتی۔

عزیزانِ من! یہ قرآن حمید یوں نہیں ہے کہ اس کو جھوم جھوم کر پڑھ لیا اور آگے چلا گیا۔ اس کا تو ایک ایک مقام ایسا ہے جہاں کھڑے ہونا پڑتا ہے۔ یعنی آپ دیکھیے جو میں عرض کر رہا ہوں' یہ نہیں ہے کہ (خدانکردہ) مجھ پہ وحی ہوتی ہے۔ قرآن حمید نے تدبر کہا ہے' تفکر کہا ہے۔ میرے سامنے بھی یہ چیزیں یہ ٹکڑے آئے کہ اعمال کا نتیجہ قرآن حمید غیر ممنون بتاتا ہے کہ اس پہ ہمارا احسان بھی نہیں ہے کہ جو کچھ اس کے نتیجے میں ملتا ہے اور ماحصل ملتا ہے' وہ اس کی Wages (اجرتیں) نہیں ملتیں' یہ نہیں ہے کہ جو تم محنت کرتے ہو وہ ہم لے جاتے ہیں اور تمہیں اس میں سے کچھ دیدیتے ہیں۔ وہ سارا تمہارا ہوتا ہے۔ آگے یہ بات آئی کہ یہ جو ارض ہے اس میں سے چپہ بھی تمہارا نہیں ہوسکتا' ساری ہماری تخلیق ہے' ہماری ملکیت ہے۔ اور اس کے بعد یہ چیز کہ پھر اس میں تم ہمارے شریک کیسے پیدا کرسکتے ہو؟ تخلیق کے مرحلے میں تو کوئی بھی شریک نہیں پیدا کرتا۔ ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ جب خدا نے بنانی شروع کی تھی تو اس میں یہ یہ بھی اس کے ساتھ شامل تھے۔ شرکت یہاں اس دنیا میں آتی ہے' شریک ہم یہاں بناتے ہیں' شرک یہاں آتا ہے کہ زمین جو خدا کی واحد ملکیت ہے اس میں کسی دوسرے کو کسی حصے کا بھی مالک سمجھ لینا' یہ خدا کا شریک بنا دینا ہے۔

قرآن حکیم نے اسی لیے کہا ہے: یہیں نہیں کہا بلکہ بیشتر مقامات پہ یہ چیز آئی ہے' ایک اور حوالہ میں دیدوں تاکہ بات ذرا اور پختہ

ہوجائے۔ سورۃ البقرۃ کے ابتدا میں ہی کہا کہ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ ❶ (2:22)۔ یہ پوری نوع انسانی کے لیے ہے۔ یہ ابتدا میں خطاب یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ (2:21) ہے۔ عزیزانِ من! اگر آپ کو قرآن حکیم سے گہری دلچسپی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہے ہی' اسی لیے تو آپ اپنا وقت صرف کرکے درس سننے کو آجاتے ہیں' دلچسپی ہے تو یہ نکات ذہن میں رکھیے' بعد میں آپ کو خود قرآن حکیم پہ اس طرح غور کرنا ہوگا۔

قدرت نے زمین یعنی رزق کے سرچشمے کو پوری انسانیت کے لیے پیدا کیا ہے کسی کی ذات ملکیت کے لیے نہیں

اگلی بات جو کہی ہے دیکھیے اس بات کی ابتدا اس نے کہاں سے کی ہے۔ کہا کہ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ (2:21) پوری نوعِ انسانی سے یہ کہا ہے۔ کہا یہ ہے کہ ہم نے زمین بنائی' ہم بارش برساتے ہیں' ہم اس زمین کو باہر سے محفوظ رکھتے ہیں' ہم یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ یہ سارا کچھ ہم نے کاہے کے لیے کیا ہوا ہے؟ اس لیے کہ رِزۡقًا لَّکُمۡ (2:22) تمام سامانِ زندگی تمہیں خدا کی طرف سے بلا مزدور معاوضہ ملے۔ اس سے پوری نوعِ انسانی کو ہمارا رزق پہنچانا مقصود ہے۔ اس حصے میں تمہارا کوئی دخل ہی نہیں ہے۔ یہ تو سب ہم نے کیا ہے۔ اور اس کے آگے ہے فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا (2:22) خدا کا شریک تو کسی کو نہ بناؤ۔ جونہی آپ نے ان میں سے کسی چیز پہ ملکیت تصور کر لی اور ملکیت جائز قرار دیدی تو مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡدَادًا ❷ (2:165) ہوگیا۔ اس لیے کہ وہ رِزۡقًا لَّکُمۡ (2:22) نہ رہا' وہ اس کا ہوگیا جس نے وہ زمین خرید لی ہے' وہ شریک بن گیا ہے۔ وہ جس نے بنائی تھی' یہ کہتا تھا کہ یہ رِزۡقًا لَّکُمۡ (2:22) ہے' آپ اسے رزقاً للناس کہہ لیجیے کیونکہ پہلے یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ (2:21) کہا ہے پھر لَکُمۡ (2:22) کہا کہ پوری انسانیت کے لیے۔ اس نے کہا تھا کہ ہم نے تو یہ سارا کچھ اس لیے کیا تھا کہ پوری نوعِ انسانی کو رزق ملے اور اگر اس کی کیفیت تم نے یہ کر دی کہ جس نے جھپٹ لیا وہ اس کی ملکیت ہوگئی' اب اس کا جی چاہے کسی کو دے' جی چاہے نہ دے' مالک جو وہ ہوگیا۔ یہاں یہ کہا ہے کہ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (2:22) تم ایسا نہ کرنا کہ انسانوں کو اس کا مالک بنا دو۔ تم جانتے ہو کہ اس زمین کے بنانے میں' اس بارش کے برسانے میں'

---

❶ یہ حفاظت تمہیں خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کی رو سے مل سکے گی جس کے مطابق اس نے تمہارے لیے زمین میں ٹھکانے کا سامان پیدا کر دیا۔ اوپر فضا میں کُرے بکھیر دیئے تاکہ باہمی کشش وجذب سے یہ اپنی اپنی جگہ برقرار ہیں۔ پھر ایسا انتظام کر دیا کہ آسمان سے پانی برسے جس سے تمہارے لیے سامانِ رزق پیدا ہو (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔8)۔

❷ خدا کے علاوہ اور ہستیوں کے متعلق بھی سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی اقتدارات واختیارات کی مالک ہیں جو خدا کو حاصل ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔59)۔

تمہارا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ کسی سے پوچھ لیجیے۔ وہ کہے گا کہ صاحب! بات تو یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اور کوئی ایسا گہرا فلسفیانہ مسئلہ نہیں' کہ یہ سمجھنے کے لیے کسی ارسطو کے پاس جانا پڑے گا کہ زمین ہم نے نہیں بنائی تھی۔ **اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ** (2:22)۔ اور جب یہ تم جانتے ہو کہ یہ اس کی ملکیت ہے' اسی نے بنائی تھی' تمہاری نہیں' تو پھر یہ جو آپ کا تصورِ ملکیت ہے' یہ تو اس کے شریک بنانے والی بات ہے۔

قدرت کاشتکار سے صرف اپنا حصہ ہی طلب کرتی ہے' اس کی ذات ملکیت کو تسلیم نہیں کرتی: بیٹھ کر حساب کرلو

عزیزانِ من! قرآن کریم کا تصریفِ آیات کا انداز ہوتا ہے کہ ایک مقام پہ ایک بات وہ نکتے کے طور پر بیان کرتا ہے' اور دوسرے مقام پہ اس کی تشریح کرتا چلا جاتا ہے۔ اب زمین ہے۔ کہا ہے کہ ہم نے بنائی ہے۔ زمین میں سے پیداوار کے لیے تو ظاہر ہے کہ کاشتکار ہے' وہ محنت کرتا ہے' اب یہ اسے کہہ سکتا ہے کہ ٹھیک ہے جی' یہ زمین جو آپ نے بنائی' اگر آپ کی زمین جیسے پڑی ہوئی تھی' پڑی رہنے دیتے تو اس میں سے پھر تو کچھ بھی نہ اگتا۔ ہم نے محنت کی' اس میں سے پیداوار ہوئی۔ یہ بات تو اس نے ٹھیک کہی' اور یہ جو کچھ اس میں سے پیداوار ہوئی' وہ ہماری ہے۔ کہا کہ آؤ حساب کریں۔ یہ جو زمین ہے یہ تو تمہاری نہیں تھی۔ مالک تم تھے نہیں۔ تم نے اس پہ محنت کی' اس میں سے کچھ پیدا ہوا۔ تو یہ ایسے ہی ہے جیسے آج کل ہمارے ہاں بٹائی پہ زمین لے لیتے ہیں کہ مالک کوئی ہوتا ہے' کاشتکار کوئی ہوتی ہے' پھر اس میں سے جو پیدا ہوتا ہے' وہ جو حقِ ملکیت ہے وہ مالک کو دیدیتے ہیں' یہ جو اس میں اس نے محنت کر کے لیا ہوتا ہے اگرچہ یہ پہلے طے کر لیتے ہیں تو وہ اس کو ملتا ہے۔ تو دیتے ہو حقِ ملکیت کا کسی کو۔ کیا انداز ہے اس کے سمجھانے کا! کہا: آؤ حساب کرتے ہیں۔ یہ زمین اور اس میں سے یہ پیدا ہوا' آؤ تو اب ذرا آپ کے ساتھ حساب کر لیں یہ جو تم اٹھا کر سارے کا سارا اپنے گھر میں لے جا رہے ہو' ذرا بیٹھ کر حساب تو کر لیں کہ یہ زمین کس کی تھی' جس میں سے یہ پیدا ہوا۔ تم یہی کہو گے کہ جی! ہم نے محنت کی' اس کی وجہ سے پیدا ہوا۔ کہنے لگے: ہم مانتے ہیں لیکن آؤ ذرا بیٹھ کر حساب کریں۔ کیوں سارے کا سارا لے جا رہے ہو؟ **اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَحۡرُثُوۡنَ** (56:63) یہ جو تم کاشت کرتے ہو۔ **ءَ اَنۡتُمۡ تَزۡرَعُوۡنَہٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الزّٰرِعُوۡنَ** (56:64) زمین میں سے یہ جو فصل پیدا ہوتی ہے' دانے پیدا ہوتے ہیں' پھر یہ پکتا ہے۔ بتاؤ کہ یہ سارا کچھ ہمارے قانون کے مطابق ہوتا ہے یا تمہاری کاریگری سے ہوتا ہے؟ تم نے تو صرف زمین کو جوتا' اس میں تم نے بیج ڈال دیا' کچھ پانی دیا' صرف اتنا کچھ کیا۔ یہ چیز کہ زمین میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اس قاعدے کی رو سے اس میں یہ کیا جائے تو ایک دانے کے بدلے میں سات سات سو دانے ملتے ہیں۔ کیا یہ بھی تمہارا مقرر کردہ ہے؟ یہ کس کا مقرر کردہ ہے؟ کہدو گے کہ ہاں صاحب! بات تو ٹھیک ہے' یہ تو ہمارا نہیں ہے یہ تو تمہارا ہی ہے۔ آگے کہا کہ **لَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنٰہُ حُطَامًا فَظَلۡتُمۡ تَفَکَّہُوۡنَ ○ اِنَّا لَمُغۡرَمُوۡنَ** (56:65:66)۔ تو یہ سب ہمارا بیکار ہو کر رہ جاتا ہے اگر وہ جو توانائی کا سرچشمہ ہے' وہ اس کا گلا گھونٹ دے۔

کاشتکار کی محنت اور زمین کی صلاحیت کا لیکھا' کیا ہی عمدہ حساب ہے!

کہا کہ اگر ہم اس زمین کے اندر یہ صلاحیت نہ رکھیں یا کبھی رکھنے کے بعد جیسے بجلی فیل ہو جاتی ہے' ہم کسی وقت زمین سے ایسا کہیں کہ یہ نہ اُگانا' تو تم اس زمین کے اوپر جو جی میں آئے کر لو فصل نہیں ہوگی۔ اس میں یہ ایک دانے کے سات سات سو تو ایک طرف رہا' جو بیج تم نے ڈالا ہے وہ بھی تمہیں چٹی پڑ جائے گی' وہ بیج تو ضائع ہو گیا' مٹی میں مل گیا' وہ بیج بھی واپس نہیں ملے گا' کہو کہ اس میں کچھ ہمارا بھی حصہ ہے جو یہ پیدا ہوا ہے؟ کیا عجیب انداز ہے! دیکھتے ہیں' عزیزانِ من! یہ "لیکھا کس طرح اوندا پیا ہیگا" یعنی حساب کیسے ہو رہا ہے۔ وہ دلائل دیئے جا رہے ہیں کہ کوئی انکار ہی نہ کرے۔ کیا ٹھیک ہے جو ہم کہہ رہے ہیں؟ ہاں جی! وہ ٹھیک ہے۔ وہ جو کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ زمیندار کے آگے آ کر روتا ہے "کہ جی او ساری فصل ای ماری گئی ایت کی تے۔"[1] کیا ہوا تھا؟ کہا کہ اگر یہ چیز ہو تو فصل میں پیدا ہونا تو ایک طرف رہا' تمہارا جو بیج بھی ہے' وہ بھی ضائع ہو جائے' تمہیں اس کی بھی چٹی پڑ جائے۔

خالق کی قائم کردہ واٹر سپلائی اور حرارت کا ایک بصیرت افروز سسٹم

کہا کہ اَفَرَاَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ [2] (56:68:69)۔ بیج ڈال دیا' یہ سب کچھ کیا' اب اس کے بعد پانی ملنا ہے۔ یہ بھی ضروری چیز ہے۔ کہا ہے یہ جو بارش برستی ہے اس کا انتظام تم کرتے ہو یا یہ انتظام ہمارا کیا ہوا ہے؟ میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ یہ جو اللہ میاں کا واٹر سپلائی سسٹم ہے وہ تو عجیب و غریب ہے۔ اس کے سسٹم سے الگ' سمندر میں سے ڈول بھر پانی لینے کے لیے مملکتیں اپنے کروڑوں روپے صرف کر رہی ہیں۔ سمندر کرہ ارض کا 4/5 حصہ ہے۔ کتنا پانی ہے لیکن یہ ایک گھونٹ پانی نہ پی سکتے ہو' نہ یہ پانی فصل کے کام آ سکتا ہے۔ اچھی بھلی کھیتی ہو' اس کے اوپر یہ ڈال دیا جائے تو اسی وقت جل جاتی ہے' آدمی یہ ایک گھونٹ پی لے تو مر جاتا ہے۔ اس قسم کے پانی کا انتظام' یہ واٹر سپلائی کہ اس میں سے اسی کی توانائی جو سورج دے رہا ہے' وہ بھی تمہاری نہیں ہے' اس سے اس سمندر سے وہ پانی کشید کر کے' اس کے اندر جتنے یہ زہریلے اور کھارے مادے ہیں وہ سارے نیچے رہ جاتے ہیں جو کشید شدہ پانی ہے' وہ خود بخود اوپر اٹھتا چلا جاتا ہے' وہ سورج کی روشنی سے اٹھتا ہے۔ اس میں بھی انسان کا کچھ دخل نہیں ہے۔ وہ کشید شدہ پانی اٹھتا چلا جاتا ہے وہ اتنی سی ٹیوب ہوتی ہے' جو یہاں سے Water Distilled (کشید شدہ پانی) کی

---

[1] یہ تو ساری فصل ہی تباہ ہو گئی ہے۔

[2] پھر ذرا تم اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی کا ہی نہیں' بلکہ خود تمہاری زندگی کا دارومدار ہے (56:68)۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1271)۔

ڈاکٹروں کے Injection (ٹیکے) کے لیے ملتی ہے۔ وہ پانی انہیں چاہیے ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کہ یہ ایک روپے یا دو روپے کی ملتی ہے' یہ اتنی سی Distilled Water کی شیشی۔ اب یہی سمندر کا پانی اوپر جا کر بادل بن جاتے ہیں۔

اب اگر وہ بادلوں کی شکل میں ہی ادھر سے اُدھر رقصاں رہیں' چلتے پھرتے رہیں' تو ہمارے کس کام آئے۔ پھر ہوائیں ان کو لیے جا رہی ہیں۔ یہ پوچھیے ٹیکنالوجی والوں کو' کہ یہ ہوائیں کس طرح کس سمت میں ان کو لے جاتی ہیں۔ وہ لیے چلی جا رہی ہیں۔ کسی خاص مقام کے اوپر جا کر ٹمپریچر Low (کم) ہوتا ہے' وہ جو بادل ہے' ہوا سے ہلکا ہے وہ وہاں ہوا سے بھاری پانی بنتا ہے اور نیچے گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ ہے جس سے یہ کھیتی اگتی ہے۔ یہ ہے خالص' کشید شدہ پانی' (Distilled Water) اور پھر وہ دریاؤں کی صورت میں' نہروں کی تعداد میں اتنی فراوانی سے جتنے کی ضرورت ہے وہ ہوتی ہے' باقی سارے کا سارا جتنا بھی ہے وہ ضائع نہیں کرتا' پھر وہیں اسی سمندر میں جا ملتا ہے۔ اگر یہ کہیں راستے میں ہی گم ہونا شروع ہو جائے تو وہ بہرحال دو چار برس نہیں تو پانچ چار ہزار برس کے بعد ہی سمندر خالی ہو جائے۔ وہ سسٹم ایسا ہے کہ اس کے بعد وہ سارا وہیں چلا جاتا ہے۔ کچھ آپ کے ہاں کنوؤں میں آ جاتا ہے۔ کہا کہ **اَفَرَاَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِىْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ** (56:68:69)۔ کیا یہ سارا سسٹم تمہارا پیدا کیا ہوا ہے یا ہمارا پیدا کیا ہوا ہے؟ حساب کر رہے ہو کھیتی کی پیداوار کا۔ **لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ** (56:70)۔ اگر یہ سسٹم نہ ہوتا تو یہ پانی خواہ تمہارے گھر کے قریب کیوں نہ ہوتا' یہ ایک دانہ اگانا تو ایک طرف' اگی ہوئی جو فصل ہے وہ بھی جل جاتی ہے اگر اس پانی کا چھینٹا پڑ جائے۔ یہ ہمارا سسٹم ہے اس کے صدقے میں تو تمہیں یہ کچھ ملا ہے۔ اب بتاؤ کیا کہتے ہو؟ کہا کہ **فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ** (56:70) حیرت ہے کہ تم اس قدر صاف اور سیدھے معاملہ پر اس نہج سے غور کر کے صحیح نتیجے تک کیوں نہیں پہنچتے اور نشوونما کے متعلق خدا کے نظام کی قدرشناسی کیوں نہیں کرتے۔ پھر کہا کہ **اَفَرَاَيْتُمُ النَّارَ الَّتِىْ تُوْرُوْنَ ۝ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ** [1] (56:71:72)۔ دو معنی ہو سکتے ہیں: آگ بھی اور حرارت بھی۔ کھیتی کے لیے حرارت کی ضرورت ہے۔ اب اِدھر پانی کی ضرورت' اُدھر حرارت کی ضرورت۔ وہ جو ہمارا سورج ہے یہ اتنا بڑا سرچشمہ حرارت ہے۔ کیا اس کے اندر تم نے کوئی ایندھن ڈال رکھا ہے یا یہ ہماری پیدا کردہ حرارت ہے؟

---

[1] اسی طرح تم اس آگ پر غور کرو جسے تم روشن کر کے اس سے اتنے کام لیتے ہو۔ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں سے حرارت کو یوں سمٹا کر رکھ دینا' رگِ خس میں شعلے کو پنہاں کر دینا' تمہاری کاریگری سے ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1271)۔

سبز ٹہنیوں میں آگ کے یہ شعلے اور ان کے پانی سے پٹرول حاصل کرنے کی کوشش

اور پھر اس کے بعد تمہاری ضرورت کے لیے جس آگ کی ضرورت ہوتی ہے' وہ کہاں سے لیتے ہو؟ درختوں کی لکڑیاں ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ تو سبز ہوتی ہیں۔ سبز لکڑیوں کے اندر یہ آگ محفوظ کر کے رکھ دی گئی ہے۔ یہ آپ دیکھتے ہیں۔ کیا یہ تمہاری پیدا کردہ ہے؟ آج کل میں نے ایک آرٹیکل پڑھا تھا۔ اس میں یہ تھا کہ اس پر تحقیق ہو رہی ہے کہ یہ نہیں ہے کہ جب یہ لکڑیاں یا درخت کی ٹہنیاں خشک ہو جاتی ہیں تو پھر یہ جلنے کے قابل ہوتی ہیں۔ انہوں نے یہ بتایا کہ جب یہ ابھی ہری ہوتی ہیں' ویسے ان کے اندر تو پانی سا ہوتا ہے' اس کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ یہ ''ہرا پن'' کیا ہے۔ اب یہ اس نظر بظاہر پانی سے پٹرول بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سبز ٹہنیوں کے اندر آگ اس طرح سے مضمر ہوتی ہے۔ کیا کہا گیا ہے (مرزا اسداللہ خاں) غالب (1797.1869)!

شعلہ خس میں جیسے' خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا [1]

یہ شعلے خس میں نہاں ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بتاؤ کیا تم یہ کرتے ہو یا ہماری کاریگری ہے؟

اس قدر احسانات کی بارش کے باوجود احسان نہیں' بلکہ صرف ایک حقیقت کی یاددہانی ہے: حساب کرلو

کہا ہے کہ **نَحۡنُ جَعَلۡنٰهَا تَذۡكِرَةً** [2] (56:73)۔ ہم نے یہ سارا کچھ بیان کیا ہے کہ یہ کچھ اس لیے نہیں ہے کہ ہم احسان جتا رہے ہیں بلکہ تمہیں ایک حقیقت کی یاددہانی کرا رہے ہیں اور وہ یاددہانی یہ کرا رہے ہیں کہ تم جو یہ سمجھ رہے ہو کہ زمین بھی میری ہے اور پھر اس کے اوپر محنت کی ہے تو وہ ساری کھیتی بھی میری ہے۔ اگر ذرا حساب کر رہے ہو تو دیکھ لو کہ اس میں تمہارا کتنا ہے اور ہمارا کتنا ہے؟ ہم ایسے شریک کاروبار نہیں ہیں کہ دھاندلی سے کچھ لے جائیں۔ ایمانداری سے حساب کے مطابق لیں گے۔ تم حساب کر کے بتا دو کہ اس میں تمہارا حصہ کتنا ہے اور ہمارا حصہ کتنا ہے۔ وہ جو ساری Basic (بنیادی) چیزیں ہیں' وہ گنائی نہیں ہیں' وہ تو خدا کی ہیں۔ اس کا انکار ہی کوئی نہیں کر سکتا۔ تمہاری تو محنت ہے۔ کہا کہ ہم نے یہ اصول بنایا ہے کہ **لَيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى** (53:39)۔ آیئے ذرا دیکھیے کہ Proportionally (تناسب سے) کتنا بنتا ہے؟ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس میں تو 90% سے بھی زیادہ تمہارا یعنی خدا کا بنتا ہے۔ تو لؤ اپنا حصہ لے لو' ہمارا حصہ ہمیں دیدو۔ وہ کہے گا کہ بہت اچھا سرکار' یہ پڑا ہوا ہے لے جایئے' اٹھا لیجیے۔ وہ سرکار تو سامنے ہے ہی نہیں۔ کہا کہ میں تو دینے کے لیے تیار ہوں لیکن دوں کسے؟ آپ تو ہیں نہیں۔ عزیزانِ من! بڑی توجہ سے سنیے' ایک لفظ ہے۔ کہا کہ کیا ہم تمہیں نظر نہیں آتے؟ **وَّمَتَاعًا لِّلۡمُقۡوِيۡنَ** (56:73)۔ یہ بھوکوں کو دیدو' ہمیں مل جائے گا۔ یہی یاددہانی ہے

---

[1] گرنگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط۔ شعلہ خس میں جیسے' خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا۔

[2] یہ تمہیں ایک حقیقت کی یاددہانی کراتے ہیں کہ...... (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1271)۔

کہ یہ تمام ذرائع پیداوار' از خود موجود رہتے ہیں۔ انہیں خدا نے بھوکوں کے لیے سامان زندگی بنایا ہے۔

خالقِ کائنات اپنا یہ حصہ تمام انسانوں کے لیے محفوظ رکھتے ہیں اور تم صرف اپنی ذات تک رکھتے ہو

یہ قرآن حکیم ہے' عزیزانِ من! یہاں کہا تھا کہ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا (41:9)۔ کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ بناؤ' جو اس کا حصہ ہے اس میں کسی کو شریک نہ بناؤ۔ اس نے کاہے کے لیے اپنا حصہ رکھا ہے؟ یہاں کہا ہے کہ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (41:9) عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کے لیے ہم نے یہ انتظام کیا ہوا ہے۔ ہمارا حصہ اس مقصد کے لیے مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ (56:73) بھوکوں کو دیدیجیے۔ یہ انتظام کیجیے' ہمیں مل جائے گا۔ کہا کہ ہم نے تم سے کوئی دھاندلی تو نہیں کی' مار تو نہیں دیا۔ دھاندلی تو تم کرتے ہو کہ جو ہمارا حصہ ہے وہ خود لے جاتے ہو۔ یہ تو نہ کرو۔ اگلی آیت ہے کہ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (56:74)۔ یہ ربوبیت تم بھی کچھ کرتے ہو لیکن تم اس کو صرف اپنے ہی گھر والوں تک' اپنے ہی خاندان تک' اپنے ہی تک محدود رکھتے ہو۔ اپنی دیوار سے جو آگے ہے وہاں تم نہیں جاتے۔ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (56:74)۔ ہماری جو ربوبیت عظمیٰ ہے' وہ عالمینی ربوبیت ہے۔ ہم اس کے لیے یہ کہتے ہیں کہ یہ تم بھی کرو۔ تم بھی کرتے تو ہو لیکن وہ عظیم نہیں ہے' وہ محدود ہے' انفرادی ہے' اسے اپنی ذات تک رکھتے ہو۔ ہم پوری نوعِ انسانی کے لیے رکھتے ہیں۔

سال بھر کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قدرت کے واٹر سسٹم کا ایک اور انداز

اس کے بعد پھر اسی آیت کی طرف آجایئے یہی جو درس میں زیر نظر ہے۔ کہا ہے کہ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ❶ (41:9)۔ ارض کے متعلق کہتے تھے کہ ہم نے بنائی۔ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا ❷ (41:10)۔ دیکھتے ہو۔ اتنی بات تو صرف کہی تھی کہ بادلوں سے بارش برساتے ہیں۔ بارش سارا سال تو ہوتی نہیں رہتی اور تمہاری ضرورت تو سال بھر رہتی ہے۔ اگر سال بھر بارش ہوتی رہے تو کھیتی ہی نہ ہو۔ تو ہم نے کیا انتظام کیا ہوا ہے؟ کہا کہ وہ جتنے کی برسات میں یوں ضرورت تھی وہ تو ویسے دیدی ہے۔ جو اس سے زائد تھا' جو بچ گیا ہے' وہ ہم نے پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر ریزروائر (Resevoir) بنادیئے' برف کی شکل میں وہاں اس کو منجمد کر دیا۔ یہ کولڈ اسٹوریج کا لفظ تو آج آیا ہے۔ باقی جو بچ گیا ہے وہ ہم نے وہاں منجمد کر دیا ہے۔ اور اس کے بعد جب گرمی آئی اور اس میں

---

❶ یہ ہے وہ اللہ جس نے تمام کائنات اور جملہ نوعِ انسانی کی نشوونما کا انتظام کر رکھا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1110)۔

❷ اس (نشوونما کے) مقصد کے لیے اس نے زمین میں' سطح کے اوپر پہاڑ بنادیئے (جن سے آب رسانی کا سلسلہ جاری ہے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1110)

زیادہ ضرورت پڑی تو وہ جو تھا' وہاں سے ہم نے پھر نلکے کا منہ کھول دیا' وہ برف پگھل پگھل کر چلی آ رہی ہے اور تمہاری کھیتیاں ہری ہو رہی ہیں۔ کہیے یہ ہے ناں واٹر سپلائی کا ایک اور انداز!

مختلف موسموں کے لحاظ سے مختلف فصلوں اور پھلوں کی نوید' یہ سارا کچھ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ رہنا چاہیے

کہا کہ وَبٰـرَکَ فِیْھَـا وَقَدَّرَ فِیْھَآ اَقْوَاتَھَا فِیْٓ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ[1] (41:10) اور پھر یہ بھی نہیں ہے کہ وہ ہنگامی طور پر ایک ہی وقت کے اندر وہ سارا کچھ اُگ آیا اور آپ نے لے لیا۔ موسموں کی تبدیلیاں ہم نے پیدا کیں اور وہ اس انداز سے پیدا کیں کہ ہر موسم کے لحاظ سے اس میں الگ الگ فصلیں ہوتی ہیں' ہر موسم کے لحاظ سے دوائیاں ہوتی ہیں۔ یہ سارا کچھ بھی ہم نے کیا ہے۔ کیا یہ سب کچھ ٹھیک ہے جو ہم کہہ رہے ہیں؟ اس کا کون انکار کر سکتا ہے؟ کہا کہ یہ ہم نے پوری انسانیت کے لیے کیا ہے۔ اس کے بعد سنئے' عزیزانِ من! جھگڑے ہوتے ہیں کہ جی زمین پہ ذاتی ملکیت کیوں نہیں ہو سکتی۔ اب ذرا الفاظ سنیے۔ وہاں یہ تھا کہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ (56:73)۔ ہمارا حصہ بھوکوں کو دیدو' ہم تک پہنچ جائے گا۔ یہاں کہا کہ یہ سارا انتظام جو ہم نے کیا تھا یہ سَـوَآءً لِّـلسَّـآئِلِیْـنَ (41:10) ہے یعنی تمام ضرورت مندوں کے لیے یکساں طور پہ اس کو کھلا رہنا چاہیے تھا۔ یہ ہے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (41:10)۔

یہ تمام سامانِ ربوبیت ہر ضرورت مند کے لیے کھلا نہیں ہے تو یہ شرک عظیم ہوگا' یہ نہیں ہے کہ یہ کسی ضرورت مند تک نہ پہنچے یا کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ رہے: یہ ہے قرآنِ حکیم کا معاشی نظام

جس نظام میں یہ ارض' اس کی تمام نعمتیں' جو بھی خدا نے سامانِ ربوبیت پیدا کیا ہے اور جو اس میں سے نکلتا ہے' اگر وہ سَـــوَآءً لِّـلسَّآئِلِیْنَ (41:10) نہیں ہے یعنی ہر ضرورت مند کے لیے اس کا دروازہ کھلا ہوا نہیں ہے تو یہ خدا کے ساتھ شرک ہے' یہ اَنْدَادًا مِنْ دُوْنِ اللّٰــهِ بنانا ہے۔ عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ یہ کونسا نظام ہے؟ نہ ایسا کہ کسی ضرورت مند تک وہ پہنچے نہیں' نہ ایسا کہ کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ ہو۔ وہ تو اسے ضرورت مند کے لیے کہتا ہے۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ تو ہو گئی یہ بات۔

کہتا ہے کہ اس کے بعد جو تم نے اور رکھا ہوا ہے وہ تمہارا ہے ہی نہیں۔ یہ اس کے لیے دو' جو بھی ضرورت مند ہے کیونکہ یہ سَوَآءً لِّـلسَّـــآئِـلِیْــنَ ہے۔ غور فرمایا' عزیزانِ من! بات یہ ہوئی تھی کہ ہم نے یہ زمین دو منزلوں میں پیدا کی۔ یوں نظر آتا تھا کہ ہمارے

---

[1] اور اس میں مختلف چیزوں کے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھ دی۔ اور چار موسموں کی تبدیلی سے اس کی فصلوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ مقرر کر دیا جس سے یہاں کے رہنے والوں کو خوراک مل جائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1110)۔

ساتھ تو اس کا کچھ واسطہ نہیں ہے' آپ کا کوئی پروگرام ہوگا' اسے پورا کرنے کے لیے آپ نے یہ پیدا کر دی' پھر ٹھیک ہے' یہ زمین تمہاری ہے۔ اس نکتے سے یہ بات آگے چلی اور سَوَآءً لِّلسَّائِلِیۡنَ تک جا پہنچی۔ اور درمیان میں یہ کہا کہ پھر خدا کے ساتھ شرک تو نہ کرو۔

خارجی کائنات ابتداً دُخان تھی۔ کیا یہ بات عرب کا ایک ان پڑھ کہہ سکتا ہے؟

کہا کہ ارض کو پیدا کیا اور اس کے ساتھ ہی کہا کہ **ثُمَّ اسۡتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ وَہِیَ دُخَانٌ** [1] (41:11) باہر جو کُرّے تمہیں نظر آتے ہیں اور اتنے اتنے مہیب کُرّے ہیں۔ یہاں بیٹھے ہوئے تو ہمیں وہ چھوٹے چھوٹے ٹمٹماتے ہوئے چراغ نظر آتے ہیں' یہ ستارے ہیں' یہ سورج بھی ایک ایسا ہی آتشیں گولا نظر آتا ہے اور چاند کو تو یہ بہت ہی محبوب کہتے ہیں۔ کہا کہ یہ جو بھی ہیں' یہ اسی طرح پہلے دن سے نہیں تھے۔ وہ جو میں نے Nebula (ہیولیٰ) کہا تھا جسے قرآن وَہِیَ دُخَانٌ (41:11) کہتا ہے۔ یہ جو ساری خارجی کائنات Material World تمہیں نظر آتی ہے' یہ اس شکل میں نہیں تھی۔ ابتداً گیسز کی شکل میں تھی۔ یہ کچھ چودہ سو سال پہلے کہہ رہا ہے' یہ کون کہہ رہا ہے؟ خود ایک ان پڑھ (Unlettered) عرب کے ملک کا ایک باشندہ' کہہ رہا ہے' دنیا میں جہاں اور کہیں تہذیب و تمدن تھی بھی تو اس خطہ عرب کے اندر تو یہ علم بھی نہیں تھا۔ ان کا مرکزی مقام مکہ تھا' اس کی بڑی شہرت اور اہمیت تھی۔ اس عرب کے اندر سترہ آدمی ایسے تھے جو صرف لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ جن کو Literate (خواندہ) کہتے ہیں' Education (تعلیم) تو بہت بعد کی چیز ہے۔ اس سرزمین حجاز کے اندر ایک شخص جو اس وحی سے پیشتر اَن پڑھ (Unlettered) تھا' وہ یہ بات کہہ رہا ہے کہ خارجی کائنات کے یہ سارے اتنے عظیم الشان کُرّے اور یہ ارض' ابتداءً گیسز تھے' یہ Nebula (ہیولیٰ) تھا۔ وہ سائنسدان یہ بات کہہ رہا ہے۔ اسی لیے وہ جو فرانسیسی ڈاکٹر [2] ہے' ایسے مقام پہ اس کی تو وہ عبارتیں پڑھنے والی ہیں' وہ جھوم اٹھتا ہے۔ یہ کچھ Explain (واضح) کرنے کے بعد وہ کہتا ہے کہ او دنیا کے دانشمندو! خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ اس ماحول میں خود ایک اَن پڑھ یہ کہہ سکتا تھا؟ کیا دنیا کا کوئی دانشمند اس وقت یہ کہہ سکتا تھا؟ اگر تم بھی اس کی تائید کرتے ہو کہ نہیں کہہ سکتا تھا تو پھر اس ماننے میں تمہیں کیا اعتراض ہے کہ یہ فکرِ انسانی کی تخلیق نہیں ہے۔ وہ یہ کچھ لکھتا ہے۔

---

[1] اسی طرح خدا نے اپنی توجہ دیگر اجرامِ فلکی کی طرف منعطف کی۔ اس وقت وہ بالکل دھوئیں' گیس (Nebulae) کی شکل میں تھے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1110)۔

[2] یہ اشارہ ڈاکٹر موریس بوکائے (Dr. Maurice Mucaille of France:1911-1989) کی طرف ہے۔ اس کی اس کتاب کا نام The Bible, Ihe Qur'an And Science ہے۔

انسان کو کائنات کی ہر شے کے مقابلے میں اختیار و ارادے کی ایک انفرادیت حاصل ہے

یہاں اب دلچسپ چیز آئی ہے۔ کہا ہے کہ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا (41:11)۔ اب قرآن حکیم نے بتایا یہ ہے کہ یہ جو سارا سلسلۂ کائنات ہے اس میں اور انسان میں فرق یہ ہے کہ یہ تو سب ہمارے قوانین کی اطاعت پر مجبور ہیں اُنہیں مجالِ سرکشی نہیں ہے، سرمو انحراف ہی نہیں ہے، وہ کفر کر ہی نہیں سکتے۔ یہاں انسان سے یہ بات کی کہ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ (41:9) تم تو کفر کرتے ہو لیکن یہ کر ہی نہیں سکتے۔ انسان کو صاحبِ اختیار بنایا ہے اس کو سب کچھ بتا دیا ہے مثلاً یہ کہ یہ زمین ہے اس طرح سے اس میں ہل چلاؤ گے اس طرح سے کھاد ڈالو گے اس طرح سے قاعدہ برتو گے اتنی اس میں فصل پیدا ہو جائے گی۔ یہ بتا دیا ہے، یہ ان کو خود نہیں اگا کر دیتے۔ تمہارے لیے زمین خود بخود یہ نہیں کر دیتی، تمہارا جی چاہے تو اس طرح سے کھیتی کرو نہ چاہے تو زمین کو چھوڑ دو۔ انسان کو اس نے صاحبِ اختیار پیدا کیا۔ اب یہ بات کہنے کا انداز بہت دلچسپ ہے کہ ہم نے یہ پیدا کیا اور کہا کہ ہمارے پروگرام کی تکمیل کے لیے تم آؤ۔ یہ طوعاً و کرھًا ایک محاورے کی بات ہوتی ہے کہ دل کی رضامندی سے آؤ مجبوراً آؤ، تمہیں تو آنا ہی پڑے گا جیسے کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہے کہ اس میں کرھًا کیا ہے؟ آپ کا حکم، آپ کا ارشاد، اور ہم دل کی کبیدگی سے مجبور ہو کر ایسا آئیں، اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ کہا کہ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ (41:11)۔ ہم اطاعت گزار بنتے ہوئے آپ کے پاس حاضر ہوتے ہیں، ہم اطاعت کریں گے۔

''اطاعت'' کا قرآنی مفہوم ہی ایمان کی نشانی ہے کہ اس اطاعت سے دل میں ذرا سی کبیدگی بھی نہ ہو

لفظ ''اطاعت'' کے عربی زبان میں بنیادی معنی ہیں کہ ''دل کی رضامندی سے از خود کوئی کام کرنا'' جسے ہم Voluntarily (رضاکارانہ طور پر) کہتے ہیں۔ اطاعت ہے ہی یہ جب کہ Obedience (فرمانبرداری) کو اطاعت کا لفظ ہی نہیں کہہ سکتے۔ جیسے اَطَاعَ النَخلُ کے معنی ہوتے ہیں کھجوریں پک گئیں۔ جب کھجور پک جاتی ہے تو پھر وہ از خود وہاں درخت سے جھڑ جاتی ہے۔ ہر پکا ہوا جو پھل ہے اس کے پکنے کی ایک مدت ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ خود ایسی حالت میں ہے تو نیچے گر جاتا ہے۔ اگر وہ کھجور نہ پکے تو پھر تو وہ جسے کہتے ہیں پھل کو توڑنے کے لیے ''جھانپل'' مارنا پڑتا ہے۔ پھر تو وہ جھانپلوں سے اپنی اپنی جھولی میں پھل لیتے ہیں۔ یہ تو زمین کے حاکم لیتے ہیں۔ یہ عربی زبان کے اندر اطاعت نہیں کہلاتی۔ اطاعت وہ پھل کہلاتی ہے، جو از خود کسی کی جھولی میں گر جائے۔ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ان سے کہو کہ **ثُمَّ لَایَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ** [1] (4:65)۔ کہتے ہو ہم ایمان والے ہیں، آؤ تمہیں بتائیں کہ ایمان کی نشانی کیا ہے؟ ایمان کی نشانی یہ ہے کہ **فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَاشَجَرَ بَیْنَهُمْ** [2] (4:65)۔ تیرے خدا کی قسم جیسے کہتے ہیں کہ ''تیرے رب دی سونہہ جیہڑی گل میں کہن لگاں بڑی سچی اے'' [3] اللہ میاں خود کہہ رہا ہے ''بھئی! سونہہ تیرے رب [4] دی۔'' انداز ہے قرآن حکیم کا عجیب سا! ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ ایک تو یہ ہے کہ یہ اپنے ہر اختلافی معاملے کے اندر جھگڑنے کی بجائے تمہارے پاس آئیں لیکن یہ تو دنیا کی ہر سیکولر گورنمنٹ بھی کہے گی کہ اگر تمہارا جھگڑا ہے تو قانون کے مطابق اس کو طے کراؤ اور یہ ہمارا انتظام ہے کہ فلاں عدالت میں آؤ، یہاں تک جو قرآن حکیم نے کہا ہے، یہ ہر نظام، جو قانون کے مطابق چلتا ہے، یہ کچھ کرائے گا کہ از خود اپنے ہاں فیصلہ نہ کرنے لگ جاؤ، وہاں کا جو فیصلہ ہے وہ قابلِ قبول ہوگا۔ وہ یہاں تک تو ہو گیا۔ اب اگلی بات یہ کہی ہے کہ **ثُمَّ لَایَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا** (4:65)۔ اس کے بعد جو فیصلہ تُو دے، وہ اسے دل کی رضامندی سے تسلیم کریں، یہ نہیں کہ اس کے سامنے کڑھا سرِ تسلیم خم کریں جیسا ہم عدالتوں کے سامنے کرتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں لیکن مومن وہ ہے جن کے دل کی گہرائیوں میں بھی تمہارے فیصلے کے خلاف کبیدگی پیدا نہ ہو، دیکھا آپ نے اسلامی نظام کسے کہتے ہیں۔ اطاعت کی بھی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک اطاعت جبر کی اطاعت ہوتی ہے:

کسے معلوم تھا عشق کس طرح مجبور کرتا ہے
دل اس کو جانتا ہے بے وفا، اور پیار کرتا ہے

وہ شاعر پیار کی بات تو غزل میں ہی کہہ گیا ہے، کہ اس طرح عشق مجبور کرتا ہے مگر جانتا ہے کہ بے وفا ہے ''تے فیر کی، میں کردا تراجاؤ نگا'' [5] کیا کیا جائے!! یہ اطاعت نہیں کہلاتی۔ کہا ہے کہ **ثُمَّ لَایَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ** (4:65) تیرے فیصلے کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی گرانی نہ گزرے، اس فیصلے کی کبیدگی نہ گزرے، جبر محسوس نہ کرے۔ یہ اطاعت ہے۔

---

1. وہ اس اطاعت سے اپنے دل میں ذرا سی بھی کبیدگی محسوس نہ کریں (پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم، ص۔483)۔
2. اے رسول! تم ان لوگوں کو ہماری طرف سے کہہ دو کہ خدا کا قانون اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے اختلافی معاملات میں تمہیں اپنا حکم (فیصلہ کرنے والا ثالث) نہ بنائیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔199)۔
3. تیرے رب کی قسم! جو بات میں کہنے لگا ہوں وہ بڑی ہی سچی ہے۔
4. بھئی! تیرے رب کی قسم!
5. تو پھر کیا، ہوا! میں تو بہر حال کرتا چلا جاؤں گا!

اطاعت کا یہ نظام رسولِ خدا اور صحابہ کرامؓ تک ہی تو محدود نہ تھا

مگر آج تو اس انداز کی اطاعت کہیں گے کہ صاحب! وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت صحابہ کرنے والے تھے، وہ ٹھیک ہے مگر اب تو نہ رسولؐ رہے، نہ صحابہؓ رہے، ہم بندے بشر ہیں، کیسے ایسا کر سکتے ہیں؟

اب فرض کیجیے کہ یہ قرآن حکیم وہاں تک ہی رہا، عزیزانِ من! سنیئے، یہ وہاں تک نہیں ہے، یہ اس نظام کی بات ہے۔ آج بھی اسی طرح سے ہوسکتا ہے۔ کیسے ہوسکتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح سے یہ فیصلہ دیتے ہیں؟ قرآن حمید نے یہ خود کہا تھا کہ جب یہ آئیں گے تو تم نے خود فیصلہ نہیں دینا بلکہ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ (5:48) قرآن حمید کے مطابق تم نے فیصلہ دینا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ انہیں معلوم تھا کہ وہ قانون جس کے مطابق فیصلہ ہونا ہے، وہ قرآن حمید کا ہے اور اس پہ ان کا ایمان تھا۔ دل میں اگر قرآن کے کسی قانون کے مطابق گرانی گزرے گی تو ایمان یہیں سے چلا گیا، نہ رہا۔

قانون کی حقانیت اور فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کی صداقت پر ایمان ضروری ہے، یہ ہو تو کبیدگی نہیں ہوتی

وہ جو کہا تھا کہ اس کی قسم، تیرا خدا شاہد ہے، یہ کبھی مومن نہیں ہوسکتے تاوقتیکہ تیرے فیصلے کے خلاف ان کے دل میں بھی گرانی نہ گزرے۔ پہلا حصہ تو یہ ہے کہ وہاں سے قرآن حمید کے قانون کے مطابق فیصلہ ملنا ہے جس پر تم دل کی رضامندی سے ایمان لائے ہو۔ قانون کو آپ نے پہلے سے دل کی رضامندی سے مانا ہوا ہے، باقی رہا، قانون کے مطابق یہ فیصلہ دینے والا تو اس کی صداقت، امانت، دیانت پر تمہارا ایمان ہے۔ اب دو شرطیں ہوئیں: ایک تو قانون وہ ہونا چاہیے جس کو آپ نے دل کی رضامندی سے مانا ہو یعنی قرآن حمید، اور دوسرے اس قانون کے مطابق فیصلہ دینے والے وہ ہوں جن کی دیانت اور امانت کے متعلق آپ کا ایمان ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو بظاہر جسے آپ اسلامی قانونی حکم کہیں گے، وہ بھی اسلامی نہیں ہوگا۔ غالباً اسی دفعہ کے طلوع اسلام [1] میں، میں نے لکھا ہے کہ اگر بھارت کی حکومت اپنے ہاں شراب کو منع کر دیتی ہے تو آپ اسے اسلامی قانون نہیں کہہ سکتے، حالانکہ یہ بات یعنی شراب کی ممانعت اسلامی قانون ہی ہے۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اسے نافذ کون کر رہا ہے۔ یہاں یہ جو شرط لگائی تھی کہ پھر اس فیصلے کے خلاف تمہارے دل کی گہرائیوں میں بھی گرانی نہ گزرے، یہ شرط کس طرح سے تھی، کیوں یہ کہا تھا کہ تمہارے پاس آئیں، تم قرآن کریم کے مطابق فیصلہ کرو، پھر یہ شکل پیدا ہوگی کہ ان کے دل میں گرانی محسوس نہیں ہوگی۔ قانون وہ ہے، جس پہ ان کا ایمان ہے، قانون نافذ کرنے والا وہ ہے، جس کی صداقت اور امانت کے اوپر ان کا ایمان ہے پھر دل میں گرانی کیسے گزرے، عزیزانِ من! جب قانون ہو جبر، کہ جس کو آپ کا دل نہیں مانتا، نافذ کرنے والا وہ ہو، جسے آپ سب سے زیادہ مستبد مانتے ہیں، تو اس فیصلے کے خلاف دل میں گرانی ہوگی، تو آپ کوشش کریں گے کہ کسی نہ کسی

---

[1] اس کے لیے دیکھیے: پرویز، غلام احمدؒ: اسلامی نظامِ حکومت: نہ مغربی جمہوریت، نہ شخصی حکومت، طلوعِ اسلام (4:34)، اپریل 1981، ص ص۔ 41 تا 64۔

طرح' جسے آپ Law (قانون) کہتے ہیں' اس سے کسی پگڈنڈی کے اوپر سے باہر نکل جائیں حتیٰ کہ جیل خانے میں بھی جو قیدی ہیں وہ فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں وہ نظام ہے کہ اس فیصلے کے خلاف دل میں بھی گرانی نہ گزرے۔ یہاں طَآئِعِیْنَ آیا ہے کہ ہم بطیّب خاطر ان قوانین کی اطاعت کریں گے۔ خارجی کائنات میں تو ایسا ہی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہم اطاعت گزار ہیں' ہمارے دل کی گہرائیوں میں بھی اس فیصلے کے خلاف گرانی نہیں گزرتی۔ فَقَضٰهُنَّ (41:12) انہیں ایسا ہی بنایا ہے۔

ہمارے ہاں حمل امانت کا غلط ترجمہ واثرات اوراس کا قرآنی مفہوم

وہ امانت کی ایک بڑی اہم آیت ہے' جس کے غلط مفہوم اور غلط ترجموں نے ہمارے ہاں عجیب قسم کی شکل پیدا کر دی ہے۔ وہ ہے کہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا (33:72)۔ ہمارے ہاں ترجمے ہوتے ہیں کہ ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں پر' زمین پر' پہاڑ پر پیش کیا' ہم اسے لیے لیے پھر رہے تھے کہ بھئی! کوئی تو اسے اٹھالو۔ میں نے یہ کہا ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں کے ترجمے ہیں' یہ اس کی رو سے ہے' ورنہ قرآن حکیم یہ نہیں کہتا کہ ان کے سامنے ہم نے یہ امانت پیش کیا کہ کوئی تو اس کو اٹھالو' ہم اسے لیے پھرتے ہیں۔ انہوں نے سرکشی اختیار کی' انکار کر دیا کہ ہم اسے نہیں اٹھا سکتے۔ یہ کائنات خدا کی تخلیق ہے۔ خدا کہہ رہا ہے کہ امانت تھی' ہم اس کو لیے لیے پھر رہے تھے' ان سب کے سامنے ہم نے پیش کی۔ یہی بات نہیں ہے کہ انہوں نے یہ نہیں لی بلکہ یہ لفظ تو سرکشی میں آتا ہے۔ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ صاحب! اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ (41:11) ہم دل کی رضامندی سے اطاعت کریں گے۔ آپ نے دیکھا کہ دو مقامات میں تضاد واقع ہو گیا۔ قرآن مجید نے خود کہا ہے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ تم اس میں کہیں تضاد نہیں پاؤ گے۔ اور یہ اتنا بڑا تضاد ہے!!! ادھر وہ کہہ رہا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو طَآئِعِيْنَ ہیں' اطاعت گزار ہیں اور کائنات کی ہر شے اطاعت گزار ہے' یہاں اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا' بلکہ تکبر سے انکار کیا ہے کہ بالکل نہیں' ہم اسے نہیں اٹھا سکتے۔ یہ تضاد ہے۔ یہ غلط معنی ہیں۔ یہ بات ہی کچھ اور ہے۔ بات لمبی چلی جائے گی' میں اس کے متعلق بیان کر چکا ہوں[1]۔ یہ چیز تھی کہ وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ (33:72)۔ یہ تو عام ترجمے کے اعتبار سے اور ہی بات بتا دی کہ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ (33:72)۔ انسان نے جب دیکھا کہ یہ تو سارے انکار کر رہے ہیں' اللہ میاں اس کو لیے لیے پھر رہے ہیں' ان کے سامنے جا رہے ہیں' یہ انکار کر رہے ہیں تو بڑی سبکی ہوئی ہے' یہ انسان اسے دیکھ نہ سکا (معاذ اللہ)۔ حَمَلَهَا: اس نے کہا مجھے دیدیجیے۔ اس نے لے لیا' اس نے اسے اٹھالیا۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ بھئی! اللہ یہ کہتا کہ تیرا بھلا ہووے شکر ہے تُو نے ہماری لاج ہی رکھ لی'

---

[1] اس کے لیے دیکھیے: سورۃ الاحزاب

انہوں نے تو ہمارے ساتھ یہ کیا تھا' تم نے اٹھالیا' بڑی مہربانی آپکی۔ یہ ہونا چاہیے تھا لیکن یہاں کہا کہ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (33:72)۔ یہ بڑا ہی جاہل ہے' بڑا ہی ظالم ہے۔ اب یہ پھنس گیا۔

عزیزانِ من! یہ کیا ہو رہا ہے قرآن کریم کے ساتھ!!! ایک لفظ ہم نے امانت کا دیکھا۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ قرآن کریم کی عربی زبان موجود ہے' کسی لغت سے پوچھ لو' کسی عرب بدو سے پوچھو کہ حملِ امانت کیا ہوتا ہے۔ وہ اس زبان کی رو سے کہیں گے کہ حملِ امانت ہے ''امانت میں خیانت کرنا۔''

ہم نے اپنی امانتوں کو ان کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے خیانت کرنے سے انکار کر دیا کہ ہم اس میں کبھی خیانت نہیں کریں گے۔ اُس نے اسے انسان کو دیا۔ اس نے اسے لے تو لیا مگر یہ کمبخت اس میں خیانت کرتا ہے' ہمارا کیا بگاڑتا ہے' بڑا ہی جاہل اور ظالم ہے۔ کیا بات ہے قرآن کریم کی! یہ اس امانت میں خیانت کرتا ہے۔ انہوں نے نہیں کی۔ اب آ گئی؟ بات کہ انہوں نے اس کو طَآئِعِيْنَ (41:11) یعنی قبول کیا تھا وہ خیانت کیوں کرتے

سبع سموات کا صحیح مفہوم

قرآنِ کریم میں یہ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ (41:12) آیا ہے۔ اس سَبْعَ [1] سَمٰوَاتٍ کا ترجمہ ہمارے ہاں سات آسمان کیا جاتا ہے: عربی زبان کے اندر ایک ہندسہ یا ایک عدد ہوتا ہے' اس کو تامہ کہتے ہیں' جس کو کہتے ہیں: کئی' متعدد۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں ''او تینوں سو واری سمجھا چکا میں'' [2] تو یہ نہیں ہے کہ گنتی سے انہوں نے ایک بار سمجھایا دو دفعہ سمجھایا یا چار دفعہ سمجھایا۔ اس کے معنی ہوتے ہیں متعدد بار۔ ''ست سلام ساڈے وی کیندے ہیگے، تینوں ست سلام''۔ [3] متعین چیز سات ہندسہ نہیں ہوتا۔ ہر زبان میں یہ ہوتا ہے۔ مثلاً انگریزی میں یہ کہ Hundreds of Time, Millions of Million ہے۔ اس میں وہ گنتی نہیں ہوتی' بتانا ہوتا ہے کہ تعداد بہت زیادہ ہے۔ عربی زبان میں یہ جو سبع ہے' یہ اس معنی میں بھی آتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ الفاظ آتے ہیں' تو ان کے ہاں گنتی نہیں ہوتی بلکہ یہ اسی طرح سے ہوتا ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ ''دس دفعہ تمہیں کہا تھا' بیس بار تم جا چکے ہو' سینکڑوں بار میں نے اس کو یہ کہا ہے''۔ وہ اس طرح سے سبع بولتے ہیں۔ تو سبع سموات گنتی کے سات کُرّے نہیں ہیں۔ متعدد کُرّے ہیں' بیشمار کُرّے ہیں جن کے لیے فِيْ يَوْمَيْنِ (41:12) کہا۔ یعنی انہیں دو مراحل میں بنا دیا۔

---

[1] سبع کے مفہوم و معنی کیلیے دیکھیے اسی باب کا ص۔ 32 کا فٹ نوٹ 1

[2] او! تجھے میں سو بار سمجھا چکا۔

[3] ہمارے ہاں بھی سات سلام کہتے ہیں' تجھے سات سلام۔

خدا تعالیٰ نے کائنات کی ہر شے کی طرف وحی کر رکھی ہے

اس کے ساتھ ہی کہا کہ وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا (41:12)۔ یہاں یہ لفظ اوحیٰ ہے یعنی وحی کی۔ ہر کُرّے کے اندر ہم نے وحی کر دی تھی کہ تمہارے لیے یہ پروگرام ہے' تمہارے لیے یہ قانون ہے' تم نے اس طرح سے گردش کرنا ہے' اس طرح سے غروب ہونا ہے' اس طرح سے طلوع ہونا ہے' یہ تمہارا راستہ ہے' یہ تمہارا کام ہے۔ یہ جو تمام چیزیں ہیں' اب ان کے لیے وحی کا لفظ ہے جو قرآن حمید بول رہا ہے۔ کہتا ہے کہ اوحیٰ یعنی ان کی طرف وحی کی۔ قرآنِ کریم میں ارض کی طرف بھی یہ ہے کہ بِـاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَھَا (99:5) اور اسی طرح شہد کی مکھی کی طرف بھی کہا کہ وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ (16:68)۔ اسے By Instinct (جبلی طور پر) کہتے ہیں۔ یہ ہے وہ وحی جو ان کے اندر رکھ دی ہے۔ ہر شے کی جو اس کے اندر Instict (جبلت) ہے' جسے فطرت کہتے ہیں' اس کی وحی یہ ہے اور اس کے لیے باہر سے کوئی سبق نہیں پڑھایا جاتا' کوئی تعلیم نہیں دی جاتی' کوئی آ کر انہیں نہیں بتاتا۔ وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ مرغی کے نیچے کچھ انڈے مرغی کے اور کچھ بطخ کے رکھ دیجیے۔ سینے (Hatching) کے بعد جب اس میں سے بچے نکلیں گے تو جو مرغی کے بچے ہیں وہ خشکی کی طرف آئیں گے' جو بطخ کے بچے ہیں وہ پانی کی طرف چلے جائیں گے۔ اب انڈوں کے اندر تو کوئی اسکول کھلا ہوا نہیں تھا جو ان کو بتاتا کہ تم نے وہاں پانی کی طرف جانا ہے اور تم نے خشکی کی طرف رہنا ہے' پانی میں مر جاؤ گے۔ کس نے بتا دیا یہ سب کچھ؟ اسے قرآن مجید وحی کہتا ہے لیکن کہتا یہ ہے کہ یہ کچھ (انسان کے سوا) خارجی کائنات کی اشیا کے اندر ہے' کسی نے انہیں باہر سے نہیں دیا ہے۔ یہ جبلی طور پر ہے۔

کائنات کی ہر شے کے برعکس انسانوں کی طرف وحی کرنے کا طریق انبیائے کرام کی وساطت سے اختیار کیا گیا اور کہا کہ اُنہیں تعلیم دو اور پھر چھوڑ دو کہ تم ان کے مطابق کام کرو یا نہ کرو مگر نتیجہ دونوں صورتوں میں بھگتو

کہا ہے کہ انسانوں کے متعلق ہم نے یہ طریق اختیار نہیں کیا اس لیے کہ یہ طریق اختیار کرتے تو انسان کی فطرت کے اندر یہ بات ہو جاتی جو ہم اس سے کرانا چاہتے۔ یہ شرفِ انسانیت نہیں ہے۔ انسان اپنے اختیار سے کرے جو کچھ بھی کرتے ہیں۔ مرغی کا چوزہ اگر پانی سے بچتا ہے تو اس کے لیے کوئی چیز ایسی شرف کی نہیں ہے' اگر بکری گوشت نہیں کھاتی' درندگی نہیں کرتی تو ہم نہیں کہتے کہ صاحب! بڑی شریف واقع ہوئی ہے' دیکھو گوشت بھی پڑا ہوا ہے' نہیں کھاتی۔ شیر بھوکوں مر جاتا ہے' انگوروں کے خوشے لٹک رہے ہوتے ہیں لیکن اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ وہ بہت بڑا ایماندار نہیں ہے' وہ اس چیز پر مجبور ہے کہ وہ صرف گوشت کھائے اور انگور نہ کھائے۔ اس کے

لیے گوشت حلال ہے، بکری کے لیے حرام ہے۔ یہ کبھی حرام کی طرف آنکھ نہیں اٹھائے گی۔ انسان اٹھائے گا اس لیے کہا کہ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ❶ (33:72)۔ اس لیے اگر انسان کے اندر یہ بات رکھ دی جاتی کہ یہ بھی مجبوراً کسی چیز کو جسے حلال قرار دیا جاتا، وہیں تک رہتا، جسے حرام قرار دیا اس تک نہ رہتا تو یہ شرفِ انسانیت کی بات ہی نہ رہتی، شرافت کوئی کریڈٹ ہی نہ ہوتا، دیانت وجہ تعریف ہی نہ ہوتی، سارے ہی مجبور ہوتے۔

بکری کسی کو نہیں کاٹتی تو میں نے کہا ہے کہ یہ اس کے لیے کونسی وجہ شرف ہے۔ اور سانپ اگر کاٹتا ہے تو اس کو پھانسی نہیں دی جا سکتی، وہ کوئی جرم نہیں کر رہا، فطرت سے مجبور ہے۔ انسان کے اندر بھی اگر یہ چیزیں رکھ دی جاتیں تو یہ مجبور ہوتا، یہ کچھ کرنے کے لیے، پھر یہ شرفِ انسانیت نہ ہوتا۔ اسے تو قرآن کریم نے بڑا مقام عطا کیا ہے۔ اس لیے اس نے یہ کہا ہے کہ ان چیزوں کے اندر ہم نے وحی رکھ دی۔ انسانوں کی بابت ہم نے یہ کیا کہ ایک فرد منتخب کیا، اسے یہ وحی دی اور پھر کہا کہ اسے ان تک صرف پہنچا دو۔ یہ ان کے اندر رکھ دینے والی بات نہیں۔ پھر کہا کہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (2:129) اس کی ان کو تعلیم دو۔ اب اس کے بعد پھر ان کو چھوڑ دو کہ تمہارا جی چاہے تم اس کے مطابق کام کرو، جی چاہے اس سے انحراف کرو۔ اس کی اطاعت کرو گے تو یہ تعمیری نتائج ملیں گے، اس کی خلاف ورزی کرو گے تو تباہ اور برباد ہو جاؤ گے۔ یہ جو انسانوں کے معاملے میں اوحیٰ وحی ہے، یہ وحی خارج سے آتی ہے۔

تخلیق کے دو گوشے: عالمِ امر اور عالمِ خلق مگر انسان کے لیے طریقہ دیگر اشیائے کائنات سے مختلف

میں نے پچھلی دفعہ بھی کہا تھا کہ اسی لیے قرآن کریم نے نزول کا لفظ کہا ہے یعنی Objectively (خارجی طور پر) جو کوئی چیز ملے۔ انسانوں کو تو وحی اس طرح ملتی تھی۔ باقی کائنات کے اندر، ہر شے کے اندر، یہ چیز داخل کر دی، یہ Instinct (جبلت) کے ذریعے سے ہے۔ کہا کہ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (41:12)۔ یہاں یہ جو امر کا لفظ ہے، وہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہماری تخلیق کے دو گوشے ہیں: ایک عالمِ امر ہے جس میں ہم یہ ساری پلاننگ کرتے ہیں، ابھی وہ چیزیں وجود میں نہیں آتیں، ان کے متعلق ''نقشے'' بنتے ہیں، جسے ہم پلاننگ کہتے ہیں، اور پھر جب اس پلان کو ہم Execute (نافذ) کرتے ہیں، جب وہ محسوس شکل میں آتا ہے تو وہ گوشہ عالمِ خلق کہلاتا ہے۔ ان چیزوں کا جو پروگرام تھا، ان کی جو Duties (فرائض) تھیں، ان کے جو قوانین تھے، وہ ہم نے عالمِ امر میں طے کیے اور پھر ان کے اندر داخل کر دیئے۔

انسان کی صورت میں بھی کہا ہے کہ ہم نے عالمِ امر میں ہی طے کیا تھا کہ اس کے لیے جائز کیا ہے اور ناجائز کیا ہے لیکن وہ چیز فطرتاً

---

❶ یہ اس کی کتنی بڑی جہالت ہے جس کی وجہ سے یہ خود اپنے آپ پر اس قدر زیادتی کرتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 985)۔

اس کے اندر داخل نہیں کی تھی۔ یاد رکھو! انسان کی کوئی فطرت نہیں ہے۔ فطرت اس چیز کو کہتے ہیں جس پہ چلنے کے لیے کوئی مجبور ہو مثلاً پانی کی فطرت ہے کہ نشیب کی طرف بہے' آگ کی فطرت ہے کہ وہ جلائے۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں ہے۔ یہ چاہے تو نیک فطرت ہو جائے' چاہے تو بدفطرت ہو جائے۔ خود انسان کی طرف وحی اس طرح سے Objectively باہر سے ملی' ایک فرد منتخب تھا جسے نبی کہا جاتا تھا' اس کو دی جاتی تھی اور اس کے بعد اس نے دوسروں تک پہنچایا۔

انسانوں کی طرف وحی کا سلسلہ اب ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا

یہ سلسلۂ وحی پہلے نبی سے آخری نبی تک شروع تھا۔ آخری نبی پہ پہنچنے کے بعد کہا کہ **تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ** (6:115)۔ لو جی جو کچھ ہم نے کہنا تھا ہم نے انسان سے آخری مرتبہ کہہ دیا' اب یہ مکمل ہو گیا' اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں ہے۔ **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ** (6:115)۔ اس میں تبدیلی کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اور قرآن حمید کی حفاظت کے لیے کہا کہ **اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ** (15:9) ہم نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم اس کی حفاظت بھی کریں گے۔ اب یہ ایک مکمل' غیر متبدل' محفوظ ضابطۂ حیات ہے جس کے بعد خود خدا کہتا ہے کہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ انسانوں کو دیدیا۔ پھر وحی کی تو ضرورت ہی ختم ہو گئی۔ اشیائے کائنات میں سے ہر شے کے اندر بطور جبلت یہ راہ نمائی رکھ دی' انسانوں کے لیے وہ خارج میں ایک محفوظ کتاب کے اندر' جو مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی ہے' دے دی تو اب اس کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ جب وحی کی ضرورت نہیں تو نبی کی ضرورت نہیں۔ ختم نبوت میں تو یہی چیز دلیل ہو جاتی ہے۔ کسی اور چیز کے داخل کرنے کی ضرورت ہی اس میں نہیں پڑتی۔

عزیزانِ من! آگے کہا کہ **وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَحِفْظًا**[1] (41:12)۔ کیا خوبصورت بات ہے! یہ کہنے کے بعد کہ آسمان کے یہ جو ستارے ہیں انہیں ہم نے بڑا دلکش' مزیّن اور خوبصورت بنا دیا ہے۔ چاند پر قدم رکھنے سے پہلے تو ہمیں پتہ نہیں تھا کہ اس کی یہ شکل کیا ہے؟ یہ چاند جس کو اتنا محبوب سمجھ رہے ہیں' ہماری ساری شاعری اس کے حسن کے اوپر نثار تھی' اب جو وہ بے نقاب ہو کر سامنے آیا ہے تو وہ ڈائن بنا ہوا نظر آتا ہے۔ یعنی اس کی وہ تصویریں جو آئی ہیں' وہ دیکھو تو سہی' کہ وہ کتنی ڈراونی اور بھیانک ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے یہ چاند اور یہ ستارے اسی قسم کے تھے۔ ذرا سوچو کہ تم تھکے ماندے ہو' گرمیوں کی رات کو باہر چارپائی بچھائی' آپ کے ہاں آسمان ہی اوپر ہے' تو وہ جو آسمان کے ستارے ہیں اگر اپنی اصلی شکل میں اوپر بے نقاب نظر آ جاتے تو نیند حرام ہو جاتی اور کوئی بچہ تو سو ہی نہ سکتا۔ آپ سوچیں کہ یہ ایک دو نہیں ہیں' یہ گنتی میں ہی نہیں آ سکتے۔ اتنی تعداد ہو اور ان میں سے

---

[1] اور جس قانون کے مطابق مختلف اجرام فلکی نے چلنا تھا اس کی وحی ان کی طرف کر دی۔ (یعنی اس قانون کو خود ان کی ساخت کے اندر رکھ دیا)۔ اور جو فضا تمہیں سب سے قریب نظر آتی ہے اس میں اس قسم کے اجرام بکھیر دیئے جو تمہیں جگمگاتے چراغوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ ۱۱۱۱)

ایک ایک ایسی بھیانک شکل لیے ہوئے ہو اور وہ آپ کے سامنے آنکھوں کے اوپر جنوں اور دیوؤں کی طرح جھانک رہے ہوں' کیا بات ہے اس کی شانِ ربوبیت کی! کہ بنایا تو انہیں ایسا' دکھایا ہمیں ایسا کہ ان میں سے ہر ایک دلکش ٹمٹماتا ہوا دیا نظر آتا ہے۔ چاند اور تارے بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ رات کے اندر نیلگوں آسمان میں یہ جڑے ہوئے موتی کتنے خوبصورت نظر آتے ہیں! یہاں کہا کہ وَزَيَّنَّا (41:12) یہ حقیقت میں ایسے نہیں تھے' تمہاری طرح ہم نے اس کا انداز ایسا رکھا کہ وہ تمہیں بڑے ہی دلکش نظر آتے ہیں۔ اسی لیے وہ جو تھا جس نے بات سمجھ لی تھی' اس ❶ نے کہا تھا کہ

ہیں کواکب کچھ' نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا' یہ بازی گر کھلا

شہابِ ثاقب اور سقفِ محفوظ کی حقیقت

یہاں (41:12) میں کہا کہ ہم نے ان کو ایسا بنا دیا۔ پھر آگے کہا کہ وَحِفْظًا ❷ (41:12)۔ یہ عجیب چیز ہے۔ کہا ہے کہ یہ جو تمہیں شہابِ ثاقب نظر آتے ہیں' وہ دم دار ستارے ہیں' دراصل وہ جو ٹوٹا ہوا تارا' گرتا ہوا نظر آتا ہے' ہمیں تو وہ صرف روشنی کی ایک لکیر سی نظر آتی ہے' اور خود ہی وہ کہیں سے نکلتی ہے اور تھوڑی دور جا کر وہ گم ہو جاتی ہے' درحقیقت یہ جو کُرّے ہیں' اس گردش سے ہر آن ان میں سے کچھ ٹکڑے ٹوٹتے رہتے ہیں اور وہ یہ نہیں ہوتا کہ ان میں سے کوئی گرام' دو گرام' تولے دو' تولے کے ہوتے ہیں' یہ ہزاروں لاکھوں من کا وہاں سے ایک ایک ٹکڑا نکلتا ہے۔ آپ سوچیے کہ اتنا بڑا ٹکڑا جو وہاں ہزاروں لاکھوں میل کے فاصلے سے نکلے اور وہ زمین کے اوپر آ رہا ہو تو کیا زمین میں ایک متنفس بھی باقی رہے گا؟ انہوں نے ٹوٹنا ہے' آنا ادھر کو ہی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ اب یہ بات سمجھ میں آ گئی جب انہوں نے دیکھا کہ یہ ٹوٹنے والے ستارے ہیں۔ یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ زمین کے اوپر یہ جو فضائی کرہ ہے جو Atmosphere ہے' اس کی کیفیت یہ ہے۔ اور یہ جو اوپر سے آتا ہے' تو وہاں سے اس طرح آنے کے بعد جب اس فضائی کُرّے کے اندر آتا ہے تو خود اس کے اور اُس کے ساتھ ان کُرّوں کی گردش کا ٹکراؤ ایسا ہوتا ہے کہ وہ پس جاتا ہے۔

خلا کے اندر کرّوں کے ٹکڑوں کی پسی ہوئی خاک کا عمل

عزیزانِ من! اس خلا میں کُرّوں کے ٹکڑے پسنے کے بعد یہ نہیں ہے کہ ان کی راکھ بیکار جاتی ہے۔ یہ جتنی Light Transmit

---

❶ مرزا اسد اللہ خاں غالب (1869-1797ء)۔

❷ اور انہیں ایسا محفوظ بنا دیا کہ یہ نہ آپس میں ٹکرائیں' نہ تمہارے اوپر گریں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1111)۔

(روشنی منتقل) ہوتی ہے، جو دوسروں تک پہنچتی ہے، یہ روشنی یونہی نہیں پہنچتی بلکہ اس کے لیے جو Medium (واسطہ) کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہی راکھ کے ذرات ہیں، اسی ذریعے (Medium) سے روشنی پہنچتی ہے۔ ہوا کے اندر یہ جو راکھ کے یا خاک کے ذرے ہوتے ہیں، یہ روشنی بھی ہم تک ان کے Through (ذریعے) پہنچتی ہے۔ وہی جو گُرّوں کی پسی ہوئی راکھ اس Atmosphere (فضا) کے اندر ہوتی ہے، یہ وہ روشنی ہے جو اوپر سے ہم تک پہنچاتی ہے۔ چودہ سو سال پیشتر قرآن حمید نے کہا کہ یہ جو تمہیں خلا نظر آتا ہے، یہ تمہارے لیے سقفِ محفوظ ہے، یہ وہ چھت ہے جو تمہیں حفاظت میں رکھے ہوئے ہے، ورنہ تم ختم ہو جاؤ۔ چودہ سو سال پیشتر کے زمانے میں یہ کون کہہ سکتا تھا۔ ذرا دیکھیے کہ اس زمانے کا فلکیات کا علم کیا تھا؟ یہ کہ اس زمانے میں زمین کو ساکن مانتے تھے، چپٹی مانتے تھے، اس آسمان کے متعلق یہ کہتے تھے کہ شیشے کا ایک ڈل ہے اور یہ جو اس کے اندر ستارے تھے، وہ کہتے تھے یہ اس میں نگینے جڑے ہوئے ہیں۔ علم انسانی تو یہ تھا اور یہ قرآن حکیم کہہ رہا ہے کہ یہ جو ستارے ہیں یہ حقیقت میں ایسے نہیں ہیں جیسے نظر آتے ہیں۔ یہ تو ہم نے ان کو تمہارے لیے دلکش بنایا اور یہ جو Atmosphere (فضا) ہے یعنی یہ خلا نہیں ہے، یہ تو سقفِ محفوظ ہے جو تمہیں بچائے ہوئے ہے۔ یعنی **حِفْظًا** (41:12) ہے۔ پھر کہا کہ **ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ** (41:12) یہ تیرے خدا کا قانون ہے کہ ہر شے کے تقاضوں کو جانتا ہے اور اس کے بعد عزیز ہے، صاحبِ قوت ہے، ان تمام چیزوں کو کنٹرول میں رکھے ہوئے ہے۔ کہا کہ کیا تم ایسے خدا سے انکار کرتے ہو؟

عزیزانِ من! ہم سورۃ حٰمٓ السجدة کی آیت 12 تک آ گئے۔ 13 سے ہم آئندہ اتوار کو لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

تیسرا باب: سورۃ حٰمٓ السجدۃ (آیات 13 تا 25)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1981ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی آیت 13 سے ہو رہا ہے: (41:13)۔

خارجی کائنات اور انسانی زندگی کے لیے دیئے گئے ضابطہ حیات کے نتائج ضرور ظہور پذیر ہوتے ہیں

سابقہ آیات میں قرآنِ کریم نے اپنے انداز کے مطابق بتایا یہ تھا کہ خارجی کائنات میں تم دیکھو گے کہ خدا کے قوانین کس نظم و نسق اور حتم و یقین کے ساتھ کارفرما رہتے ہیں' ٹھیک ٹھیک نتائج نکلتے ہیں' ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس کے بعد وہ کبھی خارجی کائنات کی اور کبھی اقوامِ سابقہ کی تاریخ کی یہ شہادات اس کے لیے پیش کرتا ہے۔ ان دونوں میں ایک بڑا گہرا Link یعنی ربط ہے۔ بات تو یہی کہنی ہوتی ہے کہ ہر قانون اپنا نتیجہ نکال کر رہتا ہے۔ قانون کہتے ہی اس کو ہیں کہ اس کا نتیجہ اٹل ہو۔ خارجی کائنات میں یہ چیزیں محسوس طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ صحیح طور پہ اچھا بیج ہو' اچھی زمین ہو' اس میں قاعدے کے مطابق کھیتی کی جائے' حفاظت کی جائے' پانی دیا جائے تو اس میں سے محاورے کے طور پر ایک ایک دانے سے سو سو دانے ملتے ہیں۔ یہ قانون اٹل ہیں۔ وہ اس سے اس چیز پہ شہادت لاتا ہے کہ اسی قسم کے قوانین انسانوں کی زندگی کے متعلق بھی دیئے گئے ہیں۔ اگر انسان ان کے مطابق اپنی زندگی' اپنی روش' اپنا نظام قائم کرے گا تو وہ نتائج نکل کر رہیں گے جو خدا نے بتا دیئے ہیں کہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا اور اگر ان کی خلاف ورزی کرے گا تو پھر وہ جو تخریب اور تباہی کا نتیجہ ہے' وہ بھی قرآن کریم نے بتا دیا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا تو یہ ہو کر رہے گا۔

تاریخ گزرے ہوئے واقعات کا نام نہیں بلکہ اختیار کردہ نظام کے نتائج کا نام ہے جو چودہ سو سال پہلے قرآن کریم کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتی

قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ جہاں کوئی قانون بیان کرتا ہے اس کی شہادت میں' اس کی تائید میں' یا تو خارجی کائنات کا نظم و نسق پیش کرتا ہے یا یہ کہتا ہے کہ سابقہ اقوام کی تاریخ پر نگاہ ڈالو' فلاں قوم نے یہ کیا' اس طرح سے زندگی بسر کی' ایسا نظام قائم کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ یہ اس لیے کہ ماضی میں یہ جو واقعات گزر چکے ہوتے ہیں ان کی تاریخ اگر سامنے ہو تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ واقعی اس قوم نے ایسی زندگی اختیار کی تھی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ یہ جو چیز ہے یہ چودہ سو سال پہلے تاریخ کو ایک سائنس کی حیثیت سے پیش کرنا ہے۔ سائنس کہتے ہی اسے ہیں کہ جہاں قانون کارفرما ہو' علت و معلول ہو۔ یہ چیز قرآنِ کریم کے سوا اس دور میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔ وہ تاریخ کو صرف واقعات اور حوادث کا ہی ایک مجموعہ قرار دیتے تھے۔ مثلاً فلاں سال سیزر ❶ تخت پہ بیٹھا' فلاں سال فلاں کے ساتھ اس کی لڑائی

---

❶ Caesar, (Galus) Julius (c.100-44BC). Roman general, statesman, and writer. During his Gaul campaign, he invaded Britain (55BC) and returned to Rome a popular hero. He had, however many political enemies, including Pompey, who persuaded the Senate to order Caesar to resign his army command. Instead, Caesar took his legions across the river Rubicon (49BC) and crushed Pompey at Pharsalus (48BC). In 47BC, he pursued his enemies to Egypt where he installed Cleopatra as queen. It is widely believed that Cleopatra later gave birth to his son, [باقی اگلے صفحے پر]

ہوئی' فلاں سال وہ تخت الٹ گیا' دوسرا دور آ گیا۔ یعنی یہ صرف واقعات (Chronicles) ہی ہوتے تھے جو تاریخ تھی۔ تاریخ بطور ایک سائنس پیش کرنا' بطور قانون کی کارفرمائی کی آماجگاہ کہ اگر اس قسم کا نظام قائم کرو گے تو یہ نتیجہ نکلے گا' چودہ سو سال پہلے' کم از کم مجھے تو کہیں نظر آتا ہے' نہ ہی اس کی کوئی شہادت ملتی ہے۔ اس انداز سے صرف قرآنِ کریم نے تاریخ کو پیش کیا۔

تاریخ کے سلسلہ میں چودہ سو سال پیشتر قرآن حکیم کا اندازِ بیان

ہمارے اس دور میں اس چیز کو بڑا معرکہ آرا کارنامہ قرار دیا گیا ہے۔ ہیگل (1770-1831ء) نے اس پر بڑی ریسرچ کی۔ اسے اس باب میں Pioneer (السابقون الاولون) قرار دیا جاتا ہے کہ اس نے کتاب سائنس آف ہسٹری یعنی تاریخ بحیثیت ایک سائنس ❶ کے دی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے بعد یہ روش چل پڑی اور پھر مارکس (1818-83) نے اس پر ایک عمارت قائم کی۔ یہ چیز سائنس آف ہسٹری یعنی تاریخ کی سائنس تھی' ورنہ ہسٹری آف سائنس یعنی سائنس کی تاریخ تو عام ہوتی ہے۔ ہمارے دور میں ہیگل (1770-1831ء) کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں اس سے پیشتر ابن خلدون (1332-1406/732-808ء) نے تاریخ کا مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں یہ بات کہی لیکن یہ چیز ابنِ خلدون کی اپنی نہیں تھی' اس نے تو یہ قرآن کریم سے لیا تھا۔ پہلی دفعہ اس موضوع پر قرآنِ کریم نے یہ انداز اختیار کیا۔ اس نے تاریخ کو بحیثیت ایک سائنس پیش کیا۔ قرآنِ کریم میں اقوامِ سابقہ کے جتنے واقعات یا تاریخی شہادات ملتی ہیں وہ ایک سائنس کے طریقے پہ قرآن کریم بیان کرتا ہے کہ انہوں نے یہ روش اختیار کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ سائنس یا قانون یہ ہوگا کہ جب اور جہاں کوئی قوم اس قسم کی روش اختیار کرے گی اس کا یہی نتیجہ نکلے گا۔ گویا قرآن کریم یہ اس لیے پیش کر رہا ہے' نہ کہ یہ کہ وہ کوئی تاریخ کی کتاب ہے اور اس لیے وہ اقوامِ سابقہ عاد اور ثمود وغیرہ کی داستانیں بیان کرتا ہے۔ ان قوموں کو اس لیے شہادت میں پیش کرتا ہے کہ اس زمانے کے مخاطب عرب ان کی تاریخ سے

[گزشتہ سے پیوستہ] -----------------------------

Caesarion. Ruturning to Rome (45BC), he was given mandate by the people to rule, as dictator, for life. He introduced many reforms, including the Julian Calender and public libraries. On 15 March, 44 BC (The Ides of March), Caesar was murdered in the Senate by a group of republicans, led by Cassius and Brutus, who feared that he was about to establish a monorchy with himself as king (Reader's Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader's Digest Association Limited, P.230).

❶ ہیگل' جارج ڈبلیو۔ ایف (1770-1831) کی اس موضوع پہ مندرجہ ذیل کتب بھی لائقِ مطالعہ ہیں:

(a) Lectures on the History of Philosophy. (b) The Philosophy of History.

(c) Philosophy of Mind (1894).

اچھی طرح واقف تھے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ تم چلتے پھرتے دیکھتے ہو' ان راستوں سے گزرتے ہو جہاں ان قوموں کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات تمہیں نظر آتے ہیں۔ ان کھنڈرات کی ٹھیکریوں پر ان کے عواقب اور انجام کی داستانیں مرثیہ خواں ہیں۔ گویا یہ اس لیے ان کی داستانیں بیان کرتا ہے کہ یہ عرب کی مخاطب قوم ان سے اچھی طرح واقف تھی اور وہ روز ان کی کہانیاں بیان کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم نے انہی داستانوں کو سائنس کی حیثیت سے پیش کیا اور اسی قوم کے سامنے پیش کیا کہ تم یہ تو کہتے ہو کہ قومِ ثمود یہاں بستی تھی' وہ اجڑ گئی' یہ ان کی بستیوں کے کھنڈرات ہیں' ان کے بعد کوئی بھی وہاں نہ بسا لیکن کیا تمہیں معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ یہ ہے اِس کی اصل لِم کہ انہوں نے یہ غلط نظام اختیار کیا' جس کا نتیجہ یہ نکلا جو تم کہتے ہو۔

کائناتی اصولوں کے نتائج کی طرح معاشرتی نظام کے نتائج بھی ہمیشہ اٹل ہوتے ہیں' بات صرف سمجھنے کی ہے

ان داستانوں اور کہانیوں میں پہلی چیز جو قدرِ مشترک تھی وہ یہ تھی کہ وہ بھی آپس میں یہ داستانیں بیان کیا کرتے تھے۔ داستانیں قرآن کریم نے بھی بیان کیں لیکن وہ اصل چیز اگلی ہے کہ وہ ان داستانوں کو محض کہانیاں ہی سمجھا کرتے تھے جیسے کہ ہمارے ہاں سوتے وقت نانی اماں کہانی کہتی ہے' اس سے آگے نہیں چلتے تھے۔ قرآن حکیم نے انہی کی ان داستانوں کو جن کو وہ دن رات بیان کرتے تھے' بطور ایک سائنس پیش کیا اور کہا کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ یہ ایسا کیوں ہوا تھا۔ اس کے بعد پھر یہ بات انہی اقوام تک اور اسی مخاطب قوم تک محدود نہیں تھی۔ اسے بحیثیت سائنس پیش کیا گیا' سائنس اٹل قوانین کا مجموعہ ہوتی ہے۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے کہ عاد اور ثمود کے ساتھ یہ ہوا' یہ بات نہیں کہ ہم نے عربوں کو یہ بات کہی۔ آج بھی جو قوم ایسی روش اختیار کرے گی اس کا نتیجہ یہی نکلے گا۔ عجیب چیز ہے کہ اس زمانے کے مخاطب عربوں سے جب یہ کہا کہ یہ قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ انہوں نے اس قسم کی روش اختیار کی' تم اس سے سبق حاصل کرو' اگر تم نے بھی اسی قسم کی غلط روش اختیار کی یا اس روش پر تم اسی طرح بضد گامزن رہے تو تمہارا بھی یہی حشر ہوگا۔ انہوں نے اس کی مخالفت کی' مزاحمت کی لیکن آخر الامر یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی اور انہوں نے اپنی غلط روش کو چھوڑ دیا۔

آج ہمارے پاس سائنس اور قرآن کریم ہونے کے باوجود ایمان کی حالت ناگفتہ بہ کیوں ہے؟

عجیب بات ہے کہ یہ سب کچھ ہم بھی پڑھتے ہیں اور ہمارے لیے تو دہری بات ہے: ایک تو سائنس کی حیثیت سے اور دوسرے یہ کہ یہ کہنے والا خدا ہے جس پر ہمارا ایمان ہے' جس کتاب میں کہا گیا ہے وہ قرآن حمید ہے جس پر ہمارا ایمان ہے۔ اس زمانے میں ان عربوں کا تو ابھی ایمان نہیں تھا' انہوں نے تو اسے قبول کیا تھا۔ ہمارا ایمان اس کے اوپر ہے اور ہم اسے پڑھتے ہیں لیکن ہم اسے صرف داستانوں کی طرح پڑھتے ہیں' ہم نے اس کو سائنس نہیں بنایا۔ ہم اپنی روش کو اس لیے نہیں بدلتے کہ قرآن مجید نے کہا ہے کہ اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا'

دیکھو قومِ ثمود کو اور قوم عاد کو۔ عاد اور ثمود کی قوم تو وہاں رہی اس کے بعد جب ہمارے ہاں اب جو ہسٹری لکھی جاتی ہے وہ سائنس کے حساب سے لکھی جاتی ہے۔ اگر آپ، یہ جوان کی Decline and Fall of Roman Empire تاریخ[1] ہے، دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ صرف سلطنتِ روما کی بڑی ضخیم تاریخ ہے، وہ تاریخ نہیں ہے، وہ سائنس کے اعتبار سے ہے، وہ اس قوم کی ایک ایک چیز گنا تا ہے کہ اس نے یہ غلط روش اختیار کی تو اس کا یہ نتیجہ نکلا۔ اسی طرح سے اب اسی نہج پہ بہت سی تاریخیں لکھی جا رہی ہیں کہ وہ کیا وجہ تھی جس کے نتیجے میں اس قوم کا یہ حشر ہوا۔ یہ ریسرچ ہو رہی ہے۔ سلطنت روما کی تاریخ لکھنے والے[1] نے اپنی ساری عمر صرف کی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے بارہ یا تیرا Volumes (جلدوں) کے اندر سولہ Civilizations (تہذیبوں) کی تاریخ مرتب کی ہے۔ بڑی محنت کی ہے اور وہ سائنس کے طریقے پہ کی ہے کہ فلاں قوم نے کیا کیا تھا، اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ یہ سارا کچھ تو وہ کر رہے ہیں، اور ادھر ہم ہیں کہ جن کے سامنے وہ قرآن مجید ہے، جس پہ ہمارا ایمان ہے، ہم جب اس میں یہ چیزیں پڑھتے ہیں تو ہم اس کو داستانِ پارینہ سمجھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ یہ قومِ ثمود کے ساتھ ہوا تھا، یہ قومِ عاد کے ساتھ ہوا تھا، ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے بجز اس کے

کہ از ''یٰسینِ'' او آساں بمیری [2]

آج ہمارا اس سے کچھ اتنا ہی تعلق ہے۔

قرآن حکیم نے تاریخ کی شہادات کو ہمیشہ علت و معلول کی وضاحت کے لیے بیان کیا ہے مگر ہم میں سامریت ہے

عزیزانِ من! یہ قرآن حکیم بڑی Scientific (سائنسی) کتاب ہے۔ علت و معلول کی ایک ایک چیز اس کے اندر ہے کہ یہ نتیجہ نکلا ہے تو دیکھو کہ کیوں ایسا نتیجہ نکلا ہے۔ قرآن حکیم یہاں ان چیزوں کو اس مقصد کے لیے لاتا ہے۔ ہاں تو وہ بیان چلا آ رہا ہے، پہلے تو اس نے خارجی کائنات کی شہادات پیش کی ہیں کہ آپ دیکھ لیں کہ آیا کسان صحیح طریقے کے مطابق، قانون کی رو سے، کھیتی کرتا ہے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے، اس میں غلط روش اختیار کی جاتی ہے تو تباہی آ جاتی ہے۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ **فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَقُلۡ اَنۡذَرۡتُکُمۡ صٰعِقَۃً مِّثۡلَ صٰعِقَۃِ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ** (41:13) اگر یہ اس کے باوجود ان حقائق سے اعراض برتیں، اسے صحیح تسلیم نہ کریں، اس کی طرف نہ آئیں تو ان سے کہو کہ میرا کام یہ تھا کہ میں تمہیں آگاہ کردوں کہ اس روش کا نتیجہ کیا نکلے گا اور یہ چیز میں نے محض Academically (نظری طور پر)

---

[1] یہ اشارہ ایڈورڈ گبن (1721-1648ء) کی تاریخ The History of the Decline and Fall of the Roman Empire (88-1776) کی طرف ہے۔ یہ قریباً 1200 سال کی تاریخ اور اپنی نوعیت کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

[1] بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست کہ از ''یٰسینِ'' او آساں بمیری (اقبالؒ: ارمغانِ حجاز)
(تجھے اس کی (قرآن کی) آیتوں سے سوا اس کے اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ تو اس کی سورۃ یٰسین اس لیے پڑھے کہ آخری وقت تیری جان آسانی سے نکل جائے یعنی تو قرآنِ کریم کو موت وارد کرنے کے لیے پڑھتا ہے زندگی حاصل کرنے کے لیے نہیں)

تمھیں نہیں بتائی، میں نے تمہارے سامنے اقوام کی تاریخ کی شہادات پیش کر دیں جن سے تم اچھی طرح واقف ہو، جن کی داستانیں تم خود اپنے ہاں بیان کرتے ہو۔ میں نے اتنا ہی کیا ہے کہ ان داستانوں کے بعد یہ بتایا ہے کہ یہ اِس قسم کی تباہی اور بربادی جیسی اقوام سابقہ عاد و ثمود پر کیوں آئی۔ یہ کیوں ہوا تھا لیکن تم اس کیوں تک تو نہیں آتے، داستانوں تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھتے ہو۔ اس لیے میں بار بار ان الفاظ کو دہرا رہا ہوں کہ ہم اس مقام تک ہی ہیں جہاں تک وہ مخاطب عرب ایمان لانے سے پہلے تھے کہ صرف داستانوں تک ان کا تعلق تھا، وہ اس قانون کو نہیں لیتے تھے۔ ہم بھی انہیں داستانوں تک ہی محدود سمجھتے ہیں، ہم اس پہ کبھی غور نہیں کرتے کہ قرآن مجید یہ کیوں کہتا ہے کہ اس قوم نے کیا کیا جس کی وجہ سے تباہی آئی، کیا ہم تو ایسا نہیں کر رہے ہیں؟ اور ہم وہی کچھ کر رہے ہیں جو کچھ ان اقوام نے کیا تھا لیکن ان اقوام کی داستانوں کو، جو قرآن مجید نے بیان کیا ہے، کہانیوں کی طرح پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ سامریت ہے۔ سامری کہتے ہی داستاں گو کو ہیں، وہ کہانیاں تو سناتا ہے ان کو سائنس نہیں بناتا۔ اللہ نے کتابِ قرآن نازل کی ہے تو اس نے ساتھ میں حکمت بھی نازل کی ہے۔ حکمت کے معنی یہی ہیں ❶ The why of it معلوم ہو۔ اس قانون کی سائنس کیا ہے؟ یہ داستانیں جو قرآن مجید ایک سائنس کی حیثیت سے بیان کرتا ہے وہ اس مقصد کے لیے بیان کرتا ہے کہ اس کے نتائج کیا نکلیں گے۔

عبادت اور عبودیت کے تراجم نے قرآنی تعلیم کو مسخ کر دیا ہے اور اب ہے عجوبہ پرستی

عزیزانِ من! کہا ہے کہ اِذۡ جَآءَتۡهُمُ الرُّسُلُ مِنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ (41:14) خدا کے پیغامبران کی طرف آئے، جیسا کہا ہے کہ دائیں بائیں سے آئے، آگے پیچھے سے آئے یعنی ان کی اکثریت ان قوموں کی طرف آتی رہی اور آکر بات تو ہر رسول نے ایک ہی کہی ہے۔ یہی کہا ہے کہ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ (41:14) خدا کے سوا کسی اور کی اطاعت اختیار نہ کرو۔

اب ہم نے اپنی سہولت کی خاطر یا اپنے آپ کو فریب دینے کی خاطر اس لفظ تعبدوا یا عبادت کا ترجمہ پرستش کیا اور اس کے بعد کہا کہ خدا کی پرستش کرو اور پرستش ہم نے کچھ نماز روزے تک محدود کر لی۔ اگر یہی جو چیز تھی کہ یہ عبادت، عبد، عبدیت اور عبودیت کے معنی کیا ہیں تو یہیں کھڑے ہو کر ہم دیکھ لیتے کہ قرآن حکیم کیا کہتا ہے۔ عبودیت کے معنی ہیں: خدا کی محکومیت اختیار کرنا، الٰہ کے معنی ہی صاحبِ اقتدار کے ہیں، کسی اور کی اطاعت اور محکومیت نہیں، کوئی صاحب اقتدار نہیں بلکہ صرف خدا کے قانون کی اطاعت ہے اور خدا کا یہ قانون تمدنی و معاشی و معاشرتی دنیا میں خدا کی کتاب قرآن مجید میں ملے گا۔ صاحبِ اقتدار کے معنی میں خدا صاحبِ اقتدار ہے۔ اس کی محکومیت اختیار کرنی ہے۔ یہ تھی جو شروع سے ہر نبی کے Through (ذریعے)، ہر رسول کی وساطت سے تعلیم دی جاتی تھی، اور اسی کو یہاں دہرایا ہے۔ ایک ہی چیز ہے جو قرآن حکیم کہتا ہے کہ انسانوں کی دنیا کے اندر اگر حکمرانی خدا کی کتاب کی ہے تو یہ صحیح روش اور صحیح راہ ہے، اگر اس کے سوا کسی اور کی ہے تو وہ کفر

---

❶ یہ کیوں ہوا، اس کی لِم کیا ہے؟

کی ہے۔ خدا کہتا ہے کہ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ [1] (5:44)۔ یہ "حکم" یہی ہے جس کو آپ عبودیت کہتے ہیں۔ قَالُوۡا لَوۡ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنۡزَلَ مَلٰٓئِکَۃً فَاِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِہٖ کٰفِرُوۡنَ [2] (41:14)۔ اب وہی ان کے ہاں کی عجوبہ پرستی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر خدا چاہتا کہ ہم واقعی تمہارے اس پیغام کو پیغامِ خداوندی مان لیں تو اسے یہ چاہیے تھا کہ وہ ایک فرشتہ ہماری طرف بھیجتا یعنی انسان کے ذریعے سے جو اس نے اپنی وحی ہم تک پہنچائی ہے یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ عزیزانِ من! اب یہ تو وہی عجوبہ پرستی ہوئی، وہی کرامات کی سحر کاری ہوئی جو ہمارے سروں پر سوار ہے۔ یعنی جو بات کوئی کہتا ہے اسے نہیں دیکھنا، اسے آن میرٹ نہیں پرکھنا کہ جو کہتا ہے اس کو دیکھیے کیا کہتا ہے۔ عجوبہ پرستی یہ ہے کہ اگر تو وہ کچھ فوق البشری کیفیت لیے ہوئے ہے، حضرت صاحب کچھ کرامات دکھاتے ہیں تو پھر ان کی ہر بات خواہ بڑا ہی کیوں نہ ہو، مانتے ہیں حتیٰ کہ اگر وہ مجذوبوں کی باتیں ہیں جو خالصتاً دیوانگی پر مبنی ہوتی ہیں، ہم ان میں حقائق ڈھونڈیں گے، اس لیے کہ وہ بالوں سے دودھ نکال دیتے ہیں اور اس کے برعکس اگر بڑے سے بڑا عالمی سائنسدان، مفکرِ قرآن اس طرح سے عقل و بصیرت کی بنیاد پر بات کرتا ہے لیکن اس سے اگر کوئی کرامت سرزد نہیں ہوتی ہے تو اس کی طرف کوئی نہیں آئے گا، کوئی اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔

حقائق کو تسلیم کرنے کے بجائے نبی اکرمؐ سے معجزوں کا مطالبہ تھا، یہ بچپن اور جوانی میں شعور اور ذہن کا فرق تھا

یہی چیز ان لوگوں نے کہی اور یہی کہتے چلے آئے، یہی جو حضورؐ کے عرب کے مخاطب تھے وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ اگر آپ کہتے ہیں کہ آپؐ خدا کی طرف سے پیغامبر ہیں تو کوئی معجزہ دکھائیے۔ آپؐ نے کہا کہ یہ میں جو قرآنِ کریم تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں یہ سب سے بڑا معجزہ ہے، تم خود اس کے سامنے عاجز ہو، میں چیلنج دے رہا ہوں کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہے، کسی انسان کا ہے تو اس کی مثل کچھ بنا کر لے آؤ۔ لیکن اس کو وہ معجزہ نہیں سمجھ رہے تھے۔ وہ تو اس چیز کو معجزہ مانتے تھے جو محسوس شکل میں اڑ کر چلی جائے مثلاً کوئی درخت آجائے، کوئی بادل آجائے۔ ان کے ہاں یہ چیز معجزہ تھی۔ یہ ذہن انسانی کی طفولیت کا زمانہ ہے، جب وہ اس قسم کی باتیں مانتا ہے۔ بچوں کو جو آپ کہانیاں سناتے ہیں کہ وہ پری آئی، اور وہ جن آئے اور اب انہوں نے وہ الف [3] لیلیٰ شروع کر رکھا ہے۔ وہ بچپن تو ٹھیک ہے آپ بھی وہاں بیٹھے ہوئے ہیں جب وہ الف لیلیٰ ہوتی ہے۔ کیا آپ اس سے مسحور ہوتے ہیں؟ آپ وہاں سے تمسخر کے ساتھ اٹھ کر کیوں

---

[1] یاد رکھو! جو شخص اس قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے، وہ کافر ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 255)۔

[2] انہوں نے، اس کے جواب میں کہا کہ اگر اللہ (ہماری طرف اپنی وحی بھیجنا) چاہتا تو وہ آسمان سے فرشتے نازل کرتا (جنہیں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے۔ تم تو ہمارے جیسے انسان ہو، اس لیے) ہم تمہارے ان پیغامات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص 1112)۔

[3] یہ اشارہ پاکستان ٹیلی ویژن (PTV) پر نشر ہونے والے الف لیلیٰ پروگرام کی طرف ہے جو اس زمانے میں آن ایئر تھا۔

چلے آتے ہیں؟ بچہ ہفتہ بھر اس کا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ کیا فرق ہے؟ اس کا ذہن ابھی بچپن میں ہے' وہ اس قسم کی جو تو ہم پرستیاں ہیں ان میں دلچسپی لیتا ہے۔ آپ بڑے ہو گئے ہیں' شعور پختہ ہو گیا ہے' آپ کو اس کے اندر کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی۔ بعینہٖ یہی صورت قوموں کی زندگی میں بھی ہے۔ یہ ساری قومیں اپنے بچپن کے زمانے کے شعور اور ذہن رکھنے والی تھیں جو معجزے مانگا کرتی تھیں' کرامات مانگا کرتی تھیں۔ قرآن حکیم اس دور کے اندر آیا جب انسان طفولیت سے جوانی کے زمانے میں پہنچ گیا تھا۔ اس کا ذہن پختہ ہو رہا تھا۔ اسی لیے قرآن حکیم کے اندر تعقلون' تدبرون' تفکرون' یہ ساری چیزیں آئیں جن سے قرآن نے عقل فکر علم اور بصیرت کو اپیل کی ہے۔ اس لیے کہ اب یہ بچہ جوان ہو گیا تھا۔ اس کو اب پریوں اور جنوں کی کہانیاں متاثر نہیں کر سکتیں' اس کو عقل و فکر کی رو سے ہی سمجھانے کی ضرورت تھی۔ بہرحال انہوں نے یہ کہا کہ صاحب! ملائکہ کو آنا چاہیے۔ قرآن کریم گنا تا ہے کہ اس قوم کے کیا جرائم تھے؟ جرائم کے معنی یہ ہیں کہ کیا غلط نظام تھا جس کی وجہ سے یہ نتیجہ نکلا۔

قوموں کی تباہی و بربادی کے اسباب افراد کے انفرادی عیوب نہیں بلکہ غلط نظام ہوتا ہے قرآن کریم اس طرف توجہ دلاتا ہے

یاد رکھیے' عزیزانِ من! قومیں اپنے نظام کے ہاتھوں ہی پنپتی ہیں' غلط نظام کے ہاتھوں ہی تباہ ہوتی ہیں۔ انفرادی برائیاں یا عیوب یا جو جرائم ہیں' وہ پوری قوم کو تباہ نہیں کرتے' ان کا ازالہ ہو سکتا ہے' ان کو روکا بھی جا سکتا ہے لیکن جب کسی قوم میں غلط نظام آ جائے تو اس کا نہ ازالہ ہو سکتا ہے اور نہ اُس کو روکا جا سکتا ہے اور جب نظام قوت کے زور پر نافذ کیا جائے تو پھر اس کا مقابلہ ہی کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ چیز ہے جو قرآن حکیم ان کی خرابیاں گنا تا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ غلط نظام کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اب وہ تاریخ کی ایک مثال لاتا ہے کہ **فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ** ❶ (41:15)۔ یہ دیکھیے جرم! دیکھیے یہ غلط نظام کیا ہے؟

بغیر الحق نظام کو قوت کے زور پر مسلط کرنا سب سے بڑا جرم ہے مگر مومن الحق سے اعلون بنتا ہے

قرآن بتاتا ہے کہ **وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً** (41:15) انہیں اس کا زعم تھا کہ ان سے زیادہ طاقتور کوئی نہیں اس لیے وہ جو جی میں آئے کر سکتے ہیں۔ یہ ہے قوت کے زور پر دوسروں کے اوپر مسلط ہو جانا' قوت کے بل بوتے پر حکومت قائم کرنا۔ لفظ استکبار سے قرآن مجید نے یہ بتایا ہے۔ قرآن مجید نے استکبار یعنی کبریائی کہا ہے۔ تکبر کے معنی بڑا ہو جانا ہیں' بڑائی جتانا ہے۔ یہ بڑائی حکومت قائم کرنا' اقتدار قائم کرنا' اپنے آپ کو دوسرے کے اوپر مسلط کر دینا ہے۔ اس میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ بغیر الحق نہ ہو۔ الحق تو خدا کے قوانین

---

❶ قومِ عاد کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے ناحق تکبر اور سرکشی اختیار کر رکھی تھی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1112)۔

ہیں۔ یہ قرآن کریم کا ایک عجیب اعجاز ہے' یعنی یہ جس کو استکبار کہتے ہیں' جو بڑا ہونا ہے' کبریائی حاصل ہونا ہے' قوت' اقتدار' اور حکومت حاصل ہونا ہے' یہ کوئی عیب نہیں ہے' جرم نہیں ہے' یہ کوئی گناہ نہیں ہے' یہ تو مومن کا حصہ ہے۔ یعنی اعلون ہونا تو قرآن کریم کی رو سے مومن کی نشان ہے' جماعت مومنین کا تو طرہ امتیاز یہ ہے۔ مومن ہو ہی اس وقت سکتے ہیں جب وہ اعلون (3:139) ہوں۔ یہ چیز تو کوئی برائی کی نہیں ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکے گا کہ کفار مومنین کے اوپر کبھی غالب آجائیں۔ جو غالب آنا ہے وہ تو مومن کا شعار ہے۔ یہ بری بات نہیں ہے۔ بری بات کیا ہے؟ یہ ہے بغیر الحق۔ یہ دنیا کے اندر الحق کے لیے قوت لیتے ہیں۔ اور الحق خدا کی وحی کے مطابق ہے۔ وہی الحق ہے۔ قومیں یہ استکبار' قوت اور اقتدار حاصل کرتی تھیں' یہ قوم عاد اور ثمود کا جو ذکر ہے یہ اپنے آپ کو بغیر الحق مسلط کرتی تھیں۔

مسلط کرنے کا ذریعہ: قوت یا مشاورت مگر اقدارِ خداوندی کو مشاورت سے نافذ کرنا ہی الحق ہے' قومِ عاد کی مثال

اب سوال یہ ہے کہ ان کے پاس اپنے آپ کو مسلط کرنے کا ذریعہ کیا تھا؟ قرآن کریم کہتا ہے کہ **وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً** [1] (41:15)۔ یہاں بات صاف ہوگئی۔ جو نظام قوت کے زور پر مسلط کیا جائے گا وہ بغیر الحق ہے' اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ جو نظام مشاورت سے طے کیا جائے گا' اس کی بنیاد الحق پر ہوگی یعنی اگر وحی خداوندی' اقدارِ خداوندی' احکامِ خداوندی کو امت یا قوم یا ملت کی مشاورت سے نافذ کرنے کا نظام ہوگا' تو یہ آپ کا اسلامی یا قرآنی نظام ہو جائے گا اور اگر کوئی اپنا نظام یا اپنی حکومت قوت کے زور پہ مسلط کرے کہ ہم سے زیادہ کون طاقتور ہے یعنی وہ اپنی قوت کے زور پہ اپنے اس نظام کو مسلط کرتے تھے اور نظام بھی الحق پہ مبنی نہیں تھا۔ یہ ہے جرم جو اس قوم کا گنایا گیا ہے۔ اب آپ سوچیے کہ یہ جو قرآن حکیم نے کہا ہے یہ صرف اس زمانے کی مخاطب عرب قوم کے لیے تھا یا قیامت تک کے لیے ہے؟ یہ قیامت تک کے لیے سائنس ہے کہ دنیا میں کسی زمانے میں' کسی خطہ ملک میں' کوئی قوم جو یہ کچھ کرے گی کہ دوسروں پر قوت کے زور پر اپنا تسلط جمائے گی اور الحق اس کے ساتھ نہیں ہوگا تو اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ یعنی یہ ایک قانون ہوا۔ اس اعتبار سے یہ ایک سائنس بنا۔ جس قوم کی بھی قرآن حکیم نے شہادت پیش کی' اس کی تاریخ اٹھائیے' اس میں نظر آئے گا کہ انہوں نے اس قسم کا نظام اپنے ہاں قائم کیا تھا یعنی محض قوت کے زور پر اپنے آپ کو قوم پر مسلط کر دینا اور اس طرح کرنا کہ الحق بھی ساتھ نہ ہو تو یہ ہے جرم جو قومِ عاد کا گنایا۔ انہوں نے کہا تھا کہ **وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً** (41:15) ہم سے زیادہ قوت کس کے پاس ہے صاحب!! اس وقت ان کی نگاہوں میں دوسری قومیں ہی تھیں۔ **اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً** (41:15)۔ انہوں نے یہ دیکھ لیا تھا

---

[1] انہیں اس کا زعم تھا کہ ان سے زیادہ طاقتور کوئی نہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1112)۔

کہ ان کے ہاں کی اور کوئی ہمعصر قوت نہیں رکھ رہی۔ انہوں نے اس پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ اللہ جس نے انہیں پیدا کیا ہے' ان سے زیادہ قوتوں کا مالک ہے۔

آج قوت کے زور پر دوسروں سے بڑھ جانے کا جذبہ مادہ پرستی کا خاصہ بن چکا ہے

عزیزانِ من! تو یہی قومیں ہیں جنہیں آج آپ سپر پاورز کہہ رہے ہیں۔ دنیا میں تو ہر پاور اس فکر میں رہتی ہے کہ دوسری جو پاور ہے وہ کہیں ہم سے زیادہ قوت نہ رکھ لے کیونکہ وہ تو اپنا نظام اپنی حکومت مسلط ہی قوت کے زور پر کرتے ہیں' اسی طرف ان کی توجہ ہوتی ہے' یہ نہیں ہوتا کہ ہم اپنے ہاں ان سے بہتر نظام قائم کریں تاکہ یہ زیادہ دیر پا رہے بلکہ دوسری قوموں سے زیادہ ہم قوت حاصل کریں' انہوں نے یہی کہا تھا۔ آپ غور کیجئے' عزیزانِ من! اور آج کے دور میں ہم جہاں بیٹھے ہیں' یہاں کے واقعات کو سامنے لائیے اور پھر دیکھیے کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اس کی شہادت دیتا ہے یا نہیں؟ آج یہ جو آپ مغربی تہذیب' مادہ پرستی (Materialism)' سیکولرازم کہتے ہیں' یہ الفاظ کیا ہیں؟ یہ صرف قوت کے بل بوتے پر اپنے آپ کو مسلط کرنا ہے۔ آج ساری دنیا کا یہی نظام ہے اور ہر پاور کی کوشش ہے کہ دوسری پاور قوت میں ہم سے زیادہ نہ بڑھ جائے۔ خوبیوں میں نہیں' منفعت عامہ کے لیے نہیں' صرف قوت (Power) میں نہ بڑھ جائے۔

تعمیری قوت کو دوام بخشنے کا راز عام منفعت سازی میں ہے' صرف اس میں نہیں کہ قوت کس کے پاس زیادہ ہے

قرآن مجید نے الحق کہا تھا اور بقا کا اصول یہ دیا ہے کہ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (13:17) بقا اسی نظام کے لیے ہے جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے ہو۔ یہ تھا قرآن مجید کا قانون۔ تو گویا اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارا نظام بقا حاصل کرے' دیر پا رہے' تو اس کے لیے طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ منفعت بخش کام کرو' دوسروں کو نفع پہنچانے والے کام کرو' اس سے بقا ہے' زندگی ہے لیکن یہ لوگ کرتے یہ تھے کہ نہیں صاحب! یہ سوال نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ قوت کس کے پاس زیادہ ہے۔ ساری دنیا کا نظام آج یہی ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم سے زیادہ بڑی قوت کس کے پاس ہے۔ قرآن مجید نے دوسری قوم نہیں گنائی۔ اگر وہ دوسری قوم گناتا تو اس کے معنی تھے کہ وہ بھی یہی قانون سمجھتا ہے کہ جس کے پاس زیادہ قوت ہوتی ہے' جس کا ڈنڈا ہوتا ہے اس کی بھینس ہوتی ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ کس قوم کے پاس زیادہ قوت ہے۔

اس نے کہا ہے کہ یہ جو تم قوموں پہ نگارہ رکھتے ہو اس کے اوپر بھی ایک صاحبِ قوت ہے اور وہ ہے خدا۔ خدا کے صاحبِ قوت ہونے کے معنی کیا ہیں؟ یہ خدا کا قانون ہے جو صاحبِ قوت ہے۔ اس کا قانون یہ ہے کہ جو نظام جبراً مسلط کیا جائے' خالص قوت کے زور پر دوسرے انسانوں کے اوپر مسلط کیا جائے تو اس نظام کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ جو منفعت عامہ کی بنا پر قائم کیا جائے تو اس کے حصے میں بقا ہوگی۔

یہ خدا کا قانون ہے اور قانون میں جتنی بڑی قوت ہوتی ہے وہ تو Bullet (گولی) کے اندر بھی وہ قوت نہیں ہوتی۔

قانونِ خدا یہ ہے کہ ایٹم پورے کرّہ ارض کو تباہ کر سکتا ہے مگر تم ضد اور سرکشی کی بنا پر انکار کرتے ہو' دلیل و برہان سے نہیں۔ تمہارے ہاں جحود ہی جحود ہے

قرآن حمید بتانے یہ آیا ہے کہ یہ جو **اَشَدُّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً** [1] (41:15) ہے' یہ قانونِ خداوندی ہے۔ اب آپ پھر خارجی کائنات کی طرف آجایئے' آپ کو اس کی قوت کا اندازہ لگانا ہے تو ایٹم کے دور کے اندر آج کے سائنسدانوں سے پوچھو۔ اس کے قانون میں' جب یہ Physical World (طبعی دنیا) میں کارفرما ہے' آپ اس کی قوت کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ اور اب تو وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ایک ایٹم بم پورے کے پورے کُرّہ ارض کو تباہ کردے گا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ قوت کس قدر ہے جن کے پاس یہ ہے! ان قوموں کی قوت کیا ہے؟ یہی کہ ایک ملک کو' ایک قوم کو' ایک شہر کو تباہ کر دینا۔ اُس کا قانون یہ ہے کہ وہ جو ایک ذرہ ایٹم (Atom) کا ہے وہ پورے کرہ ارض کو تباہ کر سکتا ہے۔ یہ قانون کی قوت ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تم قوموں کے اوپر نگاہ رکھ رہے ہو کہ کوئی ایسی قوم تو نہیں جو ہم سے زیادہ صاحبِ قوت ہو؟ یاد رکھو! خدا کا قانون اس سے زیادہ صاحبِ قوت ہے۔ وہ جو ہم کہہ رہے ہیں کہ غلط نظام کا نتیجہ تباہی ہے تو وہ یہی ہے کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

اس لیے کہ

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائیدار ہوگا [2]

قانون یہ ہے۔ یہ ہے جو قرآن حمید کہتا ہے کہ **اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیۡ خَلَقَهُمۡ هُوَ اَشَدُّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً ؕ وَ كَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَجۡحَدُوۡنَ** [3] (41:15)۔ یہ قوانین جو ہمارے ہیں' یہ جانتے بوجھتے محض ضد اور سرکشی کی بنا پر ان کا انکار کرتے ہیں۔ محض یہ انکار اور چیز ہوتی ہے اور یہ **جحود** [4]

---

[1] ان سے کہیں زیادہ قوتوں کا مالک ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1112)۔

[2] اقبالؒ: بانگِ درا' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996ء' ص149۔

[3] وہ اللہ جس نے پیدا کیا ہے ان سے کہیں زیادہ قوتوں کا مالک ہے۔ ان کے اس عدم تدبیر کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ قوانین خداوندی کا انکار کرتے تھے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1112)۔

[4] امام راغب اصفہانی نے اپنی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' اور پطرس بستانی نے ''محیط المحیط'' میں لکھا ہے کہ الجحد کے معنی ہوتے ہیں ''اس چیز سے انکار کر دینا جس کا اقرار دل کے اندر ہو اور اس کا اقرار کرنا جس کا انکار دل کر رہا ہو'' مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد اول' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1960' ص۔419۔

اور چیز ہوتی ہے۔ یہ ہوتا ہے خواہ مخواہ ''جنوں کینا پُس مار دے جانا'' یعنی اس کے لیے نہ کوئی دلیل نہ کوئی برہان نہ کوئی Reason نہ کوئی Argument بس وہ ایک ''نہ'' کی ہوئی ہے اور پسے چلے جا رہے ہیں۔ یہ جو چیز ہوتی ہے یہ ہوتی ہے جس کو جحود کہتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ کسی دلیل اور Argument (برہان) کے زور پر یہ مخالفت کر رہے ہیں یا انکار کر رہے ہیں نہیں انہوں نے بس ایک دفعہ نہ کر دی ہے اور نہ کے بعد کہے چلے جا رہے ہیں کہ نہیں صاحب! ہم نے ماننا ہی نہیں اتم کہتے ہی غلط ہو چلو نکل جاؤ فتویٰ لگا دیا ہے۔ یہ جحود ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ** (27:64) سچے ہو تو دلیل لاؤ۔ بحث یا Discussion بغیر دلیل کے کی جاتی ہے۔ وہ ہوتا ہے جس کو جحود کہتے ہیں۔ قرآن کریم تو دلائل کو Invite (مدعو) کرتا ہے۔ اور وہ اس لیے نہیں لاتے کہ **لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ** (23:117)۔ ساتھ ہی یہ کہتا ہے کہ تم دیکھو گے کہ دلیل ان کے پاس کوئی نہیں نکلے گی جحود ہی جحود ہوگا۔ وہ عذاب کیا آیا؟ کہا کہ **فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا**[1] (41:16)۔

شب وروز کی اس گردش میں نہ کوئی دن منحوس ہوتا ہے اور نہ ہی مبارک۔ یہ منحوس ومبارک ہندوآنہ تصور ہے جو ایران سے درآیا

عزیزانِ من! قوموں پہ جو عذاب آتا ہے اسے یہاں (41:16) میں ''ایامِ نحسات'' کہا ہے یہ کوئی آندھی چلی ہے اس قسم کی کوئی چیز ہوئی ہے ہم تفسیر میں تو جاتے نہیں ہیں۔ یہ جو ''ایامِ نحسات'' ہے ضمناً میں عرض کر دوں کہ عام طور پہ اس کا ترجمہ کیا جائے گا ''وہ منحوس دن تھے جن میں یہ ہوا''۔ اب ہمارے ہاں بھی بعض دنوں کو منحوس گنا جاتا ہے۔ سعد ونحس کا تصور ہمارے ہاں پایا جاتا ہے کہ بعض دن سعد ہوتے ہیں اور بعض دن منحوس ہوتے ہیں یعنی یہ کہ ''دن منحوس'' ہوتے ہیں۔ اب اس کے بعد ہمارے ہاں تو نحوست والے دن آئے جس طرح یہ ہندوؤں کے ہاں ہے مثلاً ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ منگل کا دن منحوس ہے۔ یہ خالص ہندوآنہ تصور ہے۔ ان کے ہاں منگل اور ہفتہ نحوست کے دن ہیں اور پھر ان سے ذرا الگ ہٹے تو ہم نے کہا کہ نہیں یہ ''جمعرات ٹھنڈا دن ہوندا ہیگا اے'' یعنی اے پہلوان اپنا زور نئیں کردے ایس دن''۔[2] آپ جمعرات پہ ہنس رہے ہیں ''جمعہ دی گھر والی ہندی اے ایس واسطے اینوں ٹھنڈا کیندے نیں''۔[3] یعنی ہمارے ہاں بھی یہی ہے۔ یہ جمعرات کو علاج نہیں شروع کرتے اُدھر ہمارے ہاں وہ ''پیراں فقیراں دا دن''[4] عام طور پہ مشہور ہے۔ جمعرات کو قبروں پر دیئے جلتے ہیں اور قوالیاں ہوتی ہیں اس لیے یہ ''کچھ کم نیک جیہڑا ایہو جیا نئیں کردے''[5] لیکن ان کے ہاں ہندوؤں

---

[1] سو جب ان کی تباہی کا وقت آیا جو ظاہر ہے ان کے لیے بڑا ہی نامبارک تھا تو ہم نے ان پر ایسے زور کی آندھی چلا دی جس نے انہیں آتشِ خاموش کی طرح ختم کر کے رکھ دیا (54:19)۔ اس طرح انہیں اس دنیا کی زندگی میں ذلت آمیز عذاب مل گیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔ 1112)۔

[2] یہ جمعرات کا دن ذرا ٹھنڈا ہوتا ہے یعنی اس دن پہلوان اپنی مشقِ پہلوانی نہیں کرتے۔

[3] یہ جمعہ کی بیوی (گھر کی مالکن) ہوتی ہے اس لیے اسے ٹھنڈا کہتے ہیں۔

[4] پیروں فقیروں کا دن

[5] اس لیے یہ اس جیسا کچھ نیک کام نہیں کرتے۔

کی طرف سے وہ منگل اور وہ ہفتہ 'سینچر' دیوتا منائے صداگن پائے۔

اب یہاں پاکستان میں تو وہ ہندو نہیں رہے۔ہم نے اپنے بچپن میں دیکھا ہے کہ صبح کے وقت تیل کی کٹوری برہمن کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور وہ ایک ایک دکان کے سامنے سے گزرتا تھا اور تھوڑا سا تیل ڈالتا جاتا تھا۔عزیزانِ من! یہ دن جو نحس دن اور منحوس دن ہیں اصل میں یہ ساری چیزیں ایران سے آئیں۔ وہ ستارہ پرست قوم تھی۔ اب بھی آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ اس ستارہ پرستی میں نجوم وغیرہ کے اندر یقین رکھتے ہیں، وہ بیٹھے ہوئے زائچہ بناتے ہیں کہ اب وہ جو سورج ہے وہ عقرب میں چلا گیا اور وہ جو زحل تھا ٹکرا گیا اور اس کے بعد یہ ہوا تو یہ اس لیے نحس ہو گیا۔یعنی وہ زندہ انسانوں کی تقدیر ستاروں کی رو سے، جو خود پابندِ سلاسل ہیں، سے وابستہ کرتے ہیں ''جھید ے اُتے چڑھے پھر دے نیں انسان [1] ہن''۔آپ کے ہاں یہ چاند بڑے سے بڑا ستارہ تھا۔عزیزانِ من! یہ تمام توہم پرستی کی باتیں ہیں۔

اسوہ ابراہیمیؑ: خاکِ زندہ ہے تُو تابع ستارہ نہیں، اور منحوس تو مصیبت ہوتی ہے دن نہیں

قرآن کریم نے تو ایک لفظ کہہ کر بات صاف کر دی۔کیا بات ہے اس اسوہ ابراہیمی کی! ایک دلیل دی کہ جو روبہ زوال ہو سکتا ہے، جو تغیر پذیر ہو سکتا ہے، جو آج ہے وہ کل نہیں ہے، جو غروب ہو سکتا ہے، وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ بات ختم ہو گئی۔ یہ ہے دلیل کہ جو آج ہے کل نہیں، وہ مری تقدیر پہ کیا اثر ڈالے گا:

خاکِ زندہ ہے تُو تابع ستارہ نہیں

لیکن ہم بھی اسی توہم پرستی میں چلے پھر رہے ہیں۔ ہفتے بھر کے دن گنائے ہوئے ہوتے ہیں، مہینے گنائے ہوئے ہوتے ہیں پھر وہ پوچھتے ہیں کہ آپ کی پیدائش کس دن ہوئی تھی، کس گھڑی ہوئی تھی، کس ساعت ہوئی تھی؟ پھر آپ کا مقدر بتائیں گے، زائچہ بتائیں گے۔مسلمان یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ یاد رکھیے! کوئی دن منحوس نہیں ہوتا۔جس دن کسی کے اوپر کوئی مصیبت آتی ہے وہ مصیبت منحوس ہوتی ہے، نحس ہوتی ہے۔ وہ نحس ہوتا ہے اس قسم کا بہت زیادہ دھواں جس کے اندر شعلہ چمکتا ہوا تو نظر نہ آئے لیکن وہ اندھیرا پیدا کر دے Confusion (الجھاؤ) پیدا کر دے۔اس قسم کی جو چیزیں ہیں، وہ نحس [2] ہوتی ہیں۔نحس کے معنی ہوتے ہیں کہ جب بھی کسی کے اوپر کوئی مصیبت ایسی

---

[1] جس کے پیچھے آج انسان لگے ہوئے ہیں، ان پہ پہنچ رہے ہیں۔

[2] تاج العروس میں لکھا ہے کہ النحاس ''اس اونچے ہو جانے والے دھوئیں کو بھی کہتے ہیں جس میں خفیف حرارت ہو لیکن لپٹ اور شعلہ نہ ہو۔'' امام راغب اصفہانی نے اس کے معنی ''ایسے شعلے'' کے لکھے ہیں ''جس میں دھواں نہ ہو''۔ یہیں سے نحس ہے۔اسی سے النحس ہر تاریک معاملہ کو کہتے ہیں۔امام راغب اصفہانی سے اپنی تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ ''ایام نحسات سخت سردی کے دنوں کو بھی کہتے ہیں۔'' اسی سے ایام نحسات (41:16) مرکب توصیفی ہے، یعنی پر مشقت ایام (ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1961ء، ص۔1593)۔

آ جائے جس میں وہ بالکل سرگرداں ہو جائے۔ اس کو نحس کہتے ہیں' وہ دن نحس نہیں ہوتا۔ جس پہ مصیبت نہیں آتی اس کے لیے وہ نحس نہیں ہوتا' ورنہ صرف دن تو سب کے لیے وہی ہونا چاہیے۔ سعد و نحس اس فرد کے لیے' اس گروہ کے لیے ہوتا ہے جس پر مصیبت آتی ہے اس مصیبت کو نحس کہتے ہیں۔ اس لیے وہ دن ان کے لیے بڑا ہی منحوس کہیے' تباہی کا دن کہیے۔ یہ ترجمہ ہو گیا' بات ختم ہو گئی۔ آپ سعد و نحس میں جاتے ہی کیوں ہیں صاحب! وہ ان کے اوپر مصیبت آئی' وہ ان پر مشقت' نقصان' ضرر اور تکان ہوتی ہے۔

عَذَابَ الْخِزْيِ کا قرآنی مفہوم

اسی آیت یعنی (41:16) میں ایک لفظ ''عذاب'' بھی آیا ہے۔ سنیے' عزیزانِ من! عذاب کے متعلق قرآن حمید کیا کہتا ہے؟ قوموں کا عذاب کیا ہوتا ہے؟ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ ایک چیخ ماری اور وہ کسی طرح سے زمین پھٹی اور اس میں دھنس گئے اور یہ سارا کچھ ہو گیا۔ ٹھیک ہے یہ تو فزیکل (طبعی) تباہی ہوتی ہے۔ غلط نظام کی رُو سے جو تباہی آتی ہے' سنیے! وہ کیا تباہی ہوتی ہے؟ کہا کہ **عَذَابَ الْخِزْيِ** (41:16) رسوائی کا عذاب' ذلت و رسوا۔ اس سے قوم باقی قوموں کے مقابلے میں ذلیل ہو جاتی ہے۔ یہ ہے عذاب' عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے بار بار اس چیز کو **عذاب الخزی** کہا ہوا ہے یعنی ذلت اور رسوائی کا عذاب۔ یاد رکھیے جو قوم بھی دوسری قوموں کے مقابلے میں اپنے آپ کو ذلیل سمجھتی ہے اور ذلیل ہوتی ہے تو سمجھ لیجیے کہ خدا کے عذاب میں مبتلا ہے۔ قرآنِ کریم واضح طور پہ **عَذَابَ الْخِزْيِ** کی شہادت دیتا ہے۔

ہماری سوچ ہمیشہ آخرت اور قیامت کے لحاظ سے فریبِ نفس کی اسیر رہی ہے

اب اس کے بعد پھر ہمیں تھوڑا سا اور فریب دیدیا جاتا ہے کہ ٹھیک ہے یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کا یہ سارا نتیجہ' وہاں آخرت میں' قیامت میں جا کر نکلے گا۔ قیامت برحق اور آخرت کی زندگی پر ہمارا ایمان ہے لیکن ہر چیز کو اس پر اٹھا دینا تا کہ ہم محسوس ہی نہ کر سکیں کہ ہم عذاب کے اندر مبتلا ہیں یا سعد کے اندر مبتلا ہیں' یہ ہے جو دھوکا دیا جاتا ہے کہ نہیں صاحب! یہ جو بات ہے' یہ جو ذلت اور رسوائی ہے' یہ آخرت کی ہے' یہ ان قوموں کی ہوگی جو یہاں بڑے مہذب بنے پھرتے ہیں' وہ وہاں جا کر رسوا ہونگے اور یہاں ہم جو اس طرح ساری قوموں کی جوتیاں کھا رہے ہیں' وہاں خدا کے بڑے مقرب اور معزز ہونگے۔ یہ ایک فریب ہے جو دیا جاتا ہے۔

ذلت و رسوائی کے عذاب میں صرف قوم ہی رسوا نہیں ہوتی بلکہ اس کا ہر فرد رسوا ہوتا ہے اور آخرت میں اس سے بھی زیادہ

میں نے دو تین دفعہ کہا ہے' عزیزانِ من! میں خود یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جہاں قرآن کریم نے

عَذَابَ الْخِزْیِ کہا ہے' وہاں اگلا لفظ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ہے۔ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ اسی دنیا کی زندگی کے اندر ذلت اور رسوائی ہے۔ یہ ہے عذاب۔ قوموں پہ آتا ہے۔ جو قوم ذلیل ہوتی ہے اس کا ہر فرد ذلیل ہوتا ہے' عزیزانِ من! قرآن فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا یعنی اس زندگی کے اندر کہتا ہے اور آگے ہے کہ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰی (41:16) اور آخرت میں بھی عذاب ہے کیونکہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی وہ آگے بھی جاتی ہے۔ بات یہاں یہ ہوگئی کہ جو یہاں کا ذلیل ہے وہ وہاں بھی ذلیل ہے بلکہ اخزیٰ ہے یعنی اور زیادہ ذلیل ہے:

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامہ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

(اقبالؒ)

موجودہ زندگی آخرت کی زندگی کا پیمانہ ہے اور غلط نظام کا نتیجہ

اگر یہ دیکھنا ہے کہ آخرت میں ہمارا انجام کیا ہوگا تو یہ دیکھو کہ یہاں ہماری حالت کیا ہے۔ جو قوم یہاں عزت وتکریم اور شرفِ انسانیت کی زندگی بسر کرتی ہے' زندگی تو جوئے رواں ہے' وہ وہاں بھی مقرب اور مشرف ہوگی۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ یہاں جو عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (41:16) ہے تو وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰی [1] (41:16) وہاں اور بھی زیادہ ذلیل ہونگے۔ یہ ایسا معیار ہے' ایسی کسوٹی ہے جس میں کسی قسم کا فریب ہی نہیں آسکتا۔ اب یہ اپنی ہی بات لے لیجیے کہ ہم ذلیل ہیں یا نہیں؟ کوئی دو مسلمان جب بھی آپس میں ملیں گے تو ان کے ہاں جو پہلا کلمہ ہوگا وہ یہ ہوگا کہ صاحب! ہمارا مسلمانوں کا کیا بنے گا! وہ ہمیں نہ کھا جائے وہ لوٹ کر نہ لے جائے' ہر وقت یہ ادھر سے تباہی آرہی ہے۔ اس سے زیادہ ذلت کسی قوم کی اور کیا حالت ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے اندر ہی اندر اپنے آپ کو ذلیل اور کمزور محسوس کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ ہے الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ یہ غلط نظام کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ (41:16) اور پھر ذلیل قوم کا کوئی حامی وناصر نہیں ہوتا۔

امداد کے طور پر باسی روٹی کا ٹکڑا' انسان کے لیے اور زیادہ رسوائی کا باعث بنتا ہے مگر انسان رہتا مطمئن ہے

آپ کہیں گے کہ لوگ مدد تو دیتے ہیں۔ فقیر کی جھولی میں جب آپ باسی روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دیتے ہیں تو وہ مدد نہیں ہوتی' وہ تو اس کی ذلت میں اور اضافہ کیا جاتا ہے۔ ذلیل قوموں کی جو مدد کرتے ہیں وہ حقیقت میں امداد نہیں ہوتی' وہ ان کو ان کی ذلت کے اندر ایسا رکھتے ہیں کہ وہ نہ جئیں نہ مریں۔ اس نتیجے تک وہ قومیں ان کو پہنچنے ہی نہیں دیتیں کہ آخری دم تک پہنچ کر ہی ان کو ہوش آجائے کہ صاحب!

---

[1] اور آخرت کی زندگی کا عذاب اس سے بھی زیادہ رسوا کن ہوگا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1112)۔

ہم کہاں جارہے ہیں۔ وہ ان کو کم کم دیتے چلے جاتے ہیں، ان کی جیب میں تھوڑا تھوڑا ٹکڑا ڈالتے چلے جاتے ہیں اور وہ آہستہ آہستہ مطمئن ہوتے چلے جاتے ہیں کہ

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
(غالب)

پھر ان ذلیل قوموں کی حالت یہ ہو جاتی ہے: گداگری کے ٹکڑے ملتے ہیں اور مطمئن ہیں کہ ہمیں آرام بہت ہے۔

گداگری کے ٹکڑوں پر پلنے والی قوموں کی نفسیاتی حالت اور خدا کا تصور کہ ''یہ سب خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے۔''

''ارے بھئی! آپ تو بڑے ذلیل ہیں وہ قومیں خوشحال ہیں۔ کہنے لگے چار دن کا کھیل ہے، قیامت آنے دیجیے پھر دیکھیے ان کو ایسے جوتے پڑیں گے کہ یاد رکھیں گے!'' یہ ہے فریب۔ کہا ہے کہ **عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ** [1] (41:16)۔ کیا بات ہے قرآن حمید کی! عزیزانِ من! جس کو تم ایڈ (امداد) سمجھ رہے ہو، جس کو تم نفرت سمجھ رہے ہو، وہ تو گداگری کے کشکول میں باسی ٹکڑے ڈالے جارہے ہیں تاکہ تم اسی کے اوپر مطمئن رہو۔ پھر آگے ایک اور مثال دی کہ **وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى** (41:17) دوسری قوم ہے قومِ ثمود۔ قرآن حمید میں مختلف مقامات میں کیونکہ چیزیں آہی جاتی ہیں، میں ہر جگہ ان کی تشریح نہیں بیان کرتا کہ کیا ہوا تھا اور کیوں ہوا تھا۔ یہاں قرآن حمید اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے۔ ہم نے قومِ ثمود کو بھی راستہ دکھایا۔ انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے اپنے بینا ہونے پر یعنی دکھائی دینے والی آنکھ پر اندھا ہونے کو ترجیح دیا۔ کیا بات ہے! دونوں ہی چیزیں سامنے تھیں۔ سورج تو نکل آیا، اب اس کے بعد اگر کوئی شخص آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائے تو سورج اس کو کیا فائدہ دے گا۔ کہا کہ **فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى** (41:17) انہوں نے خود اس کو ترجیح دی کہ آنکھیں بند رکھیں۔ بینائی پر اندھے پن کو ترجیح دیا۔ پھر جو دنیا کے اندر ذلیل قومیں عذاب میں گرفتار ہوتی ہیں، ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ آنکھ کھول کر حقائق کا مقابلہ و سامنا نہیں کرتیں، بلکہ جی چراتی ہیں، اپنے آپ کو فریب دے لیتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ **فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ** (41:17)۔ یہاں پھر وہ بات آگئی، اس کو چھوڑ دیجیے۔ ہوا یہ کہ ایک ہولناک چیخ تھی: صاعقہ [2]۔ میں اس کی تشریح یہاں نہیں

---

[1] انہیں اس دنیا کی زندگی ہی میں عذاب مل گیا اور آخرت کی زندگی کا عذاب اس سے بھی زیادہ رسوا کن ہوگا۔ انہیں اس عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1112)۔

[2] صرف سخت آواز کو اور عقل و خرد کے جاتے رہنے کو بھی اور مہلک عذاب اور موت کو بھی صَاعِقَةٌ کہتے ہیں (تاج العروس اور محیط المحیط) نیز لین نے بحوالہ تاج العروس لکھا ہے کہ اس کے معنی ''عقل و شعور سے محروم ہو جانے کے ہیں۔'' (ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن (جلد سوم)، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1961، ص ص۔ 1024 تا 1025)۔

کرتا' جہاں یہ بات آئے گی وہاں عرض کرونگا۔ یہاں تو میں وہی بات کرونگا جو قرآن کریم نے بتائی ہے کہ وہ کیا تھا؟ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ (41:17)۔ وہاں (41:16) میں خزی کہا ہے' یہاں (41:17) میں ھون کہا ہے۔ وہ وہی بات ہے۔ اس ذلت میں کمزوری بھی ساتھ ہوتی ہے۔ ذلیل ہوتی ہیں اور کمزور ہو جاتی ہیں۔ یہاں پھر وہی الْعَذَابِ الْهُوْنِ ہے۔ ذلت اور کمزوری آ گئی۔ لو یہ عذاب ہے خدا کا۔ جو قوم بھی یہ محسوس کرنے لگ جائے کہ ذلیل بھی ہے اور کمزور بھی' تو سمجھ لیجیے کہ وہ قوم خدا کے عذاب میں مبتلا ہے۔ خدا کا یہ عذاب کیا یونہی اوپر سے ایسے ہی آ جاتا ہے؟ ہمارے ہاں تو یہی ہے کہ جس کو جی چاہے اس نے ذلیل کر دیا اور جس کو جی چاہے معزز کر دیا' یہ سب خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے' جسے چاہتا ہے وہ بادشاہ بنا دیتا ہے' جسے چاہتا ہے فقیر بنا دیتا ہے' جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عزت دیدیتا ہے۔

ذلت ورسوائی کی شکل میں خدا کا یہ عذاب کیوں وارد ہوا؟ وہ تھا غلط نظام کا نتیجہ اور آج ہے نظامِ جمہوریت کا بھی ایک کھیل

قرآن حمید کی ایک آیت کا غلط مفہوم پیش کیا ہے کہ جسے وہ چاہتا ہے' یہ کچھ کر دیتا ہے یعنی وہ وہاں بیٹھا ہوا یہ کچھ کرتا ہے' اس میں انسانوں کا اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (41:17) جو کچھ یہ کرتے تھے یہ اس کا نتیجہ تھا۔ خدا یونہی بیٹھا ہوا یہ نہیں کرتا کہ کسی کو ذلیل کر دیا اور کسی کو معزز بنا دیا بلکہ یہ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ہے۔ یہ کیا تھا جو کچھ انہوں نے کیا تھا جس کے نتیجے میں ان کے ساتھ یہ کچھ ہو گیا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کا انداز تصریفِ آیات ہے' ایک جگہ وہ ایک بات بیان کرتا ہے اور دوسرے مقام پہ اس کی تشریح کرتا ہے۔ آؤ ذرا دیکھیں کہ الْعَذَابِ الْهُوْنِ (41:17) اور بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (41:17) جو اس نے کہا ہے کیا ہے؟ یہ ان کی اپنی غلط کوشیوں کا نتیجہ تھا' غلط نظام کا نتیجہ تھا۔ قرآن مجید الْعَذَابِ الْهُوْنِ کی کیا تشریح بیان کرتا ہے؟ سورۃ الفجر میں کہا ہے کہ انسان کی کیفیت یہ ہے کہ اگر اسے ذرا سی خوشحالی آتی ہے تو اترا تا پھرتا ہے اور اس کے برعکس: وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ (89:16) جب مفلسی آتی ہے' رزق کی تنگی ہوتی ہے تو اس وقت پھر روتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے خدا نے مجھے یونہی ذلیل کر دیا۔ یہ وہی ہے جو ہم کہتے ہیں کہ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ (89:16) خدا نے مجھے یونہی ذلیل کر دیا۔

خدا یونہی کسی کو ذلیل نہیں کیا کرتا۔ كَلَّا (89:17) نہیں' ایسا نہیں۔ یہ بڑے زور کی بات ہوتی ہے' فوراً كَلَّا کہا ہے کہ تم غلط کہتے ہو' بکتے ہو' یہ بات ایسی نہیں ہے۔ سن لو کہ تم کیوں ذلیل ہوئے ہو' خدا کسی کو یونہی نہیں ذلیل کرتا۔ تمہارا نظام کیا تھا؟ نظام یہ تھا کہ بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (89:17) تمہارا نظام یہ تھا کہ جس کا جتھہ' جس کی پارٹی' جس کا گروہ' زیادہ ہوتا تھا' وہ تمہارے نزدیک قابل عزت ہوتا تھا اور جو معاشرے میں تنہا رہ جاتا تھا' تم اس کی عزت نہیں کرتے تھے' اس لیے تم بے عزت ہوئے ہو۔ کیا بات ہے صاحب! آج نظام ہی دنیا میں

یہ ہے۔ جسے آپ سب سے بڑی رحمت گنتے پھر رہے ہیں یعنی یہ جو جمہوریت ہے وہ جمہوریت تو نام ہی اکثریت کا ہے۔ یہ درحقیقت جتھہ یا پارٹی ہوتی ہے یہی حکومت قائم کرتی ہے اسی کے پاس اقتدار ہوتا ہے وہی Effective Party (مؤثر اثر انداز پارٹی) ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! پہلے زمانے میں بھی قبائل کی زندگی میں یہی تھا کہ جس کے قبیلے کے افراد زیادہ ہوتے تھے وہ دوسرے پہ چھا جاتا تھا۔ اب بھی کچھ ایسے ہی چلا آ رہا ہے۔ اب ہمارے ہاں یہ دورِ تہذیب آ گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! وہ بات تو غلط ہے۔ پھر صحیح کیا ہے؟ کہا کہ Majority (اکثریت) جو انگریزی کا لفظ آ گیا ہے تو یہ صحیح ہو گیا ہے۔ یہ Majority (اکثریت) کیا ہوتی ہے؟ کہا کہ یہ اکیاون فیصد اکثریت ہے۔ معیارِ حق ملاحظہ فرماؤ۔ اگر کہیں بات بنے تو وہ Minorty (اقلیت) دوسرے ہی دن ذرا سے اکثریت (Majority) کے ادھر اُدھر سے کچھ ''لگا'' کر اس کو کھینچ لیتے ہیں۔ یہ انچاس رہ گئے اب یہ ذلیل ہو گئے۔ کہا کہ تمہارا نظام یہ تھا۔ اب قبائلی جتھے کی جگہ اکثریت (Majority) نے لے لی ہے اور اکثریت اس طرح کچھ لگا کر اقلیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ ہے ایک کھیل جو آج جمہوریت میں کھیلا جا رہا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک یتیم کا مفہوم اور اس کی عزت وتوقیر کا مقام

یتیم کے معنی صرف وہی نہیں ہوتے کہ جس کا ماں باپ مر گیا ہو بلکہ عربی زبان میں ''تنہا رہ جانے والے'' کو یتیم کہتے ہیں۔ یتیم کے متعلق یہاں یہ نہیں کہا کہ تم اس یتیم کی پرورش نہیں کرتے تھے۔ ہمارے ہاں تو اتنا ہی ہے کہ تم یتیموں کی پرورش کرو ان کے لیے یتیم خانے کھول دو۔ قرآن حکیم پرورش نہیں کہہ رہا وہ کہہ رہا ہے کہ وہ یتیم کی عزت نہیں کرتے تھے۔ یہ بڑی گہری چیز ہے کہ تمہارے ہاں عزت کا جو معیار تھا وہ جتھہ تھا اکثریت تھی افراد تھے۔ جو معاشرے میں تنہا رہ جاتا تھا تم اس کی عزت نہیں کرتے تھے اس لیے تم ذلیل ہو گئے۔ آپ نے یہ دیکھا کہ ذلت کے مقابلے میں قرآن حکیم نے کس طرح سے عزت کہا۔ جو تنہا رہ جاتا تھا اس کی عزت نہیں کرتے تھے۔ ہمارا قانون یہ تھا (اور ہے) کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ اٰدَمَ (17:70) ہم نے ہر انسان کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ اگر تم کسی انسان کی بھی تکریم باقی نہیں رکھتے اس کو ذلیل رکھتے ہو تو تم خود ذلیل ہو جاؤ گے۔ یہ ہے ہمارا نظام۔ یہاں یہی کہا ہے کہ بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ [1] (89:17)۔ پہلی چیز تو یہ تھی [2]۔

---

[1] تم نے ایسا معاشرہ قائم کر رکھا تھا جس میں ان لوگوں کی عزت وتوقیر نہیں ہوتی تھی جو تنہا رہ جائیں۔ وہی قابلِ عزت سمجھا جاتا تھا جس کی پارٹی مضبوط ہو جس کا جتھہ طاقتور ہو (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔1447)۔

[2] جن میں تکریم انسانیت نہیں وہ خود ذلیل ہو گئے۔ اس کے لیے دیکھیے: Belden Jack: China Shakes the World Victor, Gollancz Ltd.1952,(Foreword, pp.4&5).

مسکین کا قرآنی مفہوم' نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اور قرآنِ کریم کی مخالفت کہ یہ غلط معاشی نظام ہے

پھر کیا کیا؟ کہا کہ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (89:18)۔ مسکین' مسکن' یہ "س ک ن" سے ہے اور یہ ہے وہ جس کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے' جس کی کسی طرح سے بھی حرکت بند ہو جائے' وہ خود کمانے کے قابل نہ رہے۔ کہا کہ تم اس شخص کی روٹی کا نہ خود انتظام کرتے تھے' نہ دوسروں کو اس کے اوپر مائل کرتے تھے۔ یہ دوسرا جرم ہے۔ دیکھتے ہیں نظام یہ ہے۔ پھر کیا ہوتا تھا؟ کہا کہ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ❶ (89:19)۔ وہ جو بڑا سردار ہے' بڑا دولتمند ہے' بڑا سرمایہ دار ہے' اس نے تو پتہ نہیں جائز و ناجائز طریقوں سے دولت جمع کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محض اس کا بیٹا ہونے کی وجہ سے ہی' دولت مند ہو گیا تو اس نے کیا کاریگری کی تھی؟ وہ سب کچھ یہ کہہ کر کھا جاتا ہے کہ یہ تو مجھے وراثت میں ملا ہے۔ میرا ہی حق ہے کسی اور کا نہیں ہے۔ کہنے لگے کہ اس طرح سے یہ جو سرمایہ داری ہے یہ نظام آیا' باپ کے بعد بیٹا' بیٹے کے بعد اگلا بیٹا' اس طرح سے یہ دولت وراثت میں چلتی ہے۔ وہ دولت معاشرے کے اندر Circulate (گردش) نہیں کرتی۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ معاشی نظام یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اوپر کے طبقے کے اندر ہی گردش کرتی رہے۔ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ❷ (59:7) یہ بڑا غلط نظام ہے کہ معاشرے کی دولت اوپر کے طبقے میں ہی گردش کرتی رہے۔ یہ غلط نظام کے ذریعے سے ہو جاتا ہے۔ یہ جو انیس یا اکیس ❸ خاندان گناتے ہیں یہ اسی غلط معاشی نظام کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کیا کبھی آپ نے سوچا کہ اس کے بعد وہ خاندان کیوں ہو جاتے ہیں' فرد کیوں نہیں ہوتے؟

نظامِ سرمایہ داری میں فرد سے خاندان تو بنتا ہے' فرد باقی نہیں رہتا کیونکہ یہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ نہیں ہے

عزیزانِ من! وہ جو مرنے والا باپ ہے اس کے بعد اس کے بیٹے از خود اس کی اتنی دولت کے مالک ہو جاتے ہیں۔ کہا کہ یہ تمہارا غلط نظام تھا۔ سارے سمجھ لیتے تھے کہ یہ جو کچھ ہمیں ملا تھا یہ تو ماں باپ کے ورثے میں سے ملا ہے اس لیے اس کے اوپر ہمارا حق ہے کسی اور کا حق نہیں ہے۔ اور جب وہ تمہارے پاس اتنا جمع ہو جاتا تھا تو آگے بڑی بات سنائی۔ کہا کہ تمہارا یہ نظام' سرمایہ داری کا تھا کہ روپیہ روپے کو کھینچتا ہے' دولت دولت کو کھینچتی ہے' بڑا سرمایہ دار چھوٹے سرمائے کو کھا جاتا ہے۔ یہی کیپٹل ازم ہے۔ کہا کہ اس کے بعد وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (89:20) یہ جو نشیب ہوتا ہے' جب کہیں بارش ہوتی ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ جو اونچائی ہوتی ہے' وہاں کا سارا پانی

---

❶ تم کرتے یہ تھے کہ جو تمہارے باپ دادا سے تمہارے قبضے میں آجاتا' اسے بھی سمیٹ کر کھا جاتے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1447)۔

❷ اسے (مال کو) اس طرح نہیں بانٹنا چاہیے کہ یہ دولتمندوں کے طبقہ میں ہی گردش کرتا رہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1296)۔

❸ یہ اشارہ ان خاندانوں کی طرف ہے جو اس زمانے میں پاکستان کے امیر ترین خاندان گنے جاتے تھے۔

نشیب میں آ کر جمع ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نظامِ سرمایہ داری یہ ہوتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے سرمائے جو لوگوں کے پاس ہوتے ہیں' وہ وہاں سے چل کر بڑے سرمائے کے اندر خود جمع ہو جاتے ہیں' ہر دریا سمندر میں چلا جاتا ہے۔ تم یہ کچھ کرتے تھے۔ کہا کہ اب سمجھے جو تم رو رہے ہو کہ خدا نے مجھے یونہی ذلیل کر دیا؟ تم کیوں ذلیل کیے گئے ہو؟ آپ نے سمجھ لیا' عزیزانِ من! کہ یہ جو ذلت کا عذاب قرآن نے کہا ہے' یہ کیا عذاب ہے؟ یہ قوموں کے اوپر کیوں آتا ہے؟ اس لیے کہ جو مَایَنۡفَعُ النَّاسَ ❶ ہے' یہ وہ نظام نہیں ہوتا۔

نظام سرمایہ داری کے بالمقابل قرآنِ حکیم نے نظام خداوندی کو العقبة کے لفظ سے پیش کیا ہے

عزیزانِ من! میں یہاں تک پہنچا ہوں تو اگلی سورۃ کی بھی چار آیتیں سامنے آ جائیں۔ یہ سورۃ البلد ہے۔ کہا کہ ہم نے جو یہ اس نظام کے مقابلے میں دوسرا نظام بتایا ہے' یہ نظام پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنے کے مترادف ہے یعنی یہ ہموار سڑک نہیں ہے کہ اس کے اوپر بھاگتے ہوئے سرپٹ چلے جاؤ گے۔ یہ جو تمہارا نظام ہے یہ نظام سرمایہ داری ہے۔ اور اس کے مقابلے میں یہ جو نظام ہم بتا رہے ہیں' یہ پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنے کی بات ہے۔ پہاڑ کی گھاٹی کے اوپر بھاگتے ہوئے چڑھا ہی نہیں جاتا' بڑا بتدریج چڑھا جاتا ہے' ایک ایک قدم ہے' ہانپ جاتا ہے' یہ ہمت طلب ہوتا ہے۔ یہ ہے نظام جو دین کا نظام ہے:

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

قرآن حکیم نے اس کو العقبة کہا ہے۔ کہا ہے کہ فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ o وَمَآ اَدۡرٰکَ مَا الۡعَقَبَةُ (90:11.12) آؤ ہم بتاتے ہیں کہ جسے ہم نے یہ عقبہ کہا ہے یہ پہاڑ کی گھاٹی ہے۔ گویا دین پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنے کا نام ہے۔ آؤ تمہیں بتائیں کہ یہ پہاڑ کی گھاٹی کیا ہے؟ پہلی چیز یہ ہے کہ فَکُّ رَقَبَةٍ (90:13)۔ یہ بڑی چیز ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہے کہ پرانے زمانے میں غلام بنائے جاتے تھے' تو یہ ان غلاموں کو چھڑانا ہے۔ ہر دور کے اندر جو قوم بھی کسی کے استبداد کے اندر' کسی کے ظلم کے اندر' دبی ہوئی ہو اس کو اس ظلم سے جو چھڑا دینا ہے' یہ فَکُّ رَقَبَةٍ (90:13) ہے۔

نظامِ خداوندی کا پہلا فریضہ' موت ہے ہر نوع غلامی کے لیے اور دوسرا: کوئی فرد بھوکا نہ رہے اور نہ ہی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے ورنہ عذاب الھون ہے

عزیزانِ من! وہ جو پرانے زمانے کا غلامی (Slavery) کا انداز تھا' صرف اس کی شکل بدلی ہے' اس کی جو کیفیت اور حقیقت ہے

---

❶ یہ پوری آیت یوں ہے: واما ماینفع الناس فیمکث فی الارض (13:17) جو کچھ نوعِ انسان کے لیے نفع بخش ہوتا ہے' وہ باقی رہ جاتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 556)۔

وہ باقی ہے۔ کسی انسان کا کسی دوسرے انسان کی طاقت کے نیچے رہنا' اس کی حکمرانی کے تابع رہنا' غلامی ہے۔ اندازہ لگایئے' عزیزانِ من! کہ دین کے جو فرائض ہیں' ان میں قرآن حکیم پہلا فریضہ یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں فرد یا جو قوم کسی دوسرے کے استبداد اور ظلم کے جوئے کے نیچے پھنسی ہوئی ہے' اس کی گردن آزاد کرانا ہے۔ کیا اپنے ہاں مسلمانوں کے' مومنین کے ہاں یہ نظام ہوگا؟ قرآنِ کریم نے تو حضور ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا تھا کہ یہ اُن زنجیروں کو توڑ دے گا جس میں انسانیت جکڑے چلی آ رہی ہے' یہ ان سِلوں کو ہٹا دے گا جن کے نیچے وہ دبی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ یوں انسانوں کو آزادی دیدیگا۔ یہ تو پوری نوعِ انسانی کی آزادی ہے۔ یہ ہے دین کا پہلا قدم۔ یعنی **فَكُّ رَقَبَةٍ** (90:13)۔

آگے پھر دین کا دوسرا فریضہ ہے کہ **اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ** (90:14) افلاس اور بھوک کے زمانے میں روٹی کا انتظام کرنا۔ یہ ہے دین کا دوسرا فریضہ۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ جو اسلامی نظام ہے' قرآن حکیم نے اس کے کیا عناصر بتائے ہیں' کیا اجزا بتائے ہیں؟ اور پھر یہ بتدریج آہستہ آہستہ، قدم بقدم پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنا ہے۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ رہے۔ یہ پہلی بات ہے۔ کوئی فرد بھوکا نہ رہے۔ یہ اس کے نظام کا دوسرا ٹکڑا ہے۔ اسی لیے حضور نبی اکرم ﷺ نے جو فرمایا تھا' وہ اسی کی تشریح تھی کہ جس بستی میں ایسی صورت ہو کہ کوئی فرد رات کو بھوکا سو گیا ہو' تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ ایک فرد بھی اگر رات کو بھوکا سو جائے تو یہ ہوگا۔ یہ ہے دین کا دوسرا ٹکڑا۔ یعنی **يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ** (90:15) ان لوگوں کے رزق کی فکر کرے جو معاشرہ میں' ہزار ہا انسانوں کے قریب رہتے ہوئے بھی' اپنے آپ کو تنہا یا بے یار و مددگار پائیں۔

عزیزانِ من! قرآن کے کیا الفاظ ہیں! میں کہتا ہوں کہ صرف اسلوب بیان کے اعتبار سے بھی قرآن کا اعجاز ہے۔ آپ دیکھیے عربی زبان میں اس قسم کے اعجاز کی مثال ہی نہیں ملتی حالانکہ عربی زبان میں یہ نازل ہوا تھا۔ کہا ہے کہ **يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ** (90:15) وہ جو اتنے بڑے معاشرے کے اندر پھرتا ہوا بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے' بھری بستی کے اندر رہتے ہوئے اس دنیا کے اندر اپنے کو تنہا محسوس کرے' اس کی تنہائی کو رفع کرنا ہے۔ آج ہم میں ہر شخص یتیم ہے۔ اتنے بڑے معاشرے کے اندر جس پہ مصیبت آتی ہے تنہا اس کی مصیبت ہوتی ہے۔ نگاہ دوڑا کر دیکھیے اس وقت اس کا ساتھ دینے والا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا ہے۔ **يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ** (90:15) وہ صحرا اور جنگل کے اندر تنہا نہیں ہے بلکہ بھرے ہوئے معاشرے کے اندر اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ **اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ** (90:16)۔ اس کی حرکت رکی ہوئی ہے' آگے کاروبار نہیں چل سکتا' کھانے کو کچھ ملتا نہیں ہے۔ اس لیے نہیں ہے کہ وہ محنت نہیں کر رہا' وہ **ذَا مَتْرَبَةٍ** ہے' دن بھر مٹی میں لتھڑا ہوا ہوتا ہے' پھر بھی اتنا نہیں ملتا کہ اس کے بال بچوں کا پیٹ بھر جائے: **ذَا مَتْرَبَةٍ** ۔ یہ نہیں ہے کہ وہ کچھ کام کرنے والا نہیں ہے' مٹی میں لتھڑا رہتا ہے سارا دن غریب۔ کہا یہ تھا جس کی وجہ سے یہ **الْعَذَابُ الْهُوْنِ** آیا' جس کی وجہ سے یہ قوم ذلیل

ہوئی‘اس قوم کا نظام یہ تھا۔اب آپ کی سمجھ میں بات آ گئی کہ جب خدا ان اقوام کی تباہی کا ذکر کرتا ہے تو وہ کیا اور کیوں ہوتا ہے۔

توبہ ہمیشہ نظام کے بدلنے سے قبول ہوتی ہے‘ گناہوں سے یہ توبہ صرف اس لیے ہے کہ نگاہ کہیں ہمارے انتظام کے نظام کی خرابی کی طرف نہ اٹھ جائے

قرآن حکیم کے ان اقوام کی تباہی کا ذکر کرنے کا مقصد کیا ہوتا ہے؟''ہم نے تو اتنا ہی کہا تھا کہ وہ قومِ ثمود تھی‘ ایک سیٹی بجی اور وہ تباہ ہوگئی‘ ایک دوسری تھی‘ جھکڑ آیا اور وہ ختم ہوگئی۔'' اب سیٹیاں بجتی ہیں‘ روز جھکڑ آتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ گناہوں کے بدلے میں سارا کچھ ہوتا ہے صاحب! توبہ کرنی چاہیے۔ وہ کل ہی ہمارے ہاں نارنگ منڈی میں اولے پڑے اور دیکھتے دیکھتے چند لمحوں میں وہ تباہ ہوگئی تو آواز اٹھ گئی کہ ''یہ خدا کا عذاب ہے جو گناہوں کے بدلے میں آتا ہے'' یعنی لاہور والے جیہڑے نیں تے ایتھے تے سارے مومن بسدے [1] نیں۔ یہاں کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ وہ جو اوپر سے فرشتہ عذاب لے کر آیا تو اس نے دیکھا کہ اوہو! یہ سب کچھ نارنگ منڈی میں ہوتا ہے''لاہور وچ کچھ نئیں ہوندا [2]۔'' کیا باتیں کرتے ہیں!! یہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ کہیں نگاہ ادھر نہ چلی جائے کہ ہمارے انتظام کے نظام کی کچھ خرابی ہے۔ جب آپ اس کی وجہ بیان کر دیں کہ وہ فسق وفجور اور یہ سارا کچھ ان کے گناہ تھے اس کی وجہ سے یہ ہوا‘ تو قصہ ختم ہوا‘ انہوں نے یہ کچھ کیا‘ انہوں نے یہ کچھ بھگتا‘ ہم لاہور میں رہنے والے ہیں‘ ہمارا تو اس میں دخل ہی کچھ نہیں ہے۔ ان پہ یہ ایک مصیبت آئی اور دوسرا وہ قابلِ نفرت ہوگئے کہ وہ بڑے گناہگار تھے‘ فاسق وفاجر تھے۔ ہم بڑے پاکباز ہیں‘ مقرب ہیں‘ ہم پہ عذاب نہیں آیا‘ ان پہ عذاب آیا۔

قرآنِ حکیم نظام کی بات کرتا ہے اور تاریخ سے طوفانِ نوح کے عذاب کی مثال سے سمجھاتا ہے

جب ہم ان قوموں کے قصے قرآن حکیم سے پڑھتے ہیں کہ وہ اتنی بڑی فاسق وفاجر قوم تھی اس لیے وہ زلزلہ آیا‘ تباہی ہوگئی‘ اولے پڑے‘ تباہ ہوگئی‘ یہ سب کچھ ہوا تو نظام کی کمزوری‘ نظام کی غلطی کی طرف نہیں جاتے۔ قرآن حکیم یہ کہتا ہے کہ ذلت کا عذاب ہے اور وہ ذلت اس بنا پر آتی ہے کہ وہ نظام غلط ہوتا ہے۔ انہیں تو قرآنِ کریم نے کہا کہ وہ اس عذاب میں مبتلا ہوئے۔ **وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ** (41:18) اب یہاں یہی اتنا سا ترجمہ کیا کہ ''لوگ جنہوں نے رسول کی بات مان لی‘ جو ایمان لائے اور جو متقی پرہیزگار ہوئے‘ وہ بچ گئے۔'' اب سوال یہ ہے کہ یہ جو ایمان لائے اور متقی پرہیزگار ہوئے وہ بچ کیسے گئے تھے؟ پہلا ہی عذاب جو قرآن حکیم نے بتایا ہے‘ وہ قومِ نوح کا ہے۔ سیلاب آنے والا تھا‘ اس سے حضرتِ نوحؑ اور وہ جوان کے ساتھی ایمان والے تھے‘ وہ بچے تھے۔ کس طرح

---

[1] یعنی جو یہاں لاہور والے ہیں‘ یہ تو سارے مومن ہیں (سوائے نارنگ منڈی والوں کے)۔

[2] لاہور میں کچھ نہیں ہوتا۔

بچے تھے؟ حضرتِ نوحؑ سے کہا گیا تھا کہ کشتی بناؤ' سیلاب آنے والا ہے۔ یہ یونہی نہ تھا کہ فرشتے آئے تھے اور اپنے مونڈھوں کے اوپر اٹھا کر ان کو لے گئے تھے۔ کہا تھا کہ کشتی بناؤ۔ وہ کشتی بناتے تھے تو وہ قوم مذاق کرتی تھی۔ یہ جو حضرتِ نوحؑ اور ان کے ساتھی تھے' وہ اس کشتی میں سوار ہوئے تھے تو بچے تھے۔ حفاظت کا سامان نہ مہیا کرنا تباہی کا موجب ہے۔ قرآن حکیم نے تو پہلے نبی کے قصے میں ہمیں یہ بات بتا دی۔ اگر یہ بھی کشتی نہ بناتے تو یہ بھی اس میں بہہ جاتے۔

اگلی بات یہاں سے یہ آتی ہے کہ اگر وہ قوم نوحؑ اس چیز کو Seriously (سنجیدگی سے) لے لیتی اور مذاق نہ کرتی یعنی امنو اکرتی' رسول کی بات مان لیتی تو کشتی بنا لیتی۔ کیا پھر اللہ تعالیٰ کا قانون یہ کرتا کہ یہ نوحؑ والی جو کشتی ہے' یہ بچ جاتی اور وہ مقابلے والی کشتی ڈوب جاتی؟ جس کی کشتی ٹھیک بنی ہوئی ہوتی وہ تیرتی۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں اٰمنو ا اور تقویٰ کے معنی کیا ہیں۔ تقویٰ کے معنی ہیں ''حفاظت کا سامان کرنا'' اور اٰمنــوا کے معنی ہیں ''اس کی بات مان لینا۔'' اب اگر آپ غلط نظام میں ہونگے تو پھر یہ بات ماننا ہوگی کہ غلط نظام میں تباہیاں آتی ہیں۔ یہ جتنی بھی آپ کے ہاں Physical (طبعی) چیزیں ہیں وہ اگر صحیح نہ ہوں یا اگر وہ ہوں اور ان کی تقسیم' ان کا استعمال صحیح نہ ہو تو تباہی آتی ہے۔ یہاں جو سیلاب آیا تھا' اس میں یہ بات نہیں تھی کہ یہ حضرتِ نوحؑ اور ان کے جو ایماندار ساتھی تھے وہ بچ گئے۔ قرآن حکیم نے یہ نہیں کہا کہ وہ لوگ نماز روزے کے بڑے پابند تھے۔ میں نے کہا کہ میں اس کی تخفیف نہیں کرتا کہ یہ کوئی اہم چیز نہیں' وہ تو نظام میں' میں بتاؤنگا کہ وہ کتنی اہم چیز ہے لیکن وہاں کہا یہ گیا تھا کہ جو اس کشتی میں سوار ہوگا وہ بچے گا۔ اور کشتی ایسی بنائی تھی جو اس سیلاب کے اندر تیر کر چلی جائے۔ یہ اٰمنوا یہ بات تھی۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ وہ پاس سے گزرتے تھے تو مذاق کرتے تھے۔ اگر وہ بھی رسول کی بات مان لیتے' اسی کے مطابق عمل کرتے تو حفاظت کا سامان بہم پہنچا دیتے۔

نظام الحق کے ساتھ مادی ذرائع اور ان کا استعمال کرنا: یہ ہے کامیابی کا راز' نیز زندگی کے لیے حشر اور جحیم کا قرآنی مفہوم

کامیابی کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ نظام میں جو مادی ذرائع اور اسباب ہیں' ان کا ہونا نہایت ضروری ہے اور پھر دوسری بات یہ کہ ان کا جو استعمال ہے وہ الحق کے مطابق ہونا چاہیے' پھر قوم بچ جاتی ہے۔ قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ **وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ** [1] (41:19)۔ یہ حشر کی بات تو قیامت کی ہی ہے۔ اس دنیا کے اندر بھی' جہاں

---

[1] (جو حشر ان اقوام سابقہ کا ہوا' وہی تمہارے ان مخالفین کا ہوگا) جس دن ان دشمنانِ نظام خداوندی کو تباہی کے عذاب کے لیے اکٹھا کیا جائے گا اور انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا جائے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1113)۔

قرآن حکیم نے کہا ہے کہ ٹکراؤ ہوتا ہے' میدانِ جنگ ہوتا ہے' اس قسم کا اجتماع ہوتا ہے' تو اسے قرآن حکیم نے حشر کہا ہے۔ یہودیوں کے متعلق' جو مدینے سے ان کو نکالا ہے اور وہاں ان کے ساتھ تصادم ہوا ہے' قرآن حکیم نے اس کو بھی حشر کہا ہے۔ اس وقت اس قوم کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ کہا کہ فَهُمْ يُوزَعُونَ (41:19) آگے بڑھنے سے اسے روک دیا جاتا ہے۔ جو قوم بھی کہیں کھڑی ہو جاتی ہے اور رک جاتی ہے' عربی زبان میں اور قرآنِ کریم میں اس کی اس حالت کے لیے جحیم کا لفظ آیا ہے۔ جہنم کے لیے جحیم کا لفظ بھی آیا ہے' اس کے معنی ہیں رُک جانا۔ زندگی تو مسلسل حرکت کا نام ہے:

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

ایں مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود

[اقبالؒ]

انسانی زندگی کے لیے جوئے رواں کا وجود زندگی کی بنیادی شرط ہے

یہ زندگی تو چلتی رہتی ہے' یہ تو ندی ہے۔ کھڑی ہو جاتی ہے تو جوہڑ بن جاتی ہے اور بند پانی میں فساد کی بو آتی ہے' اس کے اندر' اسی پانی میں کھڑا رہنے سے سڑاند پیدا ہو جاتی ہے' وہ زہر ہو جاتا ہے۔ زندگی کا یہ بنیادی اصول ہے' عزیزانِ من! تجربہ کرنا ہے تو ذرا سانس روک لیجیے پھر دیکھ لیجیے۔ یہ جو سانس کا سلسلہ آمد و رفت ہے' اس میں ذرا جمود پیدا کر لیجیے' اس کو روک لیجیے تو پتہ چل جائے گا کہ موت کیا ہوتی ہے۔ زندگی کے راستے کے اندر یہ رکاوٹ موت ہے' عزیزانِ من! قوموں کی زندگی میں بھی جہاں کوئی قوم رک کر کھڑی ہو جاتی ہے' وہ اس کے لیے موت ہوتی ہے۔

جسم انسانی ذاتِ انسانی اور مکافاتِ عمل کا باہمی ربط

عزیزانِ من! کہا کہ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ❶ (41:20)۔ یہاں اس آیت (41:20) میں ایک بڑا اہم نکتہ سامنے آ گیا۔ کہا کہ اس وقت مکافاتِ عمل ہوتا ہے کہ جب نتائج سامنے آتے ہیں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہاں کوئی ایسی چیز خلافِ قانون کی ہوئی تو کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ یہاں قانون کے معنی سوسائٹی کا قانون ہی نہیں ہے بلکہ خدا کے قانون کے ہیں۔ خدا کے قانون کو تو کوئی آج یہاں پوچھتا ہی نہیں ہے۔ اور اس کے بعد یہ دیکھا کہ نہ کسی نے پکڑا ہے' نہ ہم گرفتار ہوئے ہیں' نہ پولیس نے دیکھا ہے' تو بس پھر موج ہے' سینکڑوں ہزاروں بار روزانہ ایسا کچھ ہوتا ہے۔ اب جس کے متعلق اطمینان ہو جائے کہ کسی نے نہیں دیکھا تو پھر کچھ بات ہی نہیں ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ خدا کا قانونِ مکافات

---

❶ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو جو کچھ وہ کیا کرتے تھے' اس کی شہادت کے لیے کہیں باہر سے گواہ بلانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ان کے کان' ان کی آنکھیں غرضیکہ ان کا پورا جسم' ان کے اعمال کی گواہی دے گا۔ ان کی ذات خود ان کے اعمال کا ریکارڈ ہوگی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1113)۔

ایسا نہیں ہے کہ تم مطمئن ہو جاؤ کہ کسی نے دیکھا نہیں ہے۔ یہ سمجھانے کی بات ہے کہ تمہارے خلاف یا ان کے خلاف' ان کے کان' ان کی آنکھیں' ان کی پوری شخصیت جلود ہے۔ یہ تمام ان کے خلاف شہادت دیں گے۔

عزیزانِ من! یہ ذرا غور طلب چیز ہے' سطحی طور پہ شاید بات سمجھ میں نہ آئے۔ کہا ہے کہ **شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ** (41:20) ان کے اعضا ان کے خلاف شہادت دیں گے' ان کی آنکھیں ان کے خلاف شہادت دیں گی' ان کے پورے جسم کے اعضا ان کے خلاف شہادت دیں گے۔ یہ کان تو یہی ہیں' ہم میرا کان' میری آنکھ' میرا جسم' میرے اعضا' میرے ہاتھ پاؤں' کہتے ہیں۔ یہ میرے خلاف شہادت دیں گے۔ یہ ''میں''❶ کون ہے جس کے خلاف یہ شہادت دیں گے؟ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ انسان' اس کے ہاتھ پاؤں' جسم آنکھیں کان ہیں۔ اس کو ہم انسان کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ان کے ہاتھ پاؤں آنکھ کان ان کے خلاف شہادت دیں گے۔ یہ تو ان سے الگ کوئی اور چیز ہے جو اس کے خلاف شہادت دے رہے ہیں۔ شاید یہ مقام مشکل ہے اسے سمجھیے۔

زندگی کا ایک تصور ہے جسے محض Physical Concept of Life (طبعی تصورِ زندگی) کہا جاتا ہے۔ اسے Materialistic (مادی) تصورِ حیات کہہ لیجیے۔ ان کے نزدیک انسان اسی جسم کا ہی نام ہے' زندگی یہی ہے' ہاتھ پاؤں اعضاء جسم پورا' یہی انسان ہے' جب یہ نہیں رہتا' یہ Disintegrate (منتشر) ہو جاتا ہے' موت آ جاتی ہے' ختم ہو جاتا ہے' انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ یاد رکھیے! یہ جسے ہم دین کہتے ہیں اور جسے لادینی یا کفر کہتے ہیں' اس میں جو ما بہ الامتیاز چیز ہے' یہ ابتداً خدا پہ ایمان کی بات نہیں ہے' یہ ابتداء اس تصورِ حیات کی ہے کہ انسان کی زندگی صرف اس کے جسم سے ہی منسوب نہیں ہے' اسی کا نام نہیں ہے کہ یہ انسان ہے' یہ اس کی زندگی ہے۔ جب اس کی زندگی ختم ہوگئی تو انسان ختم ہوگیا۔ دنیا کے اندر اس وقت یہ جتنی تباہی آئی ہوئی ہے تو وہ اس وجہ سے آئی ہوئی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے آگے کوئی بات نہیں ہے۔ اس کا اگر انتظام کر لیا جائے کہ اس زندگی میں کچھ نہیں ہوتا تو پھر راوی عیش لکھتا ہے۔ پھر تباہی کا سوال ہی نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تصورِ حیات غلط ہے۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے ہے جسے انسان کی ذات یا نفس کہا جاتا ہے۔ اصلِ حیات وہ ہے۔ یہ انسان کا جسم' اس کے ہاتھ پاؤں کان' ناک' تو اس ''شے'' کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کے ذرائع ہیں' اسباب ہیں۔ وہ❷ کہتی ہے کہ پانی اٹھا' پانی پی اور میرا ہاتھ پانی لیتا ہے۔ ''وہ'' کہتی ہے کہ اس کے جیب میں سے گھڑی نکال لے' میری دو انگلیاں وہ نکال لیتی ہیں۔ یہ تو ذریعہ ہیں اس کے اس حکم کو بروئے کار لانے کا۔ یہ ''وہ'' کیا ہے جو کہتی ہے کہ اس میں سے کچھ نکال لے تو یہ ہاتھ پاؤں انسان کے جتنے بھی اعضا ہیں' یہ تو اس ''وہ'' کا جو فیصلہ ہے یا اس کا جو حکم ہے' اس کو بروئے کار لانے کے ذرائع ہیں'

---

❶ I-am-ness

❷ یہ اشارہ ذاتِ انسانی' نفسِ انسانی ''میں (I-am-ness)'' کی طرف ہے۔

Instruments (آلات) ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں ہم بھی یہ بولتے ہیں۔ زبان یہی ہے کہ میں نے یہ کہا' میری آنکھ دکھ رہی ہے' میرا کان بہرہ ہوگیا۔ قرآن کریم یہی کہتا ہے کہ یہ تم جو ''میرا'' کہتے ہو تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ ''وہ'' میں کون ہے جس کا ہاتھ جس کے پاؤں یہ ہیں۔ تو بات ساری یہ ہے۔ یہ جو ''میں'' ہے جسے آپ ''میرا'' کہتے ہیں' یہ جو انسان کی ''ذات یا نفس'' ہے' یہ جسم نہیں ہے' نہ انسان کا یہ جسم طبعی قوانین کے تابع ہے' یہ طبعی قوانین کے تابع نہیں ہے' نہ ہی جسم کے Disintegrate (منتشر) ہو جانے سے' فنا ہو جانے سے' مرجانے سے' یہ مرجاتی ہے۔ یہ باقی رہتی ہے' آگے چلتی ہے اور اس کے تمام اعمال کا نتیجہ یہ جو ''میں'' ہے اس کے اوپر مرتب ہوتا ہے۔ یہ مرتی نہیں ہے' اس لیے یہ اس کی گرفت سے آگے جا ہی نہیں سکتا۔

اگر ذاتِ انسانی یعنی ''میں'' کے لیے خدا کے قانون کو نہ مانا جائے تو پھر خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں رہتی

حیات کے یہ دو تصور ہیں۔ دین اور لادینی کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے۔ ''میں'' سے ہوتی ہے' یاد رکھیے۔ اس کے بعد خدا کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ اس ''میں'' کی نشوونما' اس کی پرورش' اس کا ارتقا' خدا کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس ''میں'' کو مانتا ہی نہیں ہے تو اس کو واقعی خدا کے قوانین کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ طبعی جسم کے لیے طبعی قوانین ہیں جو ان قوانین کے مطابق زیادہ سے زیادہ ذرائع اسباب مہیا کر لے' جسمانی راحت آسائش ستائش سب کچھ میسر آ گئے' تو اس کے لیے زندگی کا یہی منتہیٰ' یہی ماحصل ہے۔ یہ ہے ابتدا اس کی۔ بڑے عجیب انداز میں یہ بات اقبالؒ (1877-1938ء) کہہ گیا ہے:

شاخِ نہالِ سدرہٗ خار و خسِ چمن مشو!

تُو اپنی حقیقت سے ذرا باخبر ہو' تُو وہ سدرۃ المنتہٰی ہے۔ ہمارے ہاں یہ ایک اصطلاح ہے' اسے آپ بلند ترین کہہ لیجیے۔ کہا کہ تُو تو اس بلند ترین سرسبز و شاداب درخت کی ایک شاخ ہے' زندۂ جاوید رہنے والا ہے۔ اپنے آپ کو تُو اس باغ کا کوڑا کرکٹ کیوں بنا کر بیٹھ گیا ہے۔ اگلی بات ہے جو وہ کہتا ہے:

منکرِ او اگر شدی منکرِ خویشتن مشو

[اقبالؒ: زبورِ عجم]

اگر کسی وجہ سے تمہاری سمجھ میں خدا نہیں آیا ہے تو بھی اپنا انکار نہ کر' یاد رکھ! اگر تُو نے اپنا انکار کر دیا تو خدا کبھی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس سے منکر مت ہو۔ یہ ہے وہ جو ''میں'' ہے۔ یہ جو کہا ہے کہ ان کی سماعت بصارت ان کے اعضا ان کے خلاف شہادت دیں گے تو ان سے مراد ان کی وہ ''ذات'' ہے۔

''میں'' کے کیے گئے اعمال کی شہادت کو بیان کرنے کا قرآنِ کریم کا ایک محاکاتی ومکالماتی انداز

قرآن کریم نے کہا کہ **بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (41:20)ان کے اعمال کی شہادت یہ چیزیں دیں گی۔ **وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ** (41:21)۔یہاں یہ ایک مکالمہ کا انداز بتایا ہے کہ وہ ''میں'' ان سے کہے گی کہ تم تو میرے ہاتھ پاؤں تھے' تم میرے ہی خلاف تم نے شہادت دیدی۔ کہا کہ تم اس وقت بھی یہ سب کچھ دیکھتے بھالتے تھے کہ تم کیا کرتے ہو' اس وقت ہمارے پاس ابھی قوتِ گویائی نہیں تھی' اب خدا نے ہمیں بولنے کی قوت دی ہے تو وہ بات جو ہم دیکھا کرتے تھے' ہم بیان کر رہے ہیں۔ وہ ان سے کہیں گے کہ جس خدا نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اسی کے قانون مکافات کے مطابق تمہارے اعمال نے یہ نتائج مرتب کیے ہیں۔تمہارا کوئی عمل اس قانون کے احاطہ سے باہر رہ نہیں سکتا۔ کہنے کا یہ انداز بڑا خوبصورت ہے۔

عزیزانِ من! اگلی آیت اس کی وضاحت کرتی ہے۔ کہا کہ تمہاری کیفیت یہ تھی کہ **وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ** (41:22)تم کوئی غلط کام کرنے لگتے تھے تو اِدھر اُدھر دیکھ لیتے تھے کہ کوئی دیکھتا تو نہیں ہے۔ جب دیکھتے تھے کہ کوئی اور نہیں ہے تو مطمئن ہو جاتے تھے۔ تم سوچتے نہیں تھے کہ جب کوئی اور نہیں دیکھ رہا تو تمہارے ہاتھ پاؤں آنکھ کان تو دیکھ رہے ہیں۔ ان سے تم نہیں چھپتے تھے کیونکہ تم سمجھتے تھے کہ یہ تو اپنے ہیں۔ یہی ہوتا ہے۔ تم مطمئن ہو گئے کہ میں نے جو جرم کیا ہے اس کو کسی نے نہیں دیکھا' یہ نہ سوچا کہ خود تمہارے اپنے جو ہاتھ پاؤں ناک کان ہیں' انہوں نے دیکھ لیا ہوا ہے۔ اس وقت مطمئن اس لیے ہو کہ یہ تمہارے خلاف کچھ کہتے نہیں ہیں۔ وہ جو بات کہی ہے کہ اس وقت خدا بھی ان کو قوتِ گویائی عطا کر دے گا اور سب کچھ تمہارے خلاف کہہ دیں گے۔ یہ کیا شہادت ہے صاحب! جس سے کوئی بھاگ ہی نہیں سکتا۔ کون انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے جو جرائم کیے ہیں میری آنکھ کو' میرے ہاتھ کو' ان کا پتہ نہیں تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ذرا چھپ کر کرنا چاہتے ہو تو دوسرے انسانوں سے تو چھپ کر تم نے کر لیا' ذرا ان سے چھپ کر کچھ کر کے دیکھو۔ ان کے بغیر وہ ''میں'' کچھ کر ہی نہیں سکتی' یہی تو اس کے ذرائع ہیں اور یہی تو کچھ کرنے کے اسباب ہیں۔ کہا کہ ان سے تو تم چھپ سکتے اور تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کو کیا پتہ' یہ تو وہاں تھا ہی نہیں' جھوٹ بولتا ہے۔ بتاؤ کہ جب تم نے چوری کی ہے تو کیا یہ ہاتھ

وہاں تھا یا نہیں؟ کیا انداز ہے قرآن حکیم کا بات سمجھانے کا!

عزیزانِ من! بات اس کی یہ ہے کہ قانونِ مکافاتِ خداوندی سے تم باہر نہیں جاسکتے' وہ تمہارے اوپر محیط ہے۔تم یہ سمجھتے تھے کہ کوئی دیکھنے والا نہیں' اس لیے تم سمجھتے تھے کہ خدا کو بھی اس کا علم نہیں ہوسکتا۔ یہ خدا کو تو جیسے یہ سی آئی ڈی والا' اگر حاکم کوئی رپورٹ نہ کرے تو اُس کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یہ جو کچھ بعض اوقات اتنا غلط نظام ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے خبریں دینے والے ذرائع ہوتے ہیں یا وہ خبریں دیتے ہی نہیں ہیں یا صحیح خبریں نہیں دیتے تو اس کے بعد وہ تو ان کا محتاج ہوتا ہے۔کہا کہ تم نے بھی یہ سمجھ رکھا تھا کہ چونکہ ہم نے ایسی جگہ جرم کیا ہے' جہاں کوئی انسان دیکھ ہی نہیں سکتا' اس لیے اللہ میاں کو اس کا کیا پتہ چلے گا۔کہا کہ کوئی بات نہیں ہے' ہم تمہارے ہاتھ سے پوچھ لیں گے کہ کیوں بھئی! تم نے چوری کی تھی یا نہیں؟ یہ قرآن کریم کے سمجھانے کے انداز ہیں جو چودہ سو سال پہلے کا بدو بھی سمجھے اور آج کا بڑے سے بڑا سائنٹسٹ بھی یہ بات سمجھے۔

آج کی سائیکالوجی کے کرشمے: وہ اعمال بھی ظہور میں آگئے جن کے متعلق تم مطمئن تھے کہ انہیں کسی نے دیکھا ہی نہیں

یہ تو آج جو میں نے کہا ہے ان کا جو نیا علم سائیکالوجی [1] ہے' ان سے پوچھیے' وہ اس کی داد دیتے ہیں کہ قرآن حمید کیا کیا باتیں کہہ گیا ہے' جہاں یہ اعمال اپنا اثر رکھتے ہیں' وہ دُھل ہی نہیں سکتا اور یہ تو اب یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ جو باتیں تمہارے شعور میں بھی نہیں ہوتیں' بھلا دیتے ہو' تم سمجھتے ہو کہ کسی کو معلوم نہیں ہے' یہ ماہرین علمِ نفسیات انہیں کرید کر نیچے سے اوپر لے آتے ہیں' ابھی لے آتے ہیں۔اور جب خدا ان کو بولنا سکھا دے گا تو پھر تو پوچھو ہی نہیں کہ کیا باتیں ہونگی۔کہا کہ یہ تمہارا ظن تھا' یہ تمہارا گمان تھا کہ ان کا کسی کو علم نہیں ہوسکتا۔ گویا تمہاری ''دانست'' میں ان اعمال کا علم خدا کو بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ یہاں کہا کہ **وَذٰلِكُمۡ ظَنُّكُمُ الَّذِىۡ ظَنَنۡتُمۡ بِرَبِّكُمۡ اَرۡدٰٮكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ** (41:23) تم نے یہ سب کچھ جو غلط باتیں کی ہیں' اس ظن کے ماتحت کیں' اس خیالِ خام کے ماتحت کیں کہ خدا کو ان کا کیا علم ہوسکتا ہے۔ یہ وہ غلط خیال تھا جو تم نے خدا کے متعلق قائم کیا۔خدا کے علم کے ذرائع تو یہاں تک ہیں جن سے تم انکار ہی نہیں کرسکتے۔اس لیے اگر تمہاری حالت یہ ہے کہ جس میں تم ذلت اور غربت اور افلاس کے عذاب میں مبتلا ہو تو وہ تمہارے اُن اعمال کا

---

[1] یہ نیا اس لیے کہا کہ یہ فلاسفی (Philosophy) کا حصہ تھا۔اس وقت یہ ایک الگ Discipline نہیں تھا۔

ہی نتیجہ ہے جن کے متعلق تم مطمئن تھے کہ کسی نے دیکھا نہیں ہے۔

سریع الحساب کے تحت تو اعمال کے نتائج کے لیے کوئی کتاب بھی مرتب کرنے کی ضرورت نہیں مگر عمل اور نتیجے کے درمیان مہلت کا وقفہ ہوتا ہے

''کسی نے دیکھا'' والی بات تو اور ہی ہے۔ وہ تو اپنے نتائج آپ مرتب کرتے چلے جاتے ہیں' وہ تو سریع الحساب ہیں۔ **فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ** (41:24) سو اگر یہ لوگ اس عذاب کو خاموشی سے برداشت کرلیں تو بھی یہ عذاب ان پر مسلط رہے گا۔ چیخ و چنگھاڑ کی بات ہی نہیں ہے' اب تو تباہی آ گئی صاحب! اب تو اس کے اندر جھلسنا ہے **وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ** (41:24)۔ میں نے کہا ہے کہ قرآن کریم کا ایک قانونِ مہلت بھی ہے کہ غلط کام' غلط نظام' فوری اپنا اثر نہیں کرتا۔ یہ کہہ کر اس میں ایک وقفہ دیا جاتا ہے کہ اب بھی اگر تم اپنی اصلاح کرلو تو بچ سکتے ہو۔ اگر وہ اصلاح کرلیتے ہیں تو اس غلط کام کا ازالہ ہوجاتا ہے لیکن اگر وہ اُس پہ بھی اِدھر نہیں آتے تو پھر جب تباہی کا وقت آتا ہے' پھر اس وقت یہ باتیں کہنا کہ یا اللہ! ہمیں مہلت دیدے' ہم یہ کردیں گے' وہ کردیں گے کارِ بے کار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پھر اُس وقت مہلت نہیں ہے۔ جب محسوس طور پر نتائج سامنے آجاتے ہیں تو مہلت کا وقفہ ختم ہوجاتا ہے' وہاں پھر اس قسم کی باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔ باز آفرینی کا موقعہ نہیں رہتا۔ یہ عذاب بہر حال ان پر مسلط رہے گا' اس سے چھٹکارا نہیں ہو سکے گا۔ یہ جو مجرم ہیں اور کچھ ساتھی بھی ہیں' یہ اِن کو بھی موردِ الزام قرار دیتا ہے۔

باطل نظام کے سربراہان کے اردگرد مصاحبوں کا کردار اور تاریخ کی سائنس

یہ کہا کہ **وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ** (41:25)۔ اس غلط نظام میں ہوتا کیا ہے؟ یہ اکیلا ہی نہیں ہوتا' ان کی ایک جھنڈلی ہوتی ہے' ساتھ ساتھی ہوتے ہیں۔ ساتھیوں کے متعلق قرآن حمید نے ایک لفظ کہا ہے' عزیزانِ من! اس سے انسان وجد میں آجاتا ہے جب وہ اس زبان کی' جامعیت اور قرآن حمید کے انتخاب الفاظ کے متعلق دیکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ ایسے ساتھی' جو آپ کے نیچے' آپ کے طفیل ہوں' ان کا آپ پہ کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن وہ جو آپ پہ چھائے ہوئے ہوں' ان کا اثر ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ اس قسم کے ساتھی ان کو مل جاتے ہیں اور ان ساتھیوں کے لیے لفظ قَيَّضْنَا[1] آیا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے جیسے کہ انڈے کے

---

[1] اس کا مادہ ''ق ی ض'' ہے۔ القیض انڈے کے اوپر کا خشک اور سخت چھلکا۔ قیض کے معنی ہیں کسی کو کسی دوسری چیز کے ساتھ اس طرح لگا دینا کہ وہ اس کے ساتھ چپکی بھی رہے اور اس پر غالب بھی رہے جس طرح انڈے کا چھلکا اس کی زردی اور سفیدی پر مستولی رہتا ہے (تاج العروس' محیط المحیط اور المفردات فی غریب القرآن)۔ (ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن' جلد سوم' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961' ص ص۔ 1406 تا 1407)۔

اوپر کا جو خول' چھلکا ہوتا ہے' وہ انڈا کے اندر جو کچھ ہوتا ہے' وہ اس کو اس طرح سے محیط ہوتا ہے کہ وہ اندر والی زردی اور سفیدی بے اختیار ہوتی ہے' کچھ کر ہی نہیں سکتی' یہی حالت اُس کی ہوتی ہے جس کا یہ قرین ہوتا ہے۔ وہ اس کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا۔ یہ اس طرح اس کے اوپر چمٹا ہوا ہوتا ہے۔ یہ جو قرین ہوتا ہے یہ اس قسم کے ساتھی ہوتے ہیں جو محیط ہوئے ہوتے ہیں کہ انسان اندر محسوس بھی کر رہا ہوتا ہے کہ صاحب! میں بری طرح سے ان کے پنجے میں پھنس گیا' چھوٹ نہیں سکتا' ان میں سے نکل نہیں سکتا۔ یہ انداز ہوتا ہے۔ یہ جو غلط سوسائٹی' اور اس غلط سوسائٹی میں اس قسم کے فریب کار لوگ اس طرح سے چھا جاتے ہیں جس طرح سے انڈے کا خول انڈے کے اوپر چھایا ہوا ہوتا ہے' یہ چاروں طرف سے محیط ہوتے ہیں اور اندر والا بے بس ہوتا ہے۔ کہا کہ وہ تھے ان کے ساتھی۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کرتے کیا تھے؟ وہ ان کے غلط کاموں کی تعریف کرتے تھے۔ وہ جنہیں حکومتیں اور سلطنتوں میں مصاحب کہتے ہیں کہ سبحان اللہ صاحب! کیا بات ہے آپ کی! ان کو بکنے دیجئے' آپ کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں ہو سکتی ہے۔ یعنی غلط کام ان کی نگاہوں میں غلط آنے ہی نہیں دیتے۔ یہ وہ ہوتے ہیں۔ اور پھر وہ چاروں طرف سے اس طرح اس کے اوپر محیط ہو جاتے ہیں کہ وہ اس سے نکلنے ہی نہیں پاتا۔ کبھی اُجڑی ہوئی بستیوں' لٹی ہوئی حکومتوں کی' تاریخوں کو آپ پڑھ کر دیکھیے تو وہاں یہی ہوتا ہے۔ یہ جو اوپر بیٹھا ہوا ہوتا ہے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اچھا بھلا سمجھدار آدمی تھا' دانش و بینش والا تھا، اس کو ہو کیا گیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے گھیراڈالا ہوا ہوتا ہے۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ یہ تو بڑا سمجھدار تھا' نکل کیوں نہ گیا؟ وہ ایسی تدبیریں کرتے ہیں کہ اس میں سے آدمی نکل ہی نہیں سکتا۔ کیا کیا چیزیں ہیں جو قرآن مجید بتا جاتا ہے صاحب! کہتا یہ ہے کہ پھر ان کے ہر غلط کام کو مزین کر کے دکھاتے ہیں وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ (41:25) اس کے بعد وہ جو ہمارے ہاں قانون کا فیصلہ ہوتا ہے پھر وہ ان کے اوپر چھا جاتا ہے۔ یہی پہلی قوموں کے ساتھ ہوا' یہی ان قوموں کے ساتھ ہوگا اور یہ جو آنے والی قومیں ہیں' ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا۔ یہ ہے Science of History (تاریخ کی سائنس)۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی 25ویں آیت تک آ گئے' 26ویں سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

چوتھا باب: سورۃ حٰمٓ السجدۃ (آیات 26 تا 32)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1981ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی آیت 26 سے ہو رہا ہے: (41:26)۔

25 ویں آیت کا پچھلے درس میں آغاز ہو گیا تھا۔ اس کا پہلا حصہ اور اس کے ساتھ ہی اگلا حصہ بھی آ گیا تھا لیکن آج تجدید یادداشت کے لیے تفصیلاً آئے گا۔ پہلے حصے میں یہ کہا گیا تھا کہ یہ لوگ جو اس قدر مجرمانہ اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں، ایک تو یہ ہے کہ ان کی اپنی نیت اور مفاد بھی یہ ہوتے ہیں لیکن اس میں ایک چیز اور بھی ہوتی ہے۔ ان کے اردگرد اس قسم کے مصاحب ہوتے ہیں جو ان کے غلط کاموں کو بھی بڑا ہی مزین بنا کر انہیں دکھاتے ہیں کہ سبحان اللہ صاحب! کیا کہنے ہیں آپ کے! واہ واہ آپ نے پہلی دفعہ تاریخ میں یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ یہ یکسر غلط ہوتے ہیں۔ اس کے لیے قرآن کریم نے جو لفظ قیضنا استعمال کیا ہے وہ عجیب چیز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان پر وہ اس طرح سے مسلط ہو جاتے ہیں جیسے انڈے کا چھلکا انڈے کے اوپر مسلط ہوتا ہے، باہر کی آواز ہی اندر نہیں پہنچ سکتی۔ قرآن کریم کی ایک ایک تشبیہ ہے۔ آپ اس آیت میں مسلط ہونے کا انداز ملاحظہ فرمایئے۔

مصاحبوں کے چکر میں چاروں طرف سے گھرے ہوئے با اختیار لوگوں کی کیفیت

واقعی جب ہم سامنے دیکھتے ہیں' پرانی تاریخوں کو تو چھوڑ دیجیے' ہمعصر تاریخوں میں بھی جہاں جہاں اس قسم کے لوگ گرد و پیش ہوتے ہیں' باہر کھڑے ہوئے آدمی کو سمجھ میں نہیں آتا کہ صاحب! اس اتنی سی بات کے لیے ہم چلا رہے ہیں مگر یہ اس تک پہنچتی نہیں ہے۔ پھر وہ ان کے ''چھلکے'' کے اندر ہوتا ہے' وہ باہر کچھ دیکھ ہی نہیں سکتا' نہ باہر والوں کی سن سکتا ہے' نہ اندر بیٹھا کچھ باہر دیکھ سکتا ہے۔ اس ایک تشبیہہ سے قرآن حکیم یہ ساری چیزیں بیان کر گیا ہے کہ یہ کیفیت کیا ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ احکام نافذ ہوتے ہیں تو ان کے نام سے ہوتے ہیں' ان کی زبان سے ہوتے ہیں حالانکہ نہ آنکھیں ان کی اپنی ہوتی ہیں' نہ کان اپنے ہوتے ہیں' نہ زبان اپنی ہوتی ہے۔ وہ تو انڈے کے چھلکے کی طرح جو چھائے ہوئے' ان کو چاروں طرف سے محیط ہوتے ہیں' یہ سب کچھ ان کا ہوتا ہے۔ اور وہ کرتے یہ ہیں کہ ان کے غلط کاموں کو بڑا پرکشش اور مزین بنا کر دکھاتے ہیں۔ اس طرح یہ چیز بظاہر تو غیر شعوری طور پر ہوتی ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ گویہ صاحبِ شعور اور صاحبِ بصیرت لوگ ہوتے ہیں لیکن ان مصاحبوں کی وجہ سے وہ صحیح راستے پر نہ آتے ہیں' نہ صحیح بات ان کے کان تک پہنچتی ہے۔

قرآن حکیم جن وانس یعنی صحرا میں اور شہر میں بسنے والے لوگوں سے مخاطب ہے

کہا کہ اس طرح سے ہمارا وہ قانون ہے' جو شروع سے چلا آ رہا ہے' وہ خواہ شہری آبادیاں ہوں' خواہ وہ باہر دیہات کے بسنے والے لوگ ہوں۔ جن اور انس قرآن حکیم میں جہاں آتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ آج تو ہم اس کی اہمیت نہیں جانتے۔ آج یہ جو باہر گاؤں کے بسنے والے لوگ ہیں' معاشرت کی کیفیت ایسی ہوگئی ہے کہ یہ آبادیاں قریباً آپس میں مل ہی گئی ہیں یعنی آج اگر ہم کہیں کہ گاؤں والوں کی یہ صورت اور شہر والوں کی یہ صورت ہے تو بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگرچہ ہمارے بچپن میں ان دونوں بستیوں کے تمدن اور معاشرت میں ابھی اتنا امتیاز تھا کہ ان میں فرق کیا جا سکتا تھا لیکن اب تو وسائلِ رسل و رسائل کے عام ہونے سے کچھ فرق ہی نہیں رہا۔ عرب میں تو خاص طور پر دو تین سارے شہر تھے اور وہ شہر بھی کیا' ہمارے قصبوں جتنے بھی شہر نہیں تھے: مکہ جو وہاں کا ام القریٰ کہلاتا تھا' سارے عرب حجاز کے اندر ان کا جو مرکزی مقام تھا اس مرکزی مقام کو دیکھیے تو اس کی آبادی آخر میں جو نظر آتی ہے وہ دس ہزار تھی۔ یہ سارے تین چار شہر تھے' باقی تمام آبادی بدوؤں کی تھی' یا جن کو آپ بدو کہتے ہیں' جو صحرائی لوگ تھے' جو خانہ بدوش لوگ تھے' وہ آبادی ان پر مشتمل تھیں اور وہ شہر کے قریب آتے ہی نہیں تھے سوائے اس کے کہ جیسے ہمارے ہاں بھی یہ ہماری نئی پود نے تو نہیں دیکھے ''گگھو گھوڑے وبیچن والیاں اوندیاں سن''[1]۔ یاد ہے آپ کو

---

[1] مٹی کے بنے ہوئے ''گگھو گھوڑے'' بیچنے والی آتی تھیں۔

انہوں نے وہ ٹوکرا اٹھایا ہوا ہوتا تھا۔ یہ جو خانہ بدوشوں کی' آبادیاں ہوتی ہیں' وہ ان میں سے آیا کرتی تھیں اور شہروں میں یہی آیا کرتی تھیں اور پتہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ ان کے اور باقی لوگ کون ہیں اور کہاں ہیں۔ یا وہ تماشہ کرنے کے لیے نٹ آتے تھے' وہ ''گکھو گھوڑے والیاں'' آتی تھیں اور ان کے ساتھ شہر والوں کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ یہ ابھی کل کی بات ہے۔ اس زمانے میں اور عرب میں' حجاز میں' تو آج بھی یہ کیفیت ہے۔ شہر ابھی اتنے تھوڑے سے ہی ہیں' ذرا ان کی آبادیاں تو بڑھ گئی ہیں لیکن ان کی کثرت آبادی کی یہی اعراب یا بدو ہیں' صحرائی ہیں' جنہیں خانہ بدوش کہتے ہیں۔ قرآن حکیم کی اصطلاح میں یا عربی زبان کے اندر بھی وہ انس ان آبادیوں کو کہتے تھے جو شہروں میں ایک دوسرے سے مانوس ہوتی تھیں اور جو نگاہوں سے اوجھل آبادیاں ہوتی تھیں' جن کو آپ صحرائی آبادیاں کہتے ہیں ان کو وہ جن کہتے تھے۔ جن کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو آنکھوں سے اوجھل ہوں۔ اس اعتبار سے قرآن کریم جہاں جن وانس کہتا ہے تو وہ دونوں آبادیوں کو ساتھ لے لیتا ہے کہ اِن کی بھی یہ کیفیت تھی اور اُن کی بھی یہ کیفیت تھی۔ یہ نہیں کہ یہ مہذب ہو گئے تھے تو ان کے ہاں کی کوئی چیز بدل گئی تھی اور وہ غیر مہذب رہے تھے۔ ان باتوں میں وہ سارے اکٹھے ہوتے تھے۔ ان کے لیے کہا کہ **اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ** (41:25) وہ سب نقصان اٹھاتے تھے۔

قرآنِ حکیم کے متعلق مخالفین کو ایک کھلا چیلنج

اب وہ اگلی آیت آئی ہے جو میں سمجھتا ہوں کہ مرکزی موضوع ہو سکتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ قرآن حکیم پیش کرتے تھے' چیلنج دیا جاتا تھا کہ اس کی مثل تم دس آیتیں بنا کر لے آؤ۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ کسی انسان کی فکر کی تخلیق ہے تو تم سارے انسان مل جاؤ' یہاں کے ہی نہیں بلکہ جن جن کو تم دنیا میں سمجھتے ہو کہ اس معاملے میں تمہارے ساتھی ہو سکتے ہیں' ان سب کو بلا لو مل بیٹھو اور اس کے بعد اس قرآن حکیم جیسی دس آیتیں بھی تم بنا کر لے آؤ۔ کسی نے یہ چیلنج قبول نہیں کیا تھا۔ یہ نہیں کہ یہ لوگ زبان کے اعتبار سے کچھ گونگے تھے۔ وہ تو باقی ساری دنیا کو گونگے کہتے تھے۔ عجم کے معنی ہی گونگے ہیں۔ عربوں کو اپنی زبان پہ بڑا ناز تھا اور زبان واقعی ایسی تھی جس زبان کو قرآن حکیم جیسی کتاب کے لیے منتخب کیا گیا ہو اس کا کیا کہنا ہے! ان کی زبان ایسی تھی اور اس زبان میں بھی پھر ان کے ہاں وہ لوگ جو شاعر ہی ہوتے تھے' وہ زبان میں سند (Authority) مانے جاتے تھے مگر انہوں نے یہ چیلنج قبول نہیں کیا۔

بنی امیہ کے زمانے تک تو عربوں کے ہاں نثر کی کوئی کتاب ہی نہ تھی' قرآن حکیم کی مثل کا چیلنج تھا' مخالفت ہوئی مگر یہ آواز اپنا اثر کیے چلی گئی

عزیزانِ من! اس زمانے میں ابھی کتابیں لکھنے کا تو رواج ہی نہیں تھا۔ یہ عربی زبان کے اندر جو Written Book (لکھی ہوئی

کتاب) ہے وہ سب سے پہلی قرآنِ کریم ہے۔ یعنی اس سے پہلے کتاب ہی کوئی نہیں تھی۔ اور جب تک یہ اُمت صحیح پٹڑی پہ رہی قرآن کریم کے سوا کوئی دوسری کتاب ہی نہیں تھی۔ یہ تو اور کتابیں آئیں تو یہ سب کچھ بکھر گیا۔ آپ کو یاد ہے کہ بنی اُمیہ کے زمانے (661-750ء) تک کوئی کتاب نہیں تھی اور بہرحال یہ قرآنِ مجید ان کے ہاں پہلی کتاب تھی لیکن وہ جو شاعر تھے ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ زبان میں سند مانے جاتے تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ جس بلندی پر ان کی شاعری پہنچی ہوئی تھی تو اس کے بعد بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ شعرائے جاہلیہ کے متعلق بات ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں چیلنج دیا گیا تھا کہ تم جو اپنی زبان پہ اتنے نازاں ہو تمہاری زبان میں یہ قرآن مجید نازل ہوا ہے تم اس کی مثل دس آیات ہی بنالاؤ۔

یہ بڑے سوچنے کی بات ہے عزیزانِ من! کہ ان کی زبان میں یہ ایک کتاب پیش کی جارہی ہے جس زبان میں آپؐ نبی اکرم ﷺ تو بہرحال نبوت سے پہلے اَن پڑھ (Unlettered) تھے ان کا قریباً چالیس سال کا عرصہ بیت چکا تھا اور وہ لوگ جو ان کے ہاں کے تھے وہ تو بچپن سے شاعریاں کرتے چلے آتے تھے۔ ان سب کو چیلنج دیا جاتا ہے کہ تمہاری زبان میں یہ کتاب ہے تم اس زبان کے اتنے بڑے بڑے مستند فاضل استاد مانے جاتے ہو تو اگر تم کہتے ہو کہ یہ خدا کی کتاب نہیں اس ﷺ کی اپنی بنائی ہوئی ہے تو پھر اس کا ثبوت مشکل کیا ہے! تم بشری اعتبار سے زبان کے اعتبار سے بہت آگے ہو مستند مانے جاتے ہو ایک دو نہیں بلکہ سارے اکٹھے ہو جاؤ جہاں جہاں اور کہیں بھی تمہارے ساتھی ہیں ان کو بھی بلا بھیجو اور سارا قرآن حمید نہیں دس آیتیں اس کی مثل تم پیش کردو۔ آج یہ بات شاید سمجھ میں نہیں آتی۔ سمجھ میں یوں آتی ہے کہ تیئس سال کا عرصہ یہ چیلنج ان کے سامنے رہا ان کی طرف سے وہ مخالفت اس انتہا تک پہنچی کہ انہوں نے اپنے سر کٹوا دیئے جانیں دیدیں اگر غزوات اور باقی جنگیں اکٹھی کی جائیں تو اُسی کے قریب بنتی ہیں ان کی ساری عمر ہی مسلمانوں کے خلاف اور نبی اکرم ﷺ کے خلاف میدانِ جنگ میں گزر گئی۔ اگر یہ ہو جاتا تو ان کو وہ دس آیتیں پیش کرنی کونسی مشکل بات تھی جو اتنے میں یہ معاملہ حل ہو جاتا۔ یہ نہیں ہوا۔ گویا وہ اس معاملے میں مقابلے میں آنے میں بے بس ہو گئے تھے۔ یہ قرآن حمید پیش کیے جاتے تھے۔

انہوں نے سوچا کہ کیا کیا جائے۔ قرآن حمید کا لفظ تو استعمال نہیں کرنا چاہیئے اردو زبان کے اعتبار سے جیسے کہتے ہیں کہ اس کا سحر ایسا تھا کہ جس کے کان میں یہ پڑ جاتا تھا وہ اس سے متاثر ہو جاتا تھا۔ اب وہ کیا کریں کہ دن بدن ان کی تعداد بڑھتی چلی جاتی تھی۔ انہوں نے ان کو مار کر پیٹ کر ذلیل کر کے ساری ہر قسم کی سختیاں ان پہ کر کے دیکھ لیں اور یہ قرآن مجید کی آواز بلند کیے جاتے تھے اور یہ اپنا اثر کیے چلی جاتی تھی اور وہ دیکھتے تھے کہ اُن کو اپنے منصوبے میں شکست ہو رہی ہے۔

قرآن مجید کی آواز دبانے کی ایک خطرناک چال

وہ اس تحریک کو پنپنے ہی نہیں دینا چاہتے تھے۔ آخر میں انہوں نے ایک حربہ استعمال کیا ایک اسکیم بنائی۔ قرآن مجید اسے بتاتا ہے

کہ وہ اسکیم کیا تھی۔ کہا کہ وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِھٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ (41:26) انہوں نے کہا کہ ان پر غالب آنے کی' ان کو شکست دینے کی' اب ایک ہی تدبیر ہماری سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ خود تو اِسے سنو نہیں اور جہاں یہ آواز بلند ہو' بس یہ ایک لفظ والغوا کا ہے' عزیزانِ من! ساری بات اس کے اندر آ جاتی ہے۔ یہ جو لفظ ہے' یہ وہی ہے جسے ہم اردو میں کہتے ہیں کہ کائیں کائیں کرنے لگ جاؤ۔ یہ کائیں کائیں پرندوں کی بولی ہے۔ پرندوں کی بولی انسان کے مقابلے میں ہو تو سوال ہی نہیں کہ اس کے کچھ معنی ہوتے ہیں۔ اردو میں ہمارے ہاں یہ کائیں کائیں کہتے ہیں۔ یہ بالکل وہی چیز ہے جسے ''والغوا'' کہتے ہیں' لغو یہیں سے بات آئی ہوئی ہے۔ یہ پرندوں کی بولی یا کائیں کائیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ جہاں قرآن مجید کی آواز بلند ہو' شور مچا دو اور کائیں کائیں کرنے لگ جاؤ کیونکہ کثرتِ آبادی ان کی تھی تو ظاہر ہے کہ ان کی کائیں کائیں تو بہت زور شور سے اٹھتی ہوگی۔ معنوی آواز تو ایک شخص کہتا ہوگا وہاں مقابلے میں جمِ غفیر ہوگا اور پھر وہ کائیں کائیں کرنے لگ جاؤ۔ خود سنو نہیں اور جہاں کہیں آواز بلند ہو' وہاں شور مچا دو' اس قسم کی ایسی بے مطلب آوازوں کا صرف شور مچانا مقصود تھا۔ کائیں کائیں کرنے لگ جاؤ۔ خود سنو نہیں اور کسی دوسرے تک آواز پہنچنے نہ دو۔ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ (41:26) اس سے کچھ ہو سکتا ہے' امید ہو سکتی ہے کہ تم اس کے اُوپر غالب آ جاؤ ورنہ اور تو کوئی صورت ہماری سمجھ میں آتی نہیں۔

صدیوں سے مذہبی فرقہ بندی کی اس کائیں کائیں کے باعث ملتِ اسلامیہ امت واحدہ نہیں بن سکی اور پرویزؒ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہا

قرآن حمید کے خلاف یہی حربہ اس تیرہ سو سال میں استعمال ہوتا رہا۔ قرآنِ خالص جہاں کسی نے پیش کیا تو اس کے مقابلے میں کوئی چیز یہ لوگ نہیں لا سکے جو قرآن حمید کے مخالف ہیں۔ اب قرآن حمید کے مخالف' عزیزانِ من! غیر مسلم نہیں تھے۔ انہوں نے اس طرح سے شور نہیں مچایا' وہ باطل سہی' غلط سہی' وہ بہر حال پھر بھی Argument (دلائل و براہین) کے ذریعے سے سامنے آتے تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ان کی Logic (منطق) تھی' وہ خالی شور نہیں مچاتے تھے لیکن یہ جو شور مچنے والی چیز تھی' وہ یہ تھی کہ کوئی قرآن مجید کو سننے نہ پائے' یہ اس بدنصیب قوم کا حربہ تھا جو اس نے استعمال کیا' جو وہ استعمال کرتے تھے کہ کوئی قرآن مجید سننے نہ پائے۔ معاف رکھیے' آپ کو یاد ہوگا کہ جہاں کہیں بھی میں والی بات آتی ہے تو مجھے بہت حجاب ہوتا ہے' اس میں تعمل ہوتا ہے' طبعاً میری یہ کیفیت ہے' میں لایا نہیں کرتا' لیکن کیا کیا جائے جب ساغر و مینا کہے بغیر بات نہ بنتی ہو تو لانا پڑتا ہے۔ میری اپنی تاریخ' میری اپنی جو زندگی ہے' وہ اس کا ثبوت ہے۔ ویسے تو پچاس سال بھی ہو گئے' مسلسل چالیس سال ہو گئے ہیں مجھے قرآن کریم پیش کرتے ہوئے۔ کسی سے میں نے لڑائی نہیں کی' کسی سے جھگڑا

نہیں کیا' کسی کا کچھ چھینا نہیں' کسی سے کچھ لیا نہیں' کسی سے کچھ مانگا نہیں۔ قرآنِ خالص پیش کرتا چلا آ رہا ہوں۔ آج تک کسی نے بھی قرآن کریم کی رُو سے میری کسی بات کی تردید نہیں کی اور کر ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ اثر کیے چلی جا رہی تھی۔ تنہا ایک شخص بلا وسائل' بلا ساز وبراق' تنہا ایک آواز بلند کرتا ہے' مقابلے میں آپ یہ دیکھیے ان کی تعداد ہی ذرا آپ ملاحظہ فرمالیجئے' کوئی جواب آج تک ان لوگوں میں سے کسی نے قرآن کریم کی رو سے نہیں دیا۔

یہاں پہلی بات تو یہ کہی کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ (41:26) اپنے لوگوں کو تاکید ہے کہ اس قرآنِ مجید کے قریب نہ جانا' انہوں نے لکھا ہوا ہے کہ یہ تو ساحر ہے' ایک دفعہ بھی کسی کے کان میں اس کی آواز پڑ جاتی ہے' تو پتہ نہیں یہ کیا کرتا ہے: وہ اُسی کا ہو جاتا ہے۔ وہی چیز جو اُن کو ڈر تھا اس قرآن حمید سے کہ جس کے کان میں یہ بات پڑ گئی' وہ اس سے متاثر ہو جائے گا۔ پہلا یہ ہے کہ قرآن حمید کسی کو سننے نہ دو' ان کے ہاں یہ مسلسل تاکید ہوتی ہے کہ اس کے درس میں نہ جانا' اس کی بات نہ سننا' وہ تو ساحر ہے' ہم نے دیکھا ہے کہ اچھے اچھے لوگ بڑے بڑے لوگ بھی وہاں گئے۔ وہ پتہ نہیں کیا کرتا ہے کہ وہ اسی کے ہو جاتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں کرتا' مگر وہ ہیں کہ کہتے ہیں کہ وہ کچھ کر جاتا ہے: عزیزانِ من! خدا کی بات کچھ کر جاتی ہے' پرویزؒ (1903-1985ء) کا حلق کیا بات کرے گا! یہ تو قرآن حمید کی زبان کرے گی۔ کہا جاتا ہے کہ طلوعِ اسلام کو ہاتھ نہ لگانا' ایمان جاتا رہے گا۔ کیا بات ہے اس ایمان کی' کہ اسے ہاتھ لگانے سے ایمان چلا گیا' کرنٹ مارتا ہے طلوعِ اسلام!!! یہ میں نے اچھے اچھے پڑھے لکھے (Educated) دانشوروں کو سنا جنہوں نے کہا کہ پرویز صاحب آتے ہیں' بات سنو گے؟ وہ کہتے ہیں کہ لاحول ولاقوۃ' صاحب! ہم نہیں جاتے۔ میں بڑے بڑے چوٹی کے دانشوروں کی بات کر رہا ہوں۔ کیوں صاحب؟ صاحب اس کی کیا بات ہے وہ تو پتہ نہیں کیا اسلام پھیلا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تین وقت کی نماز پڑھو' نو روزے رکھو' اردو زبان میں نماز پڑھو اور یہ سارا کچھ صاحب۔ اُن سے کہو کہ صاحب! آپ نے کہیں یہ چیز پڑھی؟ کہنے لگے: لاحول ولاقوۃ' اُن کے لکھے ہوئے کو پڑھنا تو ایک طرف رہا' اس کو ہاتھ لگانے سے ایمان چلا جاتا ہے' تو میں کیوں پڑھوں۔ ٹھیک ہے جی۔ کبھی اس کے درس میں جا کر سنا ہے؟ کہنے لگے کہ سن کے آدمی مسلمان واپس کیسے آ سکتا ہے' میں اتنا بڑا رسک کیسے لے سکتا ہوں۔ ٹھیک ہے جی' یہ بھی رسک نہ لیجیے۔ پڑھا کہیں نہیں' سنا کہیں نہیں۔ ان سے مل کر پوچھا بھی ہے؟ کہنے لگے کہ میں تو اس مردود کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ پھر صاحب! کچھ آپ معاف فرمائیے گا' کوئی وحی آتی ہے؟ قرآن کریم نے کہا ہے کہ شیاطین بھی وہی کیا کرتے ہیں۔ یعنی آپ کو یہ چیزیں کیسے معلوم ہو گئیں جس دھڑلے سے آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ تین نمازیں' نو روزے اور اردو میں نماز کہتا ہے۔ نہ ملے نہ اس کی بات سنی' نہ درس میں گئے' نہ کتاب پڑھی' نہ طلوعِ اسلام کو دیکھا تو معلوم کیسے ہو گیا؟ اجی یہ ساری دنیا کہتی ہے۔ چل بھئی!۔

عزیزانِ من! مجھے ہی نہیں' میرے عزیزوں کو بھی جو ان سے بات کرتے ہیں' آج تک کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس نے کہا ہو کہ ہاں

صاحب! میں نے براہِ راست اس سے پوچھا یا اس کا لکھا ہوا پڑھا ہے لیکن تاکید یہ ہو رہی ہے۔ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ [1] (41:26)۔ پرویز کی نہ سنو، پرویز کیا ہے؟ قرآن حمید کی بات مت سنو، ایمان چلا جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ چالیس سال کا مسلسل تجربہ میری ذات کا ہی نہیں بلکہ آپ احباب بھی جو جانتے ہیں جتنے عرصے سے بھی آپ جانتے ہیں، جو بھی اس قسم کا کوئی الزام دھرتا ہے، آپ اس سے پوچھ کے دیکھ لیجیے کہ سنا ہے، کبھی آپ نے یہ کچھ۔ کبھی نہیں۔ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ: یہ قرآن سنو ہی نہیں۔

ہمارے ہاں ذرائع ابلاغ کا غلط استعمال، محمد علی جوہر جیسی علمی شخصیت اور اسلم جیراجپوریؒ کا باطل پر فرمان

اب اگلی بات یہ ہے کہ خود تو سنو نہیں اور جہاں سے اس کی جو بات، کہیں باہر آئے تو وَالْغَوْا فِيْهِ (41:26) کائیں کائیں کرنا شروع کر دو، شور مچانا شروع کر دو۔ شور مچانے کے لیے ان کے پاس ذرائع ابلاغ ایسے ہیں کہ کسی حکومت کے پاس ایسے ذرائع ابلاغ نہیں ہیں، عزیزانِ من! بالکل تازہ بات آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجیے گا کہ قرآن حمید کی بات کہاں تک ہوتی ہے جو یہ اس کے لیے کہتا ہے کہ وَالْغَوْا فِيْهِ. وہ کیسے ہوتا ہے کائیں کائیں؟ اور ان کے پاس ذرائع کتنے ہیں؟ یہ آج کل رجم کا ایک سوال آپ لوگوں نے سنا ہوگا وہ بہت عام ہو رہا ہے: سنگساری کی سزا، زنا کی، اسے رجم کہا جاتا ہے۔ اس رجم کی آیت پر عدالت نے جو فیصلہ دیا ہے، میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ معلوم ہوا ہے کہ اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی گئی ہے۔ تو یہ قانون ہے کہ جب کوئی معاملہ عدالت میں زیرِ سماعت یا زیرِ بحث ہو تو اس فیصلے کے متعلق جس کے خلاف اپیل ہو، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں صرف اتنی سی بات کہوں گا کہ قرآن حمید کے متعلق کیا کیا جا رہا ہے، یا کیا کہا جا رہا ہے۔ اس کی مخالفت ہو رہی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک دفعہ علامہ اسلم جیراجپوریؒ (1879-1955AD) نے یہ کہا تھا، مجھے اب تک ان کا فقرہ یاد رہے، یہ دیر کی بات ہے، تقسیم سے پہلے کی۔ یہ ہندوستان کی پارلیمنٹ میں ایک ہندو نے، سارداا اس کا نام تھا، ایک بل پیش کیا تھا کہ نابالغوں کی جو شادی ہے، وہ قانوناً ناجائز قرار دی جائے۔ ہم خوش ہوئے تھے۔ ہندوؤں کے ہاں تو وہ پیدائش سے بھی پہلے شادیاں کر دیا کرتے ہیں، اس لیے کہ یہ تو پہلے برہما نے وہاں کیا ہوا ہوتا ہے، یہاں تو یونہی رسم ہی پوری کرنی ہوتی ہے۔ گویا ان کے ہاں یہ صورت تھی، اسی لیے اس ساردا نے یہ بل پیش کیا تھا۔ ہمیں خوشی تھی کہ یہ تو قرآن حمید کے مطابق ہے، اسلام کے مطابق ہے، قرآن مجید کی رو سے تو نابالغ کی شادی جائز ہی نہیں، بہت خوشی ہوئی لیکن سارے ہندوستان کے جتنے علمائے کرام تھے، سب نے اس کی مخالفت کی اور یہ محضر نامہ وائسرائے کے حضور بھیجا کہ آپ اگر اس بل کو منظور کریں بھی، تو اس کا اطلاق مسلمانوں پہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ ان کے مذہب کے خلاف ہوگا۔

---

[1] دیکھنا! تم کہیں قرآن کو نہ سن لینا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔1115)۔

مجھے یاد ہے علامہ اسلم جیراجپوریؒ فیروز باغ میں رہتے تھے اور جامعہ ملیہ دہلی میں پروفیسر تھے۔ میں بھی ان کے ہاں ہی رہتا تھا اور قرآن کریم پڑھتا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر (1931-1878ء) کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ وہ صرف آکسفورڈ سے ڈگری ہی لے کر نہیں آیا تھا' ان کی کیفیت یہ تھی کہ اور کچھ نہیں تو انگریزی زبان کا جو کامریڈ اخبار نکالتے تھے' مجھے معلوم ہے میں تو اس زمانے میں سیکریٹیٹ دہلی میں ہوتا تھا۔ وہ [1] دونوں اپنی اپنی کاپی الگ منگاتے تھے کیونکہ جھگڑا ہوجاتا تھا کہ کاپی آتی تھی اگر وہ پہلے وائسرائے نے لے لی ہے تو یہ کہتی تھی کہ میں اتنا انتظار نہیں کرسکتی۔ وہ وہاں فیصلہ یہ تھا کہ وہ دو کاپیاں جاتی تھیں۔ اس پائے کا یہ شخص تھا۔ لیڈر جتنا بڑا تھا' وہ بھی آپ کو معلوم ہے' یہ آکسفورڈ کا ایم اے تھا۔ اور یہ جو مہم تھی کہ مسلمانوں کے اوپر اس بل کا اطلاق نہ ہو' اس کو مولانا محمد علی جوہر لیڈ (Lead) کرتے تھے اور ان کا ہیڈ کوارٹر فیروز باغ کے جامعہ ملیہ دہلی میں تھا۔ وہ ہمارے سامنے ہی ہوتا تھا۔ مہم یوں تھی۔ اعلان کیا ہوا تھا کہ لوگ اپنے بچے اور بچیوں کو لائیں اور ان کا یہاں نکاح پڑھایا جائے۔ لوگ گود میں اٹھا کر لاتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر اتنے بڑے لیڈر تھے' کثرت سے لوگ آتے تھے' یہاں مولوی صاحب بیٹھے ہوتے تھے' چھ چھ مہینے کے بچوں کو لوگ گود میں اٹھا کر لاتے تھے اور اُن کے نکاح پڑھتے تھے اور یہ صاحب اُن کی گواہی دیتے تھے۔ انہوں نے آخر فیصلہ کیا کہ وائسرائے کے پاس ایک Deputation (وفد) لے کر جانا چاہیے۔ اس دن مجھے یاد ہے کہ Deputation (وفد) میں تمام ہندوستان کے یہ علمائے کرام وہاں سے نکلے تھے اور جا رہے تھے اور مولانا محمد علی جوہر ان کو لیڈ کر رہے تھے' ہم ان کو اپنے گھر سے بیٹھے دیکھ رہے تھے اور بات تو چھوڑ دیجیے کہ' کیا کہا تھا۔ انہوں نے ایک بات کہی۔ کہنے لگے عزیزم! تم تاریخ میں دیکھو گے کہ ہمارے ہاں کے یہ جتنے علمائے کرام ہیں' یہ کبھی کسی بات پہ متفق نہیں ہوئے' لیکن اگر کبھی ان سب کا اتفاق ہوا ہے تو وہ ہمیشہ باطل پہ ہوا ہے۔ آج یہ سارے متفقہ طور پہ ایک ایسی بات کہنے کے لیے جا رہے ہیں' جو قرآن کریم کے قطعاً خلاف ہے' اس پہ یہ سب متفق ہیں۔ کہا کہ قرآن کریم کی بات جب بھی تم کہو گے تو یہ بات نہیں ہے کہ یہ کبھی حق کے اوپر متفق ہو جائیں گے' بلکہ اس کے خلاف متفق ہو جائیں گے۔

قرآنِ حکیم میں زانی مرد اور زانیہ عورت کی سزا متعین طور پر بتا دی گئی ہے مگر علما حضرات اس کے مخالف ہیں

یہ جو رجم چیز آج قرآن کریم کے خلاف آئی ہوئی ہے' اس پہ سب متفق ہیں۔ قرآنِ کریم میں بہ نصِ صریح دیا ہوا ہے کہ زانی مرد یا زانیہ عورت کی سزا سو درے یا سو کوڑے ہے جسے جلدۃ کہتے ہیں۔ سورۃ النور کی دوسری آیت ہی یہ ہے کہ ایک ہی جگہ یہ سزا ہے' ان ہی الفاظ کے اندر ہے کہ جس کا دوسرا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ ان کے ہاں کہا جاتا ہے کہ یہ جو سزا ہے یہ غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے متعلق ہے۔ قرآن کریم نے یہ کہیں نہیں کہا کہ یہ غیر شادی شدہ کے لیے ہے۔ وہاں الزانی والزانیة ال کے ساتھ ہے۔ اس کے معنی ہوتا ہے کہ ہر Category (قسم) کا اس میں آجاتا ہے۔ یہ زبان کے اعتبار سے بھی ہے۔ ان کی سزا یہ ہے۔ بات ختم ہوگئی۔ قرآن حمید نے ایک ہی جگہ کہا ہے اور ان واضح' الفاظ میں کہا ہے' یہ بھی نہیں کہ یہ اس کے کچھ اور معنی کرتے ہوں' معنی یہ بھی کرتے ہیں۔ لیکن کہتے ہیں کہ نہیں یہ جو

---

[1] یہ اشارہ وائسرائے ہند اور ان کی اہلیہ (Wife) کی طرف ہے۔

یہاں الزانی و الزانیۃ لکھا ہے' یہ غیر شادی کے لیے ہے اور شادی شدہ کے لیے سنگسار ہے۔ یہی چیز آج کل کہی جا رہی ہے۔ کوئی پرچہ اٹھا کر دیکھیے آج کل جو ان کی مخالفت ہو رہی ہے۔ یہ ان کی تمام اخباریں جو مذہب والی ہیں' وہ میرے پاس آتی ہیں۔ ان میں شروع ہی یہ ہوتا ہے کہ دیکھیے اس عدالت نے قرآن حمید کے خلاف' حدیث کے خلاف' اجماعِ امت کے خلاف' قیاس کے خلاف' فقہ کے خلاف' ایک فیصلہ کیا' باقی سب کے خلاف تو ہوا' ان میں لکھا ہوتا ہے' کہ یہ فیصلہ قرآن حمید کے خلاف ہے۔ یا اللہ! قرآن حمید میں تو وہ بہ نصِ صریح لکھا ہوا ہے کہ سو سو کوڑے' کوئی دوسری آیت نہیں ہے۔ وہ قرآن حمید کے خلاف کیسے ہوا۔ میں اتنی سی بات کہونگا کہ قرآن حمید کے خلاف کیسے؟ [1]

قرآنِ حکیم کی ایک آواز کو دبانے کے لیے اتنا زیادہ انتظام اور پروپیگنڈا کیوں؟

یہ جو میں نے ''الغوا'' کہا ہے کہ اتنا شور مچاؤ کہ دوسرے کی آواز نہ سن پائے۔ یہ صرف بیچارہ ایک (ماہانہ) ''طلوعِ اسلام'' ہے اور ہر ایک نے اپنے ہاں کے ذرائع ابلاغ میں یہ لکھا ہوا ہوتا ہے۔ جج بھی اس سے متاثر ہیں' وہ بھی سحر کیا ہوا ہے۔ یہ ایک بیچارہ پرویز (1903-1985ء) ہے جس غریب کے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے' صرف مہینے کے بعد یہ ایک پرچہ نکلتا ہے تو وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ سارے جتنے ہیں' یہ سارے اس ایک سے تو متاثر ہیں' ہم جو کروڑوں ہیں' ان سے متاثر نہیں ہیں۔ ان کو خطرہ پیدا ہو رہا ہے کہ

سب ہو چلے ہیں اس بتِ کافر ادا کے ساتھ
رہ جائیں گے رسول ہی بس اب خدا کے ساتھ

وہ بیچارے جج کہتے ہیں کہ ہم نے تو کبھی اس کی شکل بھی نہیں دیکھی' ہم نے تو کبھی کوئی چیز بھی نہیں پڑھی۔ کہنے لگے: نہیں' دیکھی ہے یا نہیں دیکھی مگر تم ہو پرویزی۔ قرآن حکیم کی آواز کو دبانے کی یہ مہم کس طرح سے جاری ہوتی ہے' اس کے لیے سنیے کہ پچھلے جمعہ میں ان کی طرف سے یہ اعلان ہو گیا کہ ہر مسجد میں خطبے کا موضوع یہ ہو اور اس کی تردید کی جائے اور بقول ان کے پھر ان کو گالیاں دی جائیں۔ اب آپ سوچ لیجیے کہ سارے پاکستان کے گاؤں گاؤں میں' ایک مسجد نہیں ہوتی' کئی مسجدیں ہوتی ہیں اور اس میں چونکہ یہ متفق ہیں اس لیے یہ نہیں ہے کہ یہ اہلحدیث کی مسجد ہے' اس میں یہ ہوگا اور اہل فقہ کی مسجد ہے' اس میں وہ ہوگا' نہیں جی۔ قرآن کریم کی اس آواز کو دبانے میں تو متفق ہیں۔ آپ سوچیے کہ سارے ملک کی ہر مسجد کے اندر ایک وقت میں جو خطبہ ہو اور اس میں یہ موضوع ہو تو کیا کسی بڑی سے بڑی سلطنت کو بھی پبلسٹی کا ایسا جال مل سکتا ہے جس میں ایک پیسہ خرچ نہ ہو' نہ کوئی کانفرنس منعقد کرنی پڑے' نہ کوئی اشتہار دینا پڑے' کچھ دنیا میں ضرورت ہی نہیں۔ ساری مساجد کے اندر شور مچایا گیا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ میرا اس وقت جو موضوع ہے وہ صرف قرآن کریم تک ہے۔ اگر یہ قرآن کریم درمیان میں نہ لائیں' تو میں بات ہی نہ کروں۔ آپ فرما دیجیے کہ صاحب! روایات میں آیا ہے' فقہ میں آیا ہے' قیاس کی رو سے ایسا

---

[1] اس کی مکمل تشریح کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مطالب القرآن فی دروس القرآن سورۃ النور' پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص ص۔ 41 تا 87۔

ہے' اجتہاد کی رو سے ایسا ہے' اجماع امت وہ کہتے ہیں کہ یہ متواتر چلا آ رہا ہے' اس کو آپ دین سمجھتے ہیں تو مجھے اس سے تعرض نہیں ہے۔ اب وہاں یہ بات ہوئی کہ صاحب! یہ قرآن حکیم جو ہمارے سامنے ہے یا آپ کے بھی پاس ہے تو اس میں تو یہ ہے نہیں۔ میں یہی بات سنانے والا ہوں ذرا غور سے سن لیجیے کیونکہ آپ سے بھی کہیں بات ہوگی یا آپ سنیں گے۔ میں ایک بات عرض کر دوں کہ کبھی ان معاملات میں کسی سے جھگڑا نہیں کیجیے گا اس لیے کہ ان کے پاس Argument یا دلیل کوئی نہیں ہوتی' جس کے پاس دلیل نہیں ہوتی پھر وہ فساد کرتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (41:26) غالب آنے کا طریقہ ایک ہی ہے۔ اگر آپ کی کسی بات سے ان کا یہ طریقہ نا کام رہ جاتا ہے تو پھر تو فساد ہوتا ہے' کسی سے جھگڑا بالکل نہ کیجیے گا۔

''الاتقان'' ایک مستند سمجھی جانے والی کتاب میں کیا کچھ لکھا ہے؟

آپ کی معلومات کے لیے عرض کرتا ہوں کہ جب یہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم میں بھی یہ ہے تو اس قرآن حکیم میں تو یہ ہے نہیں تو پھر وہ کہاں ہے۔ سنیے' عزیزانِ من! کلیجہ شق ہو کر رہ جاتا ہے۔ کہا کہ قرآن حکیم میں یہ آیت (رجم) تو تھی لیکن اب نہیں ہے اور جواب نہیں' تو وہی ہماری سند ہے۔ اچھا جی!!

''الاتقان'' ان کی ایک بہت مسند کتاب ہے۔ اس کے اندر حضرت ابوعبید کی یہ روایت ہے' اس کا متن پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے وہ عربی زبان کے اندر ہے جس کا جی چاہے دیکھ بھی لے' اس کا ترجمہ بھی ہے۔ عربی زبان کی الاتقان کی دوسری جلد ہے' اس کا پچیسواں صفحہ ہے' اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ حضرت ابوعبید سے روایت ہے کہ مجھ سے حضرت عبید بن کعب نے پوچھا۔ ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے پوچھا' کہ تم جانتے ہو کہ سورۃ احزاب میں کتنی آیات تھیں۔ سورۃ احزاب 33 ویں سورۃ ہے' قرآن مجید موجود ہے۔ سورۃ احزاب کے اندر کتنی آیات تھیں؟ وہ بتاتے ہیں کہ وہ آیات تھیں۔ تو میں نے کہا کہ یہی 72,73 سورۃ احزاب میں موجود ہیں' اس میں یہی آیات ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ یہ دو صحابی آپس میں گفتگو کر رہے ہیں کہ تمہیں پتہ ہے کہ سورۃ احزاب میں کتنی آیات ہیں؟ اس نے کہا کہ 72,73۔ کہنے لگے کہ نہیں' سورۃ احزاب میں سورۃ بقرۃ جتنی آیات تھیں یعنی 286۔ اس کے اندر 286 آیات تھیں تو انہوں نے کہا کہ اب تو اس کے اندر 72 ہی ہیں۔ کہنے لگے کہ ہاں اب تو اتنی ہی ہیں۔ کہنے لگے: باقی کیا ہوئیں۔ کہنے لگے: باقیوں کو چھوڑیئے' اسی میں تو یہ رجم والی آیت تھی' جس کی ہم تلاوت کیا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آیتِ رجم کیا تھی؟ اُس میں کیا الفاظ آتے ہیں؟ عجیب تماشہ ہے۔ اس میں یہ نہیں ہوتا کہ شادی شدہ مرد یا شادی شدہ عورت ہے۔ اس میں جو الفاظ ہیں وہ ہیں الشیخ والشیخۃ' بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت۔ الفاظ اس روایت کے اندر بھی یہ ہیں کہ وہ جو سورۃ احزاب میں آیتِ رجم ہوا کرتی تھی' اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ جب بوڑھا مرد اور

بوڑھی عورت زنا کی مرتکب ہو تو انہیں سنگسار کیا جائے۔ اب اس سے پھر یہ لے آتے ہیں کہ نہیں' یہ جو بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت ہے' اس سے مراد شادی شدہ مرد یا شادی شدہ عورت ہے تو فرض کر لیا گیا کہ ہر بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت شادی شدہ ہی ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں' یہ شادی شدہ کے متعلق ہے۔ کہا کہ سورۃ احزاب کے اندر یہ آیت موجود تھی' ہم اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اُس نے کہا کہ اب تو وہ نہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ بھئی! کوئی تحقیق بھی اس کے لیے کی' جو آپ کہہ رہے ہیں؟ یعنی وہ تو چھوڑو کہ 286 میں سے 72 ہی رہ گئیں' وہ باقی 214 کے متعلق بات ہو رہی تھی کہ وہ کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا کہ اُن کو تو چھوڑو' یہ جو تم آیہ رجم کہتے ہو' بڑی مشہور تھی اور کوئی تحقیق بھی ہم میں سے کسی نے کی کہ یہ آیتیں کہاں گئیں؟ یہ تو آیتِ رجم کے متعلق ہے۔ انہوں نے کہا کہ باقی چھوڑو مگر آیتِ رجم کے متعلق ہم نے تحقیق کر لی تھی۔ جب قرآن مجید مرتب کرنے لگے۔ عزیزانِ من! اس قرآن مجید کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (15:9) ہم نے اسے نازل کیا اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ ایمان ہمارا یہ ہے کہ یہ مکمل ہے۔ تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ (6:115) مکمل' غیر متبدل' محفوظ ہے' تبدیل بھی نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے سامنے ہم قرآنِ کریم سے یہ بات پیش کرتے ہیں کہ ایک ہی کتاب اس آسمان کے نیچے ایسی ہے جس کی تحریر میں کوئی زیر زبر کا بھی فرق نہیں ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے محققین اپنی تحقیقات کے بعد اس کی تائید کرتے کہ اس میں واقعی ایک زیر زبر کا بھی فرق نہیں آیا۔

ابن ماجہ ❶ کے مطابق رجم کی آیت کی تفصیل

اب روایات یہ ہیں کہ جب قرآن حمید کو مرتب کرنے لگے تو اس میں یہ دیکھا کہ یہ آیہ رجم تو بڑی آیت تھی' یہ کہاں گئی؟ چلو بھئی! اس کو ڈھونڈیں' سنیوں کی حدیثوں کی چھ کتابیں ہیں' جن کو صحاح ستہ کہتے ہیں یعنی صحیح ترین چھ کتابیں' اُن میں ایک یہ ابنِ ماجہ بھی ہے۔ اس ابنِ ماجہ کے اندر یہ روایت' حدیث موجود ہے کہ ہم لوگ ڈھونڈتے ڈھونڈتے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ میرے بچو! آیہ رجم اور ایک اور آیت تھی کہ بچے کو کس عمر تک دودھ پلانا چاہیے' یہ دوسری بات انہوں نے یہ بھی کہی تھی۔ ہم آیہ رجم کی بات

---

❶ آپ کا اصل نام امام عبداللہ ابن ماجہ ہے۔ آپ نے 273ھ میں وفات پائی۔ آپ کا وطن قزوین تھا۔ آپ نے چار لاکھ احادیث جمع کیں اور ان میں سے اپنے مجموعہ حدیث سنن ابن ماجہ میں صرف چار ہزار درج کیں (ماخوذ از پرویزؒ: شاہکارِ رسالت، ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' 1987' ص۔ 502)۔

کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آیہ رجم اور رضاعت کبیر ایک صحیفہ میں تھیں جو میرے تخت کے نیچے تھا۔ یہ حدیث کی صحیح تریں کتاب ابنِ ماجہ میں ہے۔ حضرتِ عائشہؓ کی زبان سے روایت ہے کہ وہ آیات تھیں، پتہ نہیں وہ کھجور کے پتے کے اوپر عام طور پہ لکھی تھیں، وہ میرے تخت کے نیچے تھا۔ جب رسول اللہؐ کی وفات ہوئی تو ہم لوگ اس حادثے میں مشغول ہوگئے، اتنے میں گھر کی پالتو بکری اندر گھس گئی اور اس صحیفے کو کھا گئی۔ بچو: اب تم اس مصاحف کو کہاں پاؤ گے۔ ہم (شیخ) سعدی (1291-1184ء) کی وہ گلستان بوستان پڑھا کرتے تھے:

آر اگر دو زور اقصاب گرد

کہ وہ جو چیز تھی اس کو گائے کھا گئی اور گائے کو قصاب لے گیا تو اب وہ کہاں ملے گا۔ اب وہ یہ فرما رہی ہیں یعنی وہ ساری آیتیں ایک ہی کو پتہ تھا جس کے اوپر لکھی ہوئی تھیں۔ ایک ہی جگہ تھیں، کسی دوسری جگہ کسی کے پاس نہیں تھیں۔ وہاں وہ بکری آئی اور کھا گئی۔ عزیزانِ من! ایک لفظ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا، حوالے موجود ہیں۔ یہ جو دعویٰ ہے یہ قرآن حمید کے خلاف ہے۔ میں صرف اتنی سی بات کہہ رہا ہوں کہ وہ آیت سورۃ الاحزاب میں نہیں ہے۔ اب یہ قرآن حمید مرتب کرنے لگے تو تلاش ہوئی، گویا ایسا ہوا کہ جب مرتب کرنے لگے تو ایسی سورتیں تھیں، جن میں بعض آیتیں نہیں تھیں یہ آیت تو ابتداء سے بڑی مشہور تھی، اس کی تلاش ہوئی۔ اس کے متعلق پتہ چلا کہ وہ پتے پہ لکھی ہوئی تھی اور اس پتے کو بکری کھا گئی۔

32 جلدوں پر مشتمل تفسیرِ کبیر میں رجم کے سلسلہ میں امام رازی کا فرمان اور حضرت عمر فاروقؓ کا بیان

امام رازی ❶ کی تفسیرِ کبیر بڑی مشہور تفسیر ہے۔ اس میں مزید تفسیر ہے کہ حضرتِ عمرؓ نے کہا کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں ہم خود تلاوت کرتے تھے اور ہم رجم بھی کیا کرتے تھے۔ اُن سے صحابہؓ نے کہا کہ جب کیفیت یہ تھی کہ آپؓ قرآن مجید میں اس کی تلاوت کرتے تھے، اس کے اوپر عمل بھی کیا کرتے تھے تو آج اس قرآن مجید میں اگر یہ آیت یوں نہیں آئی، تو آپؓ خود با اقتدار ہیں، غالباً یہ ان کے زمانہ خلافت (634-644/45ء) کی بات ہوگی، آپؓ خود با اقتدار ہیں، قرآن مجید کی بات ہے، آپؓ خود اس کی شہادت دیتے ہیں کہ آپؓ خود اس کی تلاوت کرتے تھے، صحابہؓ موجود ہیں تو اسے قرآنِ کریم میں داخل کرلیں۔ آپؓ اسے قرآن حمید میں داخل کیوں نہیں کر دیتے۔ عزیزانِ من! اس طرح قرآن مجید ناقص کہا جارہا ہے۔ تفسیر کبیر ہے، اس کی 32 ویں جلد ہے، یہ امام رازی کی بڑی ضخیم کتاب ہے۔

---

❶ یہ وہی ہیں جن کے متعلق مفکرِ قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے کہا تھا:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشاف (اقبالؒ: بالِ جبریل)

اُس میں لکھا ہے کہ حضرتِ عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس آیت کو قرآن حمید میں ضرور درج کر دیتا لیکن ڈرتا ہوں کہ لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے خواہ مخواہ قرآن مجید میں اضافہ کر دیا۔ ''ڈرتا ہوں لوگ کہیں گے۔'' عزیزانِ من! آپ سن رہے ہیں جو میں کہہ رہا ہوں۔ پتہ نہیں آپ سن رہے ہیں یا نہیں!! مجھ سے تو یہ کہا نہیں جاتا۔ انہوں نے کہا کہ پھر اس کی تعمیل کیسے کی جائے؟ آپؓ کہتے ہیں کہ یہ آیت تھی، خدا کا حکم تھا، تو کریں کیا؟ آپؓ نے فرمایا کہ ہم اس آیت کو قرآن مجید میں تو درج نہیں کریں گے لیکن تعمیل اس کی کرتے رہیں گے۔ گویا آپ کے قرآن حمید میں بقول ان روایات کے ایسی آیتیں بھی ہیں جو قرآن کریم میں موجود تو نہیں ہے، عمل ان کے مطابق ہوگا اور اس کے برعکس بھی، میں ایک دوسرا عقیدہ بتا دیتا ہوں۔

قرآنِ حکیم کی سینکڑوں آیات کے منسوخ ہونے کا تصور یا للعجب!!

دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن حمید میں سینکڑوں آیات ایسی ہیں کہ وہ آیات تو موجود ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو گیا ہوا ہے۔ کیا بات ہے اس قرآن مجید کی (معاذ اللہ)۔ سینکڑوں آیات ہیں، حکم منسوخ ہے۔ اس کو ناسخ و منسوخ کا عقیدہ کہتے ہیں۔ جب یہ پہلی دفعہ آیا ہے تو اس میں حکم کی پانچ سو آیات قرآن مجید میں سے گنائی گئی تھیں کہ آیات تو قرآن مجید میں موجود ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہے۔ بھئی! قرآن مجید میں وہ پھر کیوں اللہ تعالیٰ نے رہنے دیں۔ کہنے لگے کہ تلاوت سے ثواب تو ہوتا ہے۔ ''یعنی ساڈا ثواب نہ گھٹ جاوے کسے طراں''۔ [1]

عزیزانِ من! کیا سن رہے ہیں!! کیا آپ پھر کمیشن بٹھائیں گے یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ اُمت اتنی ذلیل و خوار کیوں ہے؟ اس معاملے کے اندر خدا بڑا غیور ہے۔ میری کسی کتاب کے متعلق کوئی ایسا کہے تو اس کے اوپر توہینِ عدالت کا مقدمہ کر دوں۔ وہ بڑا غیور ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ رسول کہیں گے کہ وَقَالَ الرَّسُوۡلُ (25:30) خدا سے یہ فریاد کریں گے کہ یٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَهۡجُوۡرًا [2] (25:30) یا میرے اللہ! یہ میری وہ قوم ہے جس نے اس قرآن کے ساتھ یہ کیا تھا۔ کیا خدا چھوڑ دے گا اس قوم کو؟

رجم کے سلسلہ میں بخاری شریف کی روایت: ایک بندریا کو بندروں نے سنگسار کیا تھا لہٰذا یہ دینِ فطرت ہے

اب آگے پوچھا گیا کہ یہ جو سنگسار کرنے والی بات ہے یہ سزا تو کچھ یہودیوں میں تھی، کہا کہ اس کی تو کچھ علت سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں دلائل بھی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دینِ فطرت ہے جو اسلام ہے۔ آپ کبھی کسی سے پوچھیے کہ اس کے کچھ معنی بھی ہیں؟ یہ جو آپ دینِ فطرت کہتے ہیں، یہ کیا ہے؟ یہی آیہ رجم میں بتاتے ہیں کہ دینِ فطرت ہے۔ بخاری شریف تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ چھ میں سے سب سے اوپر اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ اس بخاری کا تو نام آتے ہی آپ کو معلوم ہے کہ

---

[1] یعنی کسی طرح سے ہمارے ثواب میں کمی نہ آنے پائے۔

[2] اے میرے نشو و نما دینے والے! یہی ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو اپنے خودساختہ معتقدات کی رسیوں سے، اس طرح جکڑ دیا تھا کہ یہ آزادی سے دو قدم چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 821)۔

سارے جھک جاتے ہیں۔ بخاری شریف میں ایک باب ہے باب الجاہلیہ۔ میں ریفرنس اس لیے دے رہا ہوں کہ یہ آپ کو معلوم ہو جائے۔ اردو کا ترجمہ آپ کہیں سے لیں گے تو اس کی دوسری جلد میں 261 صفحہ ہے جس کے اوپر یہ چیز موجود ہے۔ سنیے! یہ رجم یعنی سنگسار کرنا فطرت کے کیسے مطابق ہے۔ اس بخاری شریف میں وہ روایت ہے حضرت عمرؓ بن معمون سے روایت ہے جو زمانہ جاہلیت میں ایک صحابیؓ ہیں کہ میں نے ایک بندریا کو دیکھا جس نے زنا کا ارتکاب کیا تھا۔ یعنی حیوانات میں زنا کا ارتکاب۔ اس نے زنا کا ارتکاب کیا تھا تو سب بندر اس کے گرد جمع ہو گئے اور اسے سنگسار کیا اور میں نے بھی ان کے ساتھ پتھر مارے۔ تو انہوں نے کہا کہ یہ دینِ فطرت ثابت ہو گیا۔

فتویٰ یہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار کفر ہے

بخاری شریف کی یہ روایت ہے۔ مولانا محمد اسماعیل (سلفی) مرحوم (1895-1968ء) جو مرکزی جمعیت اہلحدیث کے امیر تھے وہ گوجرانوالہ میں رہتے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی انسان کو اسلام کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے[1] خدا کے لیے کہیں آپ اس سے انکار نہ کر دیجیے گا۔ یہ ہے بخاری اور مسلم کی حدیثوں کے متعلق یہ عقیدہ۔

سنگسار کے سلسلہ میں تفسیر ''فتح الباری'' کا بیان

جس طرح قرآن مجید کی تفسیریں لکھی جاتی ہیں اسی طرح حدیث کی کتابوں کی تشریح بھی لکھی جاتی ہے۔ وہ روایت یا حدیث چھوٹی سی ہوتی ہے پھر اس کی وہ تفسیر یا تشریح کی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک بخاری کی جو بہترین مستند تفسیر ہے وہ فتح الباری ہے۔ وہ امام ابن حجر اسلانی کی ہے۔ فتح الباری جو شرح بخاری ہے اس کی ساتویں جلد ہے اور صفحہ 121 ہے۔ یہ جو عمرؓ بن معمون کی حدیث یا روایت ہے اس کی شرح میں وہ فرماتے ہیں کہ حضرتِ عمرؓ بن معمون فرماتے ہیں۔ اب اس کی تشریح آئی ہے۔ بات تو انہوں نے یہ کہی تھی کہ میں نے جنگل میں دیکھا تھا کہ ایک بندریا نے زنا کیا تھا اور بندر اس کو سنگسار کر رہے تھے اور میں نے بھی پتھر مارے تھے۔ اس واقعے کی اب جو مزید تفصیلات ہیں وہ اس شرح کے اندر ہیں کہ انہوں نے یہ کہا کہ میں ایک دفعہ یمن میں اپنے ہاں کی بکریاں چرا رہا تھا۔ میں اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے تھوڑی سی معذرت چاہتا ہوں الفاظ کچھ ایسے ہیں جنہیں ایسی مجلس میں کہنا نہیں چاہیے لیکن روایت کے الفاظ ہیں اگر ان کو Miss (چھوڑ) کر جاؤں گا تو الزام عائد ہو جائے گا کہ تحریف کرتا ہے اس میں میں تحریف نہیں کر سکتا۔ ہاں تو میں اس روایت کا ذکر کر رہا تھا کہ میں اپنے ہاں یمن میں بکریاں چرا رہا تھا اور ایک اونچی جگہ پر کھڑا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بندر بندریا کو ساتھ لیے ہوئے آیا اور اس کے ہاتھ کو اپنے سر کے نیچے رکھ کر سو گیا اس کے بعد اس پہلے بندر کے مقابلے میں نسبتاً کم عمر کا بندر آیا اُس نے بندریا کو آنکھ ماری تو

---

[1] اس کے لیے دیکھیے ان کی کتب ''حجیت حدیث آنحضرت کی سیرت کی روشنی میں (1950ء)'' حدیث کی تشریعی اہمیت (1964ء) اور جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث (1967)'' حوالہ سیلچ محمد منیر احمد ڈاکٹر: وفیات ناموران پاکستان اردو سائنس بورڈ لاہور 2006ء ص۔ 697۔

اس نے آہستہ سے بندر کے سر کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اس دوسرے نوجوان بندر کے پیچھے چل پڑی' اس بندر نے اس کے ساتھ مباشرت کی جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا' پھر وہ لوٹی اور پہلے بندر کے نیچے آہستہ سے اپنا ہاتھ دینے لگی لیکن وہ گھبرا کر جاگ اٹھا اور اس نے کچھ محسوس کر لیا چنانچہ اُس نے بندریا کو سونگھا تو سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا' اس نے دہائی مچانا شروع کر دی' اس پر بہت سے بندر جمع ہو گئے' وہ بندریا کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر چیختا رہا' چنانچہ وہ بندر اِدھر اُدھر دوڑے اور اُس مجرم بندر کو پکڑ کر لے آئے جسے میں پہچانتا تھا' انہوں نے ان دونوں کے لیے گڑھا کھودا اور پھر انہیں سنگسار کر دیا۔ اور جیسا کہ روایت میں یہ کہا ہے کہ میں نے بھی پتھر مارے تھے۔ یہ اس بندر کو پہچانتے بھی تھے۔ یہ خود ایک صحابیؓ کا واقعہ ہے' آپ کی صحیح بخاری میں موجود ہے۔ اب اس کے بعد سند کی اور ضرورت کیا رہے گی کہ یہ دینِ فطرت تھا۔ اس لیے یہاں سے ہی ہمارے ہاں پھر یہ چیز ہوئی کہ رجم کیا کرتے تھے۔ یہ ہے عزیزانِ من! قرآنِ کریم کی وہ سند جو کہتے ہیں' رجم کا یہ حکم قرآن مجید میں ہے' حدیث میں ہے' فقہ میں ہے' اجماع میں ہے۔ میں نے کہا ہے کہ میرا مقصد کچھ اور نہیں ہے' میں تو قرآن مجید کا طالبعلم ہوں۔ قرآن مجید کی جو سند ہے وہ پیش کرتا ہوں' تو وہ سند یہ ہے۔

رجم کے بارے میں عدالت کے فیصلے کے خلاف علما حضرات کی آہ و فغاں تا کہ تم قرآن مجید پر غالب آ جاؤ

اس کے لیے جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' یہ (حضرات علمائے کرام) اپنے ہر پرچے میں' اس کے متعلق صفحے کے صفحے کالے کیے جا رہے ہیں۔ مطالبہ یہ کیا جا رہا ہے کہ ان ججوں کو وہاں سے ہٹاؤ' ان کے ساتھ دوسرے علمائے کرام کو رکھ دو' فیصلے کو منسوخ کر دو۔ کہا جا رہا ہے کہ اس کے خلاف اپیل دائر کر دو اور وہ پچھلے جمعہ کو ملک کے ہر مسجد کے خطبے میں تو یہ ہوا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ آیا یہ سلسلہ جاری رکھا جائے گا؟ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اس کے متعلق دہائی مچا دو کہ **لَا تَسۡمَعُوۡا لِهٰذَا الۡقُرۡاٰنِ** (41:26)۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ جو قرآن مجید ہے' اسے خود سنو ہی نہیں' اس کے قریب نہ جاؤ' اور یہ بات تو بہر حال جب تک کر سکتا ہے' کرے گا' یہاں کہا ہے کہ **وَالۡغَوۡا فِيۡهِ** (41:26)۔ اس نقار خانے میں ایسے ڈھول بجاؤ کہ اس کی آواز کوئی سنے ہی نہیں۔ اس طرح امید ہو سکتی ہے کہ **لَعَلَّكُمۡ تَغۡلِبُوۡنَ** (41:26) تم ان لوگوں پر غالب آ جاؤ۔ قرآن مجید پہ غالب آ جانے کے لیے یہ تدبیریں اختیار کر رہے ہیں۔

میرا نہ تو کوئی مذہبی فرقہ ہے' نہ ہی کوئی سیاسی پارٹی اور نہ ہی مجھے معتقدین کی ضرورت ہے: پرویزؒ

عزیزانِ من! پرویز[1] کا اس میں کیا ہے' خدانکردہ قرآن حمید میری کتاب تو ہے نہیں کہ مجھے اس کو ضرور محفوظ رکھنا ہے' بکری (Sale) بند ہو جائے گی اگر انہوں نے شور مچایا۔ (خدانکردہ) میرا اس میں کوئی کاروبار نہیں ہے کہ یہ کتابیں نہیں بکیں گی۔ میری کوئی پارٹی نہیں کہ ممبر کم ہو جائیں گے' میرا کوئی فرقہ نہیں کہ معتقدین نہیں رہیں گے۔ میں نے تو اپنے سینکڑوں ہزاروں معتقدین کو خود گلے سے اتار دیا تھا۔

---

[1] پرویزؒ (1903-1985ء)

جو قوم اپنے محسنوں کو فراموش کر دے، قدرت ان میں محسن پیدا کرنے بند کر دیتی ہے: بھائی کی خدمات کا کچھ تذکرہ

آپ احباب کو تو اس کا علم نہیں ہے، میرے بڑے ❶ بھائی پاکستان کی تحریک کے مجاہدِ اول بیٹھے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کی عمر کو سلامت رکھے۔ بعد میں پتہ چلے گا کہ انہوں نے کیا کیا کارنامے کیے ہوئے ہیں۔ کیا بات ہے وہ میر کا شعر یونہی ذہن میں آ جاتا ہے!

شریفِ مکہ رہا ہے کئی برس اے شیخ
یہ میر اب جو گڑھا ہے شراب خانے کا

یہ ایک ضعیف بوڑھا سا فرد ہے جس سے اب نہ سنا جاتا ہے، نہ چلا جاتا ہے۔ اگر میں ان کی تاریخ لکھوں کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کے دوران کتنے کتنے خطرات مول لیتے ہوئے، کیا کچھ کیا تھا، تو آپ کو ان کا اصل مقام معلوم ہوگا، بہرحال اس تحریک میں تھے تو ہم دونوں ہی اکٹھے۔ اب دیکھ لو ان کی شکلیں کہ پھر نہ دیکھو گے، ہم لوگ چلے جانے والے ہیں۔ اور میں یہ بھی کہوں گا کہ قرآن حمید کی یہ آواز سن لو کہ شاید اس کے بعد کوئی سنانے والا بھی نہ ملے۔ اس قرآن حمید کی آواز کے خلاف آج آپ کے پورے ملک میں یہ ہو رہا ہے۔

قرآن کریم کو ناقص ثابت کرنے کے لیے حضرت عمرؓ کی تائید (معاذ اللہ) اور قرآنِ کریم کا فیصلہ

اس قرآن کریم کے متعلق آپ غیروں کو کیا تصور دے رہے ہیں کہ یہ ناقص ہے (معاذ اللہ) صحابہ کبارؓ میں حضرت عمرؓ (581-644/45AD) جیسے صحابہؓ کی تائید لا رہے ہیں کہ ہم اس آیت کی تلاوت کرتے تھے۔ تو لکھ کیوں نہ دی۔ جنہوں نے قرآن کریم جمع کیا ہے انہوں نے بھی اس کے اندر نہیں لکھا۔ ان سے کہا تو وہ کہنے لگے کہ ''میں ڈرتا ہوں کہ لوگ کہیں گے کہ اس نے خواہ مخواہ اس میں اضافہ کر دیا''۔ یہ ہے وہ قرآن کریم جس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا تھا۔ اور اس سے یہ اس چیز کی سند لا رہے ہیں کہ قرآن کریم میں بھی رجم کا حکم تھا۔ **وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ** (41:26)۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم کا فیصلہ کیا ہے؟ پتہ نہیں، اپیل کا فیصلہ تو کیا ہوگا، یہ تو قرآن مجید کا فیصلہ ہے کہ **فَلَنُذِيْقَنَّ** (41:27)۔ عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کے اندر جب ف ل (فل) آیا ہے تو پھر یہ اس کا نتیجہ ہوگا۔ وہ نتیجہ کیا ہوگا؟ کہا کہ **فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِىْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (41:27) قرآن مجید سے اس طرح کفر برتنے والوں کو تم دیکھو گے کہ کس قدر شدید قسم کی تباہی کا عذاب ان کے اوپر مسلط ہوتا ہے۔

---

❶ یہ اشارہ شیخ سراج الحق مرحوم کی طرف ہے۔ وہ 15 جون (یعنی اتوار۔ سوموار کی شب) 1981ء کو ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ اپنے سحابِ کرم کے سایہ میں رکھے۔

یہ ان کی اپنی بداعمالیوں ہی کا بدلہ ہوگا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اَلْخِزْیِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (10:98) اس دنیا کی زندگی کے اندر بھی ذلت اور رسوائی۔

دنیا کے اندر آج کے دور میں مسلمانوں کی حالتِ زار: تباہی اور بربادی کا جہنم

یہ تو الگ بات ہے کہ اب ہماری غیرت اور حمیت یہ ہوگئی ہے۔ ہم اس رسوائی اور ذلت کے عادی ہوگئے ہیں۔ اسے اب محسوس ہی نہیں کرتے کہ ذلت اور رسوائی بھی ہے جو ہو رہی ہے۔ عادی ہی نہیں ہوگئے ہیں بلکہ کچھ ڈھیٹ ہوگئے ہیں۔ اس نے کہا کہ پروپیگنڈہ کرنے والے لوگوں کو دیکھو کہ جی! اس کو وہاں جوتے [1] پڑے۔ کہنے لگے کہ لوگوں کو دوسروں کے خلاف الزام تراشتے شرم نہیں آتی' تہمت تراشتے ہو۔ وہاں اتنے جوتے پڑے تھے۔ ہماری بے حمیتی کی بھی یہ کیفیت ہوگئی ہے کہ اب محسوس ہی نہیں ہو رہا کہ ہم ذلیل وخوار ہوگئے ہیں [2]۔ یہ ہے اَلْخِزْیِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (10:98) وہ قوم جو ہمارے قرآن کریم کے ساتھ یہ کر رہی ہے اسی زندگی میں ذلیل وخوار ہوجائے گی۔ یہ چیز کچھ انہی سے مختص نہیں ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ذٰلِکَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰہِ النَّارُ (41:28) اور یہ تمہارے نہیں یہ خدا کے دشمن ہیں۔ جو لوگ بھی نظام خداوندی کی مخالفت کرتے ہیں ان کا انجام تباہی اور بربادی کا جہنم ہوتا ہے۔

خدا کے دشمن بنے رہو مگر اس کی کتاب کے دشمن نہ بنو

عزیزانِ من! جہاں بھی قرآن مجید کے اندر بات آئے گی' تو سن رکھو کہ ہمارے ساتھ خدا کا جو کچھ تعلق ہے وہ تو اس کتاب کے ذریعے ہوگا۔ براہِ راست تو اس کے ساتھ ہمارا کچھ تعلق نہیں ہے۔ یہی قرآن مجید ذریعہ ہے۔ جسے قرآن مجید خدا کے دشمن کہتا ہے تو وہ خدا کا دشمن کون ہوگا؟ خدا کی دشمنی کیا کرلے گا؟ خدا کا کیا بگاڑ لے گا؟ دراصل یہ اس کی کتاب (قرآن مجید) کے دشمن ہیں جس کے ساتھ یہ کچھ کرتے ہیں۔ کہا کہ لَھُمْ فِیْھَا دَارُ الْخُلْدِ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ (41:28) یہ لوگ ہمارے قرآن مجید کی آیات کے ساتھ یہ کچھ کرنے والے نہیں۔ یہ کفر نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یہ قرآن مجید نے کہا۔ کافر تو وہ ہیں جو اپنے آپ کو اعلانیہ غیر مسلم کہہ کر یہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں مانتے کہ یہ قرآن کریم خدا کی کتاب ہے۔ اس کے حقیقت پر مبنی نہ ہونے سے' اس کے حقائق کی صداقت کو نہ ماننے سے' جو کسی کو نقصان ہوتا ہے تو ایسا ہی ہے جیسا کوئی کہے کہ نہیں صاحب! میں نہیں مانتا کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے۔ یہ ہے انکار قرآن کریم کی آیت کا' یہ ہے کفر حقیقت کا۔ سنکھیا کھا لیتا ہے تو وہ مرجاتا ہے۔ یہاں یہ کہا ہے کہ یہ جو مسلمان نام رکھانے والے ہیں' یہ کفر کی

---

[1] گدا سمجھ کے وہ چپ تھا' مرے جو شامت آئی اُٹھا' اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے (غالب)

[2] آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی (غالب)

بات نہیں ہے کہ اعلانیہ یہ کہہ دیں کہ ہم اس کو مانتے نہیں۔ مانتے تو ہیں لیکن یہ کرتے' اس طرح سے ہیں۔ یہ اس قسم کی ڈھٹائی کی باتیں' ضد کی باتیں ہیں' یہی بات ہے کہ اس کو سنو نہیں' کہیں اس کی آواز بلند ہوتی ہو تو شور مچا دو۔ یہ سب کچھ اس قرآن کریم کے اندر آتا ہے۔ تو یہ ہیں وہ لوگ۔

یہ بڑے بڑے دوسروں کے علاوہ عوام کو بھی لے ڈوبتے ہیں

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ❶ (41:29) یہ عوام بیچارے تو ہمیشہ ان بڑے بڑوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں' تو یہ خود تو ڈوبتے ہیں' اپنے ساتھ ان کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ کہا کہ جب وہ وقت آئے گا' جب ان عوام کو پتہ چل جائے گا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا تھا' تو یہ خدا سے فریاد کریں گے کہ یا اللہ! ذرا ان کو ہمارے سامنے لا' یہ جو بڑے بڑے ہمارے ہاں کے معتبر لیڈر مقتدرہ پیشوا بنے پھرتے تھے' جنہوں نے اس طرح سے ہمیں گمراہ کیا' انہیں ہمارے سامنے ایک دفعہ لا اور دیکھ کہ ہم کس طرح ان کو اپنے پاؤں کے نیچے روندتے ہیں' انہوں نے ہمیں ساری دنیا کے اندر ذلیل کرایا' ہم ان کو خود ذلیل کریں گے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ یہ کیا۔ یہ تصویر کا ایک رخ تھا۔

قرآن کریم کسی کو ناامید نہیں ہونے دیتا لیکن اس کے لیے رَبُّنَا اللّٰہ کی ایک شرط

قرآن کریم کا انداز بڑا عجیب ہے۔ جہاں وہ اس قسم کی دل سوز باتیں کرتا ہے جس میں انسان کا جگر واقعی کباب ہو جاتا ہے تو وہ فوراً دوسری سائیڈ ایسی لاتا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ وَ لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ❷ (12:87) ناامید نہ ہو اور وَلَا تَحْزَنُوْا (3:138) غم نہ کر۔ زندگی کا دوسرا پہلو بھی ہے' اس پہلو کا امکان بھی ہے' اسے اختیار کر۔ اب ادھر (41:29) میں حق وصداقت سے انکار کرنے والوں کی بات شدت سے کہنے کے بعد' دوسری طرف اس کے برعکس کہا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (41:30) جنہوں نے ایک دفعہ علیٰ وجہ البصیرت' علم وبصیرت' دانش وبصیرت' کی بنا پر دیکھ کر' پرکھ کر' یہ کہہ دیا کہ ہاں! یہ ہمارا رب اللہ ہے۔ کیا بات ہے! کیا اعلان ہے کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے! جو اس نتیجے پر پہنچ گئے' تو ہم آپ تو کہیں گے' بڑی آسان سی بات ہے کہ وہ رَبُّنَا اللّٰهُ (41:30) کہہ دیا پھر راوی عیش لکھتا ہے۔ اس میں پھر مشکل کونسی بات ہے۔ ایک دفعہ کہا کہ ہزار ہزار دانے کی تسبیح بنی ہوئی ہے' اس کے اوپر ربنا اللہ کہتے رہتے ہیں۔ کہا کہ نہیں' یہ اتنی آسان منزل نہیں ہے:

---

❶ اور اس وقت وہ لوگ' جنہوں نے ہمارے قوانین سے انکار کیا تھا کہیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! اپنوں اور بیگانوں میں سے' جن لوگوں نے ہمیں غلط راستے پر ڈالا تھا' انہیں ہمیں دکھا تا کہ ہم انہیں اپنے پاؤں تلے روندیں اور وہ سب سے زیادہ ذلیل وخوار ہوں۔ (اس طرح ہمارے انتظام کی آگ کچھ تو ٹھنڈی ہو)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1115)۔

❷ رحمتِ خداوندی کی نسیم جانفزا سے کبھی مایوس نہ ہو (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔542)۔

یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے

تم ایک دفعہ اعلان کر کے یہ دیکھو کہ ہم تم میں سے کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ اس ربنا اللہ کے معنی یہ ہیں۔ جو ربوبیت ہے یعنی سامانِ نشوونما کا ملنا' روٹی ملنا' رزق ملنا' تو مستبد کا سب سے بڑا حربہ یہی ہوتا ہے' فرعون کا یہی جرمِ عظیم قرآن کریم نے گنایا ہے کہ وہ کہتا تھا کہ **اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰى** (79:24) [1] موسیٰ! کیا تم اس قوم کو ورغلانے آگئے کہ میں رب نہیں' رب کوئی انسان نہیں' رب صرف وہ (اوپر والا) ہے۔ کسی کو رب مان لینے سے تو جو اگلے نتائج ہیں' Consequences (عواقب) ہیں' وہ اس کے سامنے آجاتے ہیں۔ یعنی فرعون نے یہ کیوں کہا تھا کہ میں تمہارا ربِ اعلیٰ ہوں اور کہا تھا کہ بتاؤ یہ نہریں کس کی ہیں' یہ ملک کس کا ہے' یہ زمینیں کس کی ہیں۔ تو جو رب بنتا ہے تو وہ تو سب اس کی ہوتی ہیں کیونکہ ربوبیت کا سامان تو اس میں سے نکلتا ہے۔ وہ اس پہ اپنی ملکیت جماتا ہے۔ اور جب ان تمام سامان و ذرائع ربوبیت کو' پرورش کو' اپنے قبضہ میں رکھ لیا تو ساری دنیا محتاج ہوگئی۔ آپ نے دیکھا کہ ایک لفظ میں پھر وہ اعلان کیا کرتے ہیں؟ یہ کہ **رَبُّنَا اللّٰهُ** (41:30) یہ بات نہیں کہ ہماری طرح سے یہ ہو۔ وہ ایمان والے ہو جاتے ہیں کہ صبح اٹھ کے **لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ** کہہ دیا۔ جو ربنا اللہ کہنا ہے وہ تو

چوں می گویم مسلمانم بلرزم

اقبال رحمۃ اللہ علیہ کہتا ہے کہ جب میں ایک دفعہ کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں:

کہ دانم مشکلاتِ لا الہ را

میں جانتا ہوں کہ لا الہ کی مشکلات کیا ہیں۔ یہی ہے ربنا اللہ۔ یعنی اللہ اور صرف اللہ واحد کو یہ ماننا کہ یہ اقتدار' یہ سرچشمہ رزق' یہ سارا کچھ اس کے اور صرف اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ دنیا سے ہر خدا کی نفی کر دیتا ہے۔ تو کونسا خدا اس کو برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی اتنی بڑی مملکت' اتنی بڑی ریاست' چھین کر کسی اور کو دیدی جائے۔ اسی لیے ربنا اللہ کہا تو کہنے کے بعد پھر جو یہ راستہ ہے' یہ اتنا دشوار گزار ہے کہ کہا **ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا** (41:30) پھر اس پر جم کر کھڑے ہوگئے۔ یعنی قرآن مجید نے کچھ نہیں کہا کہ اس راستے میں کیا مشکلات آئیں گی' ویسے وہ بڑا Simple سا ہوتا ہے کہ انہوں نے ربنا اللہ تو کہہ دیا۔ یہ اگلا ایک لفظ ہے جس میں قرآن مجید سب کچھ کہہ گیا ہے کہ **ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا** (41:30)۔ سہل گزار راستوں کے اندر تو **ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا** (41:30) کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ اس **ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا** (41:30) کو زندگی کا نصب العین قرار دیا۔ اس ایک ربنا اللہ کہنے سے دنیا کے جتنے رب تھے' سارے کے سارے' ان کی رہبانیت' ان کی ربوبیت یا حاکمیت یا فرعونیت

---

[1] تمہاری پرورش میں کرتا ہوں (کھانے پینے کو میں دیتا ہوں۔ میں تمہارا ''ان داتا'' ہوں) اس لیے تمہارا سب سے بڑا رب میں ہی ہوں۔ (یہ جو موسیٰ کہتا ہے کہ تمہارا نشوونما دینے والا خدا ہے' یہ غلط ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1410)۔

سب ختم کر دی۔ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (41:30) یعنی پھر اس کے بعد جم کر کھڑے رہو، جو ہوتا ہے سو ہو۔ پھر اس کے بعد وہ ساری دنیا کو چیلنج دیدیتے ہیں:

اِدھر آ پیارے ہنر آزمائیں
تُو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

لا الٰہ کہنا تو آسان ہے مگر ماننا مشکل ہے اور ہم کیا سمجھیں نزولِ ملائکہ

کہا کہ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (41:30) پھر پاؤں کے اندر کہیں لغزش نہیں آتی۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ کہا کہ پھر تَتَنَزَّلُ عَلَيۡهِمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ (41:30) ان پر فرشتوں کا نزول شروع ہو جاتا ہے۔ عزیزانِ من! ہم قرآن حکیم سے بیگانہ ان الفاظ ہی کو پڑھ سکتے ہیں، ہمیں کیا پتہ کہ ملائکہ کا نزول کیا کیا کرتا ہے لیکن میں اتنا عرض کر دوں کہ وہ کرتا کیا ہے۔ یہ الفاظ میں پھر بعد میں آپ کے سامنے پیش کرونگا۔ قرآن حکیم نے یہاں صدرِ اول کے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ کیا تمہیں یاد ہے وہاں اس مقام میں، جب تم اس قسم کی مشکلات میں گر گئے تھے کہ تمہاری جان حلق تک آ پہنچی تھی، ایسے میں ہم نے کیا کیا تھا؟ یہ کہ ایسے میں ملائکہ کا نزول کیا۔ سورۃ انفال میں بدر کے میدان ❶ کے متعلق (8:9-10) میں ہے کہ بدر کے میدان میں واقعی ایسا مرحلہ آ گیا تھا کہ کوئی اور ہوتا، کوئی اور فوج ہوتی، تو ان کے پایہ استقلال میں یقیناً لغزش آ جاتی۔ یہ تین سو نہتے، لٹے پٹے ہوئے، آ کے دوسروں کے ہاں پناہ لی ہوئی ہے، بے ساز و سامان ❷ ہیں اور مقابلے میں ایک ہزار کا لشکر ہے۔ اس زمانے میں پوچھو نہیں کہ ایک ہزار اور وہ بھی قریش جیسے جنگجو سارے سامان سے لیس ❷ ہیں۔ وہ آ کر ان کے اوپر حملہ آور ❶ ہو گئے تھے۔ ان کے پاس کیا تھا؟ ایسے میدان میں، ایسے مقابلے میں، یہ تھے۔ ایسے وقت میں قرآن حکیم نے یہ کہا تھا کہ تم نے ہمیں مدد کے لیے پکارا۔ میں پھر ان کی تشریح دوسرے وقت میں کرونگا تو بھی الفاظ ہی دہرائے جاتا ہوں کیونکہ مجھے بتانا ہے کہ نزولِ ملائکہ کرتا کیا ہے۔

مشکل اوقات میں دل کا مطمئن ہو جانا قدموں میں استقامت کا باعث بنتا ہے

سورۃ انفال میں کہا کہ کوئی بات نہیں، سنو اَنِّىۡ مُمِدُّكُمۡ بِاَلۡفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ مُرۡدِفِيۡنَ (8:9) یہ مقابل میں ہزار آئے ہیں، تم تین سو ہو۔ ہزار تو ہم اپنی طرف سے بھیج دیں گے" تے اوتے اپنا نال جُتھ لین گے نا تے تین سو تُسی رہوگے وادھو تے تُسی غالب آ جاؤ گے"۔ ❸ کیسا عمدہ ہے انداز اس کا! کہا کہ یہ کیا تھا جو ہم نے ان سے کہا تھا۔ یہ کاہے کے لیے کہا تھا؟ ہمارے ملائکہ کیا کرتے ہیں؟ کہا کہ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشۡرٰى وَلِتَطۡمَئِنَّ بِهٖ قُلُوۡبُكُمۡ (8:10) یہ ہم نے وعدہ کیا تھا اور تمہیں تو ہمارے وعدوں پہ

---

❶ 17 رمضان 2ھ (مطابق 31 مارچ 624ء کی صبح بدر کے میدان میں دو صفیں ایک دوسرے کے سامنے نبرد آزما تھیں۔

❷ جاں نثاروں کی یہ کل جماعت تھی اور بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ ان کے ساتھ کل دو گھوڑے تھے۔
یہ قریش مقابلے میں بڑے کروفر اور شان و شوکت سے نکلے تھے۔ ہزار سپاہیوں کی جمعیت، سو سواروں کا رسالہ، تمام رؤسائے قریش (باستثنائے ابولہب) شریکِ فوج۔ رسد کا یہ انتظام کہ دس دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے تھے (پرویزؒ: معراجِ انسانیت، ادارہ طلوعِ اسلام، کراچی، 1949، ص۔ 516۔

❸ پھر وہ اس جنگ میں ان سے نمٹ لیں گے اور تمہاری یہ تین سو کی نفری اضافے میں رہے گی اس لیے تم غالب آ جاؤ گے۔

یقین ہے۔ہم نے اس لیے کہا تھا کہ تمہیں اس بات کی بشارت مل جائے کہ کامیابی ہماری ہوگی اور تمہارے دل مطمئن ہوجائیں گے۔ مشکل اور مصیبت کے وقت میں دل کا اطمینان اور سکون بڑی چیز ہوتی ہے۔اس کا تو پوچھو نہیں۔ پھر کوئی اس کو شکست دے ہی نہیں سکتا۔ آگے کہا ہے کہ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (8:12) ہم نے ملائکہ سے یہ کہا کہ تم نے ان کے دلوں کو اس طرح سے مطمئن کرنا ہے کہ وہ اپنے مقام پہ ثابت رہیں' ان کے دل ڈول نہ جائیں۔

ہمارے ہاں 1965ء کی جنگ کے وضع کردہ افسانے اور جنگ بدر و اُحد میں نزولِ ملائکہ سے طمانیتِ قلب

عزیزانِ من! یہ ہے جو ملائکہ کیا کرتے ہیں۔وہ آ کر گولیاں نہیں چلایا کرتے۔مگر انہوں نے 1965ء [1] کے شہدا کے کارناموں کو افسانے بنا دیا۔وہ کہتے ہیں کہ وہ (دریائے) راوی کے پل پر سفید گھوڑیاں اور سبز عمامے لے کر آئے' ہندوستان والے جو گولے پھینکا کرتے تھے وہ ان کی طرف سے پھینکے گئے گولے بارود کو پھٹنے سے پہلے ہی اٹھا کر راوی میں پھینک دیتے تھے یعنی یہ گولے بھی نہیں پھینکتے تھے۔قرآن مجید نے کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔تیر تو تمہی چلاتے تھے۔ملائکہ کے نزول سے سب سے بڑی چیز جو ہوتی ہے' وہ یہ ہے کہ وہ دل نہیں ڈولنے دیتے۔وہ اطمینان قلب عطا کر دیتے ہیں' جمعیت خاطر عطا کر دیتے ہیں۔یہی ہے جس سے انسان کی استقامت ہوتی ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟ یہ میں کسی دوسرے وقت عرض کرونگا۔آج کی جو تحقیق ہو رہی ہے اس کی روشنی میں عرض کرونگا لیکن یہ دوسرے وقت کی بات ہے۔ یہ بدر [2] کے میدان کی بات تھی اور [3] اُحد کے میدان میں تو اس سے بھی زیادہ نازک مرحلہ آ گیا ہوا تھا۔وہاں تو واقعی اُن تیر اندازوں کے لشکر کے ایک طرف ہٹ جانے سے میدانِ جنگ میں' شکست ہی ہو گئی تھی۔خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں زخمی ہو گئے

---

1. یہ انڈو پاک کی جنگ کی طرف اشارہ ہے جو ستمبر 1965ء میں لڑی گئی۔ 1965ء کے ان افسانوں کے لیے دیکھیے: پرویز: (i) شہدائے جنگِ ستمبر 1965ء طلوع اسلام (10:27)' اکتوبر 1974ء' ص ص 25 تا 47 (ii) شہدائے جنگِ ستمبر 1965ء کی یاد میں' طلوع اسلام (9:30)' ستمبر 1977ء ص ص۔ 41 تا 56 (iii) ان کارناموں کو افسانے نہ بنا دیجیے' طلوع اسلام (11:18)' نومبر 1965ء' ص ص 25 تا 36 (iv) ان کارناموں کو افسانے نہ بننے دیجیے' طلوع اسلام (9:20) ستمبر 1967ء' ص ص 49 تا 60 (v) شہدائے جنگ ستمبر 1965ء کی یاد میں' طلوعِ اسلام (9:31)' ستمبر 1978ء ص 18 (vi) شہدائے جنگِ ستمبر 1965ء کی یاد میں: ان کارناموں کو افسانے نہ بننے دیجیے' طلوع اسلام (9:31) ستمبر 1978ء ص ص 21 تا 35 (vii) شہدائے جنگِ ستمبر 1968م کی یاد میں: پاکستان کی نئی زیارت گاہیں' طلوعِ اسلام (9:31)' ستمبر 1978ء' ص ص 36 تا 69 (viii) شہدائے جنگ ستمبر 1965ء کی یاد میں شہر کے لوگ' طلوع اسلام (9:31)' ستمبر 1978ء' ص ص 18 تا 20۔
2. سترہ رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء کی صبح بدر کے میدان میں دو صفیں ایک دوسرے کے سامنے نبرد آزما تھیں اور دنیا میں اس حقیقت کبریٰ کا اعلان کر رہی تھیں کہ انسانی تقسیم و قومیت کا صحیح معیار کیا ہے؟
3. جنگ اُحد 14 شوال 3ھ مطابق 29 مارچ 625ء کو مدینہ سے ڈیڑھ دو میل باہر کوہِ احد کے قریب لڑی گئی۔

تھے' وہاں بھی ملائکہ بھیجے تھے(3:125)۔ وہاں مقابلے میں جو لشکر تھا' وہ پانچ ہزار کا تھا۔ وہاں کہا ہے کہ **یُمِدَّکُمۡ رَبُّکُمۡ بِثَلٰثَةِ الٰفٍ** (3:124) وہ پانچ ہزار ہم اپنی طرف سے بھیج دیں گے۔ کیوں؟ اس لیے کہ **وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشۡرٰی لَکُمۡ وَ لِتَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُکُمۡ** ❶ (3:126)۔ وہی انداز ہے۔ اس سے مقصد یہی تھا کہ تمہیں یہ یقین ہو جائے کہ کامیابی ہماری ہے' بشارت ہم دیدیتے ہیں اور پھر تمہارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو جائے۔

قرآنِ حکیم کا فرمان ہے کہ فرشتے نظر نہیں آیا کرتے البتہ قلبی سہارا دیتے ہیں اور یہ سلسلہ اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے

ان دونوں مقامات میں قرآن حکیم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ فرشتے نظر نہیں آیا کرتے۔ کیا بات ہے قرآن حکیم کی بھی صاحب! اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ماہرِ نفسیات سے کہا ہے کہ یہ تمہاری تحقیق کا میدان (Field of Specialization) ہے یہ جو Physicists (ماہرین علم طبیعات) ہیں' جو محسوس چیزوں کو دیکھنے والے ہیں' یہ ان کا میدان نہیں ہے۔ افسانہ گروں نے کہا یہ ہے کہ وہ نظر آیا کرتے۔ اب یہاں کہا ہے کہ **اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡهِمُ الۡمَلٰٓئِکَةُ** (41:30) جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے' پھر اپنے اس ایمان پر' جم کر کھڑے ہو گئے' ان پہ ملائکہ کا نزول ہوا کرتا ہے۔ وہ ملائکہ کیا کرتے ہیں؟ کہا کہ **وَ اَبۡشِرُوۡا** (41:30) بشارت دیتے ہیں' خوشخبری دیتے ہیں' بڑا اچھا مژدہ سناتے ہیں۔ استقامت میں یہ آتا ہے کہ جب پاؤں میں لغزش پیدا کرنے والے مقامات آتے ہیں' تو یہ ملائکہ آ کر ان کو بشارت دیتے ہیں' یہ کہتے ہیں کہ **اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا** (41:30)۔ خوف نہیں کھانا۔ حزن نہیں کھانا۔ باہر کے خطرات کے مقابلے میں خوف ہوتا ہے اور جس میں انسان کا دل ڈوبا جاتا ہے' حزن ہوتا ہے' کہا یہ ہے کہ باہر سے بھی کوئی خطرہ نہیں اور دل میں ایسے خیال نہیں لانا جس سے تمہیں حزن پیدا ہو جائے' افسردگی پیدا ہو جائے' دل ڈوبنے لگ جائے۔ ملائکہ آ کر یہ کرتے تھے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ جو بھی ہمت کر کے **رَبُّنَا اللّٰهُ** کہہ دے گا تو اس کے بعد ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ وہ آ کر اس چیز کی بشارت دیتے ہیں کہ نہ خوف ہے نہ حزن ہے۔ **وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّةِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ** (41:30) جنت کا وعدہ خدا نے کیا ہوا ہے' یہ یونہی ایسے ویسے نہیں کیا' کہ کیا ہے وعدہ تو مکر جاؤ گے۔ وہ آ کے اطمینان دلاتے ہیں کہ خدا کے وہ وعدے سچے ہوتے ہیں' وہ ملائکہ ان سے کیا کہتے ہیں؟ پھر وہی بات میں جو میں عرض کیا کرتا ہوں'

---

❶ تمہارے دلوں میں پوری طمانیت پیدا ہو جائے گی اور فتح و ظفر کی خوشخبریاں تمہارے لیے باعثِ تقویت بن جائیں گی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔152)۔

عزیزانِ من! کہ ایمان واعمالِ صالحہ یا خدا کے یہ جو وعدے ہیں وہ بات یہیں سے شروع ہو جاتی ہے اور اسی زندگی سے آگے بڑھتی ہوئی پھر وہ آخرت تک جاتی ہے۔ کہا ہے کہ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (41:31) ہم تمہارے ساتھی ہیں، مددگار ہیں، چارہ ساز ہیں، اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

حضرت نظام الدینؒ کے ساتھ ولی کے بجائے لفظ اولیا کا استعمال

دیکھیے! یہاں (41:31) میں اولیاء کا لفظ آیا ہے۔ اسی سے ولی کا لفظ ہے۔ یہ ولی کا یا اولیاء کا لفظ بڑا جامع ہے۔ عزیزانِ من! میں قرآن کریم کے ولی اور اولیاء کی بات کر رہا ہوں، میں کسی حضرت جی کی بات نہیں کر رہا۔ ہمارے ہاں کے لوگ بھی عجیب لوگ ہیں کہ حضرت نظام الدینؒ اولیاء کہتے ہیں جبکہ اولیاء تو ولی کی جمع ہے۔ یہ حضرت نظام الدین ایک ہی ہیں تو ان کو ولی اللہ کہیے۔ مگر نہیں جی، یہ اولیاء ہیں۔

خدا کی طرف سے ملی ہوئی ''ولایت'' کا نتیجہ تصور سے بھی زیادہ ثمر بار مگر اس قدر نوازشات کرنے کے باوجود دینے والے کا جی نہیں بھرتا

بہرحال اس (41:30) میں فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کے سلسلے میں ان کے اولیاء ہونے کا پہلے لیجیے۔ اب سوال یہ ہے کہ اُن کی جوان کے ساتھ چارہ سازی ہے، جو ان کی ولایت ہے، جو ان کے ساتھ رفاقت ہے، اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ [1] (41:31) عزیزانِ من! کیا تصور کی دنیا میں بھی انسان اس سے آگے جا سکتا؟ کہا کہ وہ سب کچھ ملے گا جو مانگو گے، یہ بات بھی نہیں ہے کہ جو مانگو، وہ سب کچھ ہوگا، جو چاہو گے ملے گا۔ تدعون کہہ کر ذہن میں یہ آیا کہ اس میں پھر بھی کچھ تھوڑی سی سُبکی سی ہوتی ہے کہ مانگا تو ملا، اس لیے فوراً کہا کہ انہیں نہیں، جو چاہو گے، ہوگا۔ جو مانگو گے ملے گا، اور یہ اتنی سی بات ہی نہیں۔ اگر آپ کو یاد ہے تو اچھا ہے، ورنہ دوبارہ یہ حوالے، جو آپ کے سامنے آتے ہیں، لکھ لیجیے۔ یہاں ہم نے یہ کہا ہے کہ دل میں بھی جو مانگو گے، وہ ملے گا۔ پھر خود ہی یہ کہا کہ تمہارا چاہنا کیا اور تمہارا مانگنا کیا، زیادہ سے زیادہ کیا مانگ لو گے!! وہاں تو کہا ہے کہ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا (50:35) جو چاہیں گے ملے گا اور آگے ہے کہ وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (50:35) اور ہمارے پاس تو اس سے بھی زیادہ ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ قرآن کریم یہ کتنی بڑی بات کہہ گیا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ تم تنگ ذہنیت رکھنے والے ہو، تم محدود نظریات رکھنے والے ہو، تمہاری مانگ بھی تو ویسی محدود سی ہی ہوگی، لیکن ''ساڈا جی نئیں بھرے گا، اوہدے نال''۔ [2] ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔ میں مثال کے لیے بتایا کرتا ہوں کہ بچے ہمارے ساتھ مارکیٹ

---

[1] اس جنّتی زندگی میں وہ سب کچھ ہوگا جسے تمہارا جی چاہے گا اور وہ سب کچھ ملے گا جسے تم طلب کرو گے۔ (جو چاہو گے ہوگا۔ جو مانگو گے، ملے گا۔ یہ ہوگا نتیجہ تمہارے یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1116)۔

[2] ہمارا اس سے جی نہیں بھرے گا۔

میں جاتے ہیں، ہم ان کو لے جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ لؤ بیٹا! جو لینا ہے اس دکان سے لے لو۔ وہ کیا لیتے ہیں: اے گھوڑا لے دیو جی اے گگھو لے دیو جی، یہ کھلونا لے دو جی۔ یعنی ان کی مانگ کی حد ہی یہ ہوتی ہے، وہ پوری ہو رہی ہوتی ہے جو وہ مانگتے ہیں ملتا ہے، جو وہ چاہتے ہیں ہم کر رہے ہوتے ہیں لیکن ہم جی میں ہنس رہے ہوتے ہیں کہ بیٹا! تم کیا کہہ رہے ہو، ذرا اور آگے بڑھو گے تو جتنے یہ کھلونے وغیرہ ہیں، وہ سارے کے سارے بھول جاؤ گے، تمہیں پتہ ہی نہیں ہو گا کہ وہ کہاں چلے گئے اور کون ان کو لے گیا، ان کی تو اتنی سی قیمت ہی ہے۔ ہم دیں گے بیٹا! تمہیں سچ مچ کا ہوائی جہاز، جب تم بڑے ہو جاؤ گے۔ ہمارے پاس مزید بھی ہے۔ تم جو آج جس زندگی کی سطح کے اوپر ہو، اس میں تمہاری مانگ بڑی محدود ہے، تم جو انتہا میں مانگو گے ہمارے نزدیک بڑا کم ہو گا۔

آئندہ کی زندگی کے ظروف کا مقابلہ اس زندگی کے ظروف و معیارات سے کیا ہی نہیں جا سکتا

ہم یہ نہیں کہیں گے کہ بھئی! تم نے اتنا ہی مانگا تھا، وہ سارا کچھ دیدیا، اب اس کے بعد اور کیا؟ نہیں، کچھ بات نہیں، ہم جانتے ہیں کہ اس کے بعد کی تمہاری زندگی، اُس زندگی کے ظروف، اس کے پیمانے، اس موجودہ سطح کی زندگی سے بہت آگے چلے جائیں گے۔ جب تم اُس پہ جاؤ گے تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ تم نے جو چاہا تھا ہو گیا اور جو مانگا تھا مل گیا۔ اُن پیمانوں کے مطابق بھی ہمارے پاس ہے، ہم وہ بھی دیں گے تمہیں۔ ہاں، عزیزانِ من! مجھے وہ بات یاد آ گئی۔ ہمارے ایک شاعر نے بات کی ہے جس میں یہ جو اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے، تو اُس نے یہ بات کہہ کر ایسا کر دیا ہے۔ میری ''مانگ'' سن لو اور اس کے بعد کہو کہ کیا پھر یہ کہو گے عزیزانِ من! بڑی پیاری چیز ہے، سن لیجیے:

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

کہا کہ میں نے تو تجھے مانگ لیا ہے! کہو! اس سے زیادہ بھی ہے، تمہارے پاس کچھ اور عزیزانِ من! انسان کی مانگ، مطلوب، انتہا، وہ ہو جائے کہ اسے ہی مانگ لیا جائے تو واقعی پھر اس کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرمائیے، حضور ہے اس سے کچھ زیادہ!! وہ جو اُس نے کہا کہ ''اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد''، تو وہ اس لیے ہے کہ اُس کے بعد کچھ رہتا نہیں ہے، باقی کچھ حیثیت نہیں رہتی:

عشق میں ایک تم ہمارے ہو
باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

رب المومنین کے نظامِ ربوبیت کو نہ تو کسی ترازو میں تولا جا سکتا ہے اور نہ ہی ماپا

یہاں کے جو رب ہیں، وہ بھی دیتے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ ملتا ہے۔ اس میں ان کا اپنا مقصد ہوتا ہے۔ یہ قصاب اگر بکرے کو چارہ نہ دے تو اس کی اپنی روٹی ختم ہو جائے۔ وہ تو اس کو پالتا ہے کہ اس کو ذبح کرنا ہوتا ہے۔ ایسوں سے جو ملتا ہے تو اس میں تو انسان کے لیے خود ذلت و خواری ہوتی ہے، کسی سے بھی ملے۔ عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں کہ قرآن کریم قدم قدم پر یہ کہہ رہا ہے کہ یہ کسی انسان کی فکر نہیں ہے۔ انتہا یہ تھی۔ یہ کہا جائے کہ جو چاہو گے، ملے گا۔ کون انسانی فکر یہ کہہ سکتی تھی کہ اس سے بھی زیادہ ہمارے پاس ہے۔ یہ تھا کہ جو مانگو گے، ملے گا، جو چاہو گے ہو جائے گا۔ ٹھیک ہے اور کیا چاہیے!!

مومن تو خدا کا مہمان ہوگا

کہا کہ نہیں، یہ بات یاد رکھو! اس میں کوئی ذلت اور خواری کی بات نہیں ہے کیونکہ **نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍ** (41:32) تم ہمارے مہمان ہو گے۔ شرفِ انسانیت کی اتنی پاسداری، تکریمِ آدمیت کا اس قدر احساس کہ اتنا کچھ دے رہے ہیں اور اس دینے کے بعد یہ کہ احساس نہ ہو کہ اس نے مجھے یہ کچھ دیا ہے، میں اس کا محتاج ہوں، اس کا میرے اوپر احسان ہے، یہ احساس نہ ہو کہیں۔ کہا کہ تم ہمارے مہمان ہو گے اور مہمان کے لیے تو دو شرطیں بڑی ضروری ہیں۔ اگر گھر میں مہمان آ جائے تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس کی حفاظت بڑی ضروری ہوتی ہے۔ اور دوسری چیز ہے مہمان داری۔

عربوں کے ہاں مہمان داری کا جذبہ اور اس کا بے مثل احترام

عربوں کے ہاں تو یہ دونوں ہی بڑی خاص شرائط تھیں۔ ان کے ہاں جو مہمان آ جاتا تھا، اس کی حفاظت کی کیفیت یہ تھی کہ اگر وہ باہر کچھ کر کے آیا ہوا اس کی ساری ذمہ داری یہ میزبان اپنے سر لے لیتا تھا۔ عہدِ جاہلیہ کے واقعات موجود ہیں کہ ان کے ہاں وہ مہمان آیا ہے۔ اس کے بعد معلوم ہوا ہے کہ اس نے اس میزبان کے بیٹے کو باہر قتل کر دیا تھا۔ اب وہ مہمان اس کے اپنے بیٹے کا قاتل ہے۔ اس میزبان نے کہا کہ تم میری حفاظت میں آ گئے ہو۔ اس لیے تمہاری سرحد تک جہاں تک تم جانا چاہو گے، وہاں تک میں تمہیں اپنی حفاظت میں بھیج کر آؤنگا۔ سرحد سے پار چلے جاؤ گے تو وہاں تم سے بیٹے کا بدلہ لونگا، اس سے پہلے نہیں لے سکتا، تم میرے مہمان ہو۔ عربوں کے ہاں تو یہ کیفیت تھی۔ یہاں (41:32) میں کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ تم مہمان بھی کس کے ہو؟ غفور کے، وہ جو ہر قسم کی حفاظت کی ذمہ داری دینے والا ہے۔ حفاظت کی ذمہ داری تو جیل خانے میں بھی ہو جاتی ہے۔ بڑے بڑے مجرم جن کو پتہ ہوتا ہے کہ پولیس کے مقابلے میں مارے جائیں گے یا دوسری پارٹی والا مار دے گا، وہ رشوت دے کر جیل چلے جاتے ہیں کہ اس سے زیادہ امن کی کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔

سنیے! وہ جس نے قرضہ لیا ہوا تھا' پٹھان کے قابو نہیں آتا تھا' وہ بھاگتا پھرتا تھا۔ کبھی کہیں کبھی کہیں' ملتا ہی نہیں تھا' بھاگ جاتا تھا۔ وہ پٹھان بڑی مشکل میں آ گیا۔ تھک ہار کر قبرستان میں جا بسا کہ بیٹا! ایک دن تو یہاں آ ؤ گے ہی۔ یہاں دیکھیے کہ نِری حفاظت نہیں' غفور نہیں' رحیم بھی ساتھ ہے یعنی سامانِ نشو ونما بھی' پرورش بھی' بغیر کسی قسم کے احسان کے دیئے چلا جاتا ہے۔

عزیزانِ من! ہم آیت 32 تک آئے۔ بات اس سے آگے بھی بڑی حسین ہے۔ بھلا قرآنِ کریم کی کونسی بات حسین نہیں ہے' میں تو خواہ مخواہ آپ کو یہ کہہ دیتا ہوں۔ سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی آیت 33 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

پانچواں باب: سورۃ حٰمٓ السجدۃ (آیات 33 تا 39)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1981ء کی پہلی تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی آیت 33 سے ہو رہا ہے: (41:33)۔

سابقہ آیت میں تو مومنین کی خصوصیت بتائی کہ **اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ** (41:30) جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر جم کر کھڑے ہو گئے تو ان پہ ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ وہ اِن سے کہتے ہیں کہ **نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ** (41:31) ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی تمہارے ساتھی ہیں، تمہارے رفیق ہیں۔

فکرِ قرآنی کی تعلیم ہمیشہ محسوس شکل میں ہوتی ہے: رَبُّنَا اللّٰه کہنے والوں کی بھی اور قولِ احسن کی بھی

آپ اس کو یاد رکھیے کہ یہاں اس زندگی میں فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا پہلے کہا ہے، یہ جو چیز وَفِی الْاٰخِرَةِ ہے، یہ بعد میں کہی گئی ہے۔ یہ

چیز آخرت کی زندگی کے ہی متعلق نہیں' بلکہ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا کی بھی یہی کیفیت ہے اور اتنا ہی نہیں کہ یہ کوئی ایک ذہنی سی چیز ہے کہ ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ وہ جیسا کہ حضرت صاحب نے کہہ دیا کہ ہاں! ہم پہ تو ہوتا ہے اور دوسرے کو پتہ ہی نہیں چلتا اور ہر ایک اپنے ذہن میں جو بھی اپنے آپ کو فریب دینا چاہے مطمئن ہو جاتا ہے کہ ہاں صاحب! ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ یہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن حمید تو ایسی کنکریٹ' ایسی محسوس چیز' سامنے لاتا ہے کہ کوئی کسی دھوکے میں ہی نہ رہے۔ ملائکہ کے نزول کے متعلق پہلی چیز جو کی وہ فی الحیوٰۃ الدنیا کی ہے کہ یہ دنیا میں بھی ہوتا ہے اور آخرت میں بھی۔ اس کے بعد کہا کہ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُوْنَ (41:31) دنیاوی زندگی میں بھی جو کچھ تمہارا دل چاہے گا وہ ہوگا' جو مانگو گے وہ ملے گا۔ نزولِ ملائکہ کا ثبوت یہ ہوگا کہ اس دنیا کی زندگی میں یہ کیفیت ہو۔ اگر یہ کیفیت ہے تو پھر ہمارا ایمان ایمان ہے' استقامت استقامت ہے' ملائکہ کا نزول بھی ہوتا ہے اور وہ جو خدا کا فی الحیوٰۃ الدنیا میں وعدہ ہے' وہ بھی پورا ہو رہا ہے۔ اور اگر یہ چیز نہیں ہے تو پھر اوپر کی ساری چیزیں باطل ہو گئیں کیونکہ یہ تو اس چیز کا نتیجہ نکلنا ہے۔ مثلاً جب یہ ہے کہ آگ کی حرارت سے پانی کھولے گا تو اگر وہ پانی نہیں کھول رہا تو پھر پیچھے مڑ کر دیکھنا ہوگا کہ کیا اس میں آگ نہیں چل رہی یا لکڑی میں حرارت کیوں نہیں؟ یہ ہے وہ ثبوت جو قرآن حمید پیش کرتا ہے اور یہ محض ذہنی یا نظری یا اعتقادی نہیں ہے' یہ محسوسات کی دنیا کی چیزیں ہیں۔ کہا ہے کہ تمہیں ملے گا: جو مانگو گے ملے گا' جو چاہو گے ہوگا۔ اگر اس دنیا میں کسی جماعت کی یہ کیفیت ہوگی تو وہ اس کی ہوگی جو ربنا اللہ کے ایمان پر پوری اترے گی' جو استقامت پذیر ہوگی' جس پہ نزولِ ملائکہ ہوگا اور یہ ہوگی اس کی نشانی۔

اب اس کے بعد اگلی آیت آ گئی کہ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ [1] (41:33) اس سے زیادہ حسین' بہتر' عمدہ' متوازن' اعتدال پر بات کس کی ہے۔ یہ کون ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ اس سے بہتر زیادہ حسین بات کسی کی نہیں ہو سکتی؟ یہ وہ ہے جو مِمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ (41:33) جو خدا کی طرف دعوت دیتا ہے' وَعَمِلَ صَالِحًا (41:33) وہ خود خدا کے بتائے ہوئے اس پروگرام کے مطابق عمل کرتا ہے اور وقال کہتا ہے کہ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (41:33) میں مسلم ہوں۔ میں ابھی بتاتا ہوں کہ میں نے اس لفظ پر اتنا زور کیوں دیا ہے۔ میں یہاں فوراً مسلمان کہنے لگا تھا مگر رک گیا ہوں۔ میں مسلم ہوں۔ احسن قول ہے یعنی اس سے بہتر کوئی اور بات ہو نہیں سکتی۔ احسن کے معنی یہ ہوئے۔ یہ لفظ احسن Superlative

---

[1] اس کے بعد بتاؤ کہ اس شخص کی بات سے' زیادہ حسین اور جاذب بات اور کس کی ہو سکتی ہے' جو لوگوں کو قانونِ خداوندی کی طرف دعوت دیتا ہے اور خدا کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتا ہے اور (اس طرح اپنی عملی زندگی سے ثابت کر دیتا ہے کہ) وہ ان میں سے ہے جو قوانینِ خداوندی کے اطاعت گزار ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1116)

ڈگری کے اندر ہو گیا یعنی حسین' اعتدال پہ بہترین توازن بدوش۔ یہ بات کیا ہے؟ اس پہ تو پورا ایک درس ہونا چاہیے۔

خدا کی طرف دعوت دینے کا مفہوم' خدا سے ہمارا تعلق اور اس کی کتاب قرآنِ کریم کے احکام کو عملاً نافذ کرنا

وہ پہلی چیز کہ دعا الی اللہ ہے' اب یہ دیکھیے کہ یہ دعوت الی اللہ ہے' خدا کی طرف دعوت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خدا کی طرف دعوت کے کیا معنی ہیں؟ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ہم خدا کی طرف آپ کو بلاتے ہیں۔ اگر تو وہ کسی مقام پہ بیٹھا ہوا کہیں محسوس پیکر ہو' تو وہ تو ہوتا ہے کہ اس کی طرف بلا رہے ہیں' ہم آپ کو خدا کی طرف دعوت دے رہے ہیں تو وہ خدا تو موجود ہے کہ وہ فلاں جگہ ہیں' وہ ان کا مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق تو قرآن کریم یہ کچھ نہیں کہتا ہے' وہ تو کہتا کہ ''جہاں تم ہو میں وہاں ہوں'' ❶ میں تمہاری شہ رگ سے بھی نزدیک ❷ ہوں۔ تو ہم سے جو اتنا قریب ہے' جہاں ہم ہیں وہاں وہ موجود ہے' اس کی طرف دعوت دینے کے معنی کیا ہیں؟ جیسا کہ آپ اب میرا خیال ہے بیس سال سے میرے درسوں میں سنتے آ رہے ہونگے' میں نے یہ عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے ہمارا اور خدا کا تعلق اس کی اس کتاب (قرآن کریم) کی وجہ سے ہے۔ یہی ہے تعلق خدا کا اور ہمارا۔ اس کے علاوہ کوئی اور براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ خدا کو بلانا ہے تو جو کچھ اس میں لکھا ہے' اس کی رو سے بلاؤ۔ خدا کی طرف دعوت دینی ہے تو کتاب اللہ کی طرف دعوت کے معنی ہونگے خدا کی طرف دعوت دینا' خدا کی اطاعت ہوگی تو اس کی کتاب کی اطاعت ہوگی' خدا کی حکومت قائم کرنے کے معنی ہونگے اس کی کتاب کو حکومت کا ضابطہ بنایا جائے۔ یہ ہوگی خدا کی حکومت۔ خدا کی حکمرانی کے معنی ہونگے: اس کی کتاب کے احکام کو عملاً نافذ کرنا اور ان کی اطاعت کرنا۔ اس کے سوا جو بھی چیز ہے وہ ذہنی ہے' اعتقادی ہے اور نظری ہے۔ اس میں تو ہر ایک اپنے اپنے طور پر کہہ سکتا ہے کہ ہاں صاحب! میں بھی خدا کا مطیع اور فرمانبردار ہوں' میں خدا کی طرف دعوت دیتا ہے' میں خدا کی طرف جا رہا ہوں۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ عملاً کر کے دکھاؤ۔ اسی لیے اس نے اس کتاب کو ''تمت'' بھی کہا ''مکمل'' بھی کہا' ''غیر متبدل'' بھی کہا' ''محفوظ'' بھی کہا۔ اب خدا کا اور ہمارا تعلق اس کی اس کتاب کے ذریعے سے ہے۔ جو خدا کی طرف بلاتا ہے' دوسروں کو دعوت دیتا ہے تو خدا کی طرف دعوت دینے کے معنی ہیں کہ خدا کی کتاب قرآن کریم کی طرف دعوت دینا۔ یہ بڑی بنیادی اور ضروری چیز ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ یہ دعوت دے۔ لیکن خود اس کی اپنی زندگی یہ ہو کہ اس کے مطابق وہ عمل پیرا بھی ہو۔ یہ کوئی مکینکل چیز نہیں ہے کہ ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے سے ٹیپ چل گیا اور اس کی طرف خدا کی آیتیں تلاوت کر دی گئیں اور اس کے بعد سمجھ لیا کہ یہ دعوت ہے۔

---

❶ وھو معکم اینما کنتم (57:4) تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1276)۔

❷ ونحن اقرب الیہ من حبل الورید (50:16) اور ہم انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص، 1214)۔

ایمان لانے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو صرف مسلم ہی کہے

جو دعوت دینے والا ہے' اس کی اپنی زندگی یہ ہو کہ وہ خدا کی اس کتاب کے مطابق عمل کر رہا ہے۔ اب دو شرطیں ہو گئیں: ❶ خدا کی طرف دعوت دے اور ❷ اُس کی اپنی زندگی اس قسم کی ہو یعنی قرآن حمید کے مطابق ہو۔ یہ اگلی چیز جو قرآن حمید نے کہی ہے آپ غور کیجیے کہ کتنی اہم ہے کہ یہ جو قرآن حمید نے اصولی طور پر تین بنیادی جزو گنائے ہیں ان میں تیسرا جزو یہ ہے کہ وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (41:33) اور اپنے آپ کو صرف مسلم کہے۔ گویا اس کی بھی اہمیت اس لیے ہوئی' ورنہ خدا کی طرف دعوت دینا' اپنے آپ میں وہ اعمالِ صالحہ جو خدا کے احکام کے مطابق ہیں' وہ کرنا' کافی تھا۔ اس کی یہ ساتھ ہی اتنی تاکید کیوں کی جا رہی ہے؟ وہ تو خدائے علیم و خبیر کی کتاب ہے' اسے تو پتہ ہے کہ لوگوں نے کیا کرنا ہے' اس لیے اس نے سب سے پہلے یہ پیش بندیاں خود کر رکھی ہیں کہ ایسے وقت میں پھر اس میں کوئی جھگڑا نہ پڑے کہ نہیں صاحب! یہ بات نہیں ہے اور یہ نہیں ہے۔ اُس نے ہر چیز واضح کر دی ہے۔ یہ تیسرا ٹکڑا کتنا اہم ہے' آج اس کے متعلق پتہ چل سکتا ہے۔ یہ کہے کہ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (41:33) یہی نہیں کہ وہ خود یہ بات اپنی طرف سے کہے۔ اُس نے کہا ہے هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ (22:78) تمہارا یہ مسلم نام ہم نے رکھا ہے۔ یہ خدا کا رکھا ہوا نام ہے: هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ (22:78) اُس نے تمہارا مسلم نام رکھا ہے۔ اور اس کے بعد شرط یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلم کہے۔ تین شرطیں ہیں: ❶ خدا کی طرف دعوت دے ❷ اپنی زندگی قرآن حمید کے مطابق ہو' اور ❸ اپنے آپ کو صرف مسلم کہے۔ شاید آپ کچھ بور ہو رہے ہوں کہ میں ایسی بدیہی بات کو اتنا تکرار اور اصرار سے کیوں دہرائے چلا جا رہا ہوں۔ یہ بڑی ضروری چیز ہے۔ ذرا غور کر کے دیکھیے گا کہ کیا' آج کوئی بھی اپنا تعارف مسلم کہہ کر کراتا ہے؟ پہلی چیز تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں مسلم کا تو لفظ ہی نہیں رہا' مسلمان کا لفظ آ گیا۔ یہ لفظِ مسلمان عربی زبان کا لفظ ہی نہیں ہے۔ یہ جو عربی کا قاعدہ ہے اس میں مسلم تو ہے' وہ عربی قاعدے کے مطابق ہے۔

مسلمان تو عربی کا لفظ ہی نہیں ہے' خدا نے اس کا نام مسلم رکھا ہے پھر یہ اتنے فرقے کیوں؟

قرآن نے بھی کہا ہے کہ خدا نے یہ نام رکھا ہے۔ کہا کہ یہی تم نے اپنا نام کہنا ہے' کوئی دوسرا نہ کہنا۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے کہ بظاہر تو ملتا جلتا سا نظر آتا ہے لیکن یہ عربی قاعدے کے رُو سے عربی زبان میں مسلمان بنتا ہی نہیں ہے، یہ عربی زبان کا لفظ ہی نہیں ہے' یہ فارسی کا لفظ ہے۔ جیسے آپ نے صلوٰۃ کی جگہ نماز لی' وہ عربی زبان کا ہی لفظ نہیں ہے۔ صوم کی جگہ روزہ کہہ دیا تو یہ عربی زبان کا لفظ ہی نہیں ہے۔ یہ جو مسلمان لفظ ہے' قرآن حکیم تو ایک طرف رہا' یہ عربی زبان کا ہی نہیں ہے۔ لیکن آگے چلیے مسلم تو یوں گیا کہ مسلم کی جگہ ''مسلمان'' آ گئے لیکن کیا یہ تنہا ''مسلمان'' بھی کسی کی کوئی وجہِ تشخص ہے' وجہِ تعارف ہے؟ کسی سے بھی آج پوچھیے کہ آپ کون ہوتے ہیں؟ اگر وہ اکیلا کہے

کہ ''مسلمان'' ہوں تو کہتے ہو کہ ''مسلمان'' ہو مگر بتاؤ کہ وہ کونسے مسلمان ہو؟ اب وہ ''مسلمان'' پہلے شیعہ ''مسلمان'' کہے یا سنّی مسلمان۔ آپ نے دیکھا کہ یہ بتانا کتنا بنیادی ہے کہ میں شیعہ ہوں یا سنی ہوں۔ یعنی اگر اس نے پہلے یہ کہا ہے کہ میں مسلمان ہوں تو اتنے سے تسلی نہیں ہوتی' اس کا صحیح تعارف نہیں ہوتا' اس کے بعد اس سے پوچھنا پڑتا ہے اور اسے بتانا پڑتا ہے کہ کونسا مسلمان؟ مگر وہاں (41:33) میں تو صرف مسلم کہا تھا۔ یہ اب کونسا مسلم ہے جی؟ یہ کیسے آ گیا' یہ کہاں سے آ گیا؟ کونسا مسلم؟ سنی مسلمان یا شیعہ مسلمان؟ شیعہ حضرات کو تو جانے دیجئے' سنیوں کی طرف آیئے' ہم سب تو وہی سنّی مسلمان ہیں۔ چلو جی اتنا ہی سہی۔ کونسے؟ جی سنی مسلمان؟ یا اہلحدیث یا اہل فقہ؟ اور آگے بڑھے۔ کہ جی وہ اہلِ فقہ۔ تو وہ کونسے اہلِ فقہ؟ حنفی ہیں' شافعی ہیں' مالکی ہیں' حنبلی ہیں؟ آپ کونسی فقہ کے قائل ہیں؟ جی حنفی فقہ کے ہیں۔ اچھا! اچھا الحمدللہ۔ دیوبندی ہیں یا آپ بریلوی ہیں؟ چلتے جایئے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ یہ جو بڑے بڑے علما کے نام ہوتے ہیں ان کے آگے ایک لائن لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اور اس بات میں' میں تو ابھی تک شریعت تک ہی ہوں' ابھی طریقت کی طرف آیئے' وہ بھی ساتھ ہوتا ہے۔ تصوف ❶ کی طرف آیئے: نقشبندی' قادری' سہروردی' چشتی میں چشتیہ نظامیہ آتا ہے' چشتی اور صابر یہ آتا ہے صاحب۔ اور یہ جتنے بڑے بڑے حضرات ہیں تو ان کے ناموں کے آگے پیچھے وہ جو انہوں نے کہا تھا دیکھیے حالانکہ قرآن مجید نے کہا تھا کہ قَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ (41:33) وہ کہے کہ میں مسلم ہوں۔ وہ مسلم تو وہاں کہیں نہیں لکھا ہوتا۔ وہاں ہوتا ہی یہ ہے صاحب کہ حنفی' دیوبندی یا بریلوی' چشتی' نظامی' سہروردی' قادری' یہاں سے وہاں تک لگا ہوا ہے۔ یہی اس میں کہیں بھی مسلم نہیں آتا۔ عزیزانِ من! آپ دیکھ لیجیے گا یہ کہیں بھی نہیں لکھا ہوگا۔ اب آپ نے غور فرمایا کہ یہ تاکید کیوں کی گئی۔

اگر مسلم ایک نام رکھا جاتا تو آج یہ امتِ واحدہ ہوتی' آپ کو کسی اور تشخص کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ اب یہ جتنے مختلف تشخص میں نے بتائے ہیں تو یہ مختلف فرقے ہیں۔

---

❶ سلاسلِ تصوف میں عام طور پر چار (4) پیر اور چودہ (14) خانوادے گنائے جاتے ہیں۔ پہلا پیر حضرت علیؓ۔ دوسرا پیر خواجہ حسن بصریؒ، تیسرا پیر خواجہ حبیبؒ عجمی اور چوتھا پیر عبدالواحد بن زید کرخیؒ۔ چودہ خانوادے حسبِ ذیل شمار کیے جاتے ہیں: (۱) سلسلہ حبیبی (پیروانِ حبیبؒ عجمی)' (۲) طیغوری (پیروان بایزیدؒ بسطامی)' (۳) کرخی (پیروانِ معروفؒ کرخی)' (۴) جنیدی (پیروانِ جنیدؒ بغدادی)' (۵) سقطی (پیروانِ سریؒ سقطی) (۶) گازرونی (پیروانِ گازرونیؒ)' (۷) فردوسی (پیروانِ نجم الدین کبریؒ)' (۸) طرطوسی (پیروانِ عبدالفرح طرطوسیؒ) (۹) سہروردی (پیروانِ ضیاء الدین سہروردیؒ)' (۱۰) پیروانِ عبدالواحد بن زیدؒ کوفی)' (۱۱) عباضی (پیروانِ فضیل بن عیاضؒ)' (۱۲) ادھمی (پیروانِ ابراہیم ادھمؒ بلخی)' (۱۳) ہبیری (پیروان امین الدینؒ، ہبیری)' (۱۴) چشتی (ابواسحٰق چشتیؒ شامی)۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی خانوادے مشہور ہیں (مثلاً) قادریہ' شاذیعہ' مولویہ' نقش بندیہ' حلاجیہ' قلندریہ' سہروردیہ (پیروانِ شیخ شہاب الدین سہروردی۔ بحوالہ ''وحدت الوجود تے پنجابی شاعری'' از سید عباس علی جلالپوری) برصغیر ہندو پاک میں صوفیائے کرام کے یہ چار خانوادے زیادہ مشہور ہیں: (۱) چشتیہ' (۲) قادریہ' (۳) سہروردیہ' اور (۴) نقش بندیہ۔ (ماخوذ از پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992ء' ص ص۔ 75۔77)۔

فرقہ بندی کی بدنامی سے بچنے کے لیے مکاتبِ فکر کہنا شروع کر دیا

فرقہ بندی کو قرآن کریم بہ نصِ صریح شرک کہتا ہے۔ آج کے جو واعظ حضرات' خطیب حضرات' آئمہ حضرات' اتنے اتنے لمبے چوڑے خطبے دیتے ہونگے' قرآن کریم بھی پڑھتے ہونگے' یہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ فرقہ بندی شرک ہے' یہ کبھی بھی آپ کے سامنے نہیں لائیں گے۔ مجلّہ ''طلوعِ اسلام'' نے یہ آیتیں لا کر انہیں بہت تنگ کیا کہ یہ شرک ہے' شرک ہے تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے' فرقہ بندی شرک ہے لیکن ہم تو فرقے نہیں ہیں بلکہ مکاتب فکر ہیں۔ کیا بات ہے! ہر یجن نے اپنا نام عبداللہ رکھ لیا۔ مکاتبِ فکر ہیں' یہ ساری فکری بات ہے۔ اور اگر اس فکری بات کی کیفیت یہ دیکھنا ہو تو میں کیا بتاؤں آپ شام کے وقت انار کلی میں دیکھیے' کسی سینما کے اندر یا باہر دیکھیے' مال روڈ پہ ریگل کی طرف ہی جو جانے والے ہیں انہیں دیکھیے' بھیڑ لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ ہیں تو سارے مسلمان' یہاں جو ہم جتنے بستے ہیں۔ وہاں آپ کو اس فرقے کی کوئی پہچان نہیں ہوگی کہ یہ سنی ہے' یہ شیعہ ہے' یہ دیو بندی ہے' یہ وہابی ہے' یہ بریلوی ہے۔ وہ جسے یہ لوگ کفر اور الحاد کہتے ہیں' فسق وفجور کہتے ہیں' اس میں تو یہ سارے کے سارے ایک امتِ واحدہ کی شکل میں جا رہے ہوتے ہیں۔

مسجد کی ایک اذان ان کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دے گی

اب اگر کہیں نمازِ مغرب کی اذان ہو جائے تو اُسی وقت آپ کو پتہ چل جائے گا کہ یہ اس مسجد میں جا رہا ہے' وہ اُس مسجد میں جا رہا ہے' آپ کو الگ الگ نظر آ جائیں گے۔ یعنی یہ جو خدا کی طرف بلانا ہے' جسے آپ اذان کہتے ہیں' اُس بلانے میں آپ کو معلوم ہوا کہ یہ ایک امتِ واحدہ نہیں ہے' اتنی گروہ بندیاں ہیں۔ معاف رکھیے وہ اس کھیل تماشہ یا فسق وفجور میں تو یہ ایک گروہ ایک جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن جونہی مذہب کے ساتھ نسبت آئی آپ نے دیکھا کہ یہ کتنے ناموں میں بٹ گئے۔

مسلمانوں کی سیاسی تفریق

یہ تو مذہب کی حیثیت سے ہی بٹ گئے۔ سیاسی حیثیت سے جتنے بھی آپ کے مسلمانوں کے مما لک ہیں ہر ملک کے ساتھ نسبت ہے۔ سعودی عرب سے عرب آ رہے ہیں صاحب! یہ ایرانی آ رہے ہیں' یہ مصری نہیں ہیں' یہ شامی ہیں' یہ عراقی ہیں یعنی ان میں بھی کوئی مسلم نہیں ہوتا۔ یہ جغرافیائی وطنیت کے اعتبار سے شناخت ہوتی ہے۔ اب آپ نے غور فرمایا کہ یہ کتنی اہمیت تھی جو خدا تعالیٰ نے کہا کہ **دَعَآ اِلَى اللّٰهِ** (41:33) خدا کی طرف دعوت دینا' **وَعَمِلَ صَالِحًا** (41:33) خود اس پہ صلاحیت بخش عمل کرنا اور صرف یہ کہنا کہ **اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ** (41:33) مسلم ہوں۔ اگر صرف اتنی سی وجہ شناخت ہو جائے تو یہ امت اُمتِ واحدہ بن جائے۔

پاکستان کا موجودہ قانون فرقہ بندی کی توثیق کرتا ہے اور جو کسی فرقہ سے متعلق نہیں، وہ کیا کرے؟

یہاں کچھ یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ یہ ایک ایسی مملکت وجود میں آئی ہے جو بہرحال ایک اسلامی یا قرآنی مملکت بننے کے لیے ہے لیکن یہاں صورت یہ ہے کہ Constitution (آئین) کے اندر یہ چیز رکھی گئی ہے کہ اپنی فقہ کے مطابق Personal Laws (شخصی قوانین) کی تعمیل کرسکتا ہے۔ گویا جو فرقوں کا وجود ہے آپ کے ہاں آئینی طور پہ مسلم ہے۔ آپ خالص مسلم کہہ کر کسی قانون پہ عمل ہی نہیں کرسکتے، وہ عمل ہوگا کسی نہ کسی فرقے کی فقہ کے مطابق۔ اور جو خالص مسلم ہے، ان فرقوں کی فقہ کو نہیں مانتا، تو اس کے متعلق سوال پیدا ہو رہا ہے کہ اس کو کیا کہیں کہ ''اے تے ساڑے وچوں ہے ای نئیں ❶ ''۔ طلوعِ اسلام میں یہ چیز ہے کہ ماہرینِ قانون ذرا یہ بتائیں کہ اس میں تو یہ ہے کہ ہر فرقہ اپنے اپنے فرقے کی فقہ کے مطابق Personal Laws (شخصی قوانین) ہی کی تعمیل کرے اور اگر کوئی، معاف رکھیے میں Quotation میں کہتا ہوں، بدبخت یہ کہدے کہ میں کسی فرقے سے متعلق نہیں ہوں اور میں تو صرف مسلم ہوں تو یہ اُس قانون کے تابع بات بنتی ہی نہیں، تو اس کے متعلق کیا کریں؟ یعنی آج مسلم ہونا ممکن ہی نہیں۔ آپ کہیں بھی دیکھ لیں کہ ہم کہاں پہنچ رہے ہیں۔ شریعت کا قانون آپ کے مطابق نہیں اور ملک کا قانون بھی یہی ہے کہ ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق تعبیر کرے۔ جو کسی فرقے سے متعلق نہیں ہے تو اُس کے لیے تو قانون ہی نہیں ہے۔ وہ کیا کرے؟ یہ ایک بڑا ہی قانونی غور طلب سوال ہے۔

ہر فرقے کی دعوت اپنے اپنے فرقے کی طرف بلانے کی ہوتی ہے، خدا کے قانون کی طرف نہیں

آپ نے اس کی اہمیت پر غور فرمایا۔ خدا کی طرف دعوت وہی دے سکتا ہے جو ان فرقوں کی نسبتوں سے اونچا ہو کر اپنے آپ کو صرف مسلم کہے۔ اس کے علاوہ اور جو بھی کہے گا کہ میں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں، تو وہ خدا کی طرف نہیں ہوگی بلکہ اپنے فرقے کی طرف دعوت ہوگی، فرقے کے بانی کی طرف دعوت ہوگی، فرقے کی فقہ کی طرف دعوت ہوگی، خدا کی طرف دعوت نہیں ہوگی۔ اب اس دَعَآ اِلَی اللّٰہِ کی کڑیاں مل گئیں، اب اس کے بعد اس کا عمل ہے۔ ان کو تو چھوڑ دیجیے جو آج مذہب سے بیگانہ ہو رہے ہیں، متنفر ہو رہے ہیں، آپ مذہب پرستوں کو لے لیجیے۔ یہ عملِ صالح جو قرآن کریم نے کہا تھا، یہ تو مسلم کا تھا۔

ہم نے کام اور اعمال میں فرق پیدا کر رکھا ہے

جسے آپ شریعت کی رو سے اعمال کہتے ہیں، کیا آپ کو معلوم ہے کہ کام اور اعمال میں بڑا فرق ہوتا ہے؟ اِس کے کام اچھے ہیں، وہ اچھے

---

❶ یہ تو ہم میں سے ہے ہی نہیں۔

کام کرتا ہے اور مذہب والوں کو اس سے تسلی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اس کے اعمال اچھے ہیں' اس سے تسلی ہوتی ہے۔ پھر اعمال کیا ہوتے ہیں؟ وہ وہی ہیں جنہیں آپ نماز روزہ کہتے ہیں۔ سب سے بڑی اہمیت نماز کو دیدی۔ لیکن وہی نماز نماز کہلائے گی جو اُس فرقے کے مطابق نماز ہوگی۔ خدا کی طرف دعوت دینے والوں کی نماز تو ایک ہونی چاہیے کیونکہ یہ تو دعوت الی اللہ ہے۔ اذان دیتے ہو۔ اب ہر فرقے کی مسجد کی اذان کے مطابق اگر آپ نے نماز پڑھی تو وہ تو پھر خدا کی نماز ہوئی۔ گویا یہ جتنے الگ الگ فرقے یہ کچھ کر رہے ہیں' وہ اپنے فرقے کی نماز تو پڑھ رہے ہیں۔ پوچھیے کہ اس میں سے خدا کی نماز کونسی ہے۔ وہاں تو **دَعَآ اِلَی اللّٰہِ** (41:33) ہے۔ یہ شریعت پرست بھی آپ کے ہاں ہونگے۔ وہ اگر شریعت کی پابندی بھی کرنا چاہیں تو ان کے لیے بھی دعوت الی اللہ نہیں ہوگی۔ یہ دعوت ہوگی ایک خاص فرقے اور فرقے کی فقہ اور اُس کے اعمال کی طرف۔ **دَعَآ اِلَی اللّٰہِ** تو ختم ہوگیا اگر وہ **اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ** نہیں کہتا۔ غور فرمایا کہ بظاہر جو بات بڑی معمولی سی نظر آتی تھی' وہ کتنی گہری بات نکلی۔ پتہ چلا کہ ایک ایک لفظ کی جو قرآن حکیم کہہ جاتا ہے کتنی اہمیت ہے۔ کہنے کو' یا پڑھنے میں بڑی آسان بات تھی کہ اللہ کی طرف دعوت دے' عملِ صالح کرے اور کہے کہ میں مسلم ہوں۔ آگے چلیے لیکن یہاں کھڑا ہونے کے بعد بات سمجھ میں آئی کہ وہ کہہ کیا رہا ہے۔ یہ دعوت الی اللہ تو ہو ہی نہیں سکتی اگر وہ کسی فرقے کی دعوت ہے۔ وہ عمل عملِ صالح نہیں ہوسکتا اگر وہ الگ الگ فرقوں کی تقسیم کے مطابق عمل ہے۔ خدا کے احکام اور ان کے مطابق تو عمل ایک ہی ہوگا۔ خدا کے احکام کے متعلق اُس کی کیفیت یہ ہے کہ **وَ لَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا** (18:26) خدا اپنے حکم میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا چہ جائیکہ خدا کے احکام کی بجائے جو انسانوں کے احکام وقوانین ہیں ان کو اسلام قرار دیدیا جائے۔ شاید آپ کہیں کہ یہ بار بار آتا ہے۔

رجم کے سلسلہ میں صبح وشام کی بحثیں زور وشور سے جاری ہیں

آج کل ❶ رجم کا مسئلہ زیادہ شد ومد سے سامنے آگیا ہے۔ یہ جو رجم کی سزا کہتے ہیں' جو پتھر مار کر مار دینے کی سزا ہے' اس کے خلاف جو وفاقی شریعت کے جج نے فیصلہ دیدیا ہے کہ یہ اسلام کے مطابق نہیں ہے' اس کے خلاف ہے' قرآن مجید کے خلاف ہے' تو اس سے سارے ملک میں طوفان مچا ہوا ہے کہ ان ججوں کو ہی ہٹا دو جو ایسا فیصلہ دیتے ہیں۔ یہ ہمارے مذہبی فرقوں کی طرف سے اس کے اوپر بحثیں ہو رہی ہیں۔ یہاں یہ مذہبیت پرست فرقے ہیں وہ سارے اس کے اوپر اکٹھے ہیں۔ آپ ان کا کوئی اخبار اٹھا کر دیکھ لیجیے' بحث یہیں سے چلتی ہے کہ ٹھیک ہے یہ بات کہ قرآنِ کریم میں بہ نصِ صریح تو اس رجم کا حکم نہیں ہے۔ یعنی یہ مانا جاتا ہے۔ اور جو وہاں لکھا ہوتا ہے کہ قرآن کریم اور سنت کے مطابق ہونا چاہیے یا اس کے خلاف نہیں ہونا چاہیے تو قرآن کریم تو درمیان میں مجبور ہو کر لانا پڑتا ہے تو

---

❶ یاد رہے یہ بات مئی 1981ء کی پہلی تاریخ کو کہی گئی تھی۔

یہ ابتدا ہوتی ہے اس لیے کہ یہ آیت تو قرآن کریم میں ہے نہیں۔ یہ تو کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں وہ آیت رجم بہ نصِ صریح نہیں ہے لیکن اسلام صرف قرآن کریم ہی کا نام تو نہیں ہے۔

عزیزانِ من! قرآن کریم کہتا ہے کہ اُس کے ساتھ کوئی اور لفظ نہیں ملایا جا سکتا مگر یہ ہیں کہ کہتے ہیں کہ اس میں نہیں ہے تو نہ ہوا کرے اسلام تو پھر آگے چلتا ہے۔ آپ ان کا کوئی سا اخبار بھی اٹھا کر دیکھیے خواہ کسی کا بھی وہ مضمون ہو' میری تو بد نصیبی ہے کہ مجھے تو یہ چیزیں دیکھنی پڑتی ہیں۔ یہ معاملہ شروع ہی یہاں سے ہوتا ہے کہ ٹھیک ہے قرآن حکیم میں تو یہ چیز بہ نصِ صریح نہیں ہے لیکن محدثین فقہ' آئمہ اجماع اور پوری امت کا قیاس اس پر ہے' وہ سارے کا سارا اس پہ دلالت کرتا ہے کہ حکمِ خداوندی یہی ہے گو کہ قرآن مجید میں نہیں ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ خدا اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہاں شریک کا سوال نہیں ہوا' یہاں تو یہ ہوا کہ خدا کو تو الگ ہی کر دیا لیکن یہ سارے جتنے ہیں' یہ خارج از قرآن حکیم ہیں۔

میری قرآنی بصیرت کے مطابق فرقوں کا وجود اور اسلام دو متضاد چیزیں ہیں

عزیزانِ من! بہر حال پتہ نہیں' اتفاقات ہیں' بات کہنے کا موقعہ ملے یا نہ ملے' میں نے جو کچھ بھی قرآنِ کریم سے بصیرت حاصل کی ہے اور یہ تو ایسی بہ نصِ صریح قرآن کریم میں یہ چیز ہے کہ فرقے کا وجود اور اسلام دو متضاد باتیں ہیں' یہ اکٹھی ہو ہی نہیں سکتیں۔ اسلام امتِ واحدہ کا نام ہے: ایک ملت' ایک اُمت۔ جونہی اس میں تفرقہ آیا' یہ وحدت ختم ہوئی۔ قرآنِ مجید میں یہ چیز ہے کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ [1] (30:31) تو وہ شرک ہو گیا۔ ابھی میں نے بتایا ہے کہ شرک کیسے ہو گیا: خدا کے ساتھ ان کو ملایا جائے گا۔ نبی اکرم ﷺ سے اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ جو دین میں' اسلام میں' فرقے پیدا کریں تمہیں ان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یعنی رسول سے بھی واسطہ نہ رہا اور خدا سے بھی واسطہ نہ رہا اگر فرقہ موجود ہوا۔ اور یہاں فرقے کے بغیر کسی قسم کی شناخت ہی نہیں کرائی جاتی ہے۔ جن چیزوں کا نام آپ اسلامی احکام رکھے ہوئے ہیں' وہ خدا کے احکام نہیں ہیں' یہ خارج از قرآن مجید ہیں۔ جو احکام ہیں' یہ فقہ کے احکام ہیں' روایات کے احکام ہیں' تاریخ کے احکام ہیں' قرآن مجید تو نہیں ہے۔ تو اب کیا فرقوں کی موجودگی میں اسلام آ سکتا ہے؟ کونسا اسلام آپ لائیں گے؟ کوئی سا مسئلہ' کوئی سا حکم' کوئی سا قانون' آپ لیں گے تو اسے کسی فرقہ کی فقہ کے مطابق ہونا ضروری ہو جائے گا؟ وہ تو اُس کے مطابق ہو جائے گا۔ وہاں پہ دوسری فقہ والے اس کو غیر اسلامی قرار دیدیں گے چہ جائیکہ اسے پوری امت کے لیے اسلامی قرار دیں۔ جسے آپ اس وقت خالص اسلامی حکم یا کچھ کہنا چاہیں' وہ کہیں نہیں ہے' اگر چہ ہر فرقے والا اپنے ہاں کی فقہ اور احکام کو اسلامی کہتا ہے۔ ہر ایک کہتا ہے تو

---

[1] اتباع اور اطاعت میں کسی اور کے قانون اور فیصلے کو شریک نہ کرو (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 937)۔

مختلف اسلامی حکم ہو گئے۔

امتِ واحدہ اور اسلام دونوں لازم وملزوم ہیں

آپ غور فرمایئے۔ قرآن مجید نے تو ایک اُمت بتائی تھی اور کہا تھا کہ **وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا** (2:143)۔ ایک امت ایک قوم ایک ضابطۂ حیات اور ان کے ماننے والے مسلم۔ اب یہاں بات آئی مسلم کی کس کو مسلم کہا جاتا ہے؟ وہ جو اپنے آپ کو احکامِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والا کہے۔ امتِ واحدہ اور اسلام دونوں لازم وملزوم ہیں۔ فرقہ بندی آئے گی تو اس میں اسلام اور خدا نہیں رہے گا۔ فرقے، فرقوں کی فقہ، فرقوں کے احکام، فرقوں کی بانی شخصیتیں، صرف یہ آجائیں گی۔ یہی حقیقت تھی جسے قرآنی بصیرت والے اقبالؒ (1877-1938ء) نے کہا تھا کہ

کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت ❶ میں

یہاں ہفتاد و دو ملت ❶ کہا۔ وہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ ایک روایت میں ہے کہ میری امت کے تہتر فرقے ہونگے ان میں سے ایک فرقہ تو ناجی ہوگا اور جو بہتر ہیں یہ جہنمی ہونگے۔ میں اس پہ نہیں آنا چاہتا کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ وہ جو ہفتاد و دو ملت کہا ہے وہ اس اعتبار سے اس کے معنی بہتر ہو گئے:

کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت ❶ میں
سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک

[اقبالؒ: بالِ جبریل]

آج ادراک پر مختلف رنگ کی جو تہیں جمی ہوئی ہیں انہیں کھرچ کر الگ کرنا ہوگا: یہ ہوگا قائداعظمؒ کا تصورِ پاکستان

عزیزانِ من! ان میں سے ہر ایک کو اپنے ذہن سے الگ کرنا پڑے گا اس لیے کہ بیک وقت دو چیزیں تو نہیں لکھی جاتیں۔ بچے کو سلیٹ پہ دوسرا سوال لکھنا ہوتا ہے تو وہ پہلے کو مٹاتا ہے۔ اسی لیے اسلام لانے سے پہلے کہا کہ **فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ** (2:256) اللہ پر ایمان لانے سے پہلے تمہیں ہر غیر خداوندی چیز سے انکار کرنا ہوگا۔ ادراک کی بے رنگی کے معنی یہ ہوئے۔ اقبالؒ (1877-1938AD) نہایت عجیب لفظ استعمال کر جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک۔ بے رنگ کرنے کے لیے اسے

---

❶ ہفتاد و دو ملت: اسلام کے بہتر فرقے۔

بالکل دھو دینا ہوگا۔ اس میں سے تو کوئی ایک بھی باقی رکھیں گے تو فرقہ ہوگا' اسلام تو نہیں ہوگا۔ اب آپ نے غور فرمایا کہ جسے اسلامی نظام لانا' اسلامی حکومت قائم کرنا یا اسلامی احکام نافذ کرنا کہتے ہیں تو وہ کتنا مشکل ہے۔ امت اگر فرقوں میں بٹی رہے گی تو وہ شے جو اسلام کہلائے گی' ان فرقوں کی تفریقات تمیزات سے بالا اور بلند ہوگی' تو اسے کون مانے گا۔ جہاں بھی آیا' اسلام' عزیزانِ من! جب بھی آیا' جس ملک جس قوم میں بھی آئے گا' یہ وہاں آئے گا جہاں فرقے نہیں ہونگے۔ اقبالؒ (1877-1938ء) نے پاکستان کا جو تصور دیا تھا تو اس کی بنیاد میں یہ چیز بھی تھی کہ ہم وہ ایک ایسا خطہ زمین حاصل کریں گے جہاں پہلے سے کوئی قانون نافذ نہیں ہوگا۔ قانون پہلے پہل ہم خود بنائیں گے اور قانون کی بنیاد جو انہوں نے کہا حضرت عمرؓ (581-644/45AD) کا قول ہوگی کہ حسبنا کتاب الله. اللہ کی کتاب کافی ہوگی۔ نئے سرے سے وہاں کتاب اللہ کے احکام کو نافذ کریں گے' اس طرح سے وہ مملکت بھی اسلامی ہوگی' وہ نظام اور ضابطہ قوانین بھی اسلامی ہوگا' کتاب کے مطابق ہوگا۔ انہوںؒ نے اس پاکستان کا یہ تصور دیا تھا۔ بہرحال ہمارے جو حالات بھی ہیں' وہ آج آپ کے سامنے ہیں۔ یہ تھا تصور ان کے ذہن میں کہ یہاں نئے سرے سے پہلی دفعہ ایک قانون جو ہم مرتب کریں گے' وہ کتاب اللہ کا قانون ہوگا اور اسے یہاں نافذ کر کے پھر باقی دنیا کے مسلمانوں کو دکھا دیا جائے گا کہ یہ نقشہ ہوتا ہے اسلامی نظام اور اسلامی مملکت کا۔

مقدر اپنے ہاتھوں کے کرتوُت ہوتے ہیں اور قرآنِ حمید کی رو سے تین چیزیں

جیسا عام الفاظ میں کہتے ہیں کہ ابھی تک ہمارا مقدر پورا نہیں ہوسکا۔ یہی لفظ ہے جو کہا جاتا ہے۔ مقدر کیا ہوتا ہے؟ اپنے ہاتھوں کے کرتوُت ہوتے ہیں اور کیا ہوتا ہے۔ جتنی شدت سے یہاں اب فرقہ بندی کی گرہیں لگی ہیں' ہندوستان کی غیر اسلامی زندگی میں یہ چیز نہیں تھی۔ قرآن حمید کی رُو سے تو یہ تین چیزیں ضروری ہونگی۔ احسن قول صرف اس کا ہے جو خالص خدا کی طرف دعوت دے: دعـآ الـی الله قرآن حمید کی اس کتاب کی طرف' صرف اس کی کتاب کی طرف کہ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26) اس کے حکم کے ساتھ کسی اور کا بھی حکم لگا دیا جائے گا تو شرک ہو جائے گا۔ جو داعین الی اللہ ہے' وہ ہوگا جو خالص قرآن حمید کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اس کے بعد شرط یہی ہے کہ اپنی زندگی بھی اس کے مطابق ہو۔ پھر اگلی بات یہ ہے کہ کسی قسم کا تفرقہ نہ ہو اور اس کی کوئی وجہ شناخت نہ ہو سوائے اس کے کہ وہ اپنے آپ کو مسلم کہے' اس سے آگے کوئی نسبت نہیں۔ نہ تو یہ ہندو نہ وہ خراسانی جو اس نے ❶ کہا تھا تو یہ نسبتیں نہ ہوں۔

آج مسلمانوں کی باہمی شناخت علیحدہ علیحدہ ملکوں کے اعتبار سے پہچانی جاتی ہے

وطنیت کی بنا پر قومیت کا تشخص یکسر غیر اسلامی ہے۔ اِدھر تو مذہب کی بنا پہ آپ فرقے کہتے ہیں۔ یہ بہرحال مذہب کے جو

---

❶ یہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877.1938) کی طرف اشارہ ہے۔

Personal Laws (شخصی قوانین) ہیں' وہاں تک ہی وہ بات رہتی ہے۔ سیاسی طور پر مسلمان الگ الگ نہیں ہوتا لیکن جب آپ وطن یا نسل یا زبان یا ملک کی بنیاد پر الگ قومیں بناتے ہیں تو یہ قومیں بھی آپ دیکھیے گا کہ صرف مسلم کے اعتبار سے ہی نہیں پہچانی جاتیں' اس کے ساتھ بتانا پڑتا ہے۔ ساتھ کیا بتانا پڑتا ہے؟ وہاں تو مسلم آتا ہی نہیں ہے۔ مسلمانوں کی مملکت ہے وہی جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ایران ہے' عراق ہے' پاکستان ہے' افغانستان ہے' اس اعتبار سے پہچانے جاتے ہیں۔ سیاسی طور پہ ہماری کیفیت یہ تھی کہ جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والا جو مسلم ہے' جسے آپ مسلمان کہتے ہیں' وہ بھی الگ الگ ہوگیا۔ ایک ہی جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والا جو مسلمان ہے' پاکستانی مسلمان تو وہ فرقے کے اعتبار سے الگ الگ ہوگیا۔ یہ سب سے بڑی مصیبت پیدا ہوتی ہے۔

تبلیغی جماعتوں کا عمل اوراس کا نتیجہ

میرے ہاں تو لوگوں کی چٹھیاں آتی رہتی ہیں۔ جب یہ اسلام کی تبلیغ کرنے کے لیے ہماری جماعتیں نکلی ہیں تو وہ غیر مسلم بہرحال مسلمان ہوجاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں مسلمان تو ہوا' بہرحال جس مولوی صاحب نے مجھے مسلمان کیا تھا انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ نماز یوں پڑھی جاتی ہے' روزہ یوں رکھا جاتا ہے۔ میں اس طرح سے نماز پڑھتا ہوں تو وہ جو دوسری مسجد کے مولوی صاحب ہیں' وہ یہ کہتے ہیں کہ تیری تو نماز ہی نہیں ہوئی' تُو تو کافر ہوا۔ یعنی کفر چھوڑ کر میں نے اسلام قبول کیا اور اس اسلام میں میرے متعلق یہ کچھ کہا جا رہا ہے۔ آپ مجھے بتائیے کہ میں مسلمان کس طرح سے ہوں۔ یعنی اگر اسے کہا جائے کہ یہ فرقہ ٹھیک نہیں' اس فرقے میں چلے جاؤ تو وہاں بھی وہی بات ہوگی۔ اور کہاں آپ اس کو بھیجیں گے؟ عزیزانِ من! ہے کوئی ایسا گوشہ جہاں پہنچنے کے بعد وہ کہے کہ ہاں صاحب! میری نسبت تو صرف اتنی ہی ہے۔ یہ ہے اسلام والی بات۔ یہ یونہی نہیں ہے۔ قرآن حکیم نے کہہ دیا تھا کہ وَقَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ (41:33)۔ دعوت الی اللہ کی ساتھ شرط لگا دی۔ آؤ ایسے لوگوں کو باہر نکالو جو یہ دعوت الی اللہ دیں کہ صرف خالص خدا کی طرف دعوت ہو' کتاب اللہ کی طرف دعوت ہو۔

اجتماعی طور پر ایک ہزار علمائے کرام کا فتویٰ ہے کہ میں کافر ہوں: پرویزؒ

اگر کوئی یہ دعوت دے تو یہ سارے جتنے بھی اور ہیں' یہ اس کو کافر قرار دیں۔ میرا جرم یہی تھا۔ باقیوں کے متعلق تو یہ ہوتا ہے کہ ایک فرقے والے پر کفر کا فتویٰ' دوسرے فرقے والے دیتے ہیں' بہرحال اس کا فرقہ تو نہیں دیتا۔ چونکہ میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں تھا' سارے جتنے بھی فرقے ہیں' ان تمام کے ایک ہزار علمائے کرام کا مجھ پر فتویٰ لگا۔ یہ میری ایک منفرد حیثیت ہے۔ آج جس کا کوئی فرقہ نہیں' جو صرف دعوت الی اللہ دیتا ہے' وہ ان میں سے ہر ایک کے نزدیک کافر ہوتا ہے۔ کہیے وہ جو آپ کے ہاں اسلام لا کر نو مسلم آیا ہے تو وہ مجھ

سے پوچھتا ہے تو میں کیا جواب دوں کہ کن کے ساتھ جا کے ملو۔ اُن کے ساتھ جا کے یہ کچھ کرو تو پھر تم اسلام والے ہو گے۔ کسی کے ساتھ بھی وہ جائے گا تو دوسرے کہیں گے کہ یہ کفر ہے۔

قرآن حکیم نے ساری کی ساری بات تین لفظوں اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ میں سمو کر پیش کر دی اور پھر حسنات اور سیئّات کیا؟

عزیزانِ من! بات تو صرف تین لفظوں کی تھی لیکن ان تین لفظوں میں آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ خدائے کبیر و علیم نے کس طرح سے ہمارا نقشہ بہ نصِ صریح سامنے لا کر رکھ دیا ہے۔ تو جو یہ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (41:33) [1] نہیں کہتا وہ دعوت الی اللہ نہیں دے سکتا۔ آج تو میں نے عرض کیا ہے کہ دعوت الی اللہ دینے کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ ایک فرد کی حیثیت سے اپنے آپ کو کوئی بھی یہ چیز نہیں کہتا کہ میں کسی فرقے سے بھی نہیں ہوں' ایسا کہنے سے تو وہ ان کی نظر میں مسلمان ہی نہیں ہے۔ کہا کہ اس کو سامنے رکھو اور اس کے بعد یہ ہے کہ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ (41:34)۔ یاد رکھو! قرآن حکیم کے حسنات اور سیئات دو متضاد اصطلاحیں ہیں۔ ہمارے ہاں عام طور پہ جو ترجمے کیے جاتے ہیں تو بُرائی اور بھلائی کا ایک ایک لفظ لے آیا جاتا ہے۔ اسے آپ بُرائی لے لیجیے اور پھر بھلائی کو تو سوچیے کہ بھلائی کسے کہتے ہیں اور اسی طرح یہ کہ برائی کیا ہوتی ہے۔ نماز تو آپ پڑھیں گے' روزہ رکھیں گے' اگر بھلائی یہیں تک لاتے ہیں تو دوسرا فرقہ کہے گا کہ تمہاری تو نماز ہی نہیں ہوتی۔

ہر مذہب میں بھلائی اور برائی کا معیار اپنا اپنا ہوتا ہے' مسلمانوں میں بھی حلال و حرام کی مختلف فہرستیں ہیں

اگر آپ انہیں Universal Ethics (عالمگیر اخلاقیات) کے اندر لیں گے تو پھر سوچیے کہ بھلائیاں کیا ہونگی اور بُرائیاں کیا ہونگی؟ وہ یہاں (ہندوستان میں) ہمارے ہاں ہندو تھا۔ وہ صبح ہی صبح اٹھتا' آٹے کی پوٹلی اس کے پاس ہوتی تھی' کیڑے مکوڑوں کے بلوں میں آٹا ڈال دیا کرتا تھا' چڑیوں کے لیے چوگا رکھا کرتا تھا' گائے بھینس کے لیے نمک کے ڈلے رکھا کرتا تھا۔ ہر مذہب والے کے ہاں برائی اور بھلائی کے اپنے اپنے معیار ہونگے' ہر قوم کے ہاں اپنے اپنے معیار ہونگے' دنیا کے ہر قانون میں الگ الگ چیز ہو گی۔ کم از کم مسلمانوں کے ہاں تو ایک معیار ہونا چاہیے کہ یہ بھلائی ہے اور یہ بُرائی ہے۔ یہاں بھی آپ آئیں گے تو حرام و حلال کے مسئلے کے اندر آپ کو فقہوں میں مختلف فہرستیں ملیں گی۔

---

[1] (اپنی عملی زندگی سے ثابت کر دیتا ہے کہ) وہ ان میں سے ہے جو قوانینِ خداوندی کے اطاعت گزار ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1116)۔

کائنات کا حسن اور انسانی ذات کا حسن قرآنِ حمید نے المعروف اور المنکر دو الفاظ میں بیان کر دیا ہے اور ایک حد مقرر کر دی ہے

عزیزانِ من! یہ کیا چیز ہے؟ یہ کونسا معیار (Standard) ہے؟ کونسی کسوٹی ہے؟ قرآن حمید نے المعروف اور المنکر کہا ہے۔ یہ دو اصطلاحیں ہیں۔ جسے خدا کی کتاب خیر یا بھلائی کہتی ہے وہ خیر اور بھلائی ہے' جسے وہ شر اور بُرائی کہتی ہے وہ بُرائی ہے۔ اسی لیے اس نے المعروف اور المنکر دو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ معروف کے تو معنی Recognized by Quran (معروف بالقرآن) ہیں۔ حسنات تو وہ ہیں۔ اتنا خوبصورت لفظ قرآن حکیم لایا ہے اس کے لیے' یعنی وہ کام جن سے انسان کی اپنی ذات بھی حسین ہو جائے اور معاشرہ بھی حسین ہو جائے اور کائنات کا حسن بھی نکھر آئے' وہ تو اچھے عمل کے لیے لفظ ہی حسنِ عمل استعمال کرتا ہے۔ حسن ہے اصل شے۔ حسن کے معنی ہوتا ہے ''کسی چیز کا صحیح توازن قائم ہو جانا''۔ اس سے ذرا آگے یہ آیت آئے گی جو اس کی وضاحت کرے گی جو میں نے صحیح توازن یا صحیح Proportion (تناسب) کہا ہے۔ زندگی کے لیے قوت کی بھی بڑی ضرورت ہے بشرطیکہ وہ ایک خاص حد کے لیے رکھی جائے' اس کا توازن نہ بگڑنے پائے۔ انکساری بھی اچھی چیز ہے بشرطیکہ وہ بے حیائی اور بے حمیتی کی طرف انسان کو نہ لے جائے۔ ایک حد ہوتی ہے' اسے توازن کہتے ہیں۔

قرآن حکیم کا سیئات اور حسنات کے لیے معیار اور سیئات کے لیے فرمان کہ برائیوں کو بھلائیوں کے ذریعے دور کرو

میں اگلی آیت میں اس کے متعلق عرض کروں گا۔ قرآن حکیم نے حسنات کہا۔ سیئہ کے معنی ہوتا ہے ''جس کا حسن بگڑ جائے جس کا توازن بگڑ جائے' جس میں بگاڑ پیدا ہو جائے''۔ کہا کہ یہ دو برابر نہیں ہو سکتیں: وَلَا تَسْتَوِي (41:34) ایک جیسی نہیں ہو سکتیں۔ آپ کو متعین کرنا پڑے گا کہ حسنات کیا ہیں اور سیئات کیا ہیں۔ اور اس کے لیے پھر جو میزان اور معیار ہے وہ خدا کی کتاب ہے۔ المعروف وہ ہے جسے یہ کتاب خیر کی حیثیت سے Recognize (شناخت) کرتی ہے۔ وہ خیر ہے۔ جسے یہ کتاب مسترد کرتی ہے تو وہ شر (Evil) ہے۔ اب کہا کہ معاشرے میں سیئات پیدا ہو جائیں گی' خرابیاں پیدا ہو جائیں گی' جرائم عام ہو جائیں گے' عیوب عام ہو جائیں گے' افراد میں بھی برائیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کے دور کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ وہ کسی نے کہا ہے کہ ٹھیک ہے صاحب! ڈنڈے کے زور سے یہ برائیاں دور کی جا سکتی ہیں۔ کہا کہ صاحب! اتنا ڈنڈا استعمال کیا' یہ تمام برائیاں دور نہیں ہوئیں بلکہ یہ اور زیادہ شدت سے اور زیادہ قوت سے آ گئی۔ اب کوئی دوسرا طریق ان کے ذہن میں ہی نہیں آتا۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (41:34) برائیوں کو بھلائیوں کے ذریعے سے دور کرو۔ کیا بات ہے صاحب! معاشرے کا حسن بگڑ گیا ہے تو حسن قائم کرنے والا جو نقشہ ہے' جو انداز اور اعمال ہیں' انہیں' اور زیادہ کر دو۔ دوسرے مقام پہ ہے **اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ** (11:114) یاد رکھو! اگر تم نے کسی معاشرے سے سیئات کو یعنی برائیوں کو دور کرنا ہے تو اُس معاشرے میں بھلائیوں کو زیادہ سے زیادہ عام کرتے چلے جاؤ۔

خرابیوں کے علاج کے لیے سزا کا تصور تو بہت دور کی بات ہوتی ہے' یہ تو حسن کارانہ انداز سے زیادہ سے زیادہ کام کرنا ہوتا ہے

اگر معاشرے میں خراب کام ہیں تو منفعت بخش کام زیادہ سے زیادہ کرتے چلے جاؤ۔ یہ ہے اس کا علاج۔ ان کے لیے قوت کا استعمال تو کہیں آخر میں جا کر آتا ہے۔ یہ تو صرف ان کے لیے ہے جنہیں نفسیاتی طور پہ Incorrigible (ناقابل اصلاح) کہتے ہیں۔ سائیکلوجیکلی (نفسیاتی زاویہ نگاہ سے) کچھ ذہنیتیں ایسی نکلتی ہیں جو صرف خوف کے ذریعے سے ہی اپنے ان کاموں سے رکتی ہیں' وہ بڑی مستثنیات میں ہوتی ہیں۔ وہ آخری مرحلہ ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! جنہیں آپ قانون یا احکام یا سزائیں کہتے ہیں' وہ خود قرآن حمید میں کہیں آخری دور میں جا کر آئے تھے۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا پورا تئیس سال کا دور جو آپؐ نے بنایا ہے' اس میں سیئات کو حسنات سے دور کرنے کی بات تھی۔ آپ اس پورے دور میں کہیں نہیں دیکھیں گے کہ اس قسم کے تشدد آمیز طریقوں سے یا اس قسم کے قوانین کے ڈنڈے کے ذریعے سے' کسی نے شراب چھڑائی ہو یا زنا چھڑایا ہو یا یہ کچھ کیا ہو۔ معاشرے میں اس قدر زیادہ سے زیادہ حسن کارانہ انداز سے' زیادہ سے زیادہ بھلائیوں کے کام' منفعت بخش کام' لوگوں کی تکالیف دور کرنے کے کام' پریشانیاں دور کرنے کے کام' اتنے زیادہ عام کرتے چلے گئے کہ ان کی وجہ سے معاشرے میں جو جرائم ہوتے تھے وہ خود بخود ختم ہو گئے۔

بھوکے چور کا علاج قید خانہ نہیں' اس کی روٹی کا' اور اس کے خوف کے ادفع کا انتظام کرنا ہے: یہ ہیں دو شرائط

اگر بھوکا چوری کرتا ہے تو اُس کا علاج یہ نہیں ہے کہ قید خانے میں بھیج دیا جائے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اس کو روٹی دیدی جائے۔ قانون یا سزا تو وہاں آئے گی کہ جس کو روٹی دیدی جائے' اس کے باوجود وہ چوری کرے۔ اس میں ایک بڑا عجیب نکتہ ہے۔ قریش کے متعلق قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ سب سے پہلی دعوت تو قریش ہی کے متعلق تھی۔ غور فرمائیے کس وقت وہ یہ دعوت دے رہا ہے۔ کہا کہ **لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ o اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ** (106:1.2) قریش کی پوزیشن یہ ہے' ان کا مقام یہ ہے کہ ان کے قافلے سردی اور گرمی میں چلتے

رہتے ہیں۔ عربوں کے ہاں قافلے عام لوٹ لیے جاتے تھے۔ قریش چونکہ کعبے کے متولی تھے' اس اعتبار سے ان کی Respect (تکریم) اتنی تھی' احترام اتنا تھا کہ یہ قبائل ان کے قافلوں کو ان کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے کہ یہ کعبے کے متولی ہیں۔ اس طرح سردی اور گرمی میں ان کے قافلے چلتے رہتے تھے' اس اعتبار سے ان کی تجارت کو بڑا فروغ حاصل تھا' وہ بڑے متمول تھے اور اسی وجہ سے ان کو امن بھی نصیب تھا۔ غور کیجیے' قرآن مجید بات کیا کہہ رہا ہے؟ کہ ان کی یہ کیفیت ہم نے پیدا کی کہ رزق کی طرف سے بھی ان کو اطمینان ہے' انہیں خوف بھی نہیں ہے' مطمئن ہیں۔ یہ دونوں باتیں اسی سورۃ میں آگے کہی ہیں کہ **الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ** (106:4) انہیں بھوک کی طرف سے مطمئن کر دیا گیا' رزقِ فراواں دیا گیا' امن قائم کر دیا گیا۔ کہا کہ جب اتنا کچھ کر دیا ہے **فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ** (106:3) تو اب کونسی چیز مانع ہے کہ وہ خدا کے احکام نہ مانیں۔ یعنی اس کے لیے پہلے یہ دو شرطیں ہیں جو پوری کیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن مجید کیا کہہ گیا ہے۔ امن قائم کرو کہ کسی شخص کو کسی قسم کا خوف نہ ہو' حزن نہ ہو' ہر شخص اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرے اور بھوکا نہ ہو' ہر ایک کو رزق ملے۔ یہ دو شرطیں پہلے پوری کی جائیں تو پھر کہا جا سکتا ہے کہ **فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ** (106:3) آؤ عبودیت اختیار کرو' محکومیت اختیار کرو' خدا کی حکمرانی اختیار کرو۔ پہلے یہ دو شرطیں قرآن مجید نے بیان کر دیں۔

رزق اور امن یہی چیز' سارے قرآن حکیم کے اندر ہے۔ یہ ہیں وہ حسنات کہ اگر آپ معاشرے کے اندر قائم کر دیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ سیئات مٹ جائیں گی۔ یہ ہے: **اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ** (11:114)۔ کیا عجیب فقرہ ہے! چار الفاظ ہیں۔ یاد رکھو! کسی چیز کا توازن بگڑتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس میں حسن پیدا کر دو۔ بھوکے کا توازن بگڑا ہوا ہوتا ہے۔ یہ توازن کیسے قائم کریں گے؟ روٹی دے کر کریں گے۔ جس کے اعصاب کے اوپر خوف مسلط ہو' ہر وقت پریشانیاں مسلط ہوں' تو اس کا توازن بگڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ کیا ہے؟ پریشانیوں کی وجوہات کو ختم کر دیجیے' اس کا توازن صحیح ہو جائے گا' حسن قائم ہو جائے گا۔ یہ ہے **اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ** (41:34)۔ کہا کہ اسے ذرا انفرادی طور پہ کر کے دیکھیے۔ نتائج خود بتا دیں گے۔

دشمن کو دوست بنانے کا سارا راز' استقامت اور برداشت میں مضمر ہے اور اس کا نتیجہ ہے کامیابیاں اور کامرانیاں

قرآن حکیم کہتا ہے کہ **فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ** (41:34) تمہارا دشمن بھی ہو گا' اس کے ساتھ بھی تم حسن کارانہ انداز سے پیش آؤ گے تو تم دیکھو گے کہ اس کی عداوت کس طرح سے دوستی میں بدل جاتی ہے۔ لیکن بات اگلی ہے جو اگلے مصرعے میں ہے کہ **وَمَا يُلَقّٰهَآ**[1] **اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا** (41:35) اس کے لیے بڑے ہی استقامت کی ضرورت ہے' بڑی

---

[1] اس کا مادہ ''ل ق ی'' ہے۔ ابن فارس نے اپنی کتاب ''مقاییس اللغة'' میں کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تین ہیں: (۱) دو چیزوں کا ملنا' آمنے سامنے ہونا۔ (۲) کسی چیز کو ڈال دینا' اور (۳) ٹیڑھا پن' جس سے الـلـقـوة ہے (لیکن موخر الذکر وادی ہے)۔ پرویزؒ (1903-1985ء) نے اپنی تالیف ''لغات القرآن جلد چہارم'' میں لکھا ہے کہ ''یلقی'' کے معنی ''توفیق دیئے جانے کے بھی آئے ہیں۔'' وما یلقها الا الذین صبروا (41:35) اس (اہم کام) کی توفیق انہیں ہی ملتی ہے جو قوانین خداوندی کی استقامت سے اطاعت کرتے ہیں۔ اسے وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں (ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم' ادارہ طلوع اسلام لاہور' 1961 ص ص۔ 1499 تا 1501)۔

سہار کی ضرورت ہے' بڑی برداشت کی ضرورت ہے' پہلے ہی دن یہ نہیں ہو جائے گا۔ اس دشمن کے ساتھ یہ بھلائی کرو گے تو معلوم نہیں اس کا جو بگڑا ہوا توازن ہے اس میں حسن پیدا کرنے میں کتنا وقت لگے اور اتنے میں اس کی طرف سے Reaction یا ردِ عمل ہوگا تو وہ قدم قدم پہ آپ کو کہے گا کہ نہیں صاحب! ایسے شخص کے ساتھ یہ نیکی کرنے والی بات بالکل غلط بات ہے' بالکل نہیں ہونا چاہیے' یا اگر آپ نے معاشرے میں حسن پیدا کرنا ہے تو اس کے لیے آپ کو بڑی Problems (مسائل) Solve (حل) کرنی پڑیں گی۔ اس لیے کہا کہ **وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا** (41:35) یعنی بظاہر نظر آتا تھا کہ یہ تو بڑا ہی آسان طریقہ ہے' برائی کے بدلے میں بھلائی کرو لیکن کہا ہے کہ یاد رکھو! سہار اور برداشت اور استقامت اس کے لیے بڑی ضروری ہوگی۔ اور جو یہ کر جائے گا تو **وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ** (41:35) وہ بڑا ہی صاحبِ نصیب ہوگا۔ عزیزانِ من! چھوٹے چھوٹے پیمانوں کے اوپر یہ ذرا کر کے دیکھیے' آپ دیکھیے کہ کتنا سکون نصیب ہوتا ہے' کتنا اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ جسے قرآن حکیم کے الفاظ میں کہتے ہیں کہ نصیبہ بدل جاتا ہے' مقدر بدل جاتا ہے۔

قرآن کریم کے نزدیک بگاڑ پیدا کرنے والی قوتوں سے بچنے کا طریق اور ہمارا عمل

عزیزانِ من! اس عمل سے ہوگا یہ کہ اس کے ساتھ ہی بگاڑ پیدا کرنے والی قوتیں بھی کچھ خاموشی سے اس چیز کو برداشت نہیں کریں گی اس لیے قرآن کریم کہتا ہے کہ **وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ**[1] (41:36)۔ قرآن کریم اسے شیطان کہہ کر پکارتا ہے یعنی بھڑکانے والا' مشتعل کرنے والا۔ قرآن کریم کہاں لایا ہے یہ لفظ؟ کہ یہ چیزیں جو تم کرو گے تو بڑی نیک نیتی سے کرو گے' بھلائیاں کرو گے' اچھائیاں کرو گے لیکن یہ شیطان دوسروں کو بھڑکائے گا۔ یہ چیز پیدا ہو تو اس کا کیا علاج کیا جائے؟ کہا کہ **فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ** (41:36)۔ یہ ایک لفظ ہے۔ ''تم اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کے قلعے میں لے آؤ' پناہ میں لے آؤ' تمہاری حفاظت ہو جائے گی۔'' آپ کو پتہ ہے کہ آج ہمارے ہاں اس **فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ** کے اوپر عمل کیسے ہوتا ہے؟ وہ قرآن شریف پڑھنے سے پہلے **اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ** پڑھ لیا کرو جی۔ یہ جتنا کچھ ''کر لیا کرو'' میں' وہ اب سارا کچھ ''پڑھ لیا کرو'' میں بدل گیا ہے' دہراتے جاؤ زبان سے۔ زبان سے دہرانے والا ایک فقیر صبح کے وقت بھی آتا ہے: دے جا اللہ کے نام پہ۔ شام تک وہ اللہ کا نام لے کر' لاکھوں کی تسبیح کر جاتا ہے' رہا

---

[1] اس کا مادہ ''ن ز غ'' ہے۔ نَزَعَ کے اصل معنی چبھونے' گھونپنے اور طعن کرنے کے ہیں اور باقی تمام معانی اسی سے ماخوذ ہیں (محیط المحیط)۔ امام راغب اصفہانی نے اپنی مشہور تصنیف ''المفردات فی غرب القرآن'' میں ''کسی کام میں خرابی پیدا کرنے کے لیے اس میں گھسنا'' لکھے ہیں۔ تاج العروس اور محیط المحیط میں نَزَعَ بَيْنَهُم نزغاً کے معنی لکھے ہیں: ''ان کے درمیان فساد ڈال دیا یا ایک کو دوسرے کے خلاف ابھار دیا۔'' پرویزؒ (1985-1903ء) نے وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ (41:36) کے معنی لکھے ہیں: جب (انفرادی مفاد پرستی کا جذبہ) کوئی ایسی بات دل میں ڈالے جس سے فساد کا اندیشہ ہو یا ایک کو دوسرے کے خلاف ابھارنے کا جذبہ ہو (ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم' ادارہ طلوع اسلام لاہور' 1961' ص۔ 1601)۔

بھوکے کا بھوکا ہے' گدا گر کا گدا گر اور محتاج کا محتاج۔ وہ کتنا اللہ کا نام لیتا ہے۔ ایک دن اگر وہ کچھ کرے جو اللہ نے کہا ہے تو اس سے گدا گری چھوٹ جائے۔قرآن کریم نے کہا کہ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (41:36) ٹھیک ہے دشمن بڑا سخت ہوگا' یہ آگ لگا تا پھرتا ہے۔اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ احکامِ خداوندی کی پناہ میں آجاؤ۔ کیوں؟ اس لیے کہ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (41:36) وہ سب کچھ سنتا ہے' سب کچھ جانتا ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ جس کی پناہ میں ہو' وہ کہیں بے خبر ہو اور بے خبری میں ہی تمہارا کچھ بیڑہ غرق ہو جائے' وہ ایسا ہو کہ بات ہی نہ سنتا ہو اور اس میں تم چیختے رہو اور بات ہی نہ سنے۔ یاد رکھو! وہ سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے۔

حسن پیدا کرنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی پیش کردہ نظامِ کائنات کی محسوس مثال

توازن قائم ہونے سے' قوانینِ خداوندی کے مطابق ہر عمل ہونے سے' گرانقدر حسن پیدا ہوتا ہے۔اس کے لیے قرآن حکیم کا طریق یہ ہے کہ وہ ہمیشہ نظامِ کائنات کو سامنے لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ باہر کی دنیا کی طرف ذرا دیکھ لو۔ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (41:37) یہ ہمارے قوانین کے مطابق عمل کرنے کا نتیجہ ہے کہ کس صحیح نظم کے تابع سورج طلوع ہوتا ہے' دن بھر اپنا سفر طے کرتا ہے' شام کو غروب ہو جاتا ہے' پھر دوسرے دن اختلاف لیل والنہار ہوتا چلا آرہا ہے' کس استقامت کے ساتھ ہوتا چلا آرہا ہے۔ کائنات کے اندر یہ رعنائیاں' یہ ان کی کارفرمائیاں' اسی لیے ہیں کہ قوانینِ خداوندی کے اعتبار سے اس میں ایک حسن قائم ہے۔ کہتا ہے کہ تم اپنے معاشرے میں انہی قوانین کے مطابق عمل کرو تو جس طرح سے یہ نظم ونسق چل رہا ہے اسی طرح تمہاری دنیا بن جائے گی۔لیکن ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ یہ جو سورج اور چاند وغیرہ ہیں ان میں اور تم میں ایک فرق ہے کہ یہ ان قوانین کے اتباع پر مجبور ہیں۔ کائنات کے ہر نفس کو ہم نے قوانینِ فطرت میں جکڑا ہوا ہے' اس لیے وہ یہ کچھ کرتے ہیں۔

دنیا کی بہت سی قومیں ابتدائی زمانے سے یہ جتنے بھی فلکی کرّے ہیں' چاند سورج ستارے اور زہرہ وغیرہ' وہ ان کو دیوی اور دیوتا مانتے تھے۔ کہا کہ یہ صاحبِ اختیار نہیں ہیں۔ سورج اپنی مرضی سے صبح چھ بجے نہیں طلوع ہوتا یا چھ بج کر ایک منٹ کے اوپر' یہ قانون کے ہاتھوں مجبور ہیں اس لیے ان کو صاحب اختیار سمجھ کے کہیں ان کی پرستش نہ شروع کر دو۔ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ (41:37) تم نے اطاعت اختیار کرنی ہے' خدا کی اطاعت اختیار کرو جس نے انہیں بھی پیدا کیا ہے۔ دونوں لفظوں میں جتنے بھی باطل اور غلط عقائد چلے آرہے تھے' خواہ وہ توہم پرستیوں کے نتیجے میں تھے یا مفاد پرستیوں کی وجہ سے' تو ساتھ کے ساتھ قرآن حکیم ان کی تردید بھی کرتا ہے' ازالہ بھی کرتا ہے' ان کی جگہ صحیح قوانین بھی دیتا چلا جاتا ہے۔ کہا تو یہ تھا کہ لیل ونہار قانون کی پابندیوں میں ہیں' اس لیے آپ دیکھیے کہ اس میں کوئی بگاڑ نہیں پیدا ہوتا لیکن ساتھ یہ کہہ دیا کہ یہ خود صاحبِ اختیار نہیں ہیں اور

جب یہ صاحبِ اختیار ہی نہیں ہیں تو ان کو خدا مان لینا تو بہت بڑی توہم پرستی ہے' ایسا نہ کرنا۔ خدا تو وہ ہے جس نے انہیں بھی پیدا کیا ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (41:37) اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ ہم صرف اسی کی محکومیت اختیار کر رہے ہیں تو پھر دنیا میں کسی اور قوت کی محکومیت مت اختیار کرو۔ اُن سے کہا کہ تم یہ باتیں ان سے کہتے چلے جاؤ۔ فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ (41:38) اگر یہ اس کے باوجود اس پہ تکبر برتتے ہیں' سرکشی اختیار کرتے ہیں' قوانینِ خداوندی کے سامنے نہیں جھکتے تو خدا کا اس میں کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ کائنات کی قوتیں جنہیں وہ ملائکہ کہہ کر پکارتا ہے' وہ اس کی اطاعت گزار ہیں اور اس اطاعت میں کبھی تھکتی تک نہیں ہیں' سست نہیں پڑتیں' وہ کرتی چلی جاتی ہیں۔ انہیں جو ہم کہتے ہیں کہ اس کے مطابق زندگی بسر کرو تو اس میں انہی کا بھلا ہے' اس کے اندر اس خدا کا اپنا فائدہ نہیں ہے جو وہ بار بار تاکید کرتا ہے کہ ایسا کرو۔ اب اس کے برعکس قرآن حکیم اگلی محسوس نشانی لے آیا۔

قوانینِ خداوندی کے زیرِ اہتمام مردہ قوموں کے لیے زمینِ مردہ کی مثال

یہاں تو لیل و نہار کا جو اختلاف ہے' صرف اس کی نشانی دی تھی۔ ایک اور دلیل یا نشانی ہے جسے قرآن حمید پیش کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً (41:39) ذرا غور کرو کہ یہ زمینِ مردہ' خشک پژمردہ ہے۔ اس کو یہ خاشعۃ کہتے ہیں' حالانکہ ہمارے ہاں پھر تصوف میں آ کے یہ خشوع و خضوع بہت بڑی خوبی بیان کر دی گئی۔ وہ صاحبِ خشک بھی تو کہتے ہیں۔ قرآن حمید تو یہ ارض کی خوبی نہیں بیان کرتا، زمین کا خشک پژمردہ اور بنجر ہونا تو اس کی خوبی نہیں ہے' خوبی تو اس کی اگلے لفظوں میں ہے۔ کہا کہ فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (41:39) اس پہ پانی کا چھینٹا پڑتا ہے' بارش کا چھینٹا پڑتا ہے' تو پہلی چیز تو اس میں اہتزاز ہوتا ہے۔ شادابی و سرسبزی ان سب کے لیے ایک لفظ آتا ہے۔ اور پھر اس میں سے حیاتِ تازہ کی نمود ہوتی ہے۔ یہ ہے ''ربت''۔ کہا کہ جب اس قسم کی مردہ زمین' آسمانی برسات کے ایک چھینٹے سے' اس کی خشکی و پژمردگی' سرسبزی اور شادابی میں بدل جاتی ہے' وہ جو موت طاری تھی' اس کی جگہ اُس میں سے زندگی کی نمود ہو جاتی ہے تو سوچو کہ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا (41:39) جس خدا کا یہ قانون اس قسم کی زمین میں یہ تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى (41:39) کیا وہ مردہ اقوام کو زندگی نہیں کر سکتا!

ملتِ اسلامیہ کے لیے حیاتِ تازہ کی نوید وحی سے ہی ممکن ہے اس لیے کہ اس نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں

اس خشکی و پژمردگی کو سرسبزی و شادابی میں بدلنے کے لیے ایک چھینٹے کی ضرورت ہے' زمین کے لیے بھی وہ چھینٹا آسمان کی برسات

سے آتا ہے۔ قوموں کے لیے یہ ابرِ باراں وحی کے ذریعے سے آئے گا۔ قرآن کریم اس کو بھی سما کہتا ہے' اوپر سے نازل ہوتا ہے۔ کہا کہ یہ دیکھا تم نے کہ ہمارے قانون کے تابع کس قدر تبدیلی واقع ہوتی ہے' کیسا تحیر انگیز انقلاب آجاتا ہے! زمینِ مردہ لہلہاتی ہوئی سرسبز و شاداب ہوجاتی ہے' حیاتِ تازہ کی کھیتیاں اس میں نمو ہوتی ہیں۔ اسی طرح سے جس خدا نے یہ کیا ہے' جس کے قانون نے یہ کیا ہے' وہ مردہ قوموں کو بھی زندگی عطا کرسکتا ہے۔ اور آگے بڑھیں گے تو پھر یہ بھی ہے کہ وہ جسے آپ مردے کہتے ہیں' مردوں کو بھی آخرت میں زندگی عطا کرسکتا ہے لیکن یاد رکھیے! قرآن کریم نے یہ مردے یا زندگی صرف آخرت کے لیے نہیں کہا بلکہ یہاں کی مردہ اقوام کو بھی اس نے مردہ کہا ہے اور ان میں جو حیاتِ تازہ پیدا ہوتی ہے اُسے بھی اُس نے حیات سے تعبیر کیا ہے اور وہ اسی دنیا کے اندر مردہ اقوام کو بھی زندگیاں عطا کرتا ہے۔ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (41:39) اس نے ہر شے کے لیے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں' قوانین مقرر کر رکھے ہیں لیکن ان کے لیے جو میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ ایک توازن کی' صحیح Proportion (تناسب) کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔

حسن کے لیے صحیح توازن نہایت ضروری ہے اور اسی طرح اقتدار اور قوت میں بھی

ایک انسان نہایت خوبصورت ہے' چہرہ مہرہ نہایت اعلیٰ درجے کا ہے' ایک آنکھ کی سیاہی میں بال جتنا فرق آگیا کہ وہ ادھر جھک گئی ہو' وہ بھینگا ہوجاتا ہے' اس کا سارا حسن دریا برد ہوجاتا ہے۔ یہ کس چیز سے ہوا؟ ذرا سا Proportion (تناسب) بگڑا ہے۔ بال برابر Proportion (تناسب) بگڑنے سے' اچھی بھلی کرسی پہ بیٹھے رہیے' کسی ایک طرف سے اس کا پایہ جھک جائے' دیکھیے پھر آپ کہاں ہوتے ہیں، ذرا سا توازن بگڑا تو لغزش آجاتی ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ اب اپنی زندگی کے اندر دیکھیے۔ ہمدردی تواضع انکساری اچھی چیزیں ہیں لیکن اگر ان میں انتہا تک آپ چلے جائیں یہی چیزیں قوموں کی موت کا باعث ہوجاتی ہیں۔ قوت اقتدار حکومت بڑی اچھی چیز ہے لیکن اگر قوت ظالم کی کلائی مروڑنے کے بجائے مظلوم کے سینوں میں چھرا گھونپ دیتی ہے تو یہی سب سے بڑا ظلم ہوجاتا ہے۔ کیا ہوا؟ قوت کے استعمال میں توازن قائم نہیں رہا۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں الحاد کا' یہودیت اور عیسائیت میں عدل اور رحم کا مفہوم

قرآن حکیم نے دو جگہ ایک بات کہی ہے۔ بڑی عجیب چیز ہے صاحب! کہا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا (41:40)۔ یہاں یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا آیا ہے۔ ہمارے ہاں' یہ الحاد کا ایک لفظ آگیا تو الحاد تو وہ فسق و فجور ہوگیا کہ جس نے ذرا کوٹ پتلون پہن لیا' مغرب زدہ ہوگیا تو وہ ملحد ہوگیا' بے دین ہوگیا۔ الحاد کا لفظ اس میں آتا ہے۔ اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ اب تو ہماری قبروں میں لحد الگ نہیں بنتیں' وہ بیچ میں ہی گڑھا کھود کر دبا دیتے ہیں' ورنہ پہلے یہ سیدھا گڑھا کھودتے تھے' پھر ایک طرف اس کے

ایک گڑھا کھودتے تھے اس کو یہ لحد کہتے تھے۔اس کے بنیادی معنی ہوتا ہے کہ کسی ایک طرف نکل جانا۔اور یہ بڑی چیز ہے جو قرآن حکیم نے کہدی۔حسن تو نام ہے توازن کا' صحیح Proportion (تناسب) کا' جسے آپ اچھی سے اچھی چیز کہتے ہیں تو اُس میں اگر ایک طرف آپ نکل جائیں گے تو قرآن حکیم یہ کہتا ہے کہ وہ پھر نیکی نہیں رہے گی' بھلائی نہیں رہے گی' اچھائی نہیں رہے گی۔یہودیوں نے خدا کا جو عدل تھا اس کو اپنے ہاں لیا اور ان کے ہاں یہ ہے کہ صاحب توبہ کی بات ہی نہیں ہے' ایک دفعہ کسی سے لغزش ہوئی تو وہ گیا' ختم ہوا قصہ' باز آفرینی کا موقع کوئی نہیں اس کے لیے۔جب اس کے بعد اس کے یہ عواقب نظر آئے کہ پھر ہمیشہ کے لیے جہنم ہے' تو کہا کہ نہیں' وہ بزرگ آکر چھڑا لیں گے۔یعنی خود ہی یہ بات طے کی۔عیسائی آئے تو انہوں نے آکر کہا کہ نہیں' عمل وغیرہ کوئی شے ہی نہیں ہے' حضرتِ عیسٰیؑ کے کفارے کے اوپر ایمان ہونا' God is mercy[1] (ماننا)' یہاں عدل نہیں ہے صرف رحم ہے اور خدا کا رحم آتا ہے حضرت عیسٰیؑ کے کفارے پر ایمان لانے سے۔یہ انہوں نے کیا کیا؟ رحم بھی اچھی چیز ہے لیکن یہ الحاد ہے کہ ایک طرف کو نکل گیا کہ عمل کچھ شے ہی نہیں ہے' صرف رحم ہی ہے۔عدل بھی اچھی چیز ہے لیکن وہ عدل میں اس درجے تک نکل گئے کہ انسان کے لیے باز آفرینی کا موقع ہی کوئی نہیں ہے۔قرآن حکیم نے کہا کہ نہیں' یہ دونوں چیزیں الحاد ہیں۔Extremist (انتہا پسند) اس طرح سے کرتے ہیں۔اعتدال کی راہ یہ ہے کہ ٹھیک ہے' عدل ہے' خدا کے قوانین کے مطابق فیصلے کرنے کا نام' اس میں لغزش ہو جاتی ہے تو باز آفرینی کے مواقع ہوتے ہیں۔ابھی یہ کہا ہے کہ جو سیئات ہیں وہ حسنات کے ذریعے سے دور ہو جاتی ہیں لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ عمل کوئی شے نہیں ہے' صرف خدا کا رحم اور اس کی Mercy (رحم) کے اوپر ہی آپ کی نجات موقوف ہے تو عمل سے بیگانہ ہونے کے بعد یہ کائنات کائنات ہی نہیں رہ سکتی۔یہ بھی Extremist (انتہا پسند) ہیں۔

سیکولرازم کیا ہے؟ تصوف کیا ہے؟ یہ ہے اسمائے خداوندی کے اندر الحاد (Extremism)

اب قرآن حکیم نے یہاں یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا کہا ہے' یعنی خارجی کائنات میں ایک ہی طرف نکل جانا۔اس وقت مغرب کا' سارا نظام یا عقیدہ یہی ہے' جسے سیکولرازم کہتے ہیں کہ یہی Physical World فزیکل قوانین' فزیکل شے' فزیکل مفاد' انسان کی زندگی اتنی ہے اس سے زیادہ نہیں تو یہ آیاتِ خداوندی میں الحاد ہے' یہ Extreme (انتہا) تک چلے جانا ہے۔قوانینِ فطرت اور فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا نہایت ضروری ہے لیکن اگر منتہائے نگاہ یا زندگی کا سارا مقصد اسی کو قرار دیدیا جائے تو اس کے بعد جو اقدارِ خداوندی ہیں وہ تو ختم ہو جاتی ہیں۔یہاں اس نے یلحدون فی اٰیٰتنا کہا ہے۔دوسری جگہ ہے کہ وَ ذَرُوا الَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡۤ اَسۡمَآئِہٖ (7:180) وہ لوگ

---

[1] خدا رحم ہے۔

جو خدا کی صفات میں بھی Extremist (انتہا پسند) ہو جاتے ہیں، کبھی وہ عدل کی طرف جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس میں توبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے، کبھی رحم کی طرف جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ عمل کی گنجائش نہیں۔ یہ اسمائے خداوندی کے اندر الحاد ہے۔ اور یہ کچھ عدل اور رحم دونوں کے خلاف ہے۔ قرآن حکیم نے کہا کہ جب یہ صورت پیدا ہو جائے گی، تو توازن بگڑ جائے گا۔ اس لحاظ سے یہ آیت تو بڑی اہم ہے۔ کہا کہ وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (7:180) یہ دیکھیے اس میں لفظ حسنیٰ آ گیا مختلف صفات آپ قرآن حکیم کے اندر دیکھیں گے: رحیم بھی دیکھیں گے، قہار بھی آپ دیکھیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں یہ امتزاج اس انداز کا ہوا ہے کہ ان میں Proportion (تناسب) ہے۔ قوت کی بھی ضرورت ہوتی ہے، رحم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک خاص Proportion (تناسب) کے مطابق ضرورت ہوتی ہے۔ آپ اچھے طبیب کے نسخے کو دیکھیے وہ اس میں اوزان کے Proportion (تناسب) پر کتنا زور دیتا ہے۔ دوسرے دن جا کے کہیے کہ حکیم صاحب! وہ نزلے زکام میں کچھ آرام نہیں ہوا، وہ کہتا ہے کہ منقّے کے تین دانے کہا تھا تو دو دانے کر دو، حتیٰ کہ ہمارے ہاں کے دلی کے وہ حکیم ہمارے بہت اچھے واقف تھے وہ تو یہ کہا کرتے تھے۔ کہ اچھا میں نے کل کہا تھا کہ اس کو جوش دے کر پیو تو تم اسے خنخنا کر کے پی لو زیادہ جوش نہ دو تھوڑا سا گرم کر لو۔ توازن کی یہ کیفیت ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (7:180) خدا کی صفات میں جو امتزاج ہے، اس میں اس نے صحیح توازن رکھا ہے اس لیے فَادْعُوْهُ بِهَا (7:180) اس کا رنگ اختیار کرنا ہے تو اس انداز سے اختیار کرو کہ ہر صفت بھی تمہارے اندر ہو اور اس کا استعمال ایک خاص توازن کے مطابق بھی ہو۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ (7:180) جو اس میں ایک طرف نکل جائیں وہ قرآن حکیم پہ عمل کرنے والے نہیں ہوتے، ان کو تم چھوڑ دو، ان سے قطع تعلق کر لو، یہ اچھی بات نہیں ہے۔ پھر کہا کہ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (7:180) اس کا نتیجہ عنقریب ان کے سامنے آ جائے گا۔ یہ آپ کا جو سارا تصوف ہے، وہ یہی الحاد ہے۔ اقدارِ خداوندی کے اندر Extremist (انتہا پسند) ہو گئے ہیں، ایک طرف نکل گئے ہوئے ہیں: ترکِ دنیا، ترکِ لذائذ، یہ سارا کچھ جتنا بھی ہے اس میں ہے۔ اس نے تو کہا تھا کہ حیاتِ دنیا کے جو حسنات ہیں، یہ اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہے تو ان کو حاصل کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرو اور حاصل کر کے پھر ہمارے قوانین کے مطابق استعمال کرنے کی کوشش کرو۔ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِى النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِىْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ (41:40)۔ عزیزانِ من! اس آیت میں ایک بہت اہم بات اور آئی ہے جس کے لیے وقت درکار ہے میں قبل از وقت آج آپ سے دس منٹ کی چھٹی مانگتا ہوں مجھے ایک بڑا ضروری کام ہے جو

اِسی وقت مجھے کرنا ہے۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی آیت 40 ویں پر آ گئے ہیں، اس میں بھی آگے ایک ٹکڑا آتا ہے وہ میں آئندہ درس میں لونگا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

چھٹا باب: سورة حٰمٓ السجدة (آیات 40 تا 43)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1981ء کی 8 تاریخ ہے۔ سابقہ درس میں سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی آیت 40 زیرِ نظر تھی۔ آیت کا آدھا حصہ سمجھایا گیا تھا اور میں نے عرض کیا تھا کہ آگے ایک ایسی چیز آتی ہے جس میں زیادہ وقت چاہیے تو اُسے ہم نے آج کے درس پر اٹھا رکھا ہے۔

مسئلہ تقدیر کی اہمیت، الجھن اور حل

جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے ایک مسئلہ ایسا ہے جس نے اس کو مسلسل صدیوں سے وقفِ اضطراب رکھا ہے۔ مسلسل اس کے حل کی کوششیں کی جاتی رہیں مگر اس کا حل نہ ملا۔ عام الفاظ میں اسے تقدیر کا مسئلہ کہیں گے۔ قرآنِ کریم نے آ کر اس کو نہایت سادہ سہل انداز کے اندر حل کر دیا۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ پوری نوع انسان کو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا۔ صدرِ اول کے مسلمانوں نے جن کا عمل قرآن کریم کے مطابق تھا، چند سال کے عرصے کے اندر اسی ایک تقدیر کے مسئلے کو جو صحیح معنوں میں سمجھا ہے تو اس کے بعد نہ ایران کی تہذیب باقی رہی، نہ روما کی سلطنت باقی رہی کیونکہ انہیں کہا گیا تھا کہ **وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا** (45:13) زمین اور آسمان اور خارجی کائنات کی ہر شے تمہارے لیے تابع تسخیر کر دی ہے۔ جس انسان کے تابع تسخیر ساری کائنات ہو گئی ہو جب وہ اس راز کو پا لے تو پھر یہ اردگرد کی سلطنتیں اور حکومتیں کوئی شے نہیں ہوتیں، صرف اس ایک مسئلے کے سمجھنے سے یہ

سب کچھ ہوا تھا۔ ایران وروما کی سلطنتیں لپیٹ کر رکھ دی گئیں۔

ایران کا گورنر ہُرمزان پے در پے میدانِ جنگ میں شکست کھانے کے بعد حضرت عمرؓ کی عدالت میں

اس کے بعد ایران نے مسلمان سے بدلہ لیا ہے۔ وہ جوتستر کے میدان میں گرفتار ہونے کے بعد ہرمزان ❶ نے کہا تھا کہ اسے وہیں قتل کرنے کے بجائے امیر المومنین حضرت عمرؓ (581-644/45AD ء) کے پاس مدینہ بھیج دیا جائے' وہ سفر حیات میں اُن مقامات میں ہے جہاں منطق ساتھ چھوڑ دیتی ہے' دلائل مفلوج ہو جاتے ہیں اور فکری کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹ اور بکھر جاتی ہیں۔ اور انسان کے سامنے وادی حیرت کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ ایران کا گورنر تھا اور قید ہو کر پا بجولاں آیا تھا۔ یہ باتیں پہلے بھی آ گئی ہیں لیکن موقع ایسا ہے کہ اس کا دہرا دینا ٹھیک ہے۔ آپؓ نے کہا تھا کہ ہرمزان! یہ بتاؤ کہ اس سے پہلے تم ایرانیوں کی کیفیت یہ تھی کہ ہم عربوں کے ساتھ صلح اور دوستی تو ایک طرف' تم دشمنی رکھنا بھی اپنے لیے باعثِ عار سمجھا کرتے تھے۔ جنگ کی بات ہوتی تھی تو تم دھتکار دیتے تھے کہ کیسے اِن کے ساتھ جنگ کریں۔ کیفیت یہ تھی اور ہم بھی کبھی مقابلے میں نہیں آئے تھے۔ تمہاری عربوں کے ساتھ یہ کیفیت تھی۔ آج یہ کیفیت ہے کہ وہی عرب ہیں' وہی تم ہو۔ یہ عرب یہاں سے اٹھے ہیں۔ اب کیفیت یہ ہے کہ انہوں نے تمہاری ساری مملکت فتح کر لی' تمہارا شہنشاہ ❷ جان بچانے کے لیے مارے مارے پھر رہا تھا اور وہ پن چکی میں جا کر مر گیا تھا۔ حضرتِ عمرؓ (581-614145ء) نے کہا کہ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ تبدیلی کس طرح سے ہوئی؟ اس کے اندر کیا راز ہے؟ یہ مجوسی ایرانی تھے۔ ہرمزان یہ بتا رہا ہے کہ عمرؓ! بات بڑی صاف اور سہل سی ہے' پہلے جب مقابلہ ہوتا تھا تو ایک طرف عرب ہوتے تھے' دوسری طرف ایرانی ہوتے تھے' اس وقت تنہا عرب ہمارے سامنے آتے تھے تو ان کی حیثیت کچھ نہیں تھی' اب جو آتے ہیں تو ایک طرف تنہا ایرانی ہوتے ہیں دوسری طرف عرب اور ان کے ساتھ ان کا خدا ہوتا ہے' اِن کا مقابلہ ایران تو ایک طرف ساری دنیا بھی مل کر نہیں کر سکے گی۔ یہ تھا راز۔ اور یہ جو چیز تھی کہ خدا ساتھ ہوتا ہے یہ محض نظری

---

❶ ہرمزان ایران کا ایک نامور گورنر جری سپہ سالار' ماہر سیاستدان' اور نہایت مکار اور عیار حریف تھا۔ معرکہ قادسیہ 14ھ مطابق 635ء میں شکست کھانے کے بعد وہ اہواز کی طرف بھاگ گیا اور وہاں از سرِ نو فوجوں کو مرتب کر کے مسلمانوں کے مقابلے کے لیے میدانِ جنگ میں اتر آیا۔ جب وہ وہاں بھی مصیبت میں گھرا تو مسلمانوں سے صلح کی درخواست کی جسے انہوں نے منظور کر لیا۔ وہ صلح کرنے کے بعد وہاں سے نکلا تو معاہدۂ صلح کو پس پشت ڈال کر پھر میدانِ جنگ میں آ گیا۔ جب وہاں پھر گھر گیا تو دوبارہ معاہدۂ صلح کی درخواست کی جسے بحکم امیر المومنین منظور کر لیا گیا۔ اس نے پھر معاہدہ شکنی کی اور رامہرمز کے مقام پر پھر میدانِ کارزار میں اتر آیا۔ وہاں سے شکست کھائی تو بھاگ کر خوزستان کے دارالسلطنت تستر جا پہنچا۔ ایران میں یہ صوبہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا اور گرفتار کر لیا۔ اس نے درخواست کی کہ اسے قتل نہ کیا جائے بلکہ امیر المومنین کے پاس مدینہ بھیج دیا جائے چنانچہ اسے انس بن مالکؓ اور احنف بن قیسؓ کی معیت میں مدینہ روانہ کر دیا۔ (ماخوذ از پرویزؒ: شاہکارِ رسالت' ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' 1987' ص ص۔ 178 تا 185)۔

❷ یزدگرد (Iazdgird) ایران میں اس کا دورِ حکومت 651 تا 632ء تھا۔

چیز نہیں تھی کہ تبرکاً انہوں نے یہ بات کہہ دی ہو۔ ہمارے ہاں تو ان الفاظ کا کچھ مفہوم ہی نہیں رہا کہ خدا کیسے ساتھ ہوتا ہے' خدا کیسے ساتھ چھوڑتا ہے۔ وہ یہ سارا کچھ جانتے تھے۔ اور یہی ہے جو میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے جو تقدیر کا تصور تھا' وہ ان کی سمجھ میں آ گیا ہوا تھا اور خدا ساتھ ہوتا ہے کے معنی بھی۔ ان ایرانیوں کو اس کا علم تھا۔ تقدیر کا یہ مسئلہ ایرانیوں ہی کا تھا اور اس زمانے میں سب سے زیادہ اہمیت اسی کو دی گئی تھی۔

شکست خوردہ ایرانیوں کا بدلہ: تقدیر کا مسئلہ مسلمانوں کا جزوِ ایمان بن گیا

بہر حال' تھوڑے سے عرصے کے بعد' جب پھر اس قوم نے قرآن حمید سے الگ ہونا شروع کیا تو شکست خوردہ ایرانیوں نے پھر وہ بدلہ لیا۔ انہوں نے ان عربوں سے میدانِ جنگ میں شکست کھائی تھی۔ انہوں نے ذہنوں اور دلوں کی دنیا کے اندر ان عربوں سے بدلہ لیا اور سب سے پہلے یہی تقدیر کا مسئلہ ان کے دلوں اور ذہنوں کو بدلنے کے لیے ان کا جزوِ ایمان بنا دیا۔ یعنی خدا نے تو پانچ ہی اجزائے ایمان کہے تھے: ❶ اللہ پر ایمان' ❷ فرشتوں پر ایمان' ❸ کتابوں پر ایمان' ❹ انبیاء پر ایمان اور ❺ یوم آخرت پر ایمان۔ سارے قرآن حمید میں یہ پانچ ہی ہیں اور انہی کا انکار کفر ہے اور انہی کا ایمان ایمان ہے۔ انہوں نے آ کر یہ چھٹا جزو **والقدر خیرہ شرہ من اللہ تعالیٰ** ایمان میں داخل کر دیا۔ اب یہ آپ کے ایمان کا جزو ہے۔ انہیں پتہ تھا کہ اس چیز کو ان کے ایمان کا جزو بنا دیجیے' اسے اتنا زیادہ راسخ کر دیجیے کہ ان کے ایمان کا جزو ہو جائے تو وہ ان سے بدلہ لے سکیں گے۔ ان سے کسی نے نہیں پوچھا کہ بابا! خدا نے تو پانچ اجزاء مقرر کیے ہیں' ان کا ذکر سارے قرآن حکیم میں آتا ہے' یہ چھٹا کہاں سے آیا؟ چلیے یہ تو ایک مسئلہ سہی' ایک نظریہ سہی' اس انداز سے کوئی علمی بحث ہی کر و مگر انہوں نے اسے چھٹا جزوِ ایمان بنا دیا۔ اور جب یہ بنا تو پھر اس کے بعد وہی قوم جو ایک طرف شعلہ بداماں تھی وہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ ''وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے'' کہا اور بس معاملہ ہوا ختم:

سب کام اپنے کرنے' تقدیر کے حوالے
نزدیک عارفوں کے' تدبیر ہے تو یہ ہے

کیا تقدیر ہے!! اس حد تک پھر آگے گئے' پھر یہ شاعروں کے ہتھے چڑھے ہیں۔ شعر تو غزل کے انداز کا ہے مگر ہے خوب:

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

[حسرت موہانی]

تقدیر کے اس ایمان نے مسلمانوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا

اب جو شاعر یہاں تک پہنچ گئے کہ "سب کام اپنے کرنے تقدیر کے حوالے" تو پھر وہ قوم تو راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ اب یہ بجھی ہوئی آگ ہے۔ ہزار برس سے یہ راکھ کا ڈھیر چلا آ رہا[1] ہے۔ ہر تیز ہوا آ کر اسے جہاں جی چاہے اڑا کر لے جاتی ہے۔ انہی کی آنکھوں میں وہ راکھ پڑتی ہے تو انہیں اندھا کر دیتی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ تقدیر کا یہ سوال بظاہر بہت مشکل بھی ہے اور بہت زیادہ وقت طلب بھی ہے۔ درس میں تو یہ جہاں بھی کوئی آیت آئی ہے' اس کے متعلق تو میں نے اس کو سرسری لیا ہے' اس لیے میں اتنی تفصیل میں نہیں جاؤنگا۔ میں عرض کرونگا کہ قرآن مجید نے اسے ایک لفظ میں طے کر دیا ہوا ہے۔ آپ بھی حیران ہونگے اور جو پہلی دفعہ سنے گا تو وہ بھی حیران ہوگا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ مسئلہ جس نے ارسطو (384-322 B.C.)' افلاطون (428-347 B.C) کے زمانے سے لے کر آج تک ذہنِ انسانی کو وقفِ اضطراب رکھا ہے اور یہ پھر اتنی اہمیت اختیار کر گیا کہ اس کا اُلٹ مسلمانوں کا جزوِ ایمان بن گیا اور تم کہہ رہے ہو کہ قرآن نے اسے ایک لفظ میں طے کر دیا' یہ کیا بات ہوئی؟

تقدیر کے اس مسئلہ کا پس منظر: عالم امر' خدا کی مشیّت

عزیزانِ من! آپ سنیں گے تو حیران ہونگے کہ ایک لفظ میں کیسے طے کر دیا' یا اسے آپ دو کہہ لیں گے۔ ذرا تھوڑا سا اس کا جو پسِ منظر ہے وہ سمجھنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا دائرہ کار یوں کیا ہے۔ اب اسے یوں کہیے۔ ہمارے لیے الفاظ اور نہیں ہیں' اس لیے یہی الفاظ بولنے پڑتے ہیں' ورنہ خدا کے لیے دائرہ کار کہنا صحیح نہیں ہے۔ لیکن بہر حال اس نے اپنے پروگرام کو دو دوائر میں تقسیم کیا ہے۔ ایک اس نے کہا ہے کہ عالمِ امر ہے' جس میں خدا کے پروگرام کی اسکیمیں تیار ہوتی ہیں۔ وہ ہے جسے خدا کی مشیت کہتے ہیں۔ اس میں اس کا ارادہ' اس کا حکم' اس کا منشاء ہوتا ہے' ان کے مطابق خدا کے پروگرام کی اسکیمیں تیار ہوتی ہیں۔ اس کے لیے کوئی قاعدہ نہیں' کوئی قانون نہیں۔ قرآن حمید میں یہ جو آیات آتی ہیں کہ **يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ** (5:1) اور **يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ** (42:49) جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے' جو چاہتا ہے کرتا ہے' یہ ساری آیات عالمِ امر سے متعلق ہیں۔ نمک کو نمکینی کیوں ملی؟ شہد کو شیرینی کیوں ملی؟ اس کیوں کا جواب مشیّت خداوندی ہے۔ سنکھیا کیوں مہلک ہے؟ پانی کیوں ممدِ حیات ہے؟ یہ خدا کی مشیت یا عالمِ امر میں طے کیے ہوئے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے' کس قاعدے کے مطابق کیا ہے؟ قاعدے اور قانون سے' ہماری منطق سے' ہماری توجیہات سے' بالا ہے۔ وہ عالمِ امر ہے جس کے متعلق ہم کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ وہ خدا کی جولا محدوویت ہے' وہ اُس کی دنیا ہے۔ ہمارا ذہن محدود ہے۔ محدود ذہن

---

[1] بجھی عشق کی آگ' اندھیر ہے مسلماں نہیں' راکھ کا ڈھیر ہے [اقبالؒ]

لامحدودیت کے متعلق کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ لیکن یہ جتنی بھی اس قسم کی آیات قرآن حکیم میں آئیں کہ جو چاہتا ہے کرتا ہے' جیسا چاہتا ہے کرتا ہے' جب ارادہ کر لیتا ہے تو یہ چیز ہو جاتی ہے' یہ وہی خدا کی عالمِ امر میں اسکیم ہے جو قرآن حمید ان آیات میں بیان کرتا ہے۔

خدا تعالیٰ نے عالمِ امر میں ہر شے کے لیے قانون بنادیئے

عزیزانِ من! کہا یہ ہے کہ یہ وہی خدا کی اسکیم ہے۔ جب وہ وہاں عالمِ امر میں طے ہو جاتی ہے کہ یہ ایسا ہو گا تو پھر وہ اُسے اس محسوس دنیا میں' محسوس پیکروں کے اندر' مادے کی دنیا کے اندر' بڑی قابلِ تکمیل کائنات (Most Perfectable Universe) میں' اس پروگرام کو ایک محسوس شکل میں بھیجتا ہے تو یہاں کے متعلق اس نے کہا ہے کہ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (65:3) ہر شے کے لیے ہم نے قانون بنا دیا ہوا ہے' قاعدہ بنا دیا ہوا ہے۔ مثلاً قانون یہ ہے کہ اتنا سنکھیا جو ہے' وہ ڈاکٹر کے مشورہ کے مطابق کھاؤ گے تو وہ تقویت دے گا' ذرا اس سے بڑھو گے تو مہلک ہو جائے گا۔ یہ پیمانہ اس کے لیے مقرر کیا ہوا ہے' یہ قانون ہے جو اس کے لیے مقرر کیا ہوا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (65:3) کائنات کی ہر شے کے لیے' اُس نے ایک قانون بنا دیا ہے۔ مثلاً اتنا پانی ممدِ حیات ہے' اُسی پانی میں ڈوب کر مر جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیوں مہلک ہو جاتا ہے۔ وہ اِس لیے کہ اس نے جو پیمانہ دیا تھا کہ کس حد تک پانی ممدِ حیات ہے' تو یہ ہے وہ قانون۔ قدر کے معنی ہی پیمانہ ہوتا ہے۔ ہمارے الفاظ میں ان چیزوں کو اس کا قانون کہہ لیجیے گا کہ اس حد تک پانی ممدِ حیات ہے' یہ اس کا قانون ہے اور اس سے آگے جایئے تو وہی جو پانی ہے' وہ مہلک ہو جاتا ہے' تو یہ پانی کی تقدیر ہے' یہ پانی کا خواص ہے' یہ تاثیر ہے' یہ قانون ہے۔ یہی لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (65:3) ہے یعنی یہاں اُس نے ہر چیز کے لیے یہ پیمانے مقرر کر دیئے ہوئے ہیں۔

کائنات کی کسی شے کو حق حاصل نہیں کہ بنائے ہوئے قانون کو بدلے

اب جو اشیائے کائنات ہیں' ان کے متعلق تو یہ مقرر کر دیا' اب وہ اس کے مطابق چلنے کے لیے مجبور ہیں' پانی کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جی چاہے تو ممدِ حیات ہو جائے اور جی چاہے تو مہلک ہو جائے۔ یہ اسی کی مرضی کی بات نہیں کہ جی چاہے تو نشیب کی طرف بہے اور جی چاہے تو بلندی کی طرف چلا جائے۔ یہ آگ کے اختیار میں نہیں ہے کہ کبھی وہ آپ کو حرارت دیدے اور کبھی چاہے تو ٹھنڈک پہنچانا شروع کر دے۔ ہر شے کے لیے قانون مقرر ہیں اور دنیا کی ہر شے اس قانون پر چلنے کے لیے مجبور ہے۔ اسے کہتے ہیں ہر شے کی فطرت۔ فطرت کسی شے کی وہ خاصیت ہوتی ہے جسے وہ بدل نہ سکے' جو اس کے اندر ہو' کہیں سے سیکھی ہوئی نہ ہو' کہیں سے مستعار نہ لی ہوئی ہو' اس کے اندر یہ ہو اور وہ اُسے بدل نہ سکے۔ یہ ہے اس شے کی فطرت۔

فطرت تو اشیا کی ہوتی ہے انسان کی نہیں ہوتی' اسے صاحبِ اختیار بنایا مگر نتائج مرتب کرنے میں نہیں

فطرت اشیا کی ہوتی ہے' انسان کی نہیں ہوتی۔ انسان کے معاملے میں یہاں آ کر ایک استثنا ہوتا ہے' Exception ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ قوانین تو اس کے لیے بھی دیدیئے لیکن اِسے صاحبِ ارادہ بنایا کہ تمہارا جی چاہے تو اِس کے مطابق تم چلو اور اگر جی نہ چاہے تو اس کے خلاف چلو۔ یہ قانون جیسا پہلے سے خدا کے عالمِ امر میں طے ہے اپنا وہ نتیجہ مرتب کر کے رہے گا۔ غلط نظام تباہی لائے گا' یہ خدا کے عالمِ امر کا فیصلہ ہے۔ صحیح نظام خوشحالیاں دے گا' یہ اُس کے عالمِ امر کا فیصلہ ہے۔ یہاں اس قانون کے مطابق نتیجہ مرتب کرنے میں استثنا (Exception) نہیں ہے۔

عمل انسانی مرضی سے لیکن نتیجہ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے: عالمِ خلق کا حصہ

اب یہ انسانوں کے اوپر ہے کہ جی چاہے تو وہ صحیح نظام قائم کریں' جی چاہے تو وہ غلط نظام قائم کریں۔ اس حد تک تو ان کے اختیار و ارادے میں ہے۔ وہ بات کہ وہ جس قسم کا نظام قائم کریں' نتیجہ اُس قسم کا نہ نکلے' یہ اُن کے بس کی بات نہیں ہے۔ اسی لیے کہا ہے کہ **اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا** ❶ (76:3)۔ اس قسم کی متعدد آیات قرآنِ کریم کے اندر موجود ہیں۔ **فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ** ❷ (18:29) ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔ یاد رکھیے! جب بھی کسی کے سامنے دو راستے ہوں' Two Possibilities (دو ممکنات) ہوں تو وہ صاحبِ اختیار ہوتا ہے اور اگر ایک ہی راستہ ہو تو اس میں تو اختیار کی بات نہیں ہوتی' وہ تو اُسی پہ چلنا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کا تو ایک ایک لفظ بلند ترین حقائق کی وضاحت کرتا چلا جاتا ہے۔ ''نجدین'' (90:10) کہہ کر قرآن مجید نے یہ بتا دیا کہ جب کسی کے سامنے دو راستے ہوں تو وہاں اُس کا اختیار ہوتا ہے کہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرلے۔ جس راستے پہ وہ اپنے اختیار سے چلے گا' وہ راستہ اُس منزل پہ پہنچا دے گا' جس کی طرف وہ راستہ لاتا ہے' یہ نہیں ہوگا کہ چلے یہ ایک راستے اور پہنچ جائے دوسرے راستے والی منزل پہ۔ اب یہ انسان کی دنیا اپنی دنیا آ گئی ❸۔ پھر سن لیجیے کہ عالمِ امر وہ ہے جس میں کوئی قاعدہ قانون نہیں' صرف خدا کی مشیت

---

❶ خدا نے اسے وحی کے ذریعے صحیح راستہ بتا دیا اور پھر اسے آزاد چھوڑ دیا کہ یہ چاہے تو اس صحیح راستے کو اختیار کرلے' اور چاہے اس سے انکار کر کے' اپنے لیے دوسرا راستہ منتخب کرلے۔ اسی سے یہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے اور مستوجبِ جزا و سزا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص 1392 تا 1393)۔

❷ اب جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے' اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 665)

❸ (اس کے اسی صاحبِ بصیرت و سماعت' سوچنے سمجھنے کے قابل ہونے کا نتیجہ ہے کہ اسے دیگر کائنات کی طرح ایک خاص راستے پر چلنے کے لیے مجبور نہیں پیدا کیا گیا' بلکہ اسے زندگی کے مختلف راستوں میں سے کسی ایک کے منتخب کر لینے کا اختیار دیا گیا ہے)۔ اس کی سماعت و بصارت اس کا فیصلہ تو کرسکتی ہے کہ وہ کونسا راستہ اختیار کرے' لیکن صحیح راستے کا تعین ان کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف وحی خداوندی کرسکتی ہے چنانچہ خدا نے اسے وحی کے ذریعے صحیح راستہ بتا دیا اور پھر اسے آزاد چھوڑ دیا کہ یہ چاہے تو اس صحیح راستے کو اختیار کرلے اور چاہے اس سے انکار کر کے اپنے لیے دوسرا راستہ اختیار کرلے۔ اسی سے یہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے اور مستوجب جزا و سزا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص 1392 تا 1393)۔

ہے۔ جسے یہ عالمِ خلق کائنات کہتے ہیں' اس کے دو حصے ہیں: ایک حصہ وہ ہے جس میں اشیائے کائنات کے لیے قوانین ہے لیکن ان قوانین میں اُن اشیائے کائنات کا اپنا ارادہ نہیں ہے کہ جی چاہے تو اُس کو اختیار کریں' اور جی نہ چاہے تو نہ اختیار کریں۔ دوسرا حصہ یہ ہے کہ انسان کے لیے بھی قانون بتا دیئے لیکن یہ اس پر چھوڑ دیا کہ جی چاہے تو یہ راستہ اختیار کرے' جی چاہے تو وہ راستہ اختیار کر لے۔ یہ جو تبدیلی ہے' یہ جو انسان کے ذہن کے اندر' اس کی تعلیم کے اندر' انقلابِ عظیم ہے' کہا کہ یہاں تم صاحبِ اختیار ہو' تم اپنے اختیار و ارادے اور مرضی کے مطابق راستہ اختیار کر سکتے ہو' فیصلہ خود کر سکتے ہو۔ اِس میں ہم بھی دخل نہیں دیتے۔ جب کسی کو صاحبِ اختیار بنایا جائے تو اس کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ پھر خارج سے اس کے اندر دخل نہ دیا جائے' یہ کیا جائے گا تو پھر وہ صاحبِ اختیار تو نہ رہا۔ قوانین کے متعلق کہا کہ خواہ وہ کائنات کے ہوں خواہ وہ انسان کے لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا [1] (33:62) ہم بھی ان قوانین کو نہیں بدلیں گے۔

خدا بھی اپنے بنائے ہوئے قوانین کو نہیں بدلتا

اپنی مشیت کے مطابق وہ قوانین بناتا ہے۔ پھر خدا ہونا تو جچتا ہی اُسی کو ہے کہ اتنی قوت' اتنی طاقت اور اختیارات کے باوجود اپنے اوپر پابندی عائد کرتا ہے کہ ہم بھی اب ان قوانین کو نہیں بدلیں گے۔ یہ چیزیں از خود تو بدل نہیں سکتیں کہ آگ ٹھنڈک پہنچانا شروع کر دے۔ کہا کہ ہم بھی نہیں بدلیں گے۔ اس کائنات میں رہنے والوں کو کتنا یقین ہوا۔ ان کے لیے اتنا ہی ضروری ہوا کہ یہ معلوم کر لیں کہ کسی شے کا قانون کیا ہے۔ یہ قوانین بناتا نہیں ہے' یہ ان کو ایجاد نہیں کرتا' یہ تو صرف اُن پہ پڑے ہوئے پردے کو کچھ ہٹا دیتا ہے۔ آدم میں اس نے جو صلاحیت دی تھی وہ یہ تھی کہ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (2:31) اشیائے کائنات کے متعلق معلوم کرنا کہ ان کی قوت' قانون' قاعدہ کیا ہے۔

انسان کا اختیار و ارادہ کتابِ فطرت کو پڑھ تو سکتا ہے لیکن اسے لکھ نہیں سکتا

عزیزانِ من! آدم کو اس کی صلاحیت دیدی گئی تھی کہ وہ ''کر سکتا'' ہے۔ اب ''یہ کرنا'' اس کے اپنے بس کی بات ہے۔ مثلاً محنت کرے گا' جد و جہد کرے گا تو اس نے ان قوانین کے اوپر سے صرف پردہ اٹھانا ہے۔ اس [2] نے کہا کہ

We only read the book of nature, we can't write it

---

[1] تُو خدا کے قانون میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پائے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 983)۔

[2] اس سائنسدان کا نام سلیوان (J.W.N Sullivan) ہے اور اس کی اس کتاب کا نام Limitations of Science ہے' اس کے جملے کی تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل)' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ لاہور' 2006' ص ص۔ 510 تا 512)۔

ہم کتابِ فطرت کو صرف پڑھتے ہیں ہم اس کو لکھ نہیں سکتے۔ انسانوں کی دنیا کے اندر قوانین وہی ہیں جو اُن کے لیے بھی دیئے گئے ہیں کہ یہ کرو گے تو تمہاری زندگی خوشحالیوں کی زندگی ہو جائے گی' اِن کے خلاف چلو گے تو تباہیاں اور بربادیاں آئیں گی۔ یہ اٹل قانون ہے۔ اب اگلی بات یہ ہے کہ صرف یہاں آ کر فرق پڑتا ہے کہ تم جو قانون چاہو اپنے لیے اختیار کر لو' اس کا نتیجہ اٹل ہے' ہم دخل بھی نہیں دیں گے ہم بھی نتیجے کو نہیں بدلیں گے۔

ہمارے ہاں لفظ ''انشاء اور شآء'' کے غلط مفہوم کا نتیجہ اور ایرانیوں کا بدلہ

قرآن حکیم میں ''انشاء'' آتا ہے۔ عربی زبان کے اعتبار سے عرب جسے ''انشاء'' کہتے ہیں' اس کا ترجمہ ''چاہنا'' کیا جاتا ہے۔ ان سب چیزوں کو جب ہم انسانوں کی دنیا میں لے آئے تو کہنے لگے کہ (مثلاً) انشاء اللہ' اگر اللہ چاہے گا تو پھر۔ بھئی! وہ آؤ گے کل شام کو سات بجے۔ کہا: ہاں جی انشاء اللہ۔ اب یہ انشاء اللہ مذاق ہوا کہ جب پہلے ذہن میں یہ ہو کہ میں نے آنا ہے نہیں' تو اس وقت ''نہ'' کرنا بھی بُرا لگتا ہے تو پھر ٹھیک ہے ساتھ انشاء اللہ کہہ دو' اگر اللہ نے چاہا تو پھر میں آؤنگا۔ ارے آئے تم کیوں نہیں بھئی! میں نے تو کہا تھا کہ اللہ نے چاہا تو آؤنگا' اُس نے نہیں چاہا' میں نہیں آیا۔ ہر چیز کے ساتھ انشاء اللہ ہے۔ ہوائی جہازوں میں ہمارے ہاں حادثے ہونے شروع ہو گئے تھے' تو ذرا پہلے وہ بڑے بڑے حادثے ہوئے تھے' تو اس کے لیے یہ پوچھا گیا تھا کہ تجویزیں بتاؤں کہ یہ حوادث نہ ہوں۔ شاید آپ کو معلوم ہے کہ یہ تجویز بھی آئی تھی کہ پائلٹ ہوائی جہاز چلانے سے پہلے Announce (اعلان) کرتا ہے کہ ہم اتنی بلندی پہ جائیں گے اور یہ ہوگا اور اتنے بجے ہم راولپنڈی یا اسلام کے اڈے پر Land (اتر جائیں گے) کر جائیں گے۔ تو اُس میں یہ تھا کہ ساتھ کہا کرو کہ ہم انشاء اللہ وہاں لینڈ کر جائیں گے تا کہ اگر راستے میں حادثہ ہو جائے' تو اس کو کوئی نہ پوچھے کہ کیا ہوا۔ اُس نے کہا کہ ہم نے تو کہہ دیا تھا۔ اس پر یہ احکام جاری ہوئے تھے کہ ساتھ انشاء اللہ کہا کرو۔ اور اُدھر آپ دوستوں کا روز کا ماشاء اللہ تجربہ ہے کہ جو اللہ چاہے گا۔ یہ خود فریبی ہو' یا کچھ بھی ہو' آدمی رہتا بڑے مزے میں ہے۔ جو ذمہ داری کسی دوسرے کے اوپر ڈال دی جائے تو اُس میں بڑا مزہ ہوتا ہے۔ ذمہ داری اس پہ ڈال دی جائے جس سے آپ پوچھ ہی نہ سکیں کہ کیوں بھئی! تم نے یہ کیا ہے وہ جو کچھ ہے' وہ تو اوپر کہیں بیٹھا ہوا ہے۔ یہ چیزیں ہم Lightly (غیر سنجیدگی سے) لے رہے ہیں۔ قوم جب اس کے اوپر آ جائے کہ ہوائی جہاز کے حادثے اس طرح بند ہوں گے کہ ساتھ انشاء اللہ کہہ لیا جائے' آپ سوچ لیجیے کہ پھر قوم کہاں گئی۔ حادثے کے بعد وہ یہ دیکھنے کے لیے بیٹھے گی کہ اس میں کیا نقص ہوا تھا' اس کے اندر کس کی غلطی تھی۔ وہ کہے گی کہ خدا نے اس کا وہاں پہنچنا چاہا نہیں تھا اور معاملہ ختم ہوا۔ اور جب آپ کی یہ چیز ہو گئی تو پھر فتح آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے' نہ شکست آپ کے ہاتھ میں ہے' نہ عروج آپ کے ہاتھ میں ہے' نہ زوال آپ کے ہاتھ میں ہے' نہ عزت آپ کے

ہاتھ میں ہے' نہ ذلت آپ کے ہاتھ میں ہے' نہ دولت آپ کے ہاتھ میں ہے' نہ مفلسی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہر چیز کے اوپر خدا کا کنٹرول' تو آپ کی ذمہ داری ختم' جس حال میں بھی ہیں آپ کو اُس حال کے اندر راضی برضا رہنا چاہیے' جس حال میں مولا رکھے۔ بات تو ساری اپنے عقیدے یا مان لینے کی ہے۔ اگر خدا کا وجود ایسا ہوتا کہ وہ سامنے ہوتا تو ٹھیک ہے پھر بھی اس سے پوچھ لیتے کہ صاحب! ہم نے تو یوں چاہا تھا یہ جو کر گیا ہے' یہ آپ نے بگاڑا ہے' تو چلو اس کے متعلق ایک بات تو ہوتی' ذمہ داری تو ہوتی لیکن اس سے تو پوچھ ہی نہیں سکتے۔ اس سے اس قوم نے جو اپنے آپ کو فریب دیا ہے' اس نے جو نقصان پہنچایا ہے' وہ بھی سامنے ہے کہ آپ اس کے بعد اپنے کسی بھی زوال کا' اپنی کسی بھی مصیبت کا' اپنی کسی بھی مشکلات کی انکوائری کرنے کے لیے نہیں بیٹھیں گے۔ یہ نہیں دیکھیں گے کہ اس کے اسباب کیا ہیں' اس کی وجوہات کیا ہیں تا کہ ان کا ازالہ کیا جائے' ان کا علاج کیا جائے۔ نہیں' آپ کہیں گے کہ خدا کی مرضی ایسی تھی۔ اور یہ ہے وہ چیز جو آپ کے ساتھ ہزار برس سے ہوئی چلی آ رہی ہے۔ اسبابِ زوالِ امت کے متعلق کمیشن بٹھاتے ہیں۔ اس کے اسباب نہیں ہیں بلکہ اس کا ایک ہی سبب ہے کہ جو کچھ ہو' اس کے متعلق کبھی تحقیقات نہ کی جائے کہ کیسے ہوا' کیوں ہوا' آئندہ کیسے نہیں ہوگا' کیسے ازالہ کیا جائے' کون ذمہ دار ہے؟ جب ذمہ داری اپنی نہ رہے تو پھر اس کے بعد وہ عمل کی بات ہی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ تو اُس وقت ہے جب آپ تحقیق کریں' اسباب دریافت کریں اور آئندہ کے لیے کوشش کریں کہ ایسا نہ ہو۔ آپ تو اس سے بری الذمہ ہو گئے اور کوئی الزام بھی نہ آیا۔ دوسروں نے الزام کیا دینا ہے' اپنے ضمیر میں بھی خلش پیدا نہ ہوئی کہ میری کسی کوتاہی کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہے بلکہ نہیں صاحب! وہ تو اللہ کو تو منظور ہی نہیں تھا:

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا' خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں' بنا کے تقدیر کا بہانہ

[اقبالؒ: ارمغانِ حجاز]

ایرانیوں کی اس قوم نے آپ سے یوں بدلہ لیا۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ **وَقَدَرِ خیره و شره من الله تعالیٰ** آپ کا جزوِ ایمان بنا۔ میں نے کہا تھا کہ یہ اتنا بڑا اہم مسئلہ' مشکل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اتنی تمہید میں بات کتنی صاف ہو گئی۔ عالمِ امر کو الگ کر دیجیے جیسے کہ قرآن حمید نے کیا ہے کہ **اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ** (36:82)۔ آپ دیکھیں گے کہ اُس نے اپنا عالمِ امر الگ کر لیا ہے اور کہا یہ ہے کہ وہاں ہماری مشیت چلتی ہے' ہم جیسا چاہتے ہیں ہوتا ہے۔ اور یہ تمہاری دنیا ہے: **اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ** (41:40) اپنی دنیا میں تم اپنی مشیت کے مطابق کام کرو اور جو ہماری دنیائے عالمِ امر ہے' اُس میں ہماری مشیت چلے گی۔ یہ ہے **اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ** (41:40)۔ بہر حال ان آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ مذہب کی کتابیں ہوں یا کوئی اور' کسی

بھی مذہب کی آسمانی کتابوں میں آپ کو یہ دو الفاظ نہیں ملیں گے' فلسفہ اخلاق کی دنیا میں بھی یہ الفاظ نہیں ملیں گے۔

خدا تعالیٰ نے انسان کو اس کی اپنی دنیا کے اندر خدا بنا دیا ہے کہ جونسی روش جی چاہے اختیار کرو' بس بات سمجھنے کی ہے

انسان کو اعلیٰ مقام دینے کے اس معاملے میں قرآن کریم منفرد ہے اور سوچیے کہ اُس نے اِس سے انسان کو کیا مقام عطا کر دیا ہے۔ اپنی دنیا کے اندر اُس نے اس کو اپنی دنیا کا خدا بنا دیا ہے۔ وہاں کہتا ہے کہ ہماری مشیت چلے گی اور یہاں تمہاری مشیت چلے گی۔ اس کے بعد بھی کیا کچھ اور کہنے کی کوئی گنجائش رہتی ہے' عزیزانِ من! کہ انسان اپنے عمل کا' اپنے کام کا' اپنے ارادے کا' ذمہ دار نہیں ہے۔ اس کا تو مقام یہ ہے اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (41:40)۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ آپ نے خواہ مخواہ یونہی تکلف برت کر دو الفاظ کہہ دیئے' اصل میں تو بندہ بشر کیا کر سکتا ہے۔ عزیزانِ من! اس کو لاکھ بار دہرائیے اس کو اس قوم کے دماغ میں ڈالیے۔ عزیزانِ من! کیا یہ کوئی چھوٹی چیز ہے! یہ انقلاب ہے۔ انسان کا ذہن تصور نہیں کر سکتا کہ وہ جس کی کائنات میں اپنی مشیت ہے وہ انسان سے کہتا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (41:40) جو کچھ تمہارے جی میں آئے کرو' جونسی روش جی چاہے اختیار کر لو۔ تم پہ کوئی زبردستی نہیں۔ بس کچھ سمجھ لینا ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا سمجھ لینا ضروری ہے؟

عمل کی دنیا میں مرضی انسان کی ہے لیکن نتائج پر کنٹرول خدا کا ہے

کہا کہ بس اتنی سی بات یاد رکھنا کہ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (41:40) یہ بات نہیں ہے کہ جو کچھ تم کرو اور کرنے کے بعد اپنی مرضی کے نتائج بھی برآمد کر لو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تم کیا کرتے ہو اور نتائج اس قانون کے تحت ہی مرتب ہونگے جو ہم نے طے کر دیا ہوا ہے۔ ایک ہے دیکھنے والا لیکن اس نے اپنے آپ کو صرف دیکھنے والا کہا ہے' وہ Observer (مشاہدہ کرنے والا) ہے' دیکھتا ہے صرف' دخل نہیں دیتا۔ تمہیں آزادی ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (41:40)۔ میں نے جیسا کہا ہے کہ اس کو لاکھوں بار دہراؤ شاید اس کی تقدیر بدل جائے' یہ الفاظ جو آتے ہیں تو بولنے پڑتے ہیں۔ اس کی تو تقدیر کوئی نہیں ہے' تقدیر چیزوں کی ہوتی ہے۔ انسان تو صاحبِ اختیار ہے' اس کی تقدیر کوئی نہیں ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (41:40) یہ تھا اس قوم عرب کے سامنے آیا ہوا۔ پھر جب یہ قوم اٹھی ہے تو مقابلے میں ایک طرف تو ایرانی تھے' اور دوسری طرف عیسائی تھے' جس عیسائیت کا ایمان یہ تھا کہ نجات اعمال کی رو سے نہیں ہوتی بلکہ حضرتِ مسیحؑ کے کفارے کی رو سے ہوتی ہے۔ یہ مدِ مقابل دو قومیں تھیں۔ ان کے سامنے کونسی قوم آئی؟ وہ قوم آئی جس کو کہا گیا تھا کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (41:40)۔ اب آپ کہیں گے کہ قرآنِ کریم کے اس قدر واضح الفاظ ہیں اور پھر اس اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (41:40)

میں کچھ پیچیدگی نہیں ہے' کوئی منطقی مسئلہ نہیں ہے' کسی بہت بڑے عربی کے عالم کی ضرورت نہیں' عربی زبان کا جو مقتدی ہے' عزیزانِ من! وہ بھی ان دو الفاظ کے معنی جانتا ہے۔ یعنی کچھ اور نہیں ہے اس کے اندر' تو پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ پھر ہوا کیا؟ ہوا وہی:

مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیے

قرآنِ حکیم انسانی اختیار کو کسی صورت میں بھی پامال نہیں کرتا

یہ تین مقامات پہ آیا ہے' الفاظ ایک ہی ہیں۔ نظر بظاہر آپ کے ذہن میں ہی نہیں آتا ہوگا کہ اس قسم کے واضح دو الفاظ کے بعد پھر یہ کیسے بات ہوئی کہ نہیں' صاحب! کرتا وہی ہے جو کچھ خدا کرتا ہے' انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ بات کیسے آئی؟ سنیے' یہ کیسے لائے؟ انہوں نے تو وہ ثابت کرنا تھا کہ انسان کچھ نہیں کر سکتا' سب کچھ خدا ہی ہے۔ یہ تھا ذہن میں وہ ایمان' یہ تھا وہ یقین تقدیر کا' جو انہوں نے اُن لوگوں سے مانگ کر لیا' جنہوں نے اسلام کے خلاف سازش کی تھی۔ اب انہوں نے ان آیات کے معنی وہ کرنے تھے جو پہلے ذہن میں تھا۔ کیسے کیا؟ قرآنِ حکیم نے کہا کہ اِنَّ هٰذِهٖ تَذۡكِرَةٌ (76:29) یہ جو قرآن ہے' یہ ایک یاددہانی ہے' ایک تذکرہ ہے۔ فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا (76:29) تم میں سے جو چاہے وہ اس کی رُو سے اپنے خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لے۔ اب یہاں تو پھر وہی فمن شآء والی بات آ گئی کہ جو تم میں سے چاہے۔ بات کہیں گے کہ ہم تو کہہ رہے تھے کہ یہاں سے انہوں نے کچھ کیا۔ یہ کیا ہوا؟ یہ تو وہی بات ہے کہ جو چاہے یہ اختیار کرے۔ دیکھیے اتنے حصے تک وہ چیز ہے کہ جہاں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے' گنجائش آگے جا کر نکلتی ہے۔ اور یہ مقام بڑا اہم بھی ہے اور نازک بھی۔

دراصل فرمانِ خداوندی یہ تھا کہ تم وہی چاہو جو خدا چاہتا ہے مگر اس میں الجھاؤ پیدا کر دیا گیا

اس آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا (76:29) جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لے' راستہ ہم نے بتا دیا ہے۔ اور آگے ہے کہ وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ (76:30)۔ پہلے کہا کہ تم میں سے جو چاہے یہ اختیار کر لے اور اس کے بعد یہ ساتھ کی آیت ہے کہ اس کا ترجمہ یہ کیا۔ تم اپنی مرضی سے کچھ نہیں چاہ سکو گے' تم چاہ وہی سکو گے جو ہم چاہیں گے۔ لیجیے (معاذ اللہ) ''اے کچھ دین ڈیا سی سانوں''[1] یعنی فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا (76:29) عزیزانِ من! ساتھ کی آیت میں یہ الفاظ پڑے ہوئے ہیں۔ اس کو کیسے مسخ کیا جاتا ہے؟ وہ سوچے ہوئے معنی تو لانے ہیں کہ جو مجوسیوں والا ایمان ہے کہیں وہ نہ چلا جائے۔ کہا کہ وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ (76:30) لیکن تم خود کچھ نہیں چاہ سکتے' تم وہی چاہ

---

[1] یہ کچھ ہمیں دے رہا تھا۔

سکتے ہو جو خدا چاہے' تمہارے چاہنے کے اوپر بھی اُس کا کنٹرول ہے۔ یعنی تمہارے اعمال پہ ہی نہیں کہ تم کچھ کر نہیں سکتے بلکہ تم کچھ چاہ ہی نہیں سکتے بجز اس کے کہ جو ہم چاہیں۔ یہ ترجمہ کیا اور اس کے بعد پوچھا کہ کیوں جناب' پھر وہ آپ کا انتخاب اور ارادہ اور آپ کی مشیت کہاں گیا؟ ٹھیک ہے' اُس نے کہا ہے کہ ہم نے تمہیں یہ صلاحیت دی ہے' اختیار و ارادہ دیا ہے کہ تم جو چاہو کرو لیکن اُس نے ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ تم کچھ اور چاہ ہی نہیں سکتے۔ اس سے آپ کے ذہن میں ٹکراؤ پیدا ہو رہا ہے۔ عزیزانِ من! اگر یہی ہیں معنی تو پھر (معاذ اللہ 'معاذ اللہ) آپ سوچ لیجیے کہ ایسے خدا کے متعلق آپ کیا کہیں گے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے کہ جس کا جی چاہے وہ صحیح راستہ اختیار کرلے' اُسی سانس میں وہ یہ کہتا ہے وہ چاہنے والی بات جو ہے وہ تمہاری اپنی نہیں ہے' تم کچھ اور چاہ ہی نہیں سکتے بجز اس کے کہ جو کچھ ہم چاہیں۔

قرآنی الفاظ کو اپنی مرضی کے معنی پہنانا شرکِ عظیم ہے: تمہیں چاہیے کہ تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں

یہ وَمَا تَشَآءُ وْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ [1] (76:30) بڑی عظیم چیز ہے۔ آپ احباب میں بھی میرا خیال ہے عربی جاننے والے ہیں۔ عربی زبان کے قاعدے کی رو سے یہ جو الفاظ ہیں وَمَا تَشَآءُ وْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ (76:30) ان کا مفہوم کوئی مشکل نہیں ہے۔ عزیزانِ من! خدانکردہ یہ نہیں ہوتا کہ میں اپنی طرف سے کوئی چیز کہتا ہوں۔ میرے نزدیک تو اس سے بڑا جرم بارگاہِ خداوندی میں کچھ نہیں کہ خدا کا کلام ہو اور میں اپنی منشاء کے مطابق اس کا کچھ مفہوم تیار کرلوں۔ مجھے کیا مصیبت پڑی ہے کہ میں اپنے لیے ابدی جہنم مول لوں۔ اگر میرے نامہ اعمال میں کوئی اور جرم نہ ہوگا تو یہ ایک جرم کہ تم نے خدا کے کلام میں اپنے مفہوم کو دخل دیا ہے' مجھے یہ جہنم میں بھیجنے کے لیے کافی ہے' مجھے کیا مصیبت پڑی ہے کہ میں یہ کروں۔ یہ کبھی نہیں ہوگا۔ عربی زبان کا' قرآن کریم کا' عربی زبان کی رو سے' یہ کسی عربی جاننے والے سے پوچھیے کہ یہ بات ہے یا نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں' سنیے اور جھوم جایئے: کہا کہ ہم نے کہا ہے کہ تم جو راستہ چاہو' اختیار کرو' جو چاہو تم کرو لیکن اتنی بات ہم تمہیں تمہارے فائدے کی بتا رہے ہیں' اس کا یہ ترجمہ ہے کہ تمہیں چاہیے کہ تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔ یہ ہے خدا کا کلام جس کو کہتے ہیں۔ پورا اختیار و ارادہ بھی دیا گیا اور کہا کہ تمہیں چاہیے کہ تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔

خدا تعالیٰ بھلائی کا راستہ تو دکھاتا ہے مگر اس پہ چلاتا نہیں ہے' چلنا خود ہوتا ہے

پھر سن لیجیے صاحب! کہ اختیار و ارادہ بنایا تو کہا کہ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا [2] (76:29)۔ ٹھیک ہے' یہ تمہارے اختیار میں ہے' تمہارے ارادے میں ہے کہ جو راستہ جی چاہے اختیار کرلو لیکن اتنی سی بات تمہارے فائدے کی ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ تمہیں

---

[1] ان سے کہہ دو کہ یہ اسی صورت میں ہو سکے گا کہ تم اپنے اختیار و ارادہ کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ کرلو (تم ویسا ہی چاہو جیسا قانونِ خداوندی کا منشاء ہے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1397)۔

[2] جس کا جی چاہے وہ راستہ اختیار کرلے جو اسے خدا کے نظامِ ربوبیت کی طرف لیجائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1397)۔

یہ چاہیے کہ وہ راستہ اختیار کرو جو خدا چاہتا ہے کہ تم اختیار کرو اور خدا تمہاری بھلائی چاہتا ہے۔ تو ایسا راستہ اختیار کرو جس میں بھلائی ہو۔ دیکھا بات کہاں سے کہاں جا پہنچی! تم نے کچھ فیصلہ کرنا ہے کہ سامنے دوراہا آ گیا ہے' سامنے Two Possibilite (دو ممکنات) آ گئیں' ہمنے تمہیں آزاد چھوڑ دیا ہے کہ جو راستہ جی چاہے اختیار کرو لیکن اتنی سی بات ہم تمہیں کہے دیتے ہیں کہ جو راستہ ہم چاہتے ہیں کہ تم اختیار کرو تو وہ اختیار کر لو گے تو بڑے فائدے میں رہو گے اور یہ ہم نے بتا دیا ہوا ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں کہ تم اختیار کرو۔

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی مرضی کو خدا کی مشیت کے ساتھ ہم آہنگ کرے

سارا قرآن کریم جسے آپ قرآن کے احکام کہیے' قرآن کی تشبیہات کہیے' اقدار کہیے' اصول کہیے' وہ صرف یہ بات ہے کہ خدا ہمارے متعلق کیا چاہتا ہے کہ تم کیا کرو۔ ہمارے ارادے میں وہ دخل نہیں دیتا۔ صرف یہ چیز ہے کہ تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں کہ تم چاہو۔ پھر اس صورت میں تو بتانا ضروری تھا کہ اس باب میں خدا کی مشیت کیا ہے۔ عام الفاظ میں یوں کہیں گے کہ تم اپنی مشیت کو خدا کی مشیت سے ہم آہنگ کر لو۔ اپنی مرضی سے' اپنے ارادے سے' ہماری مشیت کے ساتھ ہم آہنگ کر لو۔ اسی کو تو صِبۡغَةَ اللّٰهِ (2:138) کہتے ہیں۔ ہمارا ایک رنگ ہے تم نے چاہا ہے کہ میں اپنا دوپٹہ اس رنگ میں رنگوں تو وہ اپنی مرضی سے خدا ہی کے رنگ میں کیوں نہ رنگ لوں' اس طرح خدا ہی کے رنگ میں ہم آہنگ ہو جاؤں۔ قرآن حمید نے اس کے لیے نہایت واضح الفاظ میں بات کہی ہے۔ مومنین کا بلند ترین مقام یا ان کی علامت یا ان کے اعمال کی خصوصیت رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ (5:119) ہے۔ لیکن یہاں تو پھر وہی بات ہو گئی کہ ترجمہ کیا کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہ بڑی Abstract (غیر محسوس) سی بات ہے۔ آپ کو کیسے معلوم ہوئی؟ یعنی آپ تو اپنے ذہن کے اندر طے کر لیں کہ میں خدا سے راضی ہوں' یہ طے کیا کیا گیا کہ پھر اُسی تقدیر پہ آ گئے۔

راضی برضا کا قرآنی مفہوم: ان کا عمل ہماری مشیت سے ہم آہنگ ہو گیا

راضی برضا آپ کے ہاں ایک فقرہ ہے۔ یہ وہی تقدیر کا مسئلہ ہے جو پہلے چلا آ رہا تھا' ایران والا جبر کا مسئلہ ہے ''وَمَا تَشَآءُوۡنَ'' کا ترجمہ کیا کہ تم چاہ ہی نہیں سکتے بجز اس کے کہ جو خدا چاہے۔ جو رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ (5:119) ہے اس کے لیے راضی برضا ہونا ہے۔ یہ وہی ''مرضی یار کے خلاف نہ ہو'' والی بات ہے۔ راضی برضا تو آپ کے ہاں ایک بڑی مشہور سی چیز ہوئی ہے' خود کچھ فیصلہ نہ کرنا بلکہ جو کچھ اس کی طرف سے ہو رہا ہے' اس پر راضی برضا ہو جانا۔ پھر اس آیت کا ترجمہ یہ کیا۔ انگریزی والوں نے تو Pleased ہی کر دیا جناب! خدا کی رضا مندی حاصل کی جائے' خدا کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ اس سے سارا یہ مقصود ہے۔ اب اپنے ذہن میں ہی ایک فیصلہ کر لیتے ہیں کہ بس جی ہم نے جو کر لیا ہے اس سے تو خدا راضی ہو گیا۔ تم کیسے ہوئے' جو اس کی طرف سے ہو گا' ہم

اس کے خلاف شکایت تک لب پر نہیں لائیں گے تو ہم راضی ہونگے۔ وہیں اسی جبر کے اوپر آ گئے جو ایران نے تقدیر کا مسئلہ چاہا تھا۔ جب ایک چیز پہلے سے ذہن میں طے کر لی جائے تو پھر یہ ہے جو قرآن حمید نے کہا تھا کہ اسی قرآن سے لوگ گمراہ ہونگے۔ حالانکہ عربی والوں سے پوچھ لیتے تو یہ نہ ہوتا۔ رضا کے معنی ہوتا ہے کہ ''کسی چیز سے ہم آہنگ ہو جانا''۔ یہ Pleased والی بات نہیں ہے بلکہ اس سے ہم آہنگ ہو جانا ہے۔ کہا یہ تھا کہ یہ مومن وہ ہیں کہ انہوں نے یہ کچھ کیا تو یہ انہوں نے خدا کی مشیّت کے مطابق کیا۔ یعنی کیا یہ کہ ان کا عمل ہماری مشیّت سے ہم آہنگ ہو گیا' ہماری مشیّت یا قانون کے نتائج ان کے عمل سے ہم آہنگ ہو گئے۔ یہ وہی چیز ہو گئی جو ہم نے کہا تھا کہ جو چاہو راستہ اختیار کر لو' انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا جو ہم چاہتے تھے کہ یہ کریں تو ان کا فائدہ ہوا' اِنہوں نے وہ اختیار کیا تو یہ ہماری مشیت سے ہم آہنگ ہو گئے۔ جیسا ہم چاہتے تھے تو اِنہوں نے ایسا اپنے اختیار سے کیا۔ یہ کیا تو ہم نے تو کہا تھا کہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا تو وہ نتیجہ نکل آیا' ہم ان سے ہم آہنگ ہو گئے یہ ہے رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ (5:119)۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ من قضائے حق شود

[اقبالؒ]

قضائے حق یا تقدیرِ یزداں کا مفہوم اور دنیائے تصوف

یہ جو خدا کی رضا میں فنا ہو جانا ہے تو ایک تو وہ تصوف والوں میں آ گیا' پھر وہی ہوا کہ مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو۔ کہا یہی ہے' جو قرآن مجید نے کہا ہے کہ رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ (5:119) اگر تم اپنے چاہنے کو' اپنے مقاصد کو' اپنے اس مدعا کو' اپنی ان آرزوں کو' جو خدا چاہتا ہے کہ کرو تو اگر اس کے مطابق کر لو گے تو جو کچھ تم کرو گے وہ درحقیقت یہ نہیں ہے کہ تم کر رہے ہو' وہ تو خدا کی مشیّت کر رہی ہو گی۔ یہ قضائے حق ہو جاتی ہے اس لیے کہ قضائے حق صرف یہ ہے کہ خدا کا فیصلہ تھا کہ یہ راستہ اختیار کرو' تم نے یہ راستہ اختیار کر لیا تم قضائے حق ہو گئے:

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تُو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

کیا ہے تقدیرِ یزداں؟ وہی کہ جو خدا چاہتا ہے تم اس کے مطابق کیوں نہیں چاہتے۔ اس میں آپ کی اپنی مرضی اور ارادہ و انتخاب سلب نہیں کیا گیا۔ یہ اپنی مرضی ہے لیکن وہ خدا کی مشیّت سے ہم آہنگ ہے۔ اور یہی چیز ہے جس پر اقبالؒ (1938-1877ء) تو بار بار آیا۔ وہ بڑا انقلابی تھا' یہ وہی ہے' جو اس کا مشہور شعر ہے:

تری دعا ہے کہ ہو آرزو تری پوری
مری دعا ہے' تری آرزو بدل جائے

یہ بدلنا کیسے ہے؟ ویسے تو ہم ہر وقت بدلتے ہی رہتے ہیں لیکن وہ بدلتے رہتے ہیں اپنے ہی فائدوں کے مطابق' اپنے ہی اغراض کے مطابق۔ یہ ایسا بدلنا نہیں ہے۔ بدلنا یہ ہے کہ جو خدا چاہتا ہے کہ تم کرو تو تم اُس کے مطابق اپنی آرزو بدل لو۔

خدا تعالیٰ انسان کے لیے کیا چاہتا ہے؟

یوں تو قرآنِ کریم کے بیشتر مقامات اس کے لیے پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن اس وقت میرے ذہن میں ایک ریفرنس (7:176) ہے۔ خدا کیا چاہتا ہے؟ یعنی وہ کیا کہتا ہے کہ ہم کیا چاہتے تھے کہ تم بن جاؤ؟ بات ہوگئی کہ جیسے یہ ہے کہ جو وہ چاہتا ہے تم اس کے مطابق اپنی آرزو بدل لو۔ ایک آیت کے اندر دونوں باتیں قرآن حکیم کہہ گیا ہے۔ کہا کہ **وَ لَوۡ شِئۡنَا لَرَفَعۡنٰهُ بِهَا** (7:176) ہم چاہتے یہ تھے کہ تم قرآن حکیم کی رو سے رفعتوں اور بلندیوں تک پہنچ جاؤ۔ یہ ایک بات ہوگئی کہ خدا کیا چاہتا ہے۔ اس کے بعد کہا کہ **وَ لٰکِنَّهٗۤ اَخۡلَدَ اِلَی الۡاَرۡضِ** (7:176) لیکن تم ہو کہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چمٹے چلے جاتے ہو۔ ہم چاہتے تھے کہ تمہیں ہم اس قرآن حکیم کی رو سے بلندیوں تک لے جائیں لیکن تم ہو کہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چمٹتے چلے جاتے ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ تم کیسے زمین کی پستیوں کے ساتھ چمٹے چلے جا رہے ہو؟

عربی لفظ ھوٰی کا قرآنی مفہوم

قرآن حمید نے اس سوال کا جواب دیا کہ **وَ اتَّبَعَ هَوٰهُ** (7:176) تم اپنی ہی خواہشات کے پیچھے چلتے چلے جاتے ہو۔ او بابا! ہم جو کہتے ہیں وہ تو کر لو' تم تو اپنے ذہن کے اندر جو آتا ہے' جو اپنی خواہشات ہیں' جو اپنے جذبات ہیں' جو اپنے ارادے ہیں' ان کے مطابق چلتے ہو' زمین کی پستیوں کے ساتھ چمٹے چلے جاتے ہو جبکہ ہم چاہتے تھے کہ تم آسمان کی بلندیوں کی طرف چلے جاؤ۔ دیکھا کہ خدا کی مشیت اور اس میں کیا فرق ہوا؟ پھر تم کیا کرو؟ کرو یہ جو ہم چاہتے تھے۔ ہم کیا چاہتے تھے؟ ہم چاہتے یہ تھے کہ تم آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جاؤ' بجائے اس کے کہ تم اپنے ہی ''ھوٰی'' کے پیچھے لگ جاؤ۔ یعنی ہم تو اس لفظ ''ھوٰی'' کا ترجمہ خواہشات آرزوئیں کرتے ہیں لیکن یہ تو عرب کی زبان ہے' اُن کے ہاں ھوٰی کے معنی ہیں ''ہر وہ چیز جو نیچے کی طرف لے آئے''۔ ہم چاہتے تھے کہ تم قرآن مجید کی رو سے بلندیوں کی طرف جاؤ لیکن تم اپنے ہی جذبات کے تابع' اپنی ہی مفاد پرستیوں کے تابع' زندگی بسر کر کے پست تر ہوتے چلے جاتے ہو۔ تم وہ کیوں نہیں چاہتے جو ہم چاہتے تھے کہ تم ہو جاؤ۔ دیکھا آپ نے کہ ایک ہی آیت کے اندر بات کیسی صاف ہوگئی ہے اور اِس قسم کی تو

بیسیوں آیات قرآن مجید میں ہیں۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ تم یہ بن جاؤ۔ اور قرآن حمید کی خصوصیتِ کبریٰ جو اقبالؒ (1877.1938ء) نے ایک مصرعے میں بیان کی ہے' یہ ہے کہ صاحب! اسلامی نظام کیا کرتا ہے' قرآن حمید پہ عمل کیا جائے تو کیا ہوتا ہے:

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا ❶

خدا اپنا حکم اشیائے کائنات پر تو ٹھونستا ہے مگر انسان پر نہیں: یہ ہے مسئلہ تقدیر کا حل

یہ قرآن کریم تمہیں ایسا بنا دیتا ہے جیسا خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ۔ جو خدا چاہتا ہے وہ تم پر ٹھونستا نہیں ہے۔ وہ تو اشیائے کائنات کے اوپر ٹھونس دیا ہے' ہم چاہتے ہیں کہ پانی نشیب کی طرف بہے تو وہ بہتا ہے۔ انسان کی دنیا کے اندر یہ کہا کہ تمہارے سامنے دونوں راستے ہیں' جو راستہ جی چاہے اختیار کرو لیکن یہ ہم تمہیں بتا دیں کہ ہم تمہارے بھلے میں چاہتے یہ ہیں کہ تم یہ راستہ اختیار کرو جو ہم نے تمہیں بتا دیا ہے یہ نہ اختیار کرو گے تو پھر بھگتو۔ یہ اختیار کر لو گے تو کیا ہو گا؟ یہ ہو گا:

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

خدا چاہتا ہے کہ تم ایسے ہو جاؤ' قرآن کریم تمہیں ایسا کر دیتا ہے' ایسا بنا دیتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا' عزیزانِ من! کہ یہ اتنا لاینحل اور مشکل مسئلہ تھا۔ آپ میں سے جو احباب فلسفہ یا Ethics (اخلاقیات) کے طالبعلم ہیں' وہ جانتے ہیں کہ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے انسانی فکر ہزاروں سال سے کس قدر سرگرداں چلی آ رہی ہے اور آپ نے دیکھا کہ کس آسانی سے قرآن کریم اس کو حل کرتا ہے۔ اس نے کس آسانی سے اس کو حل کیا لیکن اس کے باوجود ہم وہیں کے وہیں چلے گئے۔

تقدیر کے غلط مفہوم کی سوچ نے احساسِ زیاں کو بھی ختم کر دیا ہے

عزیزانِ من! یہ اس لیے ہوا کہ اُس تقدیر کے غلط مفہوم میں بڑی تن آسانی تھی کہ کچھ نہ کرو اور کوئی ذمہ داری قبول نہ کرو اور کہہ دو کہ خدا کی مرضی یہ ہے۔ فریب تو دے لیا اپنے آپ کو لیکن اس کا جو نتیجہ بھگت رہے ہیں' وہ بھی کوئی حمیت و غیرت والا ہو تو اُس کو اس کا احساس ہو۔ جب یہ کہا کہ یہی مرضی' خدا کی ہے' جو ہم ایسے ہیں' تو پھر معاملہ ختم ہو گیا۔ یہ جو کچھ تھوڑا بہت احساس

---

❶ قرآنی آئین و نظام کے اتباع سے انسان کے اندر جو تبدیلی واقع ہوتی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے مفکرِ قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) کہتے ہیں:

خستہ باشی! استوارت می کند — پختہ مثلِ کوہسارت می کند

گر زمینی! آسماں سازد ترا — آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا — (مثنوی ''اسرار و رموز'')

(اگر تو کمزور اور نرم ہو جائے' تجھے مضبوط کرتا ہے اور تجھے پہاڑ کی طرح پختہ بنا دیتا ہے۔ اگر تو زمین کی طرح پست ہے تو تجھے آسمان بنا دیتا ہے' (بلند رتبے والا) اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی تجھے دیتا ہے)۔

پیدا ہونا تھا کہ یہ ہماری حالت ایسی کیوں ہوگئی' اس سے یہ جسے اتنی سی خلش کہتے ہیں' وہ بھی اس قوم میں باقی نہ رہی۔ اور وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (3:26) کا ترجمہ کیا کہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے' ذلیل کر دیتا ہے۔ چل بھئی! یہ تو اس کی مرضی ہوئی۔ اِس لیے اس پستی میں سے ہمت کر کے نکلنا تو (معاذ اللہ) خدا کے خلاف بغاوت ہو جائے گی' سرکشی ہو جائے گی۔ اس کی مشیّت یہ ہے کہ ہم زوال میں رہیں اور ہم یہ کوشش کریں کہ ہم اوپر چلے جائیں۔ ذلت بھی اس سے ہوئی' عزیزانِ من! اور منافقت بھی ہوئی۔ بچہ بیمار ہوتا ہے تو اس کے لیے مشیّت اور تقدیر پہ ایمان بھی ہے کہ بیماری بھی اُس کی طرف سے آتی ہے' صحت بھی اس کی طرف سے آتی ہے' موت بھی اس کی طرف سے آتی ہے۔ اگر اِسی پہ یقین کی بات ہو جائے تو پھر تو چارہ جوئی' کچھ حیلہ کاری' کچھ علاج معالجہ' کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بیماری اُس نے بھیجی ہوئی ہے' اس کی مشیّت میں ہے' اس کے فیصلے میں ہے کہ اس نے بیمار رہنا ہے' اس کے بعد اس کا فیصلہ ہے کہ اس نے مر جانا ہے تو مر جانا ہے' اُس کا فیصلہ ہو کہ اس نے اچھا ہو جانا ہے تو اچھا ہو جانا ہے۔ لیکن یہ تو ڈاکٹروں کے پیچھے بھاگے جا رہے ہیں۔ یعنی یہ بیماری اُس کی طرف سے آئی ہے اور اس نے اتنے دن رہنا ہے پھر اس کے بعد جو نتیجہ ہونا ہے تو وہ بھی اس نے فیصلہ کر رکھا ہوا ہے۔ یہ ساری بھاگ دوڑ کیوں ہو رہی ہے؟ کہنے لگے: جی ٹھیک ہے' تقدیر پہ ہمارا ایمان ہے لیکن تدبیر بھی تو فرض ہے۔ کیا بات ہے اس ایمان کی اور کیا بات ہے اس فریضے کی!!!

متضاد خیالی اور متضاد عملی کی انتہا: تقدیر بھی اور تدبیر بھی

ایمان اس کے اوپر ہے تو ٹھیک ہے لگے رہو مگر یہ تو ساری بھاگ دوڑ ہو رہی ہے۔ مقدمے ہیں' ان میں بھاگ دوڑ ہو رہی ہے' علاج و معالجے میں بھاگ دوڑ ہو رہی ہے۔ وہ بھاگ دوڑ بھی ہو رہی ہے اور ساتھ یہ بھی ایمان ہے کہ صاحب! سب خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ دیکھا آپ نے کہ جب انسان' قرآن مجید تو عظیم چیز ہے' اس کا دامن چھوڑتا ہے تو کہاں پہنچتا ہے؟ یہ Reason (استدلال' عقل و فکر) کا دامن چھوڑ دیتا ہے تو پھر بھی دیکھیے کہ کہاں پہنچ جاتا ہے۔ خالص قرآن مجید کو چھوڑ کر صرف عقلی طور پر ہی ان سے بات کرو کہ دو چیزیں کیسے اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ فیصلہ ہوا ہوتا ہے' اس کے مطابق ہونا ہے' وہ اٹل ہے' کوئی بدل نہیں سکتا اور ساتھ تدبیریں بھی ہو رہی ہیں۔ یہاں تک پہنچا دیتی ہے یہ چیز انسان کو۔ بھئی یہ کیوں ایسا ہے؟ کہ جی! ہم یہ نہیں کہہ رہے' یہ تو امام غزالی (1058-1111AD) کہہ گیا ہے' فلاں امام کہہ گیا ہے۔ چل بھئی۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (41:40)۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ ان سے پوچھو کہ جو شخص تباہ کر دینے والے عذاب میں مبتلا کر دیا جائے وہ اچھا ہے' یا وہ جو ظہور نتائج کے وقت ان تباہیوں سے محفوظ اور مامون رہے؟ اس

فرق کو سامنے رکھو اور پھر جو کچھ تمہارے جی میں آئے کرو؛ جونسی روش جی چاہے اختیار کرلو تم پر کوئی زبردستی نہیں' بس اتنا سمجھ لو کہ خدا کا قانون مکافاتِ اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ تم جونسی روش اختیار کرو گے' اس کے مطابق نتیجہ مرتب ہو جائے گا۔ قرآن مجید اگلی آیت میں ساری بات کہہ گیا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ (41:41)۔ قرآن مجید ان کے سامنے آتا ہے۔ انہوں نے اس سے انکار کیا۔ ہم باقی ساروں کو تو کافر کہتے ہیں' ہم آج تو یہ کہہ ہی نہیں سکتے لیکن بتاؤ کہ کیا یہ قرآن مجید سے کفر نہیں تو اور کیا ہے!! یہاں کہا ہے کہ لَمَّا جَآءَهُمْ (41:41) جب یہ قرآن مجید ان کے سامنے پیش کیا جائے لیکن کہا یہ کہ تمہارے غلط مفہوم لینے سے' غلط تفسیروں سے' غلط عمل کرنے سے' اپنے آپ کو فریب دینے سے' اس کتاب کا کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ فریب دے لینے سے کہ سنکھیا مہلک نہیں ہوتا اور پھانک لیا جائے تو کہا کہ تم تو ایک ہو وہ ساری دنیا کے Votes (ووٹ) بھی اس کے حق میں آجائیں کہ یہ مہلک نہیں ہوتا' تو یہ پھر بھی مہلک ہی رہتا ہے۔

خدا کا مکمل قانون بڑے غلبے والا ہے جو کبھی نہیں بدلتا مگر یہ ہیں کہ الفاظ تو نہیں' کچھ اور کرتے ہیں

خدا کا یہ قانون بڑی قوت والا ہے۔ کہا کہ تم نے اس کے خلاف یہ کچھ کیا' اس سے انکار کرتے ہو' سرکشی برتتے ہو۔ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ (41:41) یہ کتاب بڑی قوتوں کی مالک ہے' یہ قرآن کریم کا قانون بڑے غلبے والا ہے۔ یہ نہیں بدل سکتا۔ تم اس کے خلاف' جو جی چاہے قرآن کریم کی طرف منسوب کر دو' یہ سرکشی ہے' کفر ہے' انکار ہے' اس کا کچھ نہیں بگڑتا' اس کے قوانین اپنی جگہ اٹل ہیں۔ یہ کتاب ایسی عزیز ہے' صاحبِ غلبہ ہے کہ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (41:42) باطل نہ اس کے سامنے آسکتا ہے' نہ اس کے پیچھے سے آسکتا ہے۔ قرآنِ کریم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115) جو کچھ خدا نے انسانوں کے لیے کہنا تھا' رہنمائی دینی تھی' وہ مکمل طور پر اس کتاب کے اندر دیدی' اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں' اس میں کچھ کمی نہیں رہنے دی۔ اس میں کوئی تبدیلی بھی نہیں ہوگی اور نہ کوئی تبدیلی کرسکتا ہے۔ حق اور اضافہ نہیں' تغیر و تبدل نہیں۔ اور پھر نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9) یہ کتاب محفوظ ہے اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ یہ مکمل' ابدی' غیر متبدل' محفوظ کتاب خدا کی طرف سے ہے۔ اب یہ بات ہے کہ جو باطل ہے یعنی جو چیز قرآن کریم کے خلاف ہے' وہ باطل ہے' وہ نہ اس کے سامنے سے آسکتا ہے' نہ اس کے پیچھے سے۔ سامنے سے آنا تو یہ ہے کہ دھڑلے سے مقابلے کے اندر چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر آنا' پیچھے سے آنا وہ ہے جسے سازش کہتے ہیں' یہ بھی نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے' حفاظت کا ذمہ خدا نے آپ لیا ہے تو اس کے الفاظ کی حفاظت کرتے رہیے' اسے ہم نہیں بدل سکتے اور بدلنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ سابقہ مذاہب کی جو مبینہ آسمانی کتابیں ہیں' ان میں ان

لوگوں نے ان کے الفاظ ہی بدل دیئے تھے۔اس لیے وہ نظر آ گئیں کہ محرف ہیں' ان کو بدل دیا گیا اور دوسری کتابیں آئیں۔انہوں نے اس قرآن کریم کے الفاظ کو نہیں بدلا' الفاظ اسی طرح سے ہیں۔اِنہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے الفاظ اسی طرح سے ہیں تو رہیں' ہم کچھ اور کرتے ہیں۔

قرآن حکیم جیسی عظیم کتاب کے ساتھ برپا ہونے والا سلوک: رجم کی سزا کے معاملے کا شرعی عدالت کا فیصلہ اور اس کے خلاف واویلا

آپ کو پتہ ہے کہ اب اس کتابِ عظیم کے متعلق عقائد کیا ہیں' میں یہ مغرب زدہ سیکولر دماغوں کے عقائد نہیں کہہ رہا۔ان بیچاروں کی کیا جرأت ہے۔یہ جو ہمارے ہاں مذہب کے اجارہ دار ہیں' یہ اُن کے متعلق میں عرض کر رہا ہوں اور آج کل زیادہ واضح طور پہ بات سمجھ میں آ جائے گی کیونکہ بدقسمتی سے یا خوش قسمتی سے ایک عملی مسئلہ سامنے آ گیا ہے کہ رجم کی جو سزا ہے یہ اسلام کے مطابق ہے یا نہیں یعنی زانی کو پتھر مار مار کر مار دینا۔قرآن حکیم میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ اس کی سزا کوڑے لگاؤ۔اس میں کہیں یہ بات نہیں ہے کہ پتھر مار مار کر ختم کر دو۔آپ کو معلوم ہو گا کہ ان کا جو قانون تھا' اُس میں یہ چیز لکھی ہوئی تھی کہ رجم کرو۔وفاقی شرعی عدالت نے یہ کہہ دیا کہ یہ خلافِ اسلام ہے کیونکہ یہ قرآن حکیم میں نہیں ہے۔اب اس کے خلاف پورے ملک کے اندر ایک طوفان مچا ہوا ہے کہ ان ججوں کو ہٹا دو' یہ منکرِ حدیث ہیں' دوسرے مولوی صاحبان ان کی جگہ مقرر کرو' اس فیصلے کو بدلو' اپیل کرو۔یہ قرآن کریم میں نہیں ہے۔اتنا ہی نہیں کہ نہیں ہے جو قرآن کریم میں ہے' یہ اس کے بھی خلاف ہے۔عزیزانِ من! پانی کے اندر ڈبکی ماردی جائے تو پھر نہ کچھ نظر آیا کرتا ہے اور نہ کچھ سنا جایا کرتا ہے۔ہم نے پانی کے اندر ڈبکی ماری ہوئی ہے۔ذرا بھی Reasonable (معقول) بات کی جائے تو پوچھا جائے کہ صاحب! قرآن کریم میں تو اس کے خلاف ہے۔اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ آج کل جو بحثیں چل رہی ہیں۔

رجم کی سزا قرآن حکیم میں نہ ہونے کے باوجود قرآن حکیم میں ہونے کا دعویٰ

اس سزا کے بارے میں یہ نہیں کہا جا رہا کہ قرآن حکیم میں نہیں ہے۔کہا یہ جا رہا ہے کہ قرآن اور حدیث اور روایات اور قیاس اور اجماعِ امت' سب اس کے حق میں ہیں کہ جی' رجم ہو۔قرآن حکیم کا لفظ بھی لکھا ہوتا ہے۔شامت آ گئی ان کی جو قرآن حکیم کے مطابق کچھ دلیل مانگ لیتے ہیں کہ بھائی صاحب! سند تو دیدیجیے کہ کونسی آیت ہے۔عزیزانِ من! ان حضرات کے آج کل جو بیانات و دلائل اخباروں میں شائع ہو رہے ہیں' وہ پڑھیے وہ بڑے دلچسپ ہیں۔اس میں یہ بات ہے کہ باطل کیسے آتا ہے۔پوچھا گیا کہ صاحب! قرآن حکیم میں تو یہ ہے نہیں اور تم کہتے ہو کہ قرآن حکیم میں ہے۔کہتے ہیں کہ یہ ان کا عقیدہ ہے' یہ لکھ رہے ہیں' یہ دلیل دے رہے ہیں۔کہتے ہیں کہ قرآن حکیم میں یہ آیت تھی مگر اب نہیں ہے۔جس قرآن حکیم کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا ہوا ہے' اس کے متعلق یہ یوں کہہ

رہے ہیں۔ یہ میں ایسے ہی نہیں کہہ رہا' عزیزانِ من! یہ ان کے ہاں روز لکھا جا رہا ہے' ان کے ہاں کی اخباروں میں دلیل دی گئی ہے کہ یہ آیت قرآن حکیم میں تھی لیکن اب نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اِس قرآن حکیم کے متعلق جس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا ہوا ہے' اس کے متعلق عقیدہ کیا ہے؟ عقیدہ یہ ہے کہ ایسی کئی آیات قرآن حکیم میں آئی تھیں جو اس کے بعد اس میں سے اٹھا دی گئیں۔ آیتیں بھی اٹھا دی گئیں ان کا حکم بھی اٹھا دیا گیا!!! بات تو اتنی رہ گئی کہ صاحب! اُس خدا کے متعلق کیا کہیں گے جس نے کہا تھا کہ ہم نے نازل کیا ہے' ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ کہنے لگے ٹھیک ہے اُس نے نازل کیا ہے' اُس نے اٹھا لیا ہے ''تسی چاچے لگدے او'' ؟ [1]

نبی اکرمؐ صحابہ اور کرامؓ کے عہد میں قرآنِ حکیم کا پھیلاؤ مگر یہ کہتے ہیں کہ قرآنِ حکیم کی سورتوں کو اٹھا لیا

ہم نے کہا ہے کہ صاحب! نبی اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کے زمانے میں قرآنِ حکیم تو کم از کم بارہ لاکھ مربع میل مملکت کے اندر پھیلا ہوا تھا۔ وہاں تو ہر مسلمان کے پاس قرآن حکیم تھا اور یہ اس کے اتنے سارے الفاظ تھے۔ اس قرآن کریم کی یہ اتنی آیات تھیں وہ اس میں سے اٹھا کیسے دی گئیں' انہیں نکالا کیسے گیا؟ کہنے لگے کہ دیکھیے' وہ ایک روایت ہے کہ دو صحابی تھے' وہ قرآن کریم کی ایک سورۃ کو اپنی نمازوں میں پڑھا کرتے تھے' ایک رات وہ اٹھے اور انہوں نے پڑھنا چاہا' تو وہ اُن کے ذہن میں ہی نہیں تھی' وہ حضورؐ کے پاس آئے کہ حضورؐ یہ ایک سورۃ تھی' ہم نے آپؐ سے سنی' ہم نے یاد کی' ہم نمازوں میں پڑھتے رہے' آپ کے سامنے دہراتے رہے' رات ہم اِسے پڑھنے کے لیے اٹھے تو وہ ہمیں یاد ہی نہیں آرہی۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس طرح اللہ تعالیٰ قرآن حکیم کی سورتوں کو اٹھا لیا کرتا ہے۔ تو گویا یہ تو اٹھا دیں۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے' سورتیں بھی اٹھا لیں' ان کا حکم بھی اٹھا لیا۔ بس اب بات ختم ہوگئی۔

قرآن حکیم پر چاروں طرف سے ہونے والا سلوک

یہ حضرات کہتے ہیں کہ قرآن حکیم میں ایک تو یہ اس قسم کی آیات تھیں۔ دوسری وہ آیات ہیں جو قرآن حکیم میں سے تو اٹھا لیں لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ اب آپ دیکھ رہے ہیں۔ عزیزانِ من! کہ میں یہ کسی پرانے دور کی داستانیں نہیں بیان کر رہا' آج کی بات بیان کر رہا ہوں۔ ہزار سال سے یہ عقائد چلے آرہے ہیں کہ قرآن حکیم میں آیات نہیں ہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ کہا کہ ان میں آیہ رجم تھی۔ جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن حکیم کی رو سے بھی رجم ہے تو وہ یہ ہے۔ تم مطالبہ کرتے ہو کہ آیت دکھاؤ' تو تمہارا یہ عقیدہ نہیں ہے تم منکر ہو' قرآن حمید میں وہ آیت نہیں ہے' صرف اس کا حکم ہے۔ دوسری کیٹیگری آئی کہ آیات نہیں ہیں صرف ان کا حکم باقی ہے۔ اسی قرآن حمید میں تیسری کیٹیگری یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی آیات تو قرآن کے اندر ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہے۔

---

[1] کیا آپ اس کے چچا لگتے ہیں (جو یہ کچھ معلوم کر رہے ہو)؟

اور وہ آیات جن کا حکم باقی نہیں رہا تو ان کو پھر رکھا ہوا کا ہے کے لیے ہے۔ کہنے لگے ''او کر دیندے تے اینی کی جنی رہ جاندی کتاب۔''❶ آیات موجود ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہے تو وہ منسوخ ہو گئیں۔ یہ عقیدہ ہے۔ پوچھا کہ جس نے کتاب نازل کی' اُسی کا حق بنتا تھا کہ اس کے بعد وہ کہے کہ ہم نے یہ آیات نازل کی تھیں اور ہم انہیں منسوخ کرتے ہیں۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے ساتھ تو روز یہ ہوتا ہے' آپ کے ہاں دیکھتے ہیں کہ ایک قانون جاری ہوتا ہے اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کی صرف Ammendment (ترمیم) جاری ہوجاتی ہے اس کا Notification (اعلان' اطلاع) شائع ہوجاتی ہے اور وہ قانون منسوخ کر دیا جاتا ہے۔

500 سو قرآنی آیات کو منسوخ کرنے والے ائمہ تفسیر تھے' مذہب میں یہی کچھ ہوتا چلا آتا ہے

جب کوئی وکیل عدالت میں اس بات کو پیش کرتا ہے تو اگلا کہتا ہے کہ یہ جو منسوخ ہو چکی ہوئی ہے اُس کی سند کیا ہے۔ اس کی سند لینا پڑتی ہے۔ بقول اِن کے قرآن حکیم میں آیات ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے اور قرآن حکیم میں خدا نے کہیں نہیں کہا کہ ہم نے اس آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔ ارے بھئی! وہ قرآن میں تو کہیں نہیں ہے تو وہ کس نے منسوخ کیا ہے۔ کہا کہ وہ آئمہ تفسیر نے منسوخ کر دیا ہے۔ کہ جی کتنی آیات تھیں؟ شروع میں ان کے عقیدے کی رو سے قرآن حکیم کی پانچ سو آیتیں منسوخ ہیں۔ جب فیصلہ آئمہ تفسیر نے کرنا ہوا تو پھر جس جس کے متعلق جی چاہے منسوخ کرتے چلے جاؤ۔ پھر آپس میں ان کے جھگڑے بھی ہوتے رہے' وہ تو ہر معاملے میں ہوتے رہتے ہیں۔ تعداد کے اعتبار سے ان کے ہاں یہ طے نہیں ہے کہ تراویحوں کی تعداد کتنی ہے۔ وہ آٹھ بھی بتاتے ہیں اور بیس بھی بتاتے ہیں۔ قرآن حکیم کی آیات کتنی منسوخ ہیں؟ کہا کہ پانچ سو آیتیں تھیں' پھر آہستہ آہستہ بحث و تمحیص کے اندر یہ سمٹتی رہیں' کم ہوتی رہیں' گھٹتی رہیں' لیکن اس کے لیے جو اتھارٹی ہے وہ اُس خدا کی نہیں ہے' جس نے قرآن کریم نازل کیا تھا۔ یہ فیصلہ ان کا اپنا ہے۔

اب دونوں طرف سے آپ دیکھیے کتنی گنجائشیں ہیں۔ یہ جو رجم کا حکم ہے' نافذ ہوگا۔ صاحب! اس کی سند قرآن کریم میں تو نہیں ہے۔ کہا کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہوئی ہے۔ کہا کہ یہ کیسے ہوا؟ کہنے لگے کہ ہم جو کہہ رہے ہیں کہ یہ منسوخ ہوگئی ہے' جبکہ خدا نے کہا تھا کہ **لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ** (41:42) باطل نہ اس کے مقابلے میں سامنے سے آسکے گا' نہ پشت سے آسکے گا۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ سامنے سے آ کر بتا دیا کہ قرآن میں یہ آیت تھی اور اب نہیں ہے' حکم اس کا باقی ہے۔ پیچھے سے کہہ دیا کہ قرآن میں آیات موجود ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہوا ہے۔ یہ قرآن حمید ہے' محفوظ بھی ہے' غیر متبدل بھی ہے؟ **مَا یُقَالُ لَکَ اِلَّا**

---

❶ اگر یہ کر دیا جاتا تو قرآن کی یہ کتاب چھوٹی سی ہی رہ جاتی۔

مَا قَدۡ قِیۡلَ لِلرُّسُلِ مِنۡ قَبۡلِکَ اِنَّ رَبَّکَ لَذُو مَغۡفِرَۃٍ وَّذُوۡ عِقَابٍ اَلِیۡمٍ (41:43) ہماری وحی کے متعلق جو کچھ یہ لوگ تجھ سے کہتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہی کچھ تجھ سے پہلے رسولوں سے بھی کہا جاتا تھا۔ تیرا نشوونما دینے والا ان کی مخالفت سے تیری حفاظت کرے گا اور انہیں ان کے انکاروسرکشی کے نتیجے میں الم انگیز عذاب میں مبتلا کرے گا۔

عزیزانِ من! مذہبی پیشوائیت نے ہمیشہ یہ کیا ہے۔ مذہب جب Profession (پیشہ) بن جاتا ہے تو اس کی مختلف قسم کی تشریح کردی جاتی ہے۔ آپ فتویٰ لکھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے، حکمِ خداوندی یہ ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ یہ سارا کچھ یہاں اسی طرح سے Repeat (دوبارہ ہو بہو پیش) ہو رہا ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ مَا یُقَالُ لَکَ اِلَّا مَا قَدۡ قِیۡلَ لِلرُّسُلِ مِنۡ قَبۡلِکَ [1] (41:43)۔ یہ ہوتا چلا آیا ہے۔

خدارا! خدا کی کتاب کو احبار و رہبان سے سنگسار ہونے سے بچایئے

یہی تھے وہ مقامات جہاں انہوں نے اپنے لیے یہ خداوندی Authorities (اختیارات) لے لیں تھیں۔ یہ آیت خدا کی کتاب میں نہیں ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت ہے۔ خدا کی کتاب میں یہ حکم موجود ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ جی! یہ منسوخ ہوگیا ہے۔ قرآن حکیم نے یہود ونصاریٰ سے کہا تھا کہ انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا سے ورے خدا بنا رکھا ہے۔ یہ خدا سے ورے خدا بنانے والی بات نہیں ہے۔ خدا کی آیت قرآن حکیم میں موجود ہے لیکن کہتے ہیں کہ منسوخ ہے۔ پوچھو کیسے؟ تو کہتے ہیں ہم جو کہتے ہیں۔ اور یہ جو ان کا ''ہم'' ہے بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ یہ جو یہاں آج آپ کے سامنے موجود ہے وہ خود یہ نہیں کہتے کہ ہم کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سلفِ صالحین نے ایسا فرمایا تھا۔ یہ جو وہ سلف ہوتے ہیں یعنی جوان سے پہلے مرگئے، اپنے زمانے میں یہ اپنے آپ کو نہیں کہتے۔ جب یہ مر جائیں گے تو یہ اسلاف کے زمرے میں شامل ہو جائیں گے، پھر یہ بھی سلفِ صالحین ہو جائیں گے۔ یعنی پھر ان کا جو آج کا کہنا ہے وہ آج سند نہیں ہے، وہ سند ان کی پیش کرتے ہیں۔ جب وہ سامنے ہی نہیں ہیں تو کوئی کن سے پوچھے اور جب یہ مر جائیں گے تو جو آنے والے ہیں وہ ان کو اتھارٹی کوٹ کریں گے کہ سلفِ صالحین یہ فرما گئے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ ان یہود ونصاریٰ کے اپنے احبار و رہبان دونوں نے انہیں جرائم اور حرام خوری سے نہیں روکا۔ انہوں نے بھی مذہب کو کاروبار بنالیا۔ ان میں یہ احبار تھے۔

اس قرآنِ ظاہر کے علاوہ اربابِ طریقت کے ہاں ایک قرآنِ باطن بھی ہے

جنہیں اربابِ شریعت کہا جاتا ہے، میں ان کی باتیں کر رہا ہوں۔ اربابِ طریقت کی طرف آؤں تو وہ تو پوچھو ہی نہیں لیکن بہرحال

---

[1] ہماری وحی کے متعلق جو کچھ یہ لوگ تجھ سے کہتے ہیں، وہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہی کچھ تجھ سے پہلے رسولوں سے بھی کہا جاتا تھا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1119)

بات قرآنِ ظاہر کی ہو رہی ہے۔ ایک قرآنِ باطن ہے' آپ کو اس کا معلوم نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو عربی زبان کے الفاظ ہیں' ان کے ظاہری معنی نہیں ہیں' ان کے نیچے کچھ معنی چھپے ہوئے ہیں۔ اصل قرآن حمید کے معنی وہ ہیں۔ یہ کسی زبان کی رو سے نہیں ہے۔ خدا کہتا ہے کہ ہم نے اس کو عربی مبین میں نازل کیا ہے تو اب یہ سب کچھ کیا ہے؟ کہنے لگے کہ تم لوگ سطح بین ہو جو یہ کہتے ہو۔ قرآن حمید کا مغز ہم نے لے لیا' یہ جو الفاظ ہیں (معاذ اللہ) یہ تو ہڈیاں ہیں جو کتوں کے آگے پھینک دی ہیں۔ تو اب سمجھ میں آیا کہ جب انہوں نے کہا کہ صاحب! قرآن حمید کی رو سے بھی جو رجم ہے' خدا نے فرض کیا ہے' تو پوچھا کہ وہ آیت کہاں ہے؟ کہا کہ وہ آیت ہے جو اب قرآن میں نہیں ہے۔ اس کے برعکس اب قرآن میں تو آیت لکھی ہوئی ہے' کہنے لگے کہ یہ منسوخ ہے۔ انہوں نے اپنے احبار ور ہبان کو خدا سے ورے ہی خدا بنا رکھا ہے۔ اب اس چیز کے بعد بھی آپ پوچھتے ہیں کہ ہماری یہ حالت کیوں ہوئی؟

عزیزانِ من! آج دو تین ہی آیتیں آئی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں' کہ ایک بہت اہم چیز تھی' ایک بہت بڑا مشکل مقام تھا' خدا کرے کہ میں اس کو حل کر سکا ہوں۔ بہرحال قرآن کریم نے مجھے تو یہ بصیرت دی ہے اور میرے ذہن میں تو کوئی شکوک و اعتراض نہیں ہے' بڑے صاف صاف طریقے سے میرے سامنے آیات آتی ہیں۔ خدا کرے کہ یہ آپ کے سامنے بھی آ جائیں۔

سورۃ حم السجدة کی 43ویں آیت تک ہم آ گئے' 44ویں سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

ساتواں باب: سورة حٰمٓ السجدة (آیات 44 تا 50)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1981ء کی 15 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة حٰمٓ السجدة کی آیت 44 سے ہو رہا ہے: (41:44)۔

سابقہ آیت میں نبی اکرم ﷺ سے یہ بات کہی گئی تھی کہ یہ لوگ جو اس قدر اعتراضات کرتے ہیں، حجت بازیاں کرتے ہیں، مخالفتیں کرتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، یہی باتیں یہ اس سے پہلے بھی انبیائے کرامؑ سے کیا کرتے تھے، جو انہیں غلط راستوں سے ہٹا کر صحیح راستے پر لانے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ یہ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اگلی بات میں یہ بتایا کہ یہ بھی نہیں ہے کہ یہ جو کچھ تم کہتے ہو ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔

انسانی زندگی کے سلسلہ میں وحی نے ہر قوم کو اس کی اپنی زبان میں آگاہ کیا

قرآنِ کریم میں ہے کہ دنیا کی ہر قوم کی طرف خدا نے انبیائے کرامؑ کو بھیجا اور ہر نبی کو جو پیغام دیا وہ اس قوم کی زبان میں تھا جس کی طرف وہ نبی مبعوث کیا گیا تھا۔ ہونا ہی یہی چاہیے تھا۔ وہ جو پیغام بھیجا گیا تھا وہ تو ان کو سمجھانے کے لیے تھا۔ وہ اپنی زبان میں ہی اُس کو آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔

عربی زبان کی خصوصیات: وضاحت و بلاغت

قرآن حکیم کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ لسان عربی مبین میں بھیجا گیا ہے اور خود لفظ عربی کے معنی بھی ''فصوح'' کے ہوتے ہیں ''واضح'' کے ہوتے ہیں: مفصل بالکل صاف۔ اور پھر اس کے ساتھ قرآن حکیم نے مبین اور Add (جمع) کر دیا کہ ''نہایت واضح زبان میں۔'' عرب زبان کے معاملے میں' جیسا کہ آپ کو اب معلوم ہوگا' یہ بات متعدد بار آ چکی ہے' افضل تھے۔ ویسے بھی اقوامِ عالم میں جو امامت کے داعی تھے' جو فصاحت اور بلاغت تھا' وہ اُن کا شعار تھا' ان کو امتیاز تھا' اس کے اوپر فخر تھا۔ آج بھی جو زبان کے فن کے ماہرین ہیں' وہ بھی یہ بتاتے ہیں کہ یہ عربی زبان اور اُس زمانے کی عربی زبان' تمام دنیا کی زبانوں میں افضل مانی جاتی تھی اور اِن عربوں کو تو اُس کے اوپر بڑا ہی ناز تھا اور اتنا فخر تھا کہ وہ اپنے سوا ساری دنیا کو گونگے کہتے تھے' عجمی کہتے تھے۔ عجمی کے معنی ہی گونگے یا غیر فصیح ہیں۔ ان کی زبان کے مقابلے میں ہر زبان عجمی کہلاتی تھی۔ عربوں کے قریب ہمسائیہ ہونے کی بنا پر وہ اہلِ فارس کو عجم کہتے تھے کیونکہ وہی ان کے قریب تر تھے۔ لیکن ویسے وہ اس اعتبار سے ہر غیرِ عرب کو عجمی کہتے تھے' وہ انہیں بولنے والا تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ تو گونگے ہیں۔ یہ جو لفظ عربی ہے یہ تو اہلِ عرب کی زبان کے لیے بھی بولا جاتا ہے اور بنیادی طور پر فصیح کے معنی میں بھی آتا ہے تو عربی یعنی اہلِ عرب کی زبان فصاحت و بلاغت کی زبان ہے اور جب اس کے ساتھ مبین آ جائے تو یہ نہایت واضح زبان کے معنی دیتی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں جو عجمی زبان ہے وہ غیر فصیح کہہ لیجیے یا غیر عربوں کی زبان کہہ لیجیے۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی۔ اگر یہ قرآن کریم عربی کی بجائے عجمی زبان میں ہوتا' دونوں معنی آ سکتے ہیں' یا تو یہ کہ عجمی زبان میں ہوتا' ان لوگوں کی زبان میں ہی نہ ہوتا' جب بھی وہ یہی کہتے ہیں کہ بات ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتی' اس کو ذرا واضح کر کے بیان کیجیے۔ اور اگر یہاں عجمی کے معنی غیر فصیح ہیں تو پھر بھی یہ اس کے اوپر یہی اعتراض کرتے۔ یہ لوگ تو غیر فصیح زبان کو اپنے معاشرے کے اندر بھی برداشت نہیں کرتے تھے چہ جائیکہ ایک ایسی کتاب ہو جس کا دعویٰ ہی یہ ہو کہ وہ سرچشمہ علم سے آئی ہے۔ وہ غیرِ فصیح زبان ہو اور وہ اسے تسلیم کر لیں یہ تو ممکن ہی

نہیں تھا۔ اسی لیے وہ ایک کتاب نہایت عربی مبین میں ہے' فصیح ترین زبان کے اندر ہے تاکہ زبان کے اعتبار سے کسی قسم کا اس پہ اعتراض نہ کرسکیں۔ یہاں ایک بڑی اہم چیز سامنے آتی ہے۔ قرآنِ کریم زبان کے اعتبار سے تو بہرحال کسی زبان میں آنا تھا' اور عرب میں یہ عربی زبان کے اندر آیا۔

وحی کے الفاظ اور خیالات دونوں ہی خالصتاً خدا کی طرف سے ہوتے تھے

یہ جو ہمارے ہاں فلاسفر ہیں' اُن کا تو پوچھیے ہی نہیں کہ وہ اپنے میدانِ علم میں کہاں کہاں جاتے ہیں۔ بقول ان کے یہ جسے وحی کہا جاتا ہے یہ تو خدا کی طرف سے خیالات کا القا ہوتا تھا' جو زبان تھی' وہ خود نبی کی اپنی زبان ہوتی تھی' گویا الفاظ نبی کے اور وہ خیالات خدا کی طرف سے تھے۔ یہ چیز بنیادی طور پر' فلسفے کے اعتبار سے بھی' اور لسانیات کے اعتبار سے بھی' غلط ہے۔ کوئی خیال پیدا ہی نہیں ہوسکتا جب تک اس کے لیے الفاظ اس کے ساتھ نہ ہوں یعنی یہ مسلمہ ہے کہ خیال بغیر الفاظ کے پیدا نہیں ہوتا' لفظ بغیر خیال کے نہیں آسکتا❶ بشرطیکہ وہ شخص پاگل یا دیوانہ نہ ہو۔ جو صاحبِ ہوش ہے جو صاحبِ شعور ہے اس کے لیے جو لفظ اور معنی ہیں وہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ یہ جو کہا

---

❶ علامہ اقبالؒ (1938-1877ء) نے اپنے پہلے ہی خطبے میں دوٹوک الفاظ میں اس کا اظہار یوں کیا ہے کہ

Inarticulate feeling seeks to fulfil its destiny in idea which, in turn, tends to develop out of itself its own visible garment. It is no mere metaphor to say that idea and word both simultaneously emerge out of the womb of feeling, though logical understanding cannot but take them in a temporal order and thus create its own difficulty by regarding them as mutually isolated. (Iqbal, Allama Muhammad: The Reconstruction of Religious Thought in Islam. M.Saeed Sheikh (edited and annotated). Iqbal Acadeny, Lahore, 1989, P.18).

اردو قارئین کی سہولت کے لیے اس کا رواں ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

''مبہم اور بے زبان احساس (Feeling) اپنے مقصود تک پہنچنے کے لیے تخیل (Idea) کی شکل اختیار کرتا ہے اور تخیل اپنا لباس آپ بن کر (لفظ کی صورت میں) مرئی طور پر سامنے آجاتا ہے۔ یہ کہنا محض استعارہ نہیں کہ تخیل اور لفظ دونوں احساس کے بطن سے بیک وقت پیدا ہوتے ہیں۔ یہ منطقی اندازِ فہم (کا نقص) ہے جو یہ تصور کرتا ہے کہ تخیل اور لفظ ایک دوسرے کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور اس طرح اپنے لیے آپ مشکلات پیدا کرلیتا ہے۔''

ڈاکٹر بک (R.M.Bucke) اپنی مشہور کتاب Consciousness (شعور) میں تصور اور لفظ کے باہمی تعلق کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ ''ہر لفظ کے لیے ایک تصور ہوتا ہے اور ہر تصور کے لیے ایک لفظ۔ ایک دوسرے سے الگ' رہ کر ان کا وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا۔ کوئی نیا لفظ معرض وجود میں نہیں آسکتا' جب تک وہ کسی تصور کے اظہار کا ذریعہ نہ ہو اور کوئی نیا تصور پیدا نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ساتھ ہی اس کے اظہار کے لیے ایک نیا لفظ وجود میں نہ آجائے۔ ص۔27۔'' عصرِ حاضر کے مفکرین کی یہ تحقیق قرآن حمید کے اس دعویٰ کی تائید کرتی ہے کہ قرآن حمید بالفاظہٖ قرآن حمید ہے۔

جاتا ہے کہ خیالات خدا کی طرف سے آتے تھے اور الفاظ خود نبی کے ہوتے تھے' غلط ہے۔ جہاں تک وحی کی زبان کا تعلق ہے' قرآنِ کریم کا تعلق ہے' یہ بات بنیادی طور پہ غلط ہے۔ قرآن حکیم اپنے الفاظ میں قرآن حکیم ہے۔ ان الفاظ کی جگہ اگر عربی زبان کے بھی دوسرے الفاظ رکھ دیئے جائیں' وہ معنوی اعتبار سے بھی وہی ہوں جو قرآن حکیم کہتا ہے تو وہ بھی قرآن حکیم کا بدل نہیں ہو سکتے۔

اردو زبان میں نماز کا عمل غیر قرآنی ہے

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے کچھ عرصہ پہلے بتایا تھا کہ جب میں ابھی کراچی میں ہی تھا تو وہاں لاہور میں ایک شخص نے تحریک اٹھائی تھی کہ نماز اردو زبان میں پڑھی [1] جائے۔ عجیب بات ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں تو اس کی کوئی مخالفت نہیں ہوئی حالانکہ یہ مذہبی پیشوائیت کا مرکز ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ کہنے والا بہت بڑا افسر تھا۔ بہرحال میں نے کراچی سے اس کے خلاف مخالفت میں آواز اٹھائی اور وہ قدِ آدم پوسٹر وہاں سے چھپوا کر بھیجے کہ یہ ایک بہت بڑی سازش اور فتنہ ہے۔ اگر اس نے اردو میں نماز پڑھنے کی طرح ڈالی ہے تو یاد رکھیے! آپ کا قرآن محفوظ نہیں رہ سکتا۔

کسی بھی زبان کے الفاظ قرآنِ حکیم کا بدل نہیں ہو سکتے اور اردو میں نماز' تین نمازوں اور نو روزوں کا شوشہ

نماز میں قرآنِ کریم کے الفاظ ہوتے ہیں۔ اگر اسے تسلیم کیا جائے کہ اردو زبان میں بھی نماز بدل ہو سکتی ہے تو اس کے معنی ہیں کہ قرآن کے الفاظ کے بدل آپ کے ہاں کے اردو کے یا وہ تو کہتے تھے' پنجابی میں ہونی چاہیئے' کسی زبان کے بھی الفاظ قرآن کا بدل نہیں ہو سکتے۔ اور جب وہ قرآن کا بدل نہیں ہو سکتے تو نماز عربی زبان کے سوا دوسری زبان میں نہیں ہو سکتی۔ وہاں سے میں نے یہ چیز بھیجی۔ اور اتنا عرصہ [1] میں نے مسلسل اس کی مخالفت کی کہ بات وہیں دب گئی۔ آپ کو یاد ہے کہ میرے خلاف جو اعتراضات کیے جاتے ہیں اُن میں یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ شخص تین نمازوں اور 9 روزوں کا قائل ہے اور یہ بھی کہ یہ شخص اردو میں نماز پڑھانے کا قائل ہے حالانکہ میرا وہ قدِ آدم پوسٹر شاہد ہے کہ یہ ایک بہت بڑی سازش اور فتنہ ہے' نماز عربی زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں نہیں ہو سکتی' وہ صاحب یہاں موجود ہیں' میرے ساتھ ان کے بڑے اچھے تعلقات ہوا کرتے تھے' اور اِسی بات پہ تعلقات میں کچھ تھوڑی سی دُوری آ گئی۔ وہ یہاں لاہور میں بیٹھے ہوئے کہے چلے جا رہے ہیں۔ کیا بات ہے جھوٹے پروپیگنڈے کی! بس آدمی کو تھوڑا سا ڈھیٹ ہونا چاہیے۔ وہ شخص یہاں لاہور میں موجود ہے' اس سے جا کر اُسی معاملے پر پوچھ لو لیکن یہ تو وہ سمجھے جسے سچ اور جھوٹ میں کچھ تمیز کرنا ہو۔ جب مقصد ہی کسی کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ ہے کہ وہ اہلِ قرآن ہے تو وہ کیا سمجھے گا؟

---

[1] اس کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: (i) اردو میں نماز' طلوعِ اسلام (6:10)' جون 1957ء' ص ص۔ 25 تا 82 (ii) اردو میں نماز' طلوعِ اسلام (3:23)' مارچ 1970ء' ص ص۔ 41 تا 48 اور (iii) اردو میں نماز' طلوع اسلام (3:37)' مارچ 1984ء' ص ص۔ 17 تا 25

تین نمازوں پر اہلِ قرآن [1] کے ساتھ مخالفت

یہاں ایک فرقہ ہے جو تین نمازیں [2] کہتا ہے۔ میں نے اُن کے خلاف مسلسل محاذ قائم کر رکھا ہے۔ مضامین نہیں لکھے بلکہ پمفلٹ [3] شائع کیے ہیں کہ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ میں نے اُس میں لکھا ہے کہ اُمت جس طریقے پہ' جس انداز سے' ان شعائر کو ادا کرتی چلی جارہی ہے ان میں کسی قسم کا اختلاف پیدا کرنا یا کوئی نیا طریق وضع کرنا امت میں مزید انتشار پیدا کرنے کا موجب ہوگا' جو بہت بڑا جرم ہے' گناہ ہے۔ اس لیے جس طریق سے ہو رہا ہے اس طریق پہ ہر ایک کو چلنے دیجیے۔ اگر کہیں ہماری خوش نصیبی ہوئی اور کہیں کوئی اسلامی مملکت وجود میں آ گئی تو اُس کا کام ہے کہ یہ دیکھے کہ اُمت میں وحدت پیدا کرنے کے لیے ہمیں کیا تدبیریں کرنا چاہیں۔ کسی فرد کو اس کا حق حاصل نہیں' کسی گروہ کو اس کا حق حاصل نہیں' کسی فرقے کو اس کا حق حاصل نہیں۔

قرآن حکیم کی زبان بذاتِ خود ایک معجزہ ہے

میں یہ کہہ رہا تھا کہ عربی زبان کے جو قرآن حکیم کے الفاظ ہیں' کسی اور زبان کے الفاظ تو ایک طرف رہے' خود عربی کے الفاظ بھی اگر ان کی جگہ رکھ دیئے جائیں تو وہ قرآن حکیم نہیں ہوسکتا۔ اور ویسے بھی قرآن مجید کا اعجاز اس کی زبان ہے' قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ تو ہدایت ہے' راہنمائی ہے' انسان کو صحیح راستے کی طرف لے جانے کے لیے ہم نے دیا ہے۔ اعجاز اس کا اس میں ہے لیکن یہ عجیب چیز ہے کہ زبان کے اعتبار سے بھی اس کا یہ اعجاز ہے۔ یعنی اس کی زبان خود ایک معجزہ ہے۔ ایک تو یہی چیز ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ زبان کے معاملے میں عرب تو اتنے زیادہ متشدد واقع ہوئے تھے کہ وہ ذرا سی بھی زیر زبر کی غلطی بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ جب قرآنِ کریم آیا ہے' ان کی عربی مبین میں آیا' تو انہوں نے خود اعتراف کیا کہ ہم اس کے متعلق سمجھ ہی نہیں سکتے کہ یہ نظم ہے یا یہ نثر ہے۔ بلاغت اس میں ہے' فصاحت اس میں ہے۔ سب کچھ ہے۔ لیکن یہ ہے کیا؟ اُن عربوں نے تسلیم کیا کہ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ یہ کیا اسٹائل (اسلوب) ہے۔ کہا کہ ہم اس اسٹائل (اسلوب) کے اندر کچھ لکھ ہی نہیں سکتے۔ یعنی قرآن کریم کا اسلوبِ بیان بجائے خویش خود عربوں نے مانا کہ یہ بھی ایک اعجاز ہے۔

---

[1] فرقہ اہل قرآن کا بانی (مولانا) عبداللہ چکڑالوی مرحوم (وفات 1930ء) ہے۔ اس فرقے کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کریم کے تمام احکام کی جملہ تفصیلات و جزئیات خود قرآن مجید کے اندر موجود ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے سب سے پہلے نماز کی جزئیات کو لیا۔ ان کے متعبین کا ایک گروہ لاہور میں مقیم ہے۔ ان دونوں گروہوں کی دریافت کردہ جزئیات یہ ہیں: مولانا چکڑالوی: 1. پانچ وقت کی نماز۔ 2. نماز میں دو تین چار رکعتیں۔ 3. ہر رکعت میں دو سجدے
لاہوری فرقہ: 1. تین وقت کی نماز۔ 2. نماز کی صرف دو رکعتیں۔ 3. ہر رکعت میں صرف ایک سجدہ
(حوالہ پرویزؒ: مطالب الفرقان جلد اول' طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' 1987' ص۔ 135)

[2] باب المرسلات: تین وقتوں کی نماز' طلوع اسلام' (15:6)' نومبر 1953ء' ص ص۔ 39 تا 41' فرقہ اہل قرآن کی نمازیں' طلوعِ اسلام (8:29)' اگست 1976ء' ص ص۔ 57 تا 61۔

[3] پرویزؒ: فرقہ اہل قرآن کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا تجزیہ' طلوع اسلام (6:28)' جون 1975ء' ص ص۔ 33 تا 64۔

بڑے سے بڑے عربی دان بھی اس کے سامنے سرِتسلیم خم کیے ہوئے ہیں

چودہ سو سال میں عجیب بات ہے' اس میں کوئی شبہ نہیں ہے' عربی کے بڑے بڑے ماہر پیدا ہوئے۔ مسلمانوں میں ہی نہیں' عربوں میں ہی نہیں' بلکہ غیر مسلموں میں اور غیر عربوں کے اندر بھی' وہ انگلینڈ کے اندر اتنے اتنے بڑے عربی زبان کے ماہر ہیں' اُن کا لغت ہمارے ہاں مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔ میں نے بھی اپنی لغات (القران) مرتب کرنے کے وقت قریب قریب وہ تمام لغت دیکھے لیکن ایڈورڈ لین ❶ کا جو لغت تھا' اس کا بدل نہیں ہے۔ اس کے سمیت وہ سب یہ چیز کہتے ہیں کہ الفاظ کے معنی کا تو ہم بتا سکتے ہیں لیکن ان الفاظ کو بولنے کے بعد جو اس کا فقرہ بنتا ہے وہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کو کیا کہیں۔ اما تو چیزے دیگری۔ ❷

نیٹشے کا اعتراف کہ وحی یا الہامی زبان کا ایک الگ ہی انداز ہوتا ہے مگر سوال قاری کی اپروچ کا ہے

اس چیز کو نیٹشے (1844-1900ء) نے Appreciate (پسند) کیا تھا۔ وہ عجیب شخص تھا۔ اقبال رحمتہ اللہ علیہ (1877-1938ء) تو اُس کو دیوانہ ❸ کہتا ہے۔ اُس کی دیوانگی کا بقول غالب (1797-1869ء) یہ عالم تھا کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں ❹

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس طرح یہ خیالات میرے ذہن میں آ رہے ہیں۔ اُس نے جب اپنی آخری کتاب لکھی ہے' اس میں زرتشت نے یوں کہا۔ وہ اپنے آپ کو زرتشت کہتا تھا۔ اُس کتاب میں اُس نے یہ لکھا ہے کہ اہلِ جرمن بھی حیران ہونگے کہ یہ اسٹائل (اسلوبِ بیان) کیا ہے؟ اُس نے کہا کہ الہامی زبان کا اسٹائل (اسلوب بیان) اپنا ہوتا ہے۔ دنیا کی لسانیات میں یہ ایک عجیب چیز ہے اور اسی معیار کے اوپر وہ دنیا کی مبینہ آسمانی کتابوں کو پرکھتے بھی ہیں۔ جہاں تحریف ہوتی ہے وہ اسٹائل (اسلوب بیان) انسانی ہو جاتا ہے۔ جہاں وہ کتاب اصلی ہوتی ہے' غیر محرف ہوتی ہے' خود اس کا اسٹائل ایسا ہوتا ہے کہ اُس کی کاپی نہیں کی جا سکتی۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ قرآن حمید یہ کہتا ہے کہ ءَاَعۡجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ (41:44)۔ یہ بات عربی اور عجمی کی نہیں ہے۔ اصل

---

❶ Lane, Edward William: An Arabic English Lexicon (in Eight Parts), Librairie Du Liban, Beirut, Labanon, 1968.

❷ مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) نے ''جاوید نامہ'' میں قرآنِ کریم کی حقیقت وعظمت کو بڑے وجد آفریں انداز میں بیان کیا ہے:

فاش گویم آنچہ در دلِ مضمر است — ایں کتابے نیست' چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت' جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد' جہاں دیگر شود

❸ اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں — اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

❹ آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں — غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

چیز یہ ہے کہ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ❶(41:44)۔ سوال یہ ہے کہ اس کی طرف تمہاری (Approach) اپروچ کس طرح کی ہے' کس قسم کا دل لے کر آتے ہو' کس قسم کا فکر لے کر آتے ہو' کیا ارادے لے کر آتے ہو' تمہارا منشا کیا ہوتا ہے؟ اگر یہ چیز ہے کہ ہم نے ہر چیز سے انکار ہی کرتے چلے جانا ہے تو یہ عربی زبان میں ہو' عجمی زبان میں ہو' اُس کو فرق ہی کچھ نہیں پڑتا۔ اگر اپروچ یہ ہے کہ ہم نے حقیقت کو معلوم کرنا ہے اور اگر وہ واقعی بات سچی نکلی تو ہم نے اس کو تسلیم کر لینا ہے' اس اپروچ کے ماتحت تم آؤ گے تو پھر بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔ اقبالؒ (1938-1877ء) نے جو کہا ہے' وہ اسی کا ترجمہ ہے:

تُو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الا
لغتِ غریب' جب تک ترا دل نہ دے گواہی

قرآن کریم سے استفادہ کا راز: براہ راست جذبات پر اثر انداز ہونا ہے

عزیزانِ من! یہاں جو قرآن کریم نے کہا تھا کہ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ❶(41:44)۔ یہاں وہ کہتا ہے کہ جب تک تیرا دل نہ دے گواہی' ترا یہ لا الٰہ الا لغتِ غریب ہے۔ یہ بات بھی سمجھنے کی ہے اور بڑی گہری چیز ہے کہ قرآن کریم سے فائدہ کس طرح سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انسان کے اندر ایک چیز تو اُس کی جذباتیت (Emotionalism) ہے۔ الفاظ کے اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اس کا براہِ راست قلب کے اوپر' دل کے اوپر' اثر ہو جاتا ہے۔ یہ قلب اور دل وہ الفاظ ہیں' جن کے معنی جذبات (Emotions) ہوتے ہیں' جس میں دماغ کا یعنی علم کا' فکر کا' شعور کا' تدبر کا' تعلق نہ ہو بلکہ وہ براہِ راست جذباتی چیز ہو۔ یہ براہِ راست جذبات ہیں جو اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک تو یہ چیز ہوتی ہے جو جذبات کو متاثر کرتی ہو۔ یہ وہ چیز ہے جیسے ہم آج کسی مصور کے اعلیٰ درجے کے بلند ترین شاہکار کو دیکھنے کے بعد واہ واہ کہہ اٹھتے ہیں۔ یہ وہ اثر ہے جو اگر آپ کی فطرت حسِ لطیف رکھی ہے' وہ نگاہ رکھی ہے تو آپ کے دل کو ہوتا ہے۔ یہ براہِ راست اثر ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی بلند نگہی اور رفعتِ پرواز کو "گائے اور بھینس والی آنکھ" تو دیکھ ہی نہیں سکتی اس کے لیے ضرورت ہے قلب کی

عزیزانِ من! اسے آپ Explain (بیان) ہی نہیں کر سکتے۔ یہ تو بڑی چیز ہے۔ آپ جاتے ہوئے راستے میں جو سین (منظر) دیکھتے

---

❶ ان سے کہہ دو کہ یہ قرآن' ان لوگوں کے لیے' جو اس کے منجانب اللہ ہونے پر یقین رکھتے ہیں' صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کا ذریعہ ہے اور زندگی کی تمام بیماریوں کے لیے شفا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1120)۔

ہیں بشرطیکہ وہ گائے اور بھینس والی آنکھیں نہ ہوں تو اُس سین (منظر) کے اندر وہ کچھ نظر آتا ہے کہ اُسے نہ آپ الفاظ میں Explain (بیان) کر سکتے ہیں اور نہ بتا سکتے ہیں کہ آپ اس سے کیوں متاثر ہوئے ہیں۔ جن حضرات کو موسیقی سے کچھ لگاؤ ہے وہ جانتے ہیں کہ جسے سچا سُر کہتے ہیں وہ براہِ راست دل کے اوپر جا کر بجلی کی طرح اثر کرتا ہے۔ کسی زبان میں آپ Explain (بیان) نہیں کر سکتے کہ یہ کیا اثر ہے جو اُس نے پیدا کیا ہے۔ Reason (استدلال) نہیں دے سکتے کہ آپ اس قدر محظوظ کیوں ہوئے ہیں۔ Rationally (عقلی لحاظ سے) آپ اسے Explain (بیان) نہیں کر سکتے۔ جس چیز کا تعلق براہِ راست جذبات سے ہوتا ہے اس میں جو فکر انسانی ہے اس کی Induction (نفوذ پذیری) نہیں آتی۔ ایک تو یہ طریق ہوتا ہے۔ دوسرا طریق وہ ہے جو مذہب کی دنیا کے اندر ہے۔ یہ جو تصوف والے ہیں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ماز قرآن مغز را برداشتم ...... استخواں پیشِ سگاں انداختیم۔ ❶

قرآن کریم کے الفاظ میں یہ جو سارا کچھ دیا گیا ہے (معاذ اللہ معاذ اللہ) یہ تو ”چچوڑی ہوئی ہڈیاں“ ہیں ہم نے تو اِن میں سے مغز نکال لیا ہے اور یہ ”چچوڑی ہڈیاں“ ان لوگوں کے سامنے پھینک دی ہیں۔ برادران عزیز! جو تصوف ہے وہ خالص جذباتی چیز ہے۔ وہ جو اہلِ تصوف ہیں وہ ”کیوں“ کا جواب نہیں دے سکتے۔ جب اُن سے پوچھا جائے کہ یہ کیا ہے تو وہ کہیں گے کہ

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا! تا نہ چشی ❷

شراب کا نشہ کیسا ہوتا ہے؟ وہ سمجھایا نہیں جا سکتا۔ وہ تو شراب پینے کے بعد جسے نشہ آتا ہے وہی سمجھ سکتا ہے کہ نشہ کیا ہوتا ہے۔ وہ بڑی اہم چیز

---

❶ اہلِ تصوف کا مخصوص اور منفرد عقیدہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا صحیح مفہوم وہ نہیں جو اس کے الفاظ کے معانی سے متعین ہوتا ہے۔ ان الفاظ کے حقیقی معنی ان کی تہ میں پوشیدہ ہوتے ہیں اور یہ پوشیدہ معانی علم باطن کی رُو سے منکشف ہوتے ہیں۔ یہ علم اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان علم بالحواس کے ذرائع بند کر کے ”اندر کی آنکھ“ کھول لے۔ یہ باطنی معانی الفاظ سے آزاد اور بے نیاز کر دیتے ہیں۔ اسی کو یہاں رومی نے ان الفاظ میں بیان ہے۔

❷ یعنی یہ وہ شراب ہے جس کے نشے کی کیفیت اسی کو معلوم ہو سکتی ہے جو اسے خود پیے۔ مشہور امریکن عالم نفسیات ولیم جیمز (Willian James) نے ایک نہایت پر از معلومات اور حقائق کشا کتاب Varieties of Religious Experience (مذہبی تجربہ کے متنوعات) لکھی ہے۔ اگرچہ اس کتاب کو شائع ہوئے ایک سو سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے اس موضوع پر اس جیسی کوئی دوسری کتاب کم ہی ملتی ہے۔ فلسفہ نفسیات مذہب اور تصوف کے گوشوں میں اسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ اس کتاب میں تصوف کے متعلق لکھتے ہیں کہ

”اس کا مدعی بلا تامل اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنے تجربہ کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اسے براہِ راست محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ اسے کسی دوسرے کی طرف منتقل بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس اعتبار سے کہا جائے گا کہ تصوف کا تعلق احساسات (Feelings) سے ہے ادراک سے نہیں...... تصوف کی بنیادی خصوصیت اس کا نا قابلِ انتقال ہونا ہے۔ تصوف کی صداقتیں اس فرد تک محدود رہتی ہیں جو ان سے کیف اندوز ہوتا ہے...... اسی لیے ان کے دعاوی کسی کے لیے سند نہیں قرار پا سکتے ہیں۔“

(James, William: Varieties of Religious Experience, (Edition, 1947), PP.371, 396&418)۔

آج اتفاق سے سامنے آ گئی' عزیزانِ من! اسے بڑے غور سے سنیے گا۔ قرآن حمید کے سمجھنے اور قرآن حمید کا جو مقصود ہے' اُس تک پہنچنے کے لیے یہ بات بڑی ضروری ہے۔ یہ بات براہِ راست قلب پر آتی ہے۔ اس کا تعلق Intellect (عقل) یا شعور سے نہیں ہوتا۔ یہ براہِ راست دل پہ آتی ہے' جذبات پر آتی ہے اور جذبات پہ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ جذبات پہ آئی تو بات ختم ہوئی۔ دوسرا طریق فلاسفروں کا ہے۔ وہ ہر چیز کو Intellectual (عقلی لحاظ سے) فکر سے' غور سے' تدبر سے' سمجھتے ہیں۔ آپ بڑے بڑے فلاسفر دیکھیں گے جب آپ ان کی فلسفے کی کتاب پڑھیں گے تو نظر آتا ہے کہ شاید آسمان سے بول رہے ہیں۔ جب آپ اُن کی زندگی اور صورت دیکھیں گے تو بڑی تعجب انگیز نظر آئے گی۔ ایسے ایسے بھی تھے کہ جن سے کہا گیا ہے کہ یَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ (22:13) یہ ایسی قوتوں کو پکارتے ہیں' جن کا نقصان ان کے نفع سے زیادہ قریب ہوتا ہے یعنی کہا کہ میٹھی چیزیں نہ کھاؤ شوگر کے مریض ہو کر مر جاؤ گے لیکن خود وہی کچھ کرتے ہیں۔ اسے یوں کہیے کہ سمجھنے کے اعتبار سے وہ ہر چیز جانتا ہے:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

یہ ہے وہ چیز جو (مرزا اسد اللہ خاں) غالب (1869-1797ء) کہہ گیا ہے۔ پہلی چیز تو انسان کے جذبات پہ بغیر جانے ہوئے اثر ہو جانا ہے اور دوسری چیز اس سے دل کا متاثر نہ ہونا ہے۔ جانتا ہوں۔ پر طبیعت ادھر نہیں آتی کے یہی معنی ہیں۔ اور پھر قرآن حکیم کی یہ دوسری چیز ہمارے سامنے آئی کہ اُسے ذہنی طور پر سمجھا جائے' فکری طور پر سمجھا جائے' فلسفیانہ انداز سے سمجھا جائے۔ بڑے بڑے فلاسفر گزرے ہیں جیسے کہ اقبالؒ (1938-1877ء) ہر دفعہ کہتا ہے کہ رازی [1] کی وہ فکر مجھے متاثر نہیں کر سکی حالانکہ وہ فلسفے کا Symbol (علامت) ہے' فلسفے کی رو سے اس کا مقصد ہے۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کو دل کے راستے دماغ تک پہنچنا چاہیے

عزیزانِ من! دراصل بات یہ نہیں ہے کہ اگر قرآن حکیم کو Intellectual (ذہنی طور پہ) سمجھا جائے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہمارے ہاں سب سے بڑا معرکہ مارنے والے جو ہیں وہ یہی کہتے ہیں۔ وہ یہی ہوتے ہیں جو قرآن حکیم کی ذہنی طور پر' فکری طور پر' فلسفے کے طور پر' The Why of it بتاتے ہیں' کیوں بتاتے ہیں' دلائل و براہین دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے۔ قرآن خود فکری طور پر سمجھنے کی یہ بات بتاتا ہے لیکن وہ اس طرح سمجھنے کو اس کی آخری منزل نہیں قرار دیتا۔ وہ ایک اہم فقرہ ہے جو میں آج کہہ رہا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اگر قرآن حکیم دماغ

---

[1] اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں — کبھی سوز و سازِ رومی' کبھی پیچ و تابِ رازی
ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب — گرہ کشا ہے نہ رازی' نہ صاحبِ کشّاف (اقبالؒ: بالِ جبریل)

کے راستے دل تک پہنچتا ہے تو پھر اس کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر یہ براہِ راست دل تک پہنچتا ہے تو جذباتی چیز بن جاتا ہے۔ اگر اس کی بات صرف ذہن تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے' تو اس کا جو فہم ہے وہ فلسفہ بن کر رہ جاتا ہے۔ انسان کے کیریکٹر کے اوپر نہ وہ چیز اثر انداز ہو سکتی ہے' نہ یہ چیز۔ وہ چیز انسان کے اندر نفسیاتی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتی جو محض ذہنی طور پر سمجھی جائے۔ قرآن حکیم کا مقصود آپ کی نفسیات میں' آپ کی فکر میں' آپ کے کردار میں' الختصر آپ کے اپنے اندر' تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ قرآن حکیم تو آپ کو کچھ اور بنانا چاہتا ہے:

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا [1]

انسان ذہنی و عملی طور پر جو کچھ بننا چاہے قرآن حکیم اسے وہ کچھ بنا دیتا ہے مگر دل کی گواہی ضروری ہے

خدا کہتا ہے کہ تو جس طرح بننا چاہے' قرآن حکیم تجھے اُس طرح کا بنا دیتا ہے۔ اور اس ''بننے'' کے لیے ضرورت ہے کہ اسے دماغی طور پر' فکری طور پر' سمجھا جائے۔ یہ جتنے بھی فکری اعتراضات' شکوک وشبہات وغیرہ ہیں وہ تو فکری طور پر پہلے دور ہونے ضروری ہیں' وہ اگر باقی ہیں تو وہ دل میں نہیں اتر سکتا۔ اس کے علاوہ اگر اُس کو چھوڑ کر اُس طرف آؤ تو یہ جذباتی چیز ہو جائے گی' تصوف تو ہو جائے گا مگر قرآن حکیم نہیں رہے گا۔ اور اگر آپ نے یہ سارا کچھ' یہ سارے اعتراضات شکوک وشبہات دور کر لیے' دلائل و براہین بھی فراہم کر لیں تو وہ فلسفہ بن جائے گا۔ اگر اِن تمام کے بعد بھی وہ دل پہ نہیں اترا تو قرآن حکیم کا مقصد نہیں حاصل ہو سکتا۔ مقصد اس وقت حاصل ہوگا:

لُغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

کسی بات کا فکری طور پر سمجھ لینا پہلی منزل ہے

دل کی گواہی دینے کے بعد قرآن مجید نیچے اترے گا' آپ کے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا کرے گا' آپ کے کیریکٹر (کردار) کو بدلے گا' ذہنیت کو بدلے گا' سیرت کو بدلے گا۔ جسے آپ ''میں'' [2] کہتے ہیں اُس میں کو بدلے گا۔ یہ ہے اس کا مقصود۔ براہِ راست جذباتی طور پر متاثر ہونے کا تو سوال ہی نہیں آتا۔ یہ ضروری چیز ہے کہ فکری طور پر' شعور طور پر' Intellectually (عقلی لحاظ سے) اس کو سمجھا جائے اور اس کی

---

[1] قرآنی آئین ونظام کے اتباع سے انسان کے اندر جو تبدیلی واقع ہوتی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے' مفکر قرآن ڈاکٹر اقبالؒ (1877-1938) کہتے ہیں کہ

خستہ باشی! استوارت می کند   پختہ مثل کوہسارت می کند

گر زمینی! آسماں سازد ترا   آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

[2] یعنی I-am-ness

''ہر کیوں''❶ کا جواب آپ کے پاس ہونا چاہیے۔ یہ بھی آخری منزل نہیں ہے' مقصود بالذات نہیں ہے۔ یہ تو اس کے سمجھنے کے لیے پہلا درجہ ہے' پہلی منزل ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ اس طرح فکری طور پر سمجھنے کے بعد آپ کے قلب کے اندر ایک تبدیلی پیدا کرے۔ یہ جو آپ کے ہاں دونوں کا ذہن وفکر اور قلب وجذبات کا امتزاج ہوگا' تو اُس وقت اسے کہیں گے کہ انسان اس پہ ایمان لے آیا۔ قرآن حمید اس ایمان کو ایمان نہیں سمجھتا جو پہلے فکری طور پر نہ لایا جائے۔ اور وہ اُسے بھی ایمان نہیں کہتا جو محض فکری طور پر تسلیم کیا ہوا ہو۔ یہ جو طریق ہے' وہ آپ کے ہاں ہوگا۔ اب اس میں وہ بات نہ رہی جو قرآن حمید نے کہا تھا کہ عجمی ہے یا❷ عربی ہے۔ وہ اقبالؒ (1877-1938ء) نے کہا تھا!

لا دینی و لاطینی' کس پیچ میں اُلجھا تو

دارُو ہے ضعیفوں کا' لا غَالِبَ اِلَّا ھُوْ

[ضربِ کلیم]

اس کے اندر زبان کا کیا سوال ہے۔ یہ جو قرآن حمید کے الفاظ کا محفوظ رہنا ہے جس کی ذمہ داری خدا نے لی ہے' یہ تو اس کے وحی ہونے کی دلیل اس کے الفاظ ہیں جو محفوظ ہیں' عزیزانِ من! ان کا بدل نہیں ہے' خواہ عربی زبان میں بھی کیوں نہ ہوں۔

تفسیرِ جلالین کی ایک ناتمام کوشش

ویسے تو آپ جانتے ہیں کہ عربوں کے ہاں عربی زبان میں سوسو Volumes (جلدوں) کی تفسیریں ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ فرق کیا پڑتا ہے۔ ایک مختصر سی تفسیر ہے' اسے تفسیر جلالین کہتے ہیں' وہ دو باپ بیٹا تھے۔ اُس میں انہوں نے کیا یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ باہر رکھے اور بریکٹ کے اندر عربی زبان کے مرادف الفاظ لے آئے۔ عربی کے مرادفات تو آپ جانتے ہیں کہ ایک ایک لفظ کے لیے ہزار ہزار الفاظ ہیں۔ تو انہوں نے وہاں اس کے مرادف لفظ عربی زبان کا رکھ دیا۔ وہ رکھ تو گئے تا کہ اُن مرادفات سے' یہ جو قرآن کریم کے الفاظ ہیں' سمجھ میں آجائیں۔ اب وہ جو مرادفات ہیں' ان کو اکٹھا کریں گے' تو اسی طرح سے آیت بن جائے گی۔ آپ اِسے کر کے دیکھیے۔ وہ تفسیرِ جلالین میرے پاس ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ تو باہر رکھے ہوئے ہیں۔ عربی زبان کے مرادفات اندر رکھے ہوئے ہیں۔ اُن کو اکٹھا کیجیے اور دونوں کو آمنے سامنے رکھیے تو ہنسی آجاتی ہے کہ یہ کیا بنا ہوا ہے۔ یہ قرآن کریم کچھ عجیب چیز ہے:

---

❶ یعنی The Why of it

❷ اقبالؒ نے بھی یہی کہا تھا کہ

تو عرب ہو یا عجم ہو' ترا لا اِلٰہَ اِلا　　لُغتِ غریب' جب تک ترا دل نہ دے گواہی　　(اقبالؒ: بالِ جبریل)

فاش گویم آنچہ دردِل مضمر است
ایں کتابے نیست' چیزے دیگر است

[اقبالؒ: جاوید نامہ]

یہ کتاب معنوی اعتبار سے' مقصود کے اعتبار سے' راہنمائی کے اعتبار سے' بھی چیزے دیگر ہے' یہ خود اسلوبِ بیان کے اعتبار سے بھی چیزے دیگر ہے۔

وحی کی آخری منزل قلب ہے

وحی کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ فکری طور پر' دماغ کے راستے' قلب کی طرف اترے۔ اس کی آخری منزل تو قلب ہے۔ عقلی طور پر سمجھ لینا ہی منزل نہیں ہے' وہ خالص جذباتی چیز بھی ہے۔ براہِ راست کوئی فکری چیز نہیں ہے' وہ صرف فلسفہ ہے۔ اقبالؒ (1938-1877ء) جیسا اتنا بڑا افلاسفر کون ہوگا! وہ خود کہہ رہا ہے کہ یہ لغت غریب ہے جب تک ترا دل نہ دے گواہی۔ وہاں سے یہ نیچے اترے' قلب تک پہنچے۔ یہ ہے قرآن حکیم کی منزل۔ یہاں وہ اس کا مقصد پورا کرے گا۔ تمہارے اندر ایک تبدیلی ہونی چاہیے۔ یہ تو ہوا قرآن مجید کا انداز۔ میں یہ اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ ہمارے ہاں بھی ہوسکتا ہے کہ بہر حال میرے درس میں بھی جو میرے فکر سے متاثر ہونے کا حلقہ ہے' اُن میں خود فریبی کی یہ چیز ہو کہ اگر انہوں نے قرآن حکیم کو ذہنی طور پہ سمجھ لیا ہے تو وہ کہیں کہ ہاں صاحب! بس ٹھیک ہے جی' ہم نے قرآن مجید کو سمجھا ہے۔ کیا بات جی' اُن کے درس کی' اس طرح سے سمجھا دیتے ہیں' دلائل و براہین سے۔ ٹھیک ہے سمجھایا تو قرآن کریم اسی طرح سے جائے گا اور سمجھا بھی قرآن اسی طرح سے جائے گا لیکن سمجھنا تو اس کا منزلِ آخر نہیں ہے۔ سمجھنے کے بعد وہ جو کہتا ہے کہ

پر طبیعت ادھر نہیں آتی ❶

وہ ذہنی بات ہے' سمجھ لیا ہوا ہے مگر طبیعت ادھر نہیں آتی' تو قرآن کریم کا کچھ مقصد پورا نہیں ہوا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ایک تو عربوں کے ہاں اُنہوں نے' الفاظ کا Substitute (نعم البدل) بھی کر کے دیکھ لیا' وہ قرآن کریم ہی نہیں بن سکتا۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اس طرح قرآن حکیم کے الفاظ کے مرادفات لانے کا سوال نہیں ہے۔

---

❶ یہ مرزا اسد اللہ خاں غالب (1869-1797ء) کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے' جس میں انہوں نے کہا ہے کہ
جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزُہد پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہر آنے والی نئی نسل قرآنی الفاظ کو حفظ کرنے تک ہی محدود ہو کر رہ گئی

فکری طور پہ سمجھنے والے' تو پوچھو نہیں کہ آسمان تک جا پہنچے ہیں لیکن قرآن کریم کا مقصد پھر بھی حاصل نہ ہوا۔ ہمارے ہاں والوں نے کہا کہ صاحب! یہ ٹنٹا ہی ختم کرو' ''نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔'' نہ اس کا تعلق دماغ سے ہے' نہ اس کا تعلق دل سے ہے' بلکہ اس کے الفاظ دہراتے چلے جاؤ۔ یہ ان کے نزدیک منتہیٰ ہے کہ حفظ کرتے چلے جاؤ' الفاظ دہراتے چلے جاؤ۔ کہنے لگے کہ فکر سے قلب تک لانے کے لیے قرآنِ کریم کا خواہ مخواہ یہ جھنجھٹ کاہے کے لیے ہو' نہ رہے بانس نہ بجے بانسری' بس صرف الفاظ دہراتے چلے جاؤ۔

قرآنِ حکیم کو مختلف قرأتوں میں پڑھنے کے انداز میں فرق مگر ان میں معنی معلوم نہیں جبکہ یہ ہے صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کا ذریعہ

عزیزانِ من! عرب بھی الفاظ دہراتے ہیں' عجمی بھی الفاظ دہراتے ہیں۔ یہ دیکھنا ہی نہیں ہے کہ یہ فکری چیز بھی درمیان میں آتی ہے کہ نہیں۔ یہ جو ہمارے ہاں قاری آتے ہیں۔ ایک تو اُن کی آواز بہت اچھی ہوتی ہے۔ یہ جو خشک علاقے والے ہوتے ہیں' اُن کی آواز بڑی صاف نکلتی ہے' ان کی آواز بہت اچھی ہوتی ہے' پھر وہ جس راگ میں قرآن حکیم کو گاتے ہیں وہ بھی بہت عمدہ ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں (حجاز اور مصر) کے اندر ایک ایک ہی راگ ہے۔ ان کی موسیقی سنیے جو حجاز والے ہیں' وہاں ایک راگ بھیروں ہوتا ہے۔ یہ جو آخری رات میں' علی الصبح نور کے تڑکے' اذان دی جاتی ہے' آپ اسے سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ صاحب! وہ اذان دینے والے کی کیا بات ہے' وہ جادو کر دیتا ہے! وہ اذان حجازی لَے میں ہوتی ہے یعنی بھیروں راگ میں۔ صبح چار بجے بھیروں راگ کا وقت ہوتا ہے۔ ہندو اس راگ سے اپنے دیوتاؤں کو جگاتے تھے۔ وہ بڑا ہی پُرکشش ہوتا ہے۔ وہ جو آپ کے ہاں حجاز کے قاری آتے ہیں' وہ قرآن حکیم کو بھیروں میں گاتے ہیں' یعنی قرآن کی قرأت بھیروں میں کرتے ہیں۔ اور وہ جو مصر والے آتے ہیں ان کا ایک اور راگ ہوتا ہے' وہ دس بجے صبح گایا جاتا ہے۔ وہ راگ بھیرویں ہوتا ہے۔ اُس میں خالص جذباتی چیز نہیں ہوتی' اس کے اندر کچھ تھوڑی سی حظ یا مسرت کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ یہ مصری قرآن حکیم کو بھیرویں میں گاتے ہیں۔ اس راگ (Tune) میں انہوں نے مشق کی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ یہ قاری جو قرأت کر رہا ہے' یہ وہاں مصر سے آیا ہوا ہے' سامعین بیٹھے ہوئے ہیں' وہ کسی ایک مقام پہ بے ساختہ سبحان اللہ کہہ دیتے ہیں۔ یہ کیا ہوتا ہے؟ وہ راگ میں ایک مقام آتا ہے' وہ Concentrative (ارتکاز کرنے والا) ہوتا ہے' اس میں ارتکاز ہوتا ہے۔ وہ قاری جو اُس مقام پر آتے ہیں تو بے ساختہ ان سامعین کی زبان سے سبحان اللہ نکلتا ہے۔ نہ اُس کرنے والے یعنی قاری کو پتہ ہے' نہ سننے والوں کو پتہ ہوتا ہے کہ کیا سن رہے ہیں۔ وہاں قرأتوں کے بڑے بڑے مکتب کھلے ہوئے

ہیں۔ اپنے ہاں آپ دیکھتے ہیں کہ اتنے زیادہ جو حفظ کرانے والے مکتب ہیں ویسے تو اُن کو دارالعلوم کہا جاتا ہے' جس میں علم ہوتا ہی نہیں' صرف لفظ یاد کیے ❶ جاتے ہیں' نام دارالعلوم ہوتا ہے۔ علم تو اُن کے ہاں ہوتا ہی نہیں' وہ جو حفظ کرنے والے ہیں' وہ تو الگ رہے۔

یہ جو قرأت کا فن ہے' وہ فن ہی انہوں نے الگ بنالیا ہے۔ اُنہوں نے جو فن نکالا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ ''ع'' یہاں سے نکلے گی' ''ق'' یہاں سے نکلے گا' جو ''ت'' ہے' وہ زبان کے نیچے سے' دانتوں کے ساتھ' ملایا جائے گا۔ یہ ہے کہ یہ جو حروف ہیں' یہ کس طرح صحیح طور پہ نکلتے ہیں۔ یہ ایک الگ فن ہے جسے تجوید ❷ کہتے ہیں۔ ان کے ہاں اس فن کے بڑے مکتب کھلے ہوئے ہیں۔ وہ سب تجوید ہی سکھاتے ہیں۔ جونہی انہوں نے دیکھا کہ اس کی زبان اس ''ذ'' کے ساتھ یوں نہیں لگی تو انہوں نے کہا کہ غلط پڑھتے ہو۔ یہ ''ت اور ٹ'' میں فرق نہیں ہوا۔ نہ اُس میں آپ کو کچھ پتہ تھا' نہ اِس میں آپ کو کچھ پتہ ہے لیکن اس کی ان حفاظتوں کے اوپر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ آپ کے کروڑوں روپے ان کے اوپر خرچ ہو جاتے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں آپ کے بچے یہی چیز سیکھتے ہیں اور پھر ساری عمر وہ یہی کچھ کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے کہا تھا کہ اس کو کیا فریب دے رہے ہو کہ یہ عربی ہے' یہ عجمی ہے؟ کہا تھا کہ ءَ اَعۡجَمِیٌّ وَّ عَرَبِیٌّ قُلۡ هُوَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا هُدًی وَّ شِفَآءٌ (41:44) کیا یہ قرآن مبہم زبان میں ہے یا نکھری ہوئی زبان میں؟ سوال اس قرآن حکیم کی زبان کا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خوئے بدرا بہانہ بسیار' چونکہ ان کی نیت (Intention) خراب ہے اس لیے انہیں اس قرآن حکیم میں ہزار نقص دکھائی دیتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ یہ قرآن کریم' ان لوگوں کے لیے ہے جو اس کے من جانب اللہ ہونے پر یقین رکھتے ہیں' صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کا ذریعہ ہے اور زندگی کی تمام بیماریوں کے لیے شفا ہے۔ اس طرح اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ صحیح راستے کی طرف لے جاتا ہے اور پھر راستے کی طرف لے جانے میں انسان کا تو صرف فکری اطمینان ہوتا ہے کہ میں صحیح راستے پہ جا رہا ہوں' منزل پہ پہنچوں گا۔

قلب کی تبدیلی کے باعث قرآن حمید نفسیاتی امراض کے لیے شفا ہے

اب آگے شفاً کی بات ہے۔ یہ جو تمہارے دل کے روگ ہیں' یہ اُن کا علاج کرتا ہے۔ منزل کی طرف بھی مکینکلی نہیں پہنچاتا۔ یہ راہنمائی بھی کرتا ہے اور اُس کے ساتھ دل اور دماغ دونوں اکٹھے رکھتا ہے۔ ہدایت ہے' راہنمائی ہے۔ فکری طور پر' صحیح راستے کے اوپر' چلتے چلے جانا اور اُس کے ساتھ پھر یہ صرف ذہنی چیز نہیں رہتی بلکہ آپ کے قلب کے اندر ایک تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ یہاں اُس نے شفا کہا ہے۔ یہ قلب میں بھی تبدیلی ہے۔ اِس کے لیے قرآن حمید نے بڑے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی

---

❶ جیسے کسی طوطے مینا کو' کچھ بول سکھائے جاتے ہیں اس طرح پڑھایا جاتا ہوں' اس طرح سکھایا جاتا ہوں (قرآن کی فریاد)

❷ حروف کو ان کے مخارج سے ادا کر کے پڑھنا۔

یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ [1] (13:11) خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔ یہاں (41:44) میں **شفآء** کا لفظ آیا ہے۔ یہ شفاء کا لفظ زیادہ گہرا ہے۔ وہ جو نفسیاتی امراض [2] ہیں اس سے پہلے انسان کو ان کی کچھ زیادہ اہمیت کا پتہ نہیں تھا۔ یہ اس دور میں آ کر اس کی اہمیت سامنے آئی ہے۔ وہ جو اب اِن جسمانی [3] بیماریوں کو بیماریاں نہیں مانتے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ یہی نفسیاتی طور پہ ایک چیز ہے' وہ اگر صحیح اعتدال پہ ہو' تو اِس حضرتِ انسان کو ذہنی اعتبار سے امراض نہیں ہوتے۔

اگر باہر کے خوف سے محفوظ ہونے کا نام امن ہے تو قلب کے اعتدال پر ہونے کا نام اطمینان ہے مگر ''میں'' یعنی اِلغواس طرف آنے نہیں دیتی

بہر حال قرآن حکیم کا تعلق تو نفسیاتی امراض [2] سے ہے کہ یہ ان کے لیے شفآء [4] ہے۔ قرآن حکیم نے کئی ایک مقام پہ کہا ہے کہ وہ بستی جو ہمارے قوانین پہ چلتی ہے' اُس بستی والوں کی مثال یہ تھی کہ ان کو امن بھی نصیب ہے اور اطمینان بھی نصیب ہے۔ اب عام طور پر یہ ذہن میں نہیں آتا کہ امن کے ساتھ تو سب کچھ ہی ہو گیا پھر یہ جو اطمینان ہے' وہ کس چیز کی بات ہو گئی؟ وہ جو باہر کا خوف ہوتا ہے اس سے انسان محفوظ ہوتا ہے تو وہ امن ہوتا ہے۔ اب اگلی چیز جسے وہ اطمینان کہتا ہے' یہ کیا ہے؟ انسان کا قلب جسے یہ نفسیات میں Self کہتے ہیں' وہ اگر اعتدال پر ہے تو اُس کیفیت کا نام اطمینان ہوتا ہے۔ قرآن حکیم یہ چیز دیتا ہے: ذہنی طور پر شکوک و شبہات رفع کرتا ہے اور قلبی طور پر اُن تمام چیزوں کو جو اضطراب پیدا کرتی ہیں' رفع کرتا ہے۔ یہ ہے **هُدًى وَّشِفَآءٌ** (41:44)۔ یہ کیفیت ان کے لیے ہے جو ذہنی طور پر اسے سمجھیں بھی اور قلبی طور پر اس کے مطابق اپنے اندر تبدیلی بھی پیدا کریں۔ جو لوگ اس کے برعکس رویّے اپناتے ہیں ان کے لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ **وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى** (41:44) جو قرآن کی طرف اس اپروچ سے نہیں آتا جسے آپ مائنڈ کہتے ہیں اس سے اس مقصد کے لیے نہیں جاتا کہ میں یہ دیکھوں کہ اس کے اندر ہدایت کی کونسی چیز ہے' صداقت کی کونسی چیز ہے' یہ کیا پیغام دیتا ہے یعنی وہ اس کی بنیادی صداقتوں پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کے کانوں میں تعصب کے ڈاٹ لگ جاتے ہیں اور اس کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے دل کے اندر جو خیالات ہیں' ان کو پہلے الگ رکھے پھر وہاں جائے اور دیکھے کہ اگر واقعی وہ صداقت جو مجھے اپیل کرتی ہے' تو پھر اس کو Accept (تسلیم) کرلے' ضد میں نہ آئے' اس کے

---

[1] خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا (ظفر علی خان)

[2] Psychological Diseases

[3] Physical Diseases

[4] یہ لفظ قرآنِ کریم میں ان چار مقامات پر آیا ہے: (10:57;16:69;17:82;41:44)

بعد کٹ حجتیاں نہ کرے‘ اس کی انا (Ego) درمیان میں نہ آ جائے۔ قرآن مجید نے فرعون کی قوم کے متعلق کہا ہے کہ حضرت موسیٰ نے جو کچھ اُن سے کہا تھا‘ اُن کا جرم تو بنتا تھا لیکن یہ جوان کے ہاں کی ’’میں‘‘ تھی کہ ہم بڑے لوگ ہیں‘ یہ بات ان کو اِس طرف آنے ہی نہیں دیتی تھی کہ اعتراف کریں۔

انسان کی ذاتی انا ہی حقیقت کو تسلیم کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے اور پھر نتیجہ بربادی ہوتا ہے

واقعی آپ دیکھیں گے کہ بہت سے لوگ ایسے ملیں گے کہ دل سے تو وہ قائل ہوتے ہیں لیکن وہاں فریبِ انا آ جاتا ہے۔ کچھ جھکنا پڑتا ہے۔ ’’میں‘‘ جو سامنے آ جاتی ہے‘ وہ راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ قرآن مجید قلب میں اترتا ہے تو پھر یہ ’’میں‘‘ انسان کی رکاوٹ نہیں بنتی۔ جہاں صداقت ہوتی ہے اور وہ اس کو قبول کر لیتا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ جو اس طرح سے‘ اس اپروچ سے‘ قرآن مجید کی طرف نہیں بڑھتے‘ ان کے کانوں میں ڈاٹ لگے ہوئے ہوتے ہیں اور آنکھوں پہ ان کے پردے پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ الفاظ زبان سے دہرائے چلے جائیں گے تو اس کا فائدہ کیا ہوا۔ اب آپ کے ہاں یہ حفظ والے بھی الفاظ دہراتے ہیں۔ حفظ والے ہی نہیں بلکہ ہمارے ہاں کے تو جو حفظ نہ بھی کیا ہوا ہو‘ قرآن مجید کے متعلق یوں کرتے کہ وہ قرآن کے معنی تک نہیں جاتے۔ اُن کے ہاں یہ صورت ہے کہ کانوں میں ڈاٹ لگے ہوئے ہیں‘ آنکھوں پہ پردے پڑے ہوئے ہیں۔

ملت اسلامیہ کو قرآن حکیم براہ راست ہی سمجھنا ہوگا‘ یہ سامی المذہب کی عبرانی زبان عربی زبان سے ملتی جلتی ہے

کانوں پہ تعصب کے ڈاٹ لگے اور آنکھوں پہ پردے پڑے ہوئے لوگوں کے لیے قرآن حکیم کہتا ہے کہ **اُولٰٓئِکَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّکَانٍۭ بَعِیْدٍ** (41:44) یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اس قرآن کے الفاظ اس طرح مبہم اور غیر واضح معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی دُور کی آواز سن رہا ہو اور یہ واضح نہ ہو سکے کہ کہنے والا کیا کہتا ہے اگرچہ وہ بات تمہارے بہت قریب ہوتی ہے‘ جب بیٹھے ہوئے بات کر رہے ہوتے ہو‘ وہ ایسے سنتے ہیں جیسے دور سے کوئی بڑی مبہم سی آواز آ رہی ہو‘ پتہ ہی نہ چلے کہ کیا کہہ رہا ہے۔ اِن کا دل کہیں اور ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اگر دل کہیں اور ہو تو اکثر تو سنائی ہی نہیں دیتا‘ ہم تو قرآن حکیم کو براہِ راست سنتے ہی نہیں ہیں۔ جو سمجھنا بھی چاہتے ہیں تو وہ کسی رازی سے‘ کسی غزالی سے‘ کسی طبری سے‘ مقامِ بعید سے‘ سن رہے ہوتے ہیں۔ خود قرآن حکیم کے اوپر نہیں آ رہے ہوتے۔ وہ جوان کو دور کی آوازیں آ رہی ہوتی ہیں‘ وہ ان آوازوں کو سن رہے ہوتے ہیں۔ کہا کہ یہ تجربہ اِس سے پہلے ان یہودیوں کے ہاں ہو چکا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ **وَلَقَدْ اٰتَیْنَا**

مُوۡسَی الۡکِتٰبَ فَاخۡتُلِفَ فِیۡہِ ❶ (41:45) یہ دیکھیے' ان کی کتاب جو اصلی دی تھی وہ تو ان کی عبرانی زبان میں تھی یعنی ان کی اپنی زبان کے اندر تھی۔ وہ عبرانی زبان تو بہرحال Past (عہد ماضی) میں نہیں' یہ عبرانی زبان عربی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ یہ لوگ سامی المذہب تھے۔ عربی زبان میں تو یہ قرآن کریم نبی اکرم ﷺ کی ہی طرف آیا ہے۔ اس سے پیشتر تو سارے انبیائے بنی اسرائیل آئے تھے' وہ سارے سماوی کتب عبرانی زبان یا ان کے ہاں کی جو زبان ہوتی تھی' اُس میں آتی تھیں۔ کہا کہ زبان کے اعتبار سے وہ زبان بھی بہت عمدہ تھی' وہ اس کے بارے میں جانتے بھی تھے۔

قرآن حکیم کی یہ واضح تعلیم' جس میں کوئی اختلاف بھی نہیں' آخر کیوں سمجھ میں نہیں آتی؟ فتورِ نیّتوں کا ہے

یہاں کہا ہے کہ فَاخۡتُلِفَ فِیۡہِ (41:45) وہ اس میں اختلاف کرنے لگ گئے اس لیے نہیں کہ اس کی زبان ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی بلکہ اس لیے کہ ان کی نیّتوں میں فتور آ گیا تھا۔ اسی طرح' ان مخالفینِ عرب کی مخالفت بھی ان کی نیّت کی خرابی کی وجہ سے ہے حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ اگر کوئی کتاب واضح ہے' غیر مبہم ہے' عربی مبین کے اندر ہے' وہ لوگ اس زبان کو سمجھتے بھی ہیں' کتاب میں کوئی اختلاف بھی نہیں ہے تو سوال یہ ہے کہ پھر اس کے باوجود یہ اختلاف کیوں ہوا۔ وہ اس لیے ہوا کہ یہ ان کے قلب میں نہیں اترا تھا۔ اگر یہ دماغ تک ہی رہے تو وہ تو پھر بیسیوں اختلافات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان سے کہا گیا تھا کہ وَلَوۡلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّکَ لَقُضِیَ بَیۡنَہُمۡ (41:45) تمہیں مہلت کا بڑا لمبا وقت دیا۔ ہم حضرت عیسیٰؑ تک انبیاء بھیجتے رہے' یہ تمہاری مہلت کا وقت تھا۔ بجائے اس کے کہ تم اس سے فائدہ اٹھاتے' تم نے کسی کو مار کے نکال دیا' کسی کو قتل کر دیا' کسی کو دھمکی دیدی۔ کسی کی تم نے بات نہ مانی۔ اب یہ آخری وقت ہے کیونکہ یہ آخری پیغمبر ہے' آخری کتاب ہے' اگر اس کو تم نے Accept (قبول) کر لیا تو اُس عذاب سے بچ جاؤ گے جو ایک قوم کی حیثیت سے تم پر وارد ہے۔ نہ کرو گے تو پھر قرآن حکیم کا یہ جو مکافاتِ عمل کا قانون ہے وہ پھر تباہی اور بربادی لے آئے گا۔

عربی زبان میں مرادفات کی کیفیت

عزیزانِ من! یہ یہودی بھی The Wandering Jew (خانہ بدوش یہودی) بنے۔ جو مہلت کا وقفہ تھا ختم ہوا۔ قرآن حکیم نے کہا کہ وَاِنَّہُمۡ لَفِیۡ شَکٍّ مِّنۡہُ مُرِیۡبٍ (41:45)۔ یہ شک اور ریب یہاں دو الفاظ ہیں۔ ترجمہ اردو کے اعتبار سے ان دونوں کے معنی شک ہوتا ہے۔ عربی میں مرادف کے معنی ہوتے ہی نہیں کہ Exactly (ہو بہو) وہی دوسرے معنی ہوں۔ عربی زبان میں تو پھر

---

❶ ہم سے اس سے پہلے' موسیٰؑ کو بھی اسی قسم کی کتاب دی تھی (جو بنی اسرائیل کی زبان میں تھی اور اس پر وہ ایمان بھی لائے تھے لیکن اس کے بعد) وہ اس میں اختلاف کرنے لگ گئے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1120)۔

کسی دوسرے لفظ لانے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ یہ تو زبان کا نقص ہے۔ یہ تو فارسی میں ہوتا ہے اور وہ بھی ان کو یہ ضرورت پڑتی ہے کہ انہی معنوں میں وزنِ شعر کو قائم رکھنے کے لیے کوئی دوسرا لفظ لائیں تو اس میں جو ایک لفظ ہے وہ شاعری کے لیے اس لیے آتا ہے کہ اس کے بغیر وہ وزن ٹوٹ جاتا ہے' تو اُس کی جگہ وہ کوئی دوسرا لفظ لے آتے ہیں تاکہ اس کا وزن ٹھیک رہے لیکن عربی زبان کے اندر تو مرادفات کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ شعروں کے اندر لفظ ہوتے ہیں اور لفظوں میں اور معنی میں فرق ہوتا ہے۔ بعینہٖ وہ مرادف اپنے اصل لفظ کے معنی نہیں دیتا۔

شک اور ریب میں فرق

اب یہاں (41:45) میں' عزیزانِ من! شک اور ریب دو الفاظ آئے ہیں۔ ہمارے ہاں تو شک ہی ان دونوں الفاظ کے معنی ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ دو چیزیں کیوں ہیں؟ سورۃ البقرۃ کی دوسری ہی آیت میں لَا رَیۡبَ فِیۡهِ (2:2) ❶ آیا ہے۔ یہ شروع میں کیفیت ہے۔ یہ وہی چیز ہے جو میں نے ذہنی فکری اور قلبی کہا تھا۔ ایک چیز ہے کہ یہاں بیٹھے ہوئے آپ کو گولی چلنے کی آواز آتی ہے۔ ذہنی طور پہ آپ دیکھتے ہیں کہ گولی چلی ہے' پتہ نہیں پولیس والے نے خود چلائی ہے یا کوئی آیا ہوگا' اس نے چلائی ہوگی۔ اس سے آپ کو کوئی قلبی اضطراب نہیں ہوتا۔ گولی چلنے کے بعد آپ کو چیخ کی آواز آتی ہے' جو آپ کے دوست یا عزیز سے ملتی جلتی ہے۔ اس میں ایک شک پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ آواز وہی نہ ہو۔ آپ نے دیکھا کہ یہ دو قسم کے شکوک ہیں۔ ان میں فرق کتنا ہے۔ ایک وہ شک ہے جس کا تعلق فکری طور پہ آپ کے ذہن سے ہی ہے۔ دوسرا شک وہ ہے جو ذہن کے راستے سے' قلب تک پہنچا ہے کہ کہیں وہ میرا دوست ہی نہ ہو۔ اس سے اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ عربی زبان میں جو پہلا فکری طور پہ تردد ہوتا ہے وہ شک ہوتا ہے۔ جو شک قلب کو متاثر کرتا ہے' وہ ریب ہوتا ہے۔ قرآن حمید نے اسی لیے شروع ہی میں کہا ہے کہ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ (2:2)۔ ریب میں بھی شک تو ہوتا ہے لیکن اس شک کا جو اثر ہوتا ہے' وہ قلب پر جا کر پڑتا ہے۔ اور یہاں کہا ہے کہ وَاِنَّهُمۡ لَفِیۡ شَكٍّ مِّنۡهُ مُرِیۡبٍ (41:45) وہ ذہنی طور پہ بھی شک کے اندر رہے اور قلبی طور پہ اضطراب کے اندر رہے اس لیے کہ جس عذاب میں وہ گرفتار تھے وہ ان کا پیچھا کرتا تھا۔ اور یہی چیز ان کے لیے بے یقینی' تذبذب اور نفسیاتی الجھن کا باعث بن رہی ہے۔

حصولِ جنت کے متعلق یہودیوں کا اور عیسائیوں کا تصور

پھر انہوں نے اپنے آپ کا دھوکا دے لیا کہ کوئی بات نہیں' یہاں تو ہمارے ساتھ یہ ہو رہا ہے مگر قیامت میں لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّةَ اِلَّا مَنۡ کَانَ هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی ❷ (2:111)۔ وہ جو جنت ہے وہ تو ہمارے (یہود و نصاریٰ کے) لیے بنی ہوئی ہے' وہاں تو یہ

---

❶ (اس) میں نہ بے یقینی اور تذبذب ہے' اور نہ کوئی نفسیاتی اُلجھن (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 2)

❷ اِن (اہل کتاب) کا دعوے ہے کہ جنت بس انہی (یہود و نصاریٰ) کے لیے مخصوص ہو چکی ہے' ان کے علاوہ اِس میں کسی اور کا داخلہ نہیں ہوسکتا (2:135)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 39)۔

صورت ہوگی۔ ان یہود ونصاریٰ کے ہاں یہ ہے کہ وہ جو بنی اسرائیل ہیں' یہ جو یہودی ہیں' ان کو چند دنوں کے لیے جہنم میں بھیج دیا جائے گا کیونکہ ان کے بڑے جو چھڑوا کر لانے والے ہیں' وہ ضمانتی ہیں' وہ کہیں پیچھے آ رہے ہیں اور مجرموں کو پکڑ کر سپاہی پہلے لے آئے ہیں' انہوں نے حوالات میں بند تو کر دیا ہے' تو اُس میں یہ ہے کہ یہ صرف چند دن تک وہاں رہیں گے' جب تک وہ پیچھے سے نہیں آ جاتے۔ وہ جب آئیں گے تو وہ اِن کو چھڑا لیں گے اور انہیں جنت میں بھیج دیں گے۔ عیسائی تو ان سے بھی آگے بڑھے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ چند دنوں کا سوال نہیں ہے۔ جو یہاں حضرتِ مسیحؑ کے کفارہ کے اوپر ایمان لے آئے گا' وہ یہیں سے سیدھا جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ اسی لیے عیسائیوں کے مرنے سے پہلے ان کے پاس وہ پادری آتا ہے اور وہ آ کر حضرتِ مسیحؑ کے کفارے پر ایمان کا اقرار لیتا ہے' آخری بات جو اُس سے کراتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ یہاں کفارے پر اقرار کرے اور سیدھا جنت میں پہنچ جائے۔ وہ اُس کے ہاتھ میں ٹکٹ دیدیتا ہے۔ یہ عقیدہ انہوں نے اپنے ہاں وضع کیا کیونکہ وہ عذاب پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ان میں آپ دیکھیے کہ عمل کے ذریعے کچھ نہیں ہو رہا بلکہ سب کچھ عقیدے کی رو سے ہو رہا ہے۔ اعمال کیسے بھی ہوں اس کا جنت اور جہنم میں دخل ہی نہیں ہے۔ یہ سینٹ پال (c.A.D.5-67) کی عیسائیت چلی ہوئی ہے۔ اُس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ نجات انسان کے اعمال سے نہیں ہوتی بلکہ کفارہ پر ایمان سے ہوتی ہے۔

یہودیوں کے بچوں کا جنت میں داخل ہونے کے لیے ختنے کا مسئلہ

یہودیوں نے کہا ہے کہ یہ جنت نسلی چیز ہے۔ جو یہودی النسل ہے وہ جنت میں جائے گا۔ معارف رکھنا' بیٹیاں بیٹھی ہیں لیکن بیچ میں سمجھانے کی ایک بات آ گئی کہ وہاں ان فرشتوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ یہ یہودی ہے' اس کو بھیج دو۔ یہودیوں کے زمانے تک یہودی ختنہ کراتے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ اس طرح سے فرشتے اس کی پہچان جنت میں کر لیں گے۔ یہ جتنے مختون ہونگے وہ کہیں گے کہ انہیں جنت میں بھیج دیجیے۔ پھر مسئلہ پیدا ہوا۔ کہنے لگے کہ بہت سے بچے پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں' اُن کا ختنہ تو کیا نہیں جاتا اور وہ ہوتے ہیں یہودیوں کے بچے تو اُن کے متعلق کیا ہوگا۔ یہ تو یہاں انہوں نے سب چیزیں طے کر لی تھیں۔ یہ ان کے ہاں بڑا اہم مسئلہ آیا تو اِس کے لیے انہوں نے روایت وضع کر لی۔

ختنوں کے سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں بخاری کی روایت

آپ کو معلوم ہے کہ ان کے ہاں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا ختنہ خود 80 سال کی عمر میں کلہاڑے سے کیا تھا۔ وہ پہلے مختون تھے۔ یہ آپ کے ہاں بخاری شریف میں ہے۔ اِنہوں نے کہا کہ یہ جو صورت پیدا ہوگی کہ جو بچے غیر مختون مر گئے ہونگے' وہاں حضرت ابراہیمؑ بیٹھے ہوئے ہونگے' وہ ان بچوں کا ختنہ کر کے آگے بھیجتے چلے جائیں گے۔ عزیزانِ من! ہنسا نہ کیجیے' اپنے آپ پہ رویا

کیجیے۔اس کے بعد یہ عقائد وضع کرنے پڑے کیونکہ یہ چیز دماغ تک' قلب تک تو نہ پہنچی کہ اعمال میں بھی تغیر پیدا کرے' سیرت میں' کردار میں بھی تغیر پیدا کرے۔ یہ تغیر تو نہیں پیدا ہوا۔ ہوا یہ تھا' کہ عذاب آ رہا تھا۔اس لیے انہوں نے یہ عقائد وضع کیے۔آپ دیکھیے کہ قرآن مجید بات کہاں لا رہا ہے۔کہا کہ یہ چیزیں تھیں' جن کی رو سے انہوں نے اپنے آپ کو فریب دیا اور اس طرح ''شک'' اور ''ریب'' سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔خود فریبی سے تو اضطراب چلا آتا ہے۔انہوں نے یہ کیا۔دیکھیے قرآن مجید کیا بات کس مقام پہ لاتا ہے؟ کہا کہ یاد رکھو! سن رکھو! اس فریب میں نہ رہنا' یہ بات نہیں ہے کہ جنت ان یہود و نصاریٰ کے لیے مخصوص ہو چکی ہے۔قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ (41:46) جو شخص بھی اعمال صالحہ کرتا ہے' اُس کا فائدہ خود اس کی ذات کے لیے ہوتا ہے۔ان یہودیوں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں کے سینٹ' بڑے بزرگ' بلکہ انبیاء نے' اتنے نیک کام کیے ہوئے ہونگے کہ ایک ایک کے نیک کام لاکھوں کو بخشوا کر جنت میں لے جائیں گے۔اور یہ کہ حضرتِ عیسیٰؑ کی سیرت تو خدا کی سیرت ہے۔اُن کی سیرتِ مقدسہ کے اعمال کا جو وزن ہے اُس کے بعد ہمیں ضرورت ہی نہیں ہے کہ ہم کوئی نیک کام کریں' اُن سینٹ' بڑے بڑے بزرگ بلکہ انبیاء کے اعمال خدا کے نزدیک اتنے وزنی ہیں کہ ایک ایک کر کے یہ سب ہمیں لے جائیں گے۔

دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی شفاعت کا ایک عقیدہ وضع کیا گیا

عزیزانِ من! قرآن حمید ان کی بات کرتا چلا آ رہا ہے کہ وہ شک میں تھے' ریب میں تھے' عذاب میں تھے۔کہتا ہے کہ سن لو! اُنہوں نے جو فریب دیا تھا۔قرآنِ کریم کہتا ہے کہ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ (41:46) جس نے کوئی اچھا کام کیا ہے اس کا فائدہ صرف اس کی ذات تک ہے' وہ اس کو کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتا۔عزیزانِ من! یوں قرآن مجید سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن کس بات کی تردید کر گیا ہے یعنی کتنی اہم چیز بتا گیا ہے۔یہ ہے قانونِ مکافات۔اور اس کے ساتھ ہی کن چیزوں کی تردید کر گیا ہے۔یاد رکھو! کسی کا عمل دوسرے کو منتقل نہیں کیا جا سکتا۔آپ نے کیا کیا؟ یہ کہ وہ جو بزرگ تھے وہ آ کر نکال کر جنت میں لے جائیں گے۔آپ نے بھی اپنے ہاں شفاعت کا عقیدہ وضع کیا۔آپ کے ہاں بخاری شریف کی حدیثیں ہیں کہ عدالت ختم ہو جائے گی' جو معاملات تھے گناہ اور ثواب کے بارے میں' اعمال نامے کی رو سے' جنت والے جنت میں بھیج دیئے جائیں گے' جہنم والے جہنم میں بھیج دیئے جائیں گے اور عدالت کا وقت بھی ختم ہو جائے گا' رجسٹر بھی ٹھپ کر دیئے جائیں گے' اللہ میاں بھی جانے لگیں گے۔وہ جاتے جاتے دیکھیں گے کہ میدانِ قیامت کے اندر ایک شخص سجدے میں پڑا ہے' وہ کہیں گے کہ بابا! ہم نے تو فیصلے کیے' جنت والے جنت میں چلے گئے' جہنم والے جہنم میں چلے گئے' یہ یہاں کون ہیں؟ وہ اس کا پتہ لیں گے تو وہ عرض کریں گے کہ یہ تو محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔آپ کہیں گے کہ کیا کہہ رہے ہیں! آپ خدا

ہیں، جائیے، میری امت جہنم میں ہو اور میں جنت میں چلا جاؤ، یہ ممکن نہیں۔ میں تو نہیں جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہمارا جو محبوب ہے، وہ باہر رہے اور ہم یہاں سے چلے جائیں، یہ ممکن نہیں، ہم یہ نہیں کریں گے۔ فرشتوں سے کہا کہ بہت اچھا، انہیں نکالیے۔ نکال دیئے باہر۔ کہا کہ صاحب! ان کے مزید جرم تو بہت ہی زیادہ سخت ہیں۔ فرمایا کہ کیا میری شفاعت کے مقابلے میں زیادہ وزنی ہیں؟ کہا کہ نہیں جی! تو کہا کہ جہنم سے اور نکالیے۔ بہر حال یوں جہنم سے لیا جائے گا اور جنت میں بھیج دیا جائے گا۔

اس قسم کے غیر قرآنی تصورات انسانی ذات کو عملی طور پر پامال کر دیتے ہیں

قرآن کریم یہاں کس چیز کی تردید کر رہا تھا؟ پہلی چیز یہ ہے کہ **مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ** (41:46) اس میں کسی کا استثنا نہیں ہے جو بھی اعمالِ صالحہ کرتا ہے ان کا فائدہ اسی کو ہوتا ہے۔ یہ تو ایک طرف رہا، آپ کے ہاں جو ایصالِ ثواب ہوتا ہے، وہ مردہ اپنے اعمال کے ساتھ چلا گیا ہے، آپ یہاں اس کے پیچھے، ثواب پارسل کر کے بھیج رہے ہیں۔ یعنی آپ سوچیے کہ یہ قل، یہ جمعراتیں، یہ چہلم، پھر اس کے بعد اس کے نام کی قربانی، اس کے نام کی دیگیں، اور یہ عرس، اور یہ سارے ایصالِ ثواب کے لیے کیا ہے؟ یعنی اپنا جو آپ کا ثواب ہے، آپ اُسے منتقل کر رہے ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ **مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ** (41:46)۔ عزیزانِ من! کتنی عملی تردید ہم اس قرآن حمید کی کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ جس نے کوئی کام اچھا کیا ہے، وہ اس کی ذات تک ہے۔ میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ جو شخص بھی صبح کو سیر کرتا ہے اُس کی صحت اچھی ہوتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی صحت کا کچھ حصہ اپنے اس بھائی کو دیدے جو نہ سیر کرتا ہے، نہ احتیاط کرتا ہے، نہ کوئی پرہیز کرتا ہے۔ یہ نتیجہ منتقل ہی نہیں ہو سکتا۔ عملِ صالح کا نتیجہ ناقابلِ انتقال ہے۔ یہاں تو میں کیا عرض کروں! انصاب کے طور پہ کبھی بچوں کو پڑھاؤں گا اور وہاں بتاؤں گا کہ یہ **عمل لنفسہ** کے معنی کیا ہیں؟ جو قرآن کریم نے کہا ہے، اس کے معنی کیا ہیں؟ اُس کرنے کا، عمل کا تو اثر انسان کی ذات پہ ہوتا ہے Psyche پہ ہوتا ہے، وہ ناقابلِ انتقال ہوتا ہے۔ Psyche اور ذات ہر فرد کی Individual (منفرد) ہوتی ہے، ہر فرد کی اپنی ہوتی ہے کسی دوسرے کا اس میں حصہ نہیں ہوتا۔ اب اسی لیے آگے کہہ دیا کہ **وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا** (41:46) جو یہ غلط کار ہیں، گنہگار ہیں، وہ ان گناہوں کا بدلہ بھگتیں گے۔ نہ تم منتقل کر سکتے ہو، نہ کسی کی سفارش اس کو بخش سکتی ہے۔ اب یہ ذہن میں سمجھا کہ انہوں نے کہا تھا کہ God is mercy [1]، عیسائیت کا تو ایمان ہی یہ ہے۔ یہودیوں نے کہا تھا کہ صاحب! جو شخص گناہ کر لیتا ہے اُس گناہ کے دھلنے کی کوئی شکل ہے ہی نہیں، اس لیے وہ جو جی میں آئے اس کے بعد نیک کام کرے، وہ بچ نہیں سکتا۔ اب یہودیوں کا یہ عقیدہ آپ دیکھتے ہیں واقعی ظلم نظر آتا ہے کہ اگر کسی سے لغزش ہو گئی ہے تو اُس کے بعد پھر وہ ساری عمر جو جی میں آئے اُس کے خلاف اس کو دھونے کے لیے کرتا رہے، خدا کے ہاں توبہ کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ یہودی عقیدے میں توبہ نہیں ہے۔

---

[1] خدا رحم ہے۔

یہودی عقیدے میں توبہ کا تصور نہیں' عیسائیت میں صرف رحم ہے' عدل نہیں مگر قرآنِ حمید کا بیان کچھ اور ہے

اگر اس سے لغزش ہوجاتی ہے تو یہ اس کی ابدی لغزش ہوگی جو کہ واقعی ظلم ہے' زیادتی ہے۔ اور دوسری طرف God is mercy رحم ہی رحم ہے' عمل کا سوال ہی نہیں ہے' عدل نہیں ہے' مکافاتِ عمل نہیں ہے' قانون نہیں ہے' صرف Mercy (رحم) ہے۔ اگر صرف ہر بات کے اندر Mercy (رحم) ہو تو آپ دیکھیے آپ کے معاشرے کا حال کیا ہوجائے۔ ہر قاتل کو Mercy (رحم) ہر زانی کو Mercy ہر چور کو Mercy یعنی عدل نہیں بلکہ Mercy ہے۔ اُن لوگوں پہ ظلم ہوجائے' جن کے خلاف یہ کچھ یہ کرتے ہیں۔ سنیے' عزیزانِ من! تینوں کیا ٹکڑے ہیں۔ **وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا** (41:46) جو جرم کرتا ہے اس کو خود بھگتنا ہوگا۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ **وَمَا رَبُّکَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ** (41:46) خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتا۔ قاتل پہ قانون کی حکمرانی محض رحم نہیں ہے۔ یہ اُن پہ ظلم ہے جو مظلوم ہیں۔ ایک دفعہ لغزش ہوجانے سے قیامت تک کے لیے راندۂ درگاہ ہوجانا' دوبارہ باز آفرینی نہ ہونا تو یہ بھی ظلم ہے۔ خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ ''یعنی اگر کوئی برابر بردا جوڑ ہووے تے گل وی ہووے''۔ یہ بندے بیچارے اور ان کے اوپر خدا ظلم کرے گا۔ بالکل نہیں۔ لہٰذا اصول یہ ہے کہ جس نے عمل صالح کیا ہے وہ اُس کی ذات تک ہے۔ جس نے جرم کیا ہے وہ اُس کو بھگتنا پڑے گا اور دونوں صورتوں میں تم دیکھو گے کہ قرآنِ کریم نے یہ جو باز آفرینی کا امکان رکھا ہے' یہ خدا کی بہت بڑی رحمت ہے۔ لغزش تو انسان سے ہو ہی جاتی ہے لیکن اگر وہ جو عرقِ انفعال کے قطرے ہیں' اقبالؒ (1877-1938ء) کہتا ہے کہ وہ موتی بن جاتے ہیں۔ ❶

انسان کو اپنی لغزش کی باز آفرینی کے سلسلہ میں عرقِ انفعال پیش کرنا ہوگا

اِس کا مکان ہے کہ باز آفرینی ہوجائے اور پھر اس کا طریق یہ ہے کہ **اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ** (11:114) اگر غلطی ہوگئی ہے' لغزش ہوگئی ہے تو اُس سے زیادہ بہتر کام کرو' وہ دُھل جائے گا جو کچھ بھی ہے۔ باز آفرینی کا امکان بھی ہوا اور باز آفرینی صرف Mercy (رحم) پہ نہ ہوئی کہ ہم تمہیں شانِ خسروانہ سے بخش دیں گے۔ بخشش کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ تخریبی اثرات دھونے کا اصول یہ ہے کہ اُس سے بہتر کام کرو' باز آفرینی ہوجائے گی۔ بڑے عمدہ طریق سے اقبالؒ (1877-1938) اس کو بیان کرتا ہے۔

صورت گری را از من بیاموز
شاید کہ خود را باز آفرینی ❷

(اقبالؒ: زبورِ عجم)

اگر تمہارا کسی طرح سے حلیہ بگڑ گیا ہے تو کوئی بات نہیں' میں تمہیں طریقہ بتاؤں گا جس سے پھر وہی چہرہ حسین ہوجائے گا۔

---

❶ موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے — قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

❷ صورتیں بنانے کا فن مجھ سے سیکھو۔ شاید کہ تُو خود کو (ایک نئی صورت میں) دوبارہ پیدا کرلے (لفظی ترجمہ)۔

خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں باز آفرینی کا امکان ہر آن موجود رہتا ہے' ابلیس اور شیطان ایک ہی سکے کے دو رُخ

باز آفرینی کا امکان خدا کی رحمت ہے۔ابلیس ❶ کے معنی ''مایوس'' کے ہیں۔ وہ اس لیے مایوس ہے کہ وہ باز آفرینی کا عقیدہ ہی نہیں رکھتا۔ یہ ہے بات۔اور جب یہ چیز نہ ہو' باز آفرینی کا عقیدہ نہ ہو' یہ مایوسی ہو' تو سرکشی تو آجاتی ہے۔ یہ جو جیل سے بھاگا ہوا قاتل باہر آنے کے بعد پانچ سات دس قتل اور کر دیتا ہے' تو یہ کیا چیز ہے؟ یہ شیطنت ہے۔شیطن ❷ کے معنی ہیں ''شعلوں کا بھڑک اٹھنا''۔ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا ہوتا ہے کہ پکڑا گیا تو پھانسی پہ تو چڑھنا ہی ہے' جب ایک کے قتل سے پھانسی پہ چڑھنا ہے تو دس کیوں نہ قتل کروں۔اس کی پہلی چیز اپنی زندگی کی طرف سے مایوسی ہے۔ وہ تو ہے ابلیسیت۔اور اگلی چیز پھر شعلہ فشانی ہے کہ پھر جرم پہ جرم' قتل پہ قتل کرتے چلے جاؤ۔یہ ہے شیطنت۔قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ ایک ہی سکے کے دو رُخ (Two aspects of the same coin) ہیں۔جب انسان اتنا مایوس ہو جائے کہ باز آفرینی کا امکان ہی اُس کے ذہن سے نکل جائے تو پھر سرکش ہو جاتا ہے۔اسی لیے اس نے کہا ہے کہ رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے۔

بخشش کا تصور قرآن حکیم کی تعلیم کے ہی خلاف ہے: عمل اور اس کے نتیجے میں مہلت کے وقفہ کی مثالیں

خدا کی رحمت سے مایوس ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ گناہ پہ گناہ کرتے چلے جاؤ اور پھر یہ کہا جائے کہ خدا رحیم ہے' غفور ہے' وہ پھر اپنی رحمت سے بخش دے گا۔وہ کہتا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔سمجھ لو' رحمت کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے لیے جو باز آفرینی کا امکان رکھا ہے' یہ رحمت ہے۔مرض کے لیے جو ہم نے علاج اور دوائیاں بنا دی ہیں' یہ ہماری رحمت ہیں۔اب دوائیاں لگانا' علاج کرنا تو تمہارا کام ہے مگر یہ یاد رکھو کہ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (41:46) تیرا نشو و نما دینے والا' نہ کسی کے اجر میں کمی کرتا ہے' نہ کسی پہ ظلم اور زیادتی کرتا ہے۔اس نے اپنے بندوں پر زیادتی کر کے کیا لینا ہے؟

اب پھر وہی مہلت کے وقفہ کی بات آ گئی۔ ہر بار جب حضور ﷺ' یہودی ہوں یا قریش ہوں یا عرب ہوں' سے کہتے تھے کہ اس روش کا نتیجہ تباہی ہے تو وہ کہتے تھے کہ لاؤ یہ تباہی' یہ آتی کیوں نہیں ہے۔اس کے لیے ان کو سمجھایا جاتا تھا کہ کائنات میں بھی تم غور کرو' کائنات میں کوئی چیز پہلے دن ویسی مقطع اور مکمل نہیں ملے گی۔ وہ اپنے تدریجی مراحل سے گزرے گی' آخر الامر جا کر وہ وقت آئے گا جسے

---

❶ اس کا مادہ (Root) ''ب ل س'' ہے

❷ اس کا مادہ (Root) ''ش ط ن'' ہے

آپ اعمال کا نتیجہ کہتے ہیں۔ اور وہ اسے خارجی کائنات سے سمجھتا ہے۔ بات اُس نے یہی کہنی ہے کہ یہ جو کہتے ہیں کہ وہ تباہی کی گھڑی کب آئے گی تو کہا کہ اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ (41:47) اس کا علم تو مجھے نہیں ہے۔ یہ کب آئے گی مجھے علم نہیں ہے۔ یہ میں یقین سے کہتا ہوں کہ آئے گی کیونکہ خود خدا نے کہا ہے کہ ان کے اعمال کا نتیجہ تباہی ہوگا اس لیے میں یقین سے کہہ رہا ہوں کہ یہ آئے گی۔ کب آئے گی؟ اس کے متعلق خدا کو علم ہے لیکن یہ کیسے آتی ہے؟ اس کے لیے وہ کہتا ہے کہ یہ سمجھ لیجیے کہ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ (41:47) درختوں کو تم دیکھتے ہو کہ خزاں کے بعد نئے شگوفے پھوٹتے ہیں، نئی پتیاں ابھرتی ہیں، پھر ان کے بعد اُس میں پھول آتے ہیں، پھر جسے بُور کہتے ہیں خوشبو لگتا ہے، پھر اس کے بعد تم دیکھتے ہو کہ چھوٹی چھوٹی شکل کے اندر کچھ پھل نکلتا ہے، وہ پھل آہستہ آہستہ پکتا ہے، بہت سے پھل غلافوں کے اندر ہوتے ہیں۔ کتنا وقت لیتے ہیں وہ اپنی آخری منزل تک پہنچنے کے لیے! ادھر اُدھر نگاہ نہیں جاتی تو روزمرہ آپ کے ہاں بچے پیدا ہوتے ہیں، وہ جو استقرارِ حمل ہے اُس سے لے کر وضعِ حمل تک کتنے مدارج ہیں جن سے وہ بچہ گزرتا ہے۔ یہ ہمارے قانونِ مہلت کا ہی تو نتیجہ ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ آج میں نے گیہوں بو دیا ہے اور کل آ کر کہے کہ اس میں فصل کیوں نہیں لگ رہی۔ آج کہے کہ استقرارِ حمل ہو گیا، کل ہی آ کر بیوی سے کہے کہ وہ بچہ پیدا کیوں نہیں ہو رہا۔ تو کہا کہ سوچو تو سہی۔ یہی وہ خدا کا قانون ہے اور یہ اس کی رحمت ہے کہ انسان اُسی وقت نہیں پکڑا جاتا۔ اُس نے کہا ہے کہ اگر یہ قانونِ مہلت نہ ہو تو دنیا میں کوئی انسان زندہ نہ رہے۔ ''گل تے ٹھیک ہیگی اے [1]''۔ رحمتیں اس کی یہ ہیں کہ اُس نے اس قسم کے قوانین بنا دیئے ہیں لیکن کہتا ہے کہ جب وہ ساعت، وہ انقلاب آ جاتا ہے تو وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَآءِيْ (41:47) اس دن پھر ان سے کہا جائے گا کہ جن کے بل بوتے پر تم اس قدر سرکشیاں کرتے تھے، مظالم کرتے تھے، بتاؤ! وہ قومیں کہاں ہیں؟ یاد رکھیے! اکیلا کوئی آدمی بھی اتنا طاقتور نہیں ہوتا کہ وہ پوری کی پوری قوم کو دبا لے۔ وہ ایک فرد ہی ہوتا ہے۔ شرکاء ہوتے ہیں، وہ انہیں اپنے ساتھ ملاتا ہے۔ قرآن کریم نے یہ دوسرے مقام پہ کہا ہے۔ کبھی پھر یہ درس میں آیا تو میں عرض کروں گا کہ وہ کتنی بڑی بات کہہ گیا ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ جتنے بھی تمہارے ساتھ اور جو کچھ بھی تمہارا ہے، وہ سب دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ ہمارے سامنے تم صرف Individually (فرداً فرداً) آؤ گے۔ [2] اور یہی چیز

---

[1] یہ بات تو صحیح ہے۔

[2] یہ جس طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ آیت یہ ہے: وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (6:94) اور خدا کہے گا کہ (تمہیں اپنے متبعین پر بڑا ناز تھا لیکن) آج تم ہماری عدالت میں تنہا (Individually) آ گئے ایسے ہی تنہا جیسے ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا، اور جو کچھ ہم نے تمہیں (مال و دولت وغیرہ) عطا کیا تھا، سب پیچھے چھوڑ آئے۔ ہم تمہارے ساتھ، تمہارے ان رفقاء کو بھی نہیں دیکھ رہے جن کے متعلق تمہیں زعم تھا کہ وہ ہر حالت میں تمہارا ساتھ دیں گے۔ آج تمہارے اور ان کے تعلقات منقطع ہو گئے اور جسے تم حقیقت سمجھا کرتے تھے، وہ سراب نکلا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 310)۔

ہے کہ مجرم کو وہاں تنہا پیش ہونا چاہیے۔ کہا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ شرکاء جن کے بل بوتے پہ تم یہ کچھ کیا کرتے تھے؟ قَالُوْٓا اٰذَنّٰکَ مَا مِنَّا مِنْ شَهِیْدٍ (41:47) وہ کہیں گے کہ ہم تیرے حضور اس کا اعلان کرتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی انہیں نہیں دیکھ رہا۔ معلوم نہیں وہ کہاں غائب ہو گئے۔ آج تو ان میں سے کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ جب ایسا وقت آتا ہے' عزیزانِ من! تو یہ جو ساری عمر کے ساتھ ہوتے ہیں اُن میں سے کوئی بھی ساتھ نہیں ہوتا۔ یہی نہیں کہ وہ بھاگ دوڑ کر اپنے آپ کو غائب کرتے ہیں' بچتے پھرتے ہیں بلکہ یہ آ کر کہتے ہیں کہ ہم تو بالکل اس کے ساتھ نہیں تھے' ہم تو اس کو پہچانتے نہیں ہیں' جانتے نہیں ہیں۔ کہا کہ اُس وقت یہ کیفیت ہو گی۔ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ [1] (41:48)۔ یہ "ضل" عجیب چیز ہوتی ہے۔ یعنی جس چیز کا اپنا تشخص ہی باقی نہ رہے' وہ ان سے یوں گم ہوئے' نہ وہ ان کو نظر آتے ہیں' نہ ان کا کوئی تشخص ہی نظر آتا ہے' نشان تک نظر نہیں آتا۔ وہ انکار کر رہے ہیں۔ ان کے لیے کہا ہے کہ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ (41:48) اب کوئی پناہ گاہ ان کے لیے نہیں ہے۔

دولت کی ہوس سے اس انسان کا پیٹ ہی نہیں بھرتا

قرآن کریم نے کہا ہے کہ انسان کی بھول کی بھی عجیب کیفیت ہے۔ لَا يَسْئَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوْسٌ قَنُوْطٌ (41:49) دولت سمیٹنے میں' کہ یہ مل جائے' وہ مل جائے' یہ سارا کچھ مل جائے' وہ اس میں کبھی تھکتا ہی نہیں ہے۔ اور ضرورت کے لیے تو اس کو دو چپاتیاں چاہئیں' دو کپڑوں کے جوڑے چاہئیں لیکن وہ ہے کہ سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ o حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:1.2) مال و دولت اور جاہ و منصب میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دوڑ لیے جاتی ہے حتیٰ کہ یہ دونوں قبر میں جا پہنچتے ہیں۔ کیا حسین انداز ہے! کہ "تھکتا ہی نہیں ہے"۔ جتنا جی چاہے سمیٹتا چلا جائے' تھکتا ہی نہیں ہے' بس ہی نہیں کرتا۔ اور دوسری طرف حالت یہ ہے کہ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوْسٌ قَنُوْطٌ (41:49) ذرا سا کہیں Set back (نقصان) ہوتا ہے' مسوس کر بیٹھ جاتا ہے: مارے گئے' ختم ہو گئے' کچھ نہیں رہا۔ اوبایا! کوئی ہمت کرو۔ صاحب! ہمت کاہے کی کریں' ہے ہی کچھ نہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اس کی یہ کیفیت ہے۔ اس قسم کا کردار ہوتا ہے' یہ کیریکٹر ہے۔ Undeveloped Personality (غیر نشوونما یافتہ شخصیت) کی کیفیت ہوتی ہے' عزیزانِ من! یہ بھی کسی مقام پہ رکتا نہیں ہے' ہوس ہے۔ اِدھر ذرا سی سیٹ بیک (کمی) ہوتی ہے' استقامت نہیں رہتی' ڈوب جاتا ہے۔

---

[1] یعنی اس انقلاب کے وقت' وہ سب جنہیں وہ (اپنی مدد کے لیے) پکارا کرتے تھے' ان سے غائب غلا ہو جائیں گے۔ اس وقت انہیں احساس ہو گا کہ خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے بچ کر بھاگ جانے کا کوئی بھی مقام نہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 1122 تا 1123)۔

وحی انسانی سوچ میں حدِ امتیاز پیدا کر دیتی ہے

جہاں قرآن حکیم میں، عزیزانِ من! وحی کی روشنی میں نہ چلنے والے انسان کے متعلق کچھ کہا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن حکیم نے اس کے متعلق بڑی خراب چیزیں کہی ہیں: لالچی ہے، اُس کا جی نہیں بھرتا، ظالم ہے، جاہل ہے، یہ سارا کچھ اس انسان کے متعلق ہے۔ ذہن میں یہ آتا ہے کہ جب خدا نے اِس کو پیدا کیا ہے اور یہ ایسا ہی ہے تو پھر اس سے نیکی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات اصولاً یاد رکھو! قرآن حکیم میں جہاں بھی انسان کے متعلق یہ کچھ کہا جائے گا تو اُس کے معنی وہ انسان ہونگے جو وحی کی روشنی میں نہیں چلتا بلکہ اپنے ہی مفادات کے اتباع میں چلتا ہے۔ پھر یاد رکھیے! یہ اُس انسان کے متعلق کہا ہوا ہے۔ وہی انسان جب وحی کی راہنمائی میں چلتا ہے تو پھر وہ ساری چیزیں جو قرآن کریم مومنین کی بتاتا ہے، اُس انسان میں آجاتی ہیں۔ یہ نہ کہیے کہ انسان کو تو خدا بار بار Condemn (مطرود) کرتا ہے تو پھر اس نے اس قسم کی مخلوق ہی کیوں پیدا کی؟ اور پھر اس کے بعد پیدا بھی کیے چلا جا رہا ہے۔ اُس نے کہا یہ ہے کہ انسان کو جب علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو وہ حیوانی سطح پہ ہوتا ہے اور حیوانی سطح پہ ساری وہ چیزیں اس کے اندر ہوتی ہیں جو ایک حیوان میں ہوتی ہیں۔ حیوان Values (اقدار) نہیں جانتا، اپنے اغراض کو جانتا ہے۔ وہ جو کہا ہے کہ خیر کی دعا میں تھکتا ہی نہیں ہے، تو یہ کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن جب یہی انسان وحی کی روشنی کے اندر آتا ہے تو پھر وہ جو مومن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے، پھر یہ وہ بن جاتا ہے، آخرت تو ایک طرف رہی۔

علامہ اقبالؒ انسان کے متعلق خدا سے ہم کلام ہے

کیا بات ہے! کہ اقبالؒ (1877-1938ء) بھی خدا سے بات کرتا ہے تو عجیب بات کرتا ہے:

ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد ❶

یہ وہ جانتے ہیں جن کو زمینوں کے متعلق پتہ ہے کہ خرابہ کس زمین کو کہتے ہیں۔ اور انسان سے پہلے اس کرہ ارض کی جو حالت تھی یہ سائنٹسٹ آپ کو بتاتے ہیں۔ اِس ایک لفظ ''خرابہ'' کے اندر یہ سب کچھ کہہ گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ''خرابہ'' کون آباد کرے گا؟ کہا کہ

انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد ❷

---

❶ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کا یہ پورا شعر یوں ہے۔

قصور وار، غریب الدیار ہوں لیکن | ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد | (بالِ جبریل)

❷ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) یہ پورا شعر یوں ہے:

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں | اُنھی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد | (بال جبریل)

وہ جو خرابے والا انسان ہے، وہ ہوتا ہے جو اپنے ہی اغراض کے پیچھے چلتا ہے۔ اُس خرابے کو وہ انسان آباد کرتا ہے جو وحی کی روشنی میں چلتا ہے۔ اس لیے کہا کہ

تُو شب آفریدی چراغ آفریدم ❶

تم نے تاریکی اور اندھیرا پیدا کیا تھا تو میں نے روشنی پیدا کی۔

لفظ مایوس اور قنوط کا مفہوم

عزیزانِ من! قرآن کریم کی بات یہ ہو رہی تھی کہ انسان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے لیے مال و دولت وغیرہ کی طلب سے کبھی تھکتا ہی نہیں لیکن جب اسے ذرا نقصان پہنچ جائے تو فَيَئُوسٌ قَنُوطٌ (41:49) سخت شکستہ خاطر اور ناامید ہو جاتا ہے۔ یہاں میں یہ بتاؤں کہ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ وہ مایوس ہو جاتا ہے تو یہاں فَيَئُوسٌ ❷ اور قنوط دو الفاظ آئے ہیں۔ لفظ ''یوس'' میں مایوسی کی یہ پہلی حالت ہوتی ہے جس میں اسے شاید کچھ امید کا ذرا سا امکان نظر آ جائے لیکن ''قنوط'' تو وہ حالت ہوتی ہے جہاں امید کے دروازے ہی بند کر دیئے جائیں، جو آخری اسٹیج ہوتی ہے۔ اب یہ جو چیز ہے کہ اس کے بعد قرآن کریم نے بازآفرینی کا امکان رکھا ہے اور اس کو رحمت کہا ہے تو اس کے لیے ویسے تو پورا ایک درس چاہیے لیکن میں اشارے کے طور پہ صرف ایک آیت عرض کرتا ہوں کہ رحمت سے مایوس کون ہوتا ہے؟ قرآن کریم نے کہا ہے کہ قَالَ وَ مَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ (15:56) کہا کہ اس سے تو وہی راہرو ناامید ہوتا ہے، جو صحیح راستہ گم کر دیتا ہے یا صحیح راستہ پہ نہیں رہتا، وہ چلتا بھی رہتا ہے لیکن غلط راستوں پر رہتا ہے۔ وہ مایوس ہو جاتا ہے کہ اُس کے سامنے وہ منزل نہیں آتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ جو قرآن کریم نے ''قنوط'' والی بات کہی ہے، مایوسی والی بات کہی ہے، یہ کیسے پیدا ہوتی ہے؟ صحیح راستہ گم ہو گیا ہوا ہے، چلتا رہتا ہے، تھک جاتا ہے، منزل پہ نہیں پہنچتا۔

---

❶ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے اپنی تصنیف ''پیامِ مشرق'' میں ''انسان'' کے عنوان سے یہ شعر یوں لکھا ہے:

تُو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم

(تُو نے تاریکی اور اندھیرا پیدا کیا تھا تو میں نے روشنی پیدا کر دی۔ تُو نے مٹی پیدا کی تھی تو میں نے اس مٹی سے پیالہ بنا لیا)

❷ اس کا مادہ (Root) ''ی ا س'' ہے۔ تاج العروس میں لکھا ہے کہ الیاس ناامید اور مایوس ہو جانا۔ یوس. یئوس۔ ناامید ہونے والا۔ استیاس ناامید ہو گیا۔ اس مادے سے بننے والے حروف کے تصورات کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم، ادارہ طلوع اسلام لاہور، 1961ء ص ص۔ 1782 تا 1784۔

شاہراہ زندگی پر چلنے کے دوران انسان کے مایوس ہونے کی وجہ جواز اور اس کا علاج

آپ اس مسافر کی بات سوچیے جو صحیح راستہ سمجھ کر چلتا جا رہا ہو اور منزل سامنے آ نہیں رہی' تھک بھی چکا ہو۔قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ جو اُس کے بعد یہ کہتا ہے کہ نہیں' صاحب! منزل نہیں آئے گی' میں پہنچ ہی نہیں سکتا۔ کہنے لگا کہ یہ غلط ہے۔اس سے کہو کہ تمہاری مایوسی کا یہ نتیجہ اس لیے ہے کہ تم نے غلط راستہ اختیار کیا تھا اور ہمارے صحیح راستے اب بھی موجود ہیں۔اس لیے مایوسی کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔اس وقت صحیح راستے پہ آ جاؤ تو تمہاری جو مایوسی ہے' امید میں بدل جائے گی۔گویا اُس نے خود بتایا کہ خدا کی رحمت سے باریابی کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اُس کے متعین کردہ صحیح راستے پہ چل پڑے' بیٹھا ہوا ہی نہ کہتا رہے: میری بار کیوں اتنی دیر کی۔انسان صحیح راستے کو چھوڑ کر غلط راستے پہ چلتا ہے' چلتا ہے تو تھکتا ہے' منزل سامنے نہیں آتی۔قرآن مجید کہتا ہے کہ یوں انسان مایوس ہوتا ہے۔مایوس ہو جاتا ہے کہ نہیں' صاحب! میرے نصیب میں نہیں ہے۔او بالکل یہ نہ کہو' کیا کہہ رہے ہو تم؟ وہ تو کہتا ہے کہ **وَ الَّذِیۡنَ جَاہَدُوۡا فِیۡنَا لَنَہۡدِیَنَّہُمۡ سُبُلَنَا** (29:69) ذرا کوشش' جدوجہد کر کے دیکھو۔جو شاہراہ ہے' وہ لگی ہوئی ہے۔کوئی بات نہیں ہے۔جہاں تم ہو' وہاں سے کئی پگڈنڈیاں ایسی ہیں جو وہ تمہیں صراطِ مستقیم تک پہنچا دیں گی۔کہتا ہے کہ رُخ بدل لے' سو پگڈنڈیاں تیرے سامنے آ جائیں گی جو صراطِ مستقیم میں ملا دیں گی۔سبیل اس پگڈنڈی کو کہتے ہیں جو آخر الامر آ کر شاہراہِ مستقیم پہ جا ملے۔کہتا ہے کہ سو پگڈنڈیاں ہیں جو شاہراہِ مستقیم پہ جا کر مل جاتی ہیں۔

قارون' جو نظام سرمایہ داری کا نمائندہ تھا' کا انجام

عزیزانِ من! قرآن حمید ہے تو پھر ایسے میں مایوسی کی کیا بات ہے۔لیکن اس کی کیفیت یہ ہے کہ **وَلَئِنۡ اَذَقۡنٰہُ رَحۡمَۃً مِّنَّا مِنۡۢ بَعۡدِ ضَرَّآءَ مَسَّتۡہُ لَیَقُوۡلَنَّ ہٰذَا لِیۡ** (41:50)۔کہنے لگے کہ بس یہاں مارا جاتا ہے آدمی' جب اس قسم کی پریشانیوں کے بعد پھر اس کو خوشحالی نصیب ہو جاتی ہے۔یہ ایک لفظ ھذا لی ہے جس میں قرآن کا سارا نظام آ جاتا ہے۔نظامِ سرمایہ داری کے متعلق قرآن مجید نے کہا ہے کہ قارون اس کا نمائندہ ہے' اُس نے سب کچھ سمیٹا۔اُسے کہا کہ او! سارا کچھ اپنی ذات کے لیے سمیٹے چلے جاتے ہو؟ اُس نے کہا کہ ٹھیک ہے' میں نے کمایا ہے' میرا ہے' کسی دوسرے کا اس میں کیا ہے! یہ ہے وہ چیز۔کیپٹل ازم اسی کا نام ہے کہ کسی شخص کو Interfere (مداخلت) کرنے کی اجازت ہی نہیں ہے' جتنا جی چاہے وہ اکٹھا کرتا چلا جائے' جتنے جی چاہے اُس میں سے محتاج ہوتے چلے جائیں۔جو وہ اکٹھا کرے گا تو وہ ایسے ہے کہ کسی کی روٹی چھینے گا تو اُس کے پاس دو ہونگی' وہاں سے تو ایک ایک ملی تھی' یہ دو کیسے ہو گئیں۔ایک محتاج رہا تو دو ہوئی ہیں۔لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ بھی نہیں کہ دو پہ بس کر جائے' پھر تیسرے کی چھینے گا' چوتھے کی چھینے گا۔

ھذا لی کا قرآنی مفہوم: قرآن کے معاشی نظام اور کیپیٹل ازم پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم یہاں ایک لفظ کہتا ہے۔ جھوم جائیے کہ قرآن کریم کس طرح ایک ایک لفظ میں ساری ازم سمجھا جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ اُس کے بعد اُس کو یہ کچھ مل جاتا ہے: هٰذَا لِيْ (41:50) کہ یہ میرا ہے۔ او یہ تیرا ہی نہیں ہے بلکہ ہر محتاج کا حصہ ہے۔ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (51:19)۔ یہ خیرات نہیں ہے، تم سے As of right (بطورحق) لے سکتے ہیں۔ جب ھذا لی کہو گے تو یہ قارونیت ہے، یہ کیپیٹل ازم ہے، یہ سرمایہ داری ہے۔ آگے کہا کہ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُوْنَ (2:3) ہم نے اس کو جو کچھ دیا ہے وہ دوسروں کی ضرورتوں کے لیے کھلا رکھتا ہے۔ عزیزانِ من! هٰـذَا لِـيْ (41:50) کے اوپر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے، اس کے اندر پورے دونوں سسٹم آ جاتے ہیں۔ قرآن کریم کا معاشی نظام بھی اور کیپیٹل ازم کا بھی۔

ہمارے ہاں "هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ" (27:40) کا استعمال اور مذہبی پیشوائیت کا کردار جو محض فریبِ نفس ہے

وہ کہتا ہے کہ دیکھو! اگر میں خدا کی نگاہ میں ایسا ہی کچھ گناہگار مجرم سا ہوتا تو وہ مجھے یہاں کیوں دیتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے نزدیک میں بڑا مقرب ہوں۔ یعنی دوسروں سے چھین کے، جھپٹ کے، ڈاکوؤں کی طرح لیے ہوئے ہے اور کہہ رہا ہے: هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ (27:40)۔ کہتا ہے کہ اللہ کا فضل تو اُس پہ ہی ہوتا ہے جو مقرب ہوتا ہے۔ کبھی مجرموں، گناہگاروں پہ بھی اس کا فضل ہوتا ہے؟ اُس نے کہا کہ ڈرو ایک دن قیامت کا بھی آنے والا ہے، وہاں یہ چیزیں، جو اس طرح سے تم نے حاصل کی ہیں، یہ تو وہاں کام نہیں دے سکیں گی۔ عزیزانِ من! ذرا غور سے سنیے گا۔ یہ جو آپ کے ہاں اتنے سرمایہ دار اور اتنا لوٹنے والے اور اتنا اکٹھے کرنے والے ہوتے ہیں، کبھی آپ نے یہ سوچا ہے کہ ان کو اطمینان کس بات سے ہوتا ہے۔ ضمیر تو اندر ہوتی ہے کبھی تو کوئی خلش پیدا ہونی چاہیے۔ کس چیز سے وہ مطمئن ہوتے ہیں؟ انہیں بتا دیا جاتا ہے، مولوی صاحب، واعظ صاحب، یہ کہتے ہیں کہ اگر یہاں ایک مسجد بنا دی جائے تو اللہ تعالیٰ قیامت میں موتیوں کا گھر اس کے لیے بنا دیتا ہے۔ یعنی یہ جتنا تم نے ڈاکہ ڈال کر اکٹھا کیا ہوا ہے اُس میں سے ایک مسجد بنا دیجیے۔ یہ ہے مسلمہ آپ کے ہاں۔ مسجد میں قالین بچھا رہے ہیں۔ اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ کیا بات ہے صاحب! اللہ کے بندے ہیں، بڑے نیک ہیں۔ ہزار ڈاکے مار کر اُس نے اکٹھا کیا ہوا ہوتا ہے اور وہ فانوس لگا رہے ہیں، قالین بچھ رہا ہے، ماربل کے فرش لگائے جا رہے ہیں پنکھے لٹک رہے ہیں، پھر دیگیں بھی پک رہی ہیں، نیازیں بھی بٹ رہی ہیں۔ یہ سارا کچھ اُس میں سے ہوتا ہے۔ وہ کیوں کر رہا ہے؟ اُس کو اطمینان دلایا ہوا ہے کہ یہ کر دیا جائے تو اللہ کے ہاں قیامت میں بخشش ہو جاتی ہے۔ جو یہاں اس طرح اُس نے مجھے دیا ہے اس کا فضل ہے تو اس کے لیے مجھے یہ

یقین ہے کہ وہاں بھی یہی ہوگا۔ کہتا ہے کہ **وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً** (41:50) اصل یہ ایمانداری کی بات ہے کہ دل سے تو وہ مانتا ہی نہیں ہے کہ قیامت آنے والی ہے' وہاں میرا مواخذہ ہوگا۔ لیکن جب اُس سے کہا جائے کہ وہ تو آئے گی' اتنی جرأت ہے نہیں کہ وہ یہ کہے کہ نہیں آئے گی۔ کہا کہ کوئی بات نہیں **وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰی رَبِّیۡ اِنَّ لِیۡ عِنۡدَهٗ لَلۡحُسۡنٰی** (41:50) کوئی بات نہیں' قیامت بھی آئے گی تو وہاں بھی ہم نے جنت میں گھر بنوانے کا انتظام کرلیا ہے' تو ہمیں کیا ڈر ہے۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ وہ کہتا یہ ہے کہ اول تو مجھے قیامت کا یقین نہیں ہے۔ اگر آئے گی تو وہاں میری حالت اس سے بھی بہتر ہوگی' میں نے انتظام کررکھا ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہاں بھی ہم خدا کے مقرب ہیں' اس لیے اس نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ وہاں تم دیکھو گے کہ اس سے بھی زیادہ بہتر مقام ہمیں ملے گا۔ یہ دو جگہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ یہ (18:36) دوسرا ریفرنس ہے۔ قرآن کہیں فریب نہیں کھانے دیتا' عزیزانِ من! وہاں اس میں وہ دو باغ والوں کی مثال دی ہوئی ہے۔ اُسے دوسرا کہتا ہے کہ اس میں سے محتاجوں کا بھی کچھ حصہ ہوتا ہے' یہ سب کچھ سنبھال لیا تُو نے۔ یہاں تُو نے تو یہ کچھ انتظام کرلیا وہاں یہ ہے کہ اُس نے پہرے بٹھا دیئے تھے کہ کوئی محتاج ادھر نہ آنے پائے۔ قیامت کے دن کیا چیز ہوگی؟ کہا کہ **وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰی رَبِّیۡ لَاَجِدَنَّ خَیۡرًا مِّنۡهَا مُنۡقَلَبًا** (18:36) وہاں اگر خدا کے ہاں یہ معاملہ ہوا بھی تو ہمیں یہاں سے بھی وہاں بہتر حالت ملے گی۔ یہاں تو میں نے پتھر اور اینٹوں کی مسجد بنائی ہے' وہاں موتیوں کا گھر مجھے ملے گا۔ کہا کہ یہ ہے فریبِ نفس جو ماردیتا ہے اور کس طرح سے قرآنِ کریم اس کی تردید کرتا ہے۔ کہا کہ اس سے کہو کہ ہمارا قانون یہ ہے **فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِمَا عَمِلُوۡا وَلَنُذِیۡقَنَّهُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ غَلِیۡظٍ** (41:50) اس فریبِ نفس میں مت رہو' ان صداقتوں سے انکار کرنے والے کے اعمال سامنے آئیں گے اور اس قدر وہاں سخت عذاب دیا جائے گا کہ تم یاد کرلو گے۔

اس سورۃ کی آیات تو بہرحال دو باقی ہیں لیکن وہ جو آخری دو آیات ہیں' میں سمجھتا ہوں کہ شاید وہ پورا درس لے جائیں۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ حٰمٓ السجدة کی آیت 50 تک آ گئے' 51ویں سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀❀............❀❀............❀❀

آٹھواں باب: سورة حٰمٓ السجدة (آیات 51 تا اختتام)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عزیزانِ من! آج مئی 1981ء کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة حٰمٓ السجدة کی آیت 51 سے ہو رہا ہے: (41:51) لیکن اس آیت پر آنے سے پہلے ایک مختصر سے نکتہ کی وضاحت دی جا رہی ہے۔

ایک اہم نکتہ کی وضاحت: زکوٰۃ کا موجودہ تصور قرآن کریم کے معاشی نظام کے خلاف ہے

میں نے سابقہ درس کے آخر میں یہ کہا تھا کہ یہ جو ہمارے ہاں' موجودہ اسلام کی رو سے' زکوٰۃ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جتنا جی چاہے کوئی دولت جمع کر لے اور پھر سال کے بعد اُس میں سے کچھ 2.5% خیرات کے طور پہ دیدے' اسے زکوٰۃ کہا جاتا ہے' تو باقی سارا مال پاکیزہ اور طیّب ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ تو قرآن کریم کے بنیادی مسلک کے' اس کے معاشی نظام کے' خلاف ہے۔ یہ قرآن کریم کی زکوٰۃ نہیں ہے۔ مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ پھر قرآن حکیم کی زکوٰۃ کیا ہے۔ اس دوران میں سوال آئے تو انہوں نے کہا تھا کہ درس میں ہی آپ بیان کر دیجیے گا۔ قرآن حکیم میں یہ فیصد والی بات ہی نہیں ہے۔ قرآن میں تو روپے کا اس طرح جمع کرنا ہی ناجائز ہے۔ میں قرآن حکیم کے معاشی نظام کی بات کر رہا ہوں' آج کے معاشی نظام کی نہیں۔

قرآن حکیم کے معاشی نظام کی بنیاد "قل العفو" پر ہے' اور خود لفظ پرائیویٹ کا لاطینی ماخذ "محروم کرنا ہے [1]"

عزیزانِ من! اُس نظام کی رو سے' جسے آپ اسلامی کہیں گے' قرآن حکیم نے یہ کہا ہے کہ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ

---

[1] To deprive

الْعَفْوَ (2:219) تم سے پوچھتے ہیں' کہ اے رسول! ہم کتنا دوسروں کی ضروریات کے لیے دیدیں۔ اِن سے کہو کہ تمہاری اپنی ضرورت سے جتنا زائد ہے' وہ سب کا سب دوسروں کے لیے دیدو۔ تم نے رکھنا کاہے کے لیے ہے۔ یہ ہے قرآن حکیم کی زکوٰۃ۔ لیکن یہ تو اُس نظام کو دی جائے گی جو اُس نظام کے تابع بسنے والے تمام افراد کے رزق کی ذمہ داری اپنے اوپر لے۔ وہ نظام اس روپے سے ان افراد کی ضروریات کو پورا کرے گا۔ اگر وہ نظام نہیں تو قرآن حمید کی یہ زکوٰۃ بھی نہیں ہے' پھر تو باقی خیرات کی بات رہ جاتی ہے۔ وہ خیرات جتنا بھی کسی سے ہوسکے دے۔ یہ قرآن حکیم کی زکوٰۃ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ جسے ہم قرآن کا معاشی نظام' قرآن کا سیاسی نظام' قرآن کا معاشرتی نظام' کہتے ہیں' یہ ایسے الگ الگ نظام نہیں ہیں۔ قرآن مجید کا اصل مقصد تو انسان کے اندر ایک تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ یہ ہے قرآن کی تعلیم کا سارا منتہیٰ۔ وہ انسان کو کچھ اور بناتا ہے۔ اس کے اندر جو تبدیلی پیدا کرتا ہے اگر وہ اقتصادیات یا معاشیات کا دائرہ ہے تو اُس میں اُس تبدیلی کی رو سے وہ جو Behave (طرزِ عمل اختیار) کرتا ہے' وہ قرآن حمید کا معاشی نظام ہوجاتا ہے۔ سیاست کے میدان میں' جس طرح سے اس انسان کا Reaction (ردِ عمل) ہوتا ہے جو قرآن حمید نے پیدا کیا ہے تو اُس سے اُس کا سیاسی نظام قائم ہوتا ہے۔ بنیاد تو فرد کے اندر ایک تبدیلی پیدا کرنا ہے۔

عزیزانِ من! غیر قرآنی زندگی میں جسے یہ Animal Instinct (حیوانی جبلت) کہتے ہیں' جو حیوانی جذبہ ہوتا ہے' وہ کارفرما ہوتا ہے اور ہمارے اس دور میں تو وہ شدت اختیار کر گیا ہے۔ اُس میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی فکر کرتا ہے' لینے کی فکر کرتا ہے' رکھنے کی فکر کرتا ہے' قبضے کی فکر کرتا ہے' Possession (ملکیت) کی فکر کرتا ہے۔ اور قرآن مجید کے الفاظ میں حالت یہ ہوتی ہے کہ اَلْهٰـكُمُ التَّكَاثُرُ o حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:1.2) مال و دولت اور جاہ و منصب ضرورت کے تابع نہیں ہے' ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی ہوس کے لیے ہے۔ محض مال و دولت اور جاہ و منصب کو سمیٹ کر اپنے قابو میں رکھنے کے لیے ہے۔ اور اس جذبہ کے تحت کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ جتنا حاصل کرتے جاؤ اتنی ہی ہوس بڑھتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ انسان قبر کے گڑھے تک جا پہنچتا ہے۔ یہ جو جذبہ ہے' یہ عجیب بات ہے۔ اسے پرائیویٹ پراپرٹی کہتے ہیں۔ یہ خود جو لفظ پرائیویٹ (Private) [1] ہے اس کا Latin Origin (لاطینی مخرج) ہے۔ لاطینی سے ہی یہ انگریزی زبان میں آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں ''دوسروں کو محروم کرنا''۔ یعنی اس لفظ کے معنی ''محروم کرنا'' ہیں۔ کسی زمانے میں جب وہاں یہ چیز تھی یعنی جب حضرت عیسیٰؑ کی عیسائیت نافذ ہوگی تو اس زمانے میں یہ جو زبان تھی' اُس کے معنی یہ ہیں۔ واقعی آپ دو روٹیاں کھاتے ہیں تو پیٹ بھر جاتا ہے' جو دو چار اور جمع کر کے آپ رکھ لیتے ہیں' وہ اُس بھوکے کو محروم کر دیتے ہیں' جس کے حصے

---

[1] Deprive Others.

میں یہ روٹیاں جاتی تھیں۔

زیادہ سے زیادہ جمع کرنا اور کم از کم دینا: یہ قرآن کریم کا معاشی نظام ہی نہیں ہے' اس کی بنیاد Consumer's Property پر ہے

قرآن کریم اس قسم کا انسان پیدا کرتا ہے جو صرف اپنی ضرورت کے لیے رکھے اور اس کے لیے پھر نظام یہ ہوتا ہے جو اس بات کی گارنٹی دیتا ہے' کہ تم بھوکے نہیں رہو گے۔ اُس کے بعد وہ انسان نظام ایسا پیدا کرتا ہے کہ اس کے اندر جو ہولڈنگ کا' Possession (ملکیت) کا' لینے کا جذبہ تھا' وہ اُس کے اندر سے ختم ہو جاتا ہے۔ اب اِس کا جذبہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ محنت کرے' زیادہ سے زیادہ دیتا چلا جائے۔ ضروریاتِ زندگی یہ نظام پوری کرتا ہے۔ جب انسانوں کے اندر یہ تبدیلی پیدا ہو تو اُس کے بعد یہ نظام جس میں یہی ہے کہ وہ ساری عمر جمع کرتا چلا جائے' اور اُس میں سے یہ تھوڑا سا یعنی 2.5 فی صد دیتا چلا جائے' ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ساری عمر جمع کرنا اور اس میں سے اتنا سا دینا تو اسلام کی بنیاد کے خلاف چیز ہے۔ وہ ایسے انسان پیدا کرتا ہے کہ اُن کا جذبہ لینے اور جمع کرنے کا ہوتا ہی نہیں ہے۔ ''زیادہ سے زیادہ کمانا' اور زیادہ سے زیادہ دینا'' وہ اس قسم کے انسان پیدا کرتا ہے۔ اور اب بھی ہمارے ہاں وضعی حدیثیں سرمایہ داری کے نظام میں بھری پڑی ہیں۔ اُن میں یہ ہے کہ سارا جمع کرتے چلے جاؤ اور سال کے بعد 2.5% دیدو' باقی سارا مال حلال وطیّب ہو جاتا ہے۔ یہ سرمایہ داری کے نظام کی وضع کردہ حدیثیں ہیں' رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہیں۔ اِن میں بھی کہیں کہیں ایسی احادیث ہمارے سامنے آجاتی ہیں جو پکار کر کہتی ہیں کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہوگا۔

ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ Possession (ملکیت) یا ہولڈنگ کا' اپنی ضرورت سے زیادہ سمیٹتے ہوئے لے جانا کا' جو جذبہ ہے' اسلام اِس جذبے کو ختم کرتا ہے اور دینے کے جذبے کو ابھارتا ہے۔ اب یہ جو چیز ہے کہ اتنا ہی چاہیے جتنا اپنی ضرورت کے لیے ہو' آپ اسے Consumer's Property (خرچ کرنے والے کی جائداد) کہہ لیجیے۔ جتنا کوئی خود Consume (خرچ) کرسکتا ہے' استعمال کرتا ہے۔ وہ Possession یعنی جمع کرنا تو Possessive Property (جمع کرنے والے کی جائداد) ہوتی ہے۔ جسے قرآن حمید کہتا ہے کہ **جَـمَـعَ مَـالًا وَّعَدَّدَهٗ** (104:2) یہ دولت جمع کرتا ہے اور گنتا رہتا ہے۔ یعنی مال و دولت ضرورت سے زیادہ ہے اور صرف اُس کو گنتا ہی رہتا ہے' اُس میں سے کتنا کھائے گا!! وہ دو روٹیوں سے زیادہ تو کھا نہیں سکتا' تین کھا جائے گا۔ کیا وہ سو روپیہ اندر نگل لے گا؟ نہیں۔

قرآن کریم کے معاشی نظام کے خدوخال کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی حدیث اور موجودہ زمانے میں جمع کرنے کا مقصد محض تحفظ خویش کا جذبہ ہے

نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ بندہ میرا مال کہتا چلا جاتا ہے حالانکہ وہ جو مال کہتا ہے اُس میں سے اُس کا اتنا ہی حصہ ہوتا ہے جو وہ کھالے اور ہضم کرلے جو وہ پہن کے پرانا کردے اور جو وہ دوسرے کو دے کر آخرت کے لیے اپنا سامان اختیار کرلے۔ اور اس سے زائد جو اس کے پاس ہوتا ہے یا تو کوئی اُس کی زندگی میں ہی لے جاتا ہے یا مرنے کے بعد لے جاتا ہے۔ وہ اُس کا ہوتا ہی نہیں ہے، ہوتا تو اُس کا اتنا ہے جتنا وہ اپنے اوپر خرچ کرلیتا ہے۔ یہ ہے ''عفو'' (2:219) کے معنی کہ تمہاری ضرورت سے زائد جتنا ہے وہ دوسروں کے لیے دیدو۔ قرآن حکیم کے نظام میں، عزیزانِ من! یہ زکوٰۃ ہوگی۔ زکوٰۃ کے معنی ہیں سامانِ نشوونما۔ یہ پیسے نہیں ہیں۔ یہ وہ ہے جس سے انسان کی Growth (نمود) اور Development (نشوونما) ہوتی ہے۔ بہرحال یہ اُس اسلامی نظام کا ذکر ہے جس میں پہلی چیز یہ ہے کہ تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا نظام کے ذمہ ہوتا ہے۔ تو جب میری ضروریات کا ذمہ دار کوئی ہو جائے تو میں خواہ مخواہ کاہے کے لیے یہ سر دردی لوں کہ میں جمع کرتا رہوں اور جمع کرتا چلا جاؤں۔ ہم اس دور میں اس لیے جمع کرتے ہیں کہ کل کو اگر مجھ پہ افتاد پڑگئی تو کوئی اس وقت میرا ہاتھ نہیں بٹائے گا۔ جسے Rainy Days کہتے ہیں یعنی مصیبت کے زمانے کے لیے مجھے کچھ رکھنا چاہیے۔ اور یہ ٹھیک ہے۔ اِس نظام کے اندر جہاں نفسا نفسی ہے، کوئی کسی کو پوچھتا نہیں تو ہر ایک کو یقیناً اپنی جو Preservation of Self (تحفظِ خویش) ہے، اُس کے جذبے کے لیے آپ رکھتے ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ چونکہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ دن کب آنے ہیں اور کتنا لمبا عرصہ میری زندگی کا ہے، اس لیے آدمی جمع کرتا چلا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ سب غیر قرآنی نظام ہیں۔ یہ بات واضح کرنے کی ضرورت تھی کہ قرآنی نظام کی زکوٰۃ کیا ہوتی ہے اور وہ نظام کیا ہوتا ہے۔

اب ہم سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی آیت 51 سے لیتے ہیں۔

انسانی ارادے کی پختگی کی اہمیت اور ناپختگی کا رونا

یہ الفاظ پہلے بھی آچکے ہیں کہ **وَاِذَآ اَنۡعَمۡنَا عَلَى الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوۡ دُعَآءٍ عَرِيۡضٍ** (41:51) انسان کی کیفیت یہ ہے کہ اتنا تھوڑا سا واقع ہوا ہے کہ کچھ مل جاتا ہے تو پھر تکبر اور فرحت کا پوچھو ہی نہیں کہ انداز کیا ہوتا ہے۔ پھنے خاں بنے پھرتے ہیں۔ اور جب ذرا سی بھی کوئی نقصان کی چیز آتی ہے تو پوچھو نہیں، خدا تو ایک طرف رہا، مٹی کی ڈھیریوں کے اوپر جا کر سجدے کرتے ہیں: یا خواجہ بچالو، یا حضرت صاحب بچالو! یہ کیفیت ہے۔ یہ کیا چیز ہے جو قرآن حکیم نے کہی ہے؟ کیا خدا نے

یہ کہا ہے کہ صاحب! یہ تو بُری بات ہے کہ ہم کچھ دیتے ہیں تو ہمیں سلام کرتا ہے اور نہیں ملتا ہے تو پھر ہم سے آنکھیں ہی پھیر لیتا ہے۔ تو گویا ایسا نظر آیا جیسے خدا کا کوئی اپنا مقصد تھا اس لیے اُس نے یہ کہا ہے۔ جو کچھ قرآن حکیم کہتا ہے اُس میں خدا کا اپنا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ خدا چاہتا یہ ہے کہ تم انسان بن جاؤ اور بس! انسان بننے کے لیے یہ Determination (قوتِ ارادی) یعنی جس چیز کو بھی آپ صحیح سمجھتے ہیں اس پر پختگی ہو۔ پہلی چیز اُس میں پختگی اور استقامت کی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہوا کے ساتھ بدلتا رہے۔ یہ جو چیز ہے یہ قرآن کریم نے کہی ہے۔ یہ ایک کیریکٹر کی کمزوری ہے کہ ایک وقت میں فارغ البالی حاصل ہے' جھوم رہا ہے تو اُس وقت تو جناب بڑے تکبر میں بھی ہے' فرحاں ہے' نازاں ہے۔ اور ذرا سی مصیبت آئی' تکلیف آئی تو اُس وقت وہ اتنی پستی میں گر جاتا ہے کہ انسانیت کی سطح بھی نہیں رہتی۔ یہ انسان کے اندر کی ناپختگی ہے۔

قرآن حمید پہلی چیز یہ کہتا ہے کہ انسان کے اندر کی پختگی ہے' وہ کفر میں بھی کیوں نہ ہو' خواہ اُس کا مظاہرہ غلط طریقے پہ ہو رہا ہے' وہ چیز تو اندر موجود ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ پختگی ہو۔ جن میں پختگی ہو' پھر ان کو وہ بتاتا ہے کہ تمہاری جو پختگی ہے وہ جو صحیح راستہ' صداقتیں قرآن مجید نے بتائی ہیں' اُن کے اوپر ہونی چاہیے۔ اب یہاں آ کر کفر اور ایمان کا فرق پڑتا ہے۔ اگر شروع میں ہی ناپختگی ہے تو اِس ناپختگی والے لوگ اگر ایمان بھی لے آئیں گے تو وبالِ جان بن جائیں گے جیسے قوت ہے۔ یہ قوت نہایت ضروری ہے کسی فرد کے لیے بھی' ایک قوم کے لیے بھی' دنیا میں زندہ رہنے کے لیے بھی۔ اب قوت کا استعمال آیا۔ ایک استعمال تو یہ ہے کہ جو تمہیں کمزور اور غریب نظر آئے اُس کا گلا گھونٹ دو' خون چوس لو۔ دوسرا استعمال یہ ہے کہ ظالم کی کلائی مروڑ دو۔ قوت ہوگی تو یہ کرے گا۔ گویا یہ جو قوت کا ہونا ہے' یہ بنیادی شرط ہے۔ اب اس کے استعمال میں فرق آتا ہے۔ اگر اِس انسان کے کردار کے اندر پختگی نہیں ہے' اب کچھ ہے' تھوڑی دیر بعد کچھ اور ہے تو اُس کا بھروسہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ وہ کفر میں ہو یا ایمان میں ہو۔ صرف وہ بھروسے کے قابل ہے جو ہر حالت میں انسان کے اندر کا توازن نہ بگڑنے دے۔ وہ کسی نے بڑا عمدہ کہا ہے کہ

در کفر ہم پختہ آ زنار را رسوا بہ کن

ایمان تو ایک طرف رہا تُو تو کفر میں بھی پختہ نہیں ہے۔ زنار کو کیوں رسوا کرتا ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن میں یہ پختگی تھی۔ جب وہ صداقت پر آتے ہیں تو پھر وہ ہر آن میں اپنی پختگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ رفقاء رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آئے تھے' ان کی کیفیت یہ تھی کہ جہالت کے زمانے میں ان کے اندر پختگی موجود تھی۔ اُن کی اُس پختگی کا وہ چینل بدل دیا تھا۔ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ انسان کی کیفیت یہ ہے کہ ذرا سی خوشحالی حاصل ہوئی' تکبر ہوا' یہ ہوا اور وہ ہوا' تو وہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتا۔ اور ذرا سی مصیبت آئی تو رونا پیٹنا اور گڑگڑانا شروع کر دیا۔ یہ انسانیت نہیں ہے۔ انسان کو استقامت اور ہمت سے کام لینا چاہیے۔ اب آگے یہ سارا کچھ کہنے کے بعد کہا کہ قُــلْ

اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ثُمَّ کَفَرۡتُمۡ بِہٖ مَنۡ اَضَلُّ مِمَّنۡ ہُوَ فِیۡ شِقَاقٍۭ بَعِیۡدٍ ❶ (41:52)۔ یہ جو کچھ ہم نے کہا ہے یہ کسی انسان کی بات نہیں ہے بلکہ خدا نے تم لوگوں سے یہ سب کچھ کہا ہے۔ سوچو کہ جب یہ خدا کی طرف سے ہے اور تم اس سے انکار کرو، صحیح راستے سے کفر برتو، تو اس سے زیادہ غلط راستے پہ چلنے والا کون ہو سکتا ہے؟

اس سورۃ کی آخری دو آیات کی اہمیت اور کیفیت

عزیزانِ من! اب آخری دو آیتیں آتی ہیں۔ وہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ ویسے تو ہر سورۃ کی جو آخری آیتیں ہیں ان میں مضامین و تصورات کا زیادہ سے زیادہ ارتکاز (Concentration) ہوتا ہے، جتنا کچھ کہا جاتا ہے اُس کو بڑا جامع طور پہ آخری آیتوں میں قرآن کریم بیان کرتا ہے لیکن اس سورۃ کی آخری دو آیتیں تو وہ آیتیں ہیں جو میں سمجھتا ہوں کہ ہم اسلام کی صداقت کے لیے ساری دنیا میں پیش کر سکتے ہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ یہ قرآن کریم خدا کی طرف سے ہے۔

ہندوستان میں قرآنِ حکیم کو آخری کتاب ثابت کرنے کے سلسلہ میں مباحثوں کی شدت

اِس کا ثبوت کیا ہے کہ قرآن مجید خدا کی طرف سے ہے؟ یعنی ہم تو اس کو ایمان کے ذریعے سے ہی مانتے ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے، جو اِسے نہیں مانتا تو کیسے ثابت کریں گے کہ یہ خدا کا کلام ہے، خدا کی طرف سے ہے؟ اب تو وہ زور کم ہو گیا ہے کیونکہ یہاں غیر مسلم رہے نہیں ہیں، ورنہ ہندوستان کے اندر مناظروں کا، مباحثوں کا، بڑا زور ہوا کرتا تھا۔ مباحثوں میں پہلی چیز یہی آتی تھی کہ اسلام ہی ایک سچا مذہب ہے۔ پہلے تو اس کو مذہب کہنا، اس کو اپنے مقام سے گرا دینا تھا۔ اب اس کا مقابلہ دوسرے مذاہب سے کرتے تھے جو یہ خود مذہب تھا ہی نہیں اور پھر اس کو افضل ثابت کیا جاتا تھا۔ لیکن وہ کس قسم کے دلائل اور کس قسم کے وہ پرابلم Discuss (زیر بحث و تمحیص) ہوتے تھے، مسائل کیا ہوتے تھے، تو وہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب کی سطح کے اوپر جب دوسرے مذہب سے آپ مباحثہ کریں گے تو کیا پیش کریں گے۔

قرآنِ حکیم کے منجانب ہونے کا کیا ثبوت؟ سائنس کے انکشافات نے مذہب میں کھلبلی مچا دی

یہ چیز کہ قرآن حکیم منجانب اللہ ہے، انسان کا کلام نہیں ہے، یہ خدا کا ہے، اسے ثابت کرنا آپ کا بہت بڑا مسئلہ ہے، یہ بہت بڑا دعویٰ

---

❶ بہر حال، اے رسول! تُو ان لوگوں سے، جو اس قرآن کی صداقت سے انکار کرتے ہیں جو انہیں خدا کے قانونِ مکافات سے متنبہ کرتا ہے، کہہ دے کہ کیا تم نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ اگر یہ کتاب خدا کی طرف سے ہو (جیسے یہ فی الواقع ہے) اور تم اس سے انکار کرتے رہو، اور اس کی مخالفت میں اتنی دور تک نکل جاؤ، تو تم سے زیادہ راہ گم کردہ اور تباہ حال اور کون ہوگا؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔1124)۔

ہے۔خود بھی ذہن میں آپ سوچ لیجئے' آپ سے اگر پوچھا جائے تو آپ بھی تو مانتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے' تو آپ سے اگر کوئی سوال کرے کہ یہ کیسے خدا کا کلام ہے' بتاؤ مجھے کیسے تم مانتے ہو؟ سوچو تو سہی کیا جواب دو گے۔اور پھر یہ جتنے بڑے بڑے دعویٰ کرنے والے ہیں' اس کے متعلق تو اُن سے جا کر پوچھیے کہ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔قرآن ان دو آیات میں اس کا جواب دیتا ہے اور جواب وہ ہے جو مذہب کی دنیا میں کہیں آپ کو نہیں ملے گا۔یہ قرآن حمید تو عجیب وغریب کتاب ہے۔اُس نے ثابت یہ کرنا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے' کسی انسان کا نہیں ہے' تو بہت بڑا دعویٰ ہے' جس کو وہ ثابت کر رہا ہے۔صرف مسلمانوں کے ہی سامنے نہیں' ساری دنیا کے سامنے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے۔ساری دنیا کو یہ منوانا ہے۔کیا آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید اس کے لیے ثبوت کیا پیش کرتا ہے؟

عزیزانِ من! ثبوت یہ ہے کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) جب سے یہ کائنات' یہ خارجی کائنات اور انسان کی اپنی دنیا بھی وجود میں آئی ہے' اسی دن سے اس کے اندر بہت سے حقائق تھے لیکن وہ یوں کہیے جیسے چھپے ہوئے چلے آ رہے تھے' انسان کے سامنے بے نقاب نہیں تھے۔بات یوں ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی۔آج اس ایٹم (Atom) کے زور پہ کہا جا رہا ہے کہ ایٹم (Atom) کے زور پہ انسان چاند پہ چڑھتا ہے۔ایٹم (Atom) کے زور پہ کہا جاتا ہے کہ ایٹم (Atom) کا ایک بم بن جائے تو پورے کا پورا کرہ ارض بھک سے اڑ سکتا ہے' پورا کرہ ارض ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔وہ ایٹم (Atom) ہے کیا؟ ایٹم (Atom) شروع میں کہتے تھے' اس کا نام ذرہ ہوتا تھا یعنی کسی مادی چیز (Material Thing) کو چھوٹا کرتے چلے جایئے' اس کو ٹکڑے کرتے جایئے' باریک کرتے چلے جایئے' تو وہ آخری ذرہ جو اُس کے بعد Divide (تقسیم) نہ ہو سکے' اُس کو پھر تقسیم نہ کیا جا سکے' وہ اتنا باریک ہو جائے۔اُس زمانے میں اس کو ذرہ (Atom) کہتے تھے۔ذہن میں کچھ اور آ نہیں سکتا تھا۔لیکن اس دور میں تو پھر یہ جو چیز ہے آگے چلی۔وہ جسے ہم ذرہ کہتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ یہ بھی تو ایک مادی چیز ہے' Matter (مادہ) ہے مگر اب کہتے ہیں کہ یہ بھی ایٹم کی چیز نہیں ہے۔اب' عزیزانِ من! یہ بات دوسری طرف چلی جائے گی مگر کہا یہ جا رہا ہے کہ یہ چیزیں جو ہمیں یوں محسوس نظر آتی ہیں' یہ درحقیقت توانائی یا انرجی ہے' جو اس طرح سے اکٹھی ہوئی ہوتی ہے۔ ❶ کہہ یہ رہا ہے کہ جس کو بھی آج یہ

---

❶ یاد رہے اسے سر جیمز جینس نے اپنی کتاب The Mysterious Universe (پراسرار کائنات) میں Bottled up Waves (محصور لہریں) کہا ہے۔برٹرینڈ رسل (1872-1970) نے اسے مربوط حوادث (Inter-related events) کہا ہے اور آئن اسٹائن (1879-1955) اسے منجمد خیالات (Condensed thoughts) کہتا ہے۔مادہ اس خلا (Space) میں حوادث کی مجرد ریاضی خصوصیات کا نام ہے اور Ouspensky (1879-1947) کے الفاظ میں محض ایک Condition (حالت)۔مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں آدمی اندھا ہے تو یہ اندھاپن (Blindness) کوئی مادی شے (Material thing) نہیں بلکہ ایک Condition (حالت) ہوتی ہے یعنی

Materiality is the Condition of existence in time and space (Quspensky: Tertium Organum(1912),P.213)

(جو احباب ان امور کا بنظر تعمق مطالعہ کرنا چاہیں' ان کے لیے یہ کتاب بڑی پر از معلومات ہے: پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ ادارہ طلوع اسلام' کراچی' 1955' ص ص 48 تا 51)

ایٹم (Atom) کہہ رہے ہیں' جس دن یہ کرّہ ارض وجود میں آیا ہے' یہ ایٹم بھی اُس دن موجود تھا۔ اور یہ کہ یہ جو آسمان کے بڑے بڑے کُرّے ہیں ان کُرّوں کے اندر بھی آبادیاں ہوسکتی ہیں' جب سے یہ کُرّے بنے ہیں اُس وقت سے یہ ایک چیز ہے جو اس کے اندر ہے۔ یہ کسی کے علم میں نہیں تھا۔ ہمارے اس دور میں آ کر ایٹم (Atom) کی تحقیق ہوئی ہے کہ یہ کیا ہے۔ اس دور میں آ کر یہ بھی تحقیق ہوئی کہ ان کُرّوں کے اندر آبادیوں کا امکان ہے۔ بیشمار اس قسم کے حقائق ہیں کہ جوں جوں علم انسانی ترقی کرتا چلا جاتا ہے' وہ بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کل تک یعنی ابھی پانچ چھ سو سال سے پہلے تک' جو افلاک کا یا کرّہ ارض کا نظام تھا' اُس کی رو سے یہ جو سارے دانشور تھے وہ یہی سمجھتے تھے کہ زمین چپٹی ہے اور ہمیں بالکل ایسے تھال کی طرح نظر آتی ہے' گول بھی کہیے تو تھال کی طرح گول ہے' اُس پہ آبادی ہے اور یہ جو سورج ہمیں نظر آتا ہے وہ اس کے گرد گھومتا ہے۔ یعنی یہ پرانا نظام جسے بطلیموسی کہتے ہیں' یہ نظام مانتے چلے آ رہے تھے' یہی آپ کے مذہب کی دنیا میں تھا' تورات میں بھی تھا' انجیل میں بھی یہی تھا۔ اور یہ ہمارے ہاں کے جو پڑوسی [1] ہیں ان کے ہاتھوں تو پوچھو ہی نہیں کہ مذہب کس چیز کا نام ہے۔ وہ تو سب ان کو دیوی اور دیوتا مانتے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے۔ کل تک نظام افلاک یہ سمجھا جاتا تھا۔ اُس کے بعد آ کر ہمارے ہاں جن کو گیلیلیو (1642-1564) اور کوپرنیکس (1543-1473) کہتے ہیں' اُنہوں نے آ کر پہلی دفعہ یہ انکشاف کیا کہ یہ غلط ہے۔

کسی انسان نے اس کائنات کی کسی چیز کو ایجاد نہیں کیا بلکہ اسے Discover (بے نقاب) کیا ہے

ایک چیز ایجاد ہوتی ہے۔ ایجاد (Invention) کے معنی ہوتا ہے ''جو چیز نہ ہو اُس کو پیدا کر دینا''۔ یہ ایجاد تو کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ یہ صرف انکشاف ہوتا ہے' جس کے معنی Discover (بے نقاب) کرنا ہوتا ہے' یعنی ''کسی چیز کے اوپر پردہ پڑا ہوا ہے' سائنسدان صرف اس پردے کو اٹھا دیتا ہے''۔ تو یہ Discoveries (انکشافات) کہلاتی ہیں۔ کوپرنیکس وغیرہ نے' جو علم افلاک والے سائنٹسٹ تھے' پہلی دفعہ یہ بات کہی کہ نہیں بھئی! یہ زمین اس طرح سے ساکن نہیں ہے' یوں چوڑی نہیں ہے' سورج اس کے گرد نہیں گھومتا' یہ گول ہے' یہ خود گھومتی ہے اور یہ گردشیں دو قسم کی ہیں: ایک تو یہ خود یوں گھومتی (Axial Motion) ہے اور ایک یہ اس طرح سے سورج کے گرد بھی گھومتی (Orbital Motion) ہے۔ یہ کل کی بات ہے جو یہ چیز سامنے آئی اور یہ مسلمہ بن کر دنیا کے سامنے آ گئی۔ یہ زمین اسی طرح اُس دن بھی تھی جس دن زمین بنی ہے۔ یہ اُس دن بھی گول تھی یہ اُس دن بھی دوہری گردش کرتی تھی۔ لیکن انسان یہی مانتا تھا کہ یہ ساکن ہے' یہ چپٹی ہے۔ اتنے دور کے بعد علمِ انسانی نے ترقی کی' ہاتھ کو بڑھایا' پردہ پڑا ہوا اٹھایا' نیچے سے نظر آیا کہ نہیں صاحب! زمین تو گول بھی ہے' یہ گردش بھی کرتی ہے اور دوہری گردش بھی اس کی ہے۔ اس کو Scientific Truth (سائنسی صداقت) کہتے ہیں یعنی وہ صداقت

---

[1] یہ اشارہ ہندوستان کی کثیر آبادی ہندوؤں کی طرف ہے۔

جس کا انکشاف سائنس نے کیا ہے۔ اس قسم کی صد ہا صداقتیں ہیں۔ ان کو Laws of Nature کہتے ہیں یعنی قوانین فطرت کہتے ہیں' Realities کہتے ہیں' حقائق کہتے ہیں۔ جوں جوں علمِ انسانی ترقی کرتا جاتا ہے' یہ حقائق بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ Discoveries کا جو لفظ ہے اس کے لیے کہیے کہ یہ حقائق بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔

دنیائے سائنس نے دنیائے مذہب کو ہمیشہ شکست دی: ایک حقیقت اور عرب کے اُس امیؐ کا دعویٰ

یہ ہے جو آپ دیکھیے کہ اس چیز کا بظاہر مذہب سے تعلق ہے ہی نہیں۔ ویسے بھی مظاہر کا مذہب سے تعلق ہے ہی نہیں۔ یہ تو ایک سائنس کی چیز ہے' سائنٹسٹ یہ کچھ کرتے ہیں' وہ یہ کچھ بتاتے ہیں۔ مذہب کی تو کیفیت یہ ہے کہ جس دن گلیلیو (1564-1642ء) نے یہ بات بتائی کہ زمین گول ہے یا کوپرنیکس (1473-1543ء) نے کہا ہے یہ جو زمین ہے یہ سورج کے گرد چکر لگاتی ہے' سورج اس کے گرد نہیں چکر لگاتا' عیسائیت نے ان کو مرتد قرار دیدیا اور موت کا فتویٰ عائد کر دیا۔ یہ گلیلیو (1564-1642ء) تو توبہ کر کے بچا ورنہ اِس کو تو کہا تھا کہ ٹاور سے گرا کے ماردو۔ کہنے لگے کہ جو زمین ہے' وہ ساری کائنات کا مرکز ہے' اس لیے کہ اس پہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بیٹے مسیح کو بھیجا تھا' اور اگر اِس کو تم کہتے ہو کہ یہ اتنا سا کرّہ ہے' گول ہے' سورج کے گرد گھومتی ہے تو اِس کا وہ مقام جو کائنات کی مرکزیت کا ہے' وہ چھن جاتا ہے اور حضرت عیسیٰ کا مقام چھن جاتا ہے اس لیے گلیلیو (1564-1642ء) یا کوپرنیکس (1473-543ء) کا جو نظریہ ہے' غلط ہے۔ مذہب تو آ کر یہ کرتا تھا۔ سائنس اور مذہب میں یورپ کے اندر کتنی بڑی جنگ ہوتی تھی۔ اس پر بہت سی کتابیں ہیں لیکن ایک بڑی جامع کتاب ہے' جو گریپر کی Conflict of Science & Religion ہے۔ اس کا ترجمہ مولانا ظفر علی مرحوم (1874-1956ء) نے ''معرکہ مذہب و سائنس'' کیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ابھی یہ Discoveries (انکشافات) بھی نہیں ہوئی تھیں۔ بتایا یہ گیا تھا کہ عیسائیت نے سائنس کے انکشافات کے خلاف کیا کچھ کیا' کیا رکاوٹیں پیدا کیں۔ اس لیے کہ ہر سائنس یا انکشاف عیسائیت کے کسی نہ کسی دعوے کو غلط ثابت کرتا تھا۔ عیسائیت کیا' دنیا کے ہر مذہب کے دعوے کو غلط ثابت کرتا تھا۔ دنیا کا ہر مذہب یہی مانتا ہے کہ یہ جو آسمان ہے' یہ شیشے کا ڈل ہے' اس کے اندر یہ جو ستارے ہیں' یہ ہیرے کی طرح ہوئے ہیں۔ اب اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ہے ہی کچھ نہیں' یہ تو حدِ نگاہ کا نام ہے اور ستارے تو بڑے بڑے کرّے ہیں تو ہر مذہب کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے۔ اس لیے سائنس کا ہر انکشاف ہر مذہب کے کسی نہ کسی دعوے کی تردید کرتا تھا۔ اس لیے وہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ گویا یہ ہے معرکہ مذہب اور سائنس کا کہ سائنس نے جو Discovery (انکشاف) کی وہ مذہب کے دعوے کے خلاف گئی اس لیے سائنس نے کوشش کی کہ پہلے تو اُس کو باطل ثابت کرے اور اُس کے بعد اُس کو ختم کرنے کی کوشش کرے۔ گویا سائنس کا ہر انکشاف یا کائنات کے مستور حقائق میں سے کوئی حقیقت بھی' جب بے نقاب ہو کر سامنے آئی تو وہ مذہب کے کسی نہ کسی دعوے کی تکذیب کرتی تھی' یہ حقیقت تھی جو سامنے آئی تھی۔ اس لیے

سائنس کے جو انکشافات تھے وہ مذہب کے خلاف جاتے تھے' ہر مذہب کوشش کرتا تھا کہ یہ نہ ہو کیونکہ وہ جھوٹا ثابت ہوتا تھا۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم نے کیا کہا ہے؟ اُس نے کہا ہے کہ **سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ** (41:53)۔ یہ پوچھتے ہیں کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے ہے۔ کہا کہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حقائق کائنات پر پردے پڑے ہوئے ہیں' علمِ انسانی جوں جوں ان پر سے کسی پردے کو اٹھائے گا' تو وہ بے نقاب ہوگا اور جو حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آئے گی' وہ قرآن کریم کے کسی نہ کسی دعوے کا ثبوت بنے گی۔ کہا کہ یہ ثابت کرنے کا' یہ ہے طریق کیونکہ کم از کم نزولِ قرآن تک تو کسی انسان نے وہ بات نہیں کہی تھی۔ اور نزولِ قرآن کریم کے زمانے میں بھی جہالت کی تاریکیاں بڑی دبیز تھیں اور ساری دنیا میں نہیں تو عرب میں تو آپ پوچھو ہی نہیں' یعنی علمِ سائنس دور دور تک نہیں تھا۔ ابھی میں نے کہا ہے کہ عیسائی بھی زمین کے متعلق یہ مانتے تھے۔ عرب تو ان سب سے پیچھے تھا۔ عرب کے اندر ایک اَن پڑھ شخص (Unlettered) اُٹھ کر یہ کہتا ہے۔ عجیب چیز ہے جو قرآن حکیم نے کہی ہے کہ دعویٰ نبوت سے پیشتر یہ تو امی تھا یعنی لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا' عرب میں پیدا ہوتا ہے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے کے زمانے میں پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ بات کہتا ہے کہ زمین گول ہے گردش کرتی ہے' یہ ستارے دوسرے بڑے بڑے کُرّے ہیں' ان کُرّوں میں بھی آبادیاں ہو سکتی ہیں۔ وہ ایک اَن پڑھ شخص [1] عرب کا رہنے والا چودہ سو سال پہلے یہ بات کہتا ہے۔ اُس دور کا اور اُس دور سے لے کر آج تک کے انسان سارے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دیکھیے یہ کیا کہتا ہے۔ اور اِس دور میں آ کر جب اس حقیقت سے یہ پردہ اٹھا تو اُس کے پیچھے سے جو بات ابھر کر سامنے آئی وہ قرآن حمید کے اس دعوے کی تصدیق کر رہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قرآن حمید کے ثابت کرنے کا یہ ہے طریقہ کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ اب قرآن حمید کا چیلنج ہے۔ یہ ایک بات میں نے قرآن حمید کی کہی ہے' قرآن حمید اس قسم کے دعووں سے بھرا پڑا ہے۔ وہ دعاوی ہیں اور آج کی سائنس ان کی تصدیق کر رہی ہے۔

ہمارے ہاں قرآنِ حکیم تو صرف ثواب حاصل کرنے کے لیے ہے' ہم نے تو کوئی سائنسی تحقیق نہیں کی

جیسا میں نے عرض کیا تھا ہم تو ان الفاظ کو دہرا لیتے ہیں تا کہ اُن سے ثواب ہو' ہمارا تو اس کی تحقیق سے زیادہ تعلق ہی نہیں ہے۔ وہ جو اس سے کچھ سمجھتے بھی ہیں تو وہ اتنی بات ہے کہ قرآن حکیم نے یہ کہا لیکن ہم اسے ثابت نہیں کر سکتے۔ وہ ثابت تو سائنسدان کرے گا جو تحقیق کے بعد ان حقائق کے اوپر سے پردہ اٹھائے گا۔ تو جو پردہ اٹھے گا اُس کے پیچھے سے جو حقیقت نمودار ہوگی' قرآن حکیم کہتا ہے کہ وہ میرے

---

[1] آپ حضورؐ ''نزولِ قرآن سے پہلے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے لیکن نزولِ قرآن کے بعد یہ کیفیت نہیں رہی تھی''۔ نبوت کے بعد آپؐ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ حوالہ کے لیے دیکھیے پرویزؒ: لغات القرآن' جلد اول' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1960' ص۔262۔

کسی نہ کسی دعوے کا ثبوت ہوگی۔ کیا قرآن حکیم میں اور سائنس کے انکشافات میں Conflict (ٹکراؤ) ہوگا؟ نہیں، وہ تو اپنے دعوے کی صداقت کے ثبوت میں اس چیز کو پیش کرتا ہے۔

ہم مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ ہر قرآنی دعویٰ کو علمی حیثیت سے ثابت کریں مگر ہم مرتد ہونے کا فتوی صادر کرتے ہیں

عزیزانِ من! اب ہم جو اس دعوے کو لے کر اٹھیں تو علمِ سائنس کی رو سے حقائق پر پڑے ہوئے ان پردوں کو ہٹائیں۔ وہ حقائق قرآن حمید کے کسی نہ کسی دعوے کا ثبوت بنیں گے۔ بہرحال اب ہم اپنے آپ کو مسلمان ہی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حمید خدا کی کتاب ہے، اس کا ذریعہ اور طریقہ یہ ہوگا کہ اس نے جتنے دعاوی ایسے کیے ہوئے ہیں جن کو ابھی دنیا نہیں مانتی، ہم پوری کی پوری تحقیق کے بعد علمی حیثیت سے اس کائنات کے اندر جتنے حقائق ہیں وہ ثابت کریں کہ جو قرآن حکیم کا دعویٰ ہیں وہ ان کے مطابق ہیں۔ یہ طریقہ ہوگا قرآن حکیم کے دعاوی کی صداقت کو ثابت کرنے کا۔ سارے عالمِ اسلام میں کہتے ہیں کہ اب خدا کے فضل و کرم سے ایک ارب [1] تک ان کی آبادی بڑھ گئی ہے۔ ذرا نگاہ دوڑا کر دیکھیے تو سہی، ان میں کہیں بھی ایسا مقام، کوئی بھی ایسا فرد ہے جس نے قرآن حکیم کے ان دعاوی کی صداقت کا ثبوت سائنس کے انکشافات کے ذریعے سے کیا ہو۔ ہم تو خود عیسائیوں کی طرح ہیں جنہوں نے گلیلیو وغیرہ کو بھی موت کا فتویٰ دیا تھا۔ جو بھی عقل کی بات کرتا ہے، جو بھی فطرت کی بات کرتا ہے، جو بھی کائنات کے حقائق کی بات کرتا ہے، اُس کے خلاف مرتد ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک سب سے بڑا المیہ ہے۔

سر سید احمد خاںؒ نیچری ہونے کی بنا پر مرتد قرار پائے

سر سیدؒ (احمد خاں) (1817-1898ء) نے یہ کہہ دیا کہ بھئی! یورپ کی قومیں اس لیے آگے بڑھ گئی ہیں اور غالب آ گئی ہیں کہ انہوں نے فطرت کے قوانین کو سمجھا اور ان کی قوتوں کو مسخر کیا۔ قرآن مجید یہ بار بار کہتا ہے کہ مومن کا شعار کائنات کی قوتیں مسخر کرنا ہے۔ سر سید احمد خاںؒ (1817-1898ء) نے بھی یہ کہہ دیا۔ اُس نے فطرت کی جگہ وہاں کا لفظ Nature لیا کہ Nature کی جو قوتیں ہیں ان کو مسخر کرنا ہے۔ قرآن مجید اس کا حکم دیتا ہے، مومن کا یہ شعار ہے۔ مولوی صاحبان نے کہا کہ یہ نیچری ہے۔ ایک نئے فرقے کا اضافہ ہوا

---

[1] یاد رہے یہ بات مئی 1981ء کی 22 تاریخ کو کہی گئی تھی۔ آج کل مسلمانوں کی تعداد تقریباً ایک بلین سے تجاوز کر گئی ہے اور 56 کی تعداد مسلمان ممالک کی ہے (خواجہ ازہر عباس: نفاذِ شریعت کے بارے میں چند غلط فہمیاں، صوت الحق (4:13)، ماہ اپریل 2008ء، ص ص 19 تا 24)۔

اور کفر کا فتویٰ لگا۔ وہ تو انگریز کا زمانہ تھا ورنہ کفر کے فتوے میں تو مسلمان مرتد ہو جاتا ہے اور وہ موت کی سزا ہوتی ہے۔ لیکن جو نیچری ہے وہ مشہور ہوا۔ اب اس کے بعد یہ ہوا کہ کوئی شخص جو عقل وفکر کی بات کرے' کوئی شخص جو سائنس اور علم کی بات کرے' اس کے متعلق کہا کہ یہ نیچری ہے۔ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ اس دور سے ذرا پہلے تک نیچری ایک فرقہ تھا جو مرتد تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے آپ آج تک پرویزی سنتے ہیں۔

قرآن حکیم کے سلسلہ میں عقل کی بات کرنے والا پرویز کا فرٹھہرا' خدا کی نگاہ میں ہر شے ہے' کرّوں میں آبادی ہے مگر ہم نے عملاً کوئی تحقیق نہیں کی

عزیزانِ من! کوئی شخص عقل وفکر کی بات کرے' کسی سے دلیل مانگے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ پرویزی ہے۔ کیوں پرویزی ہے؟ کہ جی! عقل کی بات کرتا ہے۔ ''مومن سارے پاگل خانے اچ وسدے نیں [1]۔'' اگر آپ کے متعلق کسی کو کچھ بھی پتہ نہ ہو' آپ کوئی ایسی بات کیجیے جو عقل کے مطابق ہو تو وہ دوسرے سے کہے گا کہ پتہ ہے یہ کون ہے؟ یہ پرویزی ہے کیونکہ یہ انسان کا دماغ رکھتا ہے بھیڑ کا نہیں رکھتا۔ ہماری یہ کیفیت ہو گئی ہے۔

آیت (41:53) دیکھیے اور اس کے بعد سارا قرآن حکیم' عزیزانِ من! سامنے لائیے۔ قرآن حکیم اپنے دعاوی کی صداقت کے ثبوت میں یہ بات پیش کرتا ہے کہ کائنات کے مستور حقائق میں سے جب بھی کسی پہ پڑا ہوا پردہ اٹھے گا تو اس کے پیچھے سے جو چیز سامنے آئے گی وہ قرآن حکیم کے کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کا ثبوت بنے گی۔ تفصیل میں آگے بیان کرتا ہوں لیکن یہیں قرآن حکیم کی وہ دلیل بھی ہے۔ وہ بات یہ بتا رہا ہے کہ اس سے یہ ثابت ہو گا کہ یہ قرآن خدا کی کتاب ہے۔ کہا کہ یہ کیسے بات ہوئی؟ کہ وہ جو حقیقت ثابت ہوئی اس سے یہ نظر آیا کہ واقعی خدا کی کتاب ہے۔ کہا کہ **اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّکَ اَنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ** [2] (41:53)۔ قرآن حمید نے خدا کی صفت یہ بتائی ہے کہ ہر شے اس کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ کہا کہ جس کی نگاہوں کے سامنے ہر شے ہو' کیا کوئی چیز اس سے مستور یا پسِ پردہ رہ سکتی ہے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ آپ غور فرما رہے ہیں کہ دلیل کیسی عجیب دی جا رہی ہے۔ تم اسے نہیں مانتے تھے کہ یہ تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ تھی۔ جس کی نگاہ سے کائنات کی کوئی شے پوشیدہ نہیں ہے وہ تو وہ کچھ کہہ دے گا جو وہ کائنات کے اندر چھپی ہوئی چیز ہے۔ چھپی ہوئی

---

[1] (پھر تو) تمام مومن پاگل خانے میں بستے ہیں۔

[2] یہ اس لیے کہ یہ کتاب اُس خدا کی طرف سے ہے جو کائنات کی ہر شے پر نگران ہے۔ اس لیے اُسے خوب معلوم ہے کہ یہاں کیا ہونے والا ہے۔ لہٰذا اس کا ایسا ہمہ گیر علم ہی اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ حقیقت ثابتہ ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1124)۔

تمہاری نگاہوں سے ہے' اس کی نگاہوں سے تو چھپی ہوئی چیز نہیں ہے۔ جب یہ چیز سامنے آئے گی تو پھر پتہ چلے گا کہ قرآن مجید نے جو کہا تھا' وہ خدا نے کہا ہے کیونکہ اس کی نگاہوں سے یہ چیز چھپی ہوئی نہیں تھی۔ جب اس نے کہا کہ ان کُرّوں کے اندر آبادی ہے تو خدا نے دیکھ کر کہا تھا۔ ''یہ شہید'' ہے جس کے معنی ہیں ''کسی چیز کا سامنے موجود ہونا''۔ کہا کہ جس خدا کے سامنے یہ موجود تھا کہ ان کُرّوں میں آبادی ہے' قرآن میں جب تم نے یہ دیکھا کہ کُرّوں میں آبادی کا اس نے دعویٰ کیا تو سائنس کے انکشاف نے اسے Discover (بے نقاب) کیا کہ کُرّوں میں آبادی ہے تو یہ اس چیز کی صداقت بن گئی جس نے یہ کہا تھا کہ کُرّوں میں آبادی ہے درآں حالانکہ یہ بات ہماری نگاہوں سے پوشیدہ تھی۔ اور واقعی وہ دیکھتا تھا اور دیکھنے والا تھا تو یہ کتاب تو خدا کی ہوئی۔ کیا دلیل ہے! اگرچہ اس کائنات اور خدا کے لیے بہت بڑی تفصیل کی ضرورت ہے لیکن میں تھوڑے سے وقت میں یا زیادہ ہی وقت میں سہی اگرچہ ہمارے نزدیک تو یہ بھی کوئی شاعری ہے' نہ ہم نے کبھی وہ سائنس دیکھی' نہ اس کے Discovery (انکشاف) کے طریقے سوچے' نہ اس میں کسی قسم کی عملاً کوئی Investigation (تفتیش) کی' نہ کسی حقائق پر سے پردے اٹھائے بلکہ وہ تو جو اٹھتا ہوا پردہ ہے' اس کے خلاف بھی ہمارے ہاں فتوے لگے۔

قرآنِ حکیم سمجھنے کی بات بھی ہے اور کرنے کی بھی

ہمارے لیے' جو کچھ بھی ہم یہ کریں گے' بہرحال ایک ذہنی اور نظری سی بات ہی ہو گی لیکن قرآن حکیم کی جب یہ آیات سامنے آتی ہیں تو پہلا طریق تو اس کو سمجھنے کا ہوتا ہے۔ یہ ساری سمجھنے کی بات ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ کرنے کی بات ہے کہ قرآن حکیم ہر چیز کو سمجھا تا اس لیے ہے کہ اس کے مطابق کرو' ورنہ اگر اس کے مطابق نہ کیا جائے' محض سمجھا جائے' تو یہ قرآن حکیم کا مقصد نہیں پورا کرتا۔ سمجھا اس لیے جائے کہ اس کے مطابق کیا جائے۔ قرآنِ حکیم سمجھنے کی بات بھی ہے اور کرنے کی بھی۔

فکری دنیا کی ابتدا اڑھائی ہزار سال پہلے یونان سے ہوئی تھی اور اس کے آئمہ آج بھی فلسفے اور فکر کے امام مانے جاتے ہیں

مذاہب کی دنیا کو تو چھوڑ دیجیے۔ تاریخ میں فکری دنیا' علم کی دنیا' کی ابتدا یونان کے جو حکماء تھے' جو فلاسفر آف Greece (یونان) تھے' ان سے' آج سے قریب اڑھائی ہزار سال پہلے ہوئی۔ وہاں سے اس چیز کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ خارجی کائنات کے متعلق ان کے ہاں کا جو ابوالآباء ہے' اس کو سقراط [1] کہتے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ مطالعہ کے لائق صرف انسان ہے' یہ باہر کی کائنات نہیں ہے۔ سب سے

---

[1] سقراط (469-399B.C) کا شاگرد افلاطون (428-347B.C) تھا اور افلاطون کا ساتھی بھی اور شاگرد بھی ارسطو (384-322B.C) تھا۔ افلاطون (428-347B.C) ایک الگ مکتبِ فکر کا امام بن کر ابھرا۔

پہلا' سب سے بڑا جو فلاسفر ہے' وہ کائنات کو مطالعہ کی شے ہی قرار نہیں دیتا تھا۔ یہ فکر کی دنیا ہے جو میں پہلے لا رہا ہوں۔ اس کا شاگرد اور ایک الگ مکتبِ فکر کا امام جس کو پلیٹو کہتے ہیں جس کو افلاطون کہتے ہیں' وہ اس سے بھی آگے بڑھا۔ اُس نے کہا کہ یہ جو آپ کو محسوس کائنات نظر آ رہی ہے' یہ حقیقت میں ہے ہی نہیں۔ اصل میں کائنات تو ایک اور عالمِ امثال ہے' اس نے اسے World of Ideas کہا ہے۔ وہ محسوس کائنات اُس World of Ideas (عالمِ امثال) میں ہے اور یہ محسوس نظر آنے والی کائنات اُس کا ایک عکس اور سایہ ہے۔ بظاہر آپ یہ کہیں گے کہ یہ کس قسم کی بدھوؤں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بدھوؤں کی باتیں نہیں' یہ آج بھی فلسفے اور فکر کے امام مانے جاتے ہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ ان کے نزدیک بھی اُس دور میں کائنات کی یہی حیثیت تھی۔ مذہب کی دنیا میں آئیے تو میں نے کہا کہ عیسائیت اور یہودیت کے اندر تو یہ کچھ اس قسم کی چیز ہے۔

ہندوؤں کے ویدوں کی' نٹوں کی' اور برہما کی کہانیاں' ان کا پس منظر اور عرب کی توہم پرستی

ہندوؤں کو اپنے ہاں کا بڑا مان ہے کہ اُن کے ہاں کے جو وید ❶ ہیں' وہ کہتے ہیں کہ وہ ابدی ہیں یعنی ان کے زمانے کا تعین ہی نہیں کیا جا سکتا لیکن جو کچھ بھی ہے ان کی رو سے ہے۔ وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ ساری کائنات مایہ ہے' فریب ہے' حقیقت نہیں ہے' یہ برہما کا خواب ہے' وہ آنکھ کھولے گا تو جیسے خواب ختم ہو جاتا ہے' یہ کائنات ختم ہو جائے گی۔ ایک اُن میں سے وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ کائنات برہما کا کھیل ہے' وہ ناٹک کر رہا ہے' اسٹیج پہ ڈرامہ ہے۔ جس طرح اسٹیج کے ڈرامے میں نہ بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے' نہ قاتل قاتل ہوتا ہے' پردے کے پیچھے وہ اور ہی ہوتے ہیں' پردے کے سامنے آتے ہیں تو ایک قاتل بن جاتا ہے' ایک اُس میں سے مقتول بن جاتا ہے یا غلام بن جاتا ہے۔ یہ سارا کچھ اس قسم کا رچایا ہوا کھیل ہے۔ اور ان کے ہاں جو یہ کھلاڑی ہوتے ہیں وہ نٹ کہلاتے ہیں۔ اب تو ہمارے ہاں نہیں آتے' وہ نٹ ہوتے تھے' وہ رسے کے اوپر آ کر بانس سے یہ کچھ کیا کرتے تھے۔ اب تو آپ کے ہاں یہ چیزیں بھی قصہ پارینہ ہو گیا ہے کہ سرکس والے جیسے باہر سے آتے ہیں اور آج کل بھی آئے ہوئے ہیں تو وہ یہ کھیلیں کرتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے کھیلیں کرنے والے یہ سب کچھ مفت دکھاتے تھے اور اس کے بعد آپ سے خدا کے نام پہ لیتے تھے۔ آپ کا جی راضی ہوتا تھا

---

❶ وید کے لفظی معنی ہیں علم۔ اگرچہ آج کل عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وید چار کتابوں کا نام ہے لیکن درحقیقت وید کسی خاص کتاب کا نام نہیں۔ حوالہ کے لیے دیکھیے ڈاکٹر سر بندر ناتھ داس گپتا (پرنسپل سنسکرت کالج کلکتہ) کی مشہور کتاب A History of Indian Philosophy Vol.1' ص ص 11-12 قریب دو ہزار سال کے عرصہ میں ہندوستان کے باشندوں نے مختلف علوم وفنون سے متعلق جو کچھ جمع کیا اس کا نام ہے وید۔ اس مجموعہ کو زمانۂ اسلوب بیان اور موضوع کے اعتبار سے چار اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) سمہت (Samnita) یا گیتوں کا مجموعہ (۲) برہمن' (۳) آرنیک' (۴) اپ نشد۔ سمہت کے مجموعہ کے چار حصے ہیں اور انہی کو چار وید کہا جاتا ہے: (۱) رگوید' (۲) سام وید' (۳) اتھروید اور (۴) یجروید (ماخوذ از پرویزؒ: مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1996' ص ص۔ 78 تا 118)۔

تو کچھ دیتے تھے' نہیں تو آپ گھر کو چلے جاتے تھے۔ اب کے جو ہیں تو یہ پہلے ٹکٹ لے لیتے ہیں' پھر اندر آنے دیتے ہیں' پھر جو جی میں آئے دکھائیں۔ کیا دور ہے!! وہ ان کونٹ کہتے تھے۔ ان ہندوؤں کے ہاں برہما کونٹ راجن کہا جاتا ہے یعنی نٹوں کا راجہ' مہانٹ' Chief Actor۔ پتہ نہیں' اب اُسے ہیرو کہتے ہیں۔

میں کہہ رہا ہوں کہ فکر کی دنیا میں' مذہب کی دنیا میں' خارجی کائنات کے متعلق یہ تصورات آ رہے تھے۔ یہ بیک گراؤنڈ' یہ پس منظر دیکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ چودھویں صدی میں انسانی فکر خواہ وہ آپ کے ہاں سیکولر دنیا کے اندر تھا یا مذہب کی دنیا کے اندر تھا تو وہ کائنات کے متعلق کیا تصور دیتا تھا۔ اس پس منظر میں آگے بات آئے گی اور وہ بیچاروں عرب والوں کی تو ہم پرستی تو پوچھو نہیں' وہ تو کچھ جانتے ہی نہیں تھے۔ مکہ ان کے ہاں کا کیپٹل سٹی یعنی بڑا مرکزی مقام تھا۔ وہاں سترہ آدمی ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور حضور ﷺ تو وہ بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ جو دونوں تصور تھے یہ اُس وقت ساری دنیا میں چھائے ہوئے تھے۔

شاعری کی آنکھ میں کائنات کی حقیقت: آنکھوں دیکھی حقیقت کو افسانہ بنا دیتی ہے

عزیزانِ من! اب پھر آگے آیئے تو اسلام بھی جب دین سے مذہب میں تبدیل ہوا ہے' تو یہی تصورات آپ کے ہاں آئے۔ پھر شاعری میں جب یہ چیز آجائے تو پھر تو پوچھو نہیں وہ شاعری تو آنکھوں دیکھی حقیقت کو افسانہ بنا دیتی ہے۔ وہ جو سقراط (469-399.B.C) کا نظریہ تھا کہ Study یا مطالعہ کے قابل انسان ہے خارجی کائنات نہیں' آپ کی شاعری میں یہ چیز آئی۔ وہ شاعری تو بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ وہ (مرزا) بیدل ہے شاعری میں' جو کچھ کہتا ہے:

ستم است گر ہوس است کشد کہ بہ سیر سرو سمندر را

وہ کہتا ہے کہ یہ تو بڑا ظلم ہے' یہ خواہش تمہارے اپنے دل کا جذبہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ چلو' باغ میں جا کر پھولوں کو دیکھو' سرو کو دیکھو۔

چوڑے غنچہ کم نہ دمی دا ای دردِل کشابہ چمن؟؟

ارے تُو خود بہت بڑا باغ ہے' کم بخت کہاں جا رہا ہے باغ دیکھنے کے لیے؟ دل کا دروازہ کھول' اندر جھانک' یہ موتیہ ہے' یہ چنبیلی ہے' یہ سرو ہے۔ ''اے سارا تہاڑے اندرای ہے۔ اینوں پھل نئیں لگدے ہیگے۔ اودکان توای جاکے لینے پیندے نیں۔''[1] ہمارے ہاں کی شاعری میں تو محبوب کی یہ کیفیت ہے۔

ہاتھ آویں تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

---

[1] یہ سب کچھ تمہارے اپنے اندر ہی موجود ہے۔ اسے پھول نہیں لگتے۔ وہ تو دکان ہی سے جا کر لینے پڑتے ہیں۔

یعنی آپ کے ہاں کی یہ کیفیت میں کہہ رہا ہوں۔ یہ تصوف ہے' یہ بعد کی بات ہے۔ اور وہ جو کہا تھا کہ یہ دنیا مایہ ہے' فریب ہے' اس کے بعد (مرزا اسد اللہ خاں) غالب (1869-1797) آ گیا۔ کہا کہ

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

مسلمانوں کے ہاں مذہب کی پکار اور اس کا نتیجہ: یہ حق نہیں' باطل ہے

آپ کے ہاں وہی صدائے بازگشت چلی آ رہی ہے۔ اور آپ کا سارا مذہب کہتا ہے کہ دنیا جیل خانہ ہے' مومن پھنسا ہوا ہے' تڑپتا ہے' دنیا ایک لاش ہے' اس کے چاہنے والے کتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں شریعت ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ چھٹی صدی عیسوی میں نبی اکرم ﷺ کا جب ظہور ہوا ہے تو اس زمانے میں فکر کی دنیا میں بھی اور مذہب کی دنیا میں بھی' کائنات کے متعلق تصورات یہ تھے۔ یہ مغرب کے مستشرق دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں کیا ہے؟ پہلے مذاہب میں' پہلی کتابوں میں' ان کے ہاں جو واقعات تھے وہ ان کے ہاں بھی واقعات تھے' کہتے ہیں کہ یہ جو افسانے تھے' یہ نبی اکرم ﷺ نے یہودی اور عیسائی علماء سے سن لیے تھے اور ان کو اپنی زبان میں ڈھال لیا تھا۔ ہم ابھی اس بحث میں نہیں پڑتے کہ وہ جو افسانے یا حکایتیں کہتے ہیں' ان کی حقیقت کیا ہے۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کائنات کے متعلق چھٹی صدی عیسوی میں جب حضور ﷺ کی بعثت ہوئی اور یہ قرآن کریم نازل ہوا تو کیا یہی تصور تھا؟ ساری دنیا میں آپ بتائیے کہ یہی تصور تھا یا اس سے الگ کوئی اور تصور تھا؟ یہی تصور تھا کہ یہ کائنات باطل ہے' فریب ہے' برہما کا خواب ہے' یہ ایک رچایا ہوا کھیل ہے' اس کی حقیقت کچھ نہیں ہے' یہ حق نہیں ہے' یہ باطل ہے۔ یہ چیز تھی ساری دنیا کے اندر۔

دنیا بھر کی سوچ کو قرآنِ حکیم کا کھلا چیلنج

عزیزانِ من! اس دور میں علم و فکر اور مذاہب کی ساری دنیا کو چیلنج کرتے ہوئے قرآنِ کریم کا یہ کہنا غور طلب ہے کہ **وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا** [1] (38:27)۔ یہ ہے دلیل' عزیزانِ من! قرآن حکیم کے منجانب اللہ ہونے کی۔ اس پس منظر میں اس کو دیکھیے۔ ساری دنیا کہتی ہے کہ یہ سب فریب ہے' باطل ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ یہ فریب نہیں ہے' یہ عالمِ خیال نہیں ہے' یہ تصوراتی دنیا نہیں ہے' یہ افلاطون (428-347B.C) کی عالمِ امثال نہیں ہے۔ باطل کے یہ معنی ہیں کہ جو حقیقت میں

---

[1] قانون مکافات سے انکار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ (یہ سمجھ لیا جائے کہ) ہم نے اس کائنات کو یونہی بیکار پیدا کر دیا ہے' حالانکہ یہ سلسلہ کائنات' مکافاتِ عمل کے لیے وجود میں لایا گیا ہے (10:4;11:7;45:22;53:31)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1057)۔

Exist (قیام) نہ کرتی ہو اور ویسے ہی تصوراتی طور پر جس کو مان لیا ہو کہ یہ کچھ ہے۔ فریب بھی اس میں آ جاتا ہے۔ اُس دور میں جب ساری دنیا یہ کہہ رہی تھی' جسے قرآن حکیم نے یہ کہا ہے کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ (30:41) خشکی اور تری دونوں میں یہ جتنے غلط تصورات و توہمات تھے' وہ چھائے ہوئے تھے' اُس میں یہ کہنا کہ اس کائنات کو ہم نے باطل پیدا نہیں کیا ہے' یہ حقیقت میں Exist (قیام) کرتی ہے اور اس کے دوسرے معنی ہوتے ہیں کہ کسی مقصد کے لیے پیدا ہوا ہو۔ اگلا ٹکڑا ہے کہ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (38:27) ۔ لیجیے کفر اور ایمان یہاں آ گیا۔ یہاں ظن کیا ہے؟ قرآن حکیم کے الفاظ ہیں کہ جو ایسا کہتے ہیں کہ یہ کائنات فریب ہے' یہ خیال ہے' یہ محض تصوراتی چیز ہے' یہ علم پر بات نہیں ہے' یہ صرف اُن کا قیاس ہے' ظن ہے۔ عزیزانِ من! یہ نہ بھولیے گا میں یہ بار بار یاد دلاؤں گا کہ یہ چھٹی صدی عیسوی میں بات ہو رہی ہے۔ ساری دنیا کے اہلِ مذاہب اور اہلِ فکر سے دعویٰ کر دیجیے کہ ان کے ہاں کسی لٹریچر میں' کہیں بھی یہ بات آئی ہوئی ہے کہ یہ کائنات فریب خیال تصور نہیں ہے بلکہ یہ حقیقت میں Exist (قیام) کرتی ہے' کہیں بھی یہ لکھا ہوا دکھا دو۔ قرآن کریم تو کہتا ہے کہ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (38:27) یہ انکار کرنے والوں کا ظن ہے۔ مذہب والے اس کو کہتے تھے کہ یہ چیز خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہے' فکر والے کہتے تھے کہ علم کی بنیاد ہی اس تصور کے اوپر ہے اور قرآن حکیم کہتا ہے کہ یہ سارا ہی ظن ہے یا قیاس ہے اور یہ کفر ہے۔ آپ نے سوچا کہ کفر اور ایمان کے ڈھانڈے کہاں جا کر ملتے ہیں۔ جو یہ کہتا ہے کہ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے' یہ کفر ہے۔ اور یہ چیزیں کہ یہ دنیا ناپاک ہے' یہ کتوں کی لاش ہے' یہ سارا کچھ کفر ہے۔ یہ ہے ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا[1] (38:27)۔

کائنات کے متعلق قرآن حکیم کا دیا ہوا یہ تصور کہ کائنات بالحق تخلیق کی گئی ہے ہمارے ایمان کا حصہ ہے اور اس میں قوت پوشیدہ ہے

ہمیں' عزیزانِ من! پتہ ہی نہیں کہ قرآن حکیم ایمان کس کو کہتا ہے اور کفر کس کو کہتا ہے۔ یہ ماننا بھی ایمان کا حصہ ہے کہ کائنات بالحق تخلیق کی گئی ہے۔ ایسا نہ ماننا کفر ہے۔ اور اسے ثابت کون کرے گا کہ یہ بالحق Exist (قیام) کرتی ہے؟ یہ سائنٹسٹ ثابت کرے گا۔ جو ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (38:27) اس کو محض قیاسی اور پرفریب اور تخیلاتی ثابت کرتے ہیں تو پھر تو سوال ہی نہیں کہ وہ اس کی قوتوں کو مسخر کریں یعنی Forces of Nature (فطرت کی قوتوں) کو مسخر کریں۔ اور پھر اس کے بعد ان کو اپنے مصرف میں لائیں' پھر ایک ذرے میں اتنی قوت پوشیدہ بتائیں کہ آج اُس ذرہ ناچیز سے سپر پاورز اپنے اپنے گھر میں بیٹھی کانپ رہی[2] ہیں۔ یہ ساری بڑی بڑی پاورز اس سے کانپ رہی ہیں کہ اگر اُس نے اس قسم کے ذرے کا میزائل چلا دیا تو سارا کُرّہ بھک سے اڑ جائے گا۔

---

1. ایسا وہی خیال کرتے ہیں جو ہمارے قوانین کی صداقت سے انکار کرتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص:1057)۔
2. یاد رہے کہ یہ بات مئی 1981ء کی 22 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

کائنات کو بالحق نہ ماننے کا حشر تباہی اور ذلت کے سوا کچھ نہیں ہے: تاریخ کا یہی فیصلہ ہے

کہا کہ ان کے مقابلے میں جو یہ سمجھے ہوئے ہونگے کہ یہ تو عالمِ خیال ہی ہے اور حقیقت میں کچھ Exist (قیام) ہی نہیں کرتا تو **فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ** (38:27) ان کی تمام سعی و کاوش، جتنی بھی ہے، وہ ساری جھلس کر رہ جائے گی، کوئی کوشش بار آور نہیں ہوگی اگر انہوں نے کائنات کو بالحق نہیں مانا۔ تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب، جنہوں نے کائنات کے متعلق یہ تصور رکھا کہ یہ باطل ہے، یہ فریب ہے، فریبِ نگاہ ہے، تخیل ہے، تصور ہے، یا مذہب کی دنیا کے اندر یہ بات کہ یہ مایہ ہے، تو تاریخ بتاتی ہے کہ جن مذاہب نے، جن قوموں نے یہ تصور رکھا وہ ہمیشہ ذلیل و خوار رہیں اور محکوم رہیں۔ اس لیے کہ قومیں جو کائناتی قوتوں کو مسخر کر کے ان کے ذریعے قوت حاصل کریں، وہ ہیں جو دنیا کو Conquer (فتح) کریں گی، وہ ہیں جو دنیا میں کامیاب اور فاتح ہونگی۔ آج بھی یہ تاریخ یہی بتا رہی ہے۔

سائنس کے میدان میں آج کے ہندوستان کا اعلیٰ مقام اور اُدھر بدھ مت کی حالت، اور ملتِ اسلامیہ کی کیفیت: تباہی اور بربادی

کل تک آپ کے ہاں یہ جو آپ کا ہندوستان تھا، اُن کے ہاں مذہب اور وہ جس کو ہمارے ہاں قدامت پرستی کہتے ہیں، جس کا نام Fundamentalism (بنیاد پرستی) رکھا گیا ہے، وہ مذہب ساری دنیا میں سب سے پیچھے تھا۔ آج بھی انہوں نے اپنے ہاں سیکولرازم رائج کیا ہے تو سائنٹسٹ پیدا کرنے شروع کیے ہیں۔ اس وقت بھی ادھر کی ہماری دنیا ہے، اُس میں ہندوستان سائنس میں سب سے آگے ہے۔ اُن کے ہاں بھی بدھ مت اسی پرانے فریب میں ہے کہ یہ کائنات Exist (قیام) ہی نہیں کرتی۔ ان کے ہاں زندگی کا مقصود فنائے خویش ہے "مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے۔" یہ ہے اُن کے ہاں تصور۔ یہ اُن سے بھی پیچھے ہیں۔ مسلمانوں کے متعلق تو ہم کہہ ہی نہیں سکتے کہ یہ ہیں کیا اور ہیں کہاں۔ ایک ارب [1] بحرِ مواج ہے، مراکو سے لے انڈونیشیا تک متلاطم سمندر کی طرح۔ ایک اتنا بڑا ابیلٹ مسلسل ان کا چلا جاتا ہے۔ سونا پٹرول کی شکل کے اندر، پانی کی شکل میں، ان کے ہاں ابلتا ہے۔ ساری دنیا کو یہ Govern (گورن) کر سکتے ہیں۔ اور یہ ہیں کہ یہ ساری دنیا سے ڈر رہے ہیں۔ یہی ہے **فویل للذین کفروا من النار** (38:27)۔ اس نظریہ کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی اس پیش کردہ تعلیم کے آئینہ میں ملت اسلامیہ کے افسردہ چہرے کی عکاسی

قرآن حکیم نے ساری بات کہہ دی۔ یہاں کہا کہ **وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا** (38:27) ہم نے اس کو

---

[1] یاد رہے یہ بات مئی 1981ء کی 22 تاریخ کو کہی گئی تھی۔ آج یہ ایک بلین سے کہیں زیادہ ہے۔

باطل پیدا نہیں کیا۔ اُس کے برعکس خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ (29:44)۔ کیا بات ہے' کس دھڑلے سے چھٹی صدی عیسوی میں کہہ رہا ہے کہ ہم نے اس سلسلہ کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ اس بِالْحَقِّ کا ترجمہ Reality (حقیقت) ہوتا ہے' فی الواقع موجود ہوتا ہے' مقصد کے لیے پیدا کی گئی چیز کے لیے یہ لفظ بالحق آتا ہے۔ یہ حق بڑا جامع لفظ ہے۔ کہا کہ ہم نے اس کائنات کو بالحق پیدا کیا۔ اگلا ٹکڑا ہے جس پہ ہمیں کانوں میں روئی ٹھونس لینا چاہیے۔ کہا کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (29:44) جو بات ہم نے کہی ہے' جو مومن ہیں' وہ اسے پہچانیں گے کہ یہ کس بات کی نشانی ہے جو قرآن حکیم نے کہہ دیا ہے۔ یہ مومنین کے لیے ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا! قرآن حکیم کی اس Definition (تعریف) کے مطابق ایک ارب آبادی کے اندر کتنے مومن نکلتے ہیں۔ اِدھر توجہ کی کہ چھٹی صدی عیسوی میں ہندوؤں کا جو مذہب یا فلسفہ تھا' تو یہ بھی کافی محیط تھا' یہ دور تک جاتا تھا۔ اِدھر توجہ کرنے کے بعد کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ❶ (21:16,44:38)۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک نٹ راجہ ہے' برہما ہے' یہ اس کا کھیل ہے' تماشہ ہے۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ ہم کھیل اور تماشے نہیں کیا کرتے۔ خدا تماشے نہیں کرتا۔ خدا جو کچھ پیدا کرتا ہے وہ کھیل کے طور پہ پیدا نہیں کیا کرتا۔ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (44:39) یہ Reality (حقیقت) میں ہم نے پیدا کیا ہے' حق کے ساتھ پیدا کیا ہے' تماشہ نہیں ہے' ناٹک نہیں ہے' افسانہ نہیں ہے' ڈرامہ نہیں ہے مگر وَلٰکِنَّ اَکْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ❷ (44:39)۔ جو ایسا کہتے ہیں وہ علم کی بنا پہ نہیں کہتے۔ اور ہم جو کہتے ہیں وہ علم کی بنا پہ کہتے ہیں۔

اس بلند مقصد کے حصول کے لیے قرآن حکیم کی پیش کردہ آیات بطور راہنمائی ہیں

اب اس جماعت کی طرف آیئے جسے قرآن حکیم نے کہا ہے کہ وہ کونسے ہیں جو ہمارے معیار پہ پورے اترتے ہیں۔ مومنین کو تو آپ نے دیکھ لیا جو قرآن حکیم نے کہا ہے کہ مومنین کے لیے اس بات کی حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانیاں ہیں۔ ان کے متعلق کہا کہ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (3:190) اس خارجی کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں' رات اور دن کے اختلافِ گردش میں' ایک کے بعد دوسرا آتا ہے' یہ یونہی نہیں یہ کچھ ہو رہا۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت تک پہنچنے کی علامات اور نشانیاں ہیں۔ قرآن حکیم نے ان تمام چیزوں کو آیت یا آیات کہا ہے اور عربی زبان میں آیت کسی چیز تک

---

❶ (وہ سمجھتے تھے کہ) ہم نے اس کارگہہ کائنات کو محض کھیل تماشے کے طور پر پیدا کر رکھا ہے! (بالکل نہیں! اسے ہم نے تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ اس کا ایک عظیم مقصد ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ کسی کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہ رہنے پائے۔ افراد ہوں یا اقوام' سب کے اعمال صحیح صحیح نتیجہ مرتب کر کے رہیں 11:7;45:22;53:31۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 730)۔

❷ لیکن ان میں سے اکثر لوگ اسے نہیں جانتے (اور سمجھتے ہیں کہ زندگی محض کھیل تماشا ہے جو موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1161)۔

پہنچنے کی نشانی ہوتی ہے۔ صحرا میں دور سے دھواں نظر آئے تو اس سے یہ نشانی ملتی ہے کہ نیچے آگ ہے تو دھواں آگ کی آیت کہلاتا ہے۔ صحرا میں کسی پرندے کا اڑتے ہوئے پھرنا یہ بتاتا ہے کہ کہیں گردونواح میں' قرب و جوار میں' پانی ہے کیونکہ ہمارے سامنے زندگی ہے۔ یہ عربی زبان میں پانی کی آیت کہلاتی ہے۔

آیات صاحبانِ عقل وفکر کے لیے ہیں' الباب ہیں جو قوانینِ خداوندی کو ہر وقت اپنے سامنے رکھتے ہیں

کہا کہ یہ اختلافِ لیل ونہار اور پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق میں آیات ہیں۔ یہ کن کے لیے آیات ہیں؟ **لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ** (3:190) صاحبانِ عقل وفکر کے لیے ہیں۔ یہ عقل سے بھی اگلا درجہ ہے جس کو لبِ لباب کہتے ہیں' جس کو الباب کہتے ہیں۔ عقل نچوڑ اور ارتکاز (Concentrated) شکل کے اندر بھی عقلِ انسانی ہے تو اس کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ کہا ہے الذین یہ کون لوگ ہیں؟ اب یہاں کہا ہے کہ صاحبانِ عقل وبصیرت ہیں یہ لوگ جوان میں بہت بڑی بڑی نشانیاں دیکھتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ کہا کہ **یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ** (3:191) وہ اٹھتے بیٹھتے لیٹتے ہر وقت اپنے سامنے قوانینِ خداوندی کو رکھتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں لفظ ذکر کا مفہوم اور مومن کی تعریف

آپ غور فرما رہے ہیں۔ ہر وقت کہا ہے۔ میں دوسری طرف نکل جاؤں گا لیکن یہ ذکر سے یذکرون ہے کہ ذکر کرتے رہتے ہیں۔ اور ذکر پھر آپ کو معلوم ہے جو محلے والوں کو رات کو سونے نہیں دیتا۔ پھر وہ بیٹھے بھی کرتے ہیں' پھر وہ کھڑے ہو جاتے ہیں سلام کے لیے۔ اس پہ بڑی بحثیں ہوتی ہیں کہ کھڑے ہونا چاہیے یا نہیں ہونا چاہیے۔ لیٹے بھی تسبیح ہاتھ میں ہوتی ہے۔ تو یہ تو ہو گیا کہ یہ ذکر کر رہے ہیں۔ اُن کے لیے اس کائنات کے اندر نشانیاں ہیں۔ یہاں ہے **یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ** (3:191)۔ ذکر کے معنی ہوتا ہے کہ ''کسی شے کو ہر وقت اپنے سامنے رکھنا۔'' وہ ان چیزوں کو سامنے رکھتے ہیں اور آگے تو اُس نے ذکر کے معنی واضح کر دیا ہے۔ کہ **وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** (3:191) سامنے رکھتے ہیں اور تخلیقِ ارض وسما میں ہر وقت غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔ دیکھتے ہیں ذکر کے کیا معنی آ گئے! یہ ہیں وہ لوگ جو غور وفکر کرتے رہتے ہیں اور اُس کے بعد اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ **رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا** (3:191) اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تُو نے جو کہا تھا کہ ہم نے اسے باطل نہیں پیدا کیا' ہم نے خود تحقیق کر کے دیکھ لیا ہے کہ واقعی یہ کائنات باطل نہیں پیدا کی گئی۔ دیکھا مومن کون ہیں!

لفظ سبحان اللہ کا قرآنی مفہوم: خوشحالیاں آئیں گی

کہا ہے کہ **رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا**[1] (3:191) یہ کہنے کے فوراً بعد کہا کہ **سُبۡحٰنَکَ** (3:191) تیری ذات تو

---

[1] اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تُو نے اس کارگہ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لیے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 171)۔

اس سے بڑی بلند ہے کہ کوئی اتنی بڑی تخلیق' بلامقصد' بلامعنی' فریبِ تخیل کے طور پہ پیدا کرے' تیرا خواب ہو' یہ یونہی کھلاڑی کی طرح ہو۔ سُبۡحٰنَکَ کیا عجیب لفظ ہے! ہمارے ہاں تو وہ سبحان اللہ کے معنی ہی کچھ نہیں سمجھ آتے کہ کیا ہوتے ہیں۔ سبحان کے معنی ہوتا ہے''بہت دور ہونا ان تصورات سے جو لوگوں نے تخلیقِ ارض وسما کے ضمن میں تمہارے متعلق پیدا کیے ہیں''۔ کہا کہ تُو اس قسم کے تصورات سے بہت دور ہے۔ ایک لفظ سبحان میں بات کہدی۔ اور اُس کے بعد یہ کہ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ کائنات کی ان قوتوں کو ہم پہلے تحقیق کے ذریعے معلوم کریں' پھر ان کو مسخر کریں اور اس کے بعد یہ صورت ہوگی کہ جب کائناتی قوتیں مسخر ہونگی تو پھر ہمیں صحیح معنی میں خوشحالیاں آئیں گی۔

ہم نے تو ''النار'' کا لفظ قیامت تک کے لیے اٹھا رکھا ہے تو اب ہمارا کوئی ہمدم نہیں اور ہم النار میں ہیں

یہ تمام کچھ کہنے کے بعد کہا کہ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (3:191) کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ ہم غلط راستے پہ پڑ جائیں اور ہماری سعی و عمل کی ساری کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں۔ اس لیے اب یہ ''النار'' آ گیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ قیامت کے جہنم کی بات ہے کہ ہمیں جہنم سے بچائیو۔ یعنی یہاں یہ کائنات کے اندر' ساری چیزوں کے اندر' غور و فکر کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہمیں جہنم سے بچائیو۔ میں نے کہا ہے کہ قرآن حمید اپنے معانی آپ واضح کر دیتا ہے' دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ النار میں یہ کون قومیں ہوتی ہیں جن سے کہا گیا ہے کہ دیکھیے ہماری آرزو یہ ہے کہ ہم ان النار میں رہنے والی جہنمی قوموں کے اندر نہ ہو جائیں۔ وہ کون ہیں؟ کہا کہ رَبَّنَآ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَہٗ (3:192) ہمارے نشو و نما دینے والے! النار کے اندر وہ قومیں ہیں جو اس دنیا کے اندر ذلیل و خوار ہوتی ہیں۔ یہ جہنم ہے۔ اور پھر کہا کہ وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ (3:192) یہی قومیں ہیں جو حقیقت میں ظالم ہوتی ہیں، اپنے آپ پہ ظلم کرتی ہیں۔ اور تو اور ان کا کوئی حامی و مددگار بھی نہیں۔ قرآن حمید نے کہا کہ جو دنیا میں ذلیل و خوار ہوتا ہے تو کوئی اس کو اپنا دوست نہیں بناتا' اُس کو Exploit (استحصال) تو سارے کرتے ہیں' اُن کا انصار کوئی نہیں ہوتا۔ یعنی اس کے اندر قرآن حمید کتنی بڑی سیاسی چیز حل کر گیا ہے کہ جو قوم دوسروں کی نگاہوں میں ذلیل ہے۔ یاد رکھو! کوئی لاکھ دوسرا کہے وہ کبھی تمہارا ہمدم اور دوست نہیں ہو سکتا۔ تم اس کے محتاج ہو گے اور وہ تمہیں Expliot (استحصال) کرے گا۔ جو بظاہر تمہارے فائدے کے لیے نظر آ رہا ہو گا وہ اُس کے اپنے فائدے کی چیز ہو گی۔ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (45:3) پھر وہی بات کہی کہ ''ارض و سماوات کے اندر مومنین کے لیے بڑی بڑی نشانیاں ہیں''۔ قرآن حمید نے یہاں مومنین کہا ہے۔

علیٰ وجہ بصیرت کسی چیز کو قبول کرنے کا نام ایمان ہے اور یہ ہیں یوقنون

ایمان ہوتا ہے کسی چیز کو ماننا' یہ اس کو دیکھنے کے بعد علیٰ وجہ البصیرت یقین ہوتا ہے' ایک Certainty (قطعیّت) کے اوپر پہنچنا ہوتا ہے،

یو قنون کے اوپر پہنچنا ہوتا ہے۔ کہا کہ وَفِیْ خَلْقِکُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (45:4) تمہاری خود اپنی تخلیق میں یہ جتنے بھی کرہ ارض کے اوپر جاندار پھرتے ہیں ان کی تخلیق میں' ان لوگوں کے لیے جو یقین تک پہنچنا چاہتے ہیں' نشانیاں ہیں۔ ایمان کے علم کے یقین تک یہ لوگ پہنچ سکتے ہیں۔ یہ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (45:4) ہے یعنی صرف انہی کے لیے جو اس کے قوانین پر یقین رکھتے ہیں۔

ہمارے ہاں مقامِ مومن سے بھی بلند درجہ متقی کا ہوتا ہے تو متقی کون؟

پہلی چیز جو ہم نے دیکھی تھی تو وہ مومنین کے لیے کہا تھا مگر ہمارے ہاں' مومن سے بھی زیادہ جو متقی کا لفظ ہے وہ اگلا درجہ ہوتا ہے یعنی متقی کے لیے۔ کہا کہ اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ (10:6) ارض و سما کی تخلیق میں' اختلافِ لیل ونہار میں' جو کچھ خدا نے اس میں پیدا کیا ہے' متقیوں کے لیے نشانیاں اور علامات ہیں۔ اب پتہ چلا کہ متقی کس کو کہتے ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہے کہ متقی یعنی پرہیز گار کسے کہتے ہیں۔ اگر کوئی محلے میں ہے تو اس کا تصور ذہن میں لے آیئے: کبڑا ہو کے چلے' لٹھ ہاتھ میں ہو' سر پہ عمامہ باندھا ہوا ہو' اور اس سے چلا بھی نہ جائے اور بولا بھی نہ جائے' نمازیں پڑھے' تہجد تک پڑھے' وظیفہ کرے' ذکر کرے تو ہمارے ہاں تو یہ متقی یعنی پرہیز گار ہوتا ہے مگر یہاں قرآن مجید کہتا ہے کہ لِقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ (10:6) تو یہ وہ نہیں ہو سکتے۔ یہ کوئی اور ہیں۔

قرآن حکیم کے نزدیک علما کون ہیں؟ یہ سائنسدان ہیں اور اس بارے میں ہمارے ایک دوست کا شگوفہ اور ایک مثال

اب آیئے' عزیزانِ من! ان سب سے آگے کے درجہ میں ہمارے ہاں علما کرام ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے آپ یہ لفظ سنتے ہیں۔ دیکھیے کہ قرآن حکیم میں علما کا لفظ کہاں آیا ہے اور کن لوگوں کے لیے آیا ہے؟ اِس سے پوچھنا چاہیے۔ لیکن یہ اسی لیے تو قرآن حکیم کو آگے آنے نہیں دیتے کہ حبشی کو اس آئینے میں اپنا بہت بگڑا ہوا چہرہ نظر آتا ہے' وہ شیشے کو ہی چھوڑ دیتا ہے۔ انہوں نے قرآن حکیم کے شیشے کو توڑ دیا ہوا ہے کہ چہرہ ہی نظر نہ آئے۔ سنیئے' عزیزانِ من! بڑی اہم آیت ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِہٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُھَا (35:27)۔ کیا تم نے اس پر کبھی غور نہیں کیا؟ ''تر'' لفظ آتا ہے جو چیزیں سامنے دیکھی جائیں۔ کہا کہ کیا ان چیزوں پہ تم نے غور وفکر نہیں کیا' مشاہدہ نہیں کیا' مطالعہ نہیں کیا' ان پر Experiments (تجربے) نہیں کیے۔ یہ سب چیز اس ایک لفظ ''تر'' کے اندر آ جاتی ہے کہ خدا نے بادلوں سے کس طرح سے بارش برسائی۔ کبھی اس کے اوپر غور کیا ہے کہ یہ قانون کیا ہے جس کی رو سے بادلوں سے بارش ہوتی ہے۔ پھر اُسی پانی سے ایک ہی زمین سے مختلف قسم کے رنگا رنگ کے پھولوں والے' انواع و اقسام کے پھلوں

والے اس میں سے پودے پیدا کر دیئے۔ کبھی اس پہ تم نے غور نہیں کیا۔ یہ علم کیا ہے؟ غالباً اس کو باٹنی کہتے ہیں۔ یہ علم حصہ نباتات سے متعلق ہے۔ وہ بارشوں والا جو حصہ ہے وہ تو ہے ہی دوسرا، پتہ نہیں وہ علم الافلاک میں آتا ہے یا کسی دوسرے میں آتا ہے۔ پہلی چیز تو یہ آئی۔ بارشوں کے برسنے کے اندر جو قاعدہ مقرر ہے، پانی سے جو پودے پیدا ہوتے ہیں، ان میں پھول لگتے ہیں، ان میں پھل لگتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مختلف قسم کے کیوں لگتے ہیں۔

قرآن حکیم نے کہا کہ **وَ مِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِیۡضٌ وَّ حُمۡرٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہَا** (35:27)۔قرآن حکیم یہ ایک ایسی چیز سامنے لایا ہے جس کی طرف عام طور پر نگاہ ہی نہیں جاتی۔ کہا کہ یہ پہاڑ تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔ تو ٹھیک ہیں پہاڑ ہیں۔ تم یہی کہو گے کہ بہت اونچا ہے، کسی کے متعلق کہو گے کہ بڑا اختشک ہے۔ کہنے لگا: نہیں، ان کے علاوہ دیکھنے کی اور بھی چیز ہے۔ اور یہ ہمارے ہاں سائنس کی نئی چیز پہاڑوں کے متعلق علم، چٹانوں کے متعلق علم، پتھروں کے متعلق علم ہے۔ یہ سائنٹسٹ آج بتا رہے ہیں کہ پہاڑوں میں اور پتھروں میں مختلف رنگوں کی Layers (تہیں) ہوتی ہیں: کوئی سفید، کوئی سرخ، کوئی سیاہ۔ ہم آپ تو صرف یہی دیکھتے ہیں کہ وہ کالا سا پتھر ہے، یہ سفید ہے، یہ سنگِ مرمر ہے۔ ان سائنسدانوں سے جتنے بھی یہ ہیں، پوچھیے، وہ ایک ایک Layer (تہہ) سے اس کی پوری تاریخ بیان کرتے ہیں۔ اُس کے اوپر یہ چیز دیکھنے کے لیے ریسرچ اسکالرز کی جماعتوں کی جماعتیں لگی ہوئی ہیں۔ پہاڑوں کے اندر جو مختلف رنگوں کی Layers (تہیں) نظر آتی ہیں آپ کو۔ کہا کہ ان پہاڑوں کے اوپر تم نے کبھی غور کر کے دیکھا ہے کہ ان میں جو مختلف رنگوں کی Layers (تہیں) ہوتی ہیں، ان کے اندر کتنے کتنے بڑے حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہ بھی کبھی تم نے دیکھا ہے؟ **وَ غَرَابِیۡبُ سُوۡدٌ** (35:27) یعنی کالے رنگ کے بھی وہ ہوتے ہیں۔ **وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الۡاَنۡعَامِ مُخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہٗ کَذٰلِکَ** (35:28) خود انسانوں کی دنیا میں تم نے کبھی غور کیا ہے کہ مختلف نوع کے انسان، مختلف نسل کے، مختلف رنگ کے، مختلف زبانوں کے ہوتے ہیں۔ اور یہ کرہ ارض کے اوپر جتنی بھی جاندار مخلوق ہے، کبھی ان پہ بھی تم نے ریسرچ کی ہے۔ تم نے نہیں کی ہے۔ کہا کہ یاد رکھو! ان چیزوں کے اوپر ریسرچ کرنے والے غور و فکر کرنے والے وہ لوگ ہیں جو **اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا** (35:28)۔ یہاں علما کا لفظ آیا۔ یہ علما وہ ہیں جو ان حقائق کی ریسرچ کے بعد جس نتیجے پہ پہنچتے ہیں، اس سے خدا کی عظمت اور کبریائی کا تصور کر کے کانپ اٹھتے ہیں، وہ لوگ جو علما ہیں۔ یہاں یہ لفظ آیا۔ کس چیز سے یہ کانپ اٹھتے ہیں؟ یہ دیکھ کر کہ **اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ غَفُوۡرٌ** (35:28) خدا کتنی قوتوں کا مالک ہے اور پھر اُس نے ان کی حفاظت کا کیا سامان کر رکھا ہے! یہ دونوں چیزیں یہ لوگ، یہ جو علما ہیں، دیکھتے ہیں۔ علما کا لفظ یہاں آیا ہے۔ آپ غور کیجیے۔ یہ مذاق کی بات ہے کہ ہمارے ایک دوست نے کہی کہ یہ علما ہے، علمائے کرام نہیں آیا ہے۔ میں نے کہا

ٹھیک ہے۔ کہنے لگے: تمھیں پتہ ہے کہ کرام کیا ہے۔ میں نے کہا: نہیں۔ کہنے لگے: ''کرم دی جمع ہیگی اے۔'' ❶

آپ ہمارے علمائے کرام کی مثال سن لیجیے' جب یہ نیا نیا لاؤڈ اسپیکر ایجاد ہوا ہے۔ یہ منقسم ہندوستان سے پہلے کی بات ہے: سن 1940ء یا 1941ء میں۔ یہاں تو یہ چیز ہے کہ جو چیز بھی اس طرح سے آئے تو پہلی بات تو ان سے پوچھی جاتی ہے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز ہے۔ یعنی یہ فائدے مند ہے یا نہیں ہے۔ یہ بات نہیں بلکہ یہ پوچھا جاتا ہے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز ہے۔ مفتی محمد شفیع (1976-1897ء) تھے جو اب مرحوم ہوگئے ہیں۔ وہ اس زمانے میں دیوبند کے مفتی اعظم تھے۔ پھر وہ ہندوستان سے تشریف لے آئے تھے' کراچی میں تھے' کوئی دو چار برس اُدھر ان کا انتقال ہوا ہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ اس کے متعلق کیا ارشاد ہے کہ اس لاؤڈ اسپیکر کا استعمال جائز ہے یا ناجائز ہے؟ اُنہوں نے کہا کہ فتویٰ دینا ہے اور فتویٰ بڑا اہم ہے: شرعاً ایک چیز کو حرام اور حلال طے کرنا بڑی مشکل سی بات ہے۔ کہا کہ تحقیق کے بعد میں ایسا کرسکتا ہوں۔ اُنہوں نے تحقیق شروع کی۔ بھوپال ہائی اسکول کے ماسٹر برج نندن لال (ہندو) ایک سائنس ماسٹر تھے' ان کو انہوں نے ریفر کیا کہ اس کے متعلق آپ کی تحقیق کیا ہے۔ اُس نے کہا کہ یہ بات تو میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ بولنے والے کی اصلی آواز آتی ہے یا دوسری آواز بن کر آتی ہیں۔ یعنی یہ معاملہ ریفر کیا ماسٹر برج نندن لال کو۔ اُس نے اپنی تحقیق کا نتیجہ یہ دیا۔ انہوں نے یعنی مفتی محمد شفیع (1976-1897ء) نے کہہ دیا کہ ہاں صاحب! عبادات کے لیے تو اس کا استعمال ناجائز ہے ❷۔ اور چند ہی دنوں کے بعد خانہ کعبہ تک میں اور ہر مسجد کے اندر' امام کے سامنے' سجدے میں جاتے ہوئے بھی' یہ سب کے سامنے تھا۔ ہمارے ہاں کے جو مفتی اعظم یا علمائے کرام ہیں' کائناتی علوم میں ان کی یہ کیفیت ہے۔ اگر آج بھی اُن سے پوچھا جائے کہ ایک سوئی کیسے بنتی ہے تو اُنہیں علم نہیں ہے۔ اُنہیں تو شاید یہ بھی علم نہ ہو کہ ''سوئی کیتھوں ملدی ہیگی اے؟ اوتے اوناں دے مرید لیا دیندے نیں' او ٹانکا لالیندے نیں۔'' ❸

قرآن حکیم علما کے متعلق یہ کہتا ہے کہ یہ ہیں وہ علما اور کہتا ہے کہ یہ ہیں جو پہچانتے ہیں کہ خدا کی عظمت اور کبریائی کیا ہے' وہ اس کی کبریائی کے سامنے کانپ اٹھتے ہیں۔ بارش کا علم' بادلوں کا علم' پودوں کا علم' پھلدار درختوں کا علم' پہاڑوں کا علم' انسانوں کا علم' حیوانات کا علم' یہ جو تمام علوم ہیں اور میں سمجھتا ہوں آج جتنے بھی علوم یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں وہ ان میں سے کسی نہ کسی شق کے اندر ہی آجاتے ہیں۔ اِن علوم پہ تحقیق کرنے کے بعد جو اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ تُو واقعی عزیز بھی ہے اور غفور بھی ہے۔ کہا کہ اُنہیں علما کہتے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو درحقیقت خدا کی عظمت کے سامنے کانپ اٹھتے ہیں۔ یہاں قرآن حکیم میں یہ علما کا لفظ آیا ہے۔

---

❶ ''کرم'' کی جمع ''کرام'' ہے۔

❶ ان کا یہ فتویٰ البدائع المفیدہ فی حکم الصنائع الجدیدہ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں لکھا تھا کہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس آلہ کی ماہیت کیا ہے اور وہ کس طرح کام کرتا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے الیگزنڈر ہائی اسکول بھوپال کے سائنس ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت کیا۔ انہوں نے کہا ہے کہ ''برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم ازکم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے''۔ چنانچہ اس تحقیق کے بعد مفتی صاحب نے عبادات کے لیے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو حرام قرار دے دیا (پرویزؒ: سلیم کے نام جلد سوم' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور' 1986' ص۔16)۔

❷ سوئی کہاں سے ملتی ہے؟ وہ تو ان کے مرید لا دیتے ہیں' وہی ٹانکا لگا دیتے ہیں۔

عزیزانِ من!۔اگلی چیز بتانے کے لیے اس آیت پہ مجھے پھر آنا چاہیے۔ یہاں تو بات میں بعد میں کرونگا۔ یہ کچھ کرنے کے بعد یہ کہا ہے کہ یہ لوگ ہیں جو خدا کی عظمت سے بالکل کانپ اٹھتے ہیں۔اُس کی عظمت بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آتی ہے۔اور کہا کہ یہ لوگ جو یہ سننے کے بعد کہتے ہیں کہ پتہ نہیں کس قسم کے افسانے ہیں' جانتے ہی نہیں ہیں' یا اس کے اوپر عمل کر کے خود تحقیق نہیں کرتے۔

ذاتِ خداوندی کو بے نقاب دیکھنے کی وضاحت: قانونِ مکافات کو سامنے دیکھنا اور حقائق کو تسلیم کر لینا

عزیزانِ من! یہ قرآن کریم اس خدا کی طرف سے ہے جو کائنات کی ہر شے پر نگران ہے اس لیے اسے خوب معلوم ہے کہ یہاں کیا ہونے والا ہے۔لہٰذا اس کا ایسا ہمہ گیر علم ہی اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ جو اس نے کہا ہے وہ حقیقت ثابتہ ہے لیکن اس کے باوجود اَلَآ اِنَّھُمۡ فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡ لِّقَآءِ رَبِّھِمۡ (41:54) ذرا ان لوگوں کی حالت پر غور کرو جو خدا کے قانونِ مکافات کا سامنا کرنے کے متعلق شک کرتے ہیں۔وہ کون ایسا ہے جس کی یہ خواہش نہ ہو کہ میں خدا کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لوں۔خدا محسوس شکل میں تو سامنے آ ہی نہیں سکتا' کوئی نگاہ اس کو دیکھ نہیں سکتی۔پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی کہہ دیا گیا کہ تو دیکھ نہیں سکتا۔اس اعتبار سے تو یہ نہیں ہے کہ خدا کسی کے سامنے بے نقاب ہو جائے' سامنے آ جائے' جسے ملاقات کہتے ہیں۔کہا کہ یہ لوگ جو ان حقائق سے انکار کرتے ہیں' حقیقت یہ ہے کہ اس طرح یہ خدا سے ملاقات ہونے کے انکاری ہیں۔

کائنات پر ریسرچ اور اس کے نتائج سے آگہی کو ہی القا کہا گیا ہے' اب کچھ زیادہ عرصہ زندہ رہنے کے لیے جی چاہتا ہے: پرویزؒ

اب خدا سے ملاقات کیسے ہو؟ قرآن مجید کہتا ہے کہ یہ لوگ جب یہ تحقیق کرتے ہیں اور ایک ایک حقیقت سے پردہ اٹھتا ہے تو جو خدا کا قانون بے نقاب ہو کر سامنے آتا ہے' یہی تو خدا سے ملاقات ہے۔ان کے سامنے خدا آ جاتا ہے۔وہ خدا کو بے نقاب دیکھ لیتے ہیں۔جو ان چیزوں کے اوپر نہیں آتے وہ ہیں جو خدا سے ملاقات کے' خدا سے آمنے سامنے آنے سے منکر رہتے ہیں۔یہ بڑی اہم چیز ہے۔اس کا ایک حوالہ اور لکھ لیجیے۔قیامت پر' خدا پر' انبیاء پر' ملائکہ پر' کتابوں پر' وہ سب کچھ ہمارا ایمان ہے لیکن قرآن مجید نے یہ لقاء کہاں کہا ہے آپ یہ تو دیکھیے! وہ تو ان علوم اور ان کے متعلق انکشافات' ریسرچ اور تحقیقات کے بعد جو نتائج سامنے آتے ہیں وہاں کہا ہے کہ جو لوگ یہ نہیں کرتے وہ درحقیقت خدا سے ملات ہونے سے انکار کرتے ہیں' اُن کے سامنے خدا نہیں آتا۔ اَللّٰہُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَھَا (13:2) تم یہ کُرّے تو دیکھو۔جب تک اس کے نیچے کوئی ستون نہ ہو' کوئی بھی چیز کھڑی نہیں رہ سکتی۔کہتا ہے کہ ان کے نیچے بھی ستون ہیں لیکن وہ ستون وہ ہیں جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے۔کششِ ثقل کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ستون ہیں جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے' یہ خدا

ہی کہہ سکتا تھا۔ **ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ** (13:2) پھر اس تمام کائنات کا مرکزی کنٹرول اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ **وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ** (13:2) اتنے اتنے عظیم کُرّوں کو انہوں نے لگامیں دے کر ان زنجیروں کے اندر جکڑ رکھا ہے **کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی** (13:2) یہ سب تمام کے تمام کُرے ایک مدتِ معینہ کے لیے سرگرمِ عمل چلے جا رہے ہیں۔ **یدبر الامر** (13:2) وہ وہاں سے تدبیر امور کرتا ہے ان چیزوں کو Direct (ہدایت) کرتا ہے **یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ** (13:2) تمہارے لیے ان باتوں کی تفصیل کرتا ہے۔ کیوں کرتا ہے؟ کیوں تفصیل سے بیان کرتا ہے؟ **لَعَلَّکُمْ بِلِقَآءِ رَبِّکُمْ تُوْقِنُوْنَ** (13:2) تاکہ تمہیں یقین آ جائے کہ خدا کو سامنے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک ہی شبہ ہے جو آپ کے ذہنوں میں آئے گا' وہ اسی وقت زائل کر دینا چاہیے۔ ابھی میں ''**وَفِیْ اَنْفُسِهِمْ**'' (41:53) پر نہیں آؤں گا۔ اصل میں اس کا آغاز ہمارے ہی دور میں ہوا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کو سائیکولوجی (علم نفسیات) کہتے ہیں۔ بڑی تیزی سے وہ علم آگے جا رہا ہے اور اس کی عجیب چیزیں' عزیزانِ من! سامنے آ جاتی ہیں۔ شاید میں نے پہلے بھی کبھی کہا ہو کہ اب کچھ زیادہ عرصہ زندہ رہنے کے لیے جی چاہتا ہے تاکہ ان کی جو تحقیقات ہیں وہ سامنے آ جائیں۔ ایک ایک بات جو اس وقت تک میرے سامنے آتی ہے' قرآن کریم کی ہر آیت کی تفسیر بنتی چلی جاتی ہے۔ ابھی یہ ان کی تحقیق شروعاتی سی ہے۔

مومن ہونے کے لیے شرط اول ''خارجی کائنات میں تحقیق'' اور شرط دوم ''ماحصل کا اقدارِ خداوندی کے مطابق استعمال کا پورا کرنا'' ضروری ہوگا

قرآن کریم نے کہا ہے کہ مومن وہ ہیں جو خارجی کائنات میں تحقیق کرتے ہیں۔ میں ابھی خارجی کائنات تک ہی رہ رہا ہوں۔ قرآن حمید نے ان کو متقی کہا ہے۔ ان کو یقین دلانے والا کہا ہے۔ ذہن میں خیال پیدا ہوگا کہ اچھا! پھر تو مومن اور متقی اور ''یوقنون'' والے (45:4) تو مغرب کی قومیں ہوئیں کہ جنہوں نے یہ سارا کچھ تحقیق کر کے' یہ کچھ' کر دیا ہے۔ قرآن حمید نے کہا کہ یہ مومن کی پہلی شرط ہے جو میں نے بتائی ہے۔ کہا کہ اس کے ساتھ ایک اور شرط بھی ہے: دو شرطیں پوری ہوتی ہیں تو پھر مومن ہوتا ہے۔ دو میں سے ایک بھی نہیں ہوتی تو وہ مومن نہیں رہتا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جو کچھ یہ فطرت کی قوتوں میں سے مسخر کریں' انہیں خدا کے بتائے ہوئے اقدار کے مطابق نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے استعمال کریں۔ یہ مومن ہونے کی دوسری شرط ہے۔ اگر صرف قوت ہے (پہلی شرط) اور یہ دوسری شرط نہیں ہے یعنی اس کا استعمال خدا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہیں ہے' تو وہ چنگیز ہے' ہلاکو ہے' فرعون ہے۔ قوت تو ہے لیکن استعمال غلط ہو رہا ہے۔ بہر حال محکوم اور محتاج سے یہ ہلاکو اور چنگیز بہتر تھے کہ وہ قوت تو رکھتے تھے لیکن مومن نہیں تھے۔ جن کے پاس یہ قوت ہی نہیں ہے' ان کے لیے استعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یعنی وہ جو اُس نے کہا کہ روپے کو یہاں استعمال کرو' یہاں استعمال نہ کرو'

تو یہ اس کے لیے ہے جس کے پاس روپیہ ہے۔ جس کے پاس گٹھلی ہے' پیسہ نہیں ہے' اس کے لیے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کہاں استعمال کرو' کہاں نہ کرو۔ اب تین کیٹیگریز ہمارے پاس آ گئیں۔

قرآن حکیم انسانوں کو تین کیٹیگری میں تقسیم کرتا ہے

پہلی کیٹیگری: اقوام مغرب

ایک تو مغرب کی وہ اقوام ہیں جنہوں نے خارجی کائنات میں غور و فکر کے بعد خدا کی نشانیاں دیکھیں' فطرت کی قوتوں (Forces of Nature) کو مسخر (Harness) کیا لیکن اس تسخیرِ فطرت کے بعد ان قوتوں کو استعمال اپنی مرضی کے مطابق کیا' اپنے مفاد کے لیے کیا' اپنے اغراض کے لیے کیا' دوسروں کی ہلاکت کے لیے کیا' کمزوروں کا خون نچوڑنے کے لیے کیا۔ کہا کہ اس حد تک تو وہ ایمان والے ہیں کہ انہوں نے ان کائناتی قوتوں کو مسخر تو کیا لیکن یہ چیز کہ ان کا استعمال اس کے مطابق نہ کیا جو خدا نے بتایا' اس لیے وہ اقوام بھی اس دنیا میں جہنم کے اندر ہی رہتی ہیں۔ اس قوت کا استعمال اس کے قوانین کے مطابق کرنا نہایت ضروری ہے جو خدا نے کہا ہے۔ یہ ایک کیٹیگری ان یورپ کی اقوام کی ہوگئی۔

دوسری کیٹیگری: جماعت مومنین

ایک کیٹیگری ان کی تھی جنہوں نے کائناتی قوتوں (Forces of Nature) کو مسخر کیا اور خدا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ان کو صرف کیا۔ یہ ہے جماعت جو حقیقت میں مومنین کی جماعت کہلاتی ہے' صحابہؓ کی جماعت کہلاتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس میں اکٹھی ہیں۔ یہ دوسری کیٹیگری ہوگئی۔

تیسری کیٹیگری: دورِ حاضر کے مسلمان اور ان کی بے کسی و بے بسی

یہ تیسری کیٹیگری ان کی ہے جنہوں نے نہ فطرت کی قوتوں کو مسخر (Harness) کیا' نہ ان قوانین کا مشاہدہ کیا۔ جب انہوں نے یہ کیا ہی نہیں ہے تو اگلا سوال کہ ان قوتوں کو وہ استعمال کس طرح سے کریں' پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اب ان کو کیا کہیں۔ یورپ کی قوموں کو تو آپ کافر کہہ لیجیے گا' وہ جنہوں نے فطرت کی قوتوں' خدا کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق صرف کیا' ان کو مومن کہہ لیجیے گا۔ یہ جو تیسری کیٹیگری ہے کہ جنہوں نے نہ ان میں کسی طرح غور و فکر کیا' نہ قوتوں کو مسخر کیا' آگے ان قوتوں کے استعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو ان کو کیا کہیں گے۔ ان کو کہیں گے دورِ حاضرہ کے مسلمان۔ کوئی دوسرا نام ہی کوئی نہیں ہے۔ جس طرح وہ قلعہ شاہی کی ''بیگمات''[1] تھیں' وہ سورۃ یٰسٓ کا نام نہیں لیتی تھیں کہ بڑی منحوس ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ وہ اس کو نناویں سورۃ کہتی تھیں۔ جیہدا ناں ای کوئی نئیں۔[2] ہم اس

---

[1] یہ اشارہ ہیجڑوں (Eunuch) کی طرف ہے۔ [2] جس کا کوئی نام ہی نہیں ہے (نہ مؤنث' نہ مذکر)۔

کیٹیگری میں ہیں' عزیزانِ من! جن کا انسانوں کی دنیا کے اندر کوئی نام ہی نہیں ہوتا۔ فطرت کی قوتوں سے محروم اور جب ان سے محروم ہیں تو اقدارِ خداوندی کے مطابق ان کو صرف کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

اب آج کل یہ ساری بحثیں چل رہی ہیں کہ اسلامی نظام کیا ہوتا ہے' قرآن کریم کا معاشی نظام کیا ہے؟ یہ بحثیں ان کے لیے ہیں جنہوں نے یہ ساری قوتیں اکٹھی کر رکھی ہیں اور پھر سوچتے ہیں کہ ان کا استعمال کیسے کیا جائے۔ یہاں اسلام آئے گا۔ اور جب یہ چیزیں ہی نہیں ہیں تو اِن کے لیے تو ہم دوسروں کے محتاج پھر رہے ہیں۔ سوئیاں تک ہم دوسروں کے ہاں سے منگوا رہے ہیں' روٹی تک دوسروں کے ہاں سے منگوا رہے ہیں۔ یہ ہے ہماری بے کسی' بے بسی اور محتاجی۔

یہ تھیں لقاء رب والی وہ آیات جن کے تحت خدا تعالیٰ کائنات کے کونے کونے میں موجود ہے

عزیزانِ من! یہ ہے جو آج کی سورۃ میں آیا ہے۔ اس میں لقاءِ رب والی بات کہی تھی کہ خدا سامنے آتا ہے۔ قرآن حمید کہتا ہے وہ اس لیے آتا ہے کہ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ (41:54) وہ کسی خاص مقام میں عرش کے اوپر نہیں بیٹھا ہوا' وہ تو اس کائنات میں ہر جگہ بکھرا ہوا ہے' وہ تمام چیزوں کو محیط ہے۔ صرف یہ چیز ہے کہ جو پردہ پڑا ہوا ہے اُس کو اٹھانے کی بات ہے۔ وہ كُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ جس شے سے پردہ اٹھے گا وہاں تمہیں رب نظر آ جائے گا۔ [1]

---

[1] لقاءِ رب بڑی اہمیت رکھتا ہے اور بڑا مشکل اور نازک سمجھا جاتا ہے۔ خدا اور کائنات کا تعلق کیا ہے؟ ''ایک گروہ کا خیال ہے کہ کائنات اور خدا کا تعلق ایسا ہی ہے جیسا ایک مشین اور مشین بنانے والے کا تعلق ہوتا ہے۔ مشین بنانے والا (انجینئر) جب مشین بنا دیتا ہے تو وہ مشین اس کے وضع کردہ اصول کے مطابق خود بخود چلتی رہتی ہے' اسے مشین کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ مشین کہیں اور ہوتی ہے اور اس کا بنانے والا کہیں۔ اس تصور کی رو سے خدا کو کائنات سے ماوراء (الگ تھلگ) سمجھا جاتا ہے۔ فلسفیانہ اصطلاح میں اسے ماورائیت (Transcendence of God) کا تصور کہا جاتا ہے جس کا نتیجہ Deism ہے' یعنی ایک ایسا خدا جو کائنات سے باہر' اپنے تختِ حکومت پر متمکن ہے۔ اس سے تجسیم (خدا کے صاحبِ جسم ہونے) کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس' دوسرا گروہ ہے جس کا خیال ہے کہ کائنات اور خدا ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ نہ خدا کائنات سے الگ ہے' نہ کائنات خدا سے الگ اپنا وجود رکھتی ہے۔ اسے فلسفیانہ انداز میں (Immanence of God) کا تصور کہا جاتا ہے جس کا نتیجہ وحدتِ وجود (Pantheism) کا عقیدہ ہے' یعنی ہر شے خدا ہے۔ قرآن کی رو سے یہ دونوں تصور باطل ہیں۔ اس کی رُو سے خدا Immanent بھی ہے اور Transcendent بھی۔ وہ کائنات کے اندر ہے لیکن اس میں محبوس نہیں۔ وہ کائنات سے باہر ہے لیکن اس سے خارج نہیں۔ وہ کائنات کا خالق ہے لیکن اس کی مخلوق (کائنات) اسی کی الوہیاتی توانائی (Divine Energy) کے بل بوتے پر چل رہی ہے۔ اسے خدا کا امر یا Directive Force کہا جاتا ہے۔ اسے زماں (Time) میں ابدیت (Eternity) حاصل ہے اس لیے هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ اُس کی شان ہے۔ وہ مکان (Spece) میں لامحدودیت (Infinity) کا مالک ہے اس لیے هُوَ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ اس کی صفت ہے۔ وہ کائنات سے باہر کہیں الگ تھلگ بھی نہیں بیٹھا اور نہ ہی کائنات کی ہر شے خدا ہے اس لیے تجسیم اور وحدتِ وجود کے دونوں تصورات غیر قرآنی ہیں۔'' یہ ہے خدا اور کائنات کا تعلق قرآن کی رو سے'' (پرویزؒ: مجلسِ اقبال' طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' 1996' ص ص۔ 277.278)۔

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ تھوڑے سے وقت میں کافی باتیں ہوگئیں۔ ویسے یہ ہوتی رہیں گی۔ سورۃ حٰمٓ السجدۃ آج اختتام تک پہنچ گئی۔ اگلے درس میں ہم سورۃ الشوریٰ جو 42 ویں سورۃ ہے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

سورۂ الشوریٰ

پہلا باب: سورة الشوریٰ (آیات 1 تا 13)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1981ء کی 29 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز 42 ویں سورۃ الشوریٰ سے ہو رہا ہے: (42:1)۔

حروفِ مقطعات خدا تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ کے مخففات ہیں

حٰمٓ o عٓسٓقٓ (42:1-2). یہ مقطعات کے حروف اس سے پہلے بھی بارہا آئے ہیں، ان کو پڑھا بھی ایسے ہی جاتا ہے۔ یہ حروف

ہوتے ہیں۔ انہیں ''مقطع'' کہتے ہی اس لیے ہیں کہ یہ الفاظ سے قطع کر کے الگ کر کے ایک ایک حرف رکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی جب بھی یہ حروف آئے ہیں عرض کر چکا ہوں کہ یہ چیز عربوں کے اسلوبِ بیان میں عام تھی۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے بتایا تھا کہ نزولِ قرآن کریم سے پہلے عربوں کے ہاں نثر کی کوئی کتاب ہی نہیں تھی یہ قرآن کریم ان کے ہاں پہلی کتاب ہے جو نثر میں آئی ہے۔ یہ جو میں نے کہا ہے کہ ان کے اسلوبِ بیان میں یہ انداز تھا اور ان کا وہ سارا جاہلیہ لٹریچر جتنا بھی تھا وہ شاعری میں ہے۔ ان کی شاعری میں یہ انداز تھا کہ وہ الفاظ کا ایک ایک حرف لے کر بناتے تھے اور چونکہ ان کو پتہ تھا کہ اس میں یہ کس لفظ کا حرف الگ کر کے رکھا ہے اس لیے انہیں کبھی دقت ہی پیش نہیں آتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہم نے قرآن کریم کو عربی مبین میں نازل کیا ہے تو جو عربوں کا اسلوبِ بیان تھا اسی کے مطابق قرآن کریم کا بھی اسلوب ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسلوب تو وہی ہے لیکن اعجاز اس کا یہ ہے کہ وہ سارے عرب اکٹھے ہو کر اسکی دس آیات کے برابر کوئی آیت بھی نہ بنا سکے۔ بہرحال یہ ہیں وہ Abbreviations (مخففات)۔ میں اپنے انداز سے یہ سمجھا کرتا ہوں اور یہی کہا کرتا ہوں کہ یہ جو اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں یہ ان صفات کے حروف ہیں جو الگ کر کے سورتوں سے پہلے لائے گئے ہیں مثلاً میری بصیرت کے مطابق حٰمٓ عٓسٓقٓ میں تو آپ ''ح'' کو ''حلیم'' کہہ لیجیے م کو ''مجید'' کہیے ع کو علیم کہیے س کو سمیع کہیے ق کو قدیر کہیے تو خدائے حلیم و حمید و مجید و سمیع و علیم و قدیر کا ارشاد ہے کہ كَذٰلِكَ يُوحِيٓ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (42:4) جس طرح سے ہم نے پہلے انبیائے کرام کی طرف وحی بھیجی تھی اسی طرح سے اے رسولؐ! تیری طرف یہ وحی بھیجی جا رہی ہے۔ یہ اس خدا نے بھیجی ہے جو حکمت اور حکومت کا مالک ہے۔ وہ بڑا صاحبِ غلبہ و تسلط ہے لیکن اس کا غلبہ یکسر حکمت پر مبنی ہے دھاندلی پر نہیں۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر قوم کی طرف رسول اور نبی آتے رہے

یہ بھی قرآن حکیم کی خصوصیت ہے کہ وہ یہ بتاتا ہے کہ دنیا کی ہر قوم کی طرف نبی آئے تھے رسول آئے تھے اور ہر ملک میں رسول آئے اور انہیں ہم نے کتابیں دیں۔ اس نے کہا ہے کہ بعض ایسے ہیں جن کا نام ہم نے بالتصریح لے لیا ہے اور باقی ایسے ہیں جن کا نام نہیں لیا لیکن اصولاً یہ یاد رکھو کہ دنیا کی ہر قوم کی طرف رسول آئے لہٰذا اگر کوئی قوم اپنے کسی بانیٔ مذہب کے متعلق کہتی ہے تو ممکن ہے کہ ان کے ہاں رسول کا تصور نہ ہو اگر وہ ان کے مذہب کا بانی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ صاحب! یہ ان انبیاء میں سے ہی ہو جن کا نام تصریح سے قرآن مجید میں نہیں لیا۔ اس اعتبار سے آپ دیکھیے کہ قرآن حمید کے ماننے والوں پر تمام مذاہب کے اکابرین کی تعلیم فرض ہو جاتی ہے اس اعتبار سے کہ جب یہ قرآن مجید نے کہا ہے کہ ہر ایک کی طرف بھیجا اور نام سب کے نہیں لیے تو ہمیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ جنہیں یہ اپنا بانی مذہب کہتے ہیں یہ ان سابقہ انبیا میں سے ہو سکتے ہیں جن کا نام قرآن مجید نے نہیں لیا وہ اس لیے کہ ہم کسی کی شان میں کوئی گستاخی کا کلمہ کہہ ہی نہیں سکتے۔ ہم ان کا نام تعظیم سے ہی لیں گے۔

آج دنیا میں سابقہ انبیائے کرام کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں تحریف نہ ہو چکی ہو

یہ الگ بات ہے کہ جو تعلیم ان کی طرف منسوب کی گئی ہوگی' اسے ہم قرآن مجید کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیں گے۔ جہاں وہ اس کے خلاف ہوگی ہم کہیں گے کہ یہ تحریف ہوئی ہے کیونکہ خدا کی طرف سے تمام انبیاء کو شروع سے آخر تک ایک ہی جیسی تعلیم دی گئی تھی تو ہم کہیں گے کہ ان کتابوں میں تحریف ہوئی ہے اور جیسا کہ یہ جو ہمارے ہاں یہود اور نصاریٰ کی کتابوں کے مدعی ہیں کہ یہ آسمانی ہیں' ان کی کتابوں کے متعلق قرآن مجید نے بھی بتایا ہے' خود وہ کتابیں بھی بتا رہی ہیں کہ ان میں کتنی تحریف ہوگئی ہے' تو کسی مذہب کی جو تعلیم ہے اس تعلیم کو سچا ماننا ہم پہ لازم نہیں ہے' وہ ان کی جو تعلیم پیش کریں گے' خواہ وہ ان کے اپنے نبی کی' اپنے بانی مذہب کی' طرف ہی کیوں نہ منسوب کریں' ہم اسے قرآن مجید سے پرکھ کر دیکھیں گے۔

احادیث اور کتب سابقہ کے پرکھنے کا طریق

قرآن حمید آنے کے بعد حق و باطل' صحیح اور غلط کی کسوٹی صرف قرآن حمید ہی ہے' خواہ وہ سابقہ انبیائے کرامؑ کی طرف منسوب کردہ کوئی چیز ہو اور اسی نہج سے خواہ وہ نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کردہ چیزیں ہوں' جنہیں احادیث کہا جاتا ہے' وہ اسی زمرے میں آتی ہیں۔ ان کے پرکھنے کا بھی یہی انداز ہے کہ انہیں قرآن حمید کے مطابق دیکھ لیا جائے۔ اگر یہ قرآن حمید کے مطابق ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حضور ﷺ کی ہو سکتی ہے' یقیناً تو پھر بھی نہیں کہا جا سکتا' اور اگر وہ قرآن حمید کے خلاف جاتی ہے تو ہم انہیں مسترد کر دیں گے کہ یہ حضور ﷺ کی ہو نہیں سکتی' حضور ﷺ نے خود اپنا حدیث کا کوئی مجموعہ نہیں دیا ہے دوسروں نے یہ جمع کر کے آپ کی طرف منسوب کر دیا ہے تو وہ جو ہمارے ہاں کی کتبِ روایات ہیں ان کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسی سابقہ مذاہب کی کتابیں انجیل اور تورات وغیرہ ہیں۔ جیسا اُنہیں قرآن حمید کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے' اسی طرح اِنہیں بھی قرآن حمید کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے اور ماننا یہ چیز ہے کہ ہمارے ہاں جنہیں انبیائے کرام علیہم السلام کہا گیا ہے ہم کہیں گے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ ان کی طرف نازل کی گئی ہو' یہ اُس خدا نے نازل کیا ہے جو **الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ** (42:3) ہے۔

خدا تعالیٰ کی پہچان' اس کی ذات کی نوعیت سے نہیں' اس کی صفات سے ہے اور قرآن حمید کے ترجمے سے بات نہیں بنتی

میں نے عرض کیا ہے کہ ہم تو خدا کی صفات ہی کو پہچان سکتے ہیں' خدا کی ذات کے متعلق تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ کیا ہے۔ خدا کی جو صفات آتی ہیں وہ صفات خود قرآنی نظام' اسلامی نظام' کے اجزا ہوتے ہیں' اس کے ستون ہوتے ہیں۔ اب اسی آیت کے اندر آپ دیکھیے کہ عزیز بھی ہے اور حکیم بھی ہے۔ عزیز تو ہوتا ہے غلبے والا' قوت والا' اقتدار والا۔ الفاظ دیکھیے' استعمال میں اس کے معنی کہاں سے

کہاں چلے جاتے ہیں تو یہ عربی زبان میں عزیز اسے کہتے ہیں۔ عزت کہتے ہی قوت کو' اقتدار کو ہیں مگر ہمارے ہاں عزت کے معنی (تعظیم) Respect کے آ گئے۔ یہ عربی زبان کی رو سے نہیں ہے' اور جب آگے بڑھے تو ایک عزیز وہ ہوتا ہے جو پیارا ہوتا ہے اور ایک عزیز رشتہ دار ہوتا ہے بجائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے' کہا جاتا ہے کہ ہمارا عزیز ہے یعنی پھر ان چیزوں کے معنی یہاں تک چلے جاتے ہیں۔ یہی چیز ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن حمید کے الفاظ اگر آپ کے سامنے آئیں تو وہ جو عربی مبین میں اس کا مفہوم ہوتا ہے' وہ مفہوم لیا جائے۔ ترجمے میں ہمارے ہاں عام طور پر ان کا جو مفہوم تھا' وہ لیا جاتا ہے' اس سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔

''عزیز اور حکیم'' اسلامی نظام کے دو ستون ہیں جن میں حکمت ہے' غایت ہے اور پھر قوت بھی ہے

میں سمجھتا ہوں کہ عزیز اور حکیم' اللہ تعالیٰ کی یہ دو ہی صفات اگر لے آئیں تو اسلامی نظام کے دو ستون بن جاتے ہیں۔ عزیز تو ہے کہ اس کے لیے قوت اور غلبے کی ضرورت ہے' اقتدار کی ضرورت ہے جبھی وہ نظام کو قائم رکھ سکتا ہے لیکن ایک تو قوت ہلاکو اور چنگیز کی ہے کہ اس کے اندر دلیل اور برہان نہیں ہوتا' اس میں کوئی حکمت نہیں ہوتی' اس کی کوئی غایت نہیں بتائی جاتی' کوئی مقصد (Purpose) نہیں بتایا جاتا' اور اسی طرح ہمارے ہاں قوت اقتدار ہے جہاں سے ملوکیت چلی ہے۔ آج تک قوت کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ صاحبِ قوت ہے' جو اس کا حکم ہے وہ مانا جائے گا' ڈنڈے کے زور سے وہ منوائے گا یعنی نظام کے لیے اقتدار اور قوت یہی چیز مانی جاتی ہے لیکن قوت' جس کے ساتھ حکمت موجود ہو' کہ وہ قوت کیوں استعمال کی جا رہی ہے' اس کی غایت کیا ہے' اس کا مقصد کیا ہے' اب اگر اقتدار کے ساتھ یہ چیز بھی بتائی جائے کہ ہم ایسا حکم کیوں دیتے ہیں اور کیوں آپ کا اطمینان کرا دیا جائے کہ واقعی ایسا ہی ہونا چاہیے تو پھر آپ دیکھ لیجیے کہ اس قوت میں اور وہ قوت جو محض ڈنڈوں کے زور پر آپ کے اوپر آئے' دونوں میں کتنا فرق ہو گیا۔ ان دونوں کا امتزاج ہے' اس سے آپ اسلامی نظام کی بنیاد بنائیں گے کہ وہ قوت بھی ہو اور اس کے ساتھ حکمت اور غایت بھی ہو' Rationally اس قوت کا استعمال کیا جائے۔

اقبالؒ (1877-1938ء) کے الفاظ میں دو چیزیں اکٹھی ہونی چاہئیں' وہ حکمت کی بجائے ''رائے'' کا لفظ استعمال کرتا ہے:

قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

وہ قوت جس کے ساتھ عقلمندی نہ ہو' وہ یا جہالت ہے یا پاگل پن ہے اور آپ دنیا میں دیکھ لیجیے کہ جہاں قوت یعنی ڈنڈا حکمت کے بغیر' استعمال کیا جاتا ہے' وہ سیدھی بات ہے یا تو وہ جہالت ہے یا پاگل پن ہے اور

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں

اگر وہ قوت بغیر رائے (حکمت) کے ہے تو وہ محض مکر وفسوں ہے' چنگیزیت ہے۔

اگر محض فلسفہ ہی ہے اور اس کے ساتھ قوت نہیں ہے تو دنیا میں یہ رائے بے قوت ہوتی ہے۔ لیڈروں کا سارا کاروبار ہی مکر وفسوں پر چلتا ہے۔ اگر وہ قوتِ بے رائے ہے تو وہ چنگیزیت ہے اور اگر فلسفہ ہی ہے' حکمت ہی ہے' قوت ساتھ نہیں ہے' باتیں ہی ہیں تو وہ چیز مکاری رہ جاتی ہے' اس میں بات کے منوانے کا اور کوئی ذریعہ ہوتا نہیں تو عزیز اور حکیم دو صفات جہاں اکٹھی ہو جائیں تو پھر یہ اسلامی نظام کی بنیاد بن جاتی ہے یہ وہ چیزیں ہیں' عزیزانِ من! جب اسلامی نظام یا قرآنی نظام کہا جاتا ہے تو ان چیزوں سے پرکھا جاتا ہے۔ وہ قرآن حمید میں کوئی Constitution (آئین) کی طرح آرٹیکل لکھی ہوئی ہوتی نہیں' یہ چیزیں ہی ہیں جہاں سے یہ چیز استنباط کی جاتی ہے کہ اس میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں' کیا صفات ہونی چاہئیں' کیا امتزاج ہونا چاہیے۔ اس کے مطابق پھر آپ اپنے حالات کے تقاضے کے مطابق آرٹیکلز خود تجویز کر لیجیے Constitution (آئین) خود بنایئے تو اس میں یہ ہونا چاہیے کہ اس میں عزت بھی ہو اور حکمت بھی ہو' کہ وہ کتنا بڑا اصاحبِ قوت ہے۔ یہ ہیں قرآنی نظام کی دو صفات: عزیز بھی اور حکیم بھی۔

ارض وسما کی ہر شے خدا تعالیٰ کے پروگرام کی تکمیل کے لیے مصروف کار ہے

قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (42:4)۔ لَهٗ کے معنی تو یہ ہیں کہ یہ لفظ ملکیت کے لیے بھی آتا ہے کہ یہ سب جو کچھ ارض وسما میں ہے اس کی ملکیت ہے لیکن قرآن حکیم نے دیگر مقامات میں جو کچھ کہا ہے ان میں یہ ''ل'' نافع ہے کہ وہ ایک مقصد کے حصول کے لیے ہے جیسے کہا کہ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (57:1)۔ اس کے معنی ہوتا ہے اس کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے' اس کے فائدے کے لیے۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ بھی سرگرمِ عمل ہے وہ خدا کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے حرکت میں ہے یعنی اس میں یہ متعین کیا ہے کہ کائنات بے مقصد نہیں پیدا کی گئی' نہ ہی اس وقت یہ بے مقصد مصروفِ گردش ہے۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ خدا کے پروگرام کی تکمیل اور حصول کے لیے مصروف کار ہے۔

قدرت نے کائنات کے اس محیر العقول سلسلہ کو بڑی مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر رکھا ہے

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ خدا الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (42:4) ہے۔ یہاں پھر دو الفاظ اور آ گئے۔ ادبی اعتبار سے اسے Alliteration [1] (تجنیس لفظی) کہتے ہیں: سماوات بلندی ہے' اس بلندی کے لیے عَلِيٌّ کا لفظ آیا ہے۔ اس کے معنی بلند ہوتا ہے۔ ارض پستی کو کہتے ہیں جو چیز نیچے ہوتی

---

[1] Allitration. The occurrence in a phrase or line of speech or writing of two or more words having the same initial sound; for example, wailing in the winter wind.

ہے۔اس کے لیے یہ لفظ عظیم ہے۔ ''عظم'' یہ بنیادی ہڈیاں ہوتی ہیں جن کے اوپر انسان کا جسم کھڑا ہوتا ہے۔اب یہ دو چیزیں کتنی عجیب کہیں! سما اور ارض کہا۔سما کے اعتبار سے اس کائنات کی بے انتہا بلندیوں کی طرف اشارہ کیا' اور بنیاد کے اعتبار سے اس کو عظیم کہا کہ اس کی وہ بنیاد بھی اتنی محکم ہے اور بلندیاں اتنی اونچی اونچی ہیں۔وہی عمارت اتنی اونچی جاسکتی ہے جس کی بنیاد محکم ہو'اس لیے اس کے لیے عَلِیٌّ ہونا بھی ضروری ہے اور ''عظیم'' ہونا بھی ضروری ہے۔

مروّجہ تراجم کے تحت اس خدائے حکیم وعزیز وعلی وعظیم اور فرشتوں کے متعلق پیدا ہونے والا تصور

اب آپ کے ہاں کے قرآنی نظام کی یہ دوسری خصوصیات ہوگئیں کہ ہر طرح کی عظمت اور بلندی اس کے لیے ہے' اس کے برعکس انسانوں نے اپنے معاشرہ کا جوان کے خود وضع کردہ آئین ودستور کے مطابق متشکل ہوتا ہے اور چلتا ہے' ایسا حشر کر رکھا ہے اور اسے اس طرح فسادانگیزیوں اور خون ریزیوں کی آماجگاہ بنادیا ہے کہ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (42:5)۔آپ کے ہاں اس آیت کے عام ترجمے یہ کیے جاتے ہیں کہ ملائکہ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور دنیا والوں کے لیے مغفرت کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ یا اللہ! تُو تو غفور ورحیم ہے' ان بیچاروں کو معاف کردے' ان کی حفاظت کا سامان کردے۔جب فرشتے تسبیح کرتے رہتے ہیں اور خدا سے ہم لوگوں کے لیے مغفرت مانگتے رہتے ہیں' اگر یہ فرشتے کچھ نہ کریں تو یہ آسمان پھٹ پڑے اور نیچے گر جائے' تو گویا ان فرشتوں کی اس تسبیح کے صدقے میں ہم آپ یہاں زندہ رہتے ہیں۔اس سے خدائے عزیز وحکیم وعَلِیٌّ وعظیم کے متعلق کیا تصور آپ کے ذہن میں آیا۔یہ اگلی آیت تو ہے۔سماوات کہا' بنیادیں بھی کہا۔سائنٹسٹ بتا سکتا ہے کہ یہ اجرامِ فلکی' یہ اتنے اتنے بڑے کرّے جو فضا میں معلق ہیں' اگر یہ اس طرح سے معلق نہ رہیں اور ان میں کشش کا ذرا سا بھی فرق پیدا ہوجائے تو یہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں اور یہ زمین تو کوئی شے ہی نہیں' ان کرّوں کے اندر ایک سورج ہی اس سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے' اگر وہی اس پہ گر جائے تو اس بیچاری کا تو کچومر ہی نکل جائے۔یہ کیوں ایسا نہیں ہوتا؟ یہ کیوں نہیں گر پڑتے؟ یہ کرّے کیوں نہیں پھٹ پڑتے؟ اس واسطے اب ملائکہ آیا۔ہمارے ہاں تو اس کا ترجمہ فرشتے کیا گیا ہے کہ بس وہ فرشتے کرتے ہیں اور ''يُسَبِّحُوْنَ'' کے معنی کیے کہ تسبیح پھیرتے رہتے ہیں تو گویا اس چیز کو بچانے کے لیے فرشتے تسبیح پھیرتے رہتے ہیں اور ہمارے لیے يَسْتَغْفِرُوْنَ یعنی مغفرت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں' ہمیں ان کا بہت شکرگزار ہونا چاہیے۔

قرآن حکیم کے لفظ غفور اور رحیم کا قرآنی مفہوم

اس آیت کے مفہوم کی رو سے یہ ہے کہ اگر یہ فطرت کی قوتیں (ملائکہ) اس نظامِ کائنات کو خدا کے لیے وجہ ستائش بنانے میں مصروفِ کار نہ ہوں اور اس طرح جتنی بھی یہ کرہ ارض کی مخلوق ہے اس کی حفاظت کا سامان نہ ہوتا چلا جائے تو پھر یہاں کوئی بھی باقی نہ بچے یہ آسمانی کرے پھٹ پڑیں، گر پڑیں، ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں لیکن یہ فطرت کی قوتیں ہیں جو اس نظام کو خدا کے پروگرام کے مطابق اس حسن کاری سے چلائے چلے جارہی ہیں اور یہ ہے اسکی صفت کہ اسے غفور اور رحیم بھی ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں ترجمہ کی رو سے غفور کے معنی بخشنے والا ہو گیا اور مغفرت کے معنی بخشش ہو گئے ہیں۔ عربی زبان کے اندر مغفرت سامانِ حفاظت کو کہتے ہیں۔ وہ ''الْمَغْفَرَ وَالْغِفَارَةَ'' اس زرہ بکتر کو کہتے ہیں جو سپاہی میدانِ جنگ میں پہن کر جاتا ہے اور فریقِ ثانی کے حملے سے محفوظ ہوتا ہے' مغفرت حفاظت کو کہتے ہیں رحیم اور رحمت جسے کہتے ہیں' یہ رحم نہیں ہے بلکہ یہ رحمت ہے۔ اس کے معنی سامانِ نشوونما ہوتا ہے۔ تو اب خدا کی کیفیت یہ ہے کہ اس زمین کے رہنے والوں کے اوپر یا جہاں جہاں بھی کرّوں کے اندر آبادیاں ہیں' وہ ان کے لیے سامانِ نشوونما بھی بہم پہنچاتا ہے اور وہ حفاظت کا سامان بھی۔

اسلامی نظام کے محفوظ رہنے کی تیسری بنیادی خصوصیت: سامانِ حفاظت کا بہم پہنچانا ہے

اب جسے آپ اسلامی یا قرآنی نظام کہیں گے اس کی تیسری خصوصیت یہ آ گئی کہ اس کے لیے غفور بھی ہونا چاہیے اور اسے رحیم بھی ہونا چاہیے' وہ ان کے لیے حفاظت کا سامان بہم پہنچائے گا اور سامانِ نشوونما بھی بہم پہنچائے گا۔ وہ جو ایک حدیث ہے جو نبی اکرم ﷺ کیطرف منسوب ہے' وہ صحیح نظر آتی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس بستی میں رات کو کوئی ایک فرد بھی بھوکا سو جائے اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے یعنی یہ مغفرت ہے۔ خدا کی حفاظت جو خدا کی طرف سے آتی ہے وہ اس بات پر مشروط ہے کہ اس بستی میں کوئی رات کو بھوکا نہ سوئے گویا نظامِ اسلامی کی کیفیت یہ ہے کہ وہ محفوظ اسی شکل میں رہ سکتا ہے کہ اس کے دائرہ کار کے اندر کوئی شخص رات کو بھوکا نہ سوئے' یہ ہے خدا کا غفور ہونا' یہ ہے خدا کی مغفرت۔

بخشش یا Mercy کا لفظ انسان میں احساسِ کمتری پیدا کر دیتا ہے

عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو جو مغفرت ہے وہ ''اللہ بخشے والی'' بات ہو جاتی ہے کہ جی اللہ بخشے' بڑا چنگا بندا ہیگا سی جناب!' اللہ کولوں مغفرت منگو' بخشش منگو ❶۔ یا اللہ! گناہوں کو بخش دے۔ وہ بخشش تو آپ سمجھتے ہیں کہ کیا ہوتی ہے۔ مسلمان ہر چیز بخشش کے طور پر مانگتا

---

❶ جی! اللہ بخشش کرے۔ بڑا اچھا بندہ تھا۔ اللہ سے مغفرت طلب کرو، بخشش مانگو۔

ہے' جنت بھی بخشش کے طور پر مانگتا ہے۔ مغفرت یہ بخشش نہیں بلکہ سامانِ حفاظت ہے' رحیم محض Mercy نہیں ہے' Mercy کسی کے اوپر رحم کا جذبہ ہے۔ آپ دیکھیے جس پر Mercy کی جائے اس کی اپنی حیثیت تو اس قدر کمزور اور ناتواں ہو جاتی ہے' وہ کچھ شے ہی نہیں رہتا: رحم کرو' مجھ پہ رحم کرو۔ آپ دیکھیے یہ ابھی فقرہ قبل از وقت نہیں ہے لیکن بہر حال جتنا کچھ انسان کسی دوسرے سے مانگ کر لیتا ہے اور وہ خدا ہی کیوں نہ ہو مانگ کر لیتا ہے' بطور اپنے حق کے نہیں لیتا' استحقاق نہیں ہے' اپنی محنت کا اجر نہیں ہے بلکہ محض بخشش کے طور پر سے جو کچھ اس طرح سے لیتا ہے۔ جتنا یہ کچھ اسے ملتا ہے وہ اتنا ہی کمزور ہوتا چلا جاتا ہے' گداگر سے زیادہ کمزور کون ہو سکتا ہے لیکن قوموں کی جب ذہنیت بدلتی ہے تو یہاں ہر چیز کے لیے یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ مانگو' اللہ تعالیٰ سے یہ کرو' اللہ تعالیٰ سے یہ کراؤ یعنی اللہ اپنے کاموں کے لیے آپ نے ایک ملازم رکھا ہوا ہے' وہ آپ کا یہ کام بھی کرے اور آپ کا وہ کام بھی کرے۔ یہ ساری چیزیں جتنی بھی ہیں ان کی رو سے خدا کے متعلق یہ تصور ہے۔ اس تصور کے بدل جانے سے یہ چیزیں آتی ہیں۔

خدا سے مانگنے کی شکل میں خدا کا جواب اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ کی شکل میں ملتا ہے اور خدا نگہبان ہے نیز اَلرَّتلُ کے معنی

عزیزانِ من! آپ اس سے کہتے ہیں کہ یا اللہ! یہ کر دے' وہ کہتا ہے کہ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ (41:40) جو مجھے کہتے ہو کہ جو میری مشیّت میں ہے' اس کے مطابق میں یہ کروں' میں تم سے کہتا ہوں کہ جو تمہاری مشیّت میں ہے تم اسے میری مشیّت کے مطابق کرو۔ یہ سب اس لیے ہے کہ کائنات میں صرف ایک خدا کا اختیار و ارادہ ہے وَالَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہُ حَفِیۡظٌ عَلَیۡہِمۡ ۫ۖ وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ (42:6) جو لوگ خدا کے سوا' اس کے قوانین کے سوا' اوروں کو اپنا دوست اور مددگار بنا تا ہے تو سنو! اب یہاں یہ ''اولیاء'' کا لفظ یا ''ولی'' کا لفظ آیا ہے یہ بڑا وسیع المعنی ہوتا ہے۔ یہ عربی زبان میں سرپرست ہوتا ہے' دوست ہوتا ہے' مددگار رہتا ہے' جس پہ بھروسہ کیا جائے وہ ہوتا ہے۔ جو بھی خدا کے قوانین کے علاوہ کسی اور کو اپنی زندگی میں یہ کچھ سمجھتا ہے' اے رسول! تم پر ہم ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ڈال رہے' خدا ان کے اوپر نگہبان ہے' وہ جانتا ہے کہ یہ کیا کرتے ہیں اور ان کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔ ان سے خدا کا قانونِ مکافات خود نپٹ لے گا' رسول کی یہ ذمہ داری نہیں ہوتی۔ اے رسول! ان کا معاملہ تیرے سپرد نہیں کیا گیا۔ کہا کہ وَکَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰی وَمَنۡ حَوۡلَہَا (42:7)۔ جیسے ہم نے شروع میں کہا ہے کہ جیسے ہم انبیائے کرامؑ کے اوپر وحی کرتے چلے آ رہے ہیں' اسی طرح سے' اے رسول ﷺ! تمہاری طرف ہم نے یہ وحی کی۔ اب یہ وحی کچھ تیئس سال کے عرصے میں تکمیل تک پہنچی' پہلے حضور ﷺ کی مکے کی زندگی ہے' پھر مدنی زندگی ہے لیکن رسالت کی یہ زندگی تو بالکل مسلسل چلتی ہے خواہ وہ مکے میں ہو'

خواہ وہ مدینے میں ہو جس طرح سے یہ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا (73:4) کہا ہے۔ اَلرَّتَلُ کے لفظ کے معنی بھی یہی ہیں: ''بتدریج کسی چیز کا دینا' بتدریج کسی چیز کا آنا حسنِ تناسب کے ساتھ مربوط و مرتب ہونا حسنِ ترتیب اور حسنِ نظم لیے ہونا۔ نبی اکرمؐ سے کہا ہے کہ تم بھی اسے اسی طرح حسن نظم و تناسب کے ساتھ عمل میں لاتے چلے جاؤ۔''

نبی اکرم کی سنت یہ ہے کہ تبلیغ اپنے خاندان سے' اقربا سے' شروع کرو اور مسلسل آگے بڑھاتے چلے جاؤ

یہ جو تبلیغ رسالت تھی' یہ جو پروگرام تھا' یہ بھی تدریجاً آگے بڑھتا تھا۔ اس سے پہلے ایک آیت ہے کہ کہاں سے بات شروع کی جاتی ہے؟ کہا کہ سب سے پہلے وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (26:214)۔ ابتدا یہ ہوئی۔ جب حضور ﷺ کی طرف وحی آئی تو کہا کہ ''اپنے اہلِ خاندان کو ان کی غلط روش کے نتائج سے سب سے پہلے آگاہ کرو۔'' گویا ابتدا اہلِ خاندان سے ہوتی ہے۔ اقربا ان کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ قریب ہوتے ہیں' جتنے بھی تمہارے قریبی ہوں' ابتدا وہاں سے کی جاتی ہے۔ حضور ﷺ نے بھی پہلی ابتدا جو تبلیغ رسالت کی تھی' وہ خود اپنے اہلِ خاندان سے کی تھی۔ پہلا تو یہ Step (قدم) تھا۔ اس کے بعد دوسرا یہ ہے کہ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا (42:7)۔ یہ مکہ' ویسے ام القریٰ (Capital City) کو کہتے ہیں' دارالخلافے کو کہتے ہیں' قرآن مجید میں دوسرے مقام پہ ہے کہ رسول کو عام طور پر مرکزی مقام میں یا کسی ملک کے دارالخلافہ میں بھیجا جاتا ہے' مرکزی مقام بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ مکہ تو دارالخلافہ نہیں تھا' یہاں تو یہ خلافت سلطنت نہیں لیکن سارے عرب کے اندر مرکزی مقام تھا تو اس لیے قرآن مجید نے کہا کہ رسول کو مرکزی مقام میں بھیجا جاتا ہے' وہاں وہ تبلیغِ رسالت کرتا ہے۔ قادیان دے پنڈ اج نئیں بھیجا جاندا۔ [1] رسول کو مرکزی مقام کے اندر بھیجا جاتا ہے اور وہاں سے پھر یہ کہا کہ تم اس ام القریٰ' جو مرکزی مقام ہے اور اس کا جوار دگرد کا علاقہ ہے' پھر اس تبلیغ کو یہاں تک آگے بڑھاؤ اور پھر آگے بڑھاتے ہوئے تو وہ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں بھی آئیں۔ قرآن مجید ذکر للعلمین ہے اور حضور ﷺ رحمۃ للعلمین ہیں' یہ تو پوری کی پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے لیکن یہ سلسلہ تدریجاً اس طرح سے آگے بڑھتا ہے: بات اپنے گھر سے شروع ہوتی ہے پھر اپنے شہر سے' مرکزی مقام سے' پھر اس کے گردونواح سے' اور پھر اسی طرح بتدریج سلسلہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

حضور ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں دس لاکھ مربع میل کا رقبہ آپ ﷺ کے زیر کنٹرول تھا

نبی اکرم ﷺ کی وفات کے وقت تک کوئی دس لاکھ مربع میل کا رقبہ اس مملکت کے اندر تھا حالانکہ جب حضور ﷺ نے پہلی آواز اٹھائی ہے تو جیسے کہتے ہیں کہ کوئی سیکنڈ کرنے والا بھی نہیں تھا۔ قرآن حمید میں حضور ﷺ کا یہ اعلان ہے کہ اَنَا اَوَّلُ

---

[1] قادیان کے گاؤں میں نہیں بھیجا تھا۔

الْمُسْلِمِيْنَ(6:163) پہلا مسلم جو ہوں' وہ میں خود ہوں۔ یہ ایک ہی آواز تھی لیکن بتدریج' آہستہ آہستہ' یہ آگے پھیلتی گئی۔ اس دوران میں کتنا رقبہ تھا جو مملکت کے زیر آ گیا تھا لیکن جو قرآن حمید کی آواز تھی' وہ اس سے کہیں آگے بڑھ چکی تھی' دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ گویا اس میں یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ جو بھی قرآن حمید کی تبلیغ کا سلسلہ کرے گا' اسے تدریجاً یہ کرنا ہوگا۔ ابتدا اپنے گردو پیش سے ہوگی: اپنے مقام سے' پھر اس کے گردو نواح سے' اور پھر اور آگے۔

قرآنِ حکیم ایک نصاب کی چیز ہے' اسے تدریساً پڑھانا چاہیے' اور اسلام زبردستی نہیں پھیلا

میں سمجھتا ہوں کہ اس دور میں یہ ذرائع مواصلات یا رسل ورسائل بہت عام ہو گئے ہیں۔ اس وقت میں آپ احباب کے سامنے جو بات کر رہا ہوں' کل ہی لوگ اس کو کینیڈا اور امریکہ میں سنیں گے۔ کل سے مراد یہ ہے کہ اس درس کے یہ ہمارے ٹیپ یورپ جاتے ہیں' امریکہ جاتے ہیں' اور کینیڈا جاتے ہیں' افریقہ تک جاتے ہیں۔ گویا یہ اتنی تیزی آ گئی ہے اور وہ اس لیے بھی ہے کہ اس دنیا کے اور عالمِ انسانیت کے خود یہ حالات' جس تیزی سے بدل رہے ہیں' تو یہ عجیب چیز ہے کہ اس کے ساتھ اسی نسبت سے یہ رسل ورسائل اور مواصلات بھی تیزی سے ترقی کرتے چلے جاتے ہیں' اس لیے اس پیغام کو دور دور تک پہنچانے میں اب کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی لیکن طریقہ یہی ہے۔ یہ پہنچانا ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں تو تدریس (Teaching) کا کام ہوتا ہے' تدبر کا کام ہوتا ہے۔ یہ تو' جیسا میں بار بار کہا کرتا ہوں' یہ جو قرآن حکیم ہے یہ نصاب کی چیز ہے۔ اس کو تو اس طرح تدریساً پڑھانا اور سمجھانا چاہیے' اس کے لیے کلاسز ہونی چاہئیں لیکن بہرحال قرآن حکیم نے تدریجاً کہا ہے کہ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے چلے جاؤ اور اس کے ساتھ کہا کہ وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ (42:7) اور ان کو بتاتے چلے جاؤ کہ جو مخالفت تم کر رہے ہو' انجام کار تمہیں ایک میدان میں جمع ہونا ہوگا۔ اب مکے کی جو یہ ابتدائی زندگی ہے اس بے سروسامانی کے عالم میں بھی یہ چیز ان سے کہنا کہ یہ جو اتنی مخالفت تم کر رہے ہو' انجام کار اس کا قولِ فیصل میدانِ جنگ میں جا کر ہی ہوگا اور تم دلائل سے تو مان نہیں رہے۔ یہ نہیں ہے کہ میدانِ جنگ میں جا کر ان لوگوں کو بزورِ شمشیر مسلمان کیا گیا تھا۔ اِکْرَاہٌ یعنی زبردستی تو ایمان کا سوال ہی نہیں ہے' ان کو بھی شمشیر کے ذریعے مسلمان نہیں کیا گیا تھا' ان کی مخالفت کو توڑا گیا تھا' یہ جو اس کے راستے میں حائل ہوتے تھے' وہ روک بنتے تھے' اس رکاوٹ کو رفع کیا گیا تھا۔ یہ تو سوال ہی نہیں تھا کہ ان سے کہا جائے کہ تم اسلام لاؤ یا تمہارے اوپر تلوار ہے۔

اسلام نہ تو کبھی شمشیر کے ذریعے پھیلا ہے اور نہ ہی وہ اس طرح پھیلے گا' وہ جنگیں تو اس کے راستے میں حائل رکاوٹیں دور کرنے کے لیے تھیں

اسلام نہ شمشیر کے ذریعے پھیلا ہے' نہ پھیل سکتا ہے۔ اس کے لیے ایمان (Conviction) کی ضرورت ہے۔ یہ ایمان تو ایسی چیز ہے جس سے قلب اور دماغ کی پوری رضامندی کے ساتھ حقیقت اور صداقت کو مانا جائے۔ بزورِ شمشیر یا قوت کے زور پر اسے کوئی نہیں منوا سکتا۔ یہ بالکل غلط ہے جو کہا جاتا ہے کہ اسلام شمشیر کے زور پہ پھیلا تھا۔ پھر کہہ دوں کہ جہاں جہاں یہ بعد میں' حضور ﷺ کے بعد بھی خلفائے راشدین تک بھی' جہاں جہاں' یہ گئے' وہ رکاوٹ دور کرنے کے لیے گئے تھے جو اس نظام کے قیام کے راستے میں مخالفین آتے تھے۔ جنہوں نے صرف یہ کہہ دیا کہ ہم اس کی مخالفت نہیں کرتے' ہم اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتے' ان سے کچھ نہیں کہا گیا' ان سے معاہدہ کیا گیا' اس معاہدے میں ادھر سے یہ تھا کہ ہم تمہاری حفاظت کے ذمہ دار ہیں تم اتنا کرو کہ اس کے راستے میں روک نہ بنو۔ یہ تھا طریقہ۔ پھر سوال یہ ہے کہ یہ اسلام پھر پھیلا کس طرح سے؟

وحی کی روشنی میں تشکیل پانے والے نظام کے درخشندہ نتائج کو دیکھ کر دنیا نے سے اپنایا

قرآن حکیم بتاتا ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ o وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا (110:1-2)۔ یہ نظام قائم کرو۔ ایک دفعہ اس نظام کے انسانیت ساز نتائج اتنے درخشندہ ہونگے کہ دنیا اس کی طرف کھنچ کر چلی آئے گی' دنیا اس کی طرف فوج درفوج چلی آئے گی۔ کوئی بھی کاروبار' کوئی فیکٹری' کوئی چیز بھی' جب آپ شروع میں کرتے ہیں تو لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے لیکن جب اس کے بعد اس کے نتائج سامنے آتے ہیں تو پھر تو جیسے کاروباری دنیا میں کہتے ہیں کہ ان کے شیئرز (Shares) ہوتے ہیں ان کی قیمت ہی کہاں سے کہاں چڑھ جاتی ہے' وہ پھر شیئرز ملتے ہی نہیں ہیں۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس نظام کو قائم کرو۔ اس کے جو انسانیت ساز نتائج برآمد ہونگے انہیں دیکھ کر یہ دنیا فوج درفوج آئے گی۔ یہ تھا طریقہ اور ذریعہ اسلام کے پھیلنے کا۔ یہ شمشیر کے ذریعے نہیں پھیل سکتا۔

مولوی حضرات کے مقابلے میں پادری حضرات ڈاکٹریٹ تک تعلیم حاصل کیے ہوتے ہیں

میں نے کہا ہے کہ یہ جو آج یا اس سے پہلے ملوکیت کا ہمارا دور چلا آ رہا ہے' اس میں یہ ہے کہ اسلام کے آگے پھیلنے کے راستے میں ہم حائل ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے غیر مسلم Writers (مصنفین) اور دانشمندوران کی کتابیں بھی دیکھیے اور میرا تو ذاتی تجربہ بھی یہی ہے' میرے پاس یہ لوگ آتے رہتے ہیں۔ قرآنِ کریم کو اگر ان کی علمی سطح پر Rationally (دلائل و براہین سے) پیش کیا جائے تو مجھے آج تک

قرآن کریم کی حقانیت کے متعلق ان کو Convince کرنے کی دقت نہیں ہوئی۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ ایک دفعہ ایک رومن کیتھولک، جو عیسائیوں کا بہت قدامت پرست طبقہ ہے، کا ایک بہت بڑا پادری بھی آیا تھا۔ یہ لوگ بڑے پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے مولوی صاحبان نہیں ہوتے، یہ بڑے پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ انگلینڈ میں یونیورسٹی کے اندر جو ایم اے کی کلاس ہے، وہاں تک تو یہ جو پادری بننے والا ہوتا ہے باقیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اپنی سندیں لے کر چلے جاتے ہیں، مگر یہ دو سال مزید لگاتا ہے۔ پادری بننے کے لیے سپیشلائز قسم (Specialization) کے جو مضامین ہیں، وہ دو سال بعد میں پڑھاتے ہیں تو اس قسم کے یہ لوگ ہوتے ہیں اور وہ بھی جو Ph.D ہوتے ہیں۔

موجودہ اسلام کے بارے میں اہلِ دانش کا اعتراف مگر کیا کریں صورت بنیں حالش مپرس [1]،

میں نے یہ دیکھا کہ قرآن حکیم کو اگر ان کی علمی سطح پر Rationally (دلائل و براہین سے فکری طور پر) پیش کیا جائے تو کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ آگے جا کر پھر جب وہ مور پاؤں کی طرف دیکھتا ہے تو وہاں اس کے پروں کی ساری رنگینیاں افسردہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ آخر میں پھر وہ پوچھتے یہ ہیں کہ اگر یہی اسلام ہے جسے تم یہ کہہ رہے ہو تو تم لوگوں کی ایسی حالت کیوں ہے۔ جرأت کر کے یہ کہنا پڑتا ہے، اس کے سوا کوئی بات اور کہی نہیں جاسکتی کہ صاحب! اسلام یہ نہیں۔ وہ پوچھتے ہیں یہاں تمہارے ہی ہاں نہیں ہے یا اور بھی کہیں ہے۔ مسلمانوں کی ایک ارب [2] کی آبادی میں اتنے ممالک ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہاں نہیں ہے تو کہیں اور بتا دیجیے، ہم وہاں جا کر دیکھ لیں۔ کیا کہیں پھر اس کے بعد، کہ کہیں بھی نہیں ہے؟ ان کا اگلا سوال بڑا منطقی سوال ہوتا ہے کہ اتنی عجیب چیز جو تم بتا رہے ہو، اس میں نتائج ایسے ہیں تو کیا یہ ساری کی ساری تمہاری قوم پاگلوں کی ہوگئی ہے جن کو اپنے نفع نقصان کا بھی پتہ نہیں ہے۔ کیا کہیں کہ بات کچھ ایسی ہے؟ یہ ہے وہ مقام جہاں آ کر ہماری حالت کو دیکھ کر، وہ اسلام کی طرف سے برگشتہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ٹھیک ہے جو ایسی صورت ہے جو تم بتا رہے ہو تو کہیں اس کو اپنے ہاں یہاں نہیں، کسی اور جگہ اتنی بڑی وسیع دنیا تمہاری پڑی ہوئی ہے، آدھی دنیا، آدھے کرہ ارض کے تم مالک ہو، تم بستے ہو، اس میں ایک ارب کوئی تھوڑی آبادی نہیں ہوتی، یہ تین ہمارے ساتھ ساتھ بسنے والے بنگلہ دیش پاکستان اور انڈیا، ان کے مسلمانوں کو ہی لے لیا جائے۔ میرا خیال ہے کوئی پچیس تیس کروڑ کے قریب تو یہی بن جاتے ہیں اور روز صبح کو اخبار اٹھایئے بنگلہ دیش میں مار پڑ رہی ہے، وہ رو رہے ہیں، چیخ رہے ہیں اور دہائی دے رہے ہیں۔ بھارت کے اندر جو کچھ ہوتا ہے، ان کے خونِ ناحق کے چھینٹے یہاں تک آتے ہیں، چلا رہے ہیں وہ، صاحب! ہم دہائی دے رہے ہیں کہ ادھر سے بھی خطرہ ہے۔ اُدھر سے بھی خطرہ ہے یہ کیفیت

---

[1] صورت دیکھ لو، حال پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

[2] یاد رہے یہ بات مئی 1981ء کی 29 تاریخ کو کہی گئی تھی۔ آج اس سے کہیں زیادہ ہے۔

ہے: روٹی مانگ کر کھاتے ہیں' اسلحہ کے لیے دوسروں کے محتاج ہیں اور ہم بتا یہ رہے ہیں کہ اس کے اندر یہ ایسا نظام ہے کہ یہ آسمانوں تک کو مسخر کر سکتا ہے۔ بات تو ٹھیک کہتے ہیں کہ کہیں بتاؤ تو سہی کہ کہاں ہے یہ نظام؟ یہ ہے چیز کہ اسلام نہ بزورِ شمشیر پھیلا ہے اور نہ یہ بحث مباحثے میں پھیلتا ہے۔ وہ اس نظام کے نتائج سے پھیلا ہے۔

قرآن کی حکمرانی کے بغیر کوئی مملکت اسلامی نہیں کہلا سکتی یہ مسلمانوں کی حکومت ہیں اسلام نے تو صرف مدافعت کے لیے جنگ لڑی

اس کے بعد پھر آپ کے ہاں کی یہ مملکتیں ہوگئیں۔ سلاطین آ گئے' انہوں نے جو نظام اپنے ہاں قائم کیا وہ اسلام کا نظام نہیں تھا۔ یہ اسلام کی سلطنتیں نہیں تھیں بلکہ مسلمان قوم ہے یہ اس کی سلطنتیں تھیں۔ وہ چلی آ رہی تھیں۔ اسلام سے ان کا کیا واسطہ!! یہ تھا وہ طریقہ جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ان سے کہا گیا کہ ان کو آگاہ کر دو کہ تمہاری جو غلط روش ہے' اگر تم اس کے راستے میں حائل ہونے سے باز نہ آئے تو پھر فیصلہ میدانِ جنگ میں ہی جا کر ہوگا' تم ہمیں مجبور کر دو گے کہ ہم وہاں جائیں۔ واقعی مجبور کیا۔ مکے سے یہ مختصر سی جماعت تعداد کے اعتبار سے اتنی چھوٹی سی' نہ کوئی وسائل' نہ ان کے پاس ساز و یراق' نہ کوئی دولت' اس طرح سے وطن چھوڑ کر وہاں سے مدینے میں آ کر پناہ گزین ہو گئے اور ان لوگوں کی کیفیت یہ کہ پورے کا پورا لشکرِ جرار لے کر مدینے پہ حملہ آور ہو گئے کہ یہاں ان کو ختم کر دیا جائے۔ اگر انہوں نے ان کے مقابلے میں فتح حاصل کی تھی تو اسلام ان کی شمشیر کے زور پہ تو نہیں پھیلا تھا۔ یہ تو لڑنے کے لیے نہیں گئے' کسی ایک مقام پہ بھی یہ لڑنے کیلئے نہیں گئے تھے۔ بہر حال یہ جو ہے کہ ان کو آگاہ کر دو کہ آخر الامر پھر فیصلہ تم کراؤ گے تو میدانِ جنگ میں' فیصلہ تم کرانا چاہتے ہو' ہم نہیں چاہتے کہ وہاں تک پہنچیں لیکن تم مجبور کر دو گے کہ وہاں تک پہنچا جائے۔ پھر اس کے بعد ظاہر ہے کہ کیا ہوگا۔ کہا کہ **فَرِيْقٌ فِى الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِى السَّعِيْرِ** (42:7)۔ ہمارے ہاں کے ترجموں میں تو یہی ہے کہ یہ قیامت میں جمع ہونے والی بات ہے' کچھ تم میں سے جنت میں چلے جائیں گے کچھ دوزخ میں چلے جائیں گے لیکن وہ یہیں کے متعلق کہہ رہا ہے کہ یہ "**یوم الجمع**" یہاں ہی ہے یہیں جمع ہونا ہے' یہیں وہ میدان ہے' اس میدانِ جنگ کے بعد جو نتیجہ ہے وہ یہ نتیجہ یہاں بتا رہا ہے کہ پھر ایک فریق جو کامیاب ہوگا وہ آسائشوں کی زندگی بسر کرے گا' جو ناکام رہے گا وہ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرے گا۔

قرآنِ حکیم کے مروّجہ غلط تراجم اور ان میں تضادات: ایک بڑی دشواری

اب یہاں یہ بات ہے کہ صاحب! پھر یہ اس طرح کی تفریق انسانوں میں کیسے ہوگئی؟ وہ نہ ماننے والے تھے' یہ ماننے والے تھے' وہ جہنم والے' یہ جنت والے' تو یہ کیوں؟ کہا کہ اِن سے کہہ دو کہ ایسا ہو کر رہے گا اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ یہ اس دنیا میں بھی ہوگا

اوراس کے بعد کی زندگی میں بھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَھُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنْ یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِہٖ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَھُمْ مِّنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (42:8)۔ پھر دیکھیے جو آپ کے ہاں کے ترجمے ہیں کہ اگر خدا کو منظور ہوتا تو وہ تمام انسانوں کو ایک امتِ واحدۃ ایک جیسی قوم بنا دیتا' نہ کوئی کافر ہوتا' نہ مومن ہوتا' نہ گناہگار رہوتا' نہ متقی پرہیز گار رہوتا' نہ کوئی جنتی ہوتا' نہ جہنمی ہوتا' سب کے سب ایک جیسے ہی ہوتے لیکن وہاں تو یہ ہے کہ وَلٰکِنْ یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِہٖ (42:8) خدا جن کو چاہتا ہے وہ اپنی رحمت میں لے آتا ہے۔ یہ میں نے مروّجہ ترجموں کی رو سے کہا ہے۔ یعنی پہلے تو سارے ایک جیسے نہیں بنائے' پھر کہا کہ یہ سارے کے سارے ہماری رحمت والے ہوجائیں گے۔ جس کو ہم چاہیں گے اسے رحمت سے نوازیں گے' اور آگے ہے کہ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَھُمْ مِّنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (42:8) یہ جو ظالم ہونگے ان میں سے ان کا کوئی والی وارث نہیں ہوگا۔ یہ کون ہونگے؟ رحمت میں ان کو داخل کیا جن کو ہم نے مَنْ یَّشَآءُ کہا۔ خدا نے چاہا تو ان کو ادھر داخل کر دیا' ان کے متعلق تو اس نے کہا ہی نہیں ہے کہ یہ ان کی رحمت میں چلے جائیں تو ان کو عذاب نہیں رہا۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں ''من یشاء'' کا مفہوم' یہ ہے مروّجہ غلط ترجمے اور ان کے تضادات۔ آیت (42:8) کا مفہوم اور آیات سے ربط باہم کہ قانون کی قوت بہت بڑی ہوتی ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ آپ کے ہاں ان ترجموں کی ذرا سی غلطی حقیقت تک آنے ہی نہیں دیتی۔ عربی قاعدے کی رو سے مَنْ یَّشَآءُ یہ ہے کہ ''جو چاہے''۔ کہا ہے کہ ہم نے تمام انسانوں کو حیوانات کی طرح مجبور نہیں بنایا کہ ایک ہی روش پہ چلتے جائیں' حیوانات صاحبِ اختیار نہیں ہوتے' ساری دنیا کی بکریاں امتِ واحدہ ہیں' ایک ہی روش' ایک ہی انداز' ایک ہی خوراک ہے' ان میں تفریق نہیں ہے کیونکہ ان میں اختیار وارادہ نہیں ہے۔ کہا یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے تو انسانوں کو بھی اسی طرح' حیوانات کی طرح' ایک امتِ واحدۃ' بلا اختیار و ارادہ بنا دیتے اور جیسا ہم بناتے اسی کے مطابق یہ چلتے رہتے لیکن ہم نے انہیں صاحبِ اختیار وارادہ بنایا ہے۔ دو راستے ان کو دکھا دیئے ہیں اور یہ کہہ دیا ہے کہ جس کا جی چاہے صحیح راستہ اختیار کرلے' جس کا جی چاہے غلط راستہ اختیار کرلے۔ مَنْ یَّشَآءُ کے معنی ہیں ''جو چاہے''۔ پھر ان انسانوں میں سے جو چاہے وہ ہمارے رحمت کے دروازے کی طرف آجائے اور جو ایسا نہ چاہے وہ ظالم اپنا نقصان آپ کرے گا' ہم مجبوراً تو کسی کو نہ جنت میں بھیجتے ہیں نہ جہنم میں بھیجتے ہیں۔ اگر ہم نے اسی طرح مجبوراً بھیجنا ہوتا تو شروع میں ان کو بنا ہی ایسا کیوں نہ دیتے۔ یہ چیز کہ انسان کو ایسا نہیں بنایا ہے' خود اس کی دلیل ہے کہ یہ اپنا فیصلہ آپ کرے' جو چاہے اس سے سرکشی اختیار کرلے لیکن اسے اچھی طرح سمجھ لے کہ اس طرح سرکشی اختیار کرنے والوں کا انجام تباہی اور بربادی ہوگا اور ان کا کوئی کارساز اور مددگار نہیں ہوگا

جوانہیں اس تباہی سے بچالے۔ آگے کہا کہ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (42:9)۔ پھر یہ لوگ کس قدر حکمت' قوت' غلبے اور قانون والے خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا سرپرست اور والی مقرر کرتے ہیں حالانکہ یہ چیز کہ انسان کس کو اپنا سرپرست' والی اور محافظ بنائے' یہ صرف قانونِ خداوندی کو ہی زیب دیتی تھی۔ انہوں نے ان کو چھوڑ دیا اور جب اِن کو چھوڑا ہے تو دنیا میں کسی اور کو بھی بنا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ وہ تمام اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے' قانون کی قوت بہت بڑی ہوتی ہے۔

اس پوری کائنات میں اصل قوت قانون کی ہی ہے

عزیزانِ من! ٹھیک ہے' یہ بھی قانون ہے جس کی قوت ہے۔ جب کہیں آگ لگتی ہے تو آپ دیکھیے کہ کراچی سے اطلاع آ رہی ہے کہ کسٹم ہاؤس کے اندر آٹھ دن سے آگ لگی رہی ہے اور دنیا بھر کے فائر بریگیڈ والے جمع ہو رہے [1] ہیں۔ آگ کی بھی قوت ہے' اس پر جب پانی پڑتا ہے تو خود پانی کی قوت ہے جو اس کو بھی دبا دیتا ہے۔ یہ سارا قانون ہے کہ آگ یہ کرے گی اور یہ پانی یہ کرے گا اور یہ کرتا ہے اور وہ ہمیشہ ایسا کرتا ہے۔ قوموں کی موت اور حیات اس کے قانون کے ساتھ وابستہ ہے۔ موت کے معنی یہ نہیں ہوتا کہ Physically (طبعی طور پہ) وہ انسان بالکل مر جاتے ہیں یا وہ قوم مر جاتی ہے۔ دراصل قوموں کی ذلت' رسوائیاں اور کمزوریاں' ان کی موت ہوتی ہے اور قوم کا عروج' برومندی' فارغ البالی زندہ قوم کی علامتی ہوتی ہے۔ اس میں یہ نہیں کہ یہ مردہ قوم ہے۔ یہ ہمارے ہاں بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (42:9) اس نے تو ہر چیز کے لیے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں اور وہ جو پیمانے ہیں وہ اپنے اندر بڑی قوت رکھتے ہیں۔ ویسا وہ کر کے رہتے ہیں۔

صدیوں سے موجود مسلمانوں کے باہمی اختلافات مٹانے کے لیے قرآنی راہنمائی

اب آگے بات آتی ہے کہ ہمارے اندر یہ جس قدر اختلافات ہیں' ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قدم قدم پہ اختلاف ہیں۔ آپ کی ساری کوششیں اختلاف مٹانے کے لیے صرف ہو جاتی ہیں۔ کوئی Positive یا مثبت Action (قدم) لیں تو آپ کا وقت' توانائی' دولت صرف اس میں صرف ہو جاتی ہے کہ قوم کے اختلافات مٹ جائیں۔ وہ اختلافات' مذہب کے اختلافات ہوں' سیاست کے اختلافات ہوں' اکنامکس اقتصادیات کے اختلافات ہوں یا معاشرتی زندگی کے اختلافات ہوں' افراد میں اختلافات ہوں وہ اختلاف ہی اختلافات ہیں۔ اِن کے مٹنے کی کوئی شکل نظر نہیں آتی۔ بہت کوششیں کی جاتی ہیں' مسلسل کوششیں کی جاتی ہیں لیکن مٹ نہیں رہے۔

---

[1] یاد رہے یہ بات مئی 1981ء کی 29 تاریخ کو کہی گئی تھی جب یہ واقعہ ہوا تھا۔

اس قرآن کریم والے خدا نے کہا ہے کہ اختلاف مٹانا چاہتے ہو تو ہم تمہیں بتاتے ہیں۔ کہا کہ **وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ**(42:10) خدا کی کتاب کی طرف آ جاؤ' یہ اختلاف مٹا دے گی۔ یہ اس کا دعویٰ ہے۔ ایک جگہ تو کہا کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یا ثبوت یہ ہے کہ اس قرآن کریم میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے اور اس کے بعد یہ کہا کہ جتنے اختلافات تمہارے اندر ہیں ان کو لے کر اس کتاب (قرآن) کی طرف آ جاؤ۔ اس کے اندر وہ کچھ موجود ہے جو تمہارے اختلافات کو مٹا دے گا۔ اب آپ سوچیے' عزیزانِ من! اختلافات اتنے ہیں جس سے کوئی انکار ہی نہیں کر سکتا۔ ہمارے اختلافات کی بنا پر ہر شخص رو رہا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اختلاف مٹیں کیسے؟ قرآن یہ بتا رہا ہے۔

باہمی اختلافات مٹانے میں سب سے بڑی رکاوٹ ذاتی اغراض اور مفاد پرستیاں ہیں جن کی وجہ سے یہ قرآن حکیم کی طرف نہیں آ رہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ اس طرف آتے کیوں نہیں ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ یہ انہیں مٹانا ہی نہیں چاہتے کیونکہ یہ دوکانداریاں ہیں' ان میں ذاتی اغراض ہیں' مفاد ہیں۔ قرآن حکیم بتاتا ہے کہ اختلافات کیسے پیدا ہوتے ہیں لیکن اس نے یہ بات تو یہاں بتا دی کہ اختلاف مٹانا ہو تو قرآن حکیم کی طرف آئیے۔ مذہب کی دنیا میں آپ دیکھیے وہ تو کوئی بھی ایسا نہیں کہے گا کہ ہم قرآن حکیم کو نہیں مانتے' اس کے باوجود ان میں جتنے اختلافات ہوتے ہیں' ان کے ہاں جتنے شدید اور عمیق اختلافات ہوتے ہیں' اتنے سیاست میں نہیں ہوتے کیونکہ سیاسی اختلاف تو ایسا ہوتا ہی نہیں ہے۔ سیاسی پارٹیاں بنتی ہیں' ٹوٹتی ہیں' کالعدم بھی قرار دی جاتی ہیں لیکن کسی فرقے کو کالعدم قرار دے کر دیکھیے' کسی فرقے کے دینی مسئلے کو کالعدم قرار دے کر دیکھیے' مٹ ہی نہیں سکتے۔ جس دن سے یہ بنے ہیں' چلے جا رہے ہیں اور گہرے مضبوط ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ابھی آگے آتا ہے کہ قرآنِ کریم نے اختلاف کو خدا کا عذاب کہا ہے' اختلاف کو اس نے شرک کہا ہے' اختلاف کرنے والوں کو مشرک کہا ہے۔ یہ اتنا کچھ کہا ہے! اور اختلاف مٹانے کا طریقہ بتا دیا۔ یہ ہر قسم کی کوشش کریں گے مگر اس طرف نہیں آئیں گے۔ سیاست تو بہرحال فی نفسہٖ سیکولر ہے ہی مگر وہ جو آپ کے ہاں مذہب کے نام پہ اختلافات ہیں' ان سے کبھی پوچھیے تو سہی کہ صاحب! قرآن حکیم تو یہ کہتا ہے کہ اختلاف تمہارے ہیں اور وہ جو مٹانا چاہتے تو اسکی طرف آؤ تو کیا تم کبھی اس کی طرف گئے ہو؟ اگر گئے ہو پھر بھی نہیں مٹ سکتے تو (معاذ اللہ) قرآن حکیم کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ مٹیں گے اور اگر اس کا دعویٰ سچا ہے اور یہ مٹ نہیں رہے تو اسکے معنی ہیں کہ تم قرآن حکیم کی طرف نہیں آ رہے۔ وہ یہ آیات کبھی بھی آپ کے سامنے پیش نہیں کریں گے۔ ابھی آگے اور آیات سامنے آتی ہیں۔

یہ رہنمائی اس خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی ہے جو ہر شے کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے اور اس پر سائنسدان کی بھی عقل محو حیرت ہے۔

کہا کہ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ(42:10) یہ ہے میرا رب' اتنی بڑی قوتوں کا مالک اور اختلافات مٹانے کی صلاحیت رکھنے والی کتاب کا بھیجنے والا' یہ ہے میرا رب' اسی پہ میرا بھروسہ ہے' اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ یہ ان سے کہہ دو۔ رسول اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے قرآن حمید اعلان کرا رہا ہے۔ وہ کون سا خدا ہے؟ کہا کہ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (42:11) وہ سماوات کو' اس کائنات کو' Nothingness (معدوم) سے Being (وجود) میں لایا' Existence (وجود) میں لایا' عدم سے وجود میں لایا۔ یہ بات ہم سن تو لیتے ہیں مگر کبھی غور کریں تو بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی چیز عدم سے کس طرح وجود میں آتی ہے جب کہ کوئی مسالہ نہ ہو' اس کے لیے کوئی میٹریل نہ ہو' اور وہ وجود میں آ جائے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں دنیا کا بڑے سے بڑا سائنٹسٹ بھی محوِ حیرت کھڑا رہ جائے۔ وہاں تک تو یہ چلا جاتا ہے جہاں تک اس کو یہ کائنات وجود میں آئی ہوئی نظر آتی ہے خواہ یہ اس کی پہلی اسٹیج ہی کیوں نہ ہو' وہ وہاں تک تو ریسرچ کر کے پہنچ جاتا ہے اور جب آگے بات ہوتی ہے کہ صاحب! یہ پہلی چیز کہاں سے آ گئی' وہاں آنے کے بعد بڑے سے بڑا سائنٹسٹ بھی محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ اس کے آگے ہم قدم نہیں اٹھا سکتے' ذہنِ انسانی جا ہی نہیں سکتا کہ کہیں سے' عدم سے' وجود میں آ سکتی ہے۔ موجود اشیا میں مختلف تراکیب سے' مختلف امتزاجات سے' نئی چیزیں تو پیدا ہو جاتی ہیں مگر عدم سے کوئی شے وجود میں نہیں آ سکتی۔ یہاں کہا ہے کہ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ(42:11) وہ عدم سے وجود میں لایا' پھر جو آگے سلسلہ لایا تو کہا کہ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا(42:11) پھر آگے یہ انعام کا' مویشیوں کا بھی' انسانوں کا بھی سلسلہ اختلاطِ جنسی کے ذریعے سے چلایا۔ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ(42:11) وہ اس طرح سے پھیلتی چلی گئیں' آبادیاں بڑھتی چلی گئیں۔

خدا تعالیٰ کی ہستی ہر قسم کی وسعتوں کے تشبیہی تصورات اور محسوساتی پیکروں سے بالاتر ہے مگر یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے لکھوالاتے ہیں یا للعجب!

کہا کہ یہاں تک تو ہم نے تمہیں یہ کچھ کہا کہ شاید تم ذہن میں خدا کا کوئی محسوس کا تصور قائم کر بیٹھے ہو' خوگر انسان مجبور ہوتا ہے' کچھ ذہن میں تصور قائم کر لیتا ہے۔ خدا نے ایسا کوئی تصور' فوراً کاٹ کر رکھ دیا اور کہا کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ(42:11) وہ خدا کیسا ہے یہ تو بات ایک طرف رہی' وہ تو کسی مثال سے بھی تم نہیں بتا سکتے کہ وہ ایسا ہے۔ مثال تو کچھ انہی کی سی سہی' اس جیسا کوئی ہو تو بتایا جائے گا۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ کہا کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ(42:11) اسے مثال کے ذریعے سے نہیں سمجھایا جا سکتا' تشبیہ ہی نہیں دی جا سکتی۔ وہ

جو میں کہا کرتا ہوں' قرآن حمید خود کہتا ہے کہ وہ Infinite (لامحدود) ہے' انسانی ذہن اور اس کا علم Finite (محدود) ہے' اور محدود تو لامحدود کا تصور کر ہی نہیں سکتا اس لیے خدا کی جو ذات ہے اسے آپ انگریزی میں کہیں' فلسفے میں کہیں' جو بھی آپ کہیں' خدا کی ذات کے لیے یہ ہے کہ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (42:11) خدا علیم ہے' خدا بصیر ہے۔ یہ جو چیزیں ہیں' یہ خدا کی صفات ہیں۔ وہ تو ہم نے سمجھ لیں۔ علیم کے معنی ہیں ''جاننے والا'' سمیع کے معنی ہیں ''سننے والا''۔ وہ خدا جو ہے جس کی یہ صفات ہیں' اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے' اسے کسی مثال سے بھی نہیں سمجھایا جاسکتا۔ یہ ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَىْءٌ (42:11)۔ خدا اپنے متعلق خود یہ کہتا ہے:

ہے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

اس سے بھی بڑھ کر کہا کہ سُبْحٰنَ اللّٰهِ تَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ (23:91) جو کچھ بھی تم اس کی ذات کے متعلق کہو' وہ اس سے بلند ہے' وسعتوں میں بھی کہہ دیا یعنی عمودی طور پہ بھی کہہ دیا اور متوازی طور پہ بھی کہہ دیا' کچھ نہیں سمجھ میں آ سکتا۔ خدا اپنے متعلق یہ کہہ رہا ہے' یہ صرف تصور ہی کیا جا سکتا۔ تشبیہ سے' مثال سے' بات نہیں سمجھائی جاسکتی۔ یہ کہتے ہیں کہ اسیں روز کھیڈ دے آں اوہدے نال' ❶ اللہ میاں کے ساتھ' اس کی محفلوں میں جاتے ہیں' اس سے باتیں کرتے ہیں' وہ ناراض بھی ہوتا ہے تو اس سے پھر حکم بھی لکھوا کر لے آتے ہیں' حتیٰ کہ......صاحب حکم لکھوانے کے لیے گئے تو صبح کے وقت انہوں نے کہا کہ میں رات وہاں گیا تھا اور میں نے حکم لکھوایا تو اس کے بعد انہوں نے اپنا لٹھے کا کرتہ دکھایا تھا' اس کے اوپر انہوں نے دکھایا کہ سرخ سیاہی کے دھبے تھے' مدعی ہے نبوت کا' پھر اس کی یہ کیفیت ہے کہ الہامی زبان سے یہ سرخ سیاہی تے اونوں پتہ نئیں پئی انیوں روشنائی کیندے نہیں۔ تو کہنے لگے کہ یہ جو چھینٹے پڑے ہوئے ہیں وہ اللہ میاں نے دستخط کرنے کے لیے جو ''قلم داڈوبالیا'' ❷ ❸ تو وہ زیادہ سیاہی لگ گئی' انہوں نے یوں چھڑکا تو وہ چھینٹے یہاں لگ گئے۔ وہ کرتہ انہوں نے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے۔

خدا تعالیٰ کو محسوس شکل میں عرش پر بٹھانے کی کہانی

ارشاد ہے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَىْءٌ (42:11) مگر وہ کہتے ہیں کہ ''جاؤ جاؤ ساڈے تے یار باش ہیگا وے۔'' ❹ کیا کہیں!! بڑا غیور ہے' عزیزانِ من! اس کے بارے میں اگر اس قسم کے مذاق کیے جائیں تو جسے کہتے ہیں کہ وہ کبھی معاف نہیں کرتا' وہ بڑا غیور ہے کہا

---

❶ ہم روزانہ اس کے ساتھ کھیلتے ہیں۔

❷ الہامی زبان سے تو اس سُرخ سیاہی کا اسے پتہ ہی نہیں کہ اسے روشنائی کہتے ہی نہیں ہیں۔

❸ قلم کو سیاہی لگانے کے لیے دوات میں ڈالا۔

❹ جاؤ میاں! ہمارا تو لنگوٹیا یار ہے۔

ہے کہ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ (42:11)۔ یہ عزیزانِ من! تمام چیزیں ذہنِ انسانی کے تصورات ہیں اور وہ جو کہا جاتا ہے۔ یہ فریبِ نفس ہے کہ تصوف میں صوفی ان سے ملاقات کرتے ہیں' خدا کے ہاں جاتے ہیں' وہاں سے لکھا کر لاتے ہیں' اس کی محفلوں میں جاتے ہیں' خدا ان کے پاس آتا ہے' یہ سارا کچھ اس طرح سے کر رہے ہوتے ہیں جیسے کوئی بچپن کا جوڑی دار ہوندا ہیگا اے حالانکہ قرآن حمید بتاتا ہے کہ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ (42:11)۔ نبی تک کے متعلق کہا ہے کہ لَا تُدۡرِکُہُ الۡاَبۡصَارُ (6:103) اس کی نگاہیں یہ نہیں ہے کہ اسے دیکھ نہیں سکتیں۔ کیا لفظ قرآن لایا ہے حالانکہ عربی زبان میں دیکھنا لفظ یہاں آنا چاہیے تھا کہ نگاہیں اس کو دیکھ نہیں سکتیں۔ کہا کہ لَا تُدۡرِکُہُ الۡاَبۡصَارُ (6:103) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں یعنی ادراک کی یہ جتنی چیزیں Perceptible (قابل ادراک) ہوتی ہیں' ان کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ ادراک (Preception) کے لیے تو کوئی نہ کوئی میٹریل چیز ہونی چاہیے' وہ تو محسوس اور مرئی ہوتی ہے پھر کہیں جا کر وہ Preceptible (قابل ادراک) بنتی ہے۔ یہاں اس نے کہا ہے کہ وہ نگاہ سے Preception (ادراک) میں بھی نہیں آ سکتا: لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ ❶ (42:11)۔ یہاں پھر اسے عرش پہ بٹھایا ہوا ہے' پھر عرش کا پتہ بتایا ہوا ہے کہ وہ پہاڑی بکرے' جو سمندر میں کھڑے ہیں' ان کے سینگوں کے اوپر خدا کا عرش ہے' پھر عرش کے اوپر اس کو ملنے کے لیے جاتے ہیں' پھر وہاں کی جو داستانیں بیان کی جاتی ہیں: نعلین دے نال عرش تے آ' قربان تھیواں تیڈی چال کولوں ❷۔ عزیزانِ من! کیا بتاؤں یہ حالت کیوں ہوئی ہے ہماری!! وہ بہت غیور ہے' اس کے ساتھ یہ ایک قسم کا مذاق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ ۚ وَھُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ (42:11)۔

خدا اپنی صفات کے اظہار میں ذرائع کا محتاج نہیں۔ ہمارا صرف اس پر ایمان ہے جو قرآن کریم سے ہی سمجھایا جا سکتا ہے

اب دوسری چیز یہ ہے کہ وہ سمیع بھی ہے' بصیر بھی ہے۔ ہم جب کہیں گے کہ وہ سنتا بھی ہے' دیکھتا بھی ہے تو ذہن میں آ جائے گا کہ کوئی کان ہونگے' آنکھیں ہونگی۔ ''جیہدے کن نہ ہون' جیہدی اکھاں نہ ہون' تے ویکھے گا کی' او سنے گا کی؟'' ❸ ذہنِ انسانی محسوس کا

---

❶ اس کی مثل کوئی شے نہیں۔ (تم اس کی صفات کو تو سمجھ سکتے ہو' اس کی ذات کی کنہ وحقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ کسی مثال سے بھی نہیں سمجھائی جا سکتی۔ اس لیے کہ اس کی مثل کوئی شے نہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1127)۔

❷ جوتوں سمیت عرش پہ آؤ۔ میں تمہاری اس چال پر قربان ہو جاؤں۔ (وحدت الوجود کے بارے میں مزید کہا ہے کہ) ''بلھے شاہ ہونی کہندے نیں۔'' (بلھے شاہ فرماتے ہیں) واہ سوہنیا! تیری چال عجائب لٹکاں نال چلیندے ہو آپے ظاہر آپے باطن' آپے لُک لُک بہندے ہو آپے مُلّا آپے قاضی' آپے علم پڑھیندے ہو ہن کس تھیں آپ چھپائیدا! (پیارے محبوب! تمہارے انداز بھی عجیب ہیں۔ خود ہی ظاہر ہو' خود ہی باطن۔ خود ہی سب سے چھپ چھپ کر بیٹھتے ہو۔ خود ہی مُلّا ہو' خود ہی قاضی......اور خود ہی تعلیم دینے والے عالم۔ اس کے بعد کہو کہ تم اپنے آپ کو چھپاتے ہو' تو کس سے چھپاتے ہو!)

❸ جس کے کان نہ ہوں' جس کی آنکھیں نہ ہوں' وہ دیکھے گا کیا اور سنے گا کیا؟

خوگر ہے لیکن اس کی یہ جو صفات ہیں وہ ہماری طرح سنتا نہیں ہے' ہماری طرح آنکھوں کا محتاج نہیں ہے کہ وہ اس آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ جس طرح اس کی ذات لیس کمثلہ ہے' اس کی یہ صفات بھی یہ ہیں کہ وہ کیسے سنتا ہے' کیسے دیکھتا ہے' ہم نہیں سمجھ سکتے' اس پہ ہمارا ایمان ہے اور وہ اس لیے ہے کہ وہ کہہ رہا ہے کہ ہم تو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں جہاں بھی کہیں کچھ ہوتا ہے' انسان کی شہ رگ سے بھی قریب ہوتے ہیں تو ان چیزوں کے اوپر' خدا کی ذات کے اوپر' صرف ایمان کی چیز ہے۔

ہمارے دَور کے بہت سے کہنے والے یہ کہیں گے کہ پھر جب خدا کی کیفیت یہ ہے کہ اس قسم کے خدا پر تم ایمان کیسے لاؤ گے کہ واقعی وہ خدا ہے اور جس خدا کے متعلق یہ کہتے ہو کہ تصور میں بھی نہیں آ سکتا' خیال میں نہیں آ سکتی' پھر اس کی ذات کی کنہ وحقیقت کو کیسے سمجھ سکتے ہو؟ یہ چیز ہے کہ یہ اس خدا کی کتاب ہے اور بات یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! باقیوں کا تو پتہ نہیں کہ وہ کیسے بات کو سمجھاتے ہیں' میں نے جب بھی ان لوگوں کو خدا کے متعلق کچھ سمجھایا ہے' میں نے ہمیشہ اس کتاب سے بات شروع کی ہے اور یہ جس سطح کے لوگ میرے پاس آتے ہیں' ان کی سطح پر گفتگو میں کرتا ہوں اور ان سے پھر یہ چیز منواتا ہوں کہ واقعی یہ چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں فکرِ انسانی یہ کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ وہ میں کہتا ہوں کہ اتنی سی بات ہی منوانے کی ہے کہ خدا کے ساتھ ہمارا تعلق صرف اس کتاب کے ذریعے سے ہے' عزیزانِ من! اور کسی طرح کا کوئی تعلق اور رشتہ اس کے ساتھ ہمارا وابستہ نہیں ہوسکتا' یہ صرف اس کی کتاب ہے۔ وہ جب اس میں کچھ کہتا ہے تو وہ ہم سے کلام کرتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب کو کلام اللہ کہا ہے۔ وہ کلام کرتا ہے جب ہم کچھ کہتے ہیں جیسا ایمان ہے' وہ سنتا ہے' تو اس تک اگر ہم لے آئیں تو یہ سارے جتنے' اتنے گنجھی دار' پیچ دار منطق فلسفے کے' مابعد الطبیعات کے جسے میٹا فزیکل کہتے ہیں' مسائل ہیں ان کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ یہاں بتایا ہے کہ اس نے یہ کتاب دی اور یہ ثابت کیا جائے کہ یہ فکرِ انسانی کی تخلیق نہیں تھی' اسے وہ سب مان لیتے ہیں اور اگلی بات پھر یہ ہے کہ ہمارا اور خدا کا تعلق اس کتاب کے ذریعے سے ہے' براہِ راست کوئی تعلق نہیں' کسی کا نہیں ہوسکتا' نبی کا تو تھا جس کو اس نے کتاب دی' ختمِ نبوت کے بعد خدا سے تعلق کا کوئی ذریعہ سوائے اس کتاب کے نہیں ہے۔

خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ خزانوں کی نوعیت اور کیفیت

عزیزانِ من! وہ ہم سے باتیں کرتا ہے تو اس کتاب (قرآن کریم) کے ذریعے کرتا ہے' ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں تو اس کتاب کے ذریعے کرتے ہیں' اور یہی اس نے کہہ دیا کہ **لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ o شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ** (42:12-13) اس کائنات کے اندر جتنے خزانے ہیں' ان خزانوں کی

چابیاں اس کے پاس ہیں۔اس کے قانون کے ذریعے سے یہاں سے یہ چیزیں باہر آتی ہیں۔دوسری جگہ ہے کہ ہمارے پاس تو لاانتہا خزانے ہیں لیکن ہم انہیں پیمانوں کے ذریعے سے بھیجتے ہیں' ایک ہی دفعہ سارے کا سارا باہر نہیں لے آتے' پھر اس کے بعد تو آنے والے انسانوں کے لیے کچھ رہے ہی نہیں' اور یہ ان کو اتنا زیادہ مل جائے تو یہ اس کے اندر ڈوب ہی جائیں' اس لیے کہا ہے کہ ہم ان کو پیمانوں کے ذریعے بتدریج باہر لاتے ہیں' ورنہ ہیں لاانتہا خزانے۔ان خزانوں کی چابیاں ہمارے پاس ہیں۔وہ اگر خزانے یہاں بھیج دے' چابیاں اپنے پاس رکھ لے تو ان خزانوں کے ہم صرف چوکیدار رہ گئے؟

کائنات کی چابیاں ہمیشہ اس قوم کے ہاتھ آئیں گی جو کائناتی خزانوں کو مسخر کرے گی

وہ کہتا ہے کہ **سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ** (31:20) سماوات وارض کو' تمہارے تابع تسخیر کیا ہے۔ اب اگر مسخر کریں گے تو اس سے فائدہ اٹھائیں گے' اسے کھولیں گے۔جب آپ کوئی چیز مسخر کرتے ہیں تو اس کو کھولتے ہیں کہ یہ چیز کیسے کی جائے گی؟ وہ کہتا ہے کہ تم ہمارے قانون کے مطابق یہ مسخر کرلو گے اور جو بھی اس قانون کے مطابق مسخر کرے گا اس کے ہاتھ میں چابیاں آجائیں گی ورنہ یہ بات نہیں ہے کہ یہ سارے خزانے تو دیدیئے اور چابیاں اپنے پاس رکھ لیں۔ہم ان خزانوں کو کیا کریں گے! خزانوں کی وہ چابیاں اس کے قانون ہیں۔ان قوانین کے ذریعے یہاں کی ہر چیز کا خزانہ کھلتا ہے۔مغرب کی قومیں' جنہوں نے فطرت کی قوتوں کو یعنی نیچر کے اوپر اس طرح عبور حاصل کیا ہے' ان کے سامنے کائنات کس طرح خزانے کھول دیتی ہیں' وہ ہمارے سامنے ہے اور یہ بھی کہ ان سے زمین خزانے اگل رہی ہے' آسمان سے خزانے برس رہے ہیں۔یہ قوانین فطرت خزانوں کی چابیاں ہیں۔ **يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ** (42:12) انہی قوانین کے مطابق جو قوم چاہے اسے رزق فراواں مل سکتا ہے اور جو ایسا نہ چاہے اور اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرے اسے نپا تلا ملتا ہے۔

کائنات میں خزانے تو اتنے پڑے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں سے جس کو جتنا ملتا ہے اُسے اتنا تو لینا چاہے۔اس کے لیے یہاں "من یشآء" آیا ہے' اس کا پھر وہی ترجمہ ہے کہ جس کو ہم دینا چاہیں اسے دیں گے' کسی کو تھوڑا دیتے ہیں' کسی کو زیادہ دیتے ہیں کیونکہ چابیاں ہمارے پاس ہیں اور اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ یہ جو غربت اور بھوک ہیں یہ خدا کا عذاب ہیں یعنی آپ نے خود ہی تو تھوڑا دیا ہے اور غریب بنایا اور خود ہی کہا کہ یہ ہمارا عذاب ہے' کوئی زیادہ لینا چاہے لے نہیں سکتا کیونکہ چابیاں اس کے پاس ہیں۔وہی "من یشآء" آیا ہے۔چابیاں ہمارے پاس ہیں تو یہاں صحیح بات واضح ہوگئی کہ اس "من یشآء" کے معنی یہ ہوئے کہ جو زیادہ لینا چاہتا ہے وہ زیادہ لے سکتا ہے' جو اس میں سے کم لینا چاہتا ہے' وہ کم لے سکتا ہے۔ہم ان کو چابیاں دیدیتے ہیں' جس قسم کی وہ محنت کرتا ہے ویسے

ہی کچھ چابیاں بھی لے لیتا ہوگا' تے اے نئیں کہ اک جنی چابی دیندا ہووے۔ ❶ یہ ساری چیزیں' اگر آپ دیکھیں' تو یہ سارا قصہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہے' سارا سلسلہ اس کے مطابق چلتا ہے' اسے خوب علم ہے کہ کون کس قسم کی کوشش کرتا ہے' اس لیے اُسے کیا ملنا چاہیے۔ یہ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (42:12) ہے۔ اُسے یہ علم ہے کہ اس کو کہاں کتنا دینا ہے' کیا اندر رکھا ہے' کیسے باہر آئے گا' کتنی مقدار میں وہ باہر آ جائے گا۔

تسخیرِ کائنات کے بعد مومن اور کافر میں بنیادی فرق کی پہچان اور انبیائے کرام کی مثال

اس کے بعد آگے بات چلی کہ یہ تو ہوگئی تسخیرِ ارض وسما' تسخیر خارجی کائنات' تسخیر طبعی دنیا (Physical world)۔ اس میں کافر اور مومن کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ جو بھی محنت کرتا ہے اس کو وہ مل جاتا ہے لیکن یہ حاصل ہونے کے بعد اب آگے کافر اور مومن کا فرق آتا ہے۔ مومن ان فطرت کی قوتوں کی تسخیر سے جو کچھ حاصل کرتا ہے' اس کو خدا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق خرچ کرتا ہے۔ ان قوانین کو نہ ماننے والا اپنے اغراض ومقاصد کے مطابق صرف کرتا ہے اور پھر تباہیاں مچتی ہیں۔ Super Powers (بڑی حکومتیں) جو آج کل اتنی بڑی قوتوں کی مالک ہیں' وہ اتنا ڈر رہی ہیں' ہم تو رات کو آرام سے سوتے ہیں' لیکن وہاں نہ امریکہ کے President (صدر) کو نیند آتی ہے' نہ رشیا کے' ❷ چیف (سربراہ) کو رات کو نیند آتی ہے۔ یہ کیا ہے؟ وہ اتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قوت کا استعمال اور تقسیم خدا کی اقدار کے مطابق نہیں کرتے۔ اسی لیے یہاں جب کائنات کی قوتوں اور ان کے تسخیر کا ذکر آیا تو فوراً ساتھ ہی کہا کہ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی (42:13) الدین شروع سے ایک ہی چلا آ رہا تھا۔ انسانی زندگی کے متعلق اصول اور اقدار' جب سے انسان پیدا ہوا' وہی تھے۔ کہا ہے کہ ان اصول واقدار کو نافذ کرنے' ان کے مطابق معاشرے کی تشکیل کرنے کے لیے' اس کے طریقے ہر دور میں بدلتے چلے جائیں گے' دین وہی تھا وہی رہے گا۔ کہا کہ ہم نے وہ دین جو نوح علیہ السلام کو دیا' ابراہیم علیہ السلام' موسیٰ علیہ السلام کو دیا' وہی جو الدین ہے اس میں شَرَعَ لَكُمْ (42:13) یعنی اس دین کا جو راستہ ہے' وہ وہی ہے جو ہم نے ان کو دکھایا تھا۔

لفظ شریعت کا قرآنی مفہوم

یہ ''شرع'' کا لفظ پہلے بھی آ چکا ہوا ہے' اسی سے وہ لفظ ہے جسے ہم شریعت کہتے ہیں۔ ان عربوں کی یہ زبان عظیم چیز ہے! آپ

---

❶ یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ہی جتنی چابی دیتا ہوگا۔

❷ یاد رہے کہ یہ بات مئی 1981ء کی 29 تاریخ کو کہی گئی تھی۔ جب یہ رشیا یو ایس ایس آر تھا' ابھی بکھرا نہیں تھا۔

نے دیکھا کہ وہ اصول اور اقدار تو مستقل ہیں' غیر متبدل ہیں' Unchangeable ہیں' Permanent ہیں لیکن ان کو نافذ کرنے کے' ان کو استعمال کرنے کے' ان کے مطابق چلنے کے' جو طریقے ہیں' قرآن حکیم نے کہا ہے کہ یہ سبل ہیں' یہ کئی راستے ہیں' یہ کئی پگڈنڈیاں ہیں' یہ مختلف ہو سکتے ہیں' یہ بدلتے رہیں گے' یہ جامد نہیں ہوں گے۔ اب عربوں کی زبان اور قرآن حکیم کے انتخاب پہ غور کیجیے گا' عربوں کے ہاں شریعت ❶ اس راستے کو کہتے ہیں جو بہتے ہوئے پانی کی طرف آپ کو لے جائے' پانی جو جوہڑ یا تالاب جیسا ہو' جسے آپ کھڑا پانی کہیں گے' بہنے والا نہ ہو' جو جامد پانی ہو' اس کی طرف جانے والے راستے کو وہ شریعت نہیں کہتے۔ ان کی زبان کے اندر اور قرآن حکیم کے انتخاب کے اندر یہ بات ہے کہ شریعت کو بہتے ہوئے پانی کی طرح رواں دواں رہنا چاہیے۔ اگر یہ ایک مقام کے اوپر کھڑی ہوگئی تو یہ شریعت نہیں رہے گی۔

الدین اور شریعت میں بنیادی فرق

ہزار سال پہلے کے بنائے ہوئے قوانین اگر اسی طرح سے آج بھی جامد ہیں اور اسی طرح سے وہ جامد رکھنا چاہتے ہیں تو یہ ان کے ہاں آج کے قوانینِ شریعت قرار پاتے ہیں۔ یہ زبان کے اعتبار سے بھی قوانین شریعت نہیں کہلا سکتے قرآن حکیم تو ایک طرف رہا۔ الدین اور شریعت میں فرق یہ ہے کہ الدین غیر متبدل ہوتا ہے' شریعت پانی کی روانی کی طرح بدلتی رہتی ہے۔ کہا کہ یہ سب کچھ ان کو دیا اور ان سب سے یہی کہا کہ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ (42:13) دین کو قائم رکھو' Establish (ثبت وقائم) کرو' خدا کے تجویز کردہ نظام کو عملاً قائم کرو اور آگے ہے کہ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (42:13) اور اس میں تفرقہ نہ پیدا کرو' فرقہ بندی نہ پیدا کرو۔ انبیائے کرام علیہم السلام کو شروع سے آخر تک جو دین دیا جاتا رہا' اس میں ان سے ایک ہی تاکید کی گئی کہ دین قائم کرو اور اس کے اندر تفرقہ نہ پیدا ہونے دو' سب سے زیادہ سنگین جرم بارگاہِ خداوندی میں انسانوں میں تفرقہ پیدا کرنا ہے۔

دین کے اندر فرقہ بندی کو شرکِ عظیم کہنے والے کی سب سے زیادہ مخالفت ہوتی ہے

عزیزانِ من! آگے بتا دیا کہ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ (42:13) اے رسول! یہ جو بات ہے کہ اپنا تفرقہ مٹا دو' جب تم ان سے کہو گے تو یہ ان پر بڑی گراں گزرے گی۔ آج بھی ان سے ذرا کہہ کر دیکھیے کہ یہ تفرقہ مٹا دیجیے' یہ جو شیعہ اور سنی میں' پھر آپ کے ہاں اہلحدیث اور اہل فقہ' اور فقہ کے ہاں دیوبندی اور بریلوی اور بریلوی' کے ہاں پھر قادری اور چشتی ہیں' آپ ان میں سے کسی سے کہیے کہ ذرا ان کو مٹا دیں' تو سب سے زیادہ سخت دشمن آپ کے یہ ہوں گے جنہیں آپ یہ کہیں گے کہ فرقہ مٹا دو۔ قرآن حکیم

---

❶ اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ العنکبوت' پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2008

کہتا ہے کہ **كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ**(42:13) قرآن مشرکین کہہ رہا ہے اور یہ یہاں ہی نہیں کہہ رہا' یہ آیت تو بڑی اہم ہے' کئی دفعہ آ چکی ہے۔ یہ ہے (30:31) جس کو یہ حضرات کبھی اپنے وعظوں میں' کبھی مسجدوں میں' محراب و منبر سے' پیش ہی نہیں کریں گے۔

فرقہ بندی کی بنا پر پیدا ہونے والی ذہنیت کا نتیجہ

قرآن کریم نے کہا ہے کہ **وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ**(30:31)۔ جماعت مومنین سے کہا جا رہا ہے کہ دیکھنا' تم مومن ہونے کے بعد مشرک نہ ہو جانا۔ اب ذہن میں آئے گا کہ کیا ہم بت پوجنے لگ جائیں گے' لیکن بت پرستی ہی شرک نہیں ہوتا۔ سنیئے عزیزانِ من! مشرک کسے کہتا ہے؟ کہا کہ **مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ**(30:32) ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر لیے **وَ كَانُوْا شِيَعًا**(30:32) اور خود بھی ایک فرقہ یا گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ جب کسی میں یہ چیز پیدا ہو جاتی ہے کہ فرقوں میں بٹ جاتے ہیں تو پھر یہ نہیں ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مطلق حق' صداقت' صحیح بات' کونسی ہے۔ اس میں یہ ہوتا ہے کہ **كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** (30:32) پھر ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ میں سچ پہ ہوں اور باقی سب جھوٹے ہیں۔ غور فرمایئے' عزیزانِ من! توحید نام ہی وحدتِ امت کا ہے۔ اس کے اندر اگر تفرقہ پیدا ہوا تو وہ شرک ہو گیا اور جسے آپ فرقہ کہتے ہیں' ایک فقرے میں وہ بات کر دوں کہ شرک کیسے ہوگا۔ فرقے میں آپ اس کو آگے لیے چلے جائیں کہ یہ کہاں سے بات آئی' اس کی سند کہاں سے آئی' کس نے یہ کہا' آگے جا کر وہ بات کسی نہ کسی انسان پر رک جائے گی (مثلاً) فلاں امام نے یہ کہا' فلاں فقیہہ نے یہ کہا' فلاں مفسر نے یہ کہا' فلاں محدث نے یہ بات کہی اور یہ شخصیت پرستی ہے جیسے تفرقہ ہوتا ہے۔ جب قرآن کریم میں خدا نے یہ کہا تھا کہ اختلاف مٹانا ہو تو اس کتاب کی طرف آؤ' تفرقہ تو اس کتاب کی طرف آنے سے مٹے گا۔ یہ تفرقہ جو باقی رہتا ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ کتاب اللہ تک نہیں آتے۔ اس سے پرے ہی جسے قرآن من دون اللہ کہتا ہے' کسی نہ کسی انسان پر رک جاتے ہیں اور پھر یہ وہ چیز ہے کہ ان میں سے پھر ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ میں حق پہ ہوں' باقی سب باطل پر ہیں۔ یہ لوگ اپنے اندر گنجائشیں رکھتے ہیں' وہ ایک حدیث نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دی جاتی ہے جو قطعاً حضور ﷺ کی نہیں ہو سکتی کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں تہتر فرقے ہونگے' تو کیا اس کے باوجود وہ حضور ﷺ کی امت رہے گی' یہاں تک تو بات ہوئی کہ اچھا ہونگے' گنجائش ملاحظہ فرماؤ' کہا کہ ان میں سے ایک فرقہ تو ناجی ہوگا اور باقی جو بہتر ہیں وہ دوزخی ہونگے۔

فرقوں کو مٹانے کا بہترین طریق انسانوں کے بجائے قرآن حکیم کو اپنا امام تسلیم کرنا ہے

اس حدیث میں ایک فرقے کی Exception (استثنا) کردی۔ بس اس میں یہ سارے فرقے' جتنے بھی تھے' ان کو جائز قرار دیدیا۔ اب ہر فرقہ یہ سمجھ رہا ہے کہ وہ جو حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ایک ناجی ہوگا' وہ تو ہم ہی ہیں اور باقی سارے جہنمی ہیں اور یہ سارے تہتر کے تہتر یہی سمجھ رہے ہیں۔ ان سے جب کہو کہ بھئی! تم اس فرقے بندی کے اندر کیوں پڑے ہو؟ کہنے لگے کہ جی! حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہ 73 فرقے ہوں گے اور اِن میں ایک ناجی ہوگا تو ہم تو ان میں سے ناجی ہیں' باقیوں سے یہ جو بہتّر (۷۲) ہیں' آپ جا کر کہو کہ وہ کیوں فرقہ بنے پھرتے ہیں۔ قرآن حکیم کا خدا تو سمیع ہے اور بصیر ہے' اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ **كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ** (30:32) جب بھی تفرقہ پیدا ہوا تو ہر گروہ پھر خوشی سے یہ کہے گا کہ ہم تو حق کے اوپر ہیں' باقی سارے کے سارے' جتنے بھی ہیں' وہ باطل پہ ہیں حالانکہ یہ سب باطل کے اوپر ہوتے ہیں۔ جب تفرقہ آ گیا تو سارے باطل پہ آ گئے' قرآن حمید نے انہیں مشرکین کہا ہے۔ عزیزانِ من! یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد تو پھر کسی انکوائری' کمیٹی یا کمیشن بٹھانے کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ ہماری یہ حالت کیوں ہے۔ جو مشرکین کی حالت دنیا میں ہے وہ ہماری حالت ہے۔

امتِ واحدہ کے تصور کو اُجاگر کیے بغیر دینِ خداوندی کی تشکیل ممکن نہیں ہے۔ کچھ پتہ نہیں زندگی میں موقع ملے یا نہ ملے: پرویزؒ

یاد رکھیے' عزیزانِ من! کچھ باتیں' پتہ نہیں زندگی میں موقع ملے یا نہ ملے' میں ضرور کہوں گا۔ اُن میں ایک بات یہ ہے کہ وحدتِ امت بنے بغیر اسلام آ ہی نہیں سکتا۔ اسلام اور امتِ واحدہ بننا' یہ دونوں چیزیں لازم وملزوم ہیں: امت میں وحدت ہوگی' اس میں کوئی فرقہ نہیں ہوگا تو وہاں اسلام ہوگا۔ وحدت نہیں' تفرقہ ہے تو اسلام نہیں ہے' پھر یہ بات بھی نہیں ہے کہ ان فرقوں میں سے کسی ایک کے پاس تو اسلام ہے باقیوں کے پاس نہیں ہے۔ یہ سوال ہی نہیں ہے۔ جس نے بھی اسلام لانا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اول تو وہ سارے فرقوں کو ختم کرے' امت بنائے اور اگر یہ نہیں ہے تو بہرحال جو بھی اس قرآن مجید کو ماننے والی قوم ہے' اس کے ساتھ وہ اپنے اندر تفرقہ پیدا نہ کرے۔ قرآن مجید کو اپنا معیار قرار دیدے تو وہاں اسلام ہوگا۔ جہاں تفرقہ آئے گا وہاں اسلام نہیں آ سکتا۔ یہاں جو شریعتیں ہیں' یہ آپ کے ہاں کی وہ مختلف فقہ کی شریعتیں ہیں۔ یہ بڑے دھڑلے سے کہا جاتا ہے کہ ہم اہلحدیث ہیں صاحب! ہم اہلِ فقہ ہیں۔ اہلِ فقہ میں بھی پھر وہ حنبلی ہیں' پھر مالکی ہیں' پھر وہ حنفی ہیں تو ان میں پھر وہ دیوبندی ہیں۔ یہ بڑے دھڑلے سے کہا جاتا ہے یعنی یہ جو تفرقہ بازی ہے' بڑے فخر سے اس کو بیان کیا جاتا ہے۔

فرقہ بندی کے خلاف قرآن مجید کی یہ تعلیم یہود و نصاریٰ کے لیے ہی نہیں' یہ ہمارے لیے بھی ہے

قرآنِ مجید نے کہا ہے کہ **كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً**(2:143) اس پروگرام کے لیے تمہیں ایک امت' ایک عالمگیر برادری بنایا۔ اب یہ ایک امت ہے' اس کے اندر تفرقہ اور تفریق شرک ہے۔ یہ اسلام نہیں ہوسکتا' الدین نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ **كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ**(42:13) جو لوگ مختلف قوتوں کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں اور قوانین خداوندی کے ساتھ اپنے خود ساختہ قوانین بھی ملاتے ہیں' انہیں تمہاری یہ دعوت بہت ناگوار گزرتی ہے اس لیے اے رسول! یہ جو فرقہ بندی کے اندر گرفتار ہو گئے ہیں' جب تُو ان کو وحدت کی طرف دعوت دیتا ہے تو ان پہ بڑی گراں گزرتی ہے' یہ کہتے ہیں کہ یہ جو یہود و نصاریٰ تھے' یہ اُن کی بات ہے' ان کی نہیں ہے' جب ان سے یہ کہیے کہ فرقہ مٹا دیجیے آپ دیکھیے تو سہی کہ پھر ان کی طرف سے اس کا ردِعمل کیا ہوتا ہے؟ ہر ایک یہ کہے گا کہ پہلے اوناں نوں کہو وہاں جا کے۔ [1] کوئی فرقوں کو مٹانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ **كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ**(42:13) مشرکین کو یہ بات بہت ناگوار گزرتی ہے۔

اب یہ رہا کہ پہلے وہ ایک وحدت کیسے قائم ہوئی تھی؟ کہا کہ **اَللّٰهُ يَجْتَبِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ**(42:13) خدا نبوت کے لیے ایک فرد منتخب کر لیتا تھا۔ ایک وقت میں ایک جگہ دو نبی الگ الگ صاحبِ شریعت نہیں ہوتے تھے' ان کی ایک ہی شریعت ہوتی تھی۔ یہ بات میں دوسری جگہ کہوں گا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور حضرتِ ہارون علیہ السلام ایک ہی جگہ دو نبی تھے' اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی تعلیم ایک دوسرے کے خلاف تھی جو دی گئی تھی' یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ خدا جس کا انتخاب کرتا تھا' وہ اس کو اپنا دین' بذریعہ وحی دیتا تھا' وہ وحدت ہوتی تھی' اس کا یہ انتخاب تمہارے معیاروں کے مطابق نہیں ہوتا تھا۔ تمہارا کام نبی کی وساطت سے دی ہوئی وحی سے راہ نمائی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ راہ نمائی ہر اس شخص کو مل سکتی ہے جو **وَيَهْدِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ**(42:13) برضا و رغبت اسے حاصل کرنا چاہے۔ جو اس کی طرف رجوع نہیں کرتا' اسے یہ راہ نمائی نہیں مل سکتی۔ یعنی جو اس وحی کی رو سے خدا کی طرف راہ نمائی کا راستہ تلاش کرتا ہے اسے ملتی ہے۔ اسی طرح یہ ہیں وہ جو امت بنتی ہے۔ وحی ایک منزل' ایک راستہ' متعین کر دیتی ہے اور پھر یہ جو اس وحی کی رو سے' اس راستے پہ چلتے ہیں' وہ متعین منزل انہیں ملتی ہے۔ اس طرح یہ ایک کارواں' ایک امت' ایک قوم' بن جاتی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ جب دین شروع سے ایک ہی تھا تو پھر مختلف مذاہب کیسے وجود میں آ گئے اور لوگوں میں اس قدر اختلافات کیسے رونما ہو گئے؟ یہ اس لیے نہیں ہوا تھا کہ خدا نے مختلف لوگوں کو مختلف مذاہب دیئے تھے یا اس کی طرف سے نازل شدہ وحی کی روشنی ایسی تھی کہ اس سے اختلافات ہوسکتے تھے۔ بات یہ نہیں تھی۔

---

[1] وہاں جا کر پہلے ان سے کہو۔

بات یہ تھی کہ **وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا ۢ بَيْنَهُمْ** (42:14) لیکن یہ بات لمبی ہے اس لیے یہ آیت پھر آئندہ لیں گے۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الشوریٰ کی آیت 13 تک آ گئے ہیں، 14 ویں آیت سے آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

دوسرا باب: سورة الشوریٰ (آیات 14 تا 21)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1981ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الشوریٰ کی آیت 14 سے ہو رہا ہے: (42:14)۔

دین ایک نظام کا نام ہے، کوئی تصوراتی یا خیالی نظری (Iheoretial) عقیدہ نہیں ہے

اس آیت (42:14) یا اس مضمون کا تسلسل سابقہ آیت کے ساتھ ہے۔ اس کے لیے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ اصول و حقیقت بیان کی تھی کہ شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوحًا وَّالَّذِیْ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى (42:13) دین شروع سے ایک ہی تھا جو تمام انبیائے کرامؑ کی وساطت سے دیا جاتا رہا اور ان سے کہا یہ گیا تھا کہ

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (42:13)) وہ دین کو قائم کریں' Establish قائم کریں۔ گویا پہلی چیز تو یہ ہوئی کہ الدین کوئی محض نظری (Theoretical) چیز نہیں تھی' کوئی وعظ و نصیحت نہیں تھی کہ وہ الفاظ میں بیان کر دی جاتی یا سمجھا دی جاتی۔ جہاں بھی آپ دیکھیں گے تو وہ یہ ہے کہ دین کو Establish قائم کرنے کے متعلق تاکید کی گئی ہے۔ یہ کوئی ایسا نظام ہے جسے Establish قائم کیا جائے گا۔ قائم کرنے کے معنی Establish قائم کرنے کے ہیں۔ کہا یہ تھا کہ وہ دین کا یہ نظام قائم کریں اور تاکید یہ کی گئی کہ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (42:13) اور اس میں تفرقہ نہ پیدا کریں۔ اب یہ جو تاکید ہے یہ ان انبیائے کرام کی امتوں کے لیے ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ دین میں تفرقہ نہ پیدا کرو۔

جہاں الدین ہوتا ہے وہاں فرقہ بندی نہیں ہوتی اور فرقہ بندی شرک ہے کیونکہ فرقہ کسی انسانی شخصیت پر آ کر رک جاتا ہے

یہ ایک ایسی بنیادی حقیقت ہے کہ جہاں الدین ہوتا ہے وہاں تفرقہ نہیں ہوتا۔ قرآن حمید میں الدین کے قیام کے ساتھ یہ کہا ہے کہ اسے Establish (قائم) کریں اور تفرقہ نہ پیدا کریں گویا بنیاد اس کی یہ ہے کہ اگر تفرقہ پیدا ہو جائے' امت کے اندر فرقے بن جائیں تو الدین باقی نہیں رہ سکتا اور جب الدین باقی نہ رہے' تفرقہ پیدا ہو جائے تو اگلی چیز یہ ہے کہ کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِ (42:13) جب تفرقہ پیدا ہو جائے' دین کی مدعی جماعت یا امت کے اندر تفریق پیدا ہو جائے' فرقے پیدا ہو جائیں' تو وہ شرک ہو جاتا ہے' توحید نہیں رہتی۔ توحید یہ ہے کہ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا (3:103) کسی دین کے نام لینے والے یا جس کو یہاں امتِ محمدیہ ﷺ کے متعلق کہا کہ وہ خدا کی کتاب جسے حبل اللہ کہا گیا ہے' وہ سارے کے سارے اس کو مضبوطی سے تھامیں اور وَلَا تَفَرَّقُوْا (3:103)) اور اس میں تفرقہ نہ کریں۔ یہاں بھی کہا کہ تفرقہ پیدا کیا تو توحید گئی' نہ توحید باقی رہی' نہ یہ معاہدات باقی رہے' یہ مشرک ہو گئے۔ توحید کی جگہ شرک آ گیا۔

جیسا کہ میں متعدد بار واضح کر چکا ہوں کہ فرقہ کسی نہ کسی انسانی شخصیت تک جا کر رک جاتا ہے' خدا تک نہیں پہنچتا۔ خدا تک پہنچنے کے بعد بھی اگر تفرقہ رہتا ہے تو یاد رکھیے! دو باتیں ہیں۔ ایک تو (معاذ اللہ) یہ کہنا کہ خدا کا یہ دعویٰ کہ میری کتاب میں کوئی اختلاف نہیں' باطل قرار پا جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر یہ ہو کہ سب کے سب اس کتاب کو تھامے ہوئے ہوں' دین کی سند حجت بنیاد اس کی کتاب ہو' اور پھر امت میں تفرقہ ہو' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کتاب ایسی ہے جس کے ماننے سے تفرقہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس نے قرآن حمید کے متعلق کہا یہ ہے کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے تو وہ تو اس کی دلیل ہے' خدا کی کتاب ہونے

کا ثبوت ہے کہ اس میں اختلافی بات نہیں ہے۔

دو متضاد کیفیات میں الجھی ہوئی قومِ مسلم کے دعویٰ کا تجزیہ

ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ جسے یہ دو منطقی کڑیاں کہتے ہیں' اُن میں ایک تو یہ ہے کہ ایک امت دعویٰ کرتی ہے کہ ہم اس کتاب کے متبع ہیں' ماننے والے ہیں' اس کا اتباع کرتے ہیں اور دوسرا یہ کہ اس کتاب کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔ اب یہ جو کتاب کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں' اس میں تہتر (۷۳) فرقے موجود ہیں تو اس کی دو ہی صورتیں ہیں' جسے Logical Conclusion (منطقی نتیجہ) کہتے ہیں۔ اس کے دو ہی منطقی نتیجے نکلیں گے کہ یا تو اس کتاب کا یہ دعویٰ غلط تھا (معاذ اللہ) کہ اس میں اختلافی بات نہیں ہے اور یا ان کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ ہم اس کتاب کے متبع ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ خدا کی کتاب کو ماننے والا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اس کتاب کا یہ دعویٰ غلط اور باطل ہو (معاذ اللہ)۔ وہ کتاب تو صحیح ہے۔ اب دوسرا ہی نتیجہ باقی رہ جاتا ہے کہ یہ لوگ دین پہ نہیں ہیں' اور جب دین میں تفرقہ پیدا ہوا' وہ شرک قرار پایا' یعنی یہ ایسی حقیقتیں ہیں۔ اور قرآن حمید میں یہ کسی ایک جگہ نہیں کہا گیا بلکہ متعدد مقامات میں یہ کہا گیا ہے کہ جہاں تفرقہ پیدا ہوا' دین گیا اور شرک آ گیا۔ کہا کہ **وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ** (30:31-32) ان سے تاکید کی کہ یاد رکھو! تم بھی کہیں مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا تھا' اور پھر اس سے ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ **كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ** (30:32) ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ میں تو حق پہ ہوں باقی سب باطل پہ ہیں حالانکہ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ جب دین میں تفرقہ پیدا ہوگا تو اس میں سے کوئی بھی حق پہ نہیں ہوتا' یہ اتنی وضاحت سے قرآن حمید نے سب چیزیں بیان کیں۔ میرا جرم یہی تھا کہ میں پہلے دن سے ان مسلمانوں کے اندر ان آیات کو سامنے لا رہا ہوں کہ بابا! ان کی روشنی میں بیٹھ کر اپنے متعلق کچھ فیصلہ کرو' اگر تمہارے یہ فرقے اسی طرح سے رہنے ہیں تو پھر اپنی نسبت قرآن حمید کی طرف نہ کرو۔ اس سے قرآن حمید بدنام ہو رہا ہے' اور اگر قرآن حمید کی طرف نسبت کرتے ہو تو پھر یہ فرقے مٹانے ہوں گے۔ اب نہ فرقے مٹے' نہ قرآن حمید کی طرف نسبت کا جو زبانی دعویٰ تھا' وہی ختم ہوا۔

فرقوں کے جواز کے لیے مکاتیبِ فکر کی پُر فریب اصطلاح

میں یہ چیز اپنی ''میں'' کی بنا پہ نہیں عرض کر رہا۔ جسے ایک گزارشِ احوالِ واقعی کہتے ہیں' ایک حقیقت بیان کرتا ہوں۔ اتنی شد و مد سے یہ چیز گزشتہ تیس برس میں یہاں کہی گئی ہے۔ میں نے کہا کہ ان حضرات سے پوچھیے کہ ان آیات کے معنی کیا ہیں۔ اگر یہ معنی غلط ہیں تو کچھ دوسرے معنی بتا دیجئے' کوئی اور تفسیر بتا دیجیے۔ یہ معنی و تفسیر تھی نہیں تو بتاتے کیا' زچ ہو گئے' کسی نے کان میں پھونک دیا کہ کہو کہ ہم فرقے

نہیں ہیں، مکاتبِ فکر ہیں۔ بس فرقے کو مکتبِ فکر کہا اور مطمئن ہو گئے کہ بس جی! فرقے ختم ہو گئے، وہ شرک والی بات تو گئی، ہم فرقے نہیں ہیں، ہم تو مکاتبِ فکر ہیں۔ اچھا جی، فکر ہے یعنی سوچ کے مختلف مکاتب ہیں جسے انگریزی میں Schools of Thought کہتے ہیں، کسی نے اس کا اردو ترجمہ مکاتبِ فکر کر دیا ورنہ ہمارے ہاں مسلمانوں میں مکاتبِ فکر، اصطلاح ہی نہیں تھی، اب اس لحاظ سے یہ فکری طور پر الگ الگ ہیں۔

ہم تو کعبے کے امام کے پیچھے بھی نماز نہیں پڑھتے

بہر حال فکر میں کچھ تو اختلاف ہو سکتا ہے۔ کوئی بات نہیں ہے لیکن امت میں تو اختلاف نہیں ہونا چاہیے، عمل میں تو اختلاف نہیں ہونا چاہیے جبکہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی مسجدیں الگ الگ ہیں، ان کی نمازیں الگ الگ ہیں، ان کی فقہیں الگ الگ ہیں اور ایسی الگ الگ کہ یہاں کعبے کا امام آیا، اس نے آ کر یہاں کچھ نمازیں پڑھائیں۔ نمازیں پڑھ لیں، اس کے بعد ایک فرقے والوں [1] نے اعلان کیا کہ ہم میں سے جن لوگوں نے اس کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں وہ اپنی نمازیں دہرائیں، وہ باطل نمازیں تھیں۔ صدرِ پاکستان [2] نے ان سے کہا تھا کہ ہمیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے یہ فرقے بندی والی بات چھوڑ دی، آپ اب ہر ایک کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کسی نے آپ کو جھوٹ بولا ہے، غلط بیانی کی ہے، خدا کے لیے ایسی تہمت ہماری طرف نہ لگا دیجیے، یہ ہر ایک کے پیچھے نماز پڑھنا تو ایک طرف، ہم تو کعبے میں جا کر بھی امامِ کعبہ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔

مجھے اس پہ کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں کہتا یہ ہوں کہ اس کے بعد یہ کہنا کہ یہ مکاتبِ فکر ہیں، فرقے نہیں ہیں، صحیح نہیں ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ مَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ (2:9) یہ خدا کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، مومنین کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ یہ سوائے اس کے کہ اپنے آپ کو دھوکا دیں اور کچھ نہیں۔ عزیزانِ من! یہ صرف خود فریبی ہے، خدا کو کیا دھوکا دیں گے یعنی کیفیت یہ ہے کہ حریمِ کعبہ میں جا کر بھی ایک امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جاتی اور کہا جاتا ہے کہ ہم فرقہ نہیں ہیں۔ افطاری یہاں اسی گلبرگ کی ایک کوٹھی [3] کے اندر ایک میز کے اوپر اکٹھی کی جاتی ہے، اس کے بعد مغرب کی نماز کی اذان ہوتی ہے تو اسی میں سے آدھے اٹھ کر ایک طرف چلے جاتے ہیں، دوسرے آدھے دوسری طرف چلے جاتے ہیں۔ وہ وہاں نماز پڑھتے ہیں، یہ یہاں نماز پڑھتے ہیں اور

---

[1] یہ اشارہ شاہ احمد نورانی (2003-1926ء)، سربراہ جمعیت علمائے پاکستان، سربراہ متحدہ مجلس عمل رکن قومی اسمبلی (1970)، کی طرف ہے۔

[2] محمد ضیاء الحق، جنرل (1988-1924ء) صدر پاکستان 16۔ستمبر 1978 تا 17 اگست 1988۔

[3] افطاری کا یہ واقعہ چودھری ظہور الٰہی (1981-1920ء) کی کوٹھی گلبرگ لاہور میں صدر پاکستان ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں ہوا۔ یہ اس طرف اشارہ ہے۔

کہتے ہیں کہ ہم مکاتبِ فکر ہیں' فرقے نہیں ہیں۔ یہ فریب ہے۔ یہ تو سارے مکاتبِ فکر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بھئی! کہو'' کیا فرقے کا بھی کہیں نام آیا ہے یا نہیں؟'' تو کہنے لگے پرویزی فرقہ ہے۔ چل بھئی! کیا کرلو گے' ہم تو فرقہ ہیں ہی نہیں یعنی جن میں نہ کسی فرقے کا نام' نہ اس فرقے کا متبع' نہ ان کی کوئی نماز الگ' نہ روزہ الگ' نہ فقہ الگ' کچھ بھی الگ نہیں' یہ تو فرقہ ہے اور وہ مکاتبِ فکر ہیں جو حریمِ کعبہ میں بھی ایک امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔

پاکستان کے اندر مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی کے بٹوارے کا پیدا کردہ جہنم

عزیزانِ من! یہ خود فریبی ہے' خدا فریبی ہے لیکن خدا کو کیا فریب دیا جاسکتا ہے! قرآن مجید نے جو کہا تھا کہ اس کا نتیجہ اس زندگی میں بھی ذلت وخواری ہوگا اور قیامت میں **اَشَدِّ الْعَذَابِ** (2:85) ہوگا۔ ذلت وخواری تو ہمارے سامنے' ایک چھوٹے سے ملک[1] کے اندر بھی ہے' جسے کل آپ نے ایک مقصدِ عظیم کے لیے حاصل کیا تھا۔ اس میں بھی آپ ایک وحدت قائم نہیں کرسکے' یہ اس لیے کہ اس سیاست میں بھی آپ کے ہاں یا یہ مذہب گھس آیا ہے' یا یہ سیاسی پارٹیاں بنی ہیں۔ مذہبی فرقوں کی بنا پہ' وہ اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ تو الگ ہونے تھے' اہلِ فقہ میں بھی دیوبندی اور بریلوی الگ تھے۔ پہلے وہ جو سیاسی پارٹیاں آپ کی بنی ہیں وہ بھی ان فرقوں کی بنا پہ ہیں' ویسے تو سیاسی پارٹیاں بنتی ہیں' بگڑتی ہیں' مٹتی ہیں' کالعدم قرار پاتی ہیں' اِدھر کے ممبر اُدھر آجاتے ہیں اُدھر کے اِدھر چلے جاتے ہیں' سیاست سیاست تک رہے تو یہ کیفیت ہوتی ہے اور سیاست جب فرقہ میں آجائے تو سوال ہی نہیں کہ کوئی بریلوی کسی دن اٹھ کر دیوبندی سیاست کے اندر آجائے یا اس پارٹی کے اندر آجائے۔ وہ تو فرقے کی پارٹی ہے۔ تمام سابقہ انبیائے کرام کی امتوں سے بھی یہ کہا گیا تھا کہ **وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ** (42:13) تفریق نہ پیدا کرنا' تفرقہ نہ پیدا کرنا۔

فرقہ بندی کے شرک کو چھوڑ کر امتِ واحدہ کے سمندر میں مدغم ہونا ہمیں گراں گزرتا ہے

اس تفرقہ نہ پیدا کرنے پر قرآن مجید نے کہا کہ **كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ** (42:13) اے رسول! انہیں جو تو شرک کو چھڑانے کے لیے وحدت کی طرف بلاتا ہے تو انہیں سخت ناگوار گزرتا ہے۔ یہ جو سابقہ امتیں تھیں' ان کے متعلق ایسی بات ہو رہی ہے۔ حضورؐ سے کہا جارہا ہے کہ ان سے یہ کہنا' ان پہ بڑا گراں گزرتا ہے کہ اپنی اپنی الگ فرقہ بندی کو چھوڑ کر ایک وحدت کے اندر مدغم ہوجائیں۔

---

[1] یہ اشارہ پاکستان کی طرف ہے جسے قرآنی نظام کے قیام کے لیے حاصل کیا تھا۔

فرقوں کے بننے کی وجہ: دوسروں پہ چڑھ دوڑنے کا جذبہ

اب اس کے بعد یہ کہا کہ یہ کیا ہوا جو دین ایک تھا' خدا کی طرف سے جو کتاب بھی ملتی تھی' اس میں کوئی چیز اختلافی نہیں ہوتی تھی تو اس کے بعد ہوا کیا اور اس میں فرقے کیسے بن گئے؟ قرآن مجید کہتا ہے کہ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ (42:14) ایک دوسرے پہ چڑھ دوڑنے کا' دوسروں کو مغلوب کر لینے کا جو جذبہ ہے' اپنے آپ کو دوسرے کے اوپر غالب کر لینے کا' دوسرے کو نیچا دکھا دینے کا' فتح پالینے کا' جو جذبہ ہے' کہا کہ اس کی بنیاد میں یہ جذبہ مضمر ہے۔ ہر فرقے کی کوشش یہ ہے کہ دوسرے فرقے والے کو مغلوب کر کے' فاتح کی حیثیت سے' سینا چوڑا کر کے چلے۔

فاتح کلکتہ کی شان میں مولوی صاحب کا جلوس

میں اس سارے واقعہ کو بھولتا ہی نہیں کہ میں ملازمت کے سلسلے میں' شروع شروع میں' دلی گیا۔ میں تو بچپن سے جسے کہا جاتا ہے کہ مذہبی آدمی تھا' مذہب تو تھا ہی مگر ان چیزوں میں دیکھتا بھی تھا۔ دلی کے سب سے بڑے چاندنی چوک سے ایک بہت بڑا جلوس نکل رہا ہے' جھنڈیاں بھی ہیں' جلوس بھی ہے' ایک مولوی صاحب ہیں جو وہاں پھولوں کے ہاروں سے لدے ہیں' اور نعرے لگ رہے ہیں: یہ فاتح کلکتہ ہے۔ پوچھا کہ یہ فاتح کلکتہ یہاں کون سے آ گئے؟ ہم تو شروع سے ان چیزوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ فاتحِ قادیان مولانا ثناء اللہ مرحوم (1868-1948) تھے' تو ہمیں پتہ تھا۔ مناظرے اس زمانے میں بڑے زوروں پر ہوا کرتے تھے۔ میں نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ صاحب! فاتح کلکتہ یہ مولوی صاحب کو کہہ رہے ہیں۔

یہ مولوی صاحب اہلحدیث تھے۔ کہنے لگے کہ کلکتے میں اہلِ فقہ کے ساتھ کوئی مناظرہ ہوا۔ اس زمانے میں اہلِ فقہ زیادہ تر دیوبندی ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ جو مناظرہ ہوا تو مناظرے میں انہوں نے امام ابوحنیفہؒ (H.80-150/c.699-767) کی شان میں کچھ گستاخیاں کیں اور مذہب میں تو یہ دوسروں کو گالیاں دینا' تہمت تراشیاں کرنا بہت بڑا ثواب سمجھتے ہیں۔ انہوں نے گستاخیاں کیں' مناظرہ تو جیت لیا لیکن اہلِ فقہ والوں نے دعویٰ کر دیا اور کچھ مہینے کی قید ہو گئی۔ کہنے لگے کہ اب یہ جو حضرت صاحب ہیں' قید سے رہا ہو کر' چھ مہینے کے بعد چھوٹ کر تشریف لائے ہیں' جلوس نکل رہا ہے: فاتح کلکتہ کا۔

یہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنا بڑا بننا فرقوں کی بنیاد میں مضمر ہے اور قرآنِ حکیم تو صرف ثواب کی غرض تک محدود ہے

قرآن کریم کہتا ہے کہ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ (42:14) صرف ایک دوسرے کے اوپر چڑھ دوڑنے کی جولانت ہے یہ ہے جذبہ' جو

فرقوں کو مٹنے نہیں دیتا۔ اگر یہ تمام فرقے وحدت کے سمندر میں جا ملتے ہیں' پھر تو سمندر ہی کا نام باقی رہتا ہے' ان کا تو وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس بنا پہ یہ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ (42:14) ہیں۔ یہ جو انانیت کی کیفیت ہے' یہ جو دوسرے کے مقابلے میں اپنا ایک جداگانہ تشخص برقرار رکھنا ہے' ایک بہت بڑا فرد بن کر بیٹھے رہنا ہے' یہ سارا جذبہ اس کی بنیاد میں مضمر ہے ورنہ پہلی قوموں میں تو یہ ٹھیک تھا کہ کتاب اپنی شکل میں نہیں رہی تھی' یہاں تو کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے لیکن موجود ہونا یا اس کا محرف ہو جانا عملاً اس میں فرق کیا ہے؟ کتاب تو ان کے ہاں ثواب کے لیے تلاوت کی جاتی ہے' رمضان میں حافظ اس کو دہراتے ہیں' اس سے زیادہ اور کچھ نہیں اور یہی نہیں کہ اس کا کچھ مصرف نہیں ہے' علی الرغم یہ اس کے خلاف جاتے ہیں' قانون بناتے ہیں' قاعدے بناتے ہیں اور فخر کرتے ہیں۔ یہ ہے جذبہ! اب آپ رجم کو ہی لے لیجیے۔

رجم کی سزا کو خلافِ قرآن مجید کہنے پر ججز کے خلاف علما کی اپیل

وفاقی شرعی عدالت فیصلہ دے رہی ہے کہ رجم کا یہ قانون جو نافذ کیا گیا تھا' قرآن مجید کے خلاف ہے۔ اوشکر کرو کہ ''ایک غلطی'' ہوگئی تھی' وہ کسی غیر نے نہیں کی تھی۔ یہ یہاں کی ایک بہت بڑی وفاقی عدالت میں' سپریم کورٹ کے ججز اس کے اندر تھے' انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ رجم کی سزا خلافِ قرآن مجید ہے انہوں نے یہ بات کہہ دی ہے' اس کو تو مانو۔ اب اس کے خلاف اپیلیں ہو رہی ہیں' ملک میں Agitation (اشتعال) ہو رہا ہے' ان ججز کو برطرف کرایا جا رہا ہے' ان کی جگہ علما حضرات کو ججز مقرر کیا جا رہا ہے کیونکہ ایک خلافِ قرآن فیصلہ کی انہوں نے تردید کیوں کر دی ہے۔

رجم کی سزا اور الگ الگ قرآن و سنت کے باوجود مہلت کا وقفہ ہے

عزیزانِ من! یہ اتنی سی بات نہیں ہے کہ انہوں نے قرآن حکیم کو باندھ کر الگ رکھا ہے' معاملہ تو اس سے آگے یہاں رجم کی سزا تک پہنچ چکا ہے کہ اس سزا کا حکم ہے۔ اب فرمائیے کہ اس کتاب کے اس طرح سے محفوظ رکھنے میں' یا رہنے میں' یا ان کے پاس جو دعویٰ ہے کہ دنیا میں محفوظ کتاب ہے اور کوئی مذہبی کتاب محفوظ نہیں ہے' اس میں اور اُس میں کوئی فرق کیا ہے؟ تمہاری اس محفوظ کتاب کا تمہیں کیا فائدہ ہے؟ اس کے خلاف جاتے ہو' قانون بناتے ہو' تمہاری روش اس کے خلاف ہے تو بتاؤ اس کتاب کے محفوظ ہونے کا تمہیں کیا فائدہ ہے۔ ہماری ان حرکات کی وجہ سے اسلام بھی اور قرآن حکیم بھی' بدنام ہوتا ہے (معاذ اللہ)۔ جب کہا جاتا ہے کہ یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں' یہ قرآن و سنت کے مطابق ہے تو وہ بہر حال نظر آتا ہے کہ ان کے ہاں کی قرآن و سنت ہر ایک کو الگ الگ نوید دیتی ہے' فرقے موجود ہیں' یہ ہر ایک کا دعویٰ موجود ہے۔ مگر قرآن حکیم نے کہا کہ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ

(42:14) جرم تو ایسا تھا کہ اس کے ارتکاب کے بعد ان کا گلا فوراً کاٹ دیا جاتا' انہیں تباہ کر کے رکھ دیا جاتا' یہ اتنا بڑا جرم تھا! اوشرک کوئی چھوٹا جرم ہے! نہیں قرآن حکیم نے شرک کو لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (31:13) کہا ہے' سب سے بڑا جرم' سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ تو کہا اس کے بعد یہ کرنے میں کونسی دقت تھی لیکن ہمارا ایک اصولی قانون ہے اور وہ ہے مہلت کا وقفہ۔ ہم ڈھیل دیتے ہیں کہ اب بھی باز آ جاؤ' اب بھی اپنی حالت پہ غور کرو' اب بھی سمجھ لو کہ اس روش کا نتیجہ کتنی بڑی تباہی ہے' ہم نے تمہارے لیے باز آفرینی کا دروازہ کھلا رکھا ہے' یہ ہے وہ مہلت کا وقفہ جس کے دوران یہ نہیں ہوتا۔

تفرقے سے قوموں کی تباہی' قرآن مجید بطور مھیمن اور نبی اکرمؐ کا دعوتِ توحید کا فریضہ

جب اس کے باوجود کوئی قوم اپنی اسی تباہ کن روش کے اوپر اصرار کرتی ہے تو پھر خدا کے قانون کے مطابق تباہی آتی ہے۔ تاریخ میں کتنی قومیں ہیں کہ صرف ان کے نام ملتے ہیں' قوموں کا نشان نہیں ملتا' اگر کہیں نشان بھی ملتے ہیں تو اس طرح سے ذلیل وخوار ہوتے ہیں اور زندہ قوموں کی صفوں میں ان کا کہیں شمار ہی نہیں ہوتا۔ قوموں کی تباہی کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کچھ تو یقیناً ایسی قومیں ہیں جن کا تاریخ میں صرف نام ملتا ہے' ان کے کوئی بچے کھچے اثرات بھی باقی نہیں ہیں' ایسی قومیں بھی ہیں جو دنیا کے اندر ذلیل وخوار پھر رہی ہیں' اس طرح سے تو قوموں کی تباہی ہوتی ہے۔ سابقہ مذاہب کی جو قومیں تھیں ان کی بھی یہی کیفیت ہوئی۔ وہ اس کے بعد بچ گئیں کیونکہ انہوں نے مذہب چھوڑ دیا' سیکولرازم پہ ہی آ گئیں۔ کہا کہ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (42:14) اپنی کتابوں کے ساتھ انہوں نے یہ کچھ کیا اور تفرقہ پیدا کیا۔ یہ ایک کتابِ عظیم آئی جس نے ان تمام حقیقتوں کو اپنے اندر لے لیا اور پھر ان سے کہا کہ یہی ہے وہ دین' یہی ہے وہ دعوت' جو تمہارے انبیائے کرام نے دی تھی' اسے قبول کرو۔ کہا کہ اس کے متعلق بھی ان کی یہی کیفیت ہے: شکوک وشبہات ہیں' اور اعتراضات اور اختلاف' تخاصم' اور مخاصمت ہے' ان کی یہ روش جاری ہے۔

اب نبی اکرم ﷺ کا فریضہ سامنے آتا ہے' اللہ تعالیٰ کی طرف سے تاکید سامنے آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو سابقہ اہلِ مذاہب نے کیا یعنی یہ جو سابقہ مذاہب تھے' ان کے ماننے والی جو امتیں یا قومیں تھیں' یہ ان کا ذکر ہے کہ وہ اس طرح مخالفت کرتے ہیں' کہ وحدت کے اوپر نہیں آنا چاہتے۔ کہا کہ ان لوگوں کی اس روش سے گھبرانے کی ضرورت نہیں' نہ افسردہ خاطر ہونے کی۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم ان کو یہ سمجھاؤ کہ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ (42:15) تم اسی وحدت کی طرف دعوت دیتے جاؤ' تفرقہ مٹانے کی طرف دعوت دیئے جاؤ۔

فرقہ بندی کے مرض میں مبتلا مریض کو امتِ واحدہ کا عظیم تصور بڑا ہی گراں گزرتا ہے اور اس میں استقامت کی ضرورت ہے

نظر آتا ہے کہ یہ واقعی بڑی سخت مہم ہے جس کے متعلق کہا کہ وَاسۡتَقِمۡ كَمَاۤ اُمِرۡتَ (42:15) جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے اس پہ ثابت قدم رہنا' اس میں استقامت کی ضرورت ہے' تو گویا نظر آیا کہ اس کی اتنی شدت سے مخالفت ہوگی کہ حضور ﷺ کو تاکیداً خدا کی طرف سے کہا گیا کہ یہی دعوت دیتے چلے جاؤ لیکن اس دعوت کے دینے میں' ان کی طرف سے مخالفت کے بڑے بڑے سخت مراحل آئیں گے' مگر تم وَاسۡتَقِمۡ (42:15) اپنے مقام پر جم کر کھڑے رہنا' بڑا صبر آزما مرحلہ ہوگا۔ پہلے کہا تھا کہ كَبُرَ عَلَى الۡمُشۡرِكِيۡنَ (42:13) یہ بات تفرقے پیدا کرنے والوں اور اپنی اپنی جماعتوں کے لیڈر بن جانے والوں پہ بڑی گراں گزرتی ہے کہ ان سے کہا جائے کہ فرقہ چھوڑ دو اور وحدت کے اندر آجاؤ۔ یہ بات بڑی گراں گزرتی ہے' بڑی سخت مخالف ہوگی۔ وَاسۡتَقِمۡ كَمَاۤ اُمِرۡتَ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ (42:15) جس طرح تم سے کہا جاتا ہے' غیر متزلزل عزم کے ساتھ' اسی کے مطابق عمل کیے جاؤ۔ ان کے پاس علم اور دلائل نہیں' یہ ساری جذباتی باتیں ہیں۔ مذہب ہوتا ہی جذباتی ہے' عزیزانِ من! علم و بصیرت اور دلائل و براہین پر مبنی تو دین ہوتا ہے۔

جذبات کے بجائے استدلالی طور پر اور عقل و فکر پر خدا کی طرف دعوت

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِىۡ (12:108) میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں' Rationally (استدلالی طور پر) دعوت دیتا ہوں' Reason (عقل و فکر) پر مبنی دعوت دیتا ہوں: اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِىۡ (12:108) میں بھی یہی کرتا ہوں اور جسے کہا جاتا ہے کہ جو میری سنت کے متبع ہوں گے' ان کا بھی انداز یہی ہوگا۔ جہاں آپ دیکھیں کہ Reason (عقل و فکر) ہاتھ سے چھوٹا اور جذبات آ گئے' سمجھ لیجیے کہ دین کی دعوت نہیں ہے' مذہب کی دعوت ہے' اس لیے کہا کہ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ (42:15) ان کے جذبات کا اتباع نہ کرو۔ یہاں ایک بڑی عظیم حقیقت پہلے بھی آئی تھی' میں نے عرض کیا تھا آج پھر وہ سامنے آ گئی۔

سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ از خود قرآنِ حکیم پر ایمان لانے کا اعلان کرتے ہیں

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وَقُلۡ اٰمَنۡتُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنۡ كِتٰبٍ (42:15) اعلان کرو (آمنت) کہ میں ایمان لاتا ہوں یا ایمان لایا ہوں اس کتاب کے اوپر' جو خدا کی طرف سے مجھے ملی ہے' دوسری جگہ بھی یہ آیا ہے کہ اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ (2:285) رسول اور مومن خدا کی اس کتاب پر ایمان لائے ہیں جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے یعنی

مومنین تو ہمیں معلوم ہے کہ ایمان لاتے ہیں' ایمان لانے کے بعد وہ مومن بنتا ہے۔ان مقامات میں خود رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہے کہ حضور ﷺ بھی اس کتاب کے اوپر ایمان لائے ہیں جو حضورؐ پر نازل ہوئی ہے۔ یہ بڑا غور طلب مرحلہ ہے کہ حضور ﷺ پر خود ایک کتاب نازل ہو رہی ہے' اس کے وحی ہونے میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں ہوسکتا ہے' اس صداقت کو تو حضور ﷺ نے خود قبول کیا ہے' جس سینے کو وحیٔ خداوندی کا مہبط قرار دیا ہے اس پہ تو پہلی دفعہ یہ کتاب نازل ہوئی لیکن اس کے بعد کہا جا رہا ہے کہ رسول بھی اپنی اس کتاب پر ایمان لاتا ہے اور ایمان لانے کے بعد مومن ہوتا ہے اور یہاں کہا گیا کہ اعلان کرو کہ میں اس کتاب پر ایمان لایا ہوں یعنی رسول ایمان لاتا ہے۔

یہ اپنے اوپر نازل ہونے والی کتاب پر ایمان لانا ایک بڑی اہم چیز ہے۔ میں جو کتابیں لکھتا ہوں' جو کوئی کتاب میری فکر کی تخلیق ہوتی ہے مجھے اس پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں ہوتی' وہ میری فکر کی تخلیق ہوتی ہے لیکن جو میری اپنی فکر کی تخلیق نہ ہو' کسی دوسرے کی کتاب ہو' اس کے متعلق مجھ سے پوچھا جاسکتا ہے کہ تم نے وہ کتاب پڑھی ہے' اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ میری اپنی کتاب کے متعلق کوئی مجھ سے نہیں کہے گا کہ تمہارا کیا خیال ہے' دوسرے کی کتاب کے متعلق یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ تمہارا کیا خیال ہے' وہ ٹھیک ہے میں کہونگا کہ نہیں وہ بڑی غلط کتاب ہے۔اس کتاب قرآن کریم پر حضور ﷺ سے بھی کہا گیا کہ ایمان لاؤ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم حضور ﷺ کی فکر کی تخلیق نہیں تھا۔

اگر یہ آپ ﷺ کی اپنی تخلیق ہوتی تو سوال ہی نہیں تھا کہ یہ کہا جاتا کہ اس پہ ایمان لاؤ۔ وہ تو یہ ہوتا کہ وہ جزوی طور پہ دوسرے کے سامنے اپنی تخلیق کو پیش کرتا ہے کہ وہ بڑی سچی چیز ہے جو میں تمہیں دے رہا ہوں۔ اب یہاں تو یہ ہے کہ یہ کسی دوسرے کی کتاب تھی جو حضور ﷺ کو ملی' جس کے لینے کے بعد آپ ﷺ نے اعلان کیا کہ میں بھی اس پر ایمان لاتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن نے صرف اس ایک لفظ کہنے سے یا حضور ﷺ کے متعلق یہ ارشاد کرنے سے کہا یہ ہے کہ اس کتاب پہ ایمان لاؤ

قرآنِ حکیم پر ایمان لانے کی ایک بنیادی اور اہم خصوصیت

ایمان کے متعلق قرآنِ کریم نے مومنوں کی خصوصیت بتائی ہے کہ مومن وہ ہوتا ہے جو خدا کی آیات پر بھی اندھا اور بہرا بن کر نہیں جھکتا' مومن جو ایمان لاتا ہے وہ علی وجہ البصیرت ایمان لاتا ہے' دلائل و براہین کی بنا پہ ایمان لاتا ہے' Rationally (استدلالی طور پر) تسلیم کرتا ہے' وہ Reason (عقل وفکر) کی رو سے اس کو Accept (قبول) کرتا ہے۔ سورۃ فرقان کی یہ (25:73) بڑی اہم آیت ہے۔ کہا ہے کہ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (25:73)۔ مومن کی تعریف (Definition)' خصوصیت یہ ہے کہ اور تو اور جب خدا کی آیات بھی مومن کے سامنے پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بھی بہرہ اور اندھا بن

کر نہیں جھکتا۔

حضور ﷺ بھی قرآن مجید پہ بغیر کسی مجبوری کے ایمان لائے اور انہیں کہا گیا کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو

بات دین پیش کرنے کی ہوئی اور اس کی Basic (بنیاد) کے اوپر، جب حضورؐ سے کہا گیا کہ اس کتاب کے اوپر ایمان لاؤ اور وہ بھی یوں کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (2:256) یہ نہیں ہے کہ مجبور کیا گیا کہ پھر ضرور ایمان لاؤ۔ ایمان لانے کی جو شرائط تھیں، وہ پوری کرنے والی بات ہے۔ ایک تو حضورؐ پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے، اس میں نہ حضور ﷺ کی اپنی فکر کا دخل ہے، نہ اپنی طرف سے دلائل و براہین کا تعلق ہے۔ جب یہ کتاب نازل کر کے کتاب کی طرح باقیوں کے سامنے بھی آئی، حضور ﷺ کے سامنے بھی آئی تو پھر پوری علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی بنا پر اس کی صداقت کو خود حضور ﷺ نے بھی Accept (تسلیم) کیا۔ عزیزانِ من! اور تو اور جتنا بھی میرا علم یا نگاہ ہے، دنیا کے مذہب کی قریباً قریباً تمام مذاہب کی کتابوں کو میں نے دیکھا ہے، کسی جگہ یہ بات نہیں ملی۔ خدا کی طرف سے جو کتابیں نازل ہوئی تھیں، اپنی اصلی شکل میں ان میں تو ہوسکتا ہے کہ یہ ہو۔ میں ان کتابوں کا ذکر کر رہا ہوں جو آج موجود ہیں اور جنہیں مختلف اہلِ مذاہب اپنی مبینہ آسمانی کتابیں کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ کسی میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ جس نے دوسروں کو کتاب دی ہے، جس پہ وہ کتاب نازل ہوئی ہے، اس سے بھی کہا گیا ہو کہ تم بھی اسی طرح سے ایمان لاؤ جس طرح سے اور ایمان لاتے ہیں: وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (42:15) اور اب سب سے پہلے رسول ہونے کی حیثیت سے، پھر اس مملکت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے جو فرائض عائد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ میں تم میں عدل کروں، اب اگر محض مذہب کی بات ہو، وعظ کی بات ہو، تبلیغ کی بات ہو، تو اس میں تو سوال ہی نہیں کہ میں تم میں عدل کروں۔ یہ تو ایک نظامِ عدل قائم کیا جائے گا اور اس نظام کے سربراہ کی حیثیت سے پھر یہ صورت ہوگی۔ حضور ﷺ کو حکم ملا ہے کہ ان لوگوں میں عدل کرو۔ کئی مقامات میں یہ چیز آئی ہے کہ تمہارے پاس یہ اپنے متنازع معاملات، مقدمات لے کر آئیں گے، ان میں عدل کرو اور عدل کے متعلق کہا ہے کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48) خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرو تو عدل ہو۔ رسول اللہ ﷺ خود بھی ان متنازع فیہ معاملات کا فیصلہ قرآن کی رو سے کیا کرتے تھے کیونکہ قرآن کا یہ حکم ہے۔

کتاب وسنت کی اصطلاح کا تجربہ

عزیزانِ من! ضمناً عرض کروں کہ جو آج کہا جاتا ہے کہ کتاب وسنت کے مطابق یہ کرو، اس میں ایک چیز کھلے بندوں قرآن حکیم کے

خلاف ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی چیز قرآن حکیم کے مطابق نہیں تو پھر سنت کو دیکھو۔ اگر اس کے مطابق ہے تو پھر سنت کے مطابق عمل ہونا چاہیے۔ یہ جو تمہیں نظر آتا ہے کہ قرآن حکیم کے خلاف ہے، یہ تمہاری نگاہ کی غلطی ہے، نبی اکرم ﷺ نے جو کیا ہے تو انہوں نے ٹھیک سمجھا تھا، یہ بات قرآن حکیم کے، خلاف نہیں ہوسکتی۔ دلیل ملاحظہ فرمایئے جبکہ کتاب ان کے سامنے موجود ہے۔ اس سنت کے خلاف ایک چیز یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ نے خود آپ کو نہیں دی، دوسواڑھائی ❶ سوسال کے بعد، وہاں سے کوئی احباب وحضرات اٹھتے ہیں، وہ واجب التکریم ہیں، ٹھیک ہے، انہوں نے بڑا کام کیا ہے، کوئی بخارا ❷ سے آتا ہے، کوئی نیشاپور ❸ سے آتا ہے۔ یہ جو آپ کے ہاں حدیث کی چھ کتابیں صحیح ترین کہی جاتی ہیں، انہیں سب سنی صحاح ستہ مانتے ہیں۔ شیعوں کی چار الگ ہیں، یہ سنیوں کی چھ ہیں۔ یہ جو ان چھ کتابوں کے چھ ❹ جامعین ہیں ان میں کوئی بھی عربی نہیں ہے، سارے ایرانی ہیں، یعنی عربی مسلمانوں میں سے کوئی ایسا اٹھا ہی نہیں کہ کم ازکم وہ حدیثوں کو ہی جمع کر لیتا۔ پھر جو جمع کرنے والے ہیں، ان کے ہاں سب سے اونچی کتاب امام بخاری کی گنی جاتی ہے۔

دوسوسال کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ نے چھ ہزار روایات اکٹھی کیں

امام (محمد اسمٰعیل) بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے دوسوسال بعد رسول اللہ ﷺ کی روایات یا حدیثیں جمع کرنے کے لیے لوگوں سے پوچھنا شروع کیا۔ حدیثوں کا اس سے پہلے کوئی written record (تحریر مواد) موجود نہیں تھا، تحریری رواج ہی نہیں تھا۔ یہ جو آپ راوی کہتے ہیں، اس کے معنی ہیں ''زبانی روایت کرنے والا'' تو ٹھیک ہے ہم مانتے ہیں کہ بہت بڑا معرکہ تھا،

---

❶ ان امور کی تفصیل، تدوین اور جامعین کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج، پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005، ص ص۔ 202,201 تا 242۔ نیز انہی صفحات کے فٹ نوٹ۔

❷ امام محمد اسمٰعیل بخاریؒ (194-256ھ) کا وطن بخارا تھا۔ آپ جامع صحیح بخاری ہیں۔

❸ مسلم بن حجاجؒ (204-264ھ) کا وطن نیشاپور تھا۔ آپ جامع صحیح مسلم ہیں۔

❹ یہ چھ جامعین حدیث یہ ہیں:

(۱) امام محمد اسمٰعیل بخاریؒ (194-256/60ھ): صحیح بخاری

(۲) امام مسلم بن حجاج (204-261ھ): صحیح مسلم

(۳) امام ابوعیسیٰ محمد ترمذی (209-279ھ): جامع ترمذی

(۴) امام ابوداود (203-275ھ): سنن ابی داود

(۵) ابوعبداللہ بن ماجہ (؟-273ھ): سنن ابن ماجہ

(۶) امام عبدالرحمٰن نسائی (؟-303ھ): سنن نسائی

ان کے دل کے اندر بڑا جذبہ تھا' انہوں نے ایسا کچھ کیا' یہ انسان کا ایک جذبہ ہوتا ہے۔ بخاری رحمہ اللہ صاحب کہتے ہیں کہ چھ لاکھ کے قریب مجھے یہ روایات ملیں' ان میں سے میں نے اپنی بصیرت کے مطابق جو انتخاب کیا' وہ قریباً تین ہزار ہیں' ویسے تو اس میں چھ ہزار ہیں لیکن اگر مکررات نکال دی جائیں' ایک ہی چیز دو دو تین تین جگہ بھی لکھی ہوئی ہے' تو وہ قریباً تین ہزار بنتی ہیں' تو چھ لاکھ میں سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی بصیرت کے مطابق' اپنی رائے کے مطابق قریباً تین ہزار کے متعلق کہا کہ یہ صحیح ہوسکتی ہیں یعنی رسول اللہ ﷺ کی سند ان تین ہزار کے ساتھ بھی نہیں ہے' امام بخاری رحمہ اللہ کی رائے میں وہ صحیح ہوسکتی ہیں۔

روایات کے تحت کفر اور ایمان کا معیار خود معیار پر بھی پورا نہیں اترتا

اب اہلحدیث کی طرف سے عقیدہ پیش کیا جارہا ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی انسان کو اسلام کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی؟ گویا یہ ہم پہ لازم کیا جاتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کی اس رائے کے اوپر ایمان لائیں جس کے مطابق انہوں نے اس حدیث کو کہہ دیا تھا کہ یہ صحیح ہے تو یہ تو ایمان لانے والی بات ہے یعنی ان کی رائے کے متعلق اگر کہا جائے کہ میں اسے صحیح نہیں سمجھتا تو آپ اسلام کے دائرے سے خارج ہوجاتے ہیں۔ سوچیے' عزیزانِ من! یہ کیا مذہب ہے' یہ کیا دین ہے؟ ایک شخص کی رائے کے متعلق یہ کہنا کہ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا ہوں' آپ اسلام کے دائرے سے خارج ہوگئے۔ اوہ! خدا نے انبیائے کرام علیہم السلام تک تو ایمان لانے کا حکم دیا تھا۔ ٹھیک ہے' میں نے کہا ہے کہ چلیے' ان کا احترام ان کی بزرگی' اپنے مقام پہ سہی' لیکن ان کو یہ مقام دینا کہ ان کی رائے میں جو بات انہوں نے کہی کہ میں اسے صحیح سمجھتا ہوں تو سوچو کہ وہ کس طرح صحیح سمجھتا ہے۔ ہر حدیث سے پہلے قال کہا جاتا ہے کہ فلاں نے یہ کہا' فلاں نے یہ کہا' اس نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سنا تو حدیث میں لکھا ہوتا ہے: قال رسول اللہ ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے ایسا کہا اور جہاں حدیث ختم ہوتی ہے اس کے بعد لکھا ہوتا ہے: او کما قال رسول اللہ ؐ یہ یا جیسا رسول اللہ ﷺ نے کہا ہو۔

امام (محمد اسمٰعیل) بخاریؒ ان احادیث کے متعلق بھی جنہیں اس نے اپنی رائے سے صحیح قرار دیا ہے' یقینی طور پہ نہیں کہتا کہ یہی ہے جو رسول اللہؐ نے فرمایا تھا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ یا جیسا انہوں نے فرمایا ہوگا۔ ٹھیک ہے انہوں نے بھی یہ کہا کہ بہرحال میری رائے میں یہ بات ہے لیکن اب اس کے متعلق یہ تاکید ہورہی ہے' آپ کے ہاں عقیدہ بن رہا ہے کہ یہ کہنا کہ انہوں نے جو فلاں روایت کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ صحیح ہے' میں اس سے انکار کرتا ہوں' تو اس انکار سے وہ اسلام کے دائرے سے خارج ہوجاتا ہے۔ یہ کتنی بڑی شخصیت پرستی ہے۔ یہ باتیں آپ کے ہاں کہیں آتی نہیں ہیں' بتائی نہیں جاتیں' مگر ایسا ہی۔ انہوں نے کتاب وسنت کی ایک اصطلاح خود وضع کی اور پھر اس

حدیث کو نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر دیا۔ کون کافر ایسا ہے جو یہ حضورؐ کا فرمان یا حضورؐ کی سنت کا انکار کرے۔ میں نہیں مانتا کہ یہ کچھ کوئی کہہ سکتا ہے اور پھر وہ اسلام کا دعویٰ کر سکتا ہے' امتِ محمدیہؐ کا ایک فرد ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے' نہیں' بالکل نہیں۔ او! بات تو یہ ہے کہ وہ بات رسول اللہؐ کی یا حضورؐ کی نہیں' وہ تو امام (محمد اسمٰعیل) بخاری کی رائے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس کا انتخاب کیا اور میری رائے میں یہ ہے' میں نے سمجھا کہ یہ جو باتیں ہیں صحیح ہو سکتی ہیں کیونکہ او **کما قال رسول اللہ** تو وہ خود کہہ رہے ہیں اور ہر حدیث کے بعد یہ لکھا ہوتا ہے۔

حکمِ خداوندی ہے کہ اے رسول! تُو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کر

قرآن یہ کہتا ہے کہ **وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ** (42:15) حضورؐ خود کتاب پر ایمان لا رہے ہیں' حضورؐ کی طرف سے اعلان ہو رہا ہے کہ میں اس کتاب کا اتباع کرتا ہوں' صرف اس کتاب کا جو میری طرف وحی ہوئی ہے۔

عزیزانِ من! حضور ﷺ کو حکم دیا جاتا ہے کہ تمام معاملات کے فیصلے اس کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔ یہ تو ایک کسوٹی اور معیار بڑا آسان تھا اور یقینی بھی تھا کہ حضور ﷺ کی طرف جو فیصلے منسوب کیے جاتے ہیں قرآن حمید کے آئینے میں انہیں دیکھ لیا جائے کیونکہ حضورؐ کو قرآن مجید کا حکم تھا کہ آپ ﷺ ہر معاملے کا فیصلہ قرآن کے مطابق کریں تو جتنے معاملات کے فیصلے حضور ﷺ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں ان کو قرآن حکیم کی کسوٹی پہ دیکھ لو۔ جو اس کے مطابق ہوں ہم کہیں گے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہو سکتے ہیں' اور جو اس کے خلاف جائے اس کو تو بلا توقف ہمیں کہنا چاہیے کہ یہ حضور ﷺ کا ہو نہیں سکتا' حضور ﷺ قرآن حمید کے خلاف کوئی فیصلہ دیتے ہی نہیں تھے' دے سکتے ہی نہیں تھے' لیکن یہاں اتنا ہی نہیں ہے کہ ان کے متعلق کہا جائے کہ یہ فیصلے اختلافی ہیں۔ وہاں تو بہر حال کتاب و سنت سے یہ عقیدہ منوایا جاتا ہے کہ اگر قرآن میں اور حدیث میں اختلاف ہو تو حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ حضور ﷺ کا تو ایمان ہے کہ **وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ** (42:15)۔ یہ قرآنِ مجید کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں' ان میں عجیب احکام ہیں۔ کہا ہے: کہہ دو کہ مجھ پر اللہ نے جو ضابطۂ قوانین نازل کیا ہے' میں اس کی صداقت پر یقین محکم رکھتا ہوں' مجھے حکم دیا گیا ہے کہ عدل کرو اور قرآن میں عدل کی Definition (تعریف) دی ہوئی ہے کہ **بِهٖ يَعْدِلُوْنَ** (7:18) خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ ہے تو وہ عدل کا فیصلہ ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک عدل کا معیار وہ فیصلہ ہے جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہو

ایک تو عدالت کا نظام ہوتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ یہ فیصلہ صحیح عدل کے مطابق ہے۔ وہ تو ملک کے قانون کے مطابق جج فیصلہ دے تو وہ عدل ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ یہ سوال نہیں ہے کہ وہ عدل ہے۔ اگر وہ قانون ہی عدل پر مبنی نہیں ہے تو اس کے مطابق فیصلہ عدل

کیسے کہلا سکتا ہے؟ یہاں تو یہ ہے کہ بِهٖ يَعْدِلُوْنَ (7:18) قرآن کے مطابق جو فیصلہ ہے وہ عدل ہے وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) اور جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہیں دیتا یا نہیں کرتا یا حکومت قائم نہیں کرتا' ان کو کافر کہا جاتا ہے۔ یہ قرآن حکیم کی آیت ہے۔

پرویزؒ کی وہ آواز جو تیس سال سے بلند ہو رہی ہے' وہ قرآنِ حمید کی آواز ہے

عزیزانِ من! پرویزؒ [1] کے خلاف کفر کے فتوے عائد کر دینے اور ایک فرقہ بنا دینے سے یہ آیات تو نہیں مٹ جاتیں۔ ان کی تکنیک یہ تھی کہ لوگ ان آیات کی طرف نہ آنے پائیں۔ عزیزانِ من! میں کسی فخر سے یہ بات نہیں کرتا' ایک حقیقت ہے کہ تیس سال سے' یہیں سے' یہ آواز اٹھ رہی ہے کہ بابا! آپ کے پاس سب سے مقدم معیار خدا کی کتاب ہے' اس کے اوپر ہر چیز کو پرکھتے چلے جاؤ۔ یہ آواز نہیں بلند ہونے دیں گے' اس آواز کے خلاف اتنے زور شور سے یہ پروپیگنڈہ کیا ہے کہ کسی کے سامنے بھی اب قرآن حمید کی بات یا عقل و فکر کی بات کیجیے تو دوسرا کہتا ہے کہ یہ پرویزی نظر آتا ہے۔ یہ کہا اور سننے والے نے بھی کہا کہ ہاں صاحب! چھوڑیئے' یہ تو ایک فرقہ پرستانہ بات ہے یعنی اس کی بات جو قرآن حمید کی دعوت دیتا ہے اور عقل کی دعوت دیتا ہے' وہ تو فرقہ پرستانہ ہے اور جو خالصتاً فرقے کی بات ہے جو نماز بھی دوسرے کے ساتھ نہیں پڑھتے' وہ فرقہ نہیں ہے۔ یہ نہ پرویز کے خلاف کوئی بات ہے' عزیزانِ من! نہ اس کا کوئی فرقہ ہے۔ بات ساری یہی ہے کہ

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

قرآن کریم نہ کہیں دنیا کے سامنے آ جائے۔

پرویزؒ کے ایام زندگی' پرویزؒ کی زبانی

عزیزانِ من! میرا زندگی کا آخری دور ہے۔ پتہ نہیں یہ باتیں دوبارہ کہہ سکوں یا نہ کہہ سکوں' مجھے اس میں لینا کیا ہے' میری ساری زندگی قوم کے سامنے ہے' آپ احباب کے سامنے ہے' میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کمایا' میں نے کوئی فرقہ نہیں بنایا' میں نے تو جماعت بھی نہیں بنائی۔ یہ جماعت اسی لیے نہیں بنائی کہ کہیں اس میں تفرقہ نہ آ جائے' کوئی بات ایسی نہ ہو جائے۔ اتنی

---

[1] جی اے پرویزؒ (1985-1903) کے خلاف کفر کے فتوے کے لیے دیکھیے پمفلٹ کافرگری' ادارہ طلوعِ اسلام لاہور' جس میں پرویزؒ اور مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم (1929-1984ad) کے مابین خط و کتابت شامل ہے اور یہ بھی کہ مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم نے 25 مارچ 1062ء کے لکھے گئے پرویزؒ کے مکتوب کا کوئی جواب نہیں دیا۔

سی بات ہے کہ حق اور صداقت کا جو معیار ہے وہ صرف خدا کی کتاب ہے۔ یہ میرا جرم ہے' قرآن حمید کہہ رہا ہے کہ کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِكِيْنَ (42:13) یہ بات انہیں بہت ناگوار گزرتی ہے۔ یاد آیا' کیا بات بیچ میں آ جاتی ہے' بڑے خوبصورت شعر ہوتے ہیں:

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا

ہم میں اور تم میں رب قدرِ مشترک ہے' قانونِ مکافاتِ عمل کارفرما ہے اور جانا اسی فیصلے پر ہے

بڑے اعلان پہ اعلان چلے آ رہے ہیں۔ یہ وہی کہہ سکتا ہے جو دنیا میں یہ کہے کہ اللہ ربنا وربکم (42:15) میرا رب اللہ ہے' کوئی اور نہیں ہے۔ اور تمہارا بھی وہی ہے۔ یہ اس کی شرط ہے۔ وہی قرآن مجید کی بات کہہ سکتا ہے' وہی عدل کر سکتا ہے۔ کہا کہ میرا ہی نہیں' تمہارا رب بھی وہی ہے' میں اسی لیے تم کو یہ دعوت دے رہا ہوں کہ تم میں اور مجھ میں یہ قدرِ مشترک ہے: وہ ایک ہی رب ہے تمہارا بھی اور میرا بھی' میں اس کی طرف دعوت دیتا ہوں' اپنی طرف تو دعوت نہیں دیتا' اپنے آپ کو تو میں رب نہیں کہہ رہا' میرا بھی رب وہی ہے۔ واہ واہ کیا اپنا مقام بتایا ہے! اٰمَنْتُ (42:15) کہہ کر تو باقیوں کے مقابل لے آئے اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ (2:285) یعنی رسول اپنے آپ کو یہ کہہ کر مومنین کے مقام پہ لے آتا ہے اور ربنا و ربکم کہہ کر باقیوں کے مقابلے میں بھی اپنے آپ کو اسی سطح پہ لے آتا ہے: میرا بھی وہی رب ہے' تمہارا بھی وہی رب اور ہم تو سارے ایک ہیں' میں تم میں سے اونچا نہیں ہوں' میں کوئی اور دعوت نہیں دیتا' تم سے کوئی اور اقرار نہیں لیتا' میں ایمان لا رہا ہوں اس کتاب پہ' تم بھی لاؤ' میرا رب بھی وہی ہے' تمہارا رب بھی وہی ہے' اور پھر اگلی بات سن لو کہ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (42:15) جہاں تک کام اور اعمال کا تعلق ہے' جو ہمارے اعمال ہیں وہ ہمارے لیے ہیں' تمہارے تمہارے لیے ہیں' نہ تم ان میں سے کچھ چھین سکتے ہو' نہ میں تمہیں کچھ دے سکتا ہوں' ہمارے اپنے کام کی ذمہ داری ہم پہ ہے' تمہارے کام کی ذمہ داری تمہارے اوپر ہے۔ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (42:15) او بابا! تم میں اور ہم میں کوئی حجت بازی ہی نہیں ہے۔ بات تو میں صاف صاف کر رہا ہوں: یہ کتاب ہے' اس کو دیکھ لو' جی ٹھکتا ہے تو اس پہ ایمان لے آؤ' اس کے بعد بات ہو گئی کہ دنیا میں رب صرف اس ایک کو ماننا ہوگا۔ تمہارا ہمارا دونوں کا آقا وہی ہوگا' عدل اس کتاب کے مطابق ہوگا' نتائج اعمال کے تمہارے تمہارے لیے ہوں گے میرے میرے لیے ہوں گے' ذمہ داریاں الگ الگ ہیں اور اس کے بعد تم میں اور مجھ میں کوئی حجت ہی نہیں ہے اور اس سب کے بعد کہا کہ اس کے باوجود اگر تم مخالفت سے باز نہیں آتے' مخاصمت کیے چلے جاتے ہو' لڑائیوں پہ لڑائیاں ہو رہی ہیں' ہجرت کر کے ہم مدینے آ گئے ہیں' یہاں بھی ہمیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتے ہو' تو خیر پھر اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا (42:15) پھر تو

تم نے اور ہم نے ایک مقام میں اکٹھا ہونا ہی ہے۔ کیا بات ہے اس اکٹھے ہونے کے مقام کی! کہا کہ وَاِلَیۡهِ الۡمَصِیۡرُ (42:15) آخر میں پانی نے نشیب میں جانا ہے' اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے ایسا ہونا ہے' تم نے' ہم نے' سب نے' وہاں اس مقام کے اوپر جانا ہے' وہاں فیصلہ ہو جائے گا' میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے ہی فیصلہ ہو جائے' اس معاملے کو وہاں تک نہ پہنچاؤ' لیکن اگر تم باز نہیں آ ؤ گے تو پھر وہاں تک تو معاملہ پہنچے گا جو کہ آخری بات ہے۔

انا اول المسلمین ہونے کے دعویٰ کے بعد کی وارننگ

جن لوگوں کا فیصلہ میدانِ جنگ میں ہوگا تو یہ کہا کہ وَالَّذِيۡنَ يُحَآجُّوۡنَ فِى اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا اسۡتُجِيۡبَ لَهٗ حُجَّتُهُمۡ دَاحِضَةٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٌ وَّلَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ ❶ (42:16)۔ اب تو یہ بات بھی نہیں رہی کہ جب رسول اللہؐ نے پہلی دفعہ کہا تھا کہ اَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ (6:163) میں سب سے پہلا مسلم ہوں تو یہ ایک ہی آواز تھی۔ اس دوران میں بھی تم نے دیکھا ہے اور اب کتنے ہی تمہارے ساتھی' تم میں سے ہیں' تمہارے بھائی بندوں میں سے ہیں' وہ اس کو قبول کر چکے ہیں۔ میری نہیں سنتے تو ان سے پوچھو کہ بھئی! تم نے اسے کیوں قبول کر لیا' ان کی تو بات مانو گے لیکن اس کے باوجود تم نہ میری بات سنتے ہو' نہ ان سے پوچھتے ہو' نہ عقل وفکر کی طرف آتے ہو' ضد چلی آتی ہے' تو پھر یہ جو تمہاری روش ہے یہ تو بڑی باطل' بےکار' کمزور ہے۔ یہ حقائق کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گی' نہ دلائل کے سامنے ٹھہر سکتی ہے۔ وہاں تمہارے جذبات آ جاتے ہیں اور مقابلے میں بھی آ ؤ گے تو ہمیں یقین ہے کہ ہم جو حق کی آواز لے کر اٹھے ہیں تو یہ یقیناً غالب آئے گا۔ کہا کہ عَلَيۡهِمۡ غَضَبٌ وَّلَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ (42:16) بہت سخت تباہی آئے گی۔

انسان کا ہر عمل میزان میں تولا جائے گا

یہ سخت تباہی اس لیے ہے کہ اَللّٰهُ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ وَالۡمِيۡزَانَ (42:17) کتاب نازل کی' حق کے ساتھ نازل کی اور اس کے ساتھ وہ نظام عدل بھی' جس کو قرآن مجید نے میزان کہا۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے جو میزان کہا گیا ہے۔ وہ جو اعمال کہا تھا وہ تلنے کی نسبت سے بات ہوتی ہے۔ ہر عمل کا ایک وزن ہوتا ہے اور قرآن مجید کا معیار یہ ہے کہ فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (99:7-8) ہر انسان کا جو ہر عمل ہے وہ تولا جاتا ہے یعنی یہ تشبیہ سمجھانے کے لیے ہے'

---

❶ جن لوگوں کا فیصلہ میدان جنگ میں ہوگا' یہ وہ ہوں گے جو نظامِ خداوندی کے بارے میں برابر جھگڑتے چلے جائیں گے حالانکہ بہت سے لوگ اسے علی وجہ البصیرت قبول کر چکے ہوں گے (اور یہ اس قدر وضاحت سے سامنے آ چکا ہوگا کہ اس میں جھگڑنے کی گنجائش ہی نہیں ہوگی)۔ ان کا یہ جھگڑا قانونِ خداوندی کی رو سے' بالکل باطل اور بیکار ہوگا۔ ان کی ظالمانہ کوششیں' جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائیں گی اور انہیں سخت ترین تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 1130)۔

تولنے کی بات، بڑی عمدہ ہوتی ہے، اگر وہ دھرم کانٹا ہو، میزان ہو حق کے اوپر مبنی، اور ہر چیز وہاں تلتی ہو تو پھر اس کے نتیجے دیکھنے میں کوئی شک اور کسی قسم کی دقت ہی پیش نہیں آسکتی کہ کتنا ہوا۔ یہ دھرم کانٹا صرف تولے اور ماشے تک ہی نہیں بتاتا بلکہ یہ تو رتیاں تک بتا دیتا ہے لہٰذا یہ مخالفین خود دیکھ لیں گے کہ ان کی مخالفت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ قرآن کریم نے کہا کہ **وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ** (42:17)۔ میں نے **الساعۃ** کا قرآنی مفہوم کئی دفعہ بتایا ہے۔

الساعۃ کا مروّجہ مفہوم اور اس کے مضمرات

عزیزانِ من! الساعۃ کا ترجمہ تو ہمارے ہاں قیامت کیا جاتا ہے اور جب قرآن حکیم میں یہ بات آجائے کہ قیامت قریب ہے تو پھر اس کے بعد ہمارے ہاں وہ سلسلہ چلا آتا ہے کہ چودھویں صدی قربِ قیامت تھی پھر شروع سے آخر تک اس کی نشانیاں بتائی جاتی تھیں اور چودھویں صدی میں یہ تھا کہ وہ قیامت آجانی ہے۔ وہ جو چودھویں صدی تھی، وہ بھی گزر گئی۔ اس کے گزرنے کے بعد اب پندرھویں صدی کے لیے جشن منائے جاتے ہیں شاید اس لیے کہ وہ ختم ہوئی اور اس کے جانے کے بعد یہ پندرھویں صدی ہے۔ یہ سارے دن ہیں۔ یہ تو حساب شمار کے لیے ہیں۔ یہ جو زندگی کے دن ہیں یہ گز کے اوپر گرہیں لگی ہوئی ہیں، محض آسانی کے لیے حساب وشمار کی ہیں، ان کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں ہے، کسی دن کوئی اہم کام کر جاؤ تو اس دن کی اہمیت ہے ورنہ دن ہے، مہینے ہیں، سال ہیں صدیاں ہیں لیکن ایک تو اس بیچاری چودھویں صدی کو انہوں نے اتنا کوسا کہ ہر ایک کو ڈر آتا تھا کہ پتہ نہیں کیا ہو جانا ہے۔ یہاں تو غنیمت ہے، یہاں تک ہی رہا۔ عیسائیوں کے ہاں تو انہوں نے Calculate (حساب شمار) کر کے قیامت کا سن مہینہ دن سال مقرر کر رکھا تھا۔

اس تاریخ کا آپ کو شاید علم نہیں۔ یورپ میں تین چار دفعہ ایسا ہوا کہ پادریوں نے قیامت آنے کی ایک تاریخ بتائی۔ اس تاریخ کے جو ماننے والے تھے، وہ اس سے پہلے ہی گھر بار چھوڑ کر جنگلوں میں چلے گئے، گویا قیامت جنگل میں نہیں آئے گی، شہر میں آئے گی۔ وہ نہ آئی تو انہوں نے کہا کہ او ہو یار! گھپلا لگ گیا، حساب اچ، غلطی لگ گئی۔ پھر دوبارہ حساب کرنا شروع کر دیا۔

دیہات میں ہمارے مسجد کے مُلّا بیچارے ہوتے تھے، وہ بھی پڑھے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ گاؤں والے ہر بات ان سے ہی پوچھتے تھے، کیلنڈر وہاں ہوتا نہیں تھا، تاریخ بھی ان سے پوچھا کرتے تھے کہ آج کونسی تاریخ ہے۔ اب مولوی صاحب کے پاس کونسا کیلنڈر یا جنتری یا کتاب تھی جس میں وہ لکھ کر رکھتے ہوں۔ انہوں نے تکنیک اختیار کی۔ انہوں نے اندر ایک مٹکا رکھا ہوا تھا۔ گاؤں میں چھوٹا مٹکا رکھا ہوتا، اور چیزیں ہوتی نہیں تھیں، بکری کی سوکھی ہوئی مینگنیں تھیں، وہ ہر دن جا کر وہ مینگنیں اس مٹکے میں ڈال دیتے تھے۔ جب کوئی تاریخ پوچھنے آتا تو اس مٹکے میں جا کر مینگنیں گن لیتے اور آکر بتا دیتے کہ آج (مثلاً) گیارہ تاریخ ہے۔ ٹھیک ہے دھندہ چلتا تھا، وہ ایک

دن بکری کھل گئی۔ ان کی Absence (عدم موجودگی) میں وہ گئی' اندر جا کے اتفاق ایسا ہوا کہ وہ مٹکا کھلا تھا' اس نے اس مٹکے کے اندر مینگنیں کیں' اب دو تین دن کے بعد کوئی پوچھنے کے لیے آیا۔ وہاں جا کر انہوں نے گنا تو وہ قریباً ڈیڑھ سو بنتی تھیں۔ کہنے لگے کہ بھئی! یہ تو بہت ہی زیادہ ہو گئیں بات اتنی تو نہیں بنتی۔ اس نے کہا جی' کیوں کیا بات ہے؟ کہنے لگے کہ کچھ نوے تاریخ ہے آج۔ کہنے لگے کہ مولوی صاحب نوے بھی ہوتی ہے؟ کہنے لگا میں اگر کتاب کے مطابق بتاتا تو ڈیڑھ سو ہوتی' شکر کریں میں نے رعایت کر دتی اے۔ وہ یورپ کے پادری یہ کیا کرتے تھے۔ پھر کہتے تھے حساب غلط لگ گیا۔ بکری نے مینگناں کر دتیاں۔ دو تین مرتبہ انہوں نے یہ کچھ کیا تھا' اس کے بعد لوگوں نے کہا کہ فٹے منہ تہاڈا۔ ہمارے ہاں بھی ساعۃ کا ترجمہ قیامت کیا اور قریب تو قرآن میں لکھا ہوا تھا' اب وہ قیامت قریب تو آ نہیں رہی' وہ قربِ قیامت آپ کے ہاں اصطلاح تھی' پھر اس کا وہ انتظار کرتے تھے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک الساعۃ یا قُربِ قیامت کی عملی تفسیر

عزیزانِ من! قرآن حکیم کی رو سے یہ جو یہاں کہا ہے کہ آخر الامر پھر ایک دن میدانِ جنگ میں اکٹھا ہونا ہے۔ وہ انقلاب کی گھڑی ہے۔ قرآن حکیم اُس کو الساعۃ کہتا ہے اور کہا کہ وہ کوئی دور نہیں ہے' یاد رکھو! بہت قریب ہے اور وہ ہجرت کے دوسرے ❶ ہی سال قریب آ گئی' وہ آ ہی گئی پھر تیسرے ❷ سال بھی وہ آ گئی' وہ تو ہر سال ❸ اتنی قریب آتی چلی گئی تھی کہ اس کے اندر سات برس بھی نہیں گزرے' عزیزانِ من! کہ مکہ فتح ❹ ہو گیا۔ یہ تھی الساعۃ جو آئی تھی' یہ تھا انقلابِ عظیم جو برپا ہوا تھا' اسی کے لیے کہا تھا کہ تم یہ کہتے ہو کہ وہ آتی کیوں نہیں ہے۔ کہا کہ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا (42:18) یہ بڑی جلدی مچاتے ہیں۔ ان سے کہو کہ وہ عید کا چاند نہیں ہے جو تم کہتے ہو کہ صاحب! تیس کا تو کچھ مزا ہی نہ آیا' انتیس کا ہوتا تو بات ہوتی عید کی۔ او! ان سے کہو کہ اتنی جلدی کیوں مچا رہے ہو' کمبخت کوئی اپنی تباہی کے لیے بھی جلدی مچاتا ہے' سوچو کس بات کے لیے جلدی مچاتے ہو۔ ہم تمہیں مہلت کا وقفہ دیتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ نہیں صاحب! آج ہی کیوں نہیں آ جاتی۔ وہ کیا عید ہے جس کے لیے جلدی مچا رہے ہو؟ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا (42:18) اور جو لوگ اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں وہ تو اس کے تصور سے بھی کانپ اٹھتے ہیں کہ اس قسم کا وہ جو انقلاب ہے' وہ جو میدانِ جنگ ہے' اس میں کس قدر صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑے گا اس لیے وہ اس سے خائف رہتے ہیں بہرحال وہ دونوں طرف سے ہوتا ہے' وہ جانتے ہیں کہ الساعۃ کیا چیز ہے۔ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ (42:18) انہیں یہ یقین ہے کہ یہ بات جو قرآن حکیم کہتا ہے وہ حق ہے' وہ ہو گا۔ اس

---

❶ سترہ رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء کی صبح بدر کے میدان میں دو صفیں ایک دوسرے کے سامنے نبرد آزما تھیں۔ یہ ہے جنگ بدر کی وہ الساعۃ

❷ 14 شوال 3ھ مطابق 29 مارچ 625ء کو۔ یہ ہے جنگ احد کی وہ الساعۃ

❸ ذیقعدہ 5ھ۔ یہ ہے جنگ احزاب کی وہ الساعۃ۔ پھر ذیقعدہ 6ھ۔ یہ ہے جنگ حدیبیہ کی وہ الساعۃ' پھر 7ھ۔ یہ ہے غزوۂ خیبر کی وہ الساعۃ

❹ رمضان 8ھ مطابق جنوری 630ء۔ یہ ہے فتح مکہ کی وہ الساعۃ۔

انقلاب کا آنا ایک حقیقت ہے۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی بے سروسامانی کا عالم مگر انقلاب عظیم کا کہا جاتا رہا

اسی طرح کہا کہ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ (42:18) جو لوگ اس السَّاعَةِ کے اندر یقین نہیں رکھتے' اس انقلابِ عظیم کے متعلق نہیں سمجھتے کہ یہ کیا ہے' وہ بہت بڑی گمراہی میں ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا آخری فیصلہ اس السَّـاعَةِ میں ہی جا کر ہونا ہے' اس انقلابِ عظیم میں ہی جا کر ہونا ہے اور یہ ہو کر رہے گا۔ یہ بہت بڑی چیز تھی۔ پہلے تو مکے کی زندگی کے اندر یہ کہنا' جہاں تعداد کے لحاظ سے بھی کمی تھی اور ان بیچاروں کی یہ جماعت اتنی کمزور تھی کہ ان میں سے تو وہاں وہ ایک ایک کو بہت زیادہ مارتے تھے' پیٹتے تھے' پھر مدینے کی زندگی میں جسے ہماری اصطلاح میں پناہ گزین کہتے ہیں' یہ جو مسلمان تھے' وہ پناہ گزینوں کی سی حیثیت سے وہاں گئے تھے' خود مدینے کے اندر بھی جو مسلمان تھے وہ زیادہ کاشتکار لوگ تھے پہلے یہ قریش جنہیں کہا جاتا ہے وہ بہت بڑی عسکری حیثیت رکھتے تھے' فوجی حیثیت رکھتے تھے' جو مدینے والے تھے ان کی کیفیت یہ تھی۔ ان کے ہاں جا کر یہ مہمان ہوئے تھے۔ وہاں جا کر بھی یہ جو قرآن کریم کا اعلان تھا' ہوتا رہا تھا کہ ان سے کہہ دو کہ مخالفت نہ کریں' اس کا انجام ان کی تباہی ہوگا' اس زمانے میں یہ بات کہنا بڑی چیز تھی۔ کہا کہ جو اس پہ یقین رکھتے ہیں ان کو معلوم ہے۔ آگے بات مہلت کے وقفے کی آئی۔ اس مہلت کے وقفے میں دیکھا یہ گیا اور ہم دیکھیں گے کہ جو لوگ بھی ہر قسم کے جائز اور ناجائز طریقوں سے فائدہ اٹھائیں' ان کو یہ دنیاوی دولت رزق مال واسباب بہت زیادہ حاصل ہو جاتی ہیں۔ اور اس مقام میں تو جو قریش تھے وہ ان کے مقابلے میں بڑے متمول تھے' تاجر تھے' بہت کچھ تھا۔ یہ پہلے ہی غریب تھے' مدینے میں آنے کے بعد یہ بے سروسامان لوگ تھے۔

خدا کا نظامِ ربوبیت ہمہ گیر اور غیر جانبدار وہ اپنے قوانینِ فطرت میں مومن اور کافر کی کوئی تخصیص نہیں کرتا

ایک بات آج بھی ہمارے دلوں میں آتی ہے' اس زمانے میں تو آتی ہوگی کہ یہ لوگ جو خدا کے قانون کو نہیں مانتے' خدا کو نہیں مانتے' ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں' مخالفت کرتے ہیں' وہ ہم سے زیادہ خوشحال ہیں' تو یہ خدا کی مخالفت بھی کر رہے ہیں' وہ خدا کچھ اور نہ کرے ''کم از کم اینا دی روٹی تے کھولے ایناں دے کولوں'' ❶ کہا کہ او ''تہاڈا رب اینا تھوڑ دلائیں ہیگا۔'' ❷ کیا بات ہے اس رب کی! ''اینا تھوڑ دلائیں ہیگا'' ❸ کہ اس کا انکار کیا تو وہ روٹی چھین لے۔ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ

---

❶ کم از کم ان سے ان کی روٹی تو چھین لے۔

❷ تمہارا وہ رب اتنے چھوٹے دل کا مالک نہیں ہے۔

❸ اتنے چھوٹے دل کا مالک نہیں ہے۔

اَلْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ (42:19) قوت بھی ہے' غلبہ بھی ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ رزق کے متعلق' سامانِ زیست کے متعلق' جو ہمارا قانون ہے' ہم اس بناپر' اس قانون کی خلاف ورزی کریں کہ یہ ہمیں مانتے کیوں نہیں ہیں۔ یہ تو پھر فرعونیت ہی ہوئی جس نے کہا کہ **اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی** (79:24) جو تم میں سے مجھے مان لے کہ میں رب ہوں' اس کو فراوانیاں ہوں گی اور جو انکار کرتا ہے ان کو وہ افلاس اور ذلت اور خواری ہوگی۔ یہ تو وہ بات ہے۔ لطیف بڑا عجیب لفظ ہے۔ کہا کہ اس باب میں ہم کچھ سخت نہیں ہیں' سنگدل نہیں ہیں' بہت نرم ہیں۔ اور پھر ہمارے ہاں کا یہ قانون' وہ ہے جس کو کہتے ہیں کہ بڑی باریک بینی سے آگے چلتا ہے۔ قانون یہ ہے: **یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ** (42:19)۔

اب یہاں یہ بات جو قرآن کریم میں بار بار سامنے آتی ہے اور میں ابھی اسے پیش کرتا ہوں' پہلے اس کو سمجھ لینا چاہیے۔ یہ ہماری دنیاوی زندگی' فطرت کے یہ جتنے قوانین ہیں' ان کے مطابق چلتی ہے۔ جو قوانین فطرت ہیں وہ مشینوں کی طرح چلتے ہیں۔ انسان کی زندگی سانس لینے پہ ہے۔ وہ عبداللہ کے لیے بھی اسی قسم کا ہے جس قسم کا ہرنام داس کے لیے ہے' جس قسم کا رنجیت سنگھ کے لیے ہے۔ ان کے لیے ایک ہی قانون ہے یعنی سانس پر زندگی کا انحصار ہے اور اس میں مومن اور کافر کی تمیز نہیں ہے۔ زہریلی ہوا ہے' مومن بھی اگر اس میں سانس لیتا ہے تو اس کی موت ہو جائے گی' اس سے کافر بچتا ہے اگر وہ صاف ہوا میں رہتا ہے' وہ زندہ رہے گا۔ کفر اور ایمان کا امتیاز یہاں نہیں ہے۔ صاف اور مصفا پانی پیتا ہے' صحت کی احتیاط کرتا ہے' اپنی حفاظت کرتا ہے' اگر وہ کافر یہ کرتا ہے تو اس کی صحت بھی اچھی رہے گی' اور اگر مسلمان اس کی احتیاط نہیں کرتا تو اس کا خمیازہ بھگتے گا یعنی جو فطرت کے قوانین (Laws of Nautre) ہیں وہ انسانوں کے لیے ہیں۔ وہاں مقام کفر اور اسلام کی تمیز کا نہیں ہے۔ یہ بات آگے جا کر آتی ہے۔ کہا کہ یہ جو رزق کا حاصل ہونا ہے' یا یہ جو ان کافروں کو دولت ملتی ہے' رزق کی فراوانی ملتی ہے تو یہ کس قانون کی رو سے ہے؟ کہنے لگا کہ یہ طبعی قوانین (Physical Laws) ہیں' فطرت کے قوانین (Laws of Nautre) ہیں' یہ من یشآء ہیں' جو اُن کے مطابق لینا چاہتا ہے' اس کو وہ ملتا ہے' ہم اتنے تنگ نظر نہیں ہیں کہ یہ دیکھیں کہ یہ جو کھیت ہے' یہ عبداللہ کا کھیت ہے' اچھا ٹھیک ہے بھئی! ''اور کوئی گل نئیں' او ہل واہندا اے یا نئیں واہندا ہیگا۔''[1] وہ عبداللہ جو ہوا' ہمارا بندہ ہوا' ٹھیک ہے اس کے کھیت سے تو پچاس من فی ایکڑ کی نکلے گی۔ ''اچھا اے نال جیہڑا ہیگا اے کہ جی! اے دھرم سنگھ دا ہیگا۔ اے واہی جائے' جینا واہنا چاہندا ہیگا اے کرے۔''[2] جتنی محنت جی چاہتا ہے لیکن ہمارا انکار کرنے والا ہے اس لیے اس کے

---

[1] اور کوئی بات نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ وہ زمین میں ہل چلاتا بھی ہے یا نہیں۔

[2] یہ جو اس کے ہمسائے میں ہے' کہ جی! یہ دھرم سنگھ کا ہے۔ اچھا! تو یہ ہل چلاتا جائے جتنا چلانا چاہتا ہے۔ یہ بھلی یہ کچھ کرتا رہے۔

کھیت سے گیہوں نہیں اگے گا۔ اگر یہ بھی قوانینِ فطرت کے مطابق کاشت کرتا ہے تو اس کے کھیت سے اس سے بھی دگنا اگتا ہے' یہ نہیں ہے کہ وہ ہمارا انکار کرتا ہے اس لیے اس کے کھیت سے گیہوں نہیں نکلے گا۔ ہم یہ چیزیں نہیں کریں گے۔

ماحمل میں کفر اور ایمان کی حدِ فاصل کو قائم کرنے کا طریق' پرکھ اور قرآنِ کریم میں اس کی مثال

کہا کہ مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ حَرۡثَ الۡاٰخِرَۃِ نَزِدۡ لَہٗ فِیۡ حَرۡثِہٖ وَمَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ حَرۡثَ الدُّنۡیَا نُؤۡتِہٖ مِنۡہَا وَمَا لَہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنۡ نَّصِیۡبٍ (42:20) یاد رکھو! ایک چیز اس دنیا کی دولت ہے' اس کے ہے سامانِ رزق چاہیے۔ یہ اس دنیا کے قوانینِ فطرت کی رو سے حاصل ہوتا ہے۔ اِس کے حاصل کرنے میں کفر اور ایمان کا فرق نہیں ہے۔ جب یہ چیز حاصل ہوتی ہے تو اس کے بعد ان کا مصرف کس طرح سے کیا جائے؟ یہاں کفر اور ایمان آتا ہے۔ مومن وہ ہے جو اس حاصل شدہ کو خدا کے احکام واقدار کے مطابق استعمال میں لاتا ہے' کافر وہ ہے جو اپنے اغراض ومقاصد کے لیے ان کو صرف میں لاتا ہے۔ یہ جو خدا کے قوانین کے مطابق صرف میں لاتا ہے جسے ہم نے اسلام یا مومن کہا ہے' اس کا ایمان یہ ہے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے' یہ آگے بھی چلتی ہے۔ میں یہاں جو کچھ خدا کے احکام کے مطابق دوسروں کو دیئے جاتا ہوں' اس میں سے مجھے اس زندگی کے بعد کی زندگی میں اس سے کہیں زیادہ ملے گا۔ بس یہ فرق ہے۔ وہ دوسرا اس پر ایمان نہیں رکھتا' وہ اسی زندگی میں سب کچھ لینا چاہتا ہے۔ کہا کہ جو اس زندگی میں لینا چاہتا ہے' ہم اسے اس کے مطابق دیئے جاتے ہیں۔ جو اِس زندگی میں اور اُس زندگی میں' دونوں میں ساتھ' لینا چاہتا ہے اس کو بھی ہم دیئے جاتے ہیں اور جو اس زندگی ہی میں فطرت کے قوانین پر عمل نہیں کرتا ہے وہ مومن ہو یا کافر ہو' وہ محروم رہ جاتا ہے۔ یہ جو حضور ﷺ نے کہا تھا کہ عدل کرو' آپ نے دیکھا کہ خدا کا عدل کس طرح سے ہو رہا ہے۔

اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں سورۃ بنی اسرائیل میں (17:18) میں ہے اور وضاحت سے بات کی گئی ہے۔ کہا کہ مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡعَاجِلَۃَ عَجَّلۡنَا لَہٗ فِیۡہَا مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِیۡدُ ثُمَّ جَعَلۡنَا لَہٗ جَہَنَّمَ یَصۡلٰىہَا مَذۡمُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا (17:18) جو صرف اسی زندگی کو زندگی سمجھتا ہے' فطرت کے قوانین ہی کو قوانین سمجھتا ہے' اس سے آگے نہ اگلی زندگی کی ارتقائی منازل پر ایمان رکھتا ہے' نہ خدا کے احکام واقدار کو مانتا ہے لیکن محنت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا فوراً مجھے نتیجہ مل جائے' کہتا ہے کہ ہم اس کا نتیجہ اس کو دیدیتے ہیں۔ فطرت کے قوانین کے مطابق اس نے ہل چلایا ہے' کھیتی کی ہے' اچھا بیج ڈالا ہے' پانی دیا ہے' حفاظت کی ہے' اس کی کھیتی بار آور ہوگی' اس کو ملے گا وَ مَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَۃَ وَ سَعٰی لَہَا سَعۡیَہَا وَ ہُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعۡیُہُمۡ مَّشۡکُوۡرًا (17:19) یہ دوسرا جو اس کے مطابق کام کرتا ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی حیاتِ آخرت کی زندگی پر بھی ایمان رکھتا ہے' اور یہاں پھر ہمارے احکام کے مطابق اس کو صرف کرتا ہے' یہاں اس کو ملتا ہے' وہاں بھی اس کو ملے گا اور یہ ہے قرآن کریم کا وہ اصول' عزیزانِ من! بڑا عام ہے۔ کہا کہ

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ (17:20)۔ہم مومن اور کافر دونوں کو اس کی محنت کے مطابق بدلہ دیئے چلے جاتے ہیں اس لیے کہ یہ عطائے رب ہے۔ یہاں صاحب! کیا لفظ آیا ہے' یہ عطائے رب ہے جس کے لیے ہم نے قوانین مقرر کر دیئے ہیں' اِن کے مطابق تم کھیتی کرو گے۔ یہ ہماری عطا ہے۔

لفظ عطا کا قرآنی مفہوم: عطیہ کے آگے پھاٹک لگا دینا خدا کی شان نہیں

عزیزانِ من! یہاں (18:20) میں ''عطا'' کہا اور کہا کہ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (17:20) وہ عطا عطا ہی نہیں ہوتی جس کے سامنے پھاٹک لگا دیئے جائیں کہ تم آگے نہیں جا سکتے' وہ جا سکتا ہے۔ کہنے لگا کہ پھر وہ عطا کیا ہوئی! ہم اپنی عطا کے سامنے پھاٹک نہیں لگایا کرتے کہ یہاں سے عبداللہ تو جا سکتا ہے' رنجیت سنگھ نہیں جا سکتا' یہ نہیں ہوتا کہ کافر کو اُس کی پوری کوشش کے باوجود پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا جائے اور مومن کو خواہ وہ کوشش ہی نہ کرے آگے بڑھا دیا جائے۔ زندگی کی اس دوڑ میں کافر اور مومن دونوں کے لیے یکساں طور پر میدان کھلا ہے' یہ تو عطائے رب ہے۔ کہا کہ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (17:21) اس اصول کے مطابق دیکھو کہ اس دنیا کے رزق اور دولت میں کون اپنی سعی و عمل کے مطابق آگے بڑھ گیا اور کون پیچھے رہ گیا ہے۔ اس سے جہاں آ کر فرق پڑتا ہے' وہ مستقبل کی خوشگواریاں ہیں۔ اِس کے مطابق یہ ہے کہ وَ لَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا (17:21) وہ جس نے اس کے ساتھ آخرت کو بھی ذہن میں رکھا ہے' وہاں دیکھنا یہ ہے کہ اس کے فضائل اور اس کے مدارج کتنے ہوتے ہیں' وہاں وہ پیچھے رہ جائے گا جس نے اس دنیا میں مفادِ عاجلہ پہ نظر رکھی' اس طرح اس دنیا کے اندر جو ہمارے قوانینِ فطرت (Laws of Nature) کے مطابق محنت کرتے ہیں' ہماری طرف سے ان کے لیے عطا ہے' ہم نے زمین کے اندر رزق کے جو خزائن رکھ چھوڑے ہیں' وہ اس طرح نکلتے ہیں کہ جو نکالتا ہے ہم اس کو دیئے چلے جاتے ہیں۔ یہ عطائے رب ہے اور عطیہ کے آگے پھاٹک لگا دینا تو خدا کی شان نہیں ہے۔ یہ بڑا پیارا خدا ہے۔

خدا کے قوانین میں انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی ملاوٹ شرک ہے

عزیزانِ من! کہا کہ یہ تھے ہمارے قوانین اور ایک کتاب قرآنِ کریم! اس کتاب کو تھامنے والے' اس پر ایمان رکھنے والے' اس پر عمل کرنے والے' ایک امت امتِ واحدہ ہے' جس میں کوئی تفرقہ نہیں' کوئی کسی قسم کا اختلاف نہیں' کوئی فرقہ نہیں' کوئی سیاسی پارٹی نہیں۔ فطرت کے قوانین کے مطابق عمل کر کے اس دنیا کی قوت اور حشمت کو حاصل کر کے' یہ سب کچھ کرنے کے بعد' پھر ہمارے اقتدار و احکام کے مطابق اسے صرف کریں' تا کہ ان کی اگلی زندگی بھی سنور جائے۔ یہ ہے ایک نظام جو ہم نے بنا کر دیا ہے۔ یہ ہے الدین جو خدا کی

طرف سے ملا ہے عزیزانِ من! قرآن کریم میں خدا یہ کہتا ہے کہ ہم اپنے اس نظام میں' اپنے قانون میں' اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتے: وَ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26) کسی کو شریک نہیں کرتے۔ شرک یہی نہیں ہے کہ بتوں کی پرستش کی تو وہ شرک ہو گیا اور اپنے ذہن میں ہم نے ایک خدا کے تصور کے مطابق پرستش کی تو وہ توحید ہو گئی۔ توحید صرف خدا کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا' اور عمل کرنا اور حکومت قائم کرنا اور عدل کرنا ہے۔ اگر اس میں کسی اور کو شریک کیا جائے گا' ملا لیا جائے گا تو وہ شرک ہو جائے گا وہ توحید نہیں رہے گی' وہ نظامِ خداوندی نہیں رہے گا اور ظاہر ہے کہ خدا کے قوانین میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو داخل کیا جائے گا تو یہ شرک ہو گا۔ یاد رکھیے! خدا کے قوانین کے ساتھ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو وہی مقام دیدینا کہ وہ غیر متبدل ہیں' قیامت تک ہیں' شرک ہے اور شرکِ عظیم ہے۔

خدا کا شریک کون ہے اور کس طرح ہے؟

سنیے! کن الفاظ میں قرآن حکیم کہتا ہے کہ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (42:21) جن کو ہم خدا کے شریک کہتے ہیں' وہ کون ہیں؟ یہ وہ ہیں جو ان کے لیے مذہب کے' شریعت کے' قوانین بنا کر دیتے ہیں' احکامِ شریعت بنا کر دیتے ہیں' وہ انسان خدا کے شریک ہیں' خدا کے لیے بتاؤ اے اس کتاب کے ماننے والو! ان آیات کو کہاں لے جاؤ گے؟ یہ تو ماننے والوں کی بات ہے۔ ان سے ہی پوچھو کہ اس کے معنی کچھ اور بھی ہیں؟ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (42:21) خدا نے اس کی اجازت نہیں دی تھی۔ کہا کہ یہ جو تفرقہ پڑتا ہے' فرقے بنتے ہیں' تفریق ہوتی ہے' خدا کی کتابِ واحد کے اوپر چلنے سے تو کبھی یہ نہیں ہوتا یہ تو انسانوں کی شریعت کے قوانین وضع کرنے والے سے ہوتا ہے۔ اس کے کرنے سے فرقے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ہے شرک۔ دنیا کے جتنے مذاہب ہیں' عزیزانِ من! ان کے پاس جہاں جہاں کوئی ضابطہ قوانین ہے بھی' وہ سارے قوانین انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب کی جو ساری کتابیں ہیں' اول تو ان کی یہ ہیں ہی نہیں۔ ان پہ محض ذہنی اعتبار کے اوپر ایمان محض ذہن کی بات ہے۔ ان کے ہاں کی چیزیں' یہ وید' یہ تمام جنہیں یہ آسمانی کتب کہتے ہیں' ان کے ہاں کے یہ سارے ضوابط قوانین' انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔

عیسائیت کے اندر تو قانون ہے ہی نہیں۔ ان کے جتنے کچھ بھی ضوابط ہیں' وہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے دیئے ہوئے نہیں ہیں' سینٹ پال [1] کے دیئے ہوئے ہیں۔ یہودیوں کے ہاں تورات پر کوئی عمل نہیں ہے' ان کے ہاں جو ان کے احبار و رہبان نے' جو قوانین بنائے ہیں مثلاً تالمود اور مشنا (Mishnah) وغیرہ' ان کے اوپر ان کا عمل ہے اور یہ سب انسانوں کے بنائے ہوئے۔

---

[1] سینٹ پال (5-67AD)۔

ہمارے ہاں کے قوانینِ شریعت انسانی فکر کا نتیجہ ہیں

یہ مسلمان قوم، جس کی کتاب قرآنِ مجید محفوظ رکھی گئی، اسے بار بار کہا گیا کہ اس کتاب کے ساتھ سب کے سب (جمیعاً) وابستہ رہنا، کسی اور کو شریک نہ کرنا۔ ہمارے ہاں بھی جتنے قوانینِ شریعت ہیں، یہ سارے انسان کے بنائے ہوئے ہیں عزیزانِ من! ان کی نسبت ہی آپ دیکھیے کہ مثلاً فقہ حنفی اس کی نسبت امام ابوحنیفہؒ ❶ کی طرف ہے، فقہ شافعی، اس کی نسبت امام شافعیؒ ❷ کی طرف ہے، فقہ حنبلی اس کی نسبت امام احمد بن حنبلؒ ❸ کی طرف ہے، فقہ مالکی اس کی نسبت امام ❹ مالکؒ کی طرف ہے۔ اس کے بعد بھی جتنے اور ان کی تفسیریں تاویلیں کرنے والے ہیں وہ سارے امام ہیں۔ عزیزانِ من! کسی انسان کی کسی دور کی بھی کوئی فکر یا ان کے بنائے ہوئے قوانین کبھی ابدی اور غیر متبدل نہیں ہوسکتے، یہ خصوصیت تو صرف خدا کے قوانین کی تھی: **وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ** (6:115) وہ صرف اس نے کلمات اللہ کے لیے کہا ہے کہ یہ غیر متبدل رہیں گے، ان میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو غیر متبدیل قرار دے کر آنے والے زمانے کے لیے انہیں ابدی طور پر انسانوں کے اوپر منطبق کر دینا صریحاً باطل ہے۔ خدا کے بندے، خدا کے غلام، خدا کے عبد، اس کے محکوم، تو ہم بنے ہی خدا پر ایمان لانے سے ہیں، یعنی اس کے غیر متبدل قوانین پر ایمان لانے سے بنے ہیں۔

پرویزؒ کی کہانی، پرویزؒ ❺ کی زبانی

عزیزانِ من! یہ کہاں کی چیز ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے بھی ہم محکوم اور عبد بنیں، ان پہ ایمان لانے کا تو خدا نے ہم سے نہیں کہا۔ ٹھیک ہے کہ اگر کسی انسان کا بھی کوئی قول یا کوئی بات جو قرآن کریم کے مطابق ہے قابلِ قبول ہے، اس لیے نہیں کہ وہ اس انسان کا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ قرآن کریم کے مطابق ہے، نبی اکرم ﷺ کی طرف بھی جو آپ کی روایات احادیث منسوب کی جاتی ہیں ٹھیک ہے اگر وہ قرآن کریم کے مطابق ہیں تو ہم کہیں گے کہ ہاں صاحب! یہ صحیح ہوسکتی ہیں، مرکزی مقام اس کو حاصل ہے لیکن اس کے برعکس یہاں صورت یہ ہے کہ یہاں قرآن کریم کو تو کوئی آنے ہی نہیں دیتا، ساری فقہیں جو انسانوں کی بنائی ہوئی ہیں، وہ آتی ہیں۔

---

❶ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (80-150ھ بمطابق 699-767ء)

❷ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (عسقلانی، مکی (150-204ھ)

❸ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (بغدادی)۔ (164-341ھ)

❹ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ (یمنی، مدنی) (93-179ھ)

❺ جی۔اے۔ پرویزؒ (1903-1985ء)

اب اہلِ حدیث حضرات کہتے ہیں کہ ہم تو فقہ کو مانتے ہی نہیں ہیں۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ وہ جو مانتے ہیں وہ تو امام بخاریؒ (60/256-194ھ) کی آراء ہیں جوانہوں نے کہا کہ یہ احادیث ہیں۔ میں سمجھتا ہوں صحیح ہے۔اس پر تو ایمان ہے' لیکن کتاب اللہ پر ایمان نہیں ہے۔سارا جھگڑا ہی یہ ہے اور میں اسی لیے یہ بار بار عرض کرتا ہوں۔اس سے سمجھ لیجیے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ یہ ہے۔ میرا کوئی فرقہ نہیں' کوئی پارٹی نہیں' کوئی جماعت نہیں' نہ ہی میں سیاست میں حصہ لیتا ہوں' ان میں سے صاحب! کچھ نہیں۔کوئی الگ نمازیں نہیں ہیں' نہ روزے ہیں' نہ کوئی فقہ الگ ہے' کچھ نہیں صاحب! لیکن صرف اتنی سی چیز ہے جو میں کہتا ہوں کہ صحیح اور غلط' حق اور باطل کے لیے معیار اور کسوٹی' خدا کی کتاب ہے۔ہر وہ چیز جس کو تم دین یا مذہب کے ساتھ نسبت دیتے ہو' اس کو اس کسوٹی پہ پرکھ کر دیکھ لو۔جو خدا کی کتاب قرآنِ کریم کے مطابق ہے' وہ قابلِ قبول ہے' جو اس کے خلاف جاتی ہے وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔میں صرف اتنی بات کہتا ہوں۔

عزیزانِ من! میں اور کچھ نہیں کہتا' میرا کوئی فرقہ نہیں۔جو فرقے کو شرک کہتا ہے کیا وہ خود فرقہ بنائے گا؟ قطعاً نہیں۔سوچو تو سہی' میں نے تو اپنے عہدِ جاہلیت کی ساری نسبتوں کو سوائے قرآن کریم کے' پہلے ہی جلا دیا **فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا** (2:256)۔جو قرآن کریم کی طرف آنا چاہتا ہے سب سے پہلے ہر غیر قرآنی نظریہ' تصور' مسلک' عقیدے' کو خیر باد کہے' اُس سے انکار کرے' اس سے کفر کرے' پھر اسے وہ حق حاصل ہے کہ قرآن کریم کا نام لے۔سمجھ لو کہ اُس نے ایسے محکم سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔میں تو تا بہ کمر نہیں' بلکہ جیسے تھوڑی تک کہتے ہیں' انسان پرستیوں کے اندر ڈوبا ہوا تھا' میں تو شریعت کے مقام کے اندر اس دوہرے طاغوت میں تھا' یہی جو فرقے ہیں ان میں' میں بھی حنفی تھا۔آپ کے ہاں جسے طریقت کہتے ہیں' تصوف میں اور چیزیں ہیں' میں ان میں اتنا ہی نہیں تھا کہ میں بھی صوفیاء کا مرید تھا' ان کے اندر صاحب! میرے اپنے مرید تھے۔میں تو وہاں تھا یہ تو اس کے بعد پھر کیا بات ہوئی! اس کا فضل و کرم ہوا۔اور میں کیا ہوں' میں ان تمام چیزوں کو چھوڑ کر ادھر آیا ہوں' علیٰ وجہ البصیرت آیا ہوں' ایک دن میں نہیں آ سکتا تھا' اِدھر آنے میں قریب دس سال کا عرصہ لگا۔مجھ کو یہ یاد ہے کہ جس دور سے میں گزرا تھا اس میں وہ ساری چیزیں' جتنی بھی تھیں' وہ ساری غلط نظر آتی تھیں۔صحیح اور صداقت کی بات ابھی سامنے نہیں آئی تھی' قرآن کریم ابھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔وہ جو کہ کشمکش کا زمانہ گزرا ہوا ہے' وہ آج بھی یاد کرتا ہوں' عزیزانِ من! آگ لگ جاتی ہے' بڑی استقامت چاہتا ہے' یہ جو زمانہ یا دور تھا لیکن اللہ کا احسان ہے کہ ایک ایک چیز کو چھوڑا' علیٰ وجہ البصیرت چھوڑا' جب کسی کو مانا علیٰ وجہ البصیرت مانا اور اب بھی قرآن کریم کی جو چیز پیش کرتا ہوں' اللہ کا احسان ہے کہ وہ دلائل و براہین کی رو سے پیش کرتا ہوں' اندھی عقیدت کی بنا پہ نہیں پیش کرتا۔جس کو سمجھا تا ہوں دلیل کی رو سے سمجھتا تا ہوں۔یہ اس کا فضل اور رحمت ہے۔

عزیزانِ من! سن رکھیے اور اس کے گواہ رہیے۔یہ ہے میرا ایمان' یہ ہے میرا مسلک۔اس کے سوا جو کچھ میری طرف منسوب کیا

جاتا ہے وہ باطل کا پروپیگنڈہ ہے میری ذات کے خلاف نہیں میں تو ان کا رقیب بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ سب اس لیے ہے کہ قرآن کریم کی بات کہیں مسلمان کے سامنے نہ آجائے سورج چڑھا تاریکی ختم ہوگئی لیکن یہاں تو سب متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہیں کہ اس کو چڑھنے نہیں دیا جائے گا وہ تو چڑھ کر رہے گا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (9:33) مشرکین پر یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے یہ قرآن حمید غالب آکر رہے گا۔ اس ایمان کے بھروسے پر عزیزانِ من! جیتا ہوں۔ ضروری نہیں کہ یہ میری زندگی میں ہو اور یہ بھی کیا شرط ہے کہ میری ہی زندگی میں ہو۔ میری زندگی کیا ہے؟ میرا کام یہ ہے کہ جس چیز کو قرآن کریم کی رو سے سچ سمجھتا ہوں اس کو پہنچائے چلا جاتا ہوں۔ یہ انسان کے اوپر فریضہ ہے کہ جس کو قرآن کریم سمجھ میں آئے وہ اسے دوسروں تک پہنچائے میں اس سے باز اس لیے نہیں رہ سکتا کہ یہ مجھ پہ قرآن کریم کا عائد کردہ فریضہ ہے کہ یہ کہے چلا جاؤں۔ جو کچھ اس کے بعد مجھے بھگتنا پڑا ہے وہ میں بھگت رہا ہوں۔ یہ اس توحید کا نتیجہ ہے۔ آپ احباب کا شکریہ کہ آپ آکر سن تو لیتے ہیں۔ اس بھری ہوئی دنیا کے اندر میں تنہا یتیم رہ گیا ہوں ورنہ میرے جو Contacts (تعلقات) ہیں وہ تو پوچھو نہیں۔ ابھی وہ احباب موجود ہیں جن کو میری دفتر کی وہ زندگی معلوم ہے اہم سے اہم کام بھی اپنے نہیں اپنا تو کبھی کسی کو کہا ہی نہیں کرتا تھا اس زمانے میں بھی یہ شکر تھا سارے احباب اپنے کام لے کر آتے تھے دفتر میں بیٹھا ہوا صرف ٹیلیفون کر دیا کرتا تھا اور لوگوں کے وہ کام ہوجاتے تھے لیکن آج یہ چیز نہیں ہے۔ توحید کوئی چھوٹی چیز نہیں ہے اس سے آدمی تمام مشرکین سے cut-off (منقطع) ہوجاتا ہے اور آج ان کی تکنیک یہ ہوتی ہے کہ کہیں اس کا نام آگے نہ آنے پائے کیونکہ اس سے قرآن مجید کا نام آجائے گا لیکن مجھے اس کا کوئی گلہ نہیں ہے۔ وہ جو ہر ٹھیک کہہ گیا ہے کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے تھا

اللہ کرے اسی طرح سے زندگی کے باقی دن بھی گزر جائیں۔

مذہب کی دنیا سے وابستہ کوئی قوم بھی خود کو عزت وتکریم کے زیور سے آراستہ نہیں کرسکی: تاریخ کا فیصلہ

قرآن حکیم کہتا ہے کہ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (42:21) یہ انہوں نے خدا کے شریک کھڑے کر رکھے ہیں: قوانینِ شریعت بناتے ہیں جن کا خدا نے کہیں حکم نہیں دیا کہیں اجازت نہیں دی۔ یہ قوانینِ شریعت وہ لوگ بناتے ہیں جن کی قوانین خداوندی کی رو سے کبھی اجازت نہیں ہوتی۔ خدا کا حکم کچھ اور ہوتا ہے اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی شریعت کچھ اور کہتی ہے۔ یہ شرک عظیم ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ (42:21) اگر ہمارا یہ قانونِ مہلت نہ ہوتا تو کبھی کا فیصلہ ہوچکا ہوتا۔ لیکن یہ ظہورِ نتائج کا وقت مہلت کے بعد آتا ہے۔ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (42:21) یہ ایسے ایسے کچھ کہنے والے تھے انجام کار پھر ان ظالمین کے لیے دردانگیز قسم کی تباہی دنیا میں آتی ہے۔

یہ جتنی بھی مذہب پرست قومیں تھیں' عزیزانِ من! ان سب پہ تباہیاں آئیں۔ کوئی قوم بھی مذہب کے ساتھ وابستہ رہتے ہوئے' دنیا کے اندر آگے بڑھ ہی نہیں سکی۔ تاریخ اس کی گواہ ہے۔ مثلاً یہ یہودی تباہ ہوئے۔ انہیں پھر کوئی ٹھکانا نہ مل سکا پھر یہ Wandering jews (آوارہ یہودی) کہلائے۔ قرآن حمید کے الفاظ میں یہ ہے کہ پھر انہیں خدا کی مدد کے سوا کوئی سہارا نہیں مل سکا' اگر وہ خدا کی طرف آ گئے' تو وہاں سے ملے گا' ورنہ کوئی قوم اگر ان کو سہارا دیدے گی تو اس سہارے پہ تو یہ جئیں گے' خود ان کو زندگی نصیب نہیں ہوگی۔ یہ جن کے ہاں سطوتِ داؤدیؑ اور شوکتِ سلیمانیؑ تک تھی' پھر جب انہوں نے قوانینِ خداوندی کو چھوڑا تو ان کی کیفیت یہ ہوئی کہ اس قوم کو صدیوں تک چھت نہیں ملی' اب یہودیوں نے اپنے ہاں کا وہ جو مذہب تھا اس کو چھوڑا ہے' وہ بھی دنیا کے اندر پست ترین قوم تھی۔ سیکولرازم پہ آئی ہے' تو ان کا شمار ہوا ہے۔ آپ کے ہاں ہندو موجود ہیں' ان کی ساری تاریخ یہ ہے کہ جو بھی باہر سے آیا اس نے (اسے) اس کے مذہب کی بناء پہ اپنے زیرِ تسلط رکھا۔ مذہب کو چھوڑ کر وہ سیکولرازم پر آ گئے' حق تو ان کے پاس تھا نہیں' دنیا تو کم از کم مل گئی۔ انہی کے اندر ابھی بدھ مت والے ہیں' تبت کے اندر رہتے ہوئے بھی وہ ان کے محکوم ہیں کیونکہ انہوں نے مذہب کو نہیں چھوڑا' آپ کے ہاں چین کے اندر دیکھیے۔ بدھ مت نے ان کو دنیا کی ذلیل ترین قوم بنایا تھا۔ انہوں نے بدھ مت کو چھوڑا اور سیکولرازم پر آئے ہیں۔ اب دنیا کی زندگی تو اچھی جی رہے ہیں۔ عیسائیت میں یہی کچھ ہوا' رشیا میں یہی کچھ ہوا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ انسانوں کے بنائے ہوئے مذہب کے ساتھ وابستہ رہتے ہوئے یہ تاریخ آپ کے لیے استثنا کر دے گی؟ نہیں' قطعاً نہیں' یہ سوال ہی نہیں ہے۔

خود مسلمانوں کی حالتِ زار پر' یہودیوں کا قبضہ اور میدانِ عرفات کی دعائیں

عزیزانِ من! قرآن مجید کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ وہ السَّاعَةُ قریب ہے' ہم تو اس السَّاعَةُ کے اندر ہیں۔ کیا کسی نے کبھی سوچا کہ مراکو (Morocco) سے لے کر ملیشیا تک ٹھاٹھیں مارتا ہوا بحرِ مواج ہے' ایک [1] ارب قوم ہے جسے وہ ہم عقیدہ کہتے ہیں' پھر سنیے! ایک ارب کے قریب ہے اور اس کرہ ارض کا جو Wealth (دولت) ہے' وہ اس میں ہے۔ یہ قوم ہے جسے اتنے خزائن فطرت کی طرف سے دیئے ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی یہ قوم روٹی تک کے لیے دوسروں کی محتاج ہے' سچ مچ روٹی کے لیے محتاج ہے۔ کوئی سیاست میں روٹی کے لیے محتاج ہے۔ کوئی معاشرت اور معیشت میں ان کی نقالی کرتا چلا جا رہا ہے یعنی اس قوم کی کیفیت یہ ہے کہ زندہ قوموں میں شمار ہی نہیں ہے۔ تیس سال سے اتنے سے وہ یہودی ان کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ وہی یہودی ہیں جن کو یہ مغضوب علیہ قوم کہتے ہیں۔ انہوں نے دوسروں کے سہارے پہ اتنی سی مملکت قائم کی۔ اس نوے کروڑ کو یا [1] ایک ارب کو تیس سال ہوئے کوئی دن

---

[1] یاد رہے یہ بات جون 1981 کی 5 تاریخ کو کہی گئی تھی۔ اب یہ آبادی ایک بلین سے تجاوز کر گئی ہے اور 56 کی تعداد مسلم ممالک کی ہے (حوالہ خواجہ ازہر عباس: نفاذِ شریعت کے بارے میں چند غلط فہمیاں' ماہنامہ صورت الحق اپریل 2008' کراچی' ص 19)

نہیں جاتا جب یہ ان کے متعلق آ ہیں نہیں بھرتے' حج کی تقریب پہ ہر سال عرفات کے میدان میں دعائیں مانگ مانگ کر چلے آ رہے ہیں لیکن وہ ہیں کہ بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ قوم انہیں ان کے مقام سے ہٹا نہیں سکی۔ اس سے زیادہ ضعف و کمزوری اور ذلت و خواری کی کوئی اور دلیل بھی ہو سکتی ہے: نوے کروڑ یا ایک ارب قوم' ان کے اندر بسنے والی اتنی سی آبادی' لاہور شہر جتنی آبادی بھی ان کی نہیں ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ مذہب کے ساتھ اِن کی وابستگی ہے۔ اِن کو یہی بتایا گیا ہے کہ عرفات کے میدان میں جو دعا مانگی جاتی ہے' وہ مقبول ہوتی ہے' وہاں دعا مانگو' بکرے ذبح کر کے وہاں چھوڑ آیا کرو اور پھر باقی یہاں آ کر اگلے حج کا انتظار کیا کرو' یہ کہا گیا ہے۔ وہاں قرآنِ کریم میں یہ نہیں کہا گیا تھا کہ قریش کے خلاف دعائیں مانگا کرو۔ وہاں کہا یہ گیا تھا کہ اپنی سرحدوں کو نہایت عمدہ رسالوں سے اور گھوڑوں سے مضبوط رکھو' تلواروں کو سانوں پہ لگائے رکھو' یہ تلواریں جو تم چلاتے ہو' بظاہر ہاتھ تمہارے نظر آتے ہیں' خدا ان تلواروں کو چلا رہا ہوتا ہے۔ یہ سکھایا گیا تھا' صرف دعائیں نہیں مانگنی سکھائی تھیں۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الشوریٰ کی آیت 21 تک آ گئے' 22 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

تیسرا باب: سورۃ الشوریٰ (آیت 22 اور اجراً اِلا المودّۃ فی القربیٰ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1981ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الشوریٰ کی آیت 22 سے ہو رہا ہے:(42:22)۔

اس آیت سے پہلی آیت میں تھا کہ اَمۡ لَهُمۡ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا لَمۡ يَاۡذَنۡۢ بِهِ اللّٰهُ (42:21) کیا ان لوگوں نے خدا کے کچھ شریک بنا رکھے ہیں جو ان کے لیے شریعت کے قوانین مرتب کرتے ہیں جن کی اجازت خدا نے نہیں دی؟ آپ غور فرما رہے ہیں کہ کیا ارشادِ خداوندی ہو رہا ہے؟ یہ شرکٰٓؤا (42:21) اتنا بڑا جرم تھا۔ کہا کہ وَلَوۡلَا كَلِمَةُ الۡفَصۡلِ لَقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ وَاِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ (42:21) اگر خدا کا قانونِ مہلت درمیان میں نہ ہوتا تو انکا ابھی فیصلہ ہو جاتا لیکن یہ فیصلہ قانونِ مہلت کے بعد ہو گا اور اب اگلی آیت آئی۔ اس میں کہا کہ تَرَى الظّٰلِمِيۡنَ مُشۡفِقِيۡنَ مِمَّا كَسَبُوۡا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمۡ (42:22) لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ عذاب، اور تباہی، جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں، وہ واقعہ ہو کر رہے گا اور جب وہ سامنے آئے گا تو تم دیکھو گے کہ یہ لوگ کس طرح سے ڈر رہے ہیں اور کانپ رہے ہیں۔ ہم جو انتباہ انہیں کر رہے ہیں، جو وارننگ دے رہے ہیں، جو تنذیر دے رہے ہیں، اس کا ان پہ اثر نہیں ہوتا، جب وہ تباہی سامنے آئے گی تو پھر ان کی کیفیت یہ ہو گی کہ کانپ اٹھیں گے۔ اس کے برعکس وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِىۡ رَوۡضٰتِ الۡجَنّٰتِ (42:22) جو لوگ ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ آئیں گے، وہ جنت میں ہونگے۔ یہ آیات متعدد بلکہ سینکڑوں بار آتی رہتی ہیں، آچکی ہوئی ہیں، ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جو

روٰضٰتِ الْجَنّٰتِ ہیں' ان سے مراد کیا ہے۔ اس کے اندر بڑی چیز ہے لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ (42:22) وہ جو کچھ بھی چاہیں گے انہیں خدا کے ہاں سے ملے گا اور یہ اس کا بہت بڑا فضل ہے جس کے اوپر ہو جائے۔ اگلی آیت میں یہ ہے کہ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (42:23) یہ وہ وعدہ ہے' بشارت ہے' خوشخبری ہے' جو ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں جو ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ ہمارے ساتھ آئے ہیں۔

آج کے درس کی ایک اہم ترین آیت

اس کے بعد اس آیت کا وہ ٹکڑا آ رہا ہے جس نے یوں کہیے کہ ہماری تاریخ میں بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے اور وہی ٹکڑا میں سمجھتا ہوں' کہ آج کے پورے درس کا موضوع ہوگا۔ میں آخر میں دیکھوں گا کہ اگر یہ موضوع تشنہ نہیں رہا ہے تو اسے وہیں ختم کر دوں گا' ورنہ ممکن ہے کچھ تھوڑا سا وقت بھی میں آپ سے مانگ لوں کیونکہ یہ ایسی اہم چیز ہے اور اس میں اس قدر Controvesial (متنازع) نکتہ آ گیا ہے۔ میں' بہرحال' چاہتا ہوں کہ اس کو ایک ہی درس میں صاف کر دیا جائے۔ ایسی اہمیت کے جو موضوعات ہوتے ہیں' اگر ان میں آٹھ آٹھ دن کا درمیان میں وقفہ پڑ جائے تو وہ ذہن میں مستحضر نہیں رہتا۔ میں کوشش کروں گا کہ ایک ہی درس میں بات ختم ہو جائے۔ جن کے سامنے قرآن حمید کے نسخے نہیں ہیں' ان کو حیرت ہوگی کہ وہ کونسی ایسی آیت ہے جس کے متعلق میں نے خصوصیت سے یوں کہا ہے۔ وہ آیت ہے: قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (42:23)۔ یہ ہے وہ آیت' آیت بھی نہیں بلکہ تیئیسویں آیت کے درمیان میں کا ایک ٹکڑا آیا ہے لیکن جیسا میں نے عرض کیا ہے' اس نے ہمارے ہاں بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔

سلسلۂ نبوت میں کوئی نبی بھی اپنی دعوت کے اجر کا طلب گار نہ تھا

قرآن کریم نے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے سلسلے میں یہ بار بار کہا ہے' قریباً ہر نبی کے سلسلے میں یہ کہا ہے کہ ان کی دعوت ہوتی تھی اور وہ کہتے ہیں کہ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (11:50)۔ سورۃ ھود میں مختلف انبیائے کرامؑ کے سلسلے میں آپ دیکھیے گا' وہ گیارھویں سورۃ ہے لیکن میں تو آگے آ رہا ہوں۔ کہا ہے کہ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (11:50) ہر نبی کی' ہر رسول کی' دعوت یہ ہوتی تھی کہ اے لوگو! خدا کی محکومیت اختیار کرو۔ ہر ایک کی دعوت یہ ہوتی تھی اور ایک ہی سانس میں' جہاں قرآن کریم نے یہ ایک آیت کا اتنا ٹکڑا' یہ حصہ بتایا' یا ایک آیت یہ بتائی جس میں ان انبیائے کرام نے کہا کہ تم خدا کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرو' اس کے ساتھ ہی یہ کہا کہ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (42:23) میں اپنی اس دعوت کا تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ اس سے نظر آیا کہ یہ اتنی بڑی اہم چیز ہے کہ ایک ہی سانس کے اندر قرآنِ کریم انبیائے کرام کی اس دعوت کو دہراتا ہے کہ میری دعوت یہ ہے' میری تعلیم یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کی

محکومیت اختیار نہ کرو اور میں تم سے اس کا کوئی اجر نہیں مانگتا۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔ کسی کے متعلق اگر یہ یقین ہو جائے کہ جو کچھ یہ نصیحت کے طور پر، تدبیر کے طور پر، مجھ سے کہتا ہے، اس میں اس کا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے تو نفسیاتی طور پہ اس کا بڑا اثر ہوتا ہے۔

اجر یہی نہیں ہے کہ کوئی مال و دولت کی شکل میں ہی ہو۔ اجر کی تو بڑی شکلیں ہوتی ہیں، بڑی صورتیں ہوتی ہیں۔ اجر: عزت کا اجر، منصب کا اجر، Popularity (شہرت) کا اجر۔ یہ سارے اجر ہیں، مختلف شکلوں میں ملتے ہیں۔ لوگ اتنا کچھ، ہزاروں روپے، لاکھوں روپے، خرچ کرتے ہیں، اپنا مال و دولت صرف کرتے ہیں۔ کس چیز کے لیے؟ کوئی لیڈری کے لیے، کوئی ممبر بننے کے لیے، کوئی کسی منصب کے لیے، کوئی بڑا بننے کے لیے، کوئی معاشرے میں عزت حاصل کرنے کے لیے، کوئی Popularity (شہرت) کے لیے۔ یہ سارے اجر ہیں۔ ہر نبی یہ کہتا ہے کہ میں تم سے اپنی اس دعوت کا کوئی اجر نہیں مانگتا۔ گویا یہ اتنی اہم چیز ہے کہ قرآن کریم کہتا ہے کہ ہر نبی اپنی دعوت کی پکار کے ساتھ ہی اس کا اعلان کرتا تھا کہ ''میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا'' حتیٰ کہ تمام انبیائے کرامؑ کے متعلق، حوالے آپ احتیاط سے لکھتے چلے جایئے گا، شاید یہ موضوع دوبارہ نہ آسکے۔ وہ ایک بہت بڑا صاحب اثر آیا ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم نے کیا ہے۔ اس نے آ کر کہا کہ **قَالَ يٰقَوۡمِ اتَّبِعُوا الۡمُرۡسَلِيۡنَ o اتَّبِعُوۡا مَنۡ لَّا يَسۡـَٔـلُكُمۡ اَجۡرًا وَّ هُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ** (36:20-21) اے میری قوم! تم ان رسولوں کا اتباع کرو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے۔ یہ خود سیدھے راستے پہ چلے جاتے ہیں اور تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے۔ یعنی اس نے بھی جب قوم سے یہ اپیل کی ہے کہ ان انبیائے کرامؑ کا، ان رسولوں کا، اتباع کرو تو ان کی دو ہی خصوصیات بتائی ہیں: ایک تو یہ کہ یہ خود سیدھے راستے پہ چلے جا رہے ہیں، ان کے پیچھے پیچھے چلنے سے تم بھی منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔ ایک تو راہنمائی کی، راہبری کی، ہدایت کی، یہ خصوصیت ہوئی اور اس کے ساتھ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ **لَّا يَسۡـَٔـلُكُمۡ اَجۡرًا** (36:21) تم دیکھتے نہیں ہو کہ یہ تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے۔ گویا پھر یہ خاص طور پہ خصوصیت ہوئی جو یہاں بتایا گیا کہ یہ تم سے اپنی اس دعوت کا کوئی اجر نہیں مانگتے۔

عزیزانِ من! اب سورۃ الشعرا سامنے لے آیئے 26 ویں سورۃ ہے۔ اس میں مختلف انبیائے کرام o کا تذکارِ جلیلہ آتا ہے۔ مختلف انبیائے کرام علیہم السلام کے تذکارِ جلیلہ کی بات سورۃ الشعراء کی آیت 109 سے شروع کیجیے۔ حضرتِ نوح علیہ السلام ہیں، دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ **وَمَاۤ اَسۡـَٔـلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ** (26:109) میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا کیونکہ **اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ** (26:109)۔ بڑی عجیب بات کہی کہ یہ کام بلا اجر کے کرتا ہوں۔ نفسیاتی طور پر بات یہ ہے کہ یہ تو ذہن میں آتا ہے کہ کچھ تو اجر ہونا چاہیے۔ کہا کہ ''میں تم سے اجر نہیں مانگتا۔ میں جو کچھ یہ دعوت دیتا ہوں، اس کا اجر اپنے خدا کے ہاں سے مانگتا ہوں۔'' دلِ بے مدّعا ایک Psychological Impossibility (نفسیاتی طور پر ناممکنیت) ہوتی ہے کہ انسان کے دل میں اس کا کچھ مدعا نہ ہو۔ کیسی عجیب

بات ہے جو قرآن مجید کہہ جاتا ہے کہ میں تم سے اجر نہیں مانگتا: وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (26:109) تم سے میں کوئی اجر نہیں مانگتا اور اب رہی یہ بات کہ کیا میں بلا اجر بلا معاوضہ بلا صلہ بغیر کسی Calculation (حساب شمار) کے بغیر کسی دل کے مدعا کے تقاضے کے یہ کام کرتا ہوں؟ کہا کہ نہیں یہ بھی بات نہیں ہے۔ اجر تو میں چاہتا ہوں لیکن اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (26:109) اس کا اجر اس کے ہاں سے چاہتا ہوں جس نے میرے ذمہ یہ بات لگائی ہے کہ میں یہ مشقتیں جھیلوں تکلیفیں برداشت کروں اور اس دعوت کو تم تک پہنچاؤں۔ میرا اجر اس کے ہاں سے ہے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ اس پہ زور ہے۔ یہ حضرتِ نوح علیہ السلام ہیں۔ آیت 127 میں حضرتِ عادؑ یہی کہتے ہیں کہ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (26:127)۔ آگے حضرت صالح علیہ السلام آ رہے وہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (26:164)۔ وہی الفاظ دہراتے چلے جا رہے ہیں۔ حضرت شعیبؑ کا تذکارِ جلیلہ سامنے آ رہا ہے۔ وہ بھی یہی الفاظ دہراتے ہیں کہ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (26:180)۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس کی اہمیت اتنی بڑی تھی کہ قرآنِ کریم نے ایک ایک نبی کے سلسلے میں جب ان کا ذکر کیا ان کی دعوت کا ذکر کیا تو ساتھ ہی یہ بات بھی دہرا دی کہ وہ کہتے یہ تھے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق بھی یہ کہا کہ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (25:57) کہہ دو کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ اس کے ساتھ آ گے ''ایک اور چیز'' بھی آئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا ہے؟

''الا'' کے لفظ کا مفہوم اور استعمال نیز اجر نہیں چاہتا تو کیا چاہتا ہوں؟

عزیزانِ من! اس ''ایک اور چیز'' کے لیے لفظ ''اِلا'' آیا ہے۔ اب یہاں یہ جو لفظ ''الا'' ہے اگر تو یہ اجر کے لیے ہے تو وہ بھی سن لیجیے۔ عربی زبان کے مبادیات سے جو بھی واقف ہیں ان کو بھی پتہ ہے کہ اس زبان میں یہ لفظ ''الا'' ''لیکن یا مگر'' یا جس کو ہم But کہتے ہیں کے لیے آتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ ہوتا ہے جو وہی چیز ہے مثلاً یہ کہ ''اور لوگ تو آ گئے مگر زید نہیں آیا'' تو گویا زید لوگوں میں شامل ہے لیکن اگر کہیں کہ ''آدمی تو آ گئے مگر عورتیں نہیں آئیں'' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دوسری جنس ہے یہ ''مگر'' جو ہے یہ ان جنسوں میں سے نہیں ہے یہ الگ ایک ٹکڑا ہے جو کہا گیا ہے۔ یہ زبان یا گرامر کی چیزیں ہیں۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے یہ اس سے الگ ہے۔ ''لیکن'' اور ''مگر'' اس میں بھی آیا ہے اور اگر ہم یہ کہیں کہ ''اور ممبر تو آ گئے شعیب نہیں آیا'' تو اس کے معنی ہیں کہ شعیب بزم کا ممبر ہے وہ نہیں آیا۔ عربی زبان میں یہ جہاں ''الا'' آتا ہے تو اس کے دونوں معنی ہوتے ہیں۔

یہاں جو کہا گیا ہے کہ ''میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا تو اگلا ٹکڑا ہے کہ الا من شآء ان یتخذ الیٰ ربہ سبیلاً (25:57)۔ اس

کے یہ معنی کر لیجیے کہ میں کوئی اجر نہیں مانگتا' میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم میں سے جو چاہے' اپنے رب کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لے' یعنی اس میں اجر کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ میں کوئی اجر مانگتا ہی نہیں ہوں۔ میں تم سے کیا چاہتا ہوں؟ بس اتنا ہی چاہتا ہوں کہ جو کوئی تم میں سے چاہے اپنے رب کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لے اور اگر آپ کہتے ہیں کہ یہ اجر تو پھر یوں ہوگا کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا' اگر مجھے کوئی اجر دینا چاہتے ہو تو وہ یہ ہے کہ تم سیدھا راستہ اختیار کر لو۔ ایک دعوت دینے والا اس کو بھی اپنا بڑا اجر سمجھتا ہے' اس سے بڑا اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ اس کی دعوت کی پکار کو دوسروں نے تسلیم کیا اور اس راستے پہ چل نکلے۔ یہ بھی بات کہنے کا ایک انداز ہے کہ میں تم سے اپنی ذات کے لیے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میری اس پکار کا' میری ان مشقتوں کا' میری ان مصیبتوں کا' یہ جو تگ و تاز کر رہا ہوں' دن رات غلطاں و پیچاں رہ رہا ہوں' اس کا اجر کہتے ہو تو اجر یہ ہے کہ تم صحیح راستہ اختیار کر لو۔ اب یہ بھی کہ یہ اجر کیا ہے؟ اس کے لیے پھر دوسری جگہ اور واضح کر دیا کہ میں تم سے اپنے لیے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ کہا کہ **قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ** (34:47) میں نے یہ جو چیز تم سے کہی ہے کہ تم سے میں اپنے لیے کوئی اجر نہیں مانگتا' چاہتا یہ ہوں کہ تم خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لو۔ اگر تم اسے میری اس دعوت کا اجر سمجھتے ہو تو **فَهُوَ لَكُمْ** (34:47) وہ بھی تمہارے ہی لیے ہے۔ بیان کرنے کا بڑا خوبصورت انداز ہے' میرے کہنے پہ اگر تم صحیح راستہ اختیار کر لیتے ہو اور یہ میری دعوت اور پکار کا اجر ہے تو یہ بھی **فَهُوَ لَكُمْ** (34:47) ہے یعنی یہ تمہارے لیے ہے' یہ بھی میرے لیے نہیں ہے اور پھر **اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ** (34:47) وہی پکار ہے کہ میرا جو اجر ہے وہ تو خدا ہی کی طرف سے ہے۔ خود نبی اکرمؐ نے بھی یہ دہرا دیا کہ وہ ان سے' اپنی قوم سے' اپنے لیے کوئی اجر نہیں مانگتے تھے۔ دعوت یہ تھی کہ تم خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لو۔ اگر میری اس رسالت' اس دعوت کا اجر ہے تو تمہارے ہی لیے ہے۔

میرے اجر کا معاملہ کسی انسان کے ساتھ نہیں بلکہ وہ تو خدا کے ساتھ ہے

کہا کہ **اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ** (34:47)۔ اس آیت نے بات صاف کر دی کہ وہ ان سے کوئی اجر نہیں مانگتے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ میرا اجر تو میرے خدا کے پاس ہے' میں وہاں سے لے لوں گا' تمہارے ساتھ میرا یہ معاملہ' اجر' معاوضہ اور صلہ کا ہے ہی نہیں۔ قرآنِ کریم میں یہی آیات ہیں جو اجرِ رسالت کے متعلق ہیں۔ ہر رسول نے آ کر یہ کہہ دیا کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ نبی اکرمؐ نے یہ فرما دیا کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا' میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لو اور اگر یہ اجر ہے تو یہ تمہارے ہی لیے ہے' میرے لیے یہ اجر نہیں ہے' میں یہ کچھ بھی خدا سے تمہارے لیے مانگتا ہوں کہ تم صحیح راستے پہ آ جاؤ' میرا اجر تو خدا کے پاس ہے۔ پھر یہ بات واضح ہو گئی کہ باقی انبیائے کرامؑ کی طرح آپؐ نے بھی یہ فرمایا کہ میں اپنے لیے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا' میرا اجر خدا کے پاس ہے۔

قرآن کریم کی ان آیات کی رو سے اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی ذرا سا بھی شبہ نہیں رہتا کہ حضور ﷺ اجرِ رسالت کوئی اپنے لیے نہیں مانگتے تھے۔ قرآن کریم کی ان آیات کی رو سے' کہ ہر نبی نے آ کر یہی کہا۔ اگر خدا نکردہ یہ تصور کیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی ذات کے لیے قوم سے کوئی اجر مانگتے تھے تو یہ تو اس رسالت کے منصب کے منافی ہو جائے گا جو قرآن کریم نے متعین کیا ہے۔ یہ اس کی خلاف ورزی ہو جائے گی۔ یہ بلا اجر و معاوضہ کے دعوتِ رسالت ہے۔ یہاں تک جو بات ہے وہ متعین ہے' واضح ہے' صاف ہے' دوٹوک ہے' نہ کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے' نہ کسی تعبیر و تاویل کے لیے کوئی موقع ہے۔ قرآن مجید نے واضح کر دیا ہے' ایک جگہ نہیں' جگہ جگہ واضح کر دیا۔

عزیزانِ من! اس تمہید کے بعد آیئے اُس آیت کی طرف' جو میں نے عرض کیا ہے کہ اتنی اہم ہے کہ اس کی وضاحت شاید ایک درس سے بھی زیادہ وقت لے جائے۔ وہ آیت ہے کہ قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا (42:23) اے رسول! کہہ دو ان لوگوں سے کہ میں تم سے اپنی اس دعوت کا اور رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا۔ یہ وہی بات ہے جو باقی انبیائے کرامؑ کہتے تھے۔ اب یہاں اس کے بعد ''الا'' آتا ہے۔ وہاں ''الا'' آیا تھا تو یہ تھا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لو اور یہ تمہارے ہی فائدے کی بات ہے۔ میرا اجر تو خدا کی طرف سے ہے۔ یہاں آیا کہ اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی (42:23)۔ یہ ہے وہ ٹکڑا جو تشریح و تفصیل چاہتا ہے۔

میری ساری زندگی کا ماحصل قرآنی تعلیمات ہیں' ان میں زندگی کا وہ حصہ شامل نہیں جسے میں عہدِ جاہلیہ کہا کرتا ہوں: پرویزؒ

عزیزانِ من! میں تمہیداً پھر اتنا واضح کر دوں جو ہر بار میں کہا کرتا ہوں کہ میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے جو شخص فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہو' وہ خود کسی فرقے سے متعلق نہیں ہو سکتا۔ قطعاً نہیں ہو سکتا' میں صرف مسلمان ہوں' قرآنِ کریم کو دین کے معاملے میں آخری دلیل اور حجت تسلیم کرتا ہوں' جو حق و باطل کا فیصلہ کرنے والا ہے' دین کی بنیاد سے۔ اگر کوئی معاملہ' کوئی مسئلہ آئے تو میں قرآن کریم کی روشنی میں اس کے متعلق جائزہ لینے والا ہوں۔ میری ساری عمر اسی میں گزری ہے۔ اِس ساری عمر سے مراد وہ پہلا نہیں حصہ ہے جسے میں عہد جاہلیہ کہا کرتا ہوں۔ اس کے بعد میری عمر کا باقی سارا حصہ' اس کو قریباً پچاس سال ہو گئے' قرآنِ کریم کے مطالعہ میں گزرا ہے۔ میں نے ہر عقیدہ' ہر نظریہ' ہر تصور' ہر مسلک کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لیا ہے جو کچھ قرآن کریم نے مجھے سمجھایا یا بتایا ہے اسے مانا ہے۔ اس سے پیشتر عقائد ایسے تھے جو اس کی روشنی میں غلط نکلے۔ عقیدے کا چھوڑنا بڑا مشکل ہوتا ہے' یہ تو دل کی گہرائیوں کے اندر چور کی طرح چھپا ہوا ہوتا ہے۔ انسان اسی سے Conscious (جانکار) بھی نہیں ہوتا۔ انسان کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ

میرا عقیدہ ہے حالانکہ وہ اس کا عقیدہ ہوتا ہے۔

یونہی بات ضمناً یاد آ گئی' یہ رسل [1] Russel, Bertrand: 1872-1970 پہلے عیسائی تھا' عیسائیت چھوڑی' دہریت پہ آ گیا' خدا کا بھی انکار کیا' یہ بہت بڑا فلاسفر تھا۔ لوگوں کو پتہ ہے کہ اگر ایسے لوگوں کی گردن ٹیڑھی ہو جائے تو وہ پوچھیے نہیں کہ وہ کیا بلا ہو جاتے ہیں۔ اس نے بہت کچھ لکھا' خیر' وہ اپنے سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ فلاں جگہ گیا' فلاں جگہ گیا۔ ایک جگہ گیا تو اس نے کہا ہے کہ وہاں مناظر بھی بڑے دلربا تھے' دلکش تھے' سب کچھ تھا لیکن وہاں میں نے دیکھا کہ ایک گرجے کی پرانی عمارت تھی' اسے میں نے اپنے لیے بڑا ہی وجہ کشش پایا' میں خاص طور پر باقی چیزوں کو چھوڑ کر اسے دیکھنے کے لیے چلا گیا' اس کو دیکھ کر آیا تو' میرے دل پہ اس کا بڑا اثر ہوا۔ اس کی بائیوگرافی (سوانح عمری) پہ Comments (تنقید) لکھنے والا' کہتا ہے کہ خدا کے انکار کے باوجود دیکھا کہ وہ دل کی گہرائیوں میں کیسے چھپا بیٹھا تھا ورنہ تمہارے لیے گرجا باعثِ کشش کیوں ہوا۔ اس نے بات بڑی صحیح کہی ہے' یہ کمبخت تو خون کے اندر حلول کی ہوئی چیز ہوتی ہے۔

بہر حال میں اپنے عقائد و مسالک کی بات کر رہا تھا۔ قرآن مجید کی تعلیمات کے بعد میں نے ان عقائد کو چھوڑا' ان مناسک کو چھوڑا' ان مسالک کو چھوڑا' اپنوں کو چھوڑا' اپنی جماعت کو چھوڑا۔ اس زمانے میں' میں نے عرض کیا ہے' کہ ایک وقت وہ پیری مریدی کا بھی گزرا تھا' ان مریدوں کو بھی چھوڑا۔ پوچھو نہیں کس کس کو چھوڑا۔ اس ایک قرآن کریم کے ساتھ رہنے کے لیے ساری دنیا کو چھوڑ دیا۔ اس لیے یہ سوال ہی نہیں کہ میں کوئی بات قرآن حمید کی رو سے کروں گا تو اس میں کسی قسم کی فرقہ بازی' فرقہ بندی کے کسی عقیدے کا دخل ہوگا۔ قرآن حکیم کی رو سے' میرے اپنے عقائد کے خلاف جو باتیں تھیں' میں نے ان کو چھوڑا ہے تو اگر کوئی بات ایسی ہے جو کسی فرقے کے عقیدے کے خلاف جاتی ہے' مجھے تو وہ بھی کہنا ہوگا' میں نہیں کہوں گا تو یہ قرآنِ کریم کی رو سے منافقت ہوگی' یہ شرک ہوگا۔

عزیزانِ من! اس پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو قرآن کریم ہاتھ میں لے کر آئے' یہ پلِ صراط ہے' بال سے باریک' تلوار سے تیز' ذرا پاؤں میں لغزش آئی اور سیدھا جہنم میں جا گرتا ہے۔ خدا بڑا غیور ہے' وہ اس معاملے میں بالکل رعایت نہیں کرتا' ہوسکتا ہے کہ کسی معاملے میں کسی کی جو قرآنی بصیرت ہے' وہ ساتھ نہ ہو لیکن یہ کہ اگر وہ جانتا ہوا' ایک چیز کو کسی رعایت سے یا کسی تعصب سے' قرآن حکیم

---

[1] لارڈ برٹرنڈ رسل سے پرویزؒ نے کراچی کے ہوائی مستقر پر 25 ستمبر 1950ء میں ملاقات کی۔ اس وقت رسل کی عمر 78 سال تھی اور بقول پرویزؒ جب وہ جہاز سے اترا ہے تو یوں دکھائی دیتا تھا جیسے وہ اپنے ڈرائنگ روم سے نکال کے صحن میں آ گیا ہو۔ شگفتہ بشاش اور یکسر حاضر دماغ، وہ کڑی کمان کے تیر جیسی چال کے ساتھ مستقر کی عمارت میں اپنی قیامگاہ کی طرف آ گیا۔ جو قارئین اس ملاقات کا احوال پڑھنے سے دلچسپی رکھتے ہیں' وہ اس کا مطالع کریں: پرویزؒ لارڈ سر برٹرنڈ رسل سے ملاقات' طلوع اسلام Pto(9:13)' ستمبر 1950ء، ص 36 تا Pto39 پرویزؒ: لارڈ سر برٹرنڈ رسل سے ملاقات دسمبر 1950ء' سلسبیل' طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' 1997' ص ص۔ 53 تا 53۔

سے ماورا پھیلائے تو اس کے لیے اس چیز کو ایسا کہنے سے کوئی معافی نامہ نہیں ہے‘ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ تیس سال ہو گئے‘ میں اس طرح سے جان کھپا رہا ہوں۔ میں اپنے ہی لیے عذاب کیوں مول لے لوں! اس لیے سوال یہ نہیں ہے کہ کسی کی رعایت ہو گی یا کسی کے خلاف میں یہ کہوں گا۔

زیرِ نظر درسِ قرآنِ حکیم کی اہم آیت کا غلط مفہوم رسالت کے منصب کی ساری عمارت گرا دیتا ہے

اب آیئے زیرِ نظر اس آیت کی طرف جو یوں ہے: **قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى** (42:23)۔ ہم دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ ہر نبی کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا لیکن اس کے باوجود اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قرآن حمید کی اس آیت (42:23) کی رو سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو۔ عزیزانِ من! اپنے لیے کچھ صلہ یا اجر مانگنا تو ایک طرف رہا‘ یہ اتنا بڑا اجر نہیں کہ مجھ سے محبت کرو بلکہ یہ کہ میرے رشتہ داروں سے محبت کرو۔ سوچیے تو سہی کہ اس آیت کا یہ ترجمہ یا تصور‘ رسالت کے منصب کی ساری بنیاد‘ کو گرا دیتا ہے۔ اس ترجمے کی رو سے یوں ہے کہ اعلان کیے چلے جا رہے ہیں کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا‘ اجرِ رسالت کے طور مانگتا کیا ہوں؟ یہ کہ میرے رشتہ داروں سے محبت کرو۔

حضور ﷺ کی رشتہ داریوں کی تفصیل‘ قرآنِ حکیم کی تعلیمات اور امتِ مسلمہ میں رشتہ داروں سے محبت میں ابتدائی گروہ بندی کا عمل

جس زمانے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے‘ پہلے تو اس کو دیکھیے۔ قریش کے قریب قریب ہر قبیلے سے حضور ﷺ کی رشتہ داریاں تھیں۔ دور کی رشتہ داریوں کو چھوڑیئے‘ رسول اللہ ﷺ کے والد بزرگوار [1] کا تو انتقال حضور ﷺ کی پیدائش سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ اس کے بعد حقیقی چچا ہی قریب ترین رشتے دار ہو سکتے تھے۔ ان میں اس زمانے میں یہ جو حقیقی چچا تھے وہ تو ابھی اسلام بھی نہیں لائے [2] تھے: ابوطالب تھے آپ ﷺ کے چچا‘ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد حضرت عباس رضی اللہ عنہ تھے آپ ﷺ کے چچا۔ ابولہب تھا آپ ﷺ کا چچا۔ حضرتِ عباس رضی اللہ عنہ تو بعد میں ایمان لے بھی آئے‘ ابولہب کا تو حکیم قرآن میں اس طرح سے ذکر ہے کہ کسی اور کا ایسے ذکر ہی نہیں کیا گیا۔

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدِ بزرگوار کا نام عبداللہ تھا جو آپؐ کی ولادت سے تقریباً چھ ماہ پہلے ایک تجارتی سفر کے دوران مدینہ کے قریب چند روز بیمار رہ کر وفات پا گئے تھے (خطباتِ عسکری‘ شعبۂ دینی تعلیمات‘ آرمی ایجوکیشن ڈائریکٹریٹ جنرل ہیڈ کوارٹر‘ 1981ء‘ ص۔ 51)۔

[2] عبدالمطلب (آپؐ کے دادا) کے 10 یا 12 بیٹوں میں سے پانچ شخصوں نے اسلام یا کفر کی خصوصیات کی وجہ سے شہرت عام حاصل کی۔ یعنی ابولہب‘ ابو طالب‘ عبداللہ‘ حضرت حمزہؓ اور حضرت عباسؓ۔ (شبلی نعمانی: سیرۃ النبیؐ‘ ناشران قرآن‘ ص۔ 169)۔

ابوالعاص داماد تھا ❶ اور دو بیٹیاں ابھی ابوجہل ❷ کے بیٹوں کے ساتھ بیاہی ہوئی تھیں۔ یعنی اس سے پہلے حضور ﷺ کی رشتہ داریاں ان سب کے ساتھ تھیں: ددھیال کی طرف سے رشتہ داریاں تھیں' ننھیال کی طرف سے رشتہ داریاں تھیں اور ابھی ان لوگوں میں سے بہت کم تھے جو اسلام لائے ہوئے تھے' ورنہ سارے کے سارے ابھی تک کافر تھے۔ اگر یہ چیز ہو کہ میرے رشتہ داروں سے تم محبت کرو' یہ میرا اجرِ رسالت ہے تو یہ تو سارے اس کے اندر آ گئے۔ قرآن حکیم تو آگے چل کر کہتا ہے کہ یاد رکھو! اگر تمہارے ماں باپ' بہن بھائی' بیٹے بیٹیاں بیوی' یہ سب چیزیں' کسی طرح بھی ایمان کے مقابلے میں تمہارے زیادہ قریب ہو جائیں تو اس عذابِ خداوندی میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

اب یہ جو رشتہ داروں سے محبت والی بات ہوئی تو یہاں اس سے ہمارے ہاں' اس امت میں' دو ابتدائی گروہ یا دو فرقے' شیعہ حضرات اور سنی حضرات' عمل میں آ گئے۔ اس باب میں یہ جو رشتہ داروں سے محبت ہے (فی القربٰی)' اس میں یہ دونوں مشترک ہیں۔ شیعہ ذرا اس باب میں Extermist (انتہا پسند) ہو گئے ہیں' یہ سنی ذرا سمجھ لیجیے کہ تھوڑے سے پیچھے ہیں لیکن یہ جو بات ہے کہ حضورؐ کے رشتہ داروں سے محبت کرو اور یہ رسول اللہ ﷺ نے اجرِ رسالت مانگا تھا' اس میں یہ دونوں مشترک ہیں۔ سنیوں کے ہاں بھی اس آیت کا ترجمہ یہی ہوتا ہے اور پھر اس کے لیے آلِ محمد' آلِ رسول اللہ کا لفظ نکالا گیا۔ اب انہوں نے رشتہ داروں میں سے جسے حضور ﷺ کی آل کہتے ہیں' الگ نکالے۔

حضرت علیؓ کی حضرت فاطمہ الزہرہؓ سے ساتھ شادی کے علاوہ ان کی دیگر شادیوں کا تاریخی بیان اور ان سے اولادوں کی تخصیص

حضرتِ علیؓ کی شادی حضرتِ فاطمہ ❸ الزہرہؓ سے ہوئی۔ ان کی زندگی میں تو وہی رہیں تھیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آپ کے اٹھارہ بیٹے اور اٹھارہ بیٹیاں تھیں' ان میں سے حضرتِ فاطمہؓ کے بطن سے جو اولاد آگے چلی' اس میں امام حسنؓ ❹ اور امام حسینؓ ❺ تھے آگے جتنا بھی

---

❶ آپؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے شوہر۔

❷ ابوجہل کا حقیقی نام عمر بن ہشام بن مغیرہ تھا۔

❸ حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کی شادی 2ھ کو حضرت علیؓ سے ہوئی (شبلی نعمانی: سیرۃ النبی' ناشرانِ قرآن' ص۔ 371)۔

❹ آپ 3ھ میں پیدا ہوئے (شبلی نعمانی: سیرۃ النبی ناشرانِ قرآن' ص۔ 393)۔ امام حسنؓ (49-3ھ)۔

❺ آپ کی ولادت 4ھ کو ہوئی (شبلی نعمانی: سیرۃ النبیؐ ص 400)۔ امام حسینؓ (61-4ھ) مگر جی۔ اے۔ پرویزؒ نے لکھا ہے کہ امام حسینؓ کی پیدائش 5ھ میں ہوئی (پرویزؒ: شاہکار رسالت: ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 1987' ص، 189۔

ان کے ہاں کا سلسلہ چلا' ان کو تو سید یا سادات یا آلِ محمدؐ کہتے ہیں اور وہ جو باقی بیویوں کے بطن سے آگے اولاد ہوئی' ان کا آگے جو سلسلہ چلا' ان کو سادات یا سید نہیں کہتے' ان کو علوی کہتے ہیں۔ آپ نے بعضوں کے نام کے ساتھ علوی لکھا ہوا دیکھا ہوگا تو گویا ان کے ہاں حضرتِ فاطمہؓ کے بطن سے حضرتِ علیؓ کی اولاد اور پھر اسی شاخ میں وہ جو آگے چلے' وہ آلِ محمد کہلائے۔ آل کے معنی یہ لوگ بیٹی کی اولاد کر لیتے ہیں' ان کو آلِ محمدؐ اہلِ بیت بھی کہتے ہیں۔ ابتداءً یہ جتنے تھے' ان کے لیے آپ کے ہاں پنج تن پاک ایک مشہور لفظ ہوتا ہے جو کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ' علی رضی اللہ عنہ' فاطمہ رضی اللہ عنہا' حسن رضی اللہ عنہ' حسین رضی اللہ عنہ انہیں پنج تن پاک کہتے ہیں۔ گویا وہ جو آلِ محمد ﷺ ہے' وہ سمٹ کر یہ ہوئی۔ اب ان کے لیے **المودة فی القربیٰ** ہو گیا یعنی یہ آلِ محمد ﷺ کے ساتھ آ گیا' انہی کو یہ حضرات اہلِ بیت بھی کہتے ہیں۔

نسلی طور پر نبی اکرم ﷺ کی طرف سے اجر کے طلب کرنے کا معاملہ

اب بقول اسی ترجمے اور ان کے عقیدہ کے' ان کے ساتھ محبت نبی اکرمؐ کا اجرِ رسالت ہے اور یہ حضور ﷺ کی زندگی تک کی بات نہیں ہے' یہ قیامت تک کے لیے ہے کہ ہر سید کے ساتھ محبت کرو۔ یہ آپ پہ فرض ہو جاتا ہے جو حضور ﷺ کی رسالت کو مانتا ہے کیونکہ یہ اجرِ رسالت ہے۔ یہ میں ان کا عقیدہ بیان کر رہا ہوں۔ ذرا اس سے ہٹ کر دوسرے رُخ کی طرف جائیے۔ یہ تو نسبی رشتے داری ہوئی' اس میں پہلی چیز تو یہ ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اجرِ رسالت کوئی رسول نہیں مانگتا تھا۔ اب اس ترجمے اور عقیدے کے مطابق یہ اجرِ رسالت مانگا گیا اور یہ ایسا اجر ہے جو قیامت تک کے لیے ہے: آلِ محمد ﷺ کو اجر ملتا چلا جائے' جیسے کہ میں نے عرض کیا ہے کہ جسے اب سید کہا جائے گا' وہ آلِ محمدؐ میں شامل ہوگا اور اس کے ساتھ محبت کرنا اس رسول اللہؐ کے ارشاد کے مطابق فریضہ قرار پا جائے گا' تو گویا یہ اتنا بڑا اجر ہے جو مانگا جا رہا ہے اور یہ نسب یا نسل کے اعتبار سے ہے یعنی وہ نسلی طور پہ سید ہوتا ہے جسے آپ کہتے ہیں یا وہ نسلی طور پہ جنہیں آلِ محمد ﷺ کہا ہے' ہوتا ہے۔ یہ ہے آلِ محمد ﷺ: حضرتِ علیؓ کی اولاد حضرتِ فاطمہؓ کے بطن سے اور پھر نسلی طور پہ ان کے ہاں آگے جو بیٹے وغیرہ چلے تو گویا ایک نسلی سلسلہ ہوا جس کے ساتھ محبت کو اب جزوِ ایمان بنایا ہے۔ یہ لفظ شیعوں کا ہی نہیں ہے' سنیوں کا بھی ہے کہ یہ جزوِ ایمان ہے۔ عملی طور پر' وہ کسی قسم کا کیوں نہ ہو اگر وہ آلِ محمدؐ میں شامل ہے یا سید ہے تو نسلی طور پر اس کے ساتھ محبت کرنا آپ کا فریضہ قرار پا جاتا ہے۔

نسلی اور نسبی امتیازات کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی واضح تعلیم کے خدوخال

قرآنِ کریم کی جو بنیادی تعلیم ہے' اس کے مطابق جہاں وہ اور چیزوں کو مٹاتا ہے وہاں وہ نسلی اور نسبی امتیازات کو بھی مٹاتا ہے۔ خدا کا اعلان ہے کہ **وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ** (17:70) ہم نے ہر انسان کو انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم پیدا کیا ہے' ہر

انسان واجب التکریم ہے۔ مدارج کے متعلق کہا کہ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (46:19) انسان ہونے کی جہت سے سب واجب التکریم ہیں' لیکن جو خدا کے نزدیک مدارج ہیں وہ اعمال کی رو سے ہیں' ان میں نسبی اور نسلی امتیاز کا کوئی ذکر قرآن کریم کی رو سے نہیں ہے۔ وہ تو اس نسلی و نسبی امتیازات کو مٹانے کے لیے آیا ہے۔ اعمال کی رو سے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (49:13) ہے: سب سے زیادہ واجب التعظیم' واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ احکامِ خداوندی کا پابند ہو۔ قرآن کریم نے یہ معیار بتایا ہے۔ کسی کا بیٹا ہونا' کسی کا باپ ہونا' کسی کا بھائی ہونا' کسی کی بیوی ہونا' اسلام کی رو سے یہ کوئی نسب ہی نہیں ہے:

ان صحابہؓ سے تو باپ کا نام پوچھا جاتا تھا تو وہ ''اسلام'' کہتے تھے۔ وہ تو اپنی اتنی نسبت بھی نہیں رکھنا چاہتے تھے: بندۂ عشق شدی ترکِ کن جامی

بندۂ عشق شدیٔ ترکِ نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

قرآنِ حکیم کے نزدیک ''اہل'' ہونے کا معیار

قرآن کی تعلیم کی رو سے حضرتِ نوحؑ سے کہا گیا کہ یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جو تیرے اہل میں سے ہے میں اسے بچالوں گا۔ وہاں ''اہل'' کا لفظ ہے اور وہ ان کا بیٹا ڈوب رہا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ یا اللہ! تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ میں ''اہل'' کو بچالوں گا' میرا بیٹا ڈوب رہا ہے۔ کہا کہ تیرا بیٹا تیرے اہل میں سے نہیں ہے' اس کے جو اعمال ہیں' وہ مومن کے نہیں ہیں۔ دیکھا کہ حقیقی بیٹا بھی ''اہل'' میں سے نہیں رہتا اگر وہ ایمان کا ساتھ نہیں دیتا۔ وہاں ''اہل'' کا لفظ آیا ہے۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا باپ ہے۔ انہوں نے پہلی دعوت باپ کو دی ہے اور ان کو کہا ہے کہ کس راستے پہ چلے جا رہے ہو' ان کا کس قدر گمراہ کن راستہ ہے اس کے جواب میں باپ نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام! تم نے اگر یہ روش نہ چھوڑی تو میں تم کو یہاں سے نکال باہر کروں گا' عاق کر دوں گا جسے کہا جاتا ہے۔ آپؑ نے کہا کہ آپ مجھے یہ کہہ رہے ہیں۔ میں تو آپ کو' آپ کی قوم کو' آپ کے ان تمام معبودوں کو' آپ کے بادشاہ کو' ان سب کو عاق کر کے جاتا ہوں'

ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا[1] رہیں۔

---

[1] یہ پورا شعر یوں ہے:

یہ زائرانِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں
{اقبالؒ: بانگ درا (قطعہ)}

حضرتِ لوطؑ کی جو بیوی تھی اس کے متعلق کہہ دیا کہ یہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم کے نزدیک ''اہل'' ہونے کا معیار کچھ اور ہے۔

امتِ محمدیہ ﷺ کی بنیاد کسی رشتہ داری پر استوار نہیں' بدر کا میدان اس کی زندہ شہادت ہے

قرآن کریم کی تعلیمات کی رو سے رشتے داری کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ تو سوسائٹی کی ایک چیز ہے' دین میں اس کا کیا واسطہ۔ حضور ﷺ نے وہاں جا کر جو امت تیار کی تھی' وہ رشتہ داری کی بنا پہ نہیں کی تھی۔ اس کی رو سے تو حبش کا بلالؓ اور روم کا صہیب رضی اللہ عنہ بھائی بھائی قرآن کریم نے کہا ہے کہ تمام مومن بھائی بھائی ہیں' عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45AD) اور صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ (570-634AD) کے بھائی بن گئے تھے اور ان کے جو اپنے بھائی تھے وہ اس لحاظ سے اپنے نہیں رہے تھے۔ مثال سنیے: رمضان کا مہینہ ابھی آتا ہے سترہ تاریخ کو بدر کا معرکہ آئے گا اس میں نظر آئے گا کہ نسب اور نسل کے جو رشتے ہیں وہاں کس طرح سے کٹ جاتے ہیں۔ اس بدر کے میدان میں حق و باطل کا جو پہلا معرکہ ❶ آیا تھا' اس میں یہ کیفیت تھی کہ باپ ایک طرف تھا بیٹا دوسری طرف ❷ تھا' ایک بھائی ایک طرف تھا دوسرا بھائی دوسری طرف ❸ تھا' رسول اللہ ﷺ ایک طرف تھے چچا اور داماد دوسری طرف تھا ❹ ایک دوسرے ❺ کے خلاف تلواریں کھینچی ہوئی تھیں۔ ان کا آپس میں نسب کا تعلق تھا' رشتے داری کے تعلقات تھے۔ مدینے اور مکے کے اندر یہ جو سات سال تک متعدد غزوات بھی ہوئے' جہادات بھی ہوئے' یہ قریباً تراسی کے قریب تو تھے جن میں عام جھڑپیں بھی ملا لیجیے۔ یہ تو اتنے ہوئے ہی ہیں۔ یہ آپس میں سارے رشتے دار ہی تو تھے۔ اگر رشتہ داری کی محبت اجرِ رسالت تھا' تو پھر اس اعتبار سے رشتہ داری میں جو آپ قرآن کریم کا یہ ترجمہ کرتے ہیں' تو یہ تو سارے آپ ﷺ کے رشتہ دار تھے۔ آپ ﷺ ان سے محبت کا تقاضا کر رہے تھے اور خود ان کے خلاف تلوار لے کر میدان میں آئے ہوئے تھے۔

عزیزانِ من! قرآن کریم کی رو سے یہ ایمان کے رشتے میں مشترک ہیں مگر باپ بیٹا بیوی بھائی' وہ سارے جتنے بھی رشتے ہیں' وہ معاشرے کے اعتبار سے' ان کے ساتھ آپ ﷺ کے رشتے ہیں۔ اگر آپ کا ایمان کے اشتراک کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو باقی کوئی رشتہ قائم نہیں رہتا۔ اسلام میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

---

❶ 17 رمضان 2ھ

❷ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مقابل ان کا بیٹا عبدالرحمٰن۔

❸ حضرت علیؓ کے بھائی عقیل

❹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس اور داماد ابوالعاص۔

❺ اس کی دوسری مثالیں یہ ہیں: حضرت عمرؓ کے مقابل ان کا ماموں عاص' حضرت ابوعبیدہؓ کے مقابل ان کے والد اور حضرت حذیفہؓ کے مقابل ان کا باپ عتبہ (حوالہ: خطبات عسکری' 1981ص۔132)۔

قرآنی ایمان کی بنا پر قائم ہونے والی برادری کو باہمی محبت کا سبق دیا گیا تھا

مکے میں مومن عورتیں اپنے خاوندوں کو چھوڑ کر مدینے آ گئیں حالانکہ یہ اتنا گہرا رشتہ تھا۔ ان مومن عورتوں نے خاوندوں کو چھوڑا تھا' ساتھ اولاد کو بھی چھوڑا تھا کیونکہ ایمان کے رشتے نے آواز دی تھی اور پھر سب رشتے منقطع ہو گئے تھے۔ یہ ایک رشتے داری کا خاندان نہیں بنا تھا' یہ تو ایمان کے اشتراک کی بنیاد کے اوپر ایک نئی برادری وجود میں آئی تھی۔ اس برادری کے افراد سے کہا گیا تھا کہ ایک دوسرے سے محبت کرو۔ ان سے کہا گیا تھا کہ تم آپس میں بھائی بھائی ہو' وہ تمہارا حقیقی بھائی جو ایمان میں مشترک نہیں تھا' وہ بھائی نہیں رہا۔ یہ بلالؓ جو حبش سے آیا ہے' جس کا تم عرب والوں سے کوئی تعلق نہیں' خون کا ایک قطرہ بھی مشترک نہیں ہے' وہ تمہارا بھائی ہے اور چونکہ مدارج اعمال کی رو سے تھے' انہوں نے جتنی سختیاں جھیلی تھیں' ان کے اعمال کا تو پوچھو نہیں کیا انداز تھا! اسی لیے حضرت عمرؓ (581-644/45AD) جیسے ہی بلالؓ آتے تھے تو سیدنا بلالؓ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے کہ ہمارا سردار بلالؓ آ رہا ہے۔ یہ رشتے قائم ہوئے تھے' ان سے محبت کا تقاضا تھا۔ ابوجہل' ابوسفیان اور ابولہب وغیرھم سے یہ تقاضا نہیں ہو سکتا تھا۔ چلیے' وہاں سے چھوڑ چلیے۔

اس اشتراکِ ایمان کو لے لیجیے' یہاں آل کے معنی سمٹا کر بھی لیجیے۔ نسلی تعلق تو ان کے موجود ہیں' بیٹی کی اولاد ہی سہی' اس کے اندر نسلی تعلق موجود ہے۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے' بنائے کعبہ کے بعد' جو پہلی دعا کی تھی' اس میں یہ کہا تھا کہ بارِ الٰہا! میرے لیے اور میرے بیٹے کے لیے یہ کرنا' ان کو یہ کچھ دینا' مدارج بلند دینا' ان کی حفاظت کرنا' رزق دینا' یہ سب کچھ دینا۔ کہا کہ یہ سب منظور ہے' یہ ٹھیک ہے۔ پھر کہا کہ کیا **وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ** (2:124) یہ میری اولاد کے متعلق بھی ہے؟ جواباً کہا کہ **لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ** (2:124) محض تیری اولاد میں سے جو ہونا ہے' وہ ہماری ان مراعات کا حقدار نہیں ہو جائے گا' ان میں سے جو بھی اس راستے سے بھاگ جائے گا' اس کے لیے ہمارا یہ وعدہ نہیں ہے یعنی ان سے بھی یہ کہہ دیا گیا۔

حضور ﷺ کی زندگی کا آخری خطبہ اور نسبی یا نسلی رشتے داریوں کی نفی

خود حضور ﷺ کے اجتماع کے اندر آپ کے آخری ارشادات' حقیقت میں دنیا کے لیے ایک بہت عظیم منشور ہیں' اس خطبے میں جن چیزوں پہ آپ ﷺ نے Stress (زور) دیا تھا' اہمیت دی تھی' وہ بنیادی اصول تھے۔ اس خطبے کے اندر یہ چیز بھی موجود ہے کہ آپؐ نے فرمایا تھا ''کہ عہدِ جاہلیہ کے تمام رشتے اور تمام بندھن میرے پاؤں کے نیچے ہیں' اب بجز تقویٰ کے عربی کو عجمی پر' عجمی کو عربی پر' کالے کو گورے پر' گورے کو کالے پر' کوئی کسی قسم کی فضیلت حاصل نہیں۔'' یہ حضور ﷺ کے حجۃ الوداع کے خطبے کے الفاظ ہیں' یہ متفق علیہ ہیں' یہ یہاں تک تو اتفاق سے چلے آ رہے ہیں' یہ آخری اعلانِ عظیم' خود رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے' لاکھ آدمی کی موجودگی میں' متفق

علیہ چلا آ رہا ہے۔

حضور ﷺ نے اپنی وفات سے پہلے جو آخری خطبہ وہاں آ کر دیا تھا' اس میں بھی یہ الفاظ اب تک منتقل ہوتے چلے آ رہے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا تھا: ''اے میری بیٹی فاطمہ ؓ! اے میری پھوپھی صفیہ ؓ! یہ مان نہ رکھنا کہ تم محمد ﷺ کی عزیزہ ہو' اس لیے خدا کے ہاں بخشی جاؤ گی' وہاں اعمال کی رو سے بخشش ہوگی۔'' یہ بیٹی سے کہہ رہے ہیں' پھوپھی سے کہہ رہے ہیں۔ اس بیٹی سے کہہ رہے ہیں جس کی اولاد کے متعلق اب یہ چیز ہے کہ وہ آلِ محمدؐ میں داخل ہیں' ان کے ساتھ محبت کی جائے گی حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس بیٹی سے یہ کچھ کہا تھا۔ حضور ﷺ خود اپنے متعلق یہ فرما رہے ہیں۔ اور یہ قرآنِ کریم میں ہے کہ ''میں بھی اگر خدا کے احکام کی نافرمانی کروں تو اس کے عذاب سے میں بھی نہیں بچ سکتا (6:15)۔'' یہ کئی جگہ آیا ہے۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے یہ مقامات آپ کے سامنے آ گئے۔ دونوں ہی چیزوں یعنی نسلی یا نسبی امتیاز کے خلاف قرآن کریم نے جو کچھ کہا تھا' اس میں اجر رسالت کی جس طرح سے نفی کی گئی وہ آپ کے سامنے آ گئی۔ جیسا میں نے کہا ہے کہ اگر اس آیت کے یہ معنی لیے جائیں کہ میں تم سے اجرِ رسالت نہیں مانگتا بجز اس کے کہ تم میرے رشتے داروں سے محبت کرو تو دونوں ہی چیزیں اس میں آ گئیں: اجرِ رسالت بھی مانگ لیا اور نسلی و نسبی رشتے کا قیامت تک کے لیے ایسا رکھا کہ ان کے ساتھ محبت تمہارے لیے جزوِ ایمان ہوگئی۔ اب اسے سمٹا کر آپ آلِ محمدؐ میں بھی کیوں نہ لے آئیں' یہ تو پھر اس کے بعد کی تاویل ہوگی۔

فِی الْقُرْبٰی کا قرآنی مفہوم

یہاں فِی الْقُرْبٰی (42:23) کے معنی اگر آپ یہ ''میرے رشتہ داروں میں'' کرتے ہیں' تو پھر ان کو سمٹا کر آپ یہاں تک کیوں لے آتے ہیں؟ پہلے تو اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی (42:23) ہے۔ اسے عربی زبان کی رو سے لیجیے۔ پہلے تو وہ جو ''اِلَّا'' ہے' اس کو لیجیے۔ میں نے عرض کیا ہے اور ایسے احباب موجود ہیں جو عربی جانتے ہیں' انہیں معلوم ہوگا کہ جب ''اِلَّا'' استثنائے منقطع میں آتا ہے تو وہ پہلے جو کہا جاتا ہے' یہ بالکل اس کی نفی کر کے ایک نئی بات ہوتی ہے یعنی میں تم سے کوئی اجرِ رسالت نہیں مانگتا' کچھ نہیں چاہتا' میں چاہتا یہ ہوں کہ یہ کرو۔ یہ اجرِ رسالت نہیں ہے۔ یہ دو باتیں ہوگئیں' جیسے وہاں کہا کہ اجرِ رسالت نہیں مانگتا' چاہتا یہ ہوں کہ تم خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لو۔ تو اجرِ رسالت سے اس کو تعلق نہیں ہے' یہ بات تو میں چاہتا ہی نہیں تھا' جیسے میں کہوں کہ بھئی! اس درس میں آنے کے لیے تو میں تم سے کچھ معاوضہ نہیں مانگتا لیکن میں اتنا تو چاہتا ہوں کہ وقت پہ آ جایا کرو' تو یہ میرے اس درس کا معاوضہ نہیں ہوا بلکہ ہوا یہ کہ دو باتیں ہیں جو میں چاہتا ہوں: یہ تو میں چاہتا نہیں ہوں کہ میرے درس کا کوئی معاوضہ دو لیکن یہ تو میں ضرور چاہوں گا کہ وقت کے او پر آیا کرو

یا بیچ میں بولا نہ کرو۔ایک ''اِلَّا'' یہ بھی ہوتا ہے۔قرآن کریم کی اتنی آیات کی رو سے تو یہ معنی یہاں صاف ہو جاتے ہیں کہ اجرِ رسالت تو یہ نہیں ہے۔پھر یہ کیا بات ہے جو رسول اللہؐ چاہتے ہیں؟ **اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى** (42:23) تو ہےٗاس کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ میرے رشتے داروں سے محبت کرو۔

عزیزانِ من! قربیٰ کا ترجمہ ''رشتے دار'' ہوتا ہی نہیں ہے۔قربیٰ کے معنی ''رشتہ داری'' ہوتا ہے۔شاید یوں سطحی طور پہ بات ذہن میں نہ آئے۔یہ رشتے داری کے تعلقات ہیں' میرے فلاں رشتہ دار سے رشتے داری کے تعلقات ہیں۔قرآن کریم میں جہاں ذی القربیٰ آیا ہے' اس کے معنی ہیں جن سے رشتہ داری کے تعلق ہوں۔''رشتے داری کے تعلق'' یہ قربیٰ کے معنی ہیں' میرے رشتہ دار نہیں۔ ''میرے'' قربیٰ کے لفظ میں تو یہاں بات ہی نہیں آ رہی' اس کے تو معنی ہی ''رشتہ داری'' ہے۔اب سوال یہ ہے کہ حضورؐ نے کیا کہا ہے؟ وہ تاریخ بتا رہی ہے اور قرآن کریم خود بتا رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ انہی میں سے تھے' عرب کے ممتاز ترین قبیلہ قریش میں سے تھے' اس قبیلہ قریش کا جو ممتاز ترین شعب بنو ہاشم تھا اس میں سے تھے' عبدالمطلب کے پوتے تھے' بڑا معزز خاندان تھا' قریش خود بڑے معزز تھے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سے تھے۔ان سے رشتہ داری کے تعلقات تھے۔

نبی اکرم ﷺ کو سب سے زیادہ اذیت آپؐ کے قریب ترین رشتہ داروں نے ہی پہنچائی

عربوں کے ہاں صلہ رحمی ایک خصوصیت چلی آ رہی تھی۔یہ وہی ہے جسے رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات کہتے ہیں۔ان کے آپس کے بڑے تعلقات ہوتے تھے لیکن یہاں یہ صورت ہوئی کہ حضورؐ نے انہی کے اندر اپنی آواز بلند کی اور انہوں نے یہ جو سب سے زیادہ قریب ترین رشتے دار تھے' سب سے زیادہ تکلیفیں پہنچائی تھیں۔یہ جو آپ ﷺ کے ساتھ پہلے اولیں مسلمان ہوئے ہیں وہ بھی ان قریش میں سے تھے۔ان کے ساتھ بھی ان کی کیفیت یہ ہوئی تھی کہ انہوں نے' وہ جو عربِ جاہلیت کی خصوصیت تھی کہ باہمی رشتہ داروں کے ساتھ' وہ اپنے علائق ویسے ہی قائم رکھا کرتے تھے' اس کو بھی بالائے طاق رکھ دیا۔قرآن کریم اس کی شہادت دیتا ہے۔میں نے عرض کیا ہے کہ میں تو سند قرآن کریم سے لیتا ہوں۔تاریخ ہمیں یہ بتا رہی ہے کہ عربوں کے ہاں اس چیز کی بڑی خصوصیت تھی' یہ جو ان لوگوں کے ساتھ ان کا Attitude (روّیہ) تھا' وہ لوگ ان کو بڑی ہی تکالیف پہنچاتے تھے' ان کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ان لوگوں کی وجہ سے حضور ﷺ کو اپنی چھوٹی سی جماعت کو لے کر مکے سے اپنے گھر بار' بال بچے' چھوڑنے پڑے اور دور تین سو میل کے فاصلے پہ جا کر پناہ گزینی کی زندگی بسر کرنا پڑی۔قریش نے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ یہ صورت پیدا کی تھی۔قرآن کریم نے خود کہا ہے کہ **لَا يَرْقُبُوْنَ فِىْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ** (9:10) ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جو اپنے ہاں کے معاشرے کی'

سوسائٹی کی انسانیت کی حدود تھیں یہ ان کو بھی پھاند گئے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ **اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً** (9:10) جو کچھ Agreement (معاہدہ) کرتے ہیں جو باتیں آپس میں Agreement (معاہدہ) کے ذریعے ضمانتیں دیتے ہیں اس کی بھی پرواہ نہیں کرتے "اِلًّا" اور وہ جو رشتہ داری کے تعلقات ہوتے ہیں یہ اس کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

اہل قریش کے متعلق حضور ﷺ کا فرمان: رشتہ داری کے تعلقات کا تو کم از کم خیال رکھو اور پھر فتح مکہ

خود قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ان کی یہ کیفیت تھی اسی کی تفسیر ہے جو اس آیت میں آئی ہے۔ آپؐ نے کہا کہ میں جو کچھ تم سے کہتا ہوں اس کا میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، لیکن یہ جو کچھ تم اپنے رشتہ داروں سے کر رہے ہو جو ایمان لے آئے ہیں اتنا تو کم از کم میں ضرور چاہوں گا کہ تم وہ اپنے ہاں کی عربی خصوصیات، قریشی خصوصیات، رشتہ داروں کے ساتھ جو تمہارے تعلقات جس قسم کے ہونے چاہئیں اس کو تو فراموش نہ کرو۔ میں تمہارے خلاف کیا کہتا ہوں یہ تمہارے خلاف کیا کرتے ہیں جس کی وجہ سے تم نے اپنے رشتہ داری کے تعلقات کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے یعنی ان کے ہاں کے باپ ان کے ہاں کے یہ جو مسلمان ہو جاتے تھے یا چچا یا بھائی وہ ان کو تکلیفیں دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ کس جرم میں؟ تمہارے خلاف تو یہ کچھ نہیں کہتے لیکن تم ہو کہ اتنا سا خیال بھی نہیں رکھتے جتنا رشتہ داری کا رکھنا چاہیے تھا۔ یہ مکے کی ابتدائی زندگی ہے۔ وہاں ابھی یہ سارے اکٹھے رہتے تھے۔ نبی اکرمؐ اور آپؐ کے ساتھ یہ جتنے بھی آپ کے عزیز تھے وہ ایک کنبہ تھا جو وہاں رہتے تھے۔ اس کنبے کو محصور کر کے تباہ کرنے کی اسکیم بنائی۔ یہ وہ ہے جسے شعبِ ابی طالب کہتے ہیں۔ ان کو مکے سے ایک طرف نکال دیا گیا ان کو ایک چھوٹے سے [1] خطے کے اندر پناہ لینا پڑی اپنے رشتے داروں سے پناہ لینی پڑی صرف اس لیے کہ یہ دعوتِ رسالت دیتے تھے۔ بات تو یہ کہی گئی کہ اپنی اس دعوتِ رسالت میں اجر تو تم سے کچھ نہیں مانگتا کہ بابا! اجر تو چھوڑ دیجیے لیکن یہ جو کچھ سلوک تم کر رہے ہو وہ تو رسالت، کفر اور ایمان تو ایک طرف رہا یہ تمہارے ہاں کے عام انسانیت کے شرف کے خلاف ہے تمہارے ہاں کی خصوصیت کے خلاف ہے معاشرہ کے تقاضوں کے خلاف ہے کہ تم یہاں تک چلے جاؤ۔ کم از کم اتنا تو خیال رکھو۔ یہ ہمارا جرم ہے کہ ہم خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ یہ جرم تو ایسا نہیں ہے کہ اس کی پاداش میں تم ان روایات و تعلقات کو بھی بھول جاؤ اور آپس میں تمہارے رشتہ داری کے جو تعلقات ہوا کرتے تھے انہیں چھوڑ دو۔ کم از کم اتنا تو خیال رکھو۔ یہ وہی ہے جو اُس فقیر نے کہا تھا جو ان سے مانگنے گیا تھا کہ "چھڈی تیری چھاچھ، کتے مگروں لہا۔"[2] جو میں چھوڑتا ہوں وہ لسّی مانگنے آ گیا تھا اس کو تو چھوڑ دیجیے یہ جو میرے پیچھے کتے ڈال دیئے

---

[1] تاریخ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھ تمام مسلمانوں کے اس گھاٹی میں قیام کے تین سال انتہائی کربناک تھے۔

[2] تمہاری لسّی (چھاچھ) تو چھوڑی مگر یہ جو کتے میرے پیچھے لگا دیئے ہیں انہیں تو ہٹاؤ۔

ہیں‘ ان کو تو ہٹاؤ۔

قریش نے اپنے ان عزیز رشتہ داروں کے اوپر زندگی اجیرن کر دی تھی۔ آپؐ نے کہا یہ تھا کہ میں اجرِ رسالت کچھ نہیں مانگتا‘ کوئی رعایت نہیں مانگتا‘ او! آپس میں بھی تو تم ایک دوسرے کے بھائی بند‘ چچا‘ تایا ہو‘ آپس میں جو تعلقات رکھ رہے ہو‘ تو ان سے اتنے تعلقات تو کم از کم رکھو‘ اذیتیں تو ان کو نہ دو‘ گھروں سے تو ان کو نہ نکالو۔ یہ ہے‘ عزیزانِ من! جو کہا گیا ہے۔ یہ بڑی صاف بات ہے کہ نہ اجرِ رسالت ہے‘ نہ کسی ایسی چیز کا تقاضا ہے کہ جس میں خصوصیت سے کوئی رعایت مانگی گئی ہو۔ صرف ایک معاشرتی تعلقات کا تقاضا کیا گیا ہے اور وہ بھی یہاں تک۔ جب انہوں نے یہ چیزیں نہیں مانیں‘ بالکل کوئی رعایت نہیں دی‘ تو آخر میں جا کر پھر قرآن کریم کو بھی یہ کہنا پڑا کہ ٹھیک ہے‘ پھر تم بھی ان سے تعلقات منقطع کر لو‘ اس کا اعلان کر دو تا کہ یہ کسی غلط فہمی میں نہ رہیں‘ ان کو معلوم ہو جائے کہ اب تمہارے ساتھ تعلقات یہ ہوں گے لیکن اس کے باوجود جو آپس میں انسانیت کے تعلقات تھے‘ اس میں فرق نہیں آنے دیا‘ ساری عمر جنہوں نے اس قدر تکلیفیں پہنچائیں اور اتنی لڑائیاں لڑیں‘ ان کے ساتھ آخر الامر فتح مکہ کے دن جس وقت وہ سارے‘ یہی قریش رشتہ دار‘ پابجولاں حضورؐ کے ساتھ تھے‘ آپؐ اس وقت سربراہِ مملکت کی حیثیت سے بھی تھے‘ کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے بھی تھے‘ فتح مکہ تھا‘ قریش مغلوب تھے‘ مفتوح تھے‘ یہی جن سے یہ چیز کہی جا رہی ہے‘ ان سے کہا گیا کہ ساری عمر کی اس دشمنی کے بعد اور میدانِ جنگ میں سمجھو مفتوح و مغلوب ہوئے‘ قیدیوں کی حیثیت سے تھے‘ پوچھا: کہو تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ وہ بھی تو عرب تھے۔ کہا کہ ٹھیک ہے جو دشمن کا سلوک دشمن کے ساتھ ہوتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم نے مجھے بھی عام دشمن تصور کر لیا‘ سنو! **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92) تم سے آج کوئی مواخذہ نہیں ہے‘ جو مغلوب و مفتوح‘ اس کیفیت میں سامنے آئے‘ اس سے زیادہ تمہیں کیا سزا دی جائے‘ یہ تھوڑی سزا ہے: **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92) یہ تعلقات تھے۔ ان میں سے ابھی کوئی مسلمان نہیں ہوا تھا‘ اتنے دشمن تھے کہ سات سال تک لڑائیاں لڑتے رہے اور کہا **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92) اُدھر سے یہ کیفیت تھی‘ اِدھر سے اتنا ہی تقاضا تھا کہ بھئی! تم آپس میں رشتہ داری کی بنا پہ جو تعلقات رکھتے ہو‘ آپس میں بھی تو کافر اور کافر کے ساتھ رکھ رہے ہو‘ وہ تعلقات تو کم از کم رہنے دو۔ انہوں نے اس کو مانا۔ یہ تھا جو حضور ﷺ نے یہاں چاہا۔

زیرِ نظر قرآنی آیت کو یہ معنی کس طرح پہنائے گئے؟ یہ تاریخ کا حصہ ہے‘ بنو ہاشم بھی اور بنو امیہ بھی

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس آیت کو یہ معنی کس طرح پہنائے کہ آپ ﷺ نے کہا تھا کہ میں تم سے کچھ اجرِ رسالت نہیں مانگتا لیکن میرے رشتہ داروں کے ساتھ تم محبت کرو۔ جو رشتہ دار ہیں وہ سمٹ کر پھر آلِ محمدؐ کے اندر آ گئے‘ جنہیں اہلِ بیت کہا جاتا ہے وہاں تک یہ

سمٹ گئے۔ یہ چیزیں کیسے پیدا ہوئیں؟ یہ تاریخ کا حصہ ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد خلافت میں حضرتِ علیؓ ❶ اور حضرتِ عباسؓ ❷ موجود تھے۔ اگر وہ پرانی وراثت کا سوال ہوتا' اس زمانے میں تو بادشاہت بھی وراثت میں آیا کرتی تھی' تو وہ انہیں ملنی چاہیے تھی لیکن ان کی بجائے وہ اُنہیں ملی جو حضورؐ کے اس طرح سے رشتہ دار یا آلِ محمدؐ میں نہیں آتے تھے۔ تینوں ❸ جو آپ کے خلفائے اول ہیں' ان کی صورت یہ ہوئی کہ وہ بنو ہاشم ❹ میں سے بھی نہیں تھے۔ اُن کے بعد ❺ آگے بات آئی۔ اب بنی امیہ ❻ آگئے' ان کی سلطنت آئی۔ یہ دونوں بنو ہاشم اور بنو امیہ تو ایک دوسرے کے علی الرغم قبیلے تھے۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ ❼ کے ہاں سلطنت آئی۔

بنو ہاشم اور بنو امیہ کی سلطنت کے خلاف گہری سازش

بنی اُمیہ برسرِ اقتدار آئے تو بنی عباس کے دل میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھی۔ ایرانی اس قسم کے مواقع کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی۔ بنی اُمیّہ کی سلطنت کے خلاف' جسے کہیے کہ ایک تنظیم کے تابع تحریک تھی' سازش تھی' وہ تیار ہوئی۔ ایران میں خراسان اس کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہاں لوگوں کو ان بنی امیہ کے خلاف بہر حال ابھارنا ہوتا تھا' تنظیم بہت بڑی تھی۔ ابو مسلم خراسانی'

---

❶ حضرت علیؓ حضورؐ کے چچازاد بھائی اور داماد۔

❷ حضرت عباسؓ حضورؐ کے چچا۔

❸ (1) خلیفہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (632-634AD) (2) خلیفہ حضرت عمرؓ (634-645AD) اور (3) خلیفہ حضرت عثمانؓ (645-656AD)۔ یہ تینوں بنو ہاشم میں سے نہیں تھے۔

❹ اہل عرب عموماً عدنان کی اولاد ہیں اور عدنان کا سلسلہ حضرت اسمٰعیلؑ تک پہنچتا ہے۔ عدنان کے نیچے گیارھویں پشت میں فہر بن مالک' ایک ذی اقتدار شخصیت گزری ہے۔ انہی کی اولاد ہے جو قریش کے لقب سے مشہور ہے۔ قریش کی نسل میں دس اشخاص نے بڑا نام پیدا کیا اور انہی کی نسبت سے قریش کے دس جداگانہ قبیلے وجود میں آئے۔ ان میں سے ایک قبیلہ ہاشم تھا جس سے رسول اللہ متعلق تھے' اور ایک قبیلہ عدی جس کی اولاد سے (حضرت) عمرؓ تھے (پرویزؒ: شاہکار رسالت' ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' 1987' ص ص۔ 6 تا 7)۔

❺ چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ (656-661ء) تھے۔

❻ بنو امیہ کا عہد 661 تا 750 عیسوی ہے۔

❼ بنی عباس اور بنی امیہ ایک ہی شجر کی دو شاخیں تھیں۔ ان کی باہمی رشتہ داریاں بھی تھیں۔ (مثلاً) امام حسینؓ کی بھتیجی' یعنی حضرت عبداللہ بن جعفر طیار کی صاحبزادی' سیدہ ام محمدؒ یزید کے عقد میں تھیں اور امام حسینؓ کی زوجۂ محترمہ (والدۂ حضرت علی اکبر) امیر معاویہؓ کی حقیقی بھانجی تھیں۔ جب سلطنت' بنی امیہ کی طرف منتقل ہوگئی تو ایرانیوں کی سازش کا رُخ بھی انہی کی طرف پھر گیا۔ اس مقصد کے لیے انہیں بنی عباس کی شکل میں ایک مؤثر مہرہ ہاتھ آ گیا۔ اس سلسلہ میں شجرۂ نسب پر ایک نگاہ ڈال لینا مفید ہوگا۔ قریش میں عبد مناف ایک ممتاز شخصیت گزری تھی۔ وہ ان دونوں خاندانوں کا مورث تھا۔ اس سے سلسلہ آگے چلا

تاریخ کی ایک شخصیت ہے،اس تحریک کا بہت بڑا داعی تھا۔ یہ عباسیوں کے حق میں پراپیگنڈہ کا سب سے بڑا داعی تھا۔اب وہاں لوگوں کو جو دعوت دی جاتی، جو بنی امیہ کے خلاف ابھارا جاتا، وہ اس عقیدہ پر تھا کہ خلافت ''اہل بیت'' کا حق وراثت ہے۔ یہ انہی کو ملنی چاہیے۔ یہ اس اہل بیت کے نام سے ابھارا جاتا تھا۔ بنی امیہ کے خلاف تو بنی عباس تھے جو چاہتے تھے کہ سلطنت ان کو مل جائے۔ یہ اب سلطنت بنی عباس ہوگئی تھی۔ یہ بنی عباس تو اپنے اندر کوئی اتنی Attraction (کشش) نہیں رکھتے تھے کہ اس کے نام کے اوپر یہ ابومسلم خراسانی ❶ لوگوں کو دعوت دے کہ بنوامیہ حق پر نہیں ہیں، بنی عباس حق پر ہیں۔ان کو سلطنت ملنی چاہیے۔ وہاں تو چیز یہ تھی کہ بنی عباس کی اپنی کوئی ایسی خصوصیت نہیں تھی جس کی بنا پر عوام کو انکا طرفدار بنایا جاسکتا۔اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ابومسلم خراسانی نے وہی پرانہ حربہ استعمال کیا، البتہ اس کا ہدف تبدیل کردیا۔لوگوں کے دل میں کیا Attraction (کشش وجاذبیت) تھی؟ یہ جنہیں ہم اہلِ بیت یا سادات ❷ کہتے ہیں، ان میں سے یہ حضرات بھی وہاں موجود تھے۔ یہ ایک چیز ایسی تھی کہ جس میں Attraction (کشش وجاذبیت) ہوجاتی تھی، پھر اس کے ساتھ واقعہ کربلا کو ملایا جاتا تھا۔تو ابومسلم خراسانی نے یہ دعوت دی تھی۔ کہا یہ تھا کہ یہ حق سلطنت اہلِ بیت کا ہے۔ وہاں اہلِ بیت کی یہ اصطلاح آتی ہے۔

خلافت کے سلسلہ میں شیعہ حضرات اور سنیوں کے ہاں تصورِ خلافت اور امامت

خلافت کے بارے میں شیعہ حضرات کا تو عقیدہ ہی مختلف ہے۔سنیوں کے ہاں تو یہ خلافت باہمی مشاورت سے، انتخاب سے، یوں آتی ہے۔ان شیعہ حضرات کے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد نبوت تو ختم ہوگئی لیکن جو امامت ہے وہ جاری ہوئی۔ یہ امامت کم و بیش نبوت ہی کے برابر ہے کیونکہ ان اماموں کی طرف بھی جبریل آتے ہیں۔خدا کی طرف سے پیغامات لاتے ہیں، ان کی اپنی شریعت

---

❶ ابومسلم خراسانی کا نام ابراہیم بن عثمان بن بشار تھا۔ یہ ایرانی الاصل اور بزرجمہر کی اولاد سے تھا۔اصفہان میں پیدا ہوا اور کوفہ میں ابتدائی پرورش پائی۔ بلا کا ذہین اور اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ پراپیگنڈہ کے فن میں اس کا کوئی حریف نہیں تھا۔ محمد (عباسی) کے بیٹے ابراہیم نے اس کی صلاحیتوں کو بھانپا اور پراپیگنڈہ کا شعبہ اس کے سپرد کردیا۔ اس نے ''اہل بیت'' کے نام سے اس قدر شدّ ومدّ سے پراپیگنڈہ کیا کہ سلطنتِ بنی امیّہ کی بنیادوں میں تزلزل واقعہ ہوگیا۔ اس دوران میں فاطمیین نے بھی بنی امیہ کے خلاف محاذ آرائیاں کیں۔ (مثلاً) 61ھ میں کربلا کا واقعہ ظہور میں آیا۔ 122ھ میں، امام زین العابدین کے فرزند زید نے، کوفہ سے بغاوت کی۔ 126ھ میں زید کے بیٹے یحییٰ نے خراسان سے۔ان کے علاوہ حضرت جعفر طیارؓ کی اولاد میں سے عبداللہ بن معاویہ نے 127ھ میں کوفہ سے علمِ بغاوت بلند کیا لیکن یہ کامیاب نہ ہوسکے (پرویزؒ: شاہکارِ رسالت، (1987)، ص۔458)۔

❷ امام حسنؓ اور امام حسینؓ حضرت فاطمہؓ کے بطن سے تھے۔ان کی اولاد کو عام طور پر سادات کہا جاتا ہے۔حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ نے متعدد شادیاں کیں جن سے آپ کے ہاں بکثرت اولاد ہوئی۔ روایات کی رو سے، ان کے ہاں اٹھارہ بیٹے اور اٹھارہ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ان میں سے جو بیٹے حضرت فاطمہؓ کے علاوہ، دوسری بیویوں سے پیدا ہوئے، ان کی اولاد علوی کہلاتی ہے (پرویزؒ: شاہکار رسالت (1987)، ص۔457)۔

ہوتی ہے۔ یہ ان کا عقیدہ ہے کہ امامت قائم ہوئی اور امامِ اول حضرتِ علیؓ (600-661AD) تھے۔ امامت میں ان کے ہاں یہ چیز ہے کہ اب یہ امامت حضرتِ علیؓ (600-661AD) کی اولاد میں جائے گی۔ یہ ہے وہ نسلی چیز اور ان کا ایمان۔ ان کا یہ عقیدہ ہے۔

مجھے کسی کے عقیدہ سے کوئی واسطہ نہیں: پرویزؒ

مجھے کسی کے عقیدے سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں تو ایک حقیقت بیان کرتا ہوں کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ سلطنت امام کے سلسلے سے آگے چلے گی۔ اب تاریخی بات سامنے آ گئی تو میں عرض کروں کہ یہ سلسلہ گیارہ اماموں تک تو جاری رہا۔ وہ جوان کے بارھویں امام تھے' ان کے متعلق تو تاریخ میں معلوم نہیں کہ کیا بات ہوئی۔ آگے ان کا اولاد کا سلسلہ نہیں ہے۔ چونکہ یہ عقیدہ تھا کہ امام اولاد میں سے آنا ہے' اس اعتبار سے تو امامت ختم ہو جاتی تھی۔ اب وہاں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ بارھویں امام زندہ ہی غائب ہو گئے' اب وہ ایک غار کے اندر ہیں' اور وہ غار عراق میں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ امام غائب ہیں اور وہاں غار میں زندہ موجود ہیں' وہ قیامت کے قریب غار سے باہر آئیں گے لیکن ان کی امامت صرف مذہب سے تعلق نہیں رکھتی' جو عقیدہ ہے' جو دنیا کی حکومت ہے' وہ بھی امام کے ہی حق میں ہوتی ہے' جو صحیح و جائز حاکم ہوتا ہے' ان کے نزدیک وہ امام ہی ہوتا ہے۔ اب اگر باہر ہمارے پاس' وہاں امام موجود نہیں ہے' تو امام جس کو اپنا نائب مقرر کر دے' اس کو خدا کی طرف سے حقِ حکومت حاصل ہو جاتا ہے' وہ خدا کی حکومت قائم کرتا ہے۔ امام تو براہِ راست خدا کی حکومت قائم کرتا تھا۔ امام کی غیر حاضری میں' وہ امام کا جو نائب ہے' وہ خدا کے نائب کی حیثیت سے حکومتِ خداوندی قائم کرتا ہے۔ یہ جو ایران کے موجودہ امام خمینی [1] ہیں' وہ کہتے ہیں کہ اس وقت ان کا یہ منصب ہے۔

بہرحال' عزیزانِ من! میں ایران کے ابومسلم خراسانی کی اس دعوت کا بیان کر رہا تھا جو وہاں ایران میں خراسان کے مرکز سے چلی۔ تو وہاں یہ جو ابومسلم خراسانی ان میں سے موجود تھے' اس نے' وہ جو کربلا کا واقعہ تھا' اس کو ابھارا' حقِ سلطنت اہلِ بیت کا بتایا۔ وہ بہت بڑا سیاسی آدمی تھا۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ''اہلِ بیت'' کی اس اصطلاح سے اس نے اور عباسیوں نے بھی کتنا بڑا فائدہ اٹھایا۔ یہ اصطلاح اتنی زیادہ عام ہوئی کہ اسی میں انہوں نے ''امام مہدی'' کا عقیدہ وضع کیا۔ بہرحال یہ تو لمبی تاریخ ہے' کبھی وقت ہوا تو میں بیان کروں گا۔ موضوع زیرِ نظر کے اعتبار سے میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ پھر وہ جو ابومسلم خراسانی کی اتنی بڑی تنظیم تھی وہ غالب آ ئی۔ ادھر سے بنی امیہ کے جو آخری [2] حاکم تھے' ان کی بھی کمزوری ہوئی۔ بس:

جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

---

[1] یاد رہے کہ بات جون 1981 کی 12 تاریخ کو کہی گئی تھی۔ یہ ہیں خمینی' آیت اللہ روح اللہؒ (1902-1989AD)

[2] بنی امیہ کا تخت سلطنت 750ء میں الٹا گیا۔ اس کے آخری حاکم مروان ثانی (127/132AH/745-750AD) تھے۔

بنوعباس کی حکومت کا قیام اور ایک حیرت انگیز مثلث

وہ کہتے تھے کہ امام مہدی آئیں گے اور ان کی فوج سیاہ لباس والوں کی ہوگی۔ وہاں سے وہ اٹھے' وہاں آئے اور آ کر بنی امیہ کا تختہ الٹا۔ یہاں آ کر جو سلطنت قائم کی تو یہ جو ان کے اندر عباسی تھے وہ زیادہ غالب تھے۔ یہ جو اہلِ بیت میں سے جنہیں سادات کہتے ہیں' یہ کمزور تھے' تو جو سلطنت بھی تھی' جو حکومت تھی' وہ بنو عباس ❶ نے قائم کر لی۔ اب یہاں ایک مثلث قائم ہوئی۔ ابو مسلم خراسانی نہ عباسی تھا' نہ اہلِ بیت میں سے تھا۔ وہ تو ایرانی تھا۔ اب خلیفہ عباسی ہوئے' اہلِ بیت کو یعنی سادات کو انہوں نے ساتھ رکھا کیونکہ لوگوں کے جو جذبات تھے' وہ ان کے ساتھ وابستہ تھے۔ اب ان تینوں نے جو اپنا اپنا حق تھا' وہ جتانا شروع کیا۔ اب اس کے لیے آسان بات یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی کچھ حدیثیں پیش کر دیں۔ ایرانیوں نے تو یہ کہا اور آپ حیران ہوں گے کہ یہ حدیثیں سُنّیوں کی کتابوں میں ہیں۔ ایرانیوں کی طرف سے تو ابو مسلم خراسانی نے کہا کہ حضرت سلمان فارسیؓ ایرانی تھے۔ یہ تاریخ کچھ اور بتاتی ہے کہ یہ تھے بھی یا نہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کردہ ایک روایت

بہرحال ان کے متعلق سُنّیوں کی یہ حدیثیں ہیں کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ ❷ آپؐ نے ان کے زانو (یا سر) پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ وہ اِس کی قوم کے افراد ہوں گے اور ان میں ایک شخص اس عظمت و شان کا پیدا ہوگا کہ ایمان' ثریا میں بھی کیوں نہ ہو' تو سلمان فارسیؓ اُسے وہاں سے بھی اتار لائے گا اور علم اولین و آخرین کا وارث ہوگا۔ آپؐ نے اس کے مونڈھے پہ ہاتھ رکھ کر اسی طرح کہا کہ اس کی قوم اس کو آسمان سے بھی اتار کر زمین میں لے آئے گی۔ چلیے جناب! آ گئی امامت ایرانیوں کے ہاتھ میں۔ اسی طرح قرآن میں ایک آیت ❸ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم نے اس دین کو چھوڑا یا نظام کو چھوڑا تو تمہاری جگہ ایک اور قوم آ جائے گی جو تم سے بہتر ہوگی اور وہ دین کا تمکن کرے گی تو حضورؐ سے پوچھا گیا کہ حضورؐ وہ کونسی قوم ہوگی تو آپؐ نے سلمان فارسیؓ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ اس ❹ کی قوم ہوگی۔ ایرانیوں نے تو اپنے آپ کو اس طرح Establish (قائم) کر لیا۔

---

❶ بنوعباس کی سلطنت کی ابتدا 750ء میں ہوئی اور اختتام 258 میں ہوا۔ اس کا پہلا خلیفہ ابو عباس الصفا (132-136A.H/750-754A.D) تھا اور آخری خلیفہ معتصم باللہ (640-656A.H/1242-1258A.D) تھا۔

❷ یہ جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ یوں ہے کہ جب سورۃ جمعہ کی یہ آیت نازل ہوئی وَ اٰخَرِیۡنَ مِنۡهُمۡ لَمَّا یَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ (62:3)۔ یعنی نبی اکرمؐ اپنی قوم کی طرف بھی رسول ہیں' اور ان کی طرف بھی جو ان کے بعد آنے والے ہیں۔ تو صحابہؓ نے دریافت فرمایا کہ ان (بعد میں آنے والوں) سے کون لوگ مراد ہیں' حضرت سلمان فارسیؓ آپ کے پہلو میں بیٹھے تھے تو آپ نے ان کے زانو (یا سر) پر ہاتھ مار کر یہ فرمایا۔

❸ یہ اشارہ اس آیت کی طرف ہے: وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَ کُمۡ (47:38)۔

❹ وہ الفاظ یوں ہیں: لوگوں نے پوچھا کہ یارسول اللہ! کس قوم کو اللہ ہماری جگہ چن لے گا۔ آپؐ نے سلمانؓ کے مونڈھے پر ہاتھ مار کر فرمایا: اس کی قوم کو' اس کی قوم کو (پرویزؒ: شاہکارِ رسالت' 1987' ص۔ 454)۔

حجۃ الوداع کے خطبہ کے متعلق متضاد روایات

اب یہ دو پارٹیاں ہوگئیں۔ ایک وہ جنہیں یہ اہلِ بیت یا سادات کہتے ہیں اور دوسری عباسی۔ عباسیوں نے اپنے متعلق ایک روایت وضع کی۔ میرے نزدیک تو یہ ساری وضعی ہیں جو قرآن کریم کی اس بنیاد کے خلاف جاتی ہیں کہ نسبی یا نسلی رشتہ کوئی کیا چیز نہیں ہوتی۔ ان کے ہاں ایک حدیث ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ نبی اکرمؐ سے آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے شکایت کی کہ لوگ مجھے کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تو آپؐ نے لوگوں کو ڈانٹا اور کہا کہ عباسؓ! یاد رکھو! جس شخص کے دل میں بھی تمہاری اور تمہاری اولاد کی محبت [1] نہیں ہوگی وہ کبھی جنت میں نہیں جاسکے گا۔ چلیے جناب! اب عباسیوں کی محبت' جنت کے لیے ویزا بن گئی' عباسیوں نے اپنے آپ کو یوں کیا۔ اب یہ جو سادات تھے ان سے جذباتی طور پہ وابستگی تھی' پہلے یہ چیز آئی تھی۔ حجۃ الوداع کا جو خطبہ تھا' وہ میں نے ابھی عرض کیا ہے' کہ سُنّیوں کی حدیث کی کتابوں میں بھی ہے' بلکہ ان کے جو صحیح ترین مجموعہ کتب صحاح ستہ ہے اس میں بخاری کے اندر ایک جگہ' جہاں اس کا متن دیا ہے' وہاں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میں جا رہا ہوں' ایک چیز تمہارے پاس چھوڑ رہا ہوں' جب تک تم اس کے ساتھ تمسک رکھو گے' کبھی گمراہ نہیں ہوگے اور وہ ہے کتاب اللہ۔ وہ حدیث اتنی ہے ٹھیک ہے' وہیں ایک حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں دو چیزیں تم میں چھوڑ رہا ہوں' کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ۔ یہاں یہ دو آ گئیں۔ اس میں بھی بہرحال سُنّیوں تک بات رہی۔ سُنّیوں ہی کے ہاں یہ حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں' ایک کتاب اللہ اور ایک میری اولاد' آل۔ یہ بھی رسول اللہؐ کی حدیث۔ یہ بتایا گیا کہ حجۃ الوداع کے خطبے کے اندر آپؐ نے دو چیزیں کہیں تھیں' یہ ساری انہی کتابوں کے اندر ہیں۔ انہوں نے وہاں جو اپنا دعویٰ کیا تو انہوں نے کہا کہ یاد رکھو! رسول اللہؐ تو کتاب کے ساتھ عترتِ [2] رسول کو چھوڑ کر گئے ہیں۔ یعنی ایک اولاد اور دوسری آلِ محمدؐ۔ وہ آلِ محمد ﷺ تو ہم ہیں' تم لوگوں کا کیا حق ہے۔ اب یہ چیز سُنّیوں کے ہاں آ گئی کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میں قرآن کریم کے ساتھ اپنی آل بھی چھوڑ چلا ہوں تو اس سے تو مفر نہیں ہے۔ وہ جو اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى تھی' اب یہ اس کی سند لے آئے اور "فی القربیٰ" کے معنی ہوئے "میرے رشتہ داروں سے محبت" اور رشتہ داروں میں یہ ہوئے اہلِ بیت میں' جو شامل ہیں۔

---

[1] عباسیوں کی محبت کے متعلق ایک حدیث یہ ہے کہ "حضور نے فرمایا کہ کسی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان داخل نہیں ہوسکتا جب تک وہ عباسؓ اور ان کی اولاد سے محبت نہ رکھے (تفسیر ابن کثیر' پچیسواں پارہ' تفسیر سورۃ شوریٰ' ص 13)۔

[2] قریبی رشتہ دار، بیٹے، بیٹیاں۔

ابومسلم خراسانی کی طرف سے اہلِ بیت کی وضع کردہ اصطلاح' وراثت کا معاملہ اور عترتِ رسول

میں نے عرض کیا تھا کہ ابومسلم خراسانی نے اہلِ بیت کی اصطلاح وضع کی تھی۔ وہ بڑا سیاسی آدمی تھا۔ عباسیوں نے بھی یہ کہا تھا کہ آپ اس اہلِ بیت میں صرف سادات کو کیوں لیتے ہیں' حضورؐ کے جتنے رشتہ دار مسلمان ہوئے تھے' وہ تھے اور ان سے تو پہلے ہمارا حق ہے۔ یہ بڑی دلچسپ گفتگو ہے۔ اگر آپ اس کی تفصیل معلوم کرنا چاہتے ہیں تو میری کتاب ''شاہکارِ رسالت'' کا آخری ❶ باب دیکھیے۔ اس میں یہ Discussion (بحث) آئی ہے۔ یہ امام' جو اہلِ بیت والے سادات تھے' اور عباسی خلیفہ (منصور) کے درمیان خط و کتابت ❷ ہوتی ہے۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ وراثت میں ہمیں ملنی چاہیے۔ یہ دعویٰ انہوں نے کیا یا کر بیٹھے۔ اس خط و کتابت میں یہ لکھا ہے کہ بہت اچھی بات ہے' اگر یہ دعویٰ اس بنیاد پہ ہے کہ وراثت میں ملنی چاہیے تو رسول اللہ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت موجود تھے اور حضرت علیؓ تو چچا کی اولاد تھے۔ قانونِ وراثت کے اعتبار سے چچا کی اولاد کے مقابلے میں چچا کا حق فائق ہے' لہٰذا یہ سلطنت ہمیں ملنی چاہیے۔ جب گاڑی دوسری پٹڑی پہ پڑتی ہے تو پوچھو نہیں کہ پھر وہ کہاں تک جاتی ہے۔ اس اعتبار سے انہوں نے کہا کہ آپ ہمیں' جن کو اہلِ بیت کہا ہے' اس میں شامل کیوں نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں' اہلِ بیت نہیں' آپ نے عترت کہا تھا اور وہ تو اولاد کے اندر ہی آتا ہے۔ وہ جو حجۃ الوداع کا خطبہ تھا' اس لحاظ سے سلطنت تو انہی کے اندر آنی چاہیے۔ اب یہ جو آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہوئی' وہ کہاں تک آگے بڑھی' وہ بھی اتنی ہی دلچسپ اور عبرت آموز ہے۔

شیعہ حضرات اور سُنّی حضرات کی الگ الگ حدیثوں کے مجموعہ جات' ان کا مقام اور درود

عزیزانِ من! پہلے سُنّیوں کو لوں یا شیعہ حضرات کو لوں؟ چلیے! شیعہ حضرات کے متعلق بات کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تو میں نے کہا ہے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ نبوت کے بعد امامت جاری ہے' جو امام ہیں' ان کا قریباً وہی مرتبہ ہے جو نبی کا مرتبہ ہوتا ہے۔ جس طرح سے بخاریؒ سُنّیوں کے ہاں ہے اور جس طرح ان کے ہاں صحاح ستہ' چھ حدیث کی کتابیں' صحیح مانی جاتی ہیں' اسی طرح ان شیعہ حضرات کے ہاں

---

❶ عباسیوں نے سلطنت ''محبتِ اہلِ بیت'' کے نقاب میں حاصل کی تھی۔ اہلِ بیت کو یہ بات فطرۃً کھٹک رہی تھی کہ سلطنت حاصل کرنے کے لیے ہر جگہ ان کا نام لیا گیا اور جب وہ حاصل ہو گئی تو بنوعباس ان کے مالک بن بیٹھے چنانچہ محمد نفس زکیہ ان کے خلاف اٹھے لیکن ناکام رہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ امامت کی وارث حضرت علیؓ کی اولاد ہے' حضرت عباسؓ کی نہیں۔ عباسی خلیفہ منصور نے ان کے اس دعویٰ کی تردید کی اور کہا کہ وراثت کے اصول کے مطابق خلافت' آلِ عباس کو ملنی چاہیے۔ اس موضوع پر ان دونوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی' وہ بڑی دلچسپ اور عبرت آموز ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ خلافت' جو قرآنی اصولوں کے مطابق' بلا لحاظ نسل و نسب' صرف جوہر ذاتی کی بنا پر کسی کو امت کے مشورے سے تفویض ہونی چاہیے تھی' کسی طرح وراثت قرار پا گئی۔ اس کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: شاہکارِ رسالت' ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' 1987' ص ص۔ 459 تا 464۔

❷ اس آخری باب کا نام ہے: شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد۔

چار کتابیں ہیں۔ان سے بالکل برعکس انہوں نے اپنے ہاں یہ رکھا ہے کہ اپنی احادیث کو وہ اپنے اماموں کی سند سے لیتے ہیں۔اس اعتبار سے ان کے نکتہ نگاہ سے وہ سُنّیوں کی حدیثوں سے زیادہ معتبر ہیں۔ بہرحال ان میں الکافی سب سے اونچی سمجھی جاتی ہے۔ میری کتاب ''شاہکارِ رسالت'' میں آپ دیکھیں گے کہ میں نے الکافی کے بہت سے اقتباسات دیئے ہوئے ہیں۔اس میں امام جعفر صادقؒ کے متعلق ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم وہ ہیں جن کی اطاعت خدا نے فرض قرار دی ہے جس نے ہم کو پہچانا وہ مومن ہے جس نے انکار کیا وہ کافر ہے۔سند یہی ہے۔امام باقرؒ نے فرمایا کہ ہماری محبت ایمان ہے ہمارا بغض کفر ہے۔وہ ہیں ہی کتابیں انہی کے اوپر انہی دعاوی کے اوپر انہی حضرات کے اوپر۔ٹھیک ہے جی! یہ شیعوں کا اپنا عقیدہ امام کے متعلق ہوا۔سُنّی ان کو کیسے سہیں؟ کبھی آپ نے نماز میں یہ سوچا ہے کہ ساری نماز ختم کر کے جو تشہد بھی ہے وہ بھی ختم کرنے کے بعد پھر درود پڑھا جاتا ہے۔قرآنِ کریم میں تو رسول اللہؐ کے متعلق مسلمانوں کو حکم ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (33:56) اللہ اور اس کے ملائکہ میں یہاں درود کا مفہوم نہیں پیش کر رہا اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56) مومنین کو حکم دیا گیا ہے کہ تم بھی رسولؐ پر درود بھیجو۔یہ وہ ہے جو ترجمہ کیا جاتا ہے۔یہ صَلُّوْا عَلَیْہِ (33:56) ہے کہ درود بھیجو۔سُنّی اپنی نماز کے آخر میں درود بھیجتے ہیں۔خدا نے تو یہ کہا تھا کہ صَلُّوْا عَلَیْہِ (33:56)۔یہ کہتے ہیں کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ۔ عزیزانِ من! مجھے کسی کے عقیدے سے کوئی غرض نہیں ہے۔حقائق بیان کرتا ہوں جس کی کوئی تردید نہیں کر سکے گا۔میرے سامنے قرآن مجید کی روشنی ہے جو فیصلہ کرنے والی بات ہے۔میں کون ہوتا ہوں فیصلہ کرنے والا؟ ان کے درود میں یہ آلِ محمد والی چیز شامل ہو گئی۔اب سُنّی اس سے کیسے انکار کر سکتا ہے وہ تو آلِ محمدؐ کے اوپر درود بھیجنے کے لیے مجبور ہے۔

کچہری میں کسی ایک سید کے متعلق سُنّی کا بیان اور پھر نماز میں درود

عزیزانِ من! کسی سُنّی کا کچہری میں کسی سیّد کے خلاف مقدمہ ہو اور وہاں وہ ثابت کرے کہ یہ مکار ہے فریبی ہے جھوٹا ہے فاسق ہے فاجر ہے سب کچھ ہے اور درمیان میں کچہری کی بریک (وقفہ) آ جائے وہ ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے آئے ظہر کی نماز کے بعد جب آخر میں نماز ختم کرنے سے پہلے کہے کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ یعنی اس پہ درود بھیج کے وہاں کچہری میں جا کر کہے کہ یہ بڑا بے ایمان ہے تو یہ کیا تضاد ہوا!!! اٰلِ محمد ان کے درود میں شامل ہے۔میں نے عرض کیا ہے کہ شیعہ حضرات کا تو اپنے ہاں وہ عقیدہ محکم ہے اس میں ان کے Compromise (مفاہمت) کرنے کا سوال ہی نہیں۔جب ان کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ نبوت کے بعد امامت ہے امامت نسل میں حضرت علی کرم اللہ وجھہ کی اولاد میں چلتی ہے آخر تک اس کے عقیدے کی یہ ساری چیزیں ہیں تو یہی سُنّی اس

کی تردید کر سکتے تھے لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ سُنّیوں کے ہاں، میں صحیح بخاری کی بات کر رہا ہوں، یہ الِ محمد کی حدیث ہے۔

مشکوٰۃ کی ایک حدیث

اب ساتھ ہی مشکوٰۃ یاد آ گئی۔ مشکوٰۃ میں ایک حدیث ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ میری جو آل ہے یا میرے جو اہلِ بیت ہیں، یہ کشتی نوح ہیں۔ جو ان کے ساتھ بیٹھ جائے گا، وہ تو اس طوفان سے پار ہو جائے گا، جو نہیں بیٹھے گا غرق ہو جائے گا۔ یہ ان کی اپنی کتابوں کے اندر ہے، اور آپ کے ہاں حدیث کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی کسی ایک حدیث کا بھی انکار کرنا کفر ہے۔ کیجیے ان سے انکار!! اس کا نتیجہ یہ ہے، عزیزانِ من! اب میں جلدی سے بات ختم کر دینا چاہتا ہوں، مگر شاید ہی ختم کر سکوں، عام اہلِ شریعت کی یہ ساری باتیں میں کر رہا ہوں، یہ درود کی بات ہے۔ اس کا جو ترجمہ ہے، یہ ہمارے ہاں کے سُنّیوں کے ہاں ترجمے میں ملتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں کوئی اجرِ رسالت نہیں مانگتا بجز اس کے کہ میرے رشتہ داروں سے محبت کرو۔ یہ ان کے ہاں کی بات ہے۔ پھر اس میں ان کی تفاصیل اسی کے متعلق ہیں۔ یہ نبی اکرم ﷺ تو خیر، ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ، آپ کی اولاد حسنین رضی اللہ عنہما[1] حضرتِ فاطمہ رضی اللہ عنہا، باقی جتنے بھی ہیں، ان کے متعلق شیعہ مسلمان چھوڑ دیجیے، ان کا تو وہ ایمان ہے، باقی سُنّی مسلمانوں کے دل میں بھی جتنا احترام اور جتنی محبت ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔

تصوف کی قید میں بیس برس تک گرفتار رہنے والی شخصیت، پرویزؒ کی زبانی، تصوف کے خانوادوں کی روئداد

بہرحال احترام تو اور چیز ہے لیکن ان کے متعلق ایک چیز آپ کے ہاں آئی۔ یہ تصوف خالص غیر قرآنی چیز ہے اور یہ قلندر، ہر چہ گوید دیدہ گوید، جو بیس برس تک خود پیر رہا ہو، اس سے زیادہ معتبر کون ہو سکتا ہے۔ تصوف ہے ہی تشیّع اور عجیب چیز ہے کہ شیعوں کے ہاں تصوف نہیں ہوتا، ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کے ہاں امام کی موجودگی میں کسی چیز کا سوال ہی نہیں، تصوف یہ ہے کہ خدا تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے۔ تصوف میں مختلف خانوادے ہیں جس طرح سے آپ کے ہاں یہ دیوبندی اور بریلوی اور اہلحدیث اور اہلِ فقہ ہیں، ان کے ہاں بھی یہی جھگڑا ہے۔ دونوں خدا کے ہاں سے آتے ہیں، دونوں لٹھم لٹھ ہو رہے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں جتنے یہ خانوادے کہلاتے ہیں، ان کے ہاں مختلف جتنے تصوف کے خانوادے ہیں، ایک کے سوا ان کے ہاں ہر صبح ایک شجرہ پڑھا جاتا ہے۔ اپنے پیر سے شروع کرتے ہیں، پھر اس کا پیر، پھر اس کا پیر، ہوتا یہ ہے کہ اس راستے سے خدا سے کہتے ہیں کہ مجھے اس راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما تا کہ میں تجھ تک پہنچ جاؤں۔ اس راستے سے چلتے چلتے جو آگے جاتے ہیں، ایک نقشبندیوں کو چھوڑ کر جو حضرتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (570-634AD) کے راستے سے چلتے ہیں، باقی سارے کے

---

[1] حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ۔

سارے یہاں سے وہاں تک جو جاتے ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے راستے سے جاتے ہیں۔ وہاں سے آگے سارے صوفی پہنچتے ہیں اور یہ تصوف مغزِ دین بتایا جاتا ہے۔ اب جسے ہم کہتے ہیں کہ دین میں غلو ہے مبالغہ ہے تصوف میں یہ مبالغہ نہیں ہے۔ تصوف میں جتنا آپ مبالغہ کریں گے اتنا ہی زیادہ مقرب مانے جائیں گے۔ یہ جو مبالغہ ہے اب آپ سوچیے کہ اس راستے سے جو پہنچتے ہیں تو حضرتِ علیؓ (600-661AD) کے متعلق پھر ان صوفیائے کرام کے ہاں کیا کیا عقائد نہ ہونگے۔

علامہ اقبالؒ اور دنیائے تصوف کی شاعری

یہ بات لمبی ہو جائے گی، درس کا وقت بڑا تھوڑا رہ گیا ہے۔ سُنّیوں کے ہاں کی منقبت، تعریف و توصیف، مدح و ستائش جتنی حضرت علی رضی اللہ عنہ (600-661AD) امام حسین رضی اللہ عنہ، امام حسن رضی اللہ عنہ کے ہاں کی ہے ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق تو پوچھیے نہیں۔ اس وقت میں اس کی سند یں نہیں دیتا۔ علامہ اقبال (1938-1877ء) تو بہر حال بہت بڑے سُنّی تھے، یہ الگ بات ہے کہ اپنی زندگی کے آخر میں انہوں نے اپنے پہلے دور کے بہت سے اشعار اپنی کتابوں میں درج نہیں کیے ❶ لیکن اس دور میں ان کے ہاں آپ کو یہ شعر ملیں گے کہ

نجف میرا مدینہ ہے، مدینہ میرا کعبہ ہے
میں بندہ اور کا ہوں، امتِ شاہِ ولایت ❶ ہوں

اپنے آپ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امت بتاتے ہیں، امتِ محمدیہ نہیں۔ اقبالؒ (1938-1877ء) جس دور میں صوفی تصوف زدہ ❷ تھا، یہ اس دور کا ان کا شعر ہے۔ اور اب آگے اگر میں صبح کے وقت سے لے کر اشعار پہ آؤں تو کتنے ہی کہہ ڈالوں ❸، علامہ اقبال اس زمانے میں ایک نظم روز پڑھتے تھے، قرآن مجید کی تلاوت کے بعد اس میں کوئی تیس بتیس چونتیس شعر تھے، وہ سارے حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں تھے اور کس حد تک وہ مبالغہ تھا بعض شعر تو ذرا مشکل ہو جائے گا سمجھنا۔

ہے سرِ خطِ وجوب و امکاں

---

❶ شاہؒ ولایت حضرت علیؓ کا متصوفانہ لقب ہے۔
❷ علامہ اقبال کے تحت الشعور میں تصوف کی مخالفت کے باوجود تصوف کی رمق آخر تک باقی رہی تھی۔ اس لیے اُن کے ہاں بھی حضرت علیؓ کی شان میں بعض مقامات پر غلو پایا جاتا ہے۔ جس زمانہ میں انہوں نے مثنوی اسرار و رموز لکھی تھی، اُس دور میں یہ غلو اور بھی شدید تھا۔
❸ مثلاً ایک عامی سا شعر ہے:

خود راز انا الحق کو وہی کھول رہا ہے
منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے

ان میں شیرازی ہیں: مولانا روی ہیں، بھگت کبیر ہیں، بلھے شاہ، خواجہ فریدؒ شاہ حسین، مولانا حامد رضا خاں اور کتنے ہی دیگر شعرا ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ جہاں خدا اور انسان آ کر ملتا ہے، اس کے جو درمیانی خط ہیں، وہ حضرتِ علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ

ہے سرِ نبوت محمدؐ توصیف تو مدحت محمدؐ

محمدؐ کی نبوت کا راز حضرت علیؓ ہیں، تیری اگر تعریف کی جائے تو وہ یونہی ہے جیسے کوئی رسول اللہ ﷺ کی تعریف کر دے، سُنّیوں کے ہاں۔ یہ شعر تو انہوں نے اپنے ہاں سے حذف کر دیئے تھے اور یہ مثنوی اسرارِ خودی اور رموزِ خودی تو اس دور کی چھپی ہوئی ہے وہ تو اب تک موجود ہے۔ اس میں ایک باب ہے: ''در شرحِ اسرارِ اسمائے حضرت علی مرتضیٰؓ'' یہ خود ان کا ایک باب ہے۔ حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کو وہ بوتراب [1] کہتے ہیں، اس کے لیے پوری کی پوری مثنوی کا ایک باب ہے، جس میں یہ ہے:

از ولائے دُودمانش زندہ ام

میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد کی محبت کی رو سے زندہ ہوں، نہ صرف زندہ ہوں بلکہ:

در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام

دنیا میں موتی کی طرح چمکتا ہوں۔ اور یہ کہ

قوتِ دینِ مبیں فرمودہ اش

آپ (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کے ارشادات، دین اسلام کی قوت کا موجب ہیں۔ چلیے! یہ بھی صحیح کہ ان کا فرمان دینِ امی کی قوت ہے۔ کہتے ہیں:

کائنات آئیں پذیر از دودہ اش

یہ تمام کائنات نظم و نسق میں چلتی ہے، آئین و قانون کی پابند ہے، یہ حضرت علیؓ کی اولاد کے صدقے میں ہے اور آگے وہ ہے جو حضرت علیؓ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ید اللہ یعنی خدا کا ہاتھ ہیں۔ اقبالؒ بھی لکھ رہا ہے:

حق ید اللہ خواند در اُمّ الکتاب

کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی کو قرآن حمید میں ید اللہ (اللہ کا ہاتھ) قرار دیا ہے۔ [2]

---

[1] نبی اکرم نے حضرت علی کو ''بوتراب'' کا لقب عطا فرمایا جس کے معنی ہیں ''مٹی کا باپ''۔ کہتے ہیں کہ ایک دن حضور نے دیکھا کہ حضرت علیؓ مسجد کے ننگے فرش پر سو رہے ہیں جس کی وجہ سے آپ کا جسم گرد آلود ہو رہا ہے۔ آپ نے اس بنا پر از راہِ محبت حضرت علیؓ کو ''بوتراب'' کہہ کر پکارا اور اس سے آپ کا یہ لقب مشہور ہو گیا۔ (پرویزؒ: مجلس اقبال، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، 1996ء، ص۔ 191)

[2] ہمیں قرآنِ کریم میں یہ بات کہیں نہیں ملی۔

یہ عقائد کے مبالغے میں قرآنِ حکیم کی تعلیم نہیں

اقبالؒ (1938-1877ء) اتنا بڑا قرآنی شخص ہے۔ اندازہ لگایئے جب آدمی عقائد کے مبالغے میں آتا ہے تو کہاں جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ خدا نے قرآن حمید میں ان کو یداللہ کہا ہے۔ یہ کہیں نہیں کہا' عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ بات یہیں تک رہنے دوں۔ اس آیت کا ترجمہ صرف اتنا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ ''میری مخالفت جتنی کرتے ہو' میرے پیغام کی مخالفت کرو۔ جو میں کہتا ہوں' اس کو نہ مانو' کچھ نہ کرو' لیکن وہ جو باہمی رشتہ داری کے تعلقات ہیں' انہیں تو قائم رکھو۔'' بس اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

یہ تھی عزیزانِ من! وہ آیت۔ اگر چند الفاظ اور ضرورت ہوگی تو اگلے درس کے شروع میں کہوں گا لیکن میرا خیال یہ ہے کہ آج بھی جو میں نے پیش کیا ہے' عرض کیا ہے' وہ حقائق ہیں' قرآن حکیم کی آیات ہیں۔ باقی جو ہے وہ احادیث ہیں جو خود سُنّیوں کے ہاں ہیں' خود شیعہ حضرات کے ہاں ہیں' ان کے عقائد ہیں' تاریخ کے واقعات ہیں جو میں نے پیش کیے اور قرآن حکیم کی رو سے میں نے یہ پیش کیا ہے کہ یہ دونوں ہی چیزیں بنیادی طور پر ایسی ہیں کہ ان سے اسلام اور قرآن کریم کی جڑ کٹ گئی ہے۔ یہ رسول اکرم کا رسالتِ اجر مانگنا' رسالت کا اجر مانگنا اور آلِ رسول سے محبت کرنا' قرآنِ کریم کی تعلیم نہیں۔

عزیزانِ من! خدا کرے کہ آپ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی کا مفہوم سمجھ گئے ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀❀............❀❀............❀❀

چوتھا باب: سورة الشوریٰ (آیات 23 تا 24)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1981ء کی 19 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم میں ہم نے سابقہ جمعہ کو سورة الشوریٰ یعنی 42 ویں سورة کی 23 آیت کا پہلا حصہ لیا تھا' اسی کا اگلا حصہ آج زیرِ درس ہوگا: (42:23)۔

میری رفاقت کے ایک پچاس سالہ رفیق شیخ سراج الحق رحمۃ اللہ کی جدائی کا صدمہ: پرویزؒ

آج کے اس درس سے پہلے ایک الم انگیز خبر ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ ایک معمر بزرگ درس میں آیا کرتے تھے' ضعف اور بیماری سے چلا نہیں جاتا تھا' ان کے لیے نشست کا خاص انتظام کرتا تھا۔ آپ احباب سے کہا کرتا تھا کہ یہ تحریکِ پاکستان کے ممتاز مجاہد ہیں۔ انہیں دیکھ لیجیے کہ ایسی صورتیں پھر نظر نہیں آئیں گی۔ چنانچہ یہ صورت پھر گزشتہ اتوار سوموار کی شب [1] کو ہمیشہ کے لیے چھپ گئی۔ یہ تھے میری رفاقت کے پچاس سالہ عمر کے رفیق' شیخ سراج الحق' جو اب مرحوم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے سحابِ کرم کے سایہ میں رکھے۔ انہیں دعا میں یاد رکھا کریں۔

مجھے درس کی طرف آ جانا چاہیے لیکن ظاہر ہے کہ جہاں پچاس سال کی مسلسل رفاقت کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو اس کا اثر میرے جیسے حسّاس انسان کے دل پہ کیا ہوا کرتا ہے۔ بہر حال یہ کاروبارِ حیات ہے' اسے تو اسی طرح چلنا چاہیے۔

---

[1] 15 جون 1981ء کو اپنی زندگی کے اگلے سفر پہ روانہ ہو گئے۔

سابقہ درس کی صدائے بازگشت: قرآن حکیم نے عزیزداری کی تخصیص کبھی ملحوظِ خاطر نہیں رکھی

سابقہ درس میں، میں نے عرض کیا ہے کہ سورۃ الشوریٰ کی 23 ویں آیت ہمارے زیر درس تھی اور اس آیت کا پہلا حصہ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (42:23) [1] تک پچھلے درس میں زیرِ غور آیا تھا۔ پورا درس اسی پہ صرف کیا گیا تھا۔ ملخص اس کا یہ تھا کہ قرآنِ کریم کی رو سے نسلی یا نسبی تعلقات یا رشتے کوئی وزن نہیں رکھتے۔ قرآنِ کریم نے تقویٰ یعنی قرآنی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کو ہی وجہ شرف اور باعثِ تکریم قرار دیا ہے: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (49:13)۔ تو اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے کہ وہ کسی خاص نسل سے پیوست ہو یا کوئی خاص شخصیت کے ساتھ اس کا خون کا رشتہ ہو۔ یہ چیز پچھلے درس میں آ گئی تھی اور اسی آیت کا اگلا حصہ ساتھ ملا لیا جائے تو قرآنِ کریم نے یہیں بات صاف کر دی ہوئی ہے۔

حسنات سے معمولی لغزشوں کے نقصانات کا ازالہ

اس آیت کا اگلہ حصہ ہے کہ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا (42:23) جو کوئی بھی حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے گا، اس کی زندگی میں حسن بڑھتا چلا جائے گا۔ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ (42:23) وہ جو کوئی بھی ہو، تو گویا اس میں بھی کوئی تخصیص نہ رہی۔ سارے قرآنِ کریم میں آپ دیکھیے گا کہ یہ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی ہی ایک شرط ہے اور اس میں اس سے زیادہ کوئی اور خصوصیت نہیں ہے۔ یہاں بھی یہ کہا ہے کہ جو کوئی بھی حسنات کی زندگی بسر کرے گا اس کی زندگی کے حسن میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، اس کی زندگی خوشگواریوں کی ہوگی، توازن کی ہوگی، حسین ہوگی لیکن اس کے لیے اولین شرط ہوگی کہ جو کوئی بھی ایسا کرے گا، اور اس کے فوراً بعد کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (42:23)۔ جنہیں آپ اس زندگی کے بڑے بڑے محاسن کہتے ہیں، جنہیں آپ نیکیاں کہتے ہیں، ان سے چھوٹی موٹی لغزشوں کے نقصانات کا ازالہ ہو جائے گا اور خدا تو بڑا ہی قدردان ہے۔ جو بھی حسنات ہوں گی وہ ان کی بڑی قدر کرتا ہے خواہ وہ کسی کی طرف سے بھی ہوں۔ اگلی آیت یہ ہے کہ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى

---

[1] اے رسول! تو......ان مخالفین سے یہ بھی کہہ دے کہ میں جو تمہیں تباہیوں سے بچا کر، بھلائیوں کی طرف لانے کی کوشش کرتا ہوں تو اس میں میرا ذاتی فائدہ کچھ نہیں۔ میں اس کے بدلے میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ لیکن تم اپنی مخالفت میں اس حد تک تو نہ بڑھ جاؤ کہ عام رشتوں ناطوں کے تعلقات کی بنا پر جو باہمی مؤدت ہوئی ہے اسے بھی نظرانداز کر کے اس قدر ظلم اور زیادتی پر اتر آؤ (34:47; 25:57; 9:8)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص 1132)۔
اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ''میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم، کم از کم آپس میں، ایک دوسرے کے ساتھ، رشتہ داری کے تعلقات اور صلۂ رحمی کے تقاضوں کو نظرانداز نہ کرو۔ اس وقت تمہاری حالت یہ ہے کہ تم انفرادی مفاد کی خاطر رشتہ داری کے تعلقات تک کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ ایسا تو نہ کرو (2:36;3:102)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1132 حاشیہ 1)

قَلْبِكَ (42:24) یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص (معاذ اللہ) جھوٹ بولتا ہے جو کہتا ہے کہ مجھ پر خدا کی طرف سے یہ وحی نازل ہوتی ہے' یہ افترا ہے' یہ جھوٹ ہے' یہ بناوٹ ہے۔ کہا کہ اگر ایسی کوئی صورت ہوتی تو ہمارے لیے کیا مشکل تھا کہ ہم اس کے دل پر اس قسم کی مہر لگا دیتے کہ ہمارے خلاف نہ کوئی چیز اس میں داخل ہو سکتی' نہ اس میں سے باہر آ سکتی۔ اگر اس قسم کا افترا کیا جائے تو سنو' یہ جو چیز ہے یہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔

کشمکشِ حق و باطل میں غلبۂ حق کی شرط

اب اگلا ٹکڑا ہے کہ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ (42:24)۔ یہ چیز یہیں نہیں آئی' قرآنِ کریم کے دیگر مقامات میں بھی آئی ہے۔ عام الفاظ میں' عام ترجمے میں' یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں حق اور باطل کی کشمکش جاری ہے' باطل مٹ جاتا ہے اور حق ثبت ہو جاتا ہے' Establish (قائم) ہو جاتا ہے' غالب آ جاتا ہے لیکن اس کے لیے بِكَلِمٰتِهٖ شرط ہے یعنی یہ قوانینِ خداوندی کی رو سے ہو' یہ حق اور باطل کی کشمکش' جیسے میں نے عرض کیا ہے' اسی مقام پہ اس کا ذکر نہیں آیا۔ اس کے لیے ایک اور حوالہ میں پیش کرتا ہوں۔ اس میں اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں کہا ہے۔ یہ ہے کہ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (21:18) ہم باطل کے سر پر حق کی ضرب لگاتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ یہ حق اس باطل کا بھیجا بھی توڑ دیتا ہے' سر توڑ دیتا ہے' بھیجا نکال دیتا ہے جسے فَيَدْمَغُهٗ کہتے ہیں' یہ اس کا دماغ توڑ دیتا ہے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے' باقی نہیں رہتا۔ یہ جو ہمارے ہاں کشمکش حق و باطل ہے جب بھی میں نے عرض کیا ہے اور میں بار بار یہ کہتا ہوں کہ اس کشمکشِ حق و باطل میں اب دین نہیں رہا ہے' یہ مذہب ہو چکا ہے اور مذہب میں تو کوئی چیز اپنے مقام پہ رہتی ہی نہیں ہے۔

مسلمان حق و باطل کی کشمکش میں بڑا اطمینان حاصل کر لیتا ہے کہ ہم حق پہ ہیں اور یہ باقی ساری دنیا باطل پہ ہے اور یہ کہ حق نے تو غالب آنا ہی ہے اس لیے ہمیں کس چیز کی فکر ہے' کونسا ڈر ہے' خدا خود کہتا ہے کہ حق غالب آئے گا اور اپنے متعلق چونکہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور باقی ساری دنیا باطل پہ ہے' اس لیے یقیناً ہم غالب آئیں گے۔ اس قسم کی خود فریبی یا جھوٹا اطمینان مذہب کی رو سے حاصل ہو جاتا ہے۔ دین میں تو حق کے معنی ہی ''حقیقت کا محسوس شکل میں سامنے آنا ہے''۔ یہ کوئی نظری بات نہیں' تجریدی بات نہیں' Theoretical چیز نہیں' Academical چیز نہیں ہے' بلکہ اس کا تو محسوس شکل میں سامنے آنا ضروری ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اب مذہب کی دنیا میں تو اتنی چیز کہہ دی اور اسے اپنا ایک عقیدہ بنا لیا اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ ہم حق پہ ہیں اس لیے بہر حال ہم تو غالب ہی آئیں گے۔ یہ خود ہی کسی چیز کو حق قرار دے لینا دراصل خود فریبی ہے۔

پوری کائنات میں حق و باطل کی کشمکش ہر آن جاری و ساری رہتی ہے

قرآن حمید کا یہ ایک کلیہ ہے' Fundamental Formula (بنیادی فارمولا) ہے کہ حق اور باطل کی کشمکش کا سلسلہ اس کائنات میں جاری ہے۔ قرآن حمید نے یہ اتنی عظیم حقیقت آج سے چودہ سو سال پہلے بیان کی اور وہ بھی عرب کی سرزمین میں' ایک امی شخص ﷺ کی زبان سے اس وقت کی جب یہ بات کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ یہ جو فارمولا قرآن حکیم نے بیان کیا ہے' ہمارے دور کی ساری سائنٹفک ریسرچز (تحقیقات) اس کی رہینِ کرم ہیں۔ یہ سارے نظام جو قائم ہو رہے ہیں' خواہ غلط ہیں یا صحیح ہیں' کچھ بھی ہیں' ان کی بنیادیں یہی کلیہ ہے' جو قرآن حمید نے بیان کیا ہے۔ اس کی اتنی بڑی اہمیت ہے؟ ہم تو اسے سمجھ ہی نہیں سکتے کیونکہ مذہب پرست کے ذہن میں حقائق نہیں آیا کرتے۔ یہ اس کے جذبات ہوتے ہیں۔ ان حقائق کی رو سے یہ جو آپ کے ہاں Evolution یا نظریہ ارتقا ہے' اس کی بنیاد اسی کے اوپر ہے۔ اس نظریہ ارتقا کو ہمارے دور سے منسوب کیا جاتا ہے۔ واقعی ارتقا کی تحقیق کی ابتدا ڈارون (82-1809ء) نے کی۔ اس نے دیکھا کہ پوری کائنات میں قدرتی انتخاب (Natural Selection) کی ایک کشمکش جاری ہے۔ اور اس میں Constructive (تعمیری) اور Destructive تخریبی) قوتیں آپس میں پیہم کشمکش میں رہتی ہے۔ جس نوع میں آگے بڑھنے کی صلاحیت کی نمود ہو جاتی ہے وہ آگے بڑھ جاتی ہے۔

جہاں سے زندگی شروع ہوئی' ڈارون (82-1809ء) نے وہاں سے تحقیق کرنا شروع کیا۔ اس نے دیکھا کہ زندگی کن مراحل میں سے گزر کر آگے بڑھتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہے۔ اولیں جرثومہ حیات ایک ایسا سیل ہے جو Naked eye (خالی آنکھ) سے دیکھا بھی نہیں جاسکتا' خوردبین سے دیکھا جاسکتا ہے' زندگی کی پہلی نمود اس سیل کے اندر ہوئی' اس سے پہلے کے مراحل میں نہ کوئی سائنسدان جاسکتا ہے' نہ ہم کچھ کہہ سکتے ہیں' نہ کچھ بتا سکتے ہیں کہ وہ زندگی کیسے پیدا ہوئی۔ اس اولین جرثومہ حیات سے ریسرچ کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کی ریسرچ یہ تھی کہ ان مراحل میں جن سے یہ زندگی گزری Destructive اور Constructive قوتیں' تخریبی اور تعمیری قوتیں' آپس میں باہمد گر کشمکش کے اندر رہیں۔ یہ زندگی کی پوری کہانی کی داستان' اس کشمکش کی داستان ہے۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاسکتا کہ موضوع بھی بڑا ٹیکنیکل ہے اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس نے یہ کہا کہ جس شکل میں بھی زندگی تھی' وہ اس کو Species یا نوع کہہ کر پکارتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اگر اس میں اتنی صلاحیت تھی کہ وہ تخریبی عناصر یا قوتوں کا مقابلہ کرتی تو وہ آگے بڑھ گئی' اگر اس میں اتنی قوت نہیں تھی' تخریبی قوتیں اس پر غالب آگئیں وہ نوع وہیں ختم ہوگئی' فنا ہوگئی' Fossilized (متحجر) ہوگئی۔ آج کھدائیوں سے برفوں کے نیچے' چٹانوں کے نیچے دبے ہوئے لاکھوں کروڑوں سال پہلے کے جانوروں کے جو پیکر نظر آتے ہیں' جو ہڈیوں کے پنجر [1] نظر

---

[1] ڈھانچے (Skeletons)

آتے ہیں' زندگی تھی جو ایک مقام پہ جامد ہوگئی منجمد ہوگئی' آگے نہ بڑھ سکی' یہ تخریبی قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکی اور جو نوع مقابلہ کر سکی وہ آگے بڑھ گئی۔ گویا سلسلہ یہ رہا کہ جو آگے بڑھی تھی اس میں زندہ رہنے کی' آگے بڑھنے کی صلاحیت تھی۔ یہ حق تھا جو آگے بڑھا ہے' جو غالب آیا ہے۔ باطل کی تخریبی قوتیں مغلوب ہوگئیں' دب گئیں' آگے نہیں بڑھ سکیں۔ یہ سلسلہ کروڑوں سال تک جاری رہا' یہ مسلسل ٹکراؤ ساری کائنات میں جو زندگی ہے' اس میں جاری ہے۔ زندگی جس شکل میں بھی ہے' اس کی پوری داستان' اسی ٹکراؤ کی داستان ہے یعنی تخریبی اور تعمیری قوتوں کے ٹکراؤ کی داستان اور یہ جو اس نے پوری تحقیق کی ہے اس میں اس نے یہ کہا۔ ہر مقام پہ ہمیں وہ نظر آتا ہے جسے ہم حق کہہ کر پکارتے ہیں۔ وہ اسے تعمیری (Constructive) قوتیں کہتا ہے اور حق کے بھی یہی معنی ہیں۔ اس نے کہا کہ یہی ساری داستان ہے اور ہماری تحقیق کا بھی ماحصل یہ ہے کہ یہ جسے ہم حق کہتے ہیں' یہ تعمیری قوتیں ہیں' جو ٹکراؤ میں غالب آتی ہیں' جو تخریبی (Destructive) قوتیں ہیں' وہ مغلوب ہو جاتی ہیں اور زندگی اپنے ارتقائی منزل میں ایک قدم آگے بڑھ آتی ہے۔ ڈارون نے تو طبعی زندگی کے متعلق یہ کہا ہے' اس نے تو ابتدا کی تھی۔ بعد کے ریسرچ کرنے والوں نے اس میں بڑی ترمیمات بھی کیں' بڑی اصلاحات بھی کیں لیکن بہر حال اس کا آغاز یہیں ❶ سے ہوا اور یہ جو ارتقا کا کلیہ ہے' یہ اب تک ثابت ہے' اس کے مطابق ریسرچز (تحقیقات) ہو رہی ہیں۔

میں یہ بات عرض کرنا چاہتا تھا جو قرآن کریم کہتا ہے کہ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ❷ (42:24)۔ یہ محض کوئی ذہنی سی' نظری سی چیز نہیں ہے جو اس نے کہہ دیا اور ہم نے یوں سمجھا کہ ہم حق پہ ہیں' یہ ہندو باطل پہ ہیں' بس وہ تو مٹ جائیں گے اور ہم غالب آ جائیں گے۔ یہ بات یوں نہیں ہے' یہ تو ایک بہت عظیم حقیقت ہے جو قرآن کریم بیان کر گیا ہے۔ یہ کارگہ کائنات کی زندگی کی پوری کشمکش ہے۔

ہیگل کا تعمیری اور تخریبی تصورات میں ٹکراؤ کا نظریہ اور قرآنی تعلیمات

ڈارون (82-1809ء) نے تو صرف طبعی طور پر لائف (زندگی) کے متعلق یہ تحقیق کی' آگے بڑھے۔ میں درمیان کی کڑیاں چھوڑتا ہوں۔ ہیگل (1831-1770ء) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ طبعی زندگی (Physical Life) کے اندر جو ہوتا ہے' وہ تو ٹھیک ہے'

---

❷ اس موضوع پر چارلس رابرٹ ڈارون (82-1809) کی یہ دو کتب لائق مطالعہ ہیں:

1- On the Origin of Species 2- The Descent of Man (1871)

❸ باطل نظریات زندگی' اور ان پر قائم کردہ نظام کبھی باقی نہیں رہا کرتے۔ مٹ جایا کرتے ہیں۔ اور حق پر متفرع نظام قائم رہتا ہے (13:17;13:39)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 1133)۔

ہوتا ہوگا' لیکن میری تحقیق یہ ہے کہ Ideas (تصورات) ❶ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کشمکش Ideas (تصورات) کی ہے جو کائنات میں' انسانی زندگی میں جاری ہے۔ ایک آئیڈیا (تصور)' جس کا نتیجہ تخریبی ہوتا ہے اور ایک آئیڈیا (تصور)' جس کا نتیجہ تعمیری ہوتا ہے' ان میں ٹکراؤ ہوتا ہے جسے انہوں نے Dialactic (جدلیاتی) ❷ کہا ہے۔ اس ٹکراؤ میں تخریبی نظریہ حیات کو شکست ہوتی ہے' تعمیری نظریہ حیات غالب آتا ہے اور اس کے بعد یہ جو نظریہ غالب آتا ہے وہ پہلے سے زیادہ نکھرا ہوا' ستھرا صاف شفاف' آگے بڑھتا ہے۔ ❸

ہیگل (1770-1831ء) کی ساری تحقیق سائنس آف ہسٹری ❹ پہ مبنی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سائنس وہ عمل ہے جس میں کوئی شے Systematically (ایک طریق کے مطابق) آگے بڑھتی جائے۔ ہم لوگ تو عام طور پر ان باتوں کو سمجھ بھی نہیں سکتے' ہسٹری آف سائنس تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ سائنس کی تاریخ کیا ہے لیکن جو سائنس آف ہسٹری (تاریخ کی سائنس) ہے' یہ بڑی اہم چیز ہے۔ اس Science of History (تاریخ کی سائنس) نے یہی ثابت کیا ہے کہ چیزیں ایک نظم (System) سے' ایک طریق کے مطابق' آگے بڑھتی ہیں۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ قرآن کریم کے یہ جو چار الفاظ (42:24) میں آتے ہیں' یہ کئی مقامات میں آتے ہیں۔ آپ غور کیجیے کہ یہ اپنے اندر کتنی بڑی عظیم حقیقت لیے ہوئے ہیں اور کہاں سے ان کے حقیقت ہونے کی شہادتیں مل رہی ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ یہ Ideas (تصورات) ہوتے ہیں اِس تصور سے اس نے بھی تصوراتی یا نظریاتی دنیا میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کیا تھا۔

---

❶ جنہیں قرآنِ کریم کلمات کہتا ہے۔

❷ جدلی مادیئین (Materialists) کا اختیار کردہ تحقیق کا ہیگلی طریقہ کار' جس کا انحصار دو متضاد لیکن متعامل قوتوں' دعویٰ وضد دعویٰ کی آویزش اور اعلیٰ تر مرحلے پر ان کی مسلسل تطبیق (تالیف) پر ہوتا ہے۔

❸ ہیگل نے کچھ یوں بات کی ہے:

Truth is reached by a continuing dialectic: an initial thesis when found unsatisfactory, generates an antithesis; these interact to form a synthesis, which may itself constitute a new thesis(Reader's Digest (1990). Universal Dictionary. New York: The Reader's Digest Association Limited, P.715)

❹ ہیگل (1770-1831) کے اہم کتب یہ ہیں

1- Encyclopedia of the Philosophical Sciences (1817).

2- Philosophy of Right (1821)

مارکس کے کہنے کے مطابق دراصل یہ ٹکراؤ نظام زندگی میں ہوتا ہے

ہیگل (1831-1770ء) کا شاگرد کارل مارکس (83-1818ء) تھا۔ اس نے کہا کہ یہ کلیہ تو درست ہے کہ تعمیری اور تخریبی قوتوں کا ٹکراؤ ہوتا ہے لیکن یہ ٹکراؤ محض Ideas (تصورات) میں نہیں ہوتا بلکہ یہ جو System of Living یا نظامِ زندگی قائم ہوتا ہے' یہ ان میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور اس میں جو نظام یا سسٹم انسانوں کے لیے نافع ہوتا ہے' وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ عجیب باتیں ہیں۔ اسی کو قرآنِ حمید مَا یَنْفَعُ النَّاسُ کہتا ہے۔

مَا یَنْفَعُ النَّاس کے سلسلے میں چودہ سو سال پیشتر قرآنِ حکیم کا اعلان

عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں' پتہ نہیں زندگی اتنا وقت دے گی یا نہیں کہ ان چیزوں کو نصاب کی طرح سمجھاؤں۔ ان لوگوں نے یہ چیز جو کہی ہے جب اور جہاں ایسے مقامات آتے ہیں' میں سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ یوں نظر آتا ہے جیسے قرآن حکیم کی آیتوں کا ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں حالانکہ جہاں تک کارل مارکس (83-1818ء) کا تعلق ہے' مجھے یہ شہادت نہیں ملی کہ قرآن حکیم اس کے سامنے اس شکل میں آیا ہو لیکن وہ قرآن حکیم الفاظ میں نہ بھی ہو تو اس کے حقائق تو کائنات کی فضا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ جو اس کے نزدیک تعمیری قوت ہے' جسے حق کہا گیا ہے' اس نے اسے انسانوں کے لیے منفعت بخش کہا ہے اور قرآن نے اسے ما ینفع الناس [1] کہا ہے اور یہ قرآن کی آیت ہے کہ جس نظام میں الناس یعنی نوعِ انسانی کی منفعت پوشیدہ ہوگی' اس کو بقا ہوگی۔ یہ قرآن حکیم کی اس ایک آیت کا ترجمہ ہے۔ اس نے کہا کہ یہ کشمکش ہوتی چلی آ رہی ہے۔ ہر نظام جو انسانیت کی تخریب کا باعث ہوگا' وہ تباہ ہو جائے گا' مغلوب ہو جائے گا' شکست کھائے گا اور ما ینفع الناس کا نظام' جو نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہوگا' وہ غالب آئے گا' وہ آگے بڑھے گا۔ گویا یہ ہیگل (1831-1770ء) سے ایک قدم آگے بڑھایا۔ وہ شخص Ideas (تصورات) کو نہیں بلکہ محسوس اور مرئی نظام زندگی سامنے لایا۔ وہ ایک عجیب وغریب چیز پیش کرتا ہے۔ وہ Ideas (تصورات) کو بھی نہیں چھوڑتا' نظام کو بھی نہیں چھوڑتا۔ وہ کہتا یہ ہے کہ ہر نظام کسی نہ کسی Idea (تصور) کے اوپر متشکل ہوتا ہے' نظام کی بنیاد ایک (Idea) یا ایک تصور یا ایک ایمان پر ہوتی ہے۔ ہیگل (1831-1770) والی جو بات بھی تھی تو بنیاد Ideas کے اوپر' کلمات پہ ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں اسی کو ایمان کہا جاتا ہے۔ ایمان نام ہے چند بنیادی نظریات یا Ideas (تصورات) کی صداقت پر یقین کا۔

---

[1] وامّا ما ینفع الناس فیمْکث فی الارض (13:17) اور جو کچھ نوعِ انساں کے لیے نفع بخش ہوتا ہے' وہ باقی رہ جاتا ہے۔

جب حق پر مبنی کوئی Idea (تصور) عملی شکل اختیار کر جائے تو پھر وہ دین کہلاتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ Ideas (تصورات) صرف Theoretically (نظری طور پر) رہیں تو یہ کوئی نتیجہ نہیں پیدا کرتے۔ ان Ideas (تصورات) کی بنیادوں کے اوپر جو نظام اٹھتا ہے وہ نظام اپنے نتائج پیدا کرتا ہے اور وہ نتائج اس کی شہادت ہوتے ہیں کہ یہ نظام حق پر مبنی ہے۔ گویا قرآن کریم نے Ideas (تصورات) اور نظام دونوں کا امتزاج پہلے دن سے پیش کیا۔ یہ دونوں الگ الگ تھے' ہیگل (1831-1770ء) صرف Ideas (تصورات) کو لے کر چلا اور کارل مارکس (83-1818ء) نے نظام کو لیا۔ ہیگل کا فلسفہ کچھ دیر چلنے کے بعد وہیں جامد ہو کر ختم ہو گیا' کارل مارکس بھی آگے نہیں چل سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہیگل کے وہ Ideas (تصورات) نظام کے بغیر تھے کارل مارکس کا یہ نظام Ideas (تصورات) کے بغیر تھا۔ قرآن کریم نے ایک نظام دیا جو Ideas (تصورات) کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے' اس کے Ideas (تصورات) ہمیشہ غیر متبدل' ابدی رہنے والے اور حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں' اور ان کے اوپر اٹھا ہوا ایک نظام ہوتا ہے۔ یہیں اسی آیت میں' آپ دیکھیے' کہا کہ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ (42:24)۔ میں کیا عرض کروں' عزیزانِ من! قرآن کیا ہے! یہاں بکلمٰتہٖ اضافہ ہے۔ حق کا نظام جو خدائی Ideas یا نظریات یا کلمات کے اوپر متفرع [1] ہوتا ہے' وہ ہے جسے یہ حق پہنچتا ہے یا جس کے اندر یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ باقی رہے۔ یہاں بِكَلِمٰتِهٖ کہا ہے اور دوسری جگہ کلمۃ کے لیے کہا ہے کہ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115)۔ اور کلمات وہی چیز ہے جس کو وہ Ideas (تصورات) کہتے ہیں' یہ نظریات کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ Ideas (تصورات) کی بنیادوں کے اوپر ایک نظام قائم ہوتا ہے جو ایک محسوس شکل اختیار کر لیتا ہے' جسے حق یا حقیقت کہا جاتا ہے۔ اسے دین کہتے ہیں۔

حق کا یا دین کا یہ سسٹم اپنے طریق پر نشو و نما پاتا ہے' ابن مسکویہ نے اسے ''سفرا'' کہا

اب بات یہ چلی کہ یہ جو قرآن حمید نے حقیقت بیان کی ہے کہ حق غالب آتا ہے' باطل مغلوب ہوتا ہے' تو یہ سلسلہ آگے کیسے چلتا ہے؟ کیا یہ از خود چلتا ہے یا اسے چلانا پڑتا ہے؟ اور آج کے دور میں تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ تو کہیں نظر ہی نہیں آتا۔ پھر سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہوتا ہے' جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ انہی لوگوں کی جو Scientific Research (سائنسی تحقیق) ہے اُس کے تحت انہوں نے یہ کہا کہ یہ Evolution یا سلسلہ ارتقا جو اس طرح سے چلا آ رہا ہے' اس کی دو شکلیں ہمارے سامنے آتی ہیں: ایک کو وہ Natural Evolution (فطری ارتقا) کہتے ہیں یعنی وہ ایک کڑی کے ساتھ دوسری' دوسری کے ساتھ تیسری' مسلسل چلی آتی ہے لیکن جب اس میں زندگی ایک

---

[1] کسی چیز سے مثل شاخ کے باہر نکلنے والا۔

منزل سے دوسری منزل میں پہنچتی ہے تو اسے ہزاروں لاکھوں کروڑوں سال لگ جاتے ہیں جیسا کہ قرآن حمید نے کہا ہے کہ خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب وشمار سے ہزار ہزار سال کا' پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔ یہ دن یہی منازل کے ٹکڑے ہیں جن میں سے یہ زندگی' نیچرل ارتقا کے نظریہ کی رو سے' آگے بڑھتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ارتقا کے سلسلے کا ایک طریق تو یہ ہے اور دوسرے طریق کے لیے انہوں نے کہا کہ یہ Emergent Evolution (فجائی ارتقا) ہے۔ وہ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ ہم اس کی تحقیق تو نہیں کر سکے گویا یہ چیز ہماری تحقیق کی گرفت میں ابھی نہیں آئی کہ یہ کیسے ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایسا نظر آتا ہے کہ ایک نوع درمیان کی کئی کڑیاں پھاندکر' جو مسافت اس نے ہزار سال یا پچاس ہزار سال میں طے کرنی تھی' وہ چند دنوں میں طے کر کے آگے جا پہنچتی ہے۔ اسے وہ Emergent Evolution (فجائی ارتقا) کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اس کے اوپر اس باب میں حکیم ابن مسکویہ (المتوفی 421ھ) کی معرکہ آرا تحقیق دنیائے علم میں ایک خاص امتیازی شان رکھتی ہے۔ اس نے اپنے مشہور رسالہ ''الفوز الاصغر'' میں اس نظریہ پر خصوصیت سے بحث کی ہے۔ ہمارے ہاں بھی اس پر ریسرچ ہوئی تھی ابنِ مسکویہ وغیرہ [1] کے ہاں ایک اصطلاح تھی جس کو وہ ''سفرا'' کہتے تھے۔ اس کے معنی ہیں مسافت طے کر جانا۔ ان کے ہاں بھی یہ تصور تھا کہ یہ وہ مسافت ہے جو بحالت دیگر سینکڑوں ہزاروں سال کے بعد طے ہوتی ہے' وہ چند دنوں میں طے ہو جاتی ہے۔

زندگی کے حقائق تک پہنچنے کے لیے عقل کو طویل المیعاد مسافت طے کرنا پڑتی ہے

قرآنِ کریم نے اس کے متعلق یہ کہا کہ یہ جو حق و باطل کی کشمکش کا معرکہ ہے' اگر اس کو علی حالہ چھوڑ دیا جائے تو یہ جو ہماری ملائکہ کی قوتیں' کائناتی قوتیں' زندگی کے تقاضے ہیں' یہ ان کے زور پہ آگے چلے۔ اس صورت میں اس کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا اور پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے یعنی یہ جو سلسلہ ہے' یہ اس طرح بھی جاری رہتا ہے۔ ایک اور عجیب چیز ہے۔ یہ جو تاریخ ہے یہ دوسرا میدان ہے اس میں یہ چیز آتی ہے۔ اس میں پروفیسر ارون شروڈنگر (Erwin Schrodingar) نے ایک چھوٹی سی لیکن بڑی اہم کتاب لکھی ہے یہ ہے: What is Life? (زندگی کیا ہے؟) یہ کتاب ''میں'' کسے کہتے ہیں' کے تجزیئے پر ''ترادلِ بےحس'' کی عکاسی ہے۔ اسی طرح ایک اور کتاب ہے اس کا نام ہے Adventures of Ideas [2] اس نظریہ کے ماتحت یہ ہے کہ وہ جو صحیح Ideas (تصورات)

---

1. ابن مسکویہ (330?-421/942?-1030 AD ھ) فارابی (870-950 AD)' ابن سینا (980-1037 AD)' اور ابن باجہ نے اپنی تصانیف میں اس نظریہ پر کافی روشنی ڈالی ہے۔
2. Whitehead, Alfred North: Adventures of Ideas, The Free Press, New York, 1967

ہیں' وہ کس طرح سے Travel (سفر) کرتے ہیں۔ یہ Alfred North Whitehead کی چھوٹی سی کتاب ہے۔ یہ عجیب وغریب لوگ ہیں۔ اس Adventures of Ideas (معرکہ تصورات) میں وائٹ ہیڈ نے لکھا ہے کہ یہ Ideas (تصورات) کس طرح سے ازخود Travel (سفر) کرتے رہتے ہیں اور کہا ہے کہ عقلِ انسانی کا طریق Trial & Error (سعی وخطا) ہوتا ہے۔ عقل انسانی خود ایک عمل' ایک راستہ' ایک پروگرام' تجویز کرتی ہے' کچھ عرصے تک اس کے اوپر چلتی ہے' آگے چل کر دیکھتی ہے کہ وہ عمل' راستہ' پروگرام ناکام رہا' اس کے بعد وہ اس کو چھوڑ دیتی ہے' پھر ایک دوسرا لائحہ عمل اختیار کرتی ہے۔ وہ اس کے اوپر چلتے ہیں اور اس طرح سے سینکڑوں قسم کے نقصانات اٹھا کر' جیسا میں کہا کرتا ہوں' ہڈیاں تڑوا کر' آگ کی خندقیں پھاند کر' آگے چلتے ہیں اور اس میں وہ ہوتا ہے جو ملائکہ نے کہا تھا کہ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَ یَسۡفِکُ الدِّمَآءَ (2:30) یہ تو زمین میں فساد انگیزیاں کرے گا' خوں ریزیاں کرے گا اور جواب ملا تھا کہ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (2:30) ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے ہو۔ انہوں نے یہ بتایا کہ اگر اس کو علیٰ حالہ عقل کے تجرباتی طریق پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اس طرح Trial & Error (سعی وخطا) کی رو سے ٹھوکریں کھاتی' ہڈیاں تڑواتی' آگے جاتی ہے اور آخرالامر حقیقت کے اوپر پہنچ جاتی ہے' اس طریق میں عرصہ بھی لمبا لگتا ہے اور انسانیت بے حد مشکلات میں سے گزرتی ہے۔ یہ ہے عقل کا Trial & Error (سعی وخطا) کا عمل۔

نظریہ ارتقاء کے سلسلہ میں میدان بدر کی مثال ایک زندہ شہادت ہے

قرآن مجید نے کہا ہے کہ اگر اس قرآن کے دیئے ہوئے ابدی اصولوں کی روشنی میں آپ ایک نظام قائم کریں تو وہ سالوں کی مسافت دنوں میں طے کر جائے گا' اگر کوئی جماعت اٹھ کھڑی ہوگی تو اس کے دست و باز کی قوت سے یہی فارمولا' یہی نظریہ' یہی Ideas (تصورات) سینکڑوں سال کی مسافت دنوں کے اندر طے کر جائیں گے۔ یہ Emergent Evolution [1] (فجائی ارتقا) ہے' جسے آپ ہنگامی ارتقا کہتے ہیں۔ دین کی تاریخ تو خیر حضرتِ نوح ﷺ سے شروع ہوئی لیکن ہمارے سامنے یہ نبی اکرم ﷺ کے عہد سے شروع ہوئی۔ اسی طرح Ideas (تصورات) کی کشمکش چلی آ رہی تھی۔ قرآن مجید میں خدا کی طرف سے ابدی حقائق آئے' نبی اکرم ﷺ کی تعلیم وتربیت نے ایک جماعت تیار کی' وہ جماعت دست و بازو بنی' وہ حق کے غالب آنے کے پروگرام کے لیے اٹھی اور وہ جو قرآن مجید میں خود اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ بدر کے میدان [2] میں تم تیر نہیں چلا رہے تھے' ہم چلا رہے تھے حالانکہ یہ وہ کام جماعت کر رہی تھی۔ اس

---

[1] اس انکشاف کا سہرا پروفیسر مارگن (C. Lloyd Morgan: 1852-1936) کے سر ہے۔ اس کی ایک کتاب کا نام بھی Emergent Evolution (فجائی ارتقا) ہے۔

[2] جنگ بدر 17 رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء

جماعت کے بغیر کام یہی کائناتی قوتیں غیر محسوس طریق پر کرتی چلی آ رہی تھیں مگر انہوں نے وہ منازل چند دنوں میں طے کر دکھائے جو اس کے بغیر ہزاروں سال کے اندر جا کر طے ہونے تھے۔

اس عہدِ اولیٰ کے بعد Emergent Evolution (فجائی ارتقا) کی جگہ پھر Natural Evolution (فطری ارتقا) نے لے لی

یہ Emergent Evolution (فجائی ارتقا) تھی، اس سے اس عہد اولیٰ میں یہ ساری چیزیں ہوئی تھیں، کچھ عرصے کے بعد یہ جماعت یوں نہ رہی۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ یہ کیسے ہوتا ہے اور کیسے ہوا؟ بہر حال یہ جماعت حق کا دست و بازو نہ رہی۔ بظاہر یہ نظر آیا یعنی سطح بین نگاہوں نے یہ دیکھا کہ وہ اسلام تو ختم ہو گیا لیکن حقیقت میں اس دور کے بعد، یہ ختم نہیں ہو گیا۔ ہوا یہ کہ وہ جو Emergent Evolution (فجائی ارتقا) تھی وہ پھر Natural Evolution (فطری ارتقا) میں بدل گئی۔ اس ہزار سال کے اندر یہی ہوا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ہماری تو نگاہ ہی اس طرف نہیں جاتی اور ظاہر بین نگاہوں نے اس بات کو عام کر دیا کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔

کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟

مغرب کے ایسے محقق ہیں جنہوں نے تاریخی تحقیقات کیں۔ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ انسان غیر محسوس طور پر انہی راستوں کی طرف آ رہا ہے جو اسلام نے چودہ سو سال پیشتر دنیا کو دیئے تھے۔ میرا ایک مختصر سا مضمون ہے: ''کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟''[1] میں نے اس میں یہ مثالیں دی ہیں کہ قرآن کریم کے دیئے ہوئے یہ کونسے تصورات تھے، جو ہمارے سامنے تو آئے، پھر کچھ عرصے کے بعد وہ ہماری نگاہوں سے گم ہو گئے لیکن وہ زمانے کے تقاضوں یا کائناتی قوتوں کی رو سے غیر محسوس طور پر آگے چلتے چلے آ رہے ہیں اور اب جو مغرب کے محققین ہیں، وہ اس کو بھانپ رہے ہیں کہ یہ وہی Adventure of Ideas (معرکۂ تصورات) ہے جو اس رفتار سے آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے، حق غالب آتا چلا جا رہا ہے، باطل مغلوب ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اقبالؒ کی فکر قرآنی میں حق و باطل کی کشمکش کی ترجمانی

یہ جو حق و باطل کی کشمکش ہے، میں نے عرض کیا ہے کہ اقبالؒ کی فکرِ قرآنی اس کی ترجمان ہے۔ اقبالؒ کو فطرت

---

[1] یہ مضمون ایک پمفلٹ کی صورت میں بھی بارہا ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور سے طبع ہوا ہے، اس کا آزاد انگریزی ترجمہ (اس مدیر کے قلم سے) بھی شائع ہو چکا ہے۔ یہ دونوں ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور سے منگوائے جا سکتے ہیں۔

نے یہ انداز عطا کیا تھا۔ بارہا کتنا مشکل موضوع ہو' کتنا Scientific Subject (سائنسی مضمون) ہو' وہ اسے اس قسم کی شعریت میں بیان کرتا ہے کہ اگر اسے خالص شعریت کے معیار پہ بھی دیکھا جائے تو اسے وہ بلندترین مقام حاصل ہوتا ہے۔ دیکھیے! وہ کس انداز میں اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں! ''بانگِ درا'' کی ایک نظم ہے' ارتقا ہی اس کا عنوان ہے' ہےتو وہ نظم بڑی مشکل لیکن بڑی خوبصورت ہے' بات انہوں نے یہی بیان کرنی ہے کہ حق اور باطل کی کشمکش' تخریب وتعمیر کے تصادم' شروع سے آخر تک چلے آ رہے ہیں:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

جنگ آپس میں ہوتی چلی آ رہی ہے' یہ کشمکش ازل سے تا امروز ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کس کس چیز کی جنگ ہے؟ کہا کہ

چراغِ مُصطفویؐ سے شرارِ بُو لہبی

اس شخص کی کتنی حسین تشبیہات ہوتی ہیں! یہ حق و باطل کی' چراغِ مصطفویؐ وشرارِ بُولہبی کی یہی کشمکش ہے اورآ گے پھر جو زندگی ہے' اس کے بارے میں کہا ہے کہ کس طرح سے' اس کشمکش کے اندر' اپنے زوردروں سے' یہ Fight (جنگ) کرتی ہوئی ارتقا کی منزل میں' آگے بڑھتی ہوئی' چلی آئی ہے۔ کہا کہ

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی' جفا طلبی

کیا بات ہے کہ اس کی سرشت میں Struggle (جدوجہد) ہے' اسی Struggle (جدوجہد) سے یہ زندہ رہتی ہے' آگے بڑھتی ہے اور پھراس کی مثالیں یہ ہیں کہ

سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی

اللہ اکبر! موضوع دیکھیے' عزیزانِ من! کتنا مشکل اور خشک تھا' وہ اسے کس حسین انداز میں بیان کررہا ہے اور

کشاکشِ زم و گرما' تپ و تراش و خراش

یہ اتنی بڑی کشاکش' کس چیز کی ہے' یہ جو شیشہ بنتا ہے' آئینہ بنتا ہے' یہ ریت ہوتی ہے۔ اس کو مختلف بھٹیوں میں سے گزارا جاتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ مصفا ہوتا ہوا آئینہ بن جاتا ہے۔

دیکھیے وہ اقبالؒ کیا کہتا ہے

کشاکشِ زم و گرما، تپ و تراش و خراش
ز خاکِ تیرہ دروں تابہ شیشۂ حلبی

اب عام طور پہ مشہور ہے کہ بہار کے موسم میں، پانی کی ایک بوند گرتی ہے تو سیپ منہ کھول کر اس کو اپنے بطن میں لے لیتی ہے اور اس کے اندر آہستہ آہستہ اس کی پرورش ہوتی ہے۔ اسے قطرۂ نیسان کہتے ہیں۔ نیسان موسمِ بہار کا نام ہے اور وہ جو اس کے اندر موتی ہے، وہ آہستہ آہستہ گوہر بنتا ہے۔

مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید
میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عِنبی

کہا کہ نہیں، وہ موتی کی طرف نہیں لے کر گئے، شراب کی طرف لے کر آئے ہیں۔ اب میں شاعری، میں دوسری تشبیہ کی طرف آجاؤں۔ وہ جو قطرۂ نیسان تھا، وہ ان تمام اضطراب انگیزیوں اور تلاطم خیزیوں کے جھولے جھولتا ہے اور آخر میں گوہر بنتا ہے۔ یہ تو غالب [1] ہے جس نے یہ کہا ہے کہ

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

انہوں نے قطرہ نیسان تشبیہ دی ہے اور جو شراب بنتی ہے اس میں اسے کن بھٹیوں میں سے گزرنا پڑتا ہے اور اس کے بعد ہے کہ

اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

اور آخری شعر فارسی کا ہے۔ یہ وہ بات آگئی کہ

مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند

یہ شراب بنانے والے، انگور کے دانے کو، جو شراب میں تبدیل کرتے ہیں تو وہ کیا کرتے ہیں؟ کہا:

ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

ستارہ توڑتے ہیں اور اس کا سورج بنا لیتے ہیں، یہ ہے ارتقا۔

---

[1] مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869ء)

کشمکشِ حق و باطل میں غلبۂ حق اور یہ ہے دین

پہلی منزل میں جو اس کی شکست ہوتی ہے تو یہ زندگی اس میں سے ابھر کر جب آگے بڑھتی ہے تو یہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین، کہیں زیادہ خوشگوار بن کر نکلتی ہے لیکن یہ کشاکشِ پیہم اسی کا ہی نتیجہ ہے۔ یہ تقاضا ہے جو قرآن نے کہا تھا کہ حق تو باطل کے سر پر ہتھوڑے کی ضربیں لگاتا چلا جاتا ہے، وہ اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کشمکش میں اور اس کشاکش کے اندر حق بالآخر غالب آتا ہے۔ اگر حق کو تنہا چھوڑ دیا ہے، ہزاروں لاکھوں سال کے بعد، تمہارے دست و بازو اس کی مدد کے لیے اٹھے ہیں تو چند دنوں کے اندر بات آخر میں وہی ہوگی کہ وَيَمۡحُ اللّٰهُ الۡبَاطِلَ وَيُحِقُّ الۡحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ (42:24)۔ ہوگا یہی، زود ہو یا بدیر ہو، یہ ہے ابدی حقیقت جسے قرآن مجید نے بیان کیا ہے اور جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ اس وقت تک کی ہمارے زمانے کی بھی سائنٹفک تحقیقات اسی کی شرح کو بیان کر رہی ہیں، وہ محققین اسی کی تفاسیر کو بیان کرتے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ بات یہ ہوگی کہ پھر آگے جا کر ہوتا کیا ہے؟ وہ دین ہوتا ہے یعنی ابدی نظریات کے اوپر ایک محسوس نظام قائم کر کے اس کے خوشگوار نتائج سے اس کے حق ہونے کی شہادت پیش کرنا۔ یہ دین ہوتا ہے۔ اس میں بڑی کشمکش اور کشاکش ہوتی ہیں۔

باطل کی تکنیک ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بے نقاب ہونے ہی نہ دے

اغراض میں، مصلحتوں میں، انسانی جذبات میں، حق کا تقاضا منفعت عامہ ہوتا ہے، نوعِ انسانی کی منفعت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس افراد کا تقاضا اپنے ذاتی اغراض اور ذاتی منافع ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس کے بعد باطل کرتا کیا ہے؟ اس کی بھی ہمارے ہی دور کے یہ جو سائیکولوجسٹ (ماہرین نفسیات) ہیں، انہوں نے بڑی تحقیق کی ہے اور میں عام طور پہ ایرک فرام [1] کا حوالہ دیا کرتا ہوں۔ بڑی عجیب چیزیں ہیں جو وہ شخص لکھ گیا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ باطل کبھی بے نقاب سامنے نہیں آتا۔ اس کی تکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کا نقاب اوڑھ لیتا ہے۔ ایک شخص آپ سے آ کر یہ کہے کہ میں آپ کے لیے یہ کروں گا اور وہ کروں گا اور یہ ایثار ہوگا اور میری آپ کے ساتھ ہمدردیاں ہیں اور مخلص دوست ہوں اور میں تو جان تک قربان کر دوں گا، یہ سب کچھ وہ آپ کے ساتھ کرتا ہے، کچھ معاہدہ، کچھ معاملہ کرتا ہے۔ ٹھیک ہے آپ اس کی باتوں کا یقین کر لیتے ہیں۔ اگر وہ اسی طرح سے اٹھ کر چلا جائے تو وہ یقین باقی رہتا ہے۔ اگر وہ جاتے وقت کہیں یہ کہے کہ دیکھو بھائی! میں نے جو کچھ تم سے کہا ہے، سب جھوٹ ہے تو وہ کامیاب رہ ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ بے نقاب ہو تو ظفرمند نہیں ہو سکتا۔ ان کی تحقیق یہ ہے اور ہمارا تو زندگی کا تجربہ ہی یہ ہو گیا۔

---

[1] Erick Fromm(1900-1980)

مذہب نے خود کو ہمیشہ دین کے نقاب میں ہی پیش کیا ہے

عزیزانِ من! اس قوم کا الدین نہیں رہتا جب وہ جماعت نہیں رہتی۔ اب اس کی رفتار کائناتی ہوتی ہے' الدین کی جگہ مذہب آ جاتا ہے جس کو باطل کہتے ہیں۔ مذہب باطل ہوتا ہے اور حق دین ہوتا ہے۔ مذہب دین کا نقاب اوڑھ کر آتا ہے لیکن اس کی تمام اصطلاحات' وہی تصورات' وہی نظریات' وہی رسومات' وہی سب کچھ ہوتا ہے جو دین کا ہے' یہ سارا نقاب ہوتا ہے' اس کی جو حقیقت ہے وہ باطل کی ہوتی ہے۔ جب یہ باطل آہستہ آہستہ عام ہو جائے تو وہ معاشرے کا ایک رہن سہن یا چلن بن جاتا ہے' پورا معاشرہ اسی کو حق سمجھنے لگ جاتا ہے۔ جب یہ کیفیت ہو جائے تو اس وقت معاشرہ اپنے اس باطل تصور کے پھیلانے کے لیے خود حربے اختیار کرتا ہے۔ قرآنِ کریم میں (17:62,64) میں وہ حربے ❶ دیئے گئے ہیں۔ وہ ایسے ہیں جیسے کہ خدا اور ابلیس مقابل میں کھڑے ہیں۔ یہاں ابلیس یہ چیز کہتا ہے کہ ٹھیک ہے کہ آپ نے اس مٹی کے مادھو کو سر پہ تو چڑھا رکھا ہے' ذرا اس کو زمین پہ اتاریئے اور مجھے اجازت دیجیے اور پھر تماشہ دیکھیے کہ میں اسے کس طرح تگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔ ❷

ابلیس کے آدم کے خلاف حربے

آپ کو قرآن کریم کا ایک لفظ لَاَ حۡتَنِکَنَّ (17:62) یاد ہے کہ وہ جو گاؤں کے لڑکے یونہی کوئی بچھیرا پکڑ کر اس کی تھوتھنی کے اوپر رسی کا بل دے کر اس کے اوپر بیٹھتے ہیں اور پھر جو اس کا حشر کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ لفظ اَحۡتَنِکَنَّ (17:62) جو قرآن نے استعمال کیا ہے۔ ابلیس نے کہا کہ تم اس کو چھوڑ کر دیکھو کہ میں کس طرح اس کا وہ حشر کرتا ہوں اور اس کے لیے میرے پاس بہت سے حربے ہیں' بہت سی تکنیکیں ہیں۔ کہا ہے کہ **وَ اسۡتَفۡزِزۡ مَنِ اسۡتَطَعۡتَ مِنۡهُمۡ بِصَوۡتِکَ** ❸ (17:64)۔ اس کے بعد کہا ہے کہ **وَ اَجۡلِبۡ عَلَیۡهِمۡ بِخَیۡلِکَ وَ رَجِلِکَ** ❹ (17:64) فوج کشی بھی ایک چیز ہے یہ بھی ایک حربہ ہوتا ہے' اس کے بعد کہا کہ **وَ شَارِکۡهُمۡ فِی الۡاَمۡوَالِ** (17:64) ان کے مال و دولت کے اندر شرکت کر دینا' حرام ہی حرام ملاتے چلے جانا۔ یہ بھی ایک طریقہ ہوتا ہے۔ آگے کہا کہ **وَ الۡاَوۡلَادِ** (17:64) ان کی اولاد کا بیڑا غرق کر دینا' تعلیم غلط دے کر۔ یہ بھی میرا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک اور طریقہ اس

---

❶ وَ اسۡتَفۡزِزۡ مَنِ اسۡتَطَعۡتَ مِنۡهُمۡ بِصَوۡتِکَ وَ اَجۡلِبۡ عَلَیۡهِمۡ بِخَیۡلِکَ وَ رَجِلِکَ وَ شَارِکۡهُمۡ فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ وَ عِدۡهُمۡ ؕ وَ مَا یَعِدُهُمُ الشَّیۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا (17:64)

❷ قَالَ اَرَءَیۡتَکَ هٰذَا الَّذِیۡ کَرَّمۡتَ عَلَیَّ ۫ لَئِنۡ اَخَّرۡتَنِ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَةِ لَاَحۡتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیۡلًا (17:62)

❸ تم خالی پروپیگنڈے کے زور سے' گڑگڑا کر اُن کے مقام سے ہٹا دو گے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔643)۔

❹ تم اُن پر اپنے بڑے بڑے لشکر لے کر چڑھ دوڑو گے' ایسے لشکر جن میں سوار اور پیادے سب شامل ہوں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔643)۔

نے بتایا کہ بِصَوْتِکَ (17:64) اس کا کیا ہے، میں تو اس کو محض آواز سے مار دوں گا۔ اس سے پہلے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ابلیس ''محض آواز سے'' کس طرح مار دیتا ہے۔ اس دور میں، عزیزانِ من! بات سمجھ میں آئی۔ یہ جتنے آلاتِ ابلاغ ہیں: یہ آپ کے ریڈیو، یہ آپ کے ٹی وی، یہ کیسٹس، یہ جتنی بھی آوازیں نکل رہی ہیں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس قدر باطل کی پبلسٹی اس کے ذریعے سے ہوتی ہے کہ انسانی ذہن مسلسل پیہم اس سے مغلوب ہو جاتا ہے۔

آپ کبھی اس تکنیک کو دیکھیے گا جو شام کو ٹی وی کے اوپر Advertisements (اشتہارات) کی صورت میں ہوتی ہے۔ یہ اشتہارات ہوتے ہیں۔ بچے کئی دفعہ پوچھتے ہیں کہ صاحب! اس پہ اتنا خرچ کیوں کیا جاتا ہے؟ اس پانچ سیکنڈ یا دس سیکنڈ کے اتنے ہزار روپے ہوتے ہیں۔ یہ بات تو اتنی سی ہے کہ کوئی ایک سگریٹ والا ہے، وہ پان سپاری والے بھی ہوتے ہیں، وہ بھی اشتہار دیتے ہیں۔ یہ بچے کہتے ہیں کہ یہ اتنا خرچ کرتے ہیں اور وہ اتنا تسلسل سے آتا ہے، یہ آخر ہوتا کیا ہے؟ یہ بِصَوْتِکَ (17:64) ہے، یہ ابلیس کی تکنیک ہے۔ اس میں آپ یہ دیکھیں گے کہ شروع میں اگر کسی چیز کا بھی اشتہار آئے گا تو آپ کے Nerves (اعصاب) اس کا مقابلہ کر رہے ہوں گے کہ نہیں، یہ اشتہاری چیز ہی ہے، یہ ایسی ہی ہے۔ یہ اشتہار بار بار آئے گا، آپ کے اعصاب سے اس کا بار بار تصادم ہوگا، آپ کی اس کے ساتھ کشمکش ہوگی، آہستہ آہستہ، اس تسلسل سے، اس زور سے، وہ اپنا پروپیگنڈہ جاری رکھے گا کہ ایک دن آپ کسی جگہ جا کر وہ چیز بغیر دیکھے، بغیر پتہ لیے کہ واقعی وہ ایسی مفید بھی ہے جیسی کہا جا رہا ہے آپ خرید لیں گے، آپ اس چیز کی مخالفت میں اپنی شکست تسلیم کر لیں گے یعنی اگر یہ ذہن شکست تسلیم نہ کرے تو ذہن میں آتا ہے کہ کیا ان Advertisements (اشتہارات) کرنے والوں کی مت ماری ہوئی ہے کہ اتنا روپیہ خرچ کریں؟ ان کا جو کاروبار ہے وہ اس Advertisement (اشتہار بازی) کے ذریعے پھیلتا ہے۔ یہ پھیل کیسے رہا ہوتا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ خریدنے والے یہ لوگ، پہلے ان چیزوں کا تجربہ نہیں کرتے کہ واقعی وہ ایسی ہیں اور مفید ہیں تو خریدا جائے۔ انسان کا ذہن اس Advertisement (اشتہار بازی) سے شکست کھا جاتا ہے یہ بڑا کامیاب حربہ ہے۔

اعتقادات کو پھیلانے کے سلسلہ میں مذہبی دنیا کے ذرائع ابلاغ ذہنوں کو ماؤف کرنے کا موثر ترین حربہ ہیں

یہ تو میں نے محسوس چیزوں کی مثال دی ہے کہ یہ جو زندگی کے Ideas (تصورات) ہیں، اعتقادات ہیں، مذہب اپنی ان چیزوں کو ان ذرائع سے پھیلاتا ہے اور اتنا عام کرتا ہے کہ انسان کے اعصاب شکست قبول کر لیتے ہیں۔ ان کے اندر اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ پیہم اتنی بڑی یورش کا مقابلہ کریں۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ پبلسٹی کے جس قدر ذرائع مذہب کے پاس ہوتے ہیں، وہ بڑی سے بڑی حکومت کے پاس بھی نہیں ہوتے۔ شرعی عدالت نے، خود حکومت نے، ایک فیصلہ۔ دیدیا فیصلہ یہ دیا کہ رجم یا سنگساری کی سزا، اسلام کے خلاف ہے، قرآن حمید کے خلاف ہے۔ مذہبیت اس فیصلے کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ ہر جگہ سے اس فیصلہ کے خلاف صدا بلند کی جاری ہے۔ اب ان کے

ہاں یہ طے پایا ہے کہ اگلے ہی جمعہ یا فلاں جمعہ کو ہر مسجد میں جمعہ کے خطبے میں جنہوں نے یہ فیصلہ دیا ہے انہیں Condemn (معتوب) کیا جائے۔ آپ ذرا سوچیے تو سہی کہ ملک کی ہر مسجد میں ایک حکومت پاکستان تو ایک طرف دس حکومتیں بھی ملائیں تو ان کے لیے مراکزِ پلبسٹی اتنے نہیں ہیں جتنے یہ ایک آواز نے ہر مسجد میں جمعہ کے خطبے کے بعد اور بغیر پیسہ خرچ کیے ہوئے پیدا کیے۔ اب وہ جو جمعہ کے سامعین ہوتے ہیں تو وہاں پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ خطبہ خاموشی سے سننا ہے بولنا نہیں ہے۔ آپ کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ اس طرح سے آپ کو متاثر کیے چلے جاتے ہیں جب خطبہ ختم ہوتا ہے تو اللہ اکبر کر کے نماز شروع ہو جاتی ہے قصہ ختم ہوا۔ یہ جو Psychological Effect (نفسیاتی اثر) ہوتا ہے یہ ذہنوں کو ماؤف کرتا ہے۔ اگر کوئی باطل کے خلاف یا حق کے حق میں آواز اٹھانے کی ہمت کرتا ہے تو اس کے خلاف ان کے پاس بڑے کامیاب حربے ہوتے ہیں۔

معاشرتی تنہائی کے خوف کا حربہ

Psychological (نفسیاتی طور پر) جو چیز ہے جس کو حربہ کہا جاتا ہے وہ Fear (خوف) ہے۔ قرآن مجید میں ابلیس کے ایک حربے کے بارے میں آیا ہے کہ جب وہ ان پلبسٹی کے ذرائع سے دیکھتا ہے کہ کہیں تھوڑی سی چوک رہ گئی ہے یا تھوڑا سا خلا رہ گیا ہے تو وہ اس کو خوف[1] کے ذریعے سے پورا کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ Fear (خوف) کس چیز کا پیدا کرتا ہے؟ عام طور پہ کہا جائے گا کہ ''میں ہر قسم کی صعوبت اور مصیبت اور مشقت برداشت کرنے کو تیار ہوں''۔ اس میں یہ نہیں ہوتا۔ ان کی یہ ایک اور چیز ہوتی ہے۔ آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ انسان Social Animal (مدنی الطبع) ہے یہ دوسروں کے ساتھ مل کر رہنے والا ہے۔ اس کے لیے سنگین ترین سزا قید تنہائی ہوتی ہے۔ یہ قید بھی کچھ کم صعوبت آمیز سزا نہیں ہوتی۔ عام مشاہدہ ہے کہ جیل خانے کے اندر قیدِ تنہائی سے قیدی چیخ اٹھتا ہے بڑے سے بڑا سخت جان مجرم بھی اس تنہائی میں چیخ اُٹھتا ہے۔ تنہائی پیدا کرنے کے لیے یہ لوگ کیا کرتے ہیں؟ سنیے حق کی آواز بلند کرنے والے یا یوں کہیے کہ ان کے خلاف کوئی بات کہنے والے کے ساتھ یہ لوگ ایک لیبل لگا دیتے ہیں اور اس لیبل کی بنا پر یہ اس کو معاشرے سے Isolate (الگ) کر دیتے ہیں۔ بس انہیں صرف اتنا کہنا ہوتا ہے کہ یہ منکرِ حدیث ہے۔ ہر شخص محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ ہم میں سے نہیں یہ کچھ اور ہے۔ وہ خود بھی محسوس کرنے لگ جاتا ہے کہ میں اس معاشرے میں سے نہیں ہوں میں تو الگ ہوں۔ یہ ہے تنہائی (Isolation)۔

---

[1] اِنما ذٰلکم الشیطٰنُ یخوف اولیآء ہ (3:174)۔ یاد رکھو! ان مرکش قوتوں کی (جو تم سے برسرِ پیکار ہیں) چال یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنی پارٹی کی طرف سے دوسروں کے دل میں ڈر اور خوف پیدا کرتے رہتے ہیں (36-39)۔ پرویزؒ: مفہوم القرآن ص ص، 166 تا 167۔

عباسیوں کے عہد میں اہل معتزلہ کے ساتھ ہونے والا سلوک

جب انہوں نے پہلی دفعہ یہ حربہ استعمال کیا تو اس کے لیے معتزلہ کا ایک لفظ استعمال کیا۔ اعتزال کے معنی ہیں ''الگ کیا ہوا (Isolated)''۔ یہ بہت بڑی حق کی آواز تھی جو انہوں نے اٹھائی۔ انہوں نے کہا تھا کہ دین نام ہے قرآن کے ابدی حقائق اور ان کے مطابق انسانی عقل کے استعمال کا۔ یہ اسے کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ عباسیوں (750-1258A.D) کا زمانہ تھا' تھیوکریسی (مذہبی پیشوائیت) بھی زوروں پہ تھی۔ بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ انہوں نے اس فرقے کا نام ہی معتزلہ رکھا ہوا ہے۔ اعتزال کے معنی ہی یہ ہیں: ''الگ کیا ہوا' Isolation کی حالت میں رکھا ہوا'' ہمارے ہاں پہلے برادریاں ہوتی تھیں۔ اب بھی پتہ نہیں کہ کوئی چھوٹی موٹی ہیں یا نہیں۔ یہ نائیوں کی برادری یعنی یہ حجام وغیرہ' یہ دھوبیوں کی برادری' یہ خاکروب یا جن کو چوڑھے کہتے ہیں ان کی برادری۔ ان میں سے اگر کوئی شخص برادری کے خلاف کچھ کرتا تھا تو اس کی سزا یہ ہوتی تھی کہ اسے برادری سے الگ کر دیتے تھے' اس کا حقہ پانی بند کر دیتے تھے یعنی اس کو برادری سے الگ کر دیتے تھے۔ وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ جو شرائط یہ کہتے تھے وہ اسے مانتا تھا' ان کے پاؤں پڑتا تھا اور اس کو مناتا تھا۔ یہ جو برادری سے الگ کر دینے والی کیفیت ہے' ان کی تکنیک یہ ہے کہ جو بھی اس قسم کی آواز اٹھائے' جو دین کے حق میں جائے' اس کے ساتھ ایسا لیبل لگا دو کہ وہ باقی معاشرہ سے بالکل الگ تھلگ نظر آئے' Isolated (تنہا) ہو جائے۔ اگر ذرا سا بھی کمزور دل ہو' تو آدمی چیخ اٹھتا ہے۔

آج کے دور میں قرآن کریم کی آواز اٹھانے والے کا حشر

آپ آج کے اس تجربے میں دیکھیے کہ کہیں کسی نے قرآن کریم کی آواز اٹھائی' انہوں نے کہا کہ یہ منکرِ حدیث ہے' تو اب یوں نظر آتا ہے جیسا وہ بیچارا کسی اور ہی کُرّے کا انسان ہے' کسی اور ہی نوع کا ہے' وہ ان میں کا ہے ہی نہیں' وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے اور ایسے بہت کم انسان ہیں جو اس کو برداشت کر لیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ ان چیزوں کو حق مانتے بھی ہیں تو بھی زبان پہ نہیں لاتے کہ ان کو بھی یہی کچھ بنا دیا جائے گا۔ منکرِ حدیث سے آگے بڑھ کر وہ پرویزی فکر کہتے ہیں یعنی کچھ بھی اس قسم کی چیز جو دین کو قرآن حمید کے ابدی حقائق اور انسانی عقل پر مبنی بنائے۔ ان کے پاس حق ہونے کی دلیل کیا ہوتی ہے؟ کسی سے پوچھیے کہ جو عقائد اسلاف سے ہمارے ہاں تواتر سے چلے آ رہے ہیں' ان کی صداقت کی سند کیا ہے؟ یعنی کوئی حق کی سند نہیں' کوئی دلیل نہیں' محض جو کچھ تواتر سے چلا آ رہا ہے' وہی سند ہے۔ اس کے لیے ایک اور لفظ اجماعِ امت ہوتا ہے جو آج تک کبھی نہیں ہوا۔ صدرِ اول میں تو بہرحال امت ایک تھی' ان کا عقیدہ ایک تھا' اس کے بعد آج تک کوئی ایک معاملہ ایسا نہیں جس میں ساری امت متفق ہوئی ہو' البتہ میرے استاد مولانا اسلم جیرا

چپوریؒ(1959-1890ء) ایک انداز میں کہا کرتے تھے کہ عجیب صورت ہے کہ تاریخ میں جب بھی مختلف فرقوں کے علما کا اجماع ہوا ہے ہمیشہ باطل پہ ہوا ہے۔ بہر حال ان کے نزدیک ایک اجماعِ امت بھی ایک چیز ہے یعنی جن کو ہجوم یا Crowd مانتا ہے جن چیزوں کو اس کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے اور جو اس کے خلاف کہتا ہے اس کو یہ برادری سے نکو بنا دیں گے بائیکاٹ (Boycott) کر دیا' Isolate (تنہا) کر دیا' الگ کر دیا' وہ تنہا رہ گیا۔ اس تنہائی کی سزا کو بہت کم ہیں جو پھر برداشت کرتے ہیں۔

تجربہ کر کے دیکھیے گا' تنہائی میں کمرے کے اندر بہت سے آپ کو ایسے مل جائیں گے جو اس بات سے متفق ہوں گے کہ واقعی جو کچھ مذہب کے نام پہ کیا جا رہا ہے' خلافِ اسلام ہے' باطل ہے' حق نہیں ہے لیکن ان سے کہیے کہ یہی بات ذرا باہر سڑک پہ جا کر کہیں تو کہنے لگے صاحب! آپ کی مت ماری ہوئی ہے' بھڑ کے چھتے میں کون پتھر مارے۔

غلبۂ حق کے لیے ایک جماعت کی ضرورت اور اس کے بغیر ابلیسی تکنیک

عزیزانِ من! یہ کیا ہے؟ یہ Isolate (الگ تھلگ) ہونا ایک بڑی سخت قسم کی تکنیک ہوتی ہے' جس سے یہ آواز دبتی ہے' نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ جو کشمکشِ حق و باطل ہے' اس میں کوئی جماعت ایسی نہیں پیدا ہوتی جو حق کی تقویت کا موجب بنے اور اس طرح اس کی جو رفتار صدیوں پر پھیلی ہوئی تھی' وہ دنوں میں سمٹ کر آ جائے۔ ان کو Isloate (الگ تھلگ) کر کے یہ آواز بلند نہیں ہونے دیتے' ورنہ اس قسم کی جماعت بن سکتی ہے جو حق کی حفاظت کے لیے اٹھے' پھر اس جماعت کی صورت یہ ہوتی ہے جیسا کہ ہم نے صدرِ اول کے اسلام میں دیکھا کہ پھر وہ موت کا ہنس کر استقبال کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ابلیس کی تکنیک یہ ہوتی ہے کہ اس قسم کی جماعت پیدا ہی نہ ہونے دی جائے' ایک ایک فرد کو اس طرح سے Isolate (الگ تھلگ) کیا جائے کہ وہ جھینپ جائے' چھپتا پھرے' اعلانیہ بات نہ کرے' ایسے لوگوں سے ملے نہیں جو اس قسم کے خیالات رکھتے ہوں۔

غلبۂ حق کے لیے فطری طریقِ کار ہے جو اپنی سست روی کے باوجود اپنی اندر کی قوت سے اوپر کو جاتا ہے

قرآن حکیم نے جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ باطل جتنی تکنیک استعمال کرنا چاہتا ہے وہ کرے' ٹھیک ہے یہ جو Emergent یا ہنگامی (ارتقا) ہے' یہ تو یہ نہیں ہونے دیگا لیکن وہ جو Evolution (ارتقا) کا Natural Process (فطری طریقِ کار) ہے Evolution کہ فطری رفتار سے وہ کشمکش چلی آ رہی ہے' اس کو دنیا کی کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ اس کے لحاظ سے تو لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) آخر الامر اس نے ہر نظام زندگی پر غالب آ کر رہنا ہوتا ہے' یہ اس کی سرشت کے اندر ہے' جس طرح فوارہ باہر کی طاقت سے اوپر نہیں ابھرتا' اپنی اندر کی قوت سے اوپر کو جاتا ہے۔ یہ ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (35:10)۔

یہ عجیب بات ہے جو قرآن مجید نے چار الفاظ میں کہہ دی کہ اس کے کلمات کے اندر از خود یہ قوت موجود ہے کہ وہ اوپر کو اٹھے لیکن اگر انسانوں کے اعمالِ صالحہ ساتھ ہو جائیں تو اس میں وہ صعود اور ترفع بڑی تیزی سے اوپر کو چلا جاتا ہے' بس فرق اتنا ہی ہے۔

عزیزانِ من! یہ جو اس سست رفتاری سے' یہ حق کا باطل پہ غلبہ ہوتا ہے' وہ محسوس نہیں ہوتا۔ اگر اس کی رفتار اتنی سست ہو تو آپ گھڑی میں دیکھیے' وہ سیکنڈ کی سوئی تو چلتی ہوئی' دوڑتی ہوئی' آپ کو نظر آتی ہے' اگر وہ نہ ہو' اول تو وہ منٹوں کی سوئی بھی نہیں نظر آتی' اور اگر وہ بھی نہ ہو' تو آپ کی نگاہ کتنی تیز بھی کیوں نہ ہو وہ گھڑی کی گھنٹے کی سوئی کے متعلق تو آپ کبھی محسوس بھی نہیں کر سکتے کہ یہ چل رہی ہے' حالانکہ وہ چل رہی ہوتی ہے۔ وہ ہے حق کی باطل پر غالب آنے کی کائناتی رفتار۔ اس کا نام آتا جا رہا ہے' اس کا نام نہ بھی کچھ رکھا جائے تو حقیقت تو اپنے مقام پر رہتی ہی ہے۔ دنیا آہستہ آہستہ اسی طرف آ رہی ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ لمبے عرصے پر پھیلے ہوئے واقعات کو ذرا سمٹا کر دیکھا جائے' Concentrate (مرتکز) کر کے دیکھا جائے تو پھر معلوم ہوتا ہے کہ واقعی یہ چیزیں' جو باطل کے نظام کی تھیں' آہستہ آہستہ وہ کس طرح حق کے تابع آتی چلی جاتی ہیں' تو ایک پروسیس (طریق کار: Process) یہ بھی ہوتا ہے اور یہ وہ عام پروسیس ہے جو قانونِ فطرت کی رو سے' کائناتی تقاضوں کے مطابق' رونما ہوتا ہے اور یہ تبدیلی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔

نسلِ انسانی کے ارتقا کا معاملہ: جسمانی اور ذہنی ارتقا مسلسل ہو رہا ہے

اگر آپ نے انسانوں کے اندر یہ دیکھنا ہو کہ عام طور پہ سطح بین لوگ' جنہیں پتہ نہیں کہ Evolution (ارتقا) کی تھیوری کے معنی کیا ہیں' وہ کس طرح سے مذاق اڑایا کرتے ہیں تو سنیے! یہ کہتے ہیں کہ جی! یہ بندروں کی اولاد ہیں۔ یہ صاحب علم کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ عام طور پہ کہتے ہیں کہ صاحب! دیکھو' اس ارتقا کے سلسلے میں انسان تو آ گیا: تو اب آگے تو ہم دیکھتے نہیں کہ کوئی اور نوع بھی آگے چلے۔ کیا ارتقا کا سلسلہ ختم ہو گیا؟ کون بتائے کہ جسے تم کہتے ہو کہ انسان میں تو ارتقا ہو نہیں رہا' انہیں نہ نظر آئے تو اس کا کیا علاج ہے!! اب ذرا آپ غار میں بسنے والے جو انسان تھے انہیں دیکھیے۔ شاید آج سے بیس ہزار سال پہلے یا کتنے ہی ہزار سال پہلے ان کے حالات ہی نہ پڑھیے' بلکہ انہی حالات کے اندر رہنے والے اب بھی آسٹریلیا کے سفید فام انسان اور افریقہ کے جنگلوں میں رہنے والے سیاہ فام' جنوبی افریقہ میں رہنے والے' پہاڑیوں کے اندر بسنے والے' اسی حالت میں کھڑے ہیں جہاں وہ غار کے زمانے کے انسان تھے۔ ان انسانوں کو بھی دیکھیے اور آج کے انسان کو بھی۔ آج چاند پہ جانے والے انسان کو دیکھیے اگرچہ شکل و شباہت میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے لیکن اس کو چھوڑ دیجیے' کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ذہنی اعتبار سے یہ دونوں انسان ایک ہی نوع کے فرد ہیں؟ نہیں' ارتقا اب اس طرح سے شروع ہوا ہے لیکن یہ اتنا غیر محسوس ہے کہ اگر شکلیں بدلتیں تو ان کا تو پتہ چلتا کہ کل اس شخص کا' اس قسم کا' حلیہ تھا اور آج اس کا چہرا یوں ہو گیا' محسوس ہے لیکن یہ جو

انسان کے اندر ارتقا اور تبدیلی آئی ہے یہ محسوس ہی نہیں ہوتی۔ یہ بڑے بڑے دیدہ ور Historian (مورخین) بھی نہیں بتا سکتے کہ تاریخ کے فلاں دور میں ایک ایسی لائن آتی ہے جس میں پچھلا انسان اور اس سے اگلا انسان متمیز ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ بالکل نہیں' یہ سلسلہ گھنٹے کی سوئی کی طرح چل رہا ہے' ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ دس سے گیارہ بج گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کی رفتار کیا تھی؟ دس سے گیارہ تک پہنچنے میں اس کی گھڑی کی سوئی کو جو دیکھا تو وہ چلتی ہوئی نظر ہی نہیں آئی۔ رابرٹ برفو (Robert Briffault) نے جو وہ اتنی ضخیم ❶ کتاب لکھی ہے بڑی عجیب وغریب چیز ہے۔ اس میں وہ Civilization (تہذیب) کی رفتار کا بھی تجزیہ کرتا چلا جاتا ہے لیکن یہ کہیں نہیں بتایا جا سکتا' نہ ہی وہ بتاتا ہے کہ اس لائن کے اوپر آ کر دیکھیے گا اس سے پہلے کا انسان اور اس کے بعد کا انسان کہیں نہیں معلوم ہوتا' بڑی غیر محسوس ہوتی ہے انسان کی یہ جتنی رفتار ہوتی ہے۔

حق و باطل پر مبنی تصورات (Ideas) کی چھان پھٹک میں وحی کا کردار اور قوموں کے عروج زوال کی داستان کا مطالعہ

اسی طرح سے اگر آپ بھی دیکھنا چاہیں کہ دین جب مذہب میں تبدیل ہوا ہے تو یہ جو آپ کے دین کے تصورات ونظریات اور زندگی کے مقاصد ومطالب ہیں' ان میں جو فرق آیا ہے' وہ کیسے آیا ہے؟ یہ فرق بڑا غیر محسوس طور پر آتا ہے۔ اگر آپ یہ بھی دیکھنا چاہیں کہ مسلمانوں کے یہ عقائد جو آج موجود ہیں' یہ کس طرح سے' ان حقیقی واصلی عقائد کے خلاف ہیں' یہ کس طرح سے عام ہوئے' یہ کیسے پیدا ہوئے؟ بڑی مشکل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ لوگ تو اس مقام پہ بھی انگشت بدنداں رہ گئے کہ معلوم نہیں کہ اب کونسا وہ Criterion یا معیار ہے جس کی رو سے ہم یہ دیکھیں کہ وہ باطل تھا' یہ حق ہے۔ قرآن کریم نے اس معمہ کو حل کیا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ تنہا تمہاری عقل اس کا فیصلہ نہیں کر سکتی' نہ ہی تاریخ تمہیں اس قسم کی کوئی لائن دے سکتی ہے۔ اس کے لیے اس نے کہا کہ وحی کی ضرورت ہے جو الحق ہے۔ اس نے کہا کہ خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے حق پر مبنی سارے تصورات (Ideas) دیدیئے' قرآنِ کریم میں مکمل کر دیئے' اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اب اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ انسان کو اس مخمصے میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ عقلی طور کے اوپر' تاریخی طور کے اوپر' فلسفیانہ تغیرات کی رو سے' چھان بین کرے' پھر یہ بتائے کہ حق کیا تھا اور کیا نہیں۔ کہا کہ اس میں بھی بہت مغالطہ لگ جائے گا۔ معیار یہ ہے کہ خدا نے ابدی طور پر آپ کو یہ جو مستقل اقدار دیدیں اور قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دیا' بس انہیں اپنے سامنے رکھیے اور ان کی روشنی میں تاریخ کا مطالعہ کیجیے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ جہاں کوئی تہذیب' کوئی تمدن' کوئی نظریہ' کوئی تصور' کوئی قوم'

---

❶ Briffault, Robert (1928), The Making of Humanity. London: George Allen & Unwin Ltd.

آہستہ روبہ زوال ہوئی پھر آہستہ آہستہ وہ فنا تک پہنچی' یہ وہ تھی' جو ان ابدی حقائق کے خلاف گئی تھی جو قرآن کریم نے دیئے ہیں اور جہاں کسی قوم کے اندر فروغ ہوا' ارتقا ہوا ہے' اس قوم کا نام کچھ بھی ہو' سوال نام کا نہیں ہے' آپ اس کا مطالعہ کیجیے۔

اس کا مطالعہ کیجیے' تو تاریخ کی رو سے نظر آئے گا کہ انہوں نے اپنے بنیادی تصورات میں ایک تبدیلی کی تھی: پچھلے تصورات کو چھوڑا تھا' نئے تصورات اختیار کیے تھے۔ اگرچہ انہوں نے یہی کہا کہ ہم نے زمانے کے تقاضوں سے ایسا کیا ہے لیکن اگر وہ ان کو آگے لے جانے والے تھے تو آپ دیکھو گے کہ وہ اس سے ملتے جلتے تھے جو قرآن کریم نے دیئے یا وہی تھے جو قرآن کریم نے دیئے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ اس انداز سے کرنا چاہیے' پھر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ (42:24) کے معنی کیا ہیں' پھر آپ کو اس کی شہادت ملتی ہے کہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ کتنا عظیم دعویٰ ہے' ورنہ سطحی طور پر جیسا میں نے عرض کیا ہے' خوش فہمی میں مبتلا رہنا کہ ہم حق پر ہیں' ہندو انگریز باطل پر ہیں' بہر حال انہوں نے تو مٹنا ہی ہے' اور ہم نے ہی باقی رہنا ہے غلط ہے' آپ بے شک اس خوش فہمی میں مبتلا رہیے۔ یہ کوئی صحیح بات نہیں ہے۔

آپ نظری طور پہ بھی' فلسفیانہ انداز سے بھی' ان تصورات کے متعلق کہیں کہ ہاں صاحب! یہ بہت بلند ہیں اور عملی طور پر کچھ نہ کریں تو اس سے بھی کچھ نہیں بنتا۔ یہ تو ہیگل (Hegal 1770-1831A.D) والی تفسیر ہے۔ یہ تو ان نظریات' ان کلمات' کی بنیادوں کے اوپر جو نظام آپ استوار کریں گے' اس کے نتائج آپ کو بتائیں گے کہ چند دنوں میں کس طرح اتنا بڑا انقلاب اور تغیر انسانیت کی اس زندگی کے اندر واقع ہو گیا۔ بہر حال' عزیزانِ من! اگر کوئی جماعت وجود میں آ جائے تو یہ جو اس کی رفتار ہے' وہ ہزار سال کے بجائے دنوں میں تبدیل ہو جاتی ہے' وہ جماعت وجود میں نہ آئے تو یہ حق اپنی طبعی کائناتی رفتار سے آگے چلتا ہے' بڑا وقت ضرور لگ جاتا ہے۔ قرآن کریم کا یہ جو دعویٰ ہے اسے ہم محض عقیدے کی بنا پہ نہیں مان رہے عقیدۃً اس کو صحیح نہیں سمجھ رہے' اس پر عمل نہیں کر رہے۔

تاریخ کے سلسلہ میں مغرب کے محققین کا کردار اور ہمارا اپنا جرم

غیر مسلم محققین نے تاریخ کا جو تجزیہ کیا ہے وہ خود اس نتیجے پہ پہنچ رہے ہیں کہ اس کشمکش کے اندر تعمیری قوتیں غالب آ کر کوئی قوم یا کوئی تہذیب آگے بڑھی ہے اور جو میں نے ابھی کہا ہے کہ وہ The Making of Humanity (تشکیلِ انسانیت) درحقیقت History of Civilization (تاریخ تہذیب) ہے کہ جب بھی کوئی تہذیب زوال پہ آئی' فنا ہوئی تو یہ وہ تھی جس نے ان اس قسم کے حقائق اور اقدار کو چھوڑ دیا تھا اور اس کے برعکس جو Civilization (تہذیب) بھی آگے بڑھی ہے' جس قوم کو بھی فروغ ہوا ہے' یہ وہ تھی جس نے یہ حقائق جو قرآن نے دیئے ہوئے ہیں ان پر عمل کیا گو کہ وہ اس کا حوالہ اور سند نہیں دیتے' وہ اس طرف نہیں آتے ہیں کیونکہ

ان کے سامنے مسلمانوں کی تاریخ غلط ہے اور وہ ہے بھی مسلمانوں کی تاریخ' اسلام کی نہیں ہے۔ صدرِ اول کی تاریخ جو نبی اکرم ﷺ و صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کے زمانے کی بھی تاریخ ہے' وہ ہم نے بعد میں آ کر عباسیوں کے زمانے (750-1258AD) میں مرتب کی ہے۔ اس تاریخ کو ہم نے اپنے رنگ میں رنگ دیا' اس لیے یہ لوگ جو غیر مسلم محقق ہیں' وہ اس قسم کا کوئی حوالہ یا سند تو نہیں دے سکتے' یہ ہمارا قصور ہے کہ ہم نے نہ ان کے سامنے قرآن مجید پیش کیا' نہ ان کے سامنے صدرِ اول کی تاریخ پیش کی ہے لیکن وہ اپنے طور پر' غیر محسوس طور پر' یہ نام لیے ہوئے ہیں۔ جب وہ ❶ کہتے ہیں کہ تاریخِ انسانیت بتاتی ہے کہ کسی انسان نے کبھی کسی انسان کی حکومت کو گوارا نہیں کیا' تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ قرآن مجید کی آیت کا ترجمہ ہے یا نہیں؟ اور پھر وہ ❶ اس پہ تحقیق کرتا چلا جاتا ہے' Volumes (ضخیم جلدیں) لکھتا چلا جاتا ہے۔ اب ان کو کون بتائے کہ قرآن نے صدیوں پہلے بتا دیا تھا کہ **مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (3:79) کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا' خواہ وہ مقننہ ہو' وہ انتظامیہ ہو' وہ نبی بھی کیوں نہ ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم میرے محکوم بن جاؤ۔ اندازہ لگائیے۔ اس ❶ نے اپنی اس پوری تحقیق کے بعد یہی کہا۔ اس نے قریباً سولہ سال اس پہ صرف کیے' میں نے ایک نکتہ کہا ہے' وہ اس پہ پہنچا ہے کہ تاریخ بتا رہی ہے کہ جب بھی انسان کا شعور بیدار ہوا ہے کسی انسان نے دوسرے انسان کے محکوم بننے کو گوارا نہیں کیا ہے۔ وہ یہ بات تاریخی شواہد سے پیش کر رہا ہے' قرآن کریم چودہ سو سال پہلے یہ بات بتا رہا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس حق حاصل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس کو گوارا ہی نہیں کر سکتا' تو یہ چیز جو وہ کہتے ہیں کہ آہستہ آہستہ انسان اپنے طبعی تقاضوں یا زمانے کے تقاضوں کی رو سے ملوکیت' بادشاہت' شہنشاہیت' شخصیت پرستی' پروہت پرستی' کو چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا ہوا چلا آیا۔ کیا کرتا بیچارہ:

کیا بات ہے! غالب ❷ کہہ گیا ہے:

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

آخر الامر وہ انقلاب فرانس (1789) سے اس پہ پہنچے کہ بھئی! انسانوں پر کوئی ملوکیت' شخصیت وغیرہ نہیں ہے' انسانوں پر کوئی انسان حکومت ہی نہ کرے' وہ خود ہی اپنے آپ پہ حکومت کریں۔ بعد کے تجربے نے یہ بتا دیا کہ یہ بھی غلط ہے' وہ خود اپنے آپ پہ حکومت کریں تو پھر بھی کوئی انسان' انسان پہ حکومت کرتا ہے۔ قرآن کریم نے جب کہا تھا کہ اپنے ھوآء (38:26) کو' اپنے جذبات کو' بھی تم

---

❶ یہ اشارہ رابرٹ بر فواوراس کی کتاب ''تشکیل انسانیت'' (The Making of Humanity) کی طرف ہے۔

❷ مرزا اسداللہ خاں غالب (1869-1797ء)

اپنا معبود نہ بنالینا' اس نے اس جمہوریت کی تردید کی تھی لیکن وہ کہتے ہیں کہ انسان یہاں تک تو پہنچ گیا۔ اس میں اس کو کتنا لمبا عرصہ لگا اور آگے اس کو اس جمہوریت سے نکال کر قرآن کریم کے اس انسانیت ساز نظامِ حکومت کے اوپر لانے کے لیے کتنا عرصہ لگے گا' اگر ان کو کوئی بتانے والا ہوتا' کہیں یوں سمجھاتا' یہ نظام قائم ہوتا ہے' وہ اس کو دیکھ لیتے' اب یہ چیز تو نہیں ہوئی لیکن قرآن کریم کا دعویٰ اپنی جگہ موجود ہے کہ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ (42:24)۔ یہ بکلمٰتہ بڑی عظیم چیز ہے' عزیزانِ من! اس کے فوراً بعد قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (42:24) اور یہ چیز میکانکی طور پر نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے دلوں کی دنیا میں ایک تغیر آنے کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنی نفسیات میں تبدیلی نہیں کرتی اس کی باہر کی حالت میں بھی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ [1]

شب برات کی کہانی تواتر کی زبانی

عام طور پر تو میں کسی سوال کا جواب نہیں دیتا لیکن اس دفعہ خاص طور پہ یہ کہا گیا ہے۔ ہوا یہ ہے کہ اتفاق سے یہ شبِ برات آ گئی ہے۔ شاید کل پرسوں ہی تھی۔ مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ یہ جو تقریب ہے' یہ کس یاد میں منائی جاتی ہے؟ اس کے متعلق کیا بات ہے؟ میرے ذہن میں تھا کہ میں براہِ راست جواب دیدوں۔ اتفاق سے یہ جو منانے والے ہیں' یہ ہفت روزہ لاہور کا الاعتصام ہے' اس کا یہ 19 جون 1981ء کا پرچہ ہے' یہ میرے سامنے ہے۔ اس میں شعبان کے متعلق لکھا ہوا ہے۔ شعبان کی پندرہویں رات کی فضیلت میں متعدد احادیث وارد ہیں لیکن سنداً یہ سب روایات ضعیف ہیں۔ میں اسے منانے والوں کا بیان پڑھ رہا ہوں۔ میں کہتا تو کہتے کہ منکرِ حدیث ہے لیکن یہ سب روایات ضعیف ہیں۔ اب اسے منانا بھی ہے' وہ نہیں مناتے تو نکو ہوجاتے ہیں' Isolate (تنہا) ہوجاتے ہیں۔ چلیے' اس کو بھی نہیں مانتے' اب چونکہ متعدد اور بکثرت تواتر سے یہ روایات مروی ہیں یعنی ہیں تو ضعیف' صحیح نہیں ہیں چونکہ یہ مختلف لوگوں کی طرف سے آئی ہیں' اس لیے محدثین کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ اس رات کی کوئی اصل ضرور ہے یعنی پتہ تے ہے نئیں۔ [1] پولیس والے چوری کے مقدمے کی تفتیش کر رہے تھے۔ کوئی کہے کہ یہ اِس کا کام ہے' وہ اُس کا کام ہے۔ ایک بیٹھا ہوا تھا' سنتا رہا' کہنے لگا کہ تم میں سے کوئی نہیں بتا سکا۔ پولیس والے کہنے لگے: بابا! تو ہی بتا۔ کہنے لگا: میں بتا سکتا ہوں۔ کہنے لگے: بتاؤ' پھر کیا ہے۔ کہنے لگا: یہ کام کسی چور کا ہے۔ اس کی کوئی اصل ضرور ہے۔ اندازہ لگا لیجیے۔ عزیزانِ من! میں اپنی طرف سے نہیں کہتا' اس لیے اس رات میں نفلی عبادت وغیرہ کا اہتمام کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے' روایات ضعیف ہیں۔ اصل کیا ہے؟ اس کا کچھ پتہ نہیں لیکن اصل ہے ضرور۔ وہ جو اصل ہے' اب

---

[1] ان اللہ لایغیر مابقوم حتیٰ یغیروا مابأ نفسِھم (13:11)۔

اس کو کیسے بتائیں کہ اصل یہ ہے۔

عباسیوں کے دور (AD 1258-750ء) میں حکومت تو ان عباسیوں کی تھی لیکن ان کے اوپر سارا غلبہ ان ایرانیوں کا تھا۔ یہ ایرانی مجوسی تھے' آتش پرست تھے۔ ان کا ایک بہت بڑا بلند پروہتوں کا برامکہ خاندان تھا۔ وہ مسلمان ہو گئے۔ وہ آئے' ان عباسیوں کے وزرا بھی وہی تھے' غلبہ ہی ان برامکہ کا تھا۔ یہ بیشتر اسلام جو آج آپ کے ہاں کا' یہ مذہب آیا ہوا ہے' یہ اس دور کا ہے۔ اس میں زیادہ تر حصہ انہی کا لایا ہوا ہے۔ یہ آتش پرست تھے' مجوسی تھے۔ مجوسی تقدیر کے قائل ہوتے ہیں۔ تقدیر کا سارا جتنا بھی تصور ہے' عقیدہ ہے' آپ کے ہاں چھٹا جزوِ ایمان ہے' یہ ان کی وجہ سے بنا ہوا ہے اور ان کے ہاں عقیدہ یہ تھا کہ ایک رات ایسی آتی ہے جس میں سال بھر کے انسانوں کی قسمت لکھی جاتی ہے اور وہ یہ شعبان کی پندرھویں رات ہوتی ہے' اس رات تقدیر لکھی جاتی ہے۔ وہ آتش پرست تھے اس لیے آگ تو آپ جانتے ہیں ان کے ہاں عبادت تھی۔ وہ اس رات کو زیادہ آتش بازی جلایا کرتے تھے۔ یہ جو بڑے بڑے متقی پرہیز گار اولیا تھے' یہ شہروں سے باہر جنگل میں جا کر نفل پڑھا کرتے تھے' عبادت کیا کرتے تھے۔ یہ اس طرح سے ہے جو وہ کہتے ہیں کہ اس کی اصل ضرور ہے۔ اس کی اصل یہ ہے اور وہاں سے جو بات بڑھی' وہ ٹھیک ہے ساتھ کچھ حلوہ چلا' بچوں کے لیے یہ آتش بازی آئی' اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے نوافل یا عبادت کی یہ چیز جمع ہوئی۔

اب آج اس کی کیفیت یہ ہے کہ صاحب! سلفِ صالحین سے' تواتر سے' یہ ایک چیز چلی آ رہی ہے' آپ کیسے انکار کر سکتے ہیں' اس پر اجماعِ امت ہے۔ عام طور پہ اجماع یا سوادِ اعظم' ان کے لیے ایک لفظ ہے۔ سُنّی تعداد کے لحاظ سے قریباً ہمیشہ ہی اکثریت میں رہے تو اِس کے لیے تو وہ حدیث بنا لینا آسان تھا' سوادِ اعظم اس کا نام رکھا گیا یعنی Majority Party (اکثریتی پارٹی)' اور وہ یہ ہو گیا کہ میری امت کا سوادِ اعظم کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا۔ شیعہ حضرات کے ہاں البتہ اس کی ایک خصوصیت ہے۔ وہ ان کی اپنی ہے۔ یہ حضرتِ امام مہدی کا تصور ہے کہ اب وہ زندہ غار میں ہیں' یہ ان کی ولادت کی رات ہے اور وہ اپنے عقیدے کے مطابق اس امامِ غائب کے حضور اپنی درخواستیں بھیجتے ہیں' وہ کاغذوں پہ درخواستیں لکھتے ہیں اور کاغذوں کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں بناتے ہیں تو وہ دریا میں' بہتے پانی میں' ندی میں' بہاتے ہیں۔ یہ ان کا اپنا عقیدہ ہے' ہمیں اس پہ کوئی حق حاصل نہیں کہ کسی قسم کی تنقید کریں۔ ان کے ہاں اس کی جو اہمیت ہے' وہ تو الگ ہے لیکن یہ جسے آپ امت کا سوادِ اعظم کہہ رہے ہیں' جو اس کی سند بن رہا ہے' وہ کیا ہے؟

وہ کہتے ہیں کہ اصل ضروری ہے۔ وہ اس کی اصل یہ ہے کہ برامکہ' جو میں نے کہا ہے کہ وہ نیا مسلمان ہوا تھا' اس نے چھینک ماری' تو

---

❶ معلوم تو ہے نہیں۔

کہا: جے نندی کی۔ اس نے کہا کہ مسلمان ہو کر جے نندی کی کہہ رہے ہو؟ کہن لگا: اوئے رام جاندا ای جائے گا' رحیم اوندا ای اوند رہے گا۔ بڑا اوقت لگدا اے رام دے جان واسطے۔ [1] جب رام کا آپ تلفظ ہی رحیم بنالیں تو وہ جائے گا ہی کیوں؟ پھر اس کے بعد تو مجوسیوں کی وہ رات تھی جو تقدیر کا عقیدہ ساتھ لیے ہوئے آپ کے ہاں آئی ہوئی ہے۔ یہ ہے جو کہتے ہیں کہ اصل اس کی یہ ہے لیکن اِس دفعہ دلچسپ بات ہوئی۔ ایک صاحب ریڈیو پہ' مولانا صاحب! تقریر فرما رہے تھے۔ کہنے لگے کہ اس کا تو ثبوت قرآنِ کریم میں ہے۔ یہ سورۃ الدخان' 44 ویں سورۃ ہے۔ کہا کہ **حٰمٓ o وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ o اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ o فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ** (44:1-2-3-4)۔ یہ وہ رات ہے جس میں قرآن حکیم نے کہا ہے کہ قرآن شریف نازل ہوا تھا اور اس میں ہر معاملے میں تفریق کی جاتی ہے۔ یہ تقریر ہوگئی' کہہ گئے کہ یہ وہ رات ہے جس میں قرآن حکیم نازل ہوا تھا۔ ان سے کہا: صاحب! قرآن حکیم نے تو کہا ہے کہ **شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ** (2:185) یہ تو رمضان کے مہینے کی رات ہے جس میں یہ نازل ہوا تو یہ پندرہ دن پہلے ہی آ پہنچی۔ انہوں نے کہا کہ نہیں' قرآن شریف اس رات کو عرشِ معلیٰ سے' پہلے آسمان پہ نازل ہوا اور آسمانِ اول سے رمضان کی رات کو زمین پر آیا' سننے والوں نے درود پڑھا۔

عزیزانِ من! آج زیرِ درس تو وہی 24 ویں آیت ہے جس کے بارے میں میں نے عرض کیا ہے۔ اب آئندہ اگلے درس میں ہم اگلی آیت سے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

---

[1] ارے بابا! نہ رام جلدی نکلے' نہ رحیم جلدی اس کی جگہ لے۔ اس رام کے جانے کے لیے بڑا اوقت لگتا ہے۔

پانچواں باب: سورة الشوریٰ (آیات 25 تا 38)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1981ء کی 26 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الشوریٰ کی آیت 25 سے ہو رہا ہے:(42:25)۔

سابقہ درس کی صدائے بازگشت

سابقہ آیت میں ایک ہی نکتہ زیرِ غور آیا تھا اور وہ یہ تھا کہ یہاں کائنات میں، حق اور باطل کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اگر حق کے تعمیری نتائج

پیدا کرنے والے وہ فارمولے قوانین قواعد نظری طور پر ہوں تو جب وہ عمل میں آتے ہیں تو وہ نظام بنتا ہے اور اس کے مقابل میں تخریبی نتائج پیدا کرنے والی یہی چیزیں اگر نظری طور پر بھی ہوں تو ان کا ٹکراؤ ہوتا ہے نظام کے اعتبار سے بھی ان کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ سابقہ درس کی آیت میں بتایا یہ گیا تھا کہ اگر کوئی جماعت اٹھ کھڑی ہو جو حق پر مبنی نظام کو قائم کرنے کے لیے اس کے دست و بازو بنے تو اس کی رفتار بڑی تیز ہو جاتی ہے انسانی حساب وشمار کے مطابق اس کے نتائج سامنے آتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہ کائناتی تقاضوں یا کائناتی (Cosmic Forces) قوتوں کے بل پر یہ آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ انہوں نے آگے تو بڑھنا ہے غالب تو انہوں نے آنا ہے لیکن ان کی رفتار بڑی سست ہو جاتی ہے ایک ایک دن خدا کا ہزار ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اب جب یہ کوئی جماعت اٹھتی ہے تو ٹھیک ہے اِس میں سرعت آ جاتی ہے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم انسان کی کمزوریوں کی ہمیشہ رعایت دیتا ہے۔ وہ کہتا صرف یہ ہے کہ اپنی طرف سے پوری سعی وعمل سے کام لینا پوری پوری کوشش کرنا لیکن اس میں بعض اوقات کچھ تدبیری غلطیاں ہو جاتی ہیں چھوٹی موٹی لغزشیں بھی ہو جاتی ہیں جنہیں قرآن نے **اللَّمَمَ** [1] (53:32) کہہ کر پکارا ہے۔ یہ یونہی قابلِ ملامت سی چیزیں ہیں۔ چونکہ قرآن کریم کا جو اصول مکافاتِ عمل کا ہے وہ وزن کا ہے کہ **مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ** (101:6) اور **مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ** (101:8) تو وہ ہر عمل کا ایک وزن ہوتا ہے۔ اگر تعمیری نتائج پر مبنی اعمال کا وزن زیادہ ہے اور پلڑا جھکتا ہے تو دوسری طرف اس قسم کی جو چھوٹی موٹی لغزشیں ہیں وہ راستے میں حائل نہیں ہو جاتیں۔ اس کے لیے یہ ایک لفظ **اللَّمَمَ** ہے۔ اس آیت میں وہی چیز آئی ہے۔

مکافاتِ عمل کا قرآنی اصول

عزیزانِ من! یہ آیت ہے کہ **وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ وَیَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ** (42:25) یہ جو کشمکش ہوتی ہے اس میں یہ جماعت آگے بڑھتی ہے تو اس میں کوئی سہو ہو جاتا ہے تدبیری غلطیاں ہو جاتی ہیں چھوٹی موٹی لغزشیں بھی ہو جاتی ہیں۔ پہلی صورت تو اس میں یہ ہے کہ جب بھی قرآن حمید کہتا ہے کہ یہ جو اس قسم کی لغزشیں ہیں جن کے لیے کہا جاتا ہے کہ ان سے معافی مل جاتی ہے یاد رکھیے کہ ایسا نہیں ہے اصول مکافاتِ عمل کی رو سے معافی کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس لیے ہے کہ اصولِ مکافاتِ عمل تخریبی نتائج مرتب کر کے سامنے نہیں آنے دیتا کیونکہ وہ جو تعمیری نتائج والے اعمال ہوتے ہیں ان کا وزن بہت زیادہ ہوتا ہے۔ قرآن حمید نے کہا ہے کہ اس کا اصول ہے کہ **اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ** (11:114) اگر کبھی سیات یعنی ناہمواریاں پیدا ہو جائیں تو اس کے دُور کرنے کا طریق یہ ہے کہ تعمیری نتائج پیدا کرنے والے اعمال اور زیادہ تیزی سے کیے جائیں اور

---

[1] اس آیت کا یہ حصہ یوں ہے: اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (53:33)۔

وزنی کیے جائیں۔ ان کا جو وزن ہے وہ اس کمی کو پورا کر دیتا ہے جو تخریبی اعمال کے نتائج کے سلسلے میں بعض اوقات لغزشوں کی صورت میں غلطیوں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

نظامِ عدل میں عفو کا مفہوم

یہ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم محض نظری یا اصولی طور پہ یہ بات نہیں کہتا کہ یہ وہ جماعت ہوگی جس سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہوگی کسی قسم کی قابلِ ملامت چیز سرزد نہیں ہوگی۔ یہ بھی انسانوں کی جماعت ہے یہ ہوتا ہے لیکن اصول یہ بتایا۔ پہلی چیز یہ ہے کہ یَقۡبَلُ التَّوۡبَةَ (42:25) یعنی اس کا احساس ہو جائے کہ ہم نے یہاں غلطی کی تھی مجھ سے یہاں لغزش ہوئی تھی یہ احساس ہو جائے احساس پہ ایک ندامت ہو پھر اس کے بعد یہ ہو کہ مجھے اس کی اصلاح کرنا ہے اصلاح کرنے کے لیے پھر پلٹ کر اس مقام پہ جائے جہاں سے غلطی ہوئی تھی۔ یہاں نہ بخشش کا لفظ صحیح ہو سکتا ہے نہ معافی کا صحیح ہو سکتا ہے۔ یہ ''عفو'' کا لفظ ہی ہے جو قرآن حکیم میں ہے۔ ہم نے اس کا ترجمہ ''معافی'' کیا ہے اور معافی کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں۔ وہ تو یہ ہوتا ہے کہ دوسرا رحم دلی سے کسی کی حالت پر ترس کھا کر جسے معافیاں مانگنا کہتے ہیں ہمارے ہاں وہ معافیاں مانگے تو پھر اس پہ از راہِ ترحم اس سے کہو کہ اچھا چلو جاؤ ہم نے تمہیں چھوڑ دیا۔ یہ بات نہیں ہے نظامِ عدل ہے نظامِ قانون ہے اس کے اندر اس طرح سے بخشش اور اس قسم کی معافی کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ بھی ایک عملی چیز ہے کہ اپنے غلط قدم کے اٹھنے کا احساس ہو اس کے بعد اصلاح کا ارادہ ہو پھر واپس لوٹے جہاں سے غلط قدم اٹھا تھا پھر صحیح راستے پر گامزن ہو تو یہ جو اس کا عمل ہے یہ ہے جو اُن نقصانات کی تلافی کر دیتا ہے جن کا اس کی لغزش کی وجہ سے سامنے آنے کا امکان تھا۔ یہ ہے وہ طریق۔

''یعفوا'' کے قرآنی مفہوم میں ''رحمت''

یہ جو قرآن مجید کا لفظ ''یَعۡفُوۡا'' (42:25) ہے جس سے ہم نے معافی لیا ہے اس کے معنی ہوتا ہے کہ ''آگے بڑھ جانا درگزر کر دینا یعنی کسی چیز کا راستے میں رکاوٹ نہ بن جانا۔'' اس کی جو شکل تھی وہ قرآن نے بتا دی کہ یہ ایک عملی چیز ہے یہ بیٹھ کر کرنے کی چیز ہے یہ اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰهَ رَبِّیۡ مِنۡ كُلِّ ذَنۡبٍ والی تسبیح پھیرنے کا سوال نہیں ہے یہ تو جسے آپ کہیں گے کہ undo (جو کیا تھا اسے ختم) کرنے کا پروگرام ہے جو پہلے غلطی ہوگئی ہے اس کو undo (ختم) کیا جائے گا خود کیا جائے گا اس سے پھر آگے بڑھا جائے گا۔ یہاں کہا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ جب کسی سے کوئی لغزش ہو تو اب یہاں سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ نہایت نیک نیتی سے وہ اس راستے پہ گامزن ہو جبھی یہ صورت ہوگی کہ جہاں احساس ہوگا کہ غلط قدم اٹھ گیا میں تو غلط راستے پہ آ رہا ہوں یہ راستہ تو اس گاؤں کو نہیں جاتا جہاں میں نے جانا ہے

اس احساس کے بعد یہ صورت پیدا ہوگی کہ اوہو! مجھے تو پھر پلٹنا چاہیے' جہاں سے میں غلط سمت کی طرف آیا تھا' وہاں آنے کے بعد پھر وہ پوچھے گا کہ صحیح راستہ کون سا ہے' پھر وہ صحیح راستے پہ چلے گا تو اپنی صحیح منزل کے اوپر جائے گا۔ یہ سارا کچھ اسے خود کرنا ہوگا' وہ جسے خدا کی طرف سے رحمت یا رعایت کہا جاتا ہے' وہ اتنا ہی ہے۔

یہودیوں کی ایک غلط سوچ نے انہیں کہاں پہنچا دیا

یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ روبہ عمل ہے کہ ایک قدم غلط اٹھنے سے اس کی تلافی کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تو وہ ہے جسے آپ Condemn Forever (ہمیشہ کے لیے مردود) کہتے ہیں' ہمیشہ کے لیے راندہ درگاہ' کہتے ہیں۔ اس کے لیے ان کو پھر یہ عقیدہ بنانا پڑا کہ بنی اسرائیل کی نسل سے جو ہوگا وہ جنت میں ضرور چلا جائے گا۔ وہ دیکھا کہ یہ جو اپنی غلطی کے نتائج کو undo (ختم) کرنے کا پریکٹکل یعنی عملی پروگرام تھا یہ انہوں نے اپنے ہاں فراموش کیا' تو پھر کیا کیا جائے؟ تو پھر وہاں Extreme (انتہا) پہ جانا پڑا کہ نہیں صاحب! غلطی کی تلافی تو ہو نہیں سکتی۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی نسل سے ہو' فرشتے تو ہمیں جلدی جلدی سے جہنم میں ڈال دیں گے لیکن اتنے میں ہمارے بزرگ آ جائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ دو تین دن میں ہی وہ آ جائیں گے اور ہمیں نکال کر لے جائیں گے۔ اس کے سوا ذہن میں کچھ بات نہیں آ سکتی تھی کہ اس کی پھر کیا شکل پیدا ہو۔

عیسائیت کے کفارے کے تصور کے بعد ہندوؤں کے ہاں آواگون کا معاملہ: مجبوری و مقہوری

عیسائیت دوسری Extreme (انتہا) پہ چلی گئی۔ اس نے کہا کہ عمل کے نتیجے کا سوال ہی نہیں ہے۔ سینٹ پال [1] کے الفاظ میں یہ ہیں کہ اعمال کے ذریعے سے جنت نہیں مل سکتی' یہ تو خدا کے رحم کے اوپر ہے' Mercy (ترس کھانے) کے اوپر ہے۔ وہ سارا کچھ رحم پہ آ گیا' عمل ختم ہوگیا۔ گویا انسانوں سے غلط اعمال تو ہوتے رہیں گے' ان کی تلافی کے لیے صحیح قدم اٹھانے کا تصور ان کے ہاں بھی نہیں رہا۔ وہاں یہ صورت ہوگئی کہ حضرت مسیحؑ کے کفارے پر ایمان لایا جائے تو اسے جنت مل جاتی ہے۔ اب یہ ہوا کہ اُدھر بنی اسرائیل میں یہودیوں کی نسل میں پیدا ہونے سے مل جاتی ہے' یہاں عیسائیت میں حضرتِ مسیح علیہ السلام کے کفارے پر ایمان لانے سے مل جاتی ہے' عمل کا سوال دونوں میں نہ رہا۔ یہ تصور چلا آ رہا تھا۔ اُدھر ہندوؤں کا آواگون یا تناسخ بھی اسی مجبوری کا نام ہے کہ پچھلے جنم کے جو غلط کارن تھے' قدم' اعمال تھے' ان کی وجہ سے وہ کسی جون میں پیدا ہوگیا: گدھے کی جون میں' بندر کی جون میں' چوہے کی جون میں' یہ ہے تصور ان کے ہاں کا۔ اور اب اس زندگی کے اندر اس جون سے نکل ہی نہیں سکتا' اسے یہ بھی علم نہیں ہے کہ میرے وہ کون سے جرائم تھے جن کی پاداش میں اس نے مجھے یہاں چوہا

---

[1] Saint Paul (c.AD 5-67)

بنادیا یا گدھا بنادیا۔ اس کا بھی اسے علم نہیں ہے، نہ وہ اس زندگی میں اپنی اس حالت کو بدل سکتا ہے۔ یہ اس مجبوری کی انتہائی شکل ہے۔

قندیلِ آسمانی کے نزدیک قانونِ مکافاتِ عمل میں رحمت کی گنجائش

اب دیکھیے کہ قرآن مجید آیا، اس نے جب قانونِ مکافاتِ عمل دیا تو یہ کس قدر ایک Practicable (قابلِ عمل) پروگرام ہے جو اس نے دیا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ انسانوں کو بہرحال انسان تصور کرتا ہے، معصوم تصور نہیں کرتا، ان سے لغزش بھی ہوسکتی ہے، تدبیری غلطی بھی ہوسکتی ہے، غلط قدم بھی اٹھ سکتا ہے لیکن اس کی تلافی کے لیے یہ صورت نہیں کہ یا ان کے بزرگ آئیں گے اور وہ جہنم سے نکالیں گے یا حضرتِ مسیحؑ کے کفارے پر ایمان لانا ہوگا۔ وہاں تو یہ ہوگا کہ ''غلط قدم تم سے اٹھا ہے، صحیح قدم بھی تم خود اٹھاؤ۔'' اس قانون کے اندر یہ جو Provision (گنجائش) ہے کہ صحیح قدم اٹھانے سے غلط قدم کے نقصانات کی تلافی ہوسکتی ہے، یہ ہے اصل چیز جسے رحمت کہا جائے گا۔ قانون کے اندر اس کی گنجائش ہے، یہ یوں بخش دینا نہیں ہے بلکہ ایسا قانون ہے کہ اس میں یہ گنجائش ہے کہ اس کی تلافی ہوسکتی ہے۔

ایسی جنت جو بخششیں میں ملے، مومن کی نظروں میں کہاں جچتی ہے

جنت رحم کے اوپر نہیں ہے، Mercy (ترس کھانے) پہ نہیں ہے، کسی سے مانگنا نہیں ہے، بھیک نہیں مانگی ہے، یہ تذلیلِ انسانیت ہے، معافیاں مانگ مانگ کر، گڑگڑا کر، اپنے جرائم کے نقصانات کی تلافی کرنا، نتائج سے بچنا، تذلیلِ انسانیت ہے۔ اس میں آپ دیکھیے کہ جب یہاں قانون میں یہ Provision (گنجائش) ہے کہ غلط قدم اٹھ گیا ہے، اس کے بعد احساس ہوگیا ہے کہ غلط ہے تو پھر صحیح قدم کے لیے واپس لوٹو، اصلاح کرو، خود آگے چلو۔ اس میں نہ کسی سے کچھ مانگنا ہے، نہ انسانیت کی کوئی تذلیل ہے، نہ بھیک مانگ رہا ہے، نہ رحم کی درخواست کر رہا ہے لیکن قانون کے اندر یہ گنجائش رکھ دینا بڑی چیز تھی۔ آپ دیکھیں گے کہ اتفاق سے یہی جو طلوعِ اسلام [1] ایک دو دن میں پہلی تاریخ کو آ رہا ہے، جو ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ہی آ جاتا ہے، اس میں میرا ایک مضمون آ رہا ہے، یہی ایک عنوان میرے سامنے [2] تھا۔ قرآنِ کریم نے ہر جرم میں اس قسم کی ''معافی'' کی گنجائش رکھی ہے۔ میں یہ ''معافی'' کا لفظ کہہ رہا ہوں، یہ قرآن کریم کی ٹرم میں ہے یعنی ہر جرم کی سزا ہے اور اس سزا سے بچنے کے لیے رحم کی درخواست نہیں کی جاتی۔ میں پھر عرض کردوں کہ کسی انسان کا کسی دوسرے انسان سے اپنے لیے بھیک مانگنا شرفِ انسانیت کی تذلیل ہے۔

---

[1] ماہنامہ طلوعِ اسلام، جولائی 1981 (7:34)۔

[2] اس عنوان ہے: تقدیر کی گرہیں: خدا اور انسان کا تعلق، طلوعِ اسلام (7:34)، جولائی 1981ء ص ص 36 تا 60۔ اسی میں دوسرا مضمون ہے: مشینی انسان اور قرآنی نظام، طلوعِ اسلام (7:34)، جولائی 1981ء ص ص۔ 1 تا 35۔

قرآن حکیم نے یہاں توبہ کا قانون دیا ہے اور اسی سے جرم کا ازالہ ممکن ہے

قرآن حکیم نے یہ نہیں کہا کہ تم کسی انسان سے بھیک مانگو حتیٰ کہ یہ بھی نہیں ہے کہ خدا سے بھی تم بھیک مانگو اور کہو کہ رحم کر۔ خدا نے اس میں یہ Provision (گنجائش) کر دی ہے کہ یہ جرم ہو گیا ہے تو اس کی سزا یہ ہے لیکن اس سزا سے ''معافی'' کی گنجائش اس کے اندر ''توبہ'' ہی ہے اور ''توبہ'' خود کرنے کی چیز ہے دوسرے کی دینے کی چیز نہیں ہے۔ اب اس کے لیے ہمارے ہاں سوائے ''معافی'' کے کوئی دوسرا لفظ ہی نہیں ہے۔ کہہ دیا ہے کہ جاؤ، تمہیں بخش دیا ہے۔ یہ بخشنے سے نہیں مل سکتی۔ اتنی سی بات ہے کہ جاؤ! اب یہ کرو، جو تم سے غلطی ہو گئی ہے، چلو، جاؤ مٹاؤ اس کو سلیٹ سے اور اس کے بعد یہ صحیح لکھو جو میں کہہ رہا ہوں۔ بچے کے ساتھ یہی کرتے ہو، یہ نہیں کرتے کہ اچھا غلط لکھتے جاتے ہو، کوئی بات نہیں، آج چھوڑ دیا، کل آؤ۔ کل پھر وہ غلط لکھے گا پھر کہیں گے کہ چھوڑ دیا، وہ تو ساری عمر کبھی صحیح نہیں لکھ سکے گا۔ یہ سلیٹ پہ گنجائش ہوا کرتی تھی۔ یہ جو اب کا پیاں ہیں، ان میں تو اصل مٹا دینے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

میں نے پھر عرض کیا ہے کہ یہ زبان کا نقص ہے کہ ہمارے ہاں اس کے لیے ''معافی'' کا ہی لفظ ہے اور ''معافی'' میں کسی انسان کا دوسرے انسان سے درگزر کر جانے کا وہ تصور آ جاتا ہے۔ یہ ہے خود اپنے کیے کو undo (ختم) کر دینا۔ یہ ایک لفظ undo (ختم) کر دینا ہے۔ کہا کہ وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ وَیَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ (42:25) کیا بات ہے! تم انسان ہو، ہم تمہاری کمزوریوں کو بھی جانتے ہیں، ہمیں یہ معلوم ہے کہ کیسے ہو گیا تھا، یہ جو کچھ تم نے کیا ہے۔ اگر وہ دانستہ، بالا ارادہ، اس طرح سرکشی سے کیا تھا تو وہ اور بات ہے، اگر وہ غلطی ہو گئی تھی تو اور بات ہے۔ ہم جانتے ہیں، توبہ ہوتی ہے۔ تمہاری غلط روش سے جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، خدا کا قانونِ مکافات تم سے ان کے مضر اثرات کو مٹا دے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تم نے اس وقت تک کیا کیا ہے اور اس کے نتائج و عواقب کیا ہیں۔ اس کا قانون یہ ہے کہ وَیَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَیَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ (42:26) غلط راستوں پر چلنے والے لوگ جب بھی اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان لے آئیں اور اس کے بعد اسی کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں تو ان کی کوششوں کو ثمر بار کرتا ہے اور اپنے فضل و کرم سے انہیں بڑی فراوانیاں عطا کرتا ہے۔ اس اگلی ہی آیت میں بات صاف کر دی کہ یہ ''توبہ'' ہے کیا بات؟ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کہا ہے۔ قرآنِ کریم نے جب جرائم کے متعلق بات ''توبہ'' کی کہی ہے، تو اس میں یہ بڑا عجیب باریک سا نکتہ ہے۔ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کہا ہے حالانکہ وہ جرم کرنے والا بہر حال ایمان تو رکھتا ہے، مسلمان تو ہے۔ اب ہمارے ہاں یہ زبان دیکھیے کہ ہم مومن کا لفظ کہتے ہیں تو اس کا مفہوم کچھ اور ہی ہوتا ہے اور مسلمان کی بات جو ہم کہتے ہیں تو وہ جو مسلمان ہیں، وہ ہمارے سامنے ہیں، جس قسم کے بھی ہیں لیکن کیا کیا جائے، زبان کی

مجبوریاں ہیں۔ بہرحال جرم سرزد ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو قرآن کریم اس کے لیے کہتا ہے، جسے میں پھر لفظِ معافی کہتا ہوں وہ نہیں ہے۔ اس کے لیے ''توبہ'' ہے، یہ باز آفرینی ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ اپنے مفہوم القرآن کے اندر یہی کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو مفہوم ہے، اس کے لیے جو گنجائش رکھی ہے، وہ اس سے زیادہ واضح ہوگا۔ وہ جرم کرنے والا مسلمان ہی تو ہے۔

خدا کے قانون پر یقین نہ کرنا ہی جرم کی بنیاد بنتا ہے

اس کے بعد یہ کہا ہے کہ اگر وہ ایمان لے آئے اور عملِ صالح کرے تو پھر اس کی تلافی ہوسکتی ہے۔ اب یہ اس لیے ہے کہ وہ ایمان لائے، یہ اس باز آفرینی کے لیے ہے۔ یہ اصطلاحی ایمان نہیں ہے۔ وہ جو مُلاّ کلمہ پڑھا کر ہندو کو مسلمان کرتا ہے اس کے اندر بڑی باریک چیز ہے کہ انسان اگر خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے تو گویا اس کا اس وقت اس حکم کی صداقت پر یقین نہیں ہوتا۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے، جرم سرزد ہو گیا، پھر اس کا احساس ہوا ''اوہو! یہ تو خدا کے حکم کی سرتابی ہوگئی'' یہ احساس ہو گیا تو اس نے اس حکم کی صداقت کا یقین کرلیا، اس کو پہلی شرط قرار دیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جرم سرزد ہوتا ہے تو اس وقت خدا کے حکم کی صداقت پر ایمان نہیں ہوتا، اس کے اوپر انسان کا یقین نہیں ہوتا اور اسی لیے وہ یہ کہتا ہے کہ اگر یہ یقین کی چیز تمہارے ساتھ ساتھ چلے تو پھر جرم سرزد ہی نہیں ہوسکتا، اس لیے اس کے بعد ''امنوا'' کی وہ شرط اس نے لگائی ہے۔

غلط عمل کے سرزد ہونے کے بعد اس کے علاج کا طریقِ کار

یہ تو ہوا کہ اس قانون کی صداقت پر پہلے جو یقین اٹھ گیا تھا کہ نہیں صاحب! یہ بخار ایسا ہے، اس کا علاج ہی نہیں ہوسکتا، اب اس کے بعد آپ کو پہلے اس ذہنیت کو بدلنا ہوگا کہ نہیں صاحب! اس کا علاج ہوسکتا ہے۔ یہ ہے جس کو آپ ایمان کہتے ہیں۔ یہ علاج ہوسکتا ہے، آپ کہیں گے تو پھر علاج کی طرف چلیں گے، اور اگر یہ ہو کہ نہیں صاحب! یہ علاج ہو ہی نہیں سکتا تو پھر قیامت تک آپ ''توبہ'' نہیں کرسکتے۔ ''علاج ہوسکتا ہے'' یہ ہے شرط جو ''امنوا'' کی لگی ہے لیکن اتنی چیز سے کہ علاج ہوسکتا ہے یہ پہلا قدم تو ضرور ہے لیکن اس سے علاج تو نہیں ہوسکتا۔ اب اس کے لیے اگلا قدم ہے کہ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (42:26) پھر اس کے لیے ٹھیک ہے، طبیب کی طرف جایئے، ڈاکٹر کی طرف جایئے، تشخیص کرایئے، نسخہ لکھوایئے، Advise لیجیے: وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (42:26) اس کا یہ طریقہ بتایا ہے کہ تلافی ہوجائے گی، یہ بخار اتر جائے گا بشرطیکہ یہ شرطیں پوری کرو۔ وہ اتنا ہی نہیں کہ صرف تلافی ہی ہوجائے گی بلکہ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ (42:26) اس سے زیادہ بھی مل جائے گی۔ ایک تو اتنی سی چیز ہے کہ ٹمپریچر نارمل ہوجائے گا۔ اس کے بعد یہ ہے کہ یہ جو بخار کی وجہ سے کمزوری پیدا ہوگئی تھی، اس کی بھی تلافی ہوجائے گی۔ جس کو آپ تلافی کہتے ہیں وہ یہی نہیں ہے بلکہ وہ يَزِيْدُهُمْ (42:26)

ہے وہ صرف تلافی نہیں ہے جو اس سے کمی واقع ہوگئی ہے' وہ کمی بھی ساتھ پوری ہو رہی ہے۔ وَيَزِيدُهُم مِّن فَضْلِهِ (42:26) اور اپنے فضل وکرم سے اسے بڑی فراوانیاں عطا کرتا ہے لیکن وَالْكَافِرُونَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ (42:26) اس کے برعکس جو اس پہ یقین نہ کرے کہ ہاں واقعی اس سے یہ کچھ ہو جائے گا تو وہ تو کبھی بھی اس سے نکل نہیں سکتا' اس کے لیے تو یہ تباہیاں لاگو ہو جائیں گی' اس کو کوئی نہیں نکال سکتا۔ کہا کہ یہ تو ہم نے ان جرائم کے متعلق قانونِ مکافاتِ عمل بتایا' جس طرح انسان کی' کائناتی قانون میں بھی وسعت کی' قوت کی' ایک حد ہے' وہ اس سے آگے نہیں جا سکتا یہ یونہی ہے جو مثال سمجھایا کرتے ہیں کہ آدمی ایک ٹانگ تو اٹھا سکتا ہے دونوں ٹانگیں نہیں اٹھا سکتا۔ یہ عام فہم بات ہے' سمجھانے کے لیے یہ کہا ہے۔

انسانی اختیارات کو محدود رکھنے میں بھی ایک مصلحت ہے

اس کی ایک حد ہے' طبعی قانون کے سلسلے میں لیجیے' ایک گلاس پانی یا زیادہ سے زیادہ دو گلاس پانی پی کر پیاس بجھتی ہے' پانی کا پورا مٹکا تو انسان کو مار دیتا ہے' طبعی قوانین کے سلسلے میں بھی یہ ایک حد ہے' یہی دوائیاں جو آپ کے علاج کے لیے ہوتی ہیں ان کو ذرا حد سے آگے بڑھا کر لیا جائے یعنی زیادہ تعداد' زیادہ مقدار میں آپ کھا ئیے تو وہی ہلاکت پیدا کر دیتی ہیں۔ اس کے لیے ایک حد ہے۔ کہا کہ یہ جو اس قسم کی حد ہے کہ انسان کے اختیارات کو محدود رکھا ہوا ہے' اس میں بڑی مصلحت ہے۔ کہا ہے کہ وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ (42:27) مثلاً ہمارا قانون یہ ہے کہ زمین ہے' قانونِ زراعت ہے' زمین میں ہل چلاؤ' کھیتی کے قابل بناؤ' اچھا بیج ڈالو' پانی دو' روشنی ہو' حرارت ہو' حفاظت ہو' یہ سارا کچھ ہو' تو زمین سے فصل اُگتی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ وہ فصل ایک خاص پیمانے کے مطابق اُگتی ہے۔ پہلے کچھ دس من فی ایکڑ تھا' پندرہ ہوا' بیس ہوا' پچیس ہوا۔ کہا کہ سارے کا سارا خزانہ جو زمین کے اندر ہے' وہ پورے کا پورا نہیں اگل دیتی۔ اگر کہیں ایسی صورت ہوتی کہ زمین کے اندر تمام نوعِ انسان کے لیے' قیامت تک کے لیے' جتنا رزق ہے' خزائن ہیں' قرآن حمید نے جو کہا ہے' وہ سارے کا سارا کوئی ایک شخص اٹھا کر نکال لیتا تو وہ دنیا کے اندر طوفان مچا دیتا' وہ تو کسی کو ایک دانہ کھانے کے لیے نہ دیتا۔ یہ چیز کہ جتنا جی چاہے محنت کر لیجیے اور کھاد ڈال دیجیے' وہ پندرہ بیس من یا چالیس پچاس من زیادہ سے زیادہ ملے گا۔ اتنا ہی نکلتا ہے' اس سے زیادہ نہیں نکلتا ہے۔

نوعِ انسانی کے لیے قدرت نے زمین کے اندر لامحدود خزانے دفن کر رکھے ہیں

ہم نے یہ کنٹرول رکھا ہوا ہے حالانکہ زمین کے اندر جو پیدا کرنے کی استعداد ہے وہ تو واقعی لامنتہا ہے۔ پتہ نہیں لاکھوں سال سے اس زمین کے اندر سے یہ کچھ الناس کے لیے نکل رہا ہے' فصلیں نکل رہی ہیں' وہ فصلیں نکالتی چلی جاتی ہے۔ یہ تو سمجھانے کو یوں ہے کہ

اس کے نیچے کچھ خزانے دبے ہوئے ہیں۔ واقعی وہ لفظ ہی خزانہ ہے۔ مجھے یاد آ گیا' کہا ہے کہ وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ (15:21) زمین کے اندر تو یوں سمجھو جیسے ان چیزوں کے خزانے دبائے ہوئے ہیں یعنی اس زمین کی فصل پیدا کرنے کی جو استعداد ہے وہ لامحدود ہے لیکن ایک فصل میں' ایک وقت میں' ایسا نہیں ہوتا کہ وہ سارے کا سارا خزانہ اُگل کر باہر لے آئے اور اس کے بعد وہ ختم ہو جائے اور پھر یہ جس کے ہاتھ لگ جائے تو وہ دنیا میں اودھم مچا دے گا' ایک دانہ کسی دوسرے کو نہیں دے گا' زمین خالی ہو چکی ہو گی' وہاں سے ملے گا نہیں۔

اب کہا یہ ہے کہ یہ استعداد ملاحظہ فرمائیے۔ یہ اتنی ہی استعداد ہے کہ جتنا نکل رہا ہے اس پہ ہی انسان نے زمین کی ملکیت کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ ہمارے باطل نظام میں وہ چیز پیدا ہو رہی ہے۔ دیکھیے یہ گاؤں کا وہ چودھری ہے اور وہ وہاں کا کمین ہے' ان دونوں میں کتنا فرق ہوتا ہے؟ اس چودھری کے پاس لامحدود رقبہ ہوتا ہے' اس کمی کمین کے پاس یا تو ہوتا ہی نہیں یا بیچارے کے پاس ہوتا ہے تو یونہی دو چار مرلے' ایک آدھ کنال۔ اس میں سے جو نکلتا ہے وہ اس کی ضرورت بھی پوری نہیں کرتا۔ اُس چودھری کی زمین میں جو نکلتا ہے تو اپنی ضرورت کے علاوہ سینکڑوں انسانوں کی ضرورت پوری کرنے کا جو رزق ہے وہ اس کو کنٹرول میں رکھ لیتا ہے۔ کہا کہ یہ تو ابھی غنیمت ہے کہ زمین نے اس کو ایک پیمانے کے مطابق رزق نکال کر دیا ہے۔ اگر کہیں ایسا ہوتا کہ وہ ایک ہی فصل میں سارے کا سارا خزانہ نکال کر اپنے قبضے میں کر لیتا تو انسان کسی کو سانس تک نہ لینے دیتا۔ قدرِ معلوم کے مطابق زمین میں سے یہ نکلنا اور پھر اسے نکلتے چلے جانا ہے۔ کہا کہ یہ ہے ہماری رحمت انسانوں کے لیے کیونکہ وَلٰكِنۡ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيۡرٌۢ بَصِيۡرٌ (42:27) وہ لوگوں کے حالات کو جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ یہ جو انسان کے اندر ہے یہ لامنتہا ہے' انسان میں طمع خود غرضی مفادِ خویش ہے۔ یہ تو سارے کا سارا سمیٹ کر لے جاتا ہے۔ کہا ہے کہ ہم جانتے ہیں اور دیکھتے بھی ہیں کہ کوئی کیا کرتا ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہم اپنے پیمانے کے مطابق کرتے ہیں مثلاً خشک سالی آ جاتی ہے۔ اس میں ایسا نظر آتا ہے کہ اس دفعہ وہ جو ایسی زمینیں ہیں' جہاں آبپاشی کا انتظام نہیں ہوتا' جنہیں بارانی زمینیں کہتے ہیں' جن کا صرف بارش کے اوپر مدار ہوتا ہے' کہتا ہے کہ ایک یہ چیز ہے کہ بارش نہیں ہوتی۔ آپ دیکھیے کہ اس سے تم کس قدر مایوس ہو جاتے ہو کہ اس دفعہ اس زمین سے اتنا بھی نہیں نکلے گا لیکن وَهُوَ الَّذِيۡ يُنَزِّلُ الۡغَيۡثَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا قَنَطُوۡا وَيَنۡشُرُ رَحۡمَتَهٗ (42:28)۔ بارانی کیا بات ہے جہاں تم مایوس ہو جاتے ہو کہ بارش نہیں ہوئی! اگر اس میں ایک ہفتہ بھی بارش نہ ہو تو وہ فصل بونے کا جو زمانہ یا وقت ہوتا ہے' موسم ہوتا ہے' وہ گزر جاتا ہے۔ کہا کہ اس کے بعد بارش آتی ہے۔ یہاں ایک لفظ ''ینشر و'' آیا ہے' جسے کہا ہے کہ بکھیر دیتا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ رحمت کے معنی سامانِ نشو و نما ہیں۔ ہمارے ہاں تو ان چیزوں کا مفہوم ہی کچھ نہیں: بس وہ اللہ کی رحمت ہے کہ وہ کرے' اور کچھ نہ ملے' یہ وہی رحم ہے کہ اس نے رحم کیا اور وہ جو اس کا رحم کرنے کا عمل

ہے' ہم نے اس کو رحمت کر کے پکار دیا' وہ بھی ایسا کہ ہم رحمت اور بخشش کے اوپر چلے ہوئے ہیں' بالکل بھکاری' ابدی بھکاری ہو گئے ہیں۔ ہمیں جہاں کہیں سے قرضہ مل جاتا ہے یا کہیں سے کوئی مدد مل جاتی ہے تو خوش ہو جاتے ہیں حالانکہ اس کی یہ رحمت بھکاریوں کو خیرات دینے والی بات نہیں ہے۔

خالقِ کائنات قدم قدم پر انسان کے لیے شرف و تکریم کے پھول بکھیرتا چلا جاتا ہے

عزیزانِ من! خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔اس کے شرف اور تکریم کو وہ ہر مقام کے اوپر برقرار رکھتا ہے۔ یہ تو انسان ہیں جن کے ہاتھوں اس کی تذلیل ہوتی ہے۔خدا تو انسان کی تذلیل نہیں کرتا' وہ تو اپنے ہاتھوں سے تباہ ہونے والے جو بندے ہیں' جو تباہی کے موقعہ پہ کھڑے ہیں' کہتا ہے کہ جہنم کے کنارے کے اوپر کھڑے ہو! او میرے بندو! تم نے یہ کیا کیا کہ اپنے آپ کو تباہ کر لیا ہے!! اس کی تو یہ کیفیت ہے' حالانکہ یہاں ہر مجرم سے نفرت کی جاتی ہے۔قرآن مجید نے کہا ہے کہ جرم سے نفرت کرو' مجرم سے نفرت نہیں' وہ پھر بھی انسان رہتا ہے۔اس میں ''توبہ'' کی' واپس آ جانے کی' انسان بن جانے کی' استطاعت ہے۔اس سے نفرت نہیں' جو اس نے غلط کام کیا ہے وہ قابلِ نفرت ہے۔وہ شرفِ انسانیت کو برقرار رکھتا ہے۔

سامانِ نشو ونما پر خدا کا احسن کنٹرول

عزیزانِ من! اس کے لیے رحمت یعنی سامانِ نشو ونما ہے' وہ سامانِ نشو ونما جو تمہارے کسب و ہنر سے نہیں ملتا' خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ یہاں یہ دیکھیے کہ تم تو مایوس ہو چکے تھے کہ اب کے تو فصل نہیں ہوگی' ہم نے بارش برسائی' تمہارے لیے رزق' سامانِ نشو ونما' بکھیر کر رکھ دیا۔ یہ ہے جسے وہ رحمت کہتا ہے۔کہا کہ **وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ** (42:28)۔''ولی'' یعنی سرپرست کا لفظ تو پہلے لایا۔اس کے اندر ذرا سا' جسے upper hand (بالا ہاتھ) کہتے ہیں' ہوتا ہے' یہ غلبے کی شکل ہوتی ہے۔اس میں یہ کہنے کے ساتھ ہی کہ کہیں ذہن میں یہ نہ آ جائے کہ استبداد کی شکل کا یہ ولی ہے' فوراً کہا کہ **الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ** (42:28) قابلِ ستائش ہے وہ جس کی ولایت پہ تم بے ساختہ پکار اٹھو کہ کیا بات ہے اس ولایت کی! سامانِ رزق دینے والا کنٹرول جو اس کا ہے۔اگر میں ولایت کے معنی یہ کروں حالانکہ اس کے معنی دوست کے بھی ہوتے ہیں۔ یہاں ولایت کے معنی ''اس کنٹرول کے ہوں گے' جو اس نے زمین پہ رکھا ہوا ہے' بارش پر کنٹرول رکھا ہے۔'' یہ ہے کنٹرول اور وہ اس لیے تھا کہ اگر زمین اپنے سارے کے سارے خزانے اگل دیتی تو یہ لوگ اودھم مچا دیتے۔ یہ تو کنٹرول ہوا لیکن جو کنٹرول ہے وہ حمید ہے اور پھر یہاں جو صیغہ استعمال ہوا ہے اس کے معنی ہیں مسلسل مستحقِ حمد و ستائش۔

قرآن حمید کی اصطلاحات الفاظ نہیں ہیں بلکہ یہ زندگی کے Concepts (تصورات) ہیں

میں نے عرض کیا ہے کہ حمد کے معنی تعریف بھی ہیں۔ بات کہیں اور نکل جائے گی' میں اپنے متعلق نہیں کہہ رہا' عزیزانِ من! قرآن حمید کے الفاظ کے صحیح مفہوم کو سمجھنا ہو تو میرے ''لغات القرآن'' کو دیکھیے' اس میں یہ چیز میں نے واضح کی ہے کہ یہ الفاظ نہیں ہیں' Concepts ہیں' تصورات ہیں' قرآن حمید کی تعلیم کے نظریات ہیں۔ قرآن مجید کی تعلیم کا یہ لفظ حمد ایک لفظ نہیں' جس کے معنی آپ تعریف اور ستائش کر سکیں۔ اس کا کسی اور زبان کے اندر ترجمہ نہیں ہو سکتا' یہ تصور ہے۔ بہر حال وہ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ہے۔ اس کی وہ کارسازی بروئے کار آتی ہے جو ہر طرح درخورِ حمد و ستائش ہے۔ خدا کے قوانین فطرت اسی زمین تک محدود نہیں' یہ ساری کائنات میں جاری و ساری ہیں۔ اسی لیے کہا کہ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَّهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ (42:29)۔ عزیزانِ من! یہ وہ آیت ہے جس کے متعلق میں پہلے بھی کہا کرتا ہوں' ہم تو ہزار برس سے' تیرہ سو سال سے' تلاوت کرتے چلے جاتے ہیں' اس سے اتنا ہی مقصد ہے کہ ہر حرف کی جو دس نیکیاں ہیں وہ ہمارے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہیں' وہ بنک میں ہمارا اکاؤنٹ کھلا ہوا ہے' وہ اس میں تو لکھی جاتی ہیں۔ ناظرہ پڑھتے چلے جائیے' ہر حرف کے عوض دس نیکیاں لکھی جائیں گی۔ آپ کے ہاں قرآن حمید نے تفکر اور تدبر کا حکم دیا ہے۔ یہ قرآن حمید سمجھ ہی فکر و نظر سے آ سکتا ہے۔ یہ جو بات تھی ہماری سمجھ میں تو نہیں آئی کیونکہ فکر اور سوچنا تو مذہب میں حرام ہو جاتا ہے' یہ تو دین کا تقاضا ہوتا ہے۔ مذہب میں تو انسان سوچ ہی نہیں سکتا' انہیں کیا معلوم کہ قرآن مجید کیا کہہ گیا ہے!

سنیے! قرآن حکیم نے کہا کیا ہے۔ پھر یہ بات آئے گی کہ ان قوموں کی سمجھ میں یہ بات کیسے آئی۔ ہمارے ہاں تو بہر حال زمین کے اوپر یہ مخلوق ہے۔ دآبۃ کے معنی ہر متنفس سانس لینے والی جو ذرا چلتی ہو' دآبۃٍ ہے۔ اس میں متنفس ہونا تو پہلی چیز ہے۔ متنفس کے معنی ہیں ''سانس لینے والے''۔ سانس سے تو زندگی ہوئی اور یہ کہ خواہ وہ رینگ کر چلے' خواہ پاؤں سے چلے' خواہ دو پاؤں سے چلے' یہ دآبّۃ ہے۔ یہ دآبۃ کا قرآن حکیم کے اندر بڑا جامع لفظ ہے۔ ہم نے تو اسی زمین کے اوپر یہ کچھ دیکھا ہے۔ ہمارے ہاں کی مذہب کی جو فکر کی سطح تھی وہ ہزار برس پہلے کی تھی' اس میں اتنا ہی تھا کہ یہ آسمان ایک شیشے کا بہت موٹا ڈل ہے اور یہ جو آپ کو یہ چاند ستارے وغیرہ نظر آتے ہیں' یہ اس کے اندر ہیرے جڑے ہوئے ہیں' شیشے کے ڈل کے اندر نگ جڑے ہوئے ہیں۔ اب یہ چاند اور سورج تو نگ نہیں' وہ تو بڑی بڑی چیزیں ہیں' یعنی یہ نہیں ہے کہ یہ ارض سے لاکھوں گنا بڑے کرّے ہیں' یہ سلسلہ کائنات ہے' یہ کرّے گردش کر رہے ہیں' ان کا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔

مذہبی پیشوائیت کے دورِ اقتدار میں جہالت اور ظلم (یورپ میں بھی) اپنے عروج پر ہوتا ہے

یہ جو فلکیات کا نظام ہے' یہ ہزار برس میں ہمارے سامنے نہیں آیا تھا اور اس کا سامنے نہ آنا کوئی جرم یا غلطی نہیں ہے۔ انسانی علم کی ابھی سطح ہی اتنی تھی' یورپ میں بھی' مغرب میں بھی' جو اس وقت اس سائنٹفک معلومات میں اتنا ایڈوانس ہو چکا ہے' سترھویں صدی سے پہلے ان کے ہاں بھی اسی قسم کا تصور تھا۔ ان کے ہاں مذہب کی جو گرفت تھی وہ بڑی شدید تھی اس لیے کہ تھیاکریسی (مذہبی پیشوائیت) تھی' اس کے ساتھ حکومت کی قوتیں موجود تھیں۔ جب بھی مذہبی پیشوائیت کے ساتھ حکومت کی قوتیں شامل ہو جائیں تو ان کی جہالت اور ان کا ظلم شدت اختیار کر لیتا ہے۔ یورپ میں یہ دونوں ہی چیزیں تھیں' جہالت بھی تھی' اسی لیے گیلیلیو [1] (1564-1642ء) کو کہا کہ اسے پھانسی دیدؤ اس کو ٹاور کے اوپر سے گرادؤ اس کی موت کی سزا [2] کا فتویٰ صادر کر دیا۔ کس جرم میں سزا کا فتویٰ دیا؟ کہتا تھا کہ زمین گردش کرتی ہے۔ اس کو زندہ جلا دو۔ کس جرم کے اندر؟ کہتا ہے کہ زمین گول ہے۔ اس قسم کی چیزیں جنہوں [3] نے بھی کہیں' وہ ان کے مذہبی عقیدے کے خلاف جاتی تھیں۔ کیفیت یہ ہوئی کہ جس نے ذرا بھی وہ کہا' جو ان کے خلاف جاتا تھا' تو ان پر سزائے موت کا فتویٰ دے دیا۔ گیلیلیو (1564-1642ء) کو کہنے لگے تھے کہ اب بھی مان جاؤ توبہ کر لو' وہ کہنے لگا کہ کیسے توبہ کروں' میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ زمین گردش کر رہی ہے۔ کیا بات تھی ان لوگوں کی صاحب! تو وہاں یہ کیفیت تھی کہ سوچنا حرام تھا' اس لیے کوئی ایسی بات جو ان کے ہاں کے عقائد کے خلاف جاتی تھی' وہ الحاد تھا' جرم تھا' ارتداد تھا' اس کی سزا موت تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ فکرِ انسانی ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی' ذہنِ انسانی اس طرح جامد تھا گویا کہ ان کے ہاں وہ ذہن کوئی چھ سو سال یا ایک ہزار [3] سال پہلے کا تھا۔

فکرِ انسانی کے جمود کے سلسلہ میں ہماری اپنی حالتِ زار اور مرتد کی سزائے قتل

ہمارے ہاں فکر جامد ہو چکی ہے۔ ایک ہزار سال پہلے جہاں انسان کی فکر تھی' آج بھی وہیں ہے' کوئی بھی نئی بات کہیے تو انہوں نے کہا کہ یہ سلفِ صالحین کے مسلک کے خلاف ہے یعنی دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ بات اس فکری سطح کے خلاف ہے جو ہزار برس پہلے تھی اس لیے ہمارے ذہن میں تو یہ نئی بات آ نہیں سکتی' کسی کے ذہن میں کچھ اصلاح کی شکل آتی تھی تو وہ ڈر جاتا تھا کہ جونہی میں زبان پہ یہ

---

1. گیلیلیو (1564-1642ء) اطالوی ماہر فلکیات اور ریاضی دان جس نے اپنی دوربین 1609ء میں تیار کی۔
2. 1633ء میں
3. ان نکات کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مطالبِ القرآن فی دروس الفرقان سورۃ انبیاء' پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔ 91 تا 95 نیز فٹ نوٹ 1 تا 5 (ص۔ 91)۔

لفظ لایا یا اور مرتد کا فتویٰ صادر ہوا اور مرتد کی سزا تو قتل تھی۔ آپ حیران ہوں گے کہ مرتد کی سزا قتل تھی، یہی نہیں تھا کہ کسی قاعدے، قانون کے مطابق، کسی عدالت سے، فیصلہ ہو پھر حکومت کی طرف سے قتل کی سزا ملے۔ مرتد کا خون ارزاں ہوتا ہے یعنی جس کا جی چاہے اس کو قتل کردے۔ وہ اپنے ہاں بیٹھے ہوئے فتویٰ صادر کردیں، یہ نہیں ہے کہ اس نے مذہب تبدیل کرلیا ہے، وہ ہندو ہوگیا ہے، نہیں، یہ جو عقائد متوارث چلے آرہے ہیں یا جن کو اجماعِ امت کہتے ہیں، ان کے کسی عقیدہ کے خلاف کسی کا عقیدہ یہ ثابت کردیا جائے تو بیٹھے بیٹھے بھی ارتداد کا فتویٰ صادر ہوگیا اور ارتداد کے بعد مرتد کی سزا قتل اور اس کا خون کردیا یعنی جس کا جی چاہے اس کو قتل کردے۔ تو آپ سوچتے ہیں کہ اس میں انسانی فکر تو جامد (Static) ہوکر رہ جائے گا۔ جو بھی ان چیزوں کو نہایت دیانتداری سے مانے، میں برملا کہہ رہا ہوں کہ ان چیزوں کو دیانتداری سے مانے، اس کی فکر بھی جامد یعنی وہ فکر تو سوچنے کی اہل ہی نہیں رہتی، کہ جو کچھ ہزار سال پہلے کی کسی تفسیر میں لکھا ہے، کسی روایت میں کہا گیا ہے، وہ آخری حرف ہے، وہی حق ہے، اس سے جو اِدھر اُدھر ہٹنا ہے، ارتداد ہے اور جنہوں نے اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا، اب ان کا جو حشر ہوا، وہ تاریخ ہمیں بتارہی ہے یعنی ایک مرتد کی سزا آپ نے دیکھی ہوگی، ان کے پیچھے سراغ رساں ڈھونڈتے ہوئے جاتے تھے، وہ جنگلوں میں بھاگ جاتے تھے، غاروں میں چھپ جاتے تھے، وہ سراغ رساں وہاں سے نکال نکال کر ان کو قتل کردیتے تھے تو پھر کس کی جرأت تھی کہ اگر وہ بات سمجھ بھی گیا ہے تو زبان پہ لے آئے، تو وہاں اگر جہالت کی وجہ سے فکر جامد تھی یہاں وہ استبداد کی بنا پر فکر جامد نہیں تھی، محبوس تھی، جکڑی ہوئی تھی، تو بات تو وہیں رہی، بات کوئی آگے چلی نہیں، جنہوں نے یہ سمجھ بھی لیا تھا کہ یہ گُرّے بڑے بڑے ہیں، وہ بھی زبان پر نہیں لاسکتے تھے۔

فکری جمود تو روشن حقائق کو بھی تسلیم کرنے سے انکاری ہوتا ہے

یورپ نے کوئی دوسو سال پہلے تھیوکریسی کے، مذہبی پیشوائیت کے، استبداد سے تنگ آکر سرے سے مذہب کا لبادہ ہی اٹھا کر پھینک دیا، سیدھی سی بات تھی کہ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری اور اپنے ہاں سیکولرازم رائج کرلی کہ جاؤ تم گرجے میں، وہاں جاکر Preach (تبلیغ) کیا کرو اور اس دوسو سال کے اندر آپ دیکھیے کہ زمین کی سطح پہ نہیں، وہ آسمان پہ جا پہنچے [1] اور جب وہ آسمان پہ پہنچے تو پھر آپ کے ہاں سے مذاق ہو رہا تھا، اب بھی وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ نہیں، یہ چیز غلط ہے، پروپیگنڈہ ہی ہے، چاند کے اوپر کوئی نہیں جاسکتا، کیونکہ اگر یہ مان لیا

---

[1] ہوا کچھ یوں کہ 2 دسمبر 1942ء کو ایٹم (Atom) توڑا گیا۔ انرجی دستیاب ہوئی۔ 4 اکتوبر 1957ء میں (سابقہ) روس نے سپٹنک نامی مصنوعی سیارہ پہلی بار خلا میں بھیج کر ایک عالم کو ورطہ حیرت میں غرق کردیا۔ 28 فروری 1959ء میں امریکہ نے پہلا مخبر سیارہ خلا میں بھیجا اور...... پھر انسان نے چاند پہ جا قدم رکھا۔ (خورشید عالم: خلا کا عالمی کردار، طلوعِ اسلام فروری 1968ء ص ص۔ 40 تا 47)

جائے کہ چاند ایسا ہے جیسا یہ کہتے ہیں تو وہ جو شق القمر کا معجزہ نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب ہے کہ انگلی سے آپ نے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے، ایک ٹکڑا اِدھر سے گزر گیا تھا، ایک ٹکڑا اُدھر سے گزر گیا تھا، تو پھر وہ باطل ہو جاتا ہے۔ اگر اس کو اتنا بڑا کرّہ مان لیا جائے، اس بنا پہ یہ کہا کہ یہ جھوٹ ہے۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے ہاں تو یہ چیز یا فکرِ جامد یا فکرِ محبوس ہے، اس کے ہوتے ہوئے آپ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ کوئی نئی چیز جو آپ کے ہاں آئے، پہلا فتویٰ ان کی طرف سے آجاتا ہے کہ اس کا استعمال ناجائز ہے، حرام ہے، ممنوع ہے مثلاً لاؤڈ اسپیکر آیا، مفتی [1] صاحب نے فتویٰ دیدیا کہ اس کا استعمال ناجائز ہے، عربیبہ کے اندر سے ٹیلیفون آیا۔ کہا کہ اس میں سے شیطان کی آواز آتی ہے، وہ ناجائز ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پھر اس کے بعد زمانے کا تقاضا اس کو مار مار کر حلال کر دیتا ہے۔ آج سب استعمال کر رہے ہیں لیکن پہلا فتویٰ یہی ہے کہ حرام ہے۔ نابیناؤں کے لیے اس دور کی یہ اتنی بڑی تحقیق آئی کہ اگر مردے کی آنکھ نابینا کو لگا دیں تو اسے نظر آنے لگتا ہے عزیزانِ من! یہ ایجاد نہیں انکشاف ہے کہ مُردے کی آنکھ وہ اندھے کی پیشانی میں لگا دیتے ہیں تو وہ دیکھنے لگ جاتا ہے اللہ اکبر! یعنی انسانیت کو اس کے اوپر جشن منانا چاہیے تھا، اُن قوموں نے جشن منائے، مگر یہاں سے فتویٰ صادر ہو گیا کہ یہ حرام ہے، یہ ناجائز ہے۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ مذہب کے اندر فکر یا تو جامد ہوتی ہے یا وہ جہالت کی بنا پہ اس فکر کو حرفِ آخر مانتے ہیں، اس کو دیانتداری کہہ لیجیے لیکن دیانتداری یہ ہے کہ Sincerity is not always a guarantee for sanity [2] اور اگر کوئی یہ سمجھتا ہے تو اس کی فکر محبوس ہوتی ہے، وہ زبان پہ نہیں لا سکتا۔

جدید سائنسی انکشافات قرآن کریم کی روشنی میں

اُن قوموں نے جب علم الافلاک کی تحقیق کی تو وہی ہوا جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ انفس اور آفاق میں جتنے بھی حقائق مستور ہیں، جن پہ پردے پڑے ہوئے ہیں، جوں جوں کسی حقیقت سے پردہ اٹھے گا، جو بات سامنے آئے گی تو وہ قرآن کریم کے کسی دعوے کی صداقت کی شہادت ہوگی۔ قرآن کریم کی یہ آیت بڑا عظیم دعویٰ ہے۔ ان چیزوں کو بھی قرآن نے آیاتِ خداوندی کہا ہے یعنی کسی حقیقت تک پہنچنے کی یہ نشانیاں، علامات بڑی چیز ہے۔ یہ بھی کہا ہے کہ جس نے ارض و سما کی تخلیق کی، یہی کچھ چھوٹی بات نہیں تھی۔ میں کہا کرتا ہوں کہ کسی چیز کو عدم (Nothingness) سے وجود (Being) میں لانا یعنی ''کچھ ہے نہیں'' اور اس کو یوں ''پیدا کر دینا'' یہ خدا ہی کر سکتا ہے، ذہنِ انسانی

---

[1] یہ اشارہ مفتی محمد شفیع مرحوم (1976-1897ء) کی طرف ہے۔ ان کا یہ فتویٰ البدائع المفیدہ فی حکم المنائع الجدیدہ میں شائع ہوا ہے۔ انہوں نے تحقیق کے لیے الیگزنڈر ہائی اسکول بھوپال کے ہندو سائنس ماسٹر برج نندن لال سے دریافت کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ''برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم از کم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے۔''

[2] اخلاص مندی کبھی بھی ہوش مندی کی ضمانت نہیں ہوتی۔

میں تو یہ آ ہی نہیں سکتا۔ یہی کوئی چھوٹی چیز نہیں اور یہاں کہا ہے کہ **وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ** (42:29)۔ یہاں ارض اور سما آیا ہے۔ قرآن حکیم سما آسمانی کروں کو کہتا ہے اور ارض یہ جو نیچے کرّے ہیں۔ اگر میں اِدھر آ گیا تو یہ تو مضمون ہی دوسرا نکل آئے گا۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہے زمین اور اوپر یہ آسمان ہے۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ ایسی بات نہیں ہے۔ ہر ارض کا ایک آسمان ہے' ہر آسمان کی ایک ارض ہے۔ جو اس کرّے سے نیچے کا کرّہ ہے' وہ اس کرّے کی زمین ہے جو اس سے نیچے والا کرہ ہے یہ ہماری ارض ہے مگر اس کی سما ہے۔ یہ قرآن کہتا ہے۔ عزیزانِ من! تخلیقِ ارض و سما یہ کرّے ہیں اب جو یورپ کی فکرِ انسانی آزاد ہوئی ہے اور وہ ارض سے اٹھ کر سما کی طرف گئے ہیں تو اگرچہ چاند کے متعلق انہوں نے وہاں جا کر دیکھ لیا کہ اس میں اب زندگی کی استعداد نہیں ہے لیکن وہ ابھی سے جو کچھ ان کے احاطۂ تجربہ یا انکشاف میں آیا ہے تو اس کی بنیاد پہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ان میں ایسے کرے ہیں' ان کے اندر ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جن میں لائف (زندگی) ممکن ہے' ان کے اندر زندگی کا امکان ہے۔ آج وہ یہ کہہ رہے ہیں اور پھر وہ اس امکان کو ایک حقیقت دیکھنے کے لیے ان کی طرف اور آگے اور آگے بڑھ رہے ہیں۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

ان کُرّوں کی تلاش میں اور بڑھ رہے ہیں' جن کے اندر انہیں زندگی ملے گی۔ قرآن حمید نے چودہ سو سال پہلے یہ کہا کہ اس ارض اور ان آسمانی کرّوں میں ایسے ہیں جن کے اندر دآبۃ ہیں۔ پہلی چیز تو یہی کچھ کم نہیں۔ آگے بڑھیے' وہ کرّے ہیں یہاں اس ارض پہ بیٹھے ہوئے تصور ہی نہیں ہوسکتا تھا کہ ان میں کبھی کوئی رابطہ بھی پیدا ہوسکتا ہے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ **وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ** (42:29) اور وہ اس پہ بھی قدرت رکھتا ہے کہ جب اس کی مشیت کے پروگرام میں یہ چیز آئے گی' وہ ان دونوں میں رابطہ پیدا کر دے گا۔ اللہ اکبر! رابطہ ہی نہیں بلکہ **جَمْعِهِمْ** (42:29) کہا ہے کہ وہ انہیں اکٹھا بھی کر دے گا۔ آج سے چودہ سو سال پیشتر قرآن مجید یہ کہہ رہا ہے۔ ہماری تو آج بھی یہ حالت ہے' عزیزانِ من! کہ وہ چاند پہ گئے اور ہم نے انہیں جھٹلایا کہ یہ غلط ہے' جو کہہ رہے ہیں' یہ محض پروپیگنڈہ ہے۔ ہم تو آج بھی یہ کہہ رہے ہیں لیکن وہ قوم جس میں فکر تھی اور ان میں سے جس کے سامنے قرآن مجید آیا ہے' میں ان میں' مورس بوکائے (1911-1989) کا حوالہ دیا کرتا ہوں اس کی کتاب ہے: ❶ The Bible, The Quran And Science (بائبل' قرآن اور سائنس)۔ وہ ان آیات پہ آتا ہے تو رقص کرنے لگ جاتا ہے اور ہمیں نہیں' دنیا بھر کے سائنسدانوں سے کہتا ہے کہ او! سوچو تو سہی' چودہ سو سال پہلے یہ بات کوئی انسان کیسے کہہ سکتا تھا' اس لیے میں ایمان لاتا ہوں کہ یہ انسان کا کلام نہیں۔ مگر ہم ہیں کہ انہیں جھٹلا رہے ہیں کہ جی نہیں' صاحب!

---

❶ Bucaille, Maurice: The Bible, The Qur'an AND Science, Islamic Book Service, Lahore, 1998.

چاند پہ کون جا سکتا ہے۔ وہ ایمان لاتا ہے اُسی چیز پر جو اس نے یہ کہی ہے کہ ارض میں بھی اور ان کرّوں کے اندر بھی اس کا امکان ہے' امکان نہیں بلکہ وہ تو قرآن حمید کے الفاظ میں کہتا ہے کہ **فِيهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ** (42:29) ان میں دآبۃ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو چیز ہے' ہم اس کے امکان تک تو پہنچ گئے ہیں۔ اب اگلی چیز جو قرآن حمید نے کہی تھی کہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ جو مشیت کا پروگرام ہے یعنی کائناتی قوانین کی رو سے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک دن نہ صرف رابطہ پیدا ہو جائے بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے بھی ہو جائیں۔ اگر چاند کے اوپر یہ دآبۃ ہوتا اور یہ جو یہاں سے انسان چاند پہ جا رہے ہیں تو وہ جمعھم ہیں۔ وہاں یہ بات سامنے آجاتی لیکن رابطہ تو آج بھی قائم ہو گیا اور اس کے بعد وہ آگے بڑھ رہے ہیں۔

قدم قدم پر کائنات کے حقائق کو Discover (بے نقاب) کرنے والی قوموں کا ایمان

عزیزانِ من! قرآن مجید پہ تو یہ قومیں ایمان لائیں گی۔ قرآن نے کہا یہ ہے کہ فکر کی رو سے اس پہ ایمان لایا جا سکتا ہے۔ وہ جن میں فکرِ جامد اور فکرِ محبوس ہے وہ کیا ایمان لائیں گی۔ محبوس پھر بھی دل میں تو مان لے گا اگر زبان پہ نہیں لا سکتا لیکن عزیزانِ من! قرآن مجید تو سمجھ میں اس وقت آ سکتا ہے جب فکر و تدبر سے کام لیا جائے' انفس اور آفاق کی جو مستور حقیقتیں ہیں سائنٹفک طریقے سے ان کے پردوں کو ایک ایک کر کے اٹھایا جائے' جبھی تو انہوں نے اپنے ہاں Discover (بے نقاب) کا بڑا عمدہ لفظ استعمال کر رکھا ہے' وہ بڑا سائنٹفک لفظ ہے۔ وہ ان چیزوں کو ایجاد نہیں کرتے' وہ صرف Discover (بے نقاب) کرتے ہیں' اس کے اوپر سے پردہ اٹھاتے ہیں' یہ قرآن مجید کا لفظ ہے۔ کہا کہ **وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ** [1] (42:29)۔ انسانوں کے اختیارات اور ان کے امکانات کی وسعتوں کی تو یہ کیفیت ہے۔

تقدیر کی آڑ میں انسانی نفسیات کا اندازِ فکر

ہم نے کہا ہے کہ یہاں سے وہاں تک اس انسان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو بھی مجبور ہی محسوس نہیں کرتا' بلکہ مجبور ظاہر کرتا ہے' مجبور کہتا ہے۔ یہ مجبور کہنے کی چیز کیا ہے؟ یہ تقدیر کا مسئلہ ہے۔ یہ کہتا ہے کہ انسان جو مجبورِ محض ہوتا ہے' اللہ کی طرف سے ہوتا ہے' یہ راضی برضا ہوتا ہے' یہ مولا کی مرضی سے ہوتا ہے' بندہ بشر ہے کیا کرے؟ یہاں تو ایک پتہ بھی اس کی اجازت کے بغیر نہیں ہل سکتا' سیدھی سی بات ہے کہ یہ بے بس ہے' بلا اختیار و ارادہ ہے۔ ذرا غور کیجیے! قرآن کریم دکھتی ہوئی رگ کو کیسے پکڑتا ہے۔ انسانوں کو جو خوشحالیاں آتی ہیں' دولت کماتے ہیں' جو لوگ یہ کچھ تکلفاً کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! یہ خدا کی دین ہے۔ یہ دین کا لفظ ہی بڑا معنی خیز ہوتا ہے کہ جہاں وہ اپنی

---

[1] یہ آبادیاں' اِس وقت تو الگ الگ ہیں۔ لیکن وہ اس پر قادر ہے کہ انہیں اکٹھا کر دے۔ (یعنی زمین اور ان کُرّوں میں بسنے والی آبادیاں' باہمی ربط پیدا کر لیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1134)۔

دولت Account for (جواب دہ) نہ کر سکے کہ کہاں سے آئی ہے تو وہ خدا کی دین ہوتی ہے' ورنہ بتانا پڑتا ہے کہ کہاں سے لیا ہے۔ یہ سیدھی سی بات ہے لیکن بہرحال یہ جو دولت کماتا ہے' خوشحال ہوتا ہے' یہ واقعی ایمانداری سے اس وقت نہیں کہتا کہ اس میں یہ میرا سب کچھ میرا نہیں' قارون کا ہے۔ یہ وہی قارون کا نظریہ ہے جو قرآن حکیم نے کہا ہے کہ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ [1] (28:78) میری کاریگری کا نتیجہ ہے کہ مجھے یہ سب کچھ ملا ہے لیکن جب مصیبت آتی ہے اس وقت آدمی کبھی نہیں کہتا کہ یہ میری غلطی کا نتیجہ ہے۔ کہتا ہے کہ "خدا نے مصیبت ڈال دی صاحب! اللہ ولوں ہی آ گئی جو کچھ وی اوہ ڈیا ہیگا اے۔ بندے دی طاقت کی ہے صاحب! کچھ کر لے ٹھیک ہے جی اوہدے ولوں ای اوندا اے جو کچھ اوندا اے۔" [2] جب اس کی طرف سے آتا ہے تو پھر اپنی طرف سے اس کے ہٹانے کی کوشش کرنا تو بہت بڑا الحاد ہے یہ تو کفر ہے اور شاعری میں تو پھر یہ چیز ہی عجیب ہے' وہ حسرت (1875-1951ء) کا شعر ہے:

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

لؤ دوا تے اک پاسے رہی' دعا [3] بھی نہ کریں۔ مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو کیونکہ یہ بیماری تو اس نے بھیجی ہوئی ہے۔ اس کے لیے کوشش کرنا کہ یہ دُور ہو جائے یہ تو اس کے خلاف اعلانِ جنگ ہو گیا' یہ بالکل نہ کرنا' اپنے سب کام کرنا تقدیر کے حوالے۔ یہ ہے تقدیر کی آڑ میں انسانی نفسیات کا اندازِ فکر۔

تقدیر کا عقیدہ اور شبِ برات کے تصور کی حقیقت

جب انسان پہ مصیبت آتی ہے اس وقت یہ چیز کہتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے صاحب! اس کو تسکین و تسلی دینے والے بھی یہی کہتے ہیں کہ کوئی بات نہیں' اللہ کی طرف سے یہ چیز ہے' وہ خود دور کر دے گا' آدمی کو چاہیے صبر شکر سے اس کو برداشت کرے' حرفِ شکایت بھی زبان پہ نہیں لانا چاہیے' یہ خدا کے خلاف شکایت ہو جائے گی۔ مصیبت اس کی طرف سے ہے۔ یہ تھی ایران میں وہ چیز جو آپ کے ہاں دین کو

---

[1] یہ دولت میں نے اپنی ہنرمندی اور چابک دستی سے کمائی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص 904 تا 905)۔

[2] خدا نے مصیبت ڈال دی صاحب! جو کچھ بھی آتا ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ بندے کی کیا طاقت صاحب! ٹھیک ہے کچھ بھی کر لے' جو کچھ بھی آتا ہے اسی کی طرف سے آتا ہے۔

[3] لو بھئی! دوا تو رہی ایک طرف' وہ کہتے ہیں کہ دعا بھی نہ کریں۔

جب مذہب سے بدلا ہے تو آئی ہے۔ ایران کے مجوسیوں کا بنیادی عقیدہ ہی تقدیر کا تھا۔ میں نے پچھلے درس [1] میں بتایا تھا کہ یہ شبِ برات جو آپ کے ہاں آتی ہے یہ مجوسیوں کی تھی۔ وہ مانتے تھے کہ ایک رات آتی ہے جس میں آنے والے سال میں ہر انسان کی قسمت کا فیصلہ ہو جاتا ہے اس لیے اس رات میں وہ بہت زیادہ جسے وہ عبادت کہتے ہیں' ان کے ہاں آتش پرست تھے' زیادہ آگ جلاتے تھے۔ اب ہمارے ہاں آتش بازی چھوڑتے ہیں۔

غلط قسم کے نظریات خصوصاً تقدیر انسانی فکر کو عملی طور پر مفلوج کر دیتے ہیں

یہ تقدیر کی بات تھی کہ یہ جو مصیبت آتی ہے خدا کی طرف سے آتی ہے۔ یہ قوموں کو تباہ کر کے رکھ دینے والی بات ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ کھڑے ہو کر سوچیں کہ ہم سے کہاں غلطی ہوگئی جس کی وجہ سے یہ اتنا بڑا نقصان ہو رہا ہے' سوچیں گے تو پتہ چلے گا کہ کہاں غلطی ہوئی اور جب غلطی کو Detect (شناخت) کرلیں گے کہ یہاں ہوئی تو پھر اس کی تلافی کے لیے آدمی کچھ کر سکے گا اور اگر شروع سے ایمان ہو کہ نہیں صاحب! یہ ہماری طرف سے تو نہیں' یہ تو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہے' تو پھر اس کے بعد تلافی کا اور اس تلافی کے لیے کچھ کوشش کرنے کا' سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو گویا یہ بنیادی چیز ہے۔ یاد رکھیے! تقدیر کا مسئلہ جس نے قوموں کو قوتِ عمل سے عاری اور محروم کر کے رکھ دیا ہے' قوموں کے لیے تباہ کن ہے اور اس میں جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے۔ جب مصیبت آتی ہے تو اس کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں' یہ لمبی چوڑی بحثیں ہیں' عزیزانِ من! تقدیر کے متعلق بحثوں کے لیے تو مجھے بھی ایک کتاب لکھنا پڑی اس کا نام ہے: ''کتاب التقدیر'' اس لیے کہ اس کے خلاف تقدیر کا وہ جو ایرانی عقیدہ ہے' اس کے لیے ہمارے ہاں اتنا لٹریچر ہے کہ کتابوں سے کمرے بھر جائیں' جس میں یہ کہا گیا ہے کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ مجھے تو بہر حال قرآن حکیم کی رو سے لکھنا پڑا لیکن درس میں تو لمبی چوڑی کہنے کی بات نہیں ہے' قرآن حکیم تو ایک فقرے میں بات کہہ جاتا ہے۔

سارے مسئلے کا حل' عزیزانِ من! چار الفاظ میں ہے کہ **وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ** (42:30) ہر مصیبت جو تمہارے اوپر آتی ہے' وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوتی ہے۔ قرآن حکیم ہے' عزیزانِ من! اس کے اوپر فلسفیانہ بحثیں کرتے چلے جایئے کہ انسان مطلق کیا ہوتا ہے یہ ختم نہیں ہوں گی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ انسان جب بیٹھا ہو' کام ہوتا نہیں تو پھر کیا کہیں؟ بس کھان نوں' ویلیاں نوں' وظیفے ملدے ہون' تے کرے کی؟ ویلی جٹّی اون ویلے۔ اگلے بچے او ویلے دی گل سمجھ نئیں رہے کہ پئی او ویلے کی

---

[1] اس کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا چوتھا باب۔

ہوندا ہیگا اے؟ [1] ہمارے ہاں ایک چھوٹا سا آلہ ہوتا تھا' اسے بیلنا کہتے تھے' ہاتھ سے یوں کرتے تھے تو یہ کپاس جو آتی ہے' اس میں بنولے بھی ہوتے ہیں' اونوں ولیوں کیندے نیں' [2] تو وہ بنولے الگ کرنے ہوتے ہیں' پھر وہ روئی بنتی ہے' پھر وہ روئی کو کاتتے ہیں' پھر وہ کپڑا بنتا ہے تو اس میں پہلا Step (قدم) بنولوں کا الگ کرنا ہوتا ہے' آج تو یہ بڑی بڑی جیننگ فیکٹریاں لگ گئی ہیں' اس زمانے میں فیکٹریاں نہیں تھیں' ہر گھر فیکٹری ہوتا تھا' وہ اتنا سا بیلنا ہوتا تھا وہ اس کو بیٹھی ہوئی ہاتھ سے یہ کام کرتی تھی۔ وہ جو کپاس تھی' جنوں بُرکیاں کیندے نیں [3] وہ اس میں کیے جاتی تھی اور اس میں سے وہ بنولے الگ ہو جاتے تھے' روئی الگ ہو جاتی تھی۔ ایک ایسا عمل تھا جس کا نتیجہ نکلتا تھا اور یہ ہونا تھا' تو وہ ہمارے ہاں اس نے یہ کہا کہ ویلی یعنی بیکار جٹی جس کو کچھ کام نہیں تھا' وہ کیا کر رہی ہے؟ وہ کپاس نہیں بیل رہی' وہ اون بیل رہی ہے ''یعنی اون وچوں کیہڑے وڑینویں کڈنے نیں اونے لیکن ویلدی پئی جاندی اے۔ تے کیوں ویلدی اے؟ کہن لگے ویلی جو ہوئی۔ آپ کے ہاں لٹریچر کے یہ جتنے کمرے بھرے ہوئے ہیں' اے سارے ویلیاں دا کم اے۔'' [4] بادشاہوں کی طرف سے وظیفے لگے ہوئے ہیں اور وہ جان بوجھ کر وظیفے لگا دیتے تھے کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

کھانے کو دیئے چلے جاؤ اور ان سے کہو کہ اون ویلدے ترے جاؤ [5]۔

اس قدر الجھے ہوئے مسئلے کا حل صرف چار الفاظ میں: قانونِ خداوندی کے مطابق عمل کرو

قرآنِ کریم نے چار الفاظ میں سارا مسئلہ حل کر کے رکھ دیا۔ کہا کہ **وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ** (42:30) ہر مصیبت جو تم پہ آتی ہے تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوتی ہے۔ فرد ہو یا قوم ہو یا نظام ہو' عزیزانِ من! یہ ہر ایک پہ Apply (اطلاق) ہو جائے گا۔ جہاں مصیبت آئے گی' کھڑا ہو کر سوچے گا کہ یہ میرے اپنے ہاتھوں سے آئی۔ اس میں میری غلطی کہاں ہوئی۔ کیا بات ہے! کہتا ہے کہ یہ جو تم ہماری طرف منسوب کرتے ہو' تو سنو! ہم انسانوں پر مصیبتیں نہیں لایا کرتے۔ یہ بھی چیز نہیں ہے کہ اپنے

---

[1] بغیر کام کیے کھانے کو وظیفہ ملتا ہو' تو کیا کرے؟ بس یہ کہ فارغ بیٹھی جٹی تو اون بیلے۔ ہماری یہ نئی نسل بیلنے کی بات نہیں سمجھ رہی کہ یہ بیلنا ہوتا کیا ہے؟

[2] اسے بیلنا کہتے ہیں۔

[3] جسے ''پونیاں'' کہتے ہیں۔

[4] یعنی اون سے اس نے کون سے بنولے نکالنے ہیں لیکن وہ ہے کہ بس اون کو بیلے چلی جا رہی ہے۔ یہ کیوں بیلتی ہے؟ کہنے لگے کہ فارغ جو ہوئی۔ آپ کے ہاں لٹریچر کے یہ جتنے کمرے بھرے ہوئے ہیں' یہ سب فارغ لوگوں کے کام ہیں۔

[5] اون بیلتے چلے جاؤ۔

ہاتھوں سے تم اس طرح سے غلطیاں کرو اور پھر نتیجہ بھی نہ بھگتو۔ کچھ تھوڑا سا ہم یہ کیا کرتے ہیں جو ابھی ابھی میں نے کہا تھا کہ وہ ذرا سی جو تدبیری غلطیاں ہوتی ہیں، تھوڑی سی لغزش ہوتی ہے اس کے نتائج سے درگزر کرنے کی بات کی ہے، وہ بھی اس طرح سے کہ وہ ''توبہ اور اصلح'' والی بات ہے۔ کہا ہے کہ یہ سب کچھ تمہارے اپنے ہاتھوں سے ہوتا ہے: وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (42:30) اور ہم تو ان میں سے کئی ایک جو ایسی چھوٹی موٹی ہوتی ہیں وہ ''يَـعْـفُـوْا'' میں آتی ہیں۔ ایسے ہوتا ہے کہ توبہ کے بعد اصلاح کرنے سے ان کے اثرات سے درگزر ہو جاتا ہے۔ یہ بڑا عجیب تصور ہے۔ یہ ''يَعْفُوْا'' لفظ جو ہے یہ کسی سے آگے بڑھ جانا ہے، ایک ہے کہ جاتے ہوئے لوگوں کو پکڑ لینا، ان کو حوالات میں لے جانا اور ایک یہ ہوتا ہے کہ اس سے یہ کہے کہ اوئے! پھر نہ کرنا، یہ بری بات ہے صاحب! یہ ہے جسے آگے بڑھ جانا کہتے ہیں، باقی تمہارے ہاں کا یہ رہا کہ تم بڑے اختیارات والے ہو اور بڑی قوتیں ہیں لیکن سنو! تم ہمارے قانون کی خلاف ورزی کر کے بچ نہیں سکتے، ہاں البتہ اگر غلطی کی اصلاح کر لی جائے تو اس غلطی کی وجہ سے پیدا ہونے والی خرابیوں میں سے بھی اکثر کی تلافی ہو جاتی ہے، پھر کہا کہ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (42:31) جس قانون کی خلاف ورزی سے تمہیں کوئی مصیبت آئی اسی کے قانون کے مطابق پھر عمل کرو گے تو مصیبت ختم ہوگی، اس سے سرکشی برتتے چلے جاؤ اور سمجھو کہ وہ مصیبت ٹل جائے گی، یہ نہیں ہو سکے گا۔ یاد رکھو! تمہارے لیے اُس کے قانون کی پشت پناہی کے علاوہ، کسی کی کارسازی نہ کام آ سکتی ہے، نہ یاوری اور مددگاری بن سکتی ہے۔

خدا کی ذات کسی کو مصیبتوں میں مبتلا نہیں کرتی بلکہ وہ ان کا ازالہ کرتی ہے

عزیزانِ من! بیماری کا جو سبب ہے، پہلے اس سبب کو دور کرنا پڑے گا۔ اگر اس کو تو اسی طرح سے جاری رکھو اور سمجھو کہ بیماری سے آرام ہو جائے گا، یہ نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ تم ہمارے قانون کے ساتھ مقابلہ کرتے ہو، اس چیز کو یاد رکھو! کہ تم اسے شکست نہیں دے سکتے، صرف اس مصیبت کا ازالہ ہے، اس کا علاج ہے اور وہ بھی قانونِ خداوندی کی رو سے ہی ہوگا، اس کے سوا کوئی دوسرا اس کے اثرات کو دور کرنے والا نہیں ہے۔ وہ ان مصیبتوں کو دور کرنے والا ہے لیکن سنو! مصیبتیں لانے والا بھی کوئی اور نہیں ہے، تم اپنے ہاتھوں سے لاتے ہو اور اس کے قانون کے مطابق عمل کرنے سے وہ دور ہوتی ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ہماری وہ رحمتیں ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم تو انسانوں کے اوپر ان کا سامانِ رزق بہم پہنچاتے ہیں، ان کو رعایتیں دیتے ہیں۔ ان کے لیے یہاں کچھ دیا ہوا ہے تو یہ بات نہیں ہے کہ خدا نے ہمیں پیدا کیوں کر دیا، پیدا کر دیا تو پھر یہ مصیبتیں کیسے پیدا کر دیں؟ ہر ایک روتا ہے۔ اب چیز یہ ہے کہ یہ سارا کچھ تمہارا اپنا لایا ہوا ہوتا ہے، اس لیے روتے ہو۔

اجتماعی مصیبتوں کی وجہ جواز اجتماعی نظام کی خرابی ہوتی ہے اور اللہ کا قانون ان سے بچاتا ہے

یہ جو اجتماعی مصیبتیں ہیں' اس میں فرد واقعی صحیح روتا ہے۔ یہ مصیبتیں اس بیچارے کی تنہا اپنی لائی ہوئی نہیں ہوتیں' غلط نظام کی لائی ہوئی ہوتی ہیں۔ خدا نے کہا ہے کہ ہم نے تو تمہارا غلط نظام نہیں بنایا' ہم نے تو تمہیں سامانِ نشو ونما اتنا فراوانی سے دیا کہ صحیح نظام کی رو سے اگر تم اس کی تقسیم کرو تو کسی پہ کوئی مصیبت آئے ہی نہیں۔ ہمارے دینے کی طرف دیکھو۔ کہا کہ وَمِنۡ اٰیٰتِهِ الۡجَوَارِ فِی الۡبَحۡرِ کَالۡاَعۡلَامِ ۝ اِنۡ یَّشَاۡ یُسۡکِنِ الرِّیۡحَ فَیَظۡلَلۡنَ رَوَاکِدَ عَلٰی ظَهۡرِهٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ (42:32-33) زمین اور خشکی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ تو الگ رہا' یہ سمندر نظر آتا ہے کہ تلاطم خیزیاں' طوفان آمیزیاں' تباہ ہی کرنے کے لیے ہیں۔ کہتا ہے کہ ہم نے اسی سمندر میں ایک قانون بنایا اور وہ قانون یہ تھا کہ ہم نے سمندر میں ہوائیں چلائیں' اس زمانے میں بادبانوں کی کشتیاں ہوا کرتی ہیں اب بھی ہیں۔ یہ ان سے چلتی ہیں۔

رزق کی باہم رسائی کے لیے سمندروں میں تیز ہواؤں کے گزرنے کا انتظام اور کشتیوں کی مثال سے قانونِ خداوندی کی وضاحت

ہمارے ہاں بادبانی کشتیاں بہت ہوتی ہیں' اس زمانے میں تو اسٹیم کی یہ کشتیاں اور جہاز ابھی نکلے نہیں تھے۔ کہنے لگے کہ ذرا سوچو تو سہی' یہ جو تمہاری اتنی بڑی کشتیاں پہاڑوں کی طرح سمندر پہ چلتی ہیں' پہلی چیز تو یہ ہے کہ سمندر میں اگر تم سوئی ڈال دو تو وہ نیچے ڈوب جاتی ہے مگر یہ اتنی بڑی کشتی' اتنا بڑا بوجھ' اتنی سواریاں لے کر سطح سمندر پہ بطخ کی طرح تیرتی رہتی ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ ہمارا قانون ہے۔ میں پھر عرض کر دوں تو بات آگے بڑھ جائے گی۔ یہ جو قانون ہے کہ اتنے حجم کی چیز سے جو پانی کا خلا ہوا اگر اس ہٹے ہوئے پانی کا وزن اس چیز کے وزن میں کمی کے برابر ہو تو وہ چیز تیرتی ہے اور قانون کی خلاف ورزی یہ ہے کہ اگر اس سے ایک بوری بھی زیادہ اس میں لاد لے تو ڈوب جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے یہ پہلا قانون ہے کہ اتنے بوجھ کو لے کر کشتی تیرتی رہتی ہے [1] اور ہمارا دوسرا قانون ہے کہ ہوائیں چلتی رہیں۔ عجیب بات ہے۔ کہا کہ ہوا تو ہوتی ہے' زندگی کے لیے یہ سانس نہایت لازم ہے لیکن کشتیوں کے لیے ہمارا قانون ہے کہ ہوائیں چلتی رہیں۔ تمہارا اپنی نقل و حرکت کا سارا دار و مدار سامانِ رزق کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا ہے۔ اس کے جو تمہارے

---

[1] یہ اصولِ آرشمیدس یہ ہے:

The principle that the apparent loss in the weight of a body immersed in a fluid is equal to the weight of the fluid displaced.

ہاں ذرائع ہیں' اس زمانے میں زیادہ ذرائع یہی تھے۔ کہتا ہے کہ اس کا دارومدار اس پہ ہے کہ ہم ہوائیں چلاتے رہتے ہیں اور اگر ہواؤں کو ساکن کر دیا جائے تو تمہاری کشتی کیسے چلے' لیکن ان قوانین سے فائدہ اٹھانے کے لیے دو شرطیں ہیں: **لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ** (42:33)۔ اب ہمارے ہاں تو ترجمے ہو گئے کہ اس بات میں بھی نشانیاں ہیں اس کی جو صبر سے کام لے' شکر سے کام لے۔ ''تے صبر شکر تے تہانوں پتہ اے تہاڈے کس معنی اچ استعمال ہوندا اے۔''[1]

جب کسی کے اوپر مصیبت آجاتی ہے تو آپ کو پتہ ہے کہ اس مصیبت کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ اور سنگین ترین مصیبت کیا ہوتی ہے؟ جب کسی مظلوم عورت کے ہاں دو تین بیٹیاں پیدا ہوں تو جونہی تیسری یا چوتھی لڑکی آئی' تعزیت کرنے والیاں آپہنچیں۔ وہ بیچاری بیوی بھی رو رہی ہوتی ہے' یہ بھی رو رہی ہوتی ہیں اور کہتی یہ ہیں کہ بہن صبر کرو' شکر کرو' یعنی اس کا تو علاج ہی کوئی نہیں ہے' یہ ہیں ترجمے۔

کہا یہ ہے کہ کشتیاں ہیں' جو ہواؤں سے چل رہی ہیں۔ یہ ہمارا قانون ہے اور اس میں کوئی کھڑا ہو کر سوچتا نہیں اور یہ کہ اس میں نشانیاں ہیں ان کے لیے جو صبر شکر کر کے بیٹھ جائیں۔ ''صبر'' ہی نہیں بلکہ ''صبار'' کہا ہے اس کا عام ترجمہ ہی صبر شکر ہے۔ آپ نے ''صبر'' کا مفہوم لینا ہے تو اس کے معنی ہوتا ہے ''وہ شے جو مستقل طور پہ کسی توازن کو قائم رکھے۔'' جو کشتی ڈولتی ہے اس کے اندر عدمِ توازن ہوتا ہے' اس کے اندر ایک طرف جہاں وہ بوجھ کم ہوتا ہے' کشتی والے اتنا بڑا سا پتھر رکھ دیتے ہیں اس پتھر کو الصابورۃ کہتے ہیں' کشتی کو صبر دلا دینے والا'' یہ عرب بلا کی قوم تھی۔ کہا کہ اپنا توازن نہ کھو' کشتی اگر طبعی طور پہ لیتے ہیں تو الصابورہ وہ پتھر ہے۔ یہی خطرہ ہے کہ یہ اس لیے کشتی ڈگمگائے گی یا ڈگمگاتی ہے کہ اس کا توازن نہیں رہتا۔ توازن صحیح رکھنے کے لیے الصابورۃ ساتھ رکھو۔ اور انسان کے لیے کہا کہ اپنا توازن بھی نہ کھو بیٹھو' استقامت سے اپنا توازن برقرار رکھو۔ شکور کہتے ہیں ''قانون کے مطابق ایسے کام جس سے محنت بھرپور نتائج پیدا کرے'' یہاں کہا کہ استقامت سے اس قانون کے اوپر چلتے چلے جاؤ' اس کے مطابق کچھ کرتے چلے جاؤ' تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کرتی چلی جائیں گی۔

پہلے تو یہ کہا تھا کہ اگر ہم ہواؤں کو ساکن کر دیں تو یہ کشتیاں کھڑی رہ جائیں' آگے اور کہا کہ **اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ** (42:34) ہوائیں نہ چلیں کشتیاں ساکن ہی ہو جائیں تم کشتیوں کو جو اتنا over load (بہت بوجھل) کر دیتے ہو' کشتیوں کے تختے مضبوط نہیں ہوتے' ان میں چھید ہی ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ کچھ جو تم کرتے ہو اگر اسی پہ چھوڑ دیا جائے تو کشتیاں تو ڈوب جائیں۔ ہم نے اس کے لیے قانون دیا ہے کہ اس قسم کی کشتی بناؤ' اس انداز سے اس کو چلاؤ' استقامت سے ان کا توازن قائم رکھو' قانون کے مطابق محنت کرو' اس سے بھرپور نتائج پیدا ہوں گے ورنہ تمہاری چھوٹی موٹی کوتاہیوں کی وجہ سے تو ڈوب ہی جائیں: **وَيَعْفُ عَنْ**

---

[1] صبر شکر کا تو آپ کو معلوم ہے کہ کن معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

كَثِيْرٍ (42:34) ہم نے اس کے لیے بھی پھر کچھ علاج بتا دیا ہوا ہے کہ چھوٹی موٹی ایسی چیزیں ہوں تو وہ اس طرح سے ٹھیک ہو جایا کرتی ہیں۔ یہ فطرت کے قواعد ہیں جن کے متعلق یہ کچھ ہوتا ہے۔ یہ کشتی بان جو اس کے ماہر ہیں' وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کا چھوٹا موٹا جو اس میں نقص پیدا ہوتا' اس کو کیسے رفع کیا کرتے ہیں۔ پھر کہا کہ وَّيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ (42:35) ہم جانتے ہیں' ہم ان قوانین کی باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ لوگ ہیں جو اس میں جھگڑا کرتے ہیں کہ نہیں صاحب! آدمی سب کچھ کر سکتا ہے' نہیں صاحب! اس سے بھی کچھ نہیں بنتا۔ دونوں قسم کا مجادلہ ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ان قوانین کی کچھ خلاف ورزی کر کے دیکھ لیں اور پھر دیکھیں کہ ان کو کہیں پناہ مل سکتی ہے؟ کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (42:36)۔ یہ سارا کچھ گنا دیا: زمین سے پیدا ہونے والے رزق کی فراوانی' مواصلات کے لیے قوانینِ فطرت' یہ سارے ذرائع اور اسباب' یہ سب کچھ گنا دیا۔

زندگی دو مختلف پہلوؤں سے عبارت ہے: ایک کا تعلق طبعی قوانین سے ہے اور دوسری کا تعلق اقدار سے

کہا کہ سن لو! اس طبعی کائنات Physical Universe میں' طبعی قوانین Physical Laws تمہاری طبعی زندگی Physical Life کے لیے ہیں۔ یہ ہے لیکن انسان صرف طبعی زندگی سے ہی عبارت نہیں ہے' اس زندگی کے بعد بھی اس کی زندگی آگے چلنی ہے' ہمارے ہاں ان قوانین کے ساتھ وہ اقدار بھی دی گئی ہے۔ اب دیکھیے میں نے یہاں قانون کا لفظ استعمال نہیں کیا' دونوں میں فرق کر دیں گے تو بات سمجھ میں آ جائے گی۔ ان کو Laws of Nature (قوانین فطرت) کہہ دیجئے' وہ انسان کی زندگی جو آگے چلنی ہے اس کے لیے جو قوانین ہیں ان کو Values (اقدار) کہا جاتا ہے' ہیں وہ بھی قوانین ہی۔ کہا کہ یہ یاد رکھو! یہ ہے قرآن کا اعجاز۔ کہتا ہوا چلا آ رہا ہے کہ کس طرح رزق کی فراوانیاں ہوتی ہیں' کیسے قوانین محکم ہیں۔ درمیان میں لا رہا ہے کہ سن لو! یہ سارا کچھ تمہاری طبعی زندگی کے متعلق ہے اور زندگی صرف طبعی ہی نہیں ہے' آگے چلنے والی بھی چیز ہے' اس کے لیے ہم نے جو کچھ دیا ہے اس میں "اٰمنوا" پہلی چیز ہے کہ ان کی صداقت پر یقین رکھو اور اس بات کا اور بھروسہ رکھو کہ وہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ واقعی ایسا ہوگا۔ طبعی زندگی کے متعلق تو اسی وقت پتہ چل جاتا ہے کہ اس قانون کی خلاف ورزی سے کیا نقصان ہوا' اس کے مطابق پھر عمل کرنے سے کیا فائدہ ہو گیا۔ اقدار کے متعلق اتنی جلدی پتہ نہیں چلتا کہ سچ بولنے سے میرا کیا فائدہ ہوا' اس کا نقصان تو شام تک پتہ چل جاتا ہے' فائدے کا اتنی جلدی پتہ نہیں چلتا اور یہی وجہ ہے کہ آدمی دو چار دن یہ کچھ کر کے پھر چھوڑ دیتا ہے کہ نہیں صاحب! اووی کر دیکھیا ہیگا سی [1]

---

[1] وہ کچھ بھی کر دیکھا۔

اس دور میں کچھ نہیں بنتا دیانتداری سے صاحب! ہم نے دیکھا ہے دکان چلا کے آٹھویں دن ٹھپ ہو کر رہ گئی تھی۔

توکل کا قرآنی مفہوم اور لغزش اور جرائم میں فرق

کہا کہ یہ مقام ایسا ہے جس میں اس ایمان کے ساتھ ایک اور چیز کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ جس طرح طبعی زندگی میں اس کا ہر قانون وہ نتیجہ پیدا کرتا ہے جو اس نے بتایا ہے' اُسی طرح یہ value (اقدار) بھی وہ نتیجہ یقیناً پیدا کرتی ہیں جو اس نے بتایا ہے۔ اس کو ''توکل'' کہتے ہیں۔ اپنے پیراشوٹ کی چھتری پر یہ یقین ہے کہ میں نے جب دس ہزار فٹ کی بلندی سے بھی کھولا' اگر چھلانگ لگا دوں گا تو نیچے حفاظت سے لے جائے گی۔ اسے توکل کہتے ہیں' اس کے لیے وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ (42:37) پہلی چیز یہ ہے جو کہا ہے کہ لغزشیں اور جرائم ہیں' ان میں قرآن کریم کچھ فرق کرتا ہے۔ جرائم وہ ہیں جو اہم بنیادی قانون ہیں' ان کی کھلی خلاف ورزی ہے اور یہ باقی چیزیں ہیں جن کے لیے میں وہ اللَّمَمَ (53:33) کا لفظ ہی آپ کے سامنے کیوں نہ لے آؤں۔ یہاں کہا ہے کہ وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ (42:37)۔ یہ تو دونوں الفاظ یہاں بھی ہیں اور وہاں بھی ہیں اور یہاں اس پہ اِلَّا اللَّمَمَ (53:32) کا اضافہ ہے۔ ''لَمَمَ'' کا مفہوم تو کچھ معیوب سے ہے جس سے ملامت ہوتی ہو۔ انسان کی جرم کی خلاف ورزی سے صرف ملامت نہیں ہوتی۔ اس کے نتائج و عواقب' تو بڑے سنگین ہوتے ہیں۔ بعض چھوٹی موٹی سی یونہی غلطیاں ہوتی ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ جو قابلِ ملامت ہیں تو جو مومن ہیں' وہ کبائر الاثم اور فواحش سے تو بچتے ہیں لیکن انسان ہونے کی جہت سے کبھی کبھی کوئی اجتہادی غلطی یا تدبیری غلطی' کچھ اس قسم کی لغزش ہو جاتی ہے' وہ قابلِ ملامت ہوتی ہیں کہ اچھا نہیں کیا بھئی! اس نے کہا ہے کہ ان کی تلافی بھی آسانی سے ہو جاتی ہے۔

قابلِ ملامت افعال پر انسانی ردعمل اور قرآنی راہنمائی

اس معاشرے کے اندر بڑی چیز یہ ہے کہ یہ جو اس قسم کی اللَّمَمَ کی چیز کسی سے ہوتی ہے تو اس سے دوسرے کو غصہ آتا ہے۔ اندازہ لگائیے کہ قرآن کریم کہاں تک پہنچتا ہے۔ عزیزانِ من! کہا ہے کہ اس کی اس قابلِ ملامت لغزش سے ہمیں غصہ نہیں آیا اور ہم نے کہا ہے کہ کوئی بات نہیں۔ اسی پر بات اقبالؒ [1] (1877-1938ء) کے الفاظ میں تمہاری پیشانی پہ جو قطرے ہیں اگر یہ ندامت کے' عرقِ انفعال کے ہیں تو ہم ان کو موتی سمجھ کر چن لیا کرتے ہیں۔ ہم تو یہ کرتے ہیں' تم ان کے خلاف غصے میں نہ آؤ۔ میں نے کہا تھا کہ مجرم سے نفرت نہیں ہے'

---

[1] موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

یہ اسی جرم کے خلاف نفرت ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ **وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ** ❶ (42:37) تمہارے غصے سے اس کو نقصان پہنچنا تھا۔ "یغفرون" کیا لفظ ہے! یہاں تو پھر یہی بات ہے کہ غصہ آتا ہے' تو وہ ان کو بخش دیتے ہیں' معاف کر دیتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر یہ وہی تذلیل انسانیت ہے' وہ احسان رکھے گا۔ جب معاف کرے گا تو اسے طیش نہیں آئے گا۔ اگر معاف نہیں کرے گا تو تمہارے اس غصے سے اس کو نقصان پہنچنا تھا' وہ نقصان اسے پہنچے گا۔ اس لیے کہا کہ اس سے درگزر کر کے اُسے تم اس نقصان سے محفوظ رکھو' نہ گالی دو' نہ طمانچہ مارو' نہ یہ کچھ کرو۔ اپنے اندر یہ چیز پیدا کرو کہ غصے کے وقت میں کیا کیا جائے' دوسری جگہ کہا ہے کہ وہ **وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ** ❷ (3:134) ہیں۔ اب میں اگر اس وقت اس کی تشریح میں آ گیا تو پھر اس کے لیے ایک درس چاہیے گا۔ وہ بڑی Psychological (نفسیاتی) حقیقت ہے جو قرآن کریم کہہ گیا ہے۔ فرائڈ ❸ اپنے ہاں اس کے اوپر بحث کرتا ہے۔ کیا بات ہے ان لوگوں کی! یہ لوگ بڑی حد تک خالص فکر کی روشنی میں چلتے ہیں۔ وہ جو قرآن کریم کی تشبیہ ہے کہ جب یہ روشنی دیکھتے ہیں' تو اس میں چند قدم چلتے ہیں اور اس کے بعد اندھیرا ہو جاتا ہے' یہ پھر پھسل کر رہ جاتے ہیں۔ یہ خالی عقل کی راہنمائی میں چند قدم تو چلتے ہیں۔ (2:17) یہ سائیکولوجسٹ (ماہرین نفسیات) اس چیز پہ پہنچے تھے کہ غصہ کیوں آتا ہے' اس کا انسان پہ کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ غصے کو پی جاؤ اور قرآن کریم **وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ** ❷ (3:134) جو الفاظ آیا ہے' جس کا ترجمہ غصے کو دبانے والا کیا جاتا ہے' یہ بڑا غلط ترجمہ ہی نہیں ہے' بلکہ بڑا نقصان دہ ترجمہ ہے اور اس کی نقصان دہی ہمارے زمانے میں سائیکولوجسٹ (ماہرین نفسیات) نے بتائی کہ جو Repression (جبر' دباؤ) ہے' یہ Suppression (بیخ کنی) سے بھی آگے ہے۔ وہ انسان کے لیے بہت ہی زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے ❹ بہرحال میں پھر بتاؤں گا کہ قرآن کریم نے غصے کے عالم میں کیا کہا ہے کہ کیا کیا کرو۔ یہاں یہ کہا ہے کہ دوسرے کی ذرا سی لغزش سے تمہیں غصہ آیا ہے تو اس غصے سے کسی کو نقصان نہ پہنچاؤ۔

---

❶ جب آپس میں کسی سے سہواً ایسی بات ہو جائے جس سے طبیعت میں طیش آ جائے' تو اس شخص سے درگزر کر دیتے ہیں۔ اُسے نقصان نہیں پہنچاتے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1136)۔

❷ اپنی زائد قوت اور حرارت کو (خواہ مخواہ مشتعل ہو کر تباہ و برباد کر دینے کے بجائے) تعمیری کاموں کی طرف منتقل (Sublimate) کر دیتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 154)۔

❸ Freud, Sigmund (1856-1930 AD)' تحلیلِ نفسی نظریہ کا اطالوی موجد۔

❹ اسی موضوع سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے یہ کتاب پُر از معلومات ہے:

Baldwin, Alfred L. (1967), Theories of Child Development. London: John Wiley & Sons, Inc.

لغزشوں سے بچنے کا طریقِ عمل

ہم نے کہا کہ لغزشوں سے ہم بھی درگزر کر دیتے ہیں، تم بھی اس کو اس نقصان سے بچاؤ جو اس طرح سے ہونا تھا اور پھر مومنین کا یہ جو انہوں نے نظام قائم کرنا ہے، اس میں یہ تدبیری غلطیاں، یہ چھوٹے موٹے سہو و نسیان کی باتیں ہیں، اس میں یہ ہے کہ ان سے بھی کیسے بچا جا سکتا ہے۔ اب نظام کی بات آئی۔ کہا کہ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ (42:38)۔ مومنین کا شعار، عزیزانِ من! اس آیت کے اندر آیا ہے اور پھر یہ سیاسی اعتبار سے بڑی بنیادی آیت ہے۔ اس میں جو پہلی چیز ہے، وہ یہ ہے کہ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ (42:38)۔ شرط یہ ہے کہ جب قوانینِ خداوندی کی طرف آواز دی جائے تو خدا کے قوانین کی طرف لبیک کہو۔ قرآن کریم کی طرف آواز دی جائے تو اس کی طرف لبیک کہو۔ پھر کہا کہ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (42:38)۔ اس پہ بھی میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا، بار ہا بار یہ عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی نظام میں نماز کے اجتماعات اپنے مقام پہ ہیں، اہم ہیں، ضروری ہیں لیکن وہ اقامتِ صلوٰۃ، یہ جسے آپ پنج وقتہ نماز کہتے ہیں، یہی اجتماع نہیں ہے، پورے کے پورے اسلامی نظام کے قائم کرنے کے لیے بھی قرآن کریم کی یہ اصطلاح ہے۔ چلیے! آگے چلیے جو بات میں کہہ رہا ہوں کہ یہ جو لغزشیں ہیں ان سے کیسے بچا جائے کہ چھوٹی موٹی باتیں کسی طرح سے بھی نہ ہوں یعنی جسے Humanly possible (انسانی امکان) کہتے ہیں، جو بات انسانی طور پہ ممکن ہے، قرآن کریم وہ کہتا ہے۔ اس کا وہ طریقہ کیا ہے؟ کہا کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38) تنہا اکیلے ہی فیصلہ نہ کر لیا کرو، ان کا نظام باہمی مشاورت پر قائم ہوگا۔ اندازہ لگایئے چودہ سو سال پہلے کا دنیا میں سیاسی نظام کے لیے مشاورت کا تصور ہی نہیں تھا۔ ملوکیت چلی آ رہی تھی۔ ملوکیت میں مشاورت کے کیا معنی؟ اس زمانے میں یہ چیز اور پھر مشاورت دو متضاد تصورات تھے۔ آپ کو اس کی اہمیت معلوم ہے۔

حضورِ نبی اکرم ﷺ اس اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کے پہلے سربراہ ہیں، مہبطِ وحی ہیں، ان پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوتی تھی، حضور ﷺ اس مملکت کے سربراہ تھے۔ ہم اگر انفرادی طور پہ یا ذاتی طور پہ سوچتے، اگر قرآن کریم کی یہ بات نہ ہوتی، تو ہم یقیناً اس چیز کو اپنے لیے جزوِ ایمان بنا لیتے کہ حضور ﷺ کا جو ہر حکم تھا، ان مومنین کے لیے وہ فریضہ تھا۔ سوال ہی نہیں تھا کہ اس کے متعلق کچھ سوچتے، کوئی بات کرتے، ٹھیک ہے وہ حکم دیتے تھے اور یہ اس کی اطاعت کرتے، لیکن قرآن کریم نے یہ بات نبی اکرمؐ سے ہی کہی کہ وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ (3:159) رسول اللہؐ پہ حکم ہے کہ ان معاملات میں اپنے ان رفقا سے مشورہ کیا کرو اور پھر تربیتِ نبوی بھی تھی۔ عزیزانِ من! وہ تو رسول ہیں، نبی ہیں، جن پر ایمان لا کر ایک شخص مسلمان ہوتا ہے، جن کے متعلق قرآن کریم میں یہ ہے کہ مومن کا شعار یہ ہے کہ جب رسول کسی معاملے کا کوئی فیصلہ کر دے تو یہی نہیں کہ وہ اس کی بادلِ ناخواستہ اطاعت کریں بلکہ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِىْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا (4:65)

اپنے دل کی گہرائیوں میں اس کے خلاف گرانی بھی محسوس نہ کریں۔ مومن یہ ہیں۔ ان کی تو یہ کیفیت تھی کہ حضور ﷺ فیصلہ کر دیتے۔ یہاں تو حضور ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ ان لوگوں سے مشورہ کیا کرو۔ وہ جو کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے سوا بھی نبی اکرم ﷺ جو کچھ ارشاد فرماتے تھے' کہتے تھے' وہ بھی وحی ہوتا تھا' سوچیے تو سہی کہ وہ بھی وحی تھا تو یہ مشورہ کس بات میں کرتے تھے۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ ان سے مشورہ کیا کرو۔ یہ ہے وہ طریقہ کہ جو چھوٹی موٹی اجتہادی غلطیاں ہیں' تدبیری سہو رہ جاتے ہیں' تو باہمی مشورے سے اس میں سے بہت سوں کا ازالہ اسی وقت ہو جاتا ہے اس لیے کہا کہ **وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** (42:38)۔ جسے آپ اسلامی نظام کہیں گے اس کی بنیاد یہ ہے کہ وہ امت کے مشورے کے مطابق قائم ہوگی اور ہر معاملے میں امت کا مشورہ لیا جائے گا اور اس میں جب رسول اللہ ﷺ کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا گیا تو اس سے کوئی ہستی بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔ پہلی بنیادی شرط یہ ہے۔

اب پھر وہی دکھتی ہوئی رگ آئی کہ وہ جو سب کچھ سمیٹ کر رکھ لینے والی بات ہے وہ بالکل نہیں ہوگی۔ کہا کہ **وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ** (42:38) ہم نے ان کو جو کچھ دیا ہے وہ اسے سمیٹ کر نہیں بیٹھ جاتے' اسے کھلا رکھتے ہیں کہ جس کی ضرورت ہے وہ اس ضرورت کو پورا کر لے لے جائے۔ کہا کہ یہ ہے نظام۔ آگے اور بھی اس نظام کی شرطیں دی ہیں لیکن یہ بنیاد ہے کہ قوانینِ خداوندی کی طرف آواز دی جائے تو وہ لبیک کہے' نظام قائم کرے جس میں ہر فرد ان قوانین کی اطاعت کرتا چلا جائے اور یہ نظام باہمی مشورے سے قائم کرے' رسول ﷺ کو بھی حکم ہے اور اس کے بعد امت کو بھی یہ حکم ہے اور جو کچھ اس کو سامانِ رزق ملتا ہے اس کو سمیٹ کر نہ بیٹھ جائے' وہ ضرورت مندوں کے لیے اسے کھلا رکھے۔ اس کے بعد کہا کہ پھر لغزش کا بہت کم امکان رہ جاتا ہے' اس کو کھلا رکھنے سے نہ تو اس سے ایسی لغزش ہوتی ہے اور نہ انفرادی سہو ہوتا ہے۔ وہ جو مفاد پرستی اور خودغرضی کی بنا پہ ہوتی ہے' وہ اس سے نہیں ہوتی۔ کہا یہ ہے کہ بنیادی نظام کی خصوصیات یہ ہیں جو ہم نے ان کے لیے بیان کیں۔ یہ کرو گے تو پھر مصیبتیں نہیں آئیں گی۔

عزیزانِ من! سورۃ الشوریٰ کی آیت 38 تک ہم آ گئے۔ 39 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

چھٹا باب: سورۃ الشوریٰ (آیات 39 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1981ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الشوریٰ کی آیت 39 سے ہو رہا ہے:

(42:39)۔

صفاتِ خداوندی انسانی ذات کے لیے حدِّ بشریت کے اندر ایک معیار مقرر کرتی ہیں

مومنین کی خصوصیات کیا ہیں؟ ان کی خودی کی نمود کس طرح ہو؟ یہ چیزیں بیان ہو رہی تھیں۔ یاد رہے کہ یہ جو میں نے سابقہ درس میں آخری بات کہی تھی' وہ ذرا سوچ کی متقاضی ہے۔ یہی چیز ہے جس سے انسان کے اندر کی دنیا میں انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ یہ قرآنِ کریم کی اقدار کی رو سے ہے۔ جس شکل میں' جس موقع پہ اس کی نمود ہوتی ہے وہ تبدیلی چھوٹے پیمانے پر خدا کی صفات کا ہی ایک عکس ہوتی ہے۔ اس نے اسے صبغت اللہ کہا ہے یعنی خدا کے رنگ میں رنگے جانا۔ گو کہ اصل میں وہ بات دوسری طرف چلی جائے گی تاہم جسے آپ Self یا Personality یا ذات یا خودی کہتے ہیں' یہ اس کی نمود ہوتی ہے۔ خدا کی جو ذات ہے وہ ہر اعتبار سے مکمل ترین' اکمل ترین ہے۔ اس کے لیے لفظ Developed (نشو ونما یافتہ) بھی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تو انسان ہی کے لیے کہا جا سکتا ہے۔ خدا کی ذات ایک مکمل ترین ذات ہے۔ اس کے متعلق اس کی صفات ہیں جو قرآن حمید میں بیان ہوئی ہیں۔ اس کے لیے Development (نشو ونما) کا لفظ بھی کچھ اچھا نہیں ہے' وہ اصل میں اس کی اس ذات کے مختلف گوشوں کا عکس ہے۔ اگر آپ قرآن حمید کا اس زاویئے سے مطالعہ کریں تو بڑی عجیب چیزیں سامنے آئیں گی۔ کہ قرآنی آیات کے Context (سیاق) میں' جہاں خدا کی کسی خاص صفت کا ذکر کیا گیا ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے لیے خدا کی وہ صفت کس طرح مفید ہو سکتی ہے کہ خدا ایسا ہے۔

قرآن مجید کی ہر بات ہمارے لیے ہے' خدا نے اپنے متعلق بھی جو کچھ کہا ہے وہ ہمارے ہی لیے ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر اس قسم کا کوئی موقع آئے تو اس میں تمہاری اس قسم کی جو خصوصیت ہے' اس کی نمود ہونی چاہیئے' تمہارا Reaction (ردِ عمل) اس قسم کا ہونا چاہیے۔ مومن وہ ہے جس کی اپنی ذات (Self) کی نشو ونما اقدارِ خداوندی کے تابع ہوتی ہے۔ دراصل یہ نشو ونما اقدارِ خداوندی کے ہی اتباع سے ہے۔ وہ نشو ونما جو ہو گئی ہو تو وہ اس حد کے اندر رہتے ہوئے ہوتی ہے جسے بشریت کی حد کہتے ہیں۔ وہ خدا کی اس خاص صفت کا ایک عکس ہوتی ہے اور وہ without نہیں ہوتی within (زور دروں) ہوتی ہے یعنی یہ نہیں ہے کہ وہ Laboured (آورد) ہوتی ہے۔ میں یہ لفظ انگریزی کا ہی بول رہا ہوں کہ اس سے یہ بات زیادہ واضح طور پہ سمجھ میں آتی ہے یعنی وہ آورد نہیں ہوتی۔ یہ شاعری کی اصطلاح ہے۔ یہ ہمارے لیے بتکلف نہیں ہوتی۔ وہ یہ نہیں ہوتی کہ انسان اس وقت اپنے آپ پہ کچھ تھوڑا سا جبر کر کے کہتا ہے کہ مجھے اس قسم کا ہونا چاہیے۔ یہ تو مومن کی صفت نہیں ہے۔ یہ تو وہ ہے ''جس میں یہ ہو کہ مجھے ایسا ہونا چاہیے۔ اس کی صفت تو یہ ہے کہ وہ اس قسم کا ہو'':

گوہر میں آبِ گوہر کے سوا کچھ اور نہیں

نشوونمایافتہ ذات کا ردِعمل صفاتِ خداوندی کا عکس ہوگا: یہ ہے مومن کی صفات کا معیار

اگر انسانی ذات کی نشوونما ہوئی ہے یا جس حد تک بھی ہوئی ہے تو خارجی واقعات میں اس سے جو اس کا Reaction (ردِعمل) ہوگا وہ وہی ہوگا جو قرآن حمید میں ایسے واقعات پر خدا کی کسی صفت کا عکس بتایا گیا ہے۔ یہ ہے اصل چیز کہ ہمارا تعلق خدا سے کیا ہے۔ ہمارا خدا سے اتنا تعلق ہی ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک ماڈل ہے' ہمارے لیے Perfection (تکمیل) کا ایک اسٹینڈرڈ (معیار) ہے۔ ایسے مواقع پہ ہمارے اندر سے یہ Reaction (ردِعمل) از خود برآمد ہونا چاہیے۔ مومن ہوتے ہی ایسے ہیں' سورج ہوتا ہی روشن ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ نمودار ہوتا ہے تو پھر وہ ادھر اُدھر ذرا جھانک کر فیصلہ کرتا ہے کہ اچھا! مجھے حرارت دینی چاہیے یا مجھے روشنی دینی چاہیے یا مجھے حرارت کی بجائے ٹھنڈک دینی چاہیے۔ یہ سوال ہی نہیں ہے۔ وہ ہوتا ہی ایسا ہے۔ یہ جو مومن کی جنہیں آپ صفات کہتے ہیں' قرآن میں گنائی گئی ہیں' اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسے موقع پر مومن ہوتا ہی ایسا ہے۔ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ ❶ (42:37)۔ یہ سابقہ درس میں آ چکا ہے۔ ''کبٰئر الاثم'' وہ ہیں جو بڑے بڑے جرائم ہوتے ہیں اور فواحش' ہر لغوی' ہر بے حیائی کی بات ہے۔ یہ بڑا ہی جامع لفظ ہے' بلکہ عربوں کے ہاں تو وہ سب سے بڑی قابلِ مذمت' جسے آپ بے حیائی اور بے غیرتی کی بات کہتے ہیں' وہ بخل ہوتا تھا۔ ان کے ہاں جو کشادِ قلب تھا' جو مہمان نوازی تھی' جو تواضع تھی' وہ بڑی بلند صفت تھی۔ اس کے مقابلے میں بخل یا تنگ نظری کی جو بات تھی' وہ بہت معیوب چیز تھی۔ اس کے لیے یہ لفظ ''فحشا'' آتا تھا۔ ہر وہ چیز جو قابلِ مذمت ہو اور جس میں تنگ نظری پائی جائے خواہ کسی اعتبار سے بھی ہو یا بے حیائی کی بات کسی اعتبار سے بھی ہو' وہ اس کو فواحش کہیں گے۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ (42:37)۔ میں پچھلی دو آیتوں کو دہرا رہا ہوں کہ اگر کسی بات کے اوپر ان کو غصہ بھی آتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ دوسرے کو نقصان پہنچائیں' وہ کوشش کرتے ہیں کہ اس سے اس کی حفاظت ہو جائے۔ یہ بھی بڑی چیز ہے۔ یہ حفاظت دو طرح سے ہے۔ ایک یہ کہ اس کے ہاتھوں سے بھی اس کو نقصان نہ پہنچے اور دوسرا یہ کہ وہ جو اپنی کسی غلطی کی وجہ سے غلط کام کر گیا ہے اس کی بھی اصلاح ہو جائے تاکہ خود اس کی ذات کو' خود اس کے ہاتھوں بھی' نقصان نہ پہنچے۔ کیا بات ہے! یہ ''غفرۃ'' کا ایک لفظ ہے جو قرآن مجید بول جاتا ہے۔ بیٹھ کر اس کی تشریح کرتے چلے جائیے اور یہ جو چیز تھی کہ یہ نہ کرے' وہ کرے تو کیا

---

❶ یہ وہ لوگ ہیں جو ایسے جرائم سے مجتنب رہتے ہیں جن سے انسانی ذات میں ضعف اور اضمحلال پیدا ہو جائے یا جن سے طبیعت میں بخل اور بے حیائی کے انسانیت سوز رجحانات پیدا ہو جائیں۔ (ہاں! کبھی بھول چوک سے کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہو جائے' جس پر وہ بعد میں خود نادم ہوں' تو اور بات ہے (4:31; 53:32))۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1136)۔

قرآن مجید نے بتایا ہے؟ کہا کہ **وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ** (42:38) جو کچھ وہاں سے حکم ملتا ہے' سامنے نظر آتا ہے' جب آواز دی جاتی ہے تو اس آواز پہ لبیک کہے۔ یہ ہوئے استجاب کے معنی۔ پھر فوراً ہی کہا کہ **وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ** [1] (42:38)۔ یہ میں نے آپ کو بتایا تھا اور اس نظام میں **وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** (42:38) باہمی مشاورت سے ان کے معاملات طے ہوں گے۔ یہ جو بنیادی چیز ہے وہ باہمی مشاورت سے طے کرنا ہے۔ یہ کوئی Political Practice (سیاسی مشق) نہیں ہے' کوئی سیاسی تدبیر نہیں ہے۔ وہ جہاں یہ مومنین کی صفات بیان کر رہا ہے اس میں یہ چیز ہے کہ ان کا شعار ہی یہ ہوگا' ان کا نظام ہی یہ ہوگا۔

مقامِ نبوت کے لیے بھی مشاورت کا حکم ہے

جیسا کہ پچھلی دفعہ [2] میں نے عرض کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو تو حکم دیا گیا تھا کہ **شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ** [3] (3:158)۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے اور جب ہم اس پہ غور کرتے ہیں کہ رسول ﷺ کا مقام' نبی اکرم ﷺ کا مقام' کس قدر بلند ہے اور جو آپ کے رفقا تھے جنہیں ہم صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کہتے ہیں' یہ جماعتِ مومنین ہے جو حضور ﷺ پر ایمان لا کر مومن ہوئی تھی' اس کے متعلق قرآن حمید میں یہ ہے کہ تیرا رب اس پہ گواہ ہے کہ وہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ اپنے ہر اختلافی معاملے میں تجھے حکم مقرر نہ کریں اور پھر تیرے فیصلے کے خلاف اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں۔ [4] یہ ہیں مومن' اور یہ ہے رسول کا مقام کہ ان کے فیصلے کے خلاف دل میں بھی گرانی محسوس نہ ہو۔ اس رسولؐ سے کہا جا رہا ہے کہ ان لوگوں سے مشورہ کیا کرو۔ کیا بات ہے! اور یہ بات بتا رہی ہے کہ حضور ﷺ کن معاملات میں مشورے کرتے تھے' اور کئی مقامات ایسے آئے ہیں جہاں مشورے میں آپ کے خیال یا رائے کے خلاف آراء دی گئیں اور انہیں حضور ﷺ نے اپنی رائے پہ ترجیح دیتے ہوئے قبول فرمایا۔ یہ شوریٰ ایسی چیز ہے' اور وہی اتباعِ سنت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو مشورے کا یہ حکم تھا اور کہا کہ ان کا تو یہ ہوگا ہی۔ اب دیکھیے کہ یہاں تو حکم کی ضرورت نہیں پڑی' مومن جیسے کہتے چلے آئے کہ مومن ہوتے ہی ایسے ہیں' اسی رو میں یہ بات کہی کہ وہ ہوتے ہی ایسے ہیں کہ وہ معاملات باہمی مشاورت سے طے کرتے ہیں۔

---

[1] نظامِ صلوٰۃ پر کاربند رہتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1136)۔

[2] اس کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا ''پانچواں باب۔''

[3] معاملات میں ان سے مشورہ کرو (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 162)۔

[4] یہ اس آیت کی طرف اشارہ ہے کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ (4:65) اے رسول! تم ان لوگوں کو ہماری طرف سے کہہ دو کہ خدا کا قانون اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے اختلافی معاملات میں تمہیں حکم (فیصلہ کرنے والا ثالث) نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم صادر کرو' اس کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم کر دیں کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی اُس کے خلاف گرانی اور کبیدگی محسوس نہ کریں (33:36 ;24:62)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔199)۔

لفظ ینفقون کا قرآنی مفہوم اور مروجہ تراجم

قرآن کریم کہتا ہے کہ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُوْنَ (42:38)۔ یہ مومنین کی بڑی بنیادی صفت ہے۔ یہ وہی آیت (2:3) ہے جو قرآن حمید شروع میں لایا ہے' اور دہرائے چلا جارہا ہے کہ جو کچھ بھی ہم ان کو سامانِ زیست دیتے ہیں' یہ اس میں سے بقدر اپنی ضروریات رکھ کر' باقی نوعِ انسان کی ربوبیت عامہ کے لیے کھلا رکھتے ہیں۔ اب آپ ہر جگہ دیکھیں گے کہ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم نے جو انہیں دیا ہے' وہ اسے خرچ کرتے ہیں۔ یہ کیا صفت ہے؟ وہ تو ہر شخص خرچ کرتا ہے۔ خرچ کے اندر اتنا ہی ہے کہ اسراف نہیں ہونا چاہیے' فضول خرچی نہیں لیکن یہ چیز بھی ہے کہ یہ مومن کی صفت ہے کہ وہ خرچ کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کون خرچ نہیں کرتا؟ یہ خصوصیت نہیں ہے۔ میں نے یہ کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی نہیں ہیں۔ جو معنی ہیں ان کا ترجمہ ہمارے ہاں اس قسم کا ہوا ہے کہ صحیح تصور سامنے نہیں آتا حالانکہ یہ تو آپ کے ہاں نظامِ ربوبیت کا' معاشی نظام کا' قرآن حمید کی اکنامکس کا بڑا بنیادی مسئلہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جو کچھ کسی کو ملتا ہے' اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد جو باقی ہے وہ اس کو کھلا رکھتا ہے۔ اس کو روکتا نہیں ہے' اس کو بند نہیں کرتا۔ قرآن حمید نے کہا ہے کہ اس کی یہ بات نہیں کہ جَمَعَ فَاَوْعٰى (70:18) تھیلی میں بند کرتا ہے' پھر رسی سے منہ بند کر دیتا ہے۔ مومن یہ نہیں کرتا' وہ جان مار کر محنت کرتا ہے' جو کچھ کماتا ہے اس میں سے صرف اپنی ضرورت کے مطابق لیتا ہے اور جو باقی ہے اس کو رسی سے باندھتا نہیں' تجوریوں میں نہیں رکھتا' اس کو دوسروں کی ضروریات کے لیے کھلا رکھتا ہے۔ یہ ہے مومن۔

عزیزانِ من! اب ہم آگے چلتے ہیں کہا کہ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ (42:39)۔ اب آپ قرآن کریم میں دیکھیں گے کہ دین کی اسٹیج سے تعلیم دی جارہی ہے' یہ یکسر عملی بھی ہے اور عدل پر مبنی ہے۔ یہ نہیں کہا جارہا کہ ایک گال پہ کوئی تھپڑ مارے تو تم دوسرا گال اس کے سامنے کر دو' نہ کبھی اس پہ عمل ہوا ہے' نہ ہوسکتا ہے۔ اور عیسائیت نے تو اس کو Discard (رد) ہی کر دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ تعلیم ہی نہیں تھی۔ یہ تعلیم بہر حال کسی کی بھی تھی' وہ ناقابلِ عمل تھی' اس کے ساتھ ہی پھر یہ ہے کہ تم بھی یونہی کسی کو تھپڑ نہ مار دو' یہ زیادتی ہوگی۔ قرآن کریم نے اس میں فرق کیا ہے۔ کہا ہے کہ جن کے اوپر کوئی زیادتی کرے تو اس کے لیے یَنْتَصِرُوْنَ کا لفظ کہا ہے۔ اب یہ لفظ کیا ہے؟

لفظ یَنْتَصِرُوْنَ کا قرآنی مفہوم

یَنْتَصِرُوْنَ کا لفظ نصر (ن ص ر) سے ہے۔ یہ بڑا جامع لفظ ہے۔ اس کے معنی بدلا لینا بھی آجاتے ہیں' اپنی مدد کرنا بھی آجاتے ہیں' مدد طلب کرنا بھی اس میں آجاتا ہے۔ ظلم کو' زیادتی کو' روکنے کے لیے کس حد تک اجازت ہے؟ دیکھنا یہ ہے کہ کونسی تدبیر زیادہ مؤثر ہے۔

اگر معاملہ ایسے سرکشوں سے پڑ گیا ہے کہ وہ بدلے کے سوا کوئی زبان سمجھتے ہی نہیں ہیں تو یہ کہا گیا ہے کہ اس زیادتی کا بدلا لیا جاسکتا ہے تا کہ یہ بالکل ہی بدلگام نہ ہو جائیں اور پھر معاشرے میں کوئی بھی ان کے ہاتھ سے محفوظ ہی نہ رہے' بدلا لیا جاسکتا ہے۔ یہ بدلا تنہا نہیں لے سکتے' یہاں سوال تنہا کا نہیں ہے' یہ تو معاشرے کا ہے۔ لوگ معاشرے سے مدد طلب کرتے ہیں' دوسرے آواز دیتے ہیں' پھر مومنوں کے لیے فریضہ ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی مدد کو پہنچیں تا کہ کوئی تنہا رہنے کی وجہ سے بھی اتنا کمزور نہ ہو جائے کہ دوسرے اس کے اوپر چڑھ دوڑیں۔ یہ بات آگے آتی ہے۔ یہاں تک تو میں سمجھتا ہوں کہ عیسائیت کو تو چھوڑ دیجیے کہ وہ دوسرا گال سامنے لاتے ہیں۔

قرآنی معاشرے میں تادیب کے متعلق عمل پیرائی کی حدود

عزیزانِ من! یہاں تک ہر ایک کہے گا کہ ٹھیک ہے صاحب! بدلا لینا چاہیے۔ اب بدلے کے لیے وہ حدود' وہ تادیب آئیں جو مقرر کی گئی ہیں۔ وہ بے محابہ نہیں ہیں کہ جو جی میں آئے اس کے ساتھ کرتے چلے جاؤ اور کہو کہ میں بدلا لے رہا ہوں' یہ نہیں ہے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ کہا کہ وَجَـزٰٓؤُا سَيِّـئَةٍ سَيِّـئَةٌ مِّثْلُهَا (42:40) جرم کا بدلا' جرم کی سزا' اس کے مطابق ہے جو اس نے کیا ہے' اس سے زیادہ نہیں ہے۔ پہلی پابندی اور روک یہ ہے کہ بدلا اس سے زیادہ نہیں ہے' خواہ ذاتی طور پہ ایسا موقع آئے جہاں تم نے بدلا لینا ہے تو زیادتی نہیں کرنا۔ یہ ابھی آدھا حکم ہے جو میں نے کہا ہے' باقی آگے آتا ہے۔ پہلا تو یہی ہے کہ بدلا لینا ہے' زیادتی نہیں کرنا۔ اگر عدالت کی رو سے اس جرم کی سزا کا سوال آتا ہے تو قانون میں ایسا ہونا چاہیے کہ جرم کی حد سے زیادہ سزا نہیں دی جائے۔ یہ ہے وَجَـزٰٓؤُا سَيِّـئَةٍ سَيِّـئَةٌ مِّثْلُهَا (42:40)۔

بعض مقام ایسے آتے ہیں کہ جن میں مجھے یہ بتانا بھی ضروری ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں ان آیات کا کیا مفہوم لیا جاتا ہے اور کس طرح سے قرآن حکیم کے مفہوم کے خلاف ہے۔ یہ بتانا ضروری ہو جاتا ہے لیکن میری مشکل یہ ہو جاتی ہے کہ اس محفل کے اندر جہاں میری بیٹیاں بہنیں بھی بیٹھی ہوں' ویسے بھی شرفا کی محفل کے اندر آپ حیران ہوں گے جو میں بات کہہ رہا ہوں' یہ بات کہی نہیں جاسکتی۔ یہ ہے جس کو آپ کے ہاں احکامِ شریعت اور فقہ کے احکام کہا جاتا ہے۔ اگر میں اس آیت کے متعلق آپ سے عرض کروں تو نہ میں جرأت کرسکتا ہوں' نہ آپ سن سکتے ہیں۔ آپ کے ہاں کا فقہ کا یہ اصول ہے کہ جس قسم کی کسی نے ضرب پہنچائی ہو' جس طرح سے پہنچائی ہو' جس چیز سے پہنچائی ہو' ضرب کی حد تک اسی طرح سے' اسی شے سے' اتنی ہی ضرب پہنچائی جائے۔ یہ ہے اس کا مطلب اور اگر اس کی موت واقع ہو گئی ہے تو جس طریق سے جو کچھ کرنے سے اس کی موت واقع ہوئی ہے وہی کچھ اس کے ساتھ کیا جائے اور اس سے آگے' میں محفل میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کے ہاں فقہ کے قانون کا کیا حکم ہے' یہ کہا نہیں جاسکتا' وہ اس لیے کہ اس کے معنی یہ کیے گئے: مثل کے معنی وہ یعنی جس طرح' جو کچھ کسی طرح سے کسی کے ساتھ کسی نے کیا ہے' اسی طرح ویسے ہی وہی کچھ اس کے ساتھ کیا جائے۔ یہ مثل کے معنی لے لیے حالانکہ اس کے

معنی بالکل صاف ہیں اور عدل پر مبنی ہیں۔ ہر شخص جو بھی عدل کی تعریف یا Definition جانتا ہے وہ سمجھے گا کہ نہایت عمدہ بات کہی ہے کہ جرم کی سزا جرم سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ صرف اس کے جرم کے مطابق دی جا سکتی ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے' یہ زیادتی کو روکا گیا ہے۔ یہ ہیں معنی اس کے' اور یہ قرآنِ کریم کے دوسرے مقامات سے واضح ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم اپنے معنی آپ واضح کرتا ہے۔ یہ جو ہے کہ جس شکل میں کسی نے کسی کو تکلیف پہنچائی یا اس کی موت واقع ہوئی' وہی شکل اس کے ساتھ برتی جائے' یہ مثل کے معنی نہیں ہیں۔ قرآن خود (10:26-27) میں اس کی شہادت دیتا ہے اس کی رو سے یہ جو آیت ہے' اس کے معنی خود بخود ابھر کر' نمایاں طور پر' واضح ہو جاتے ہیں۔ کہا ہے کہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ (10:26) بھلائی کرنے والا' اچھا کام کرنے والا' نیکی کا کام کرنے والا' اچھی خدمات سرانجام دینے والے' جو بھی یہ کچھ کریں' کہا کہ ایک تو بات یہ ہے کہ ان کے اس حسنِ عمل کا ان کو معاوضہ دیا جائے' صلہ دیا جائے۔ یہ تو عدل ہو گیا۔ ان کو اس کا بدلا' معاوضہ' صلہ دیا جائے اور اگر انہوں نے حسن کارانہ انداز سے آپ کا کام کیا ہے' خدمت سرانجام دی ہے' آپ خوش ہو گئے ہیں تو انہیں آپ انعام بھی تو دے سکتے ہیں۔ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ (10:26) میں وہ جو ''حسنیٰ'' ہے' میں نے عرض کیا ہے کہ اس کا عام ترجمہ تو نیکی یا بھلائی کیا جاتا ہے لیکن اس کے تو بڑے وسیع معنی ہیں۔ اس کے معنی ہیں توازن برقرار رکھنا' Proportion (تناسب) صحیح کر دینا۔ جو کوئی بھی کسی کے بگڑے ہوئے حسن کی تحسین کر دیتا ہے' اس کا بدلا اتنا ہی نہیں۔ کہا کہ ہم تو بڑے کشادہ ظرف واقع ہوئے ہیں' ہم اس سے بھی زیادہ دیتے ہیں۔ عام الفاظ میں یہ کہیے کہ اگر آپ نے مزدور لگایا ہے' وہ آپ کا کام کر رہا ہے' دن بھر جو آپ نے طے کیا ہے وہ تو دینا ہے لیکن اگر وہ کام ایسا کرتا ہے جس سے آپ بہت خوش ہوتے ہیں' یہ کچھ از خود وہ کر رہا ہے تو آپ اسے اس کے بعد کچھ انعام بھی دیدیتے ہیں حالانکہ یہ عدل کا تقاضا نہیں وہ اس کے آگے کی بات ہے جسے احسان کہتے ہیں۔ یہ اس کا تقاضا ہو جاتا ہے۔ یہ تو ہو گئی وہ جو زیادہ کی بات ہے۔

ذاتِ خداوندی کی نوازشِ بے کراں مگر جرم کی سزا' جرم کے مطابق

آپ کو یاد ہے کہ وہاں قرآن کریم نے یہ کہا ہوا ہے کہ جنت میں یا جنتی معاشرہ میں جو کچھ تم چاہو گے ہو گا' جو کچھ تم مانگو گے۔ ملے گا [1] اس کے بعد کہا ہے کہ وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (50:35) یعنی اتنی بات بھی کچھ کم نہیں کہ جو چاہو گے ہو جائے گا' جو مانگو گے مل جائے گا یعنی اس سے زیادہ اور کوئی کیا کہے گا لیکن بات کرنے کا اندازہ لگائیے' انسان یہیں تک بات کر سکتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارے پاس اس سے بھی

---

[1] لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا (50:35)

زیادہ ہے یعنی جو تم چاہو گے ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے، وہ ہم دیں گے۔ جب وہ آیت آئی تھی تو میں نے عرض کیا تھا کہ یہاں بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ جو ہم چاہیں گے وہ ملے گا، اس سے بھی زیادہ کیا ہے تو قرآن حمید نے دوسری جگہ کہا ہے کہ تم تو ایک محدود ذہن کے، محدود تقاضوں کے مالک ہو، محدود آرزوؤں کے، محدود تمناؤں، پہ بیٹھے ہوئے ہو۔ تم تو اپنے ظرف کے مطابق ہی مانگو گے، چاہو گے اور ہمارا ظرف تو بڑا لامتناہی ہے۔ میں نے مثال دی تھی کہ ایک جو بچہ ہے، وہ زیادہ سے زیادہ دکانوں پہ جائے گا تو وہ کھلونا مانگے گا، گھوڑا دیدیجیے، یہ موٹر سائیکل دیدیجیے۔ وہ اس کا بچپن کا تقاضا ہے آپ لے دیں گے۔ دو تین برس کے بعد وہ سارے کھلونے پھینک دیتا ہے۔ اس کے تقاضے اور بڑھ جاتے ہیں۔ بڑا ہوتا ہے تو اور بڑھ جاتے ہیں۔ اب وہ گھوڑا کھلونا نہیں مانگتا، سچ مچ کا گھوڑا مانگتا ہے۔ اب وہ کھلونے والی موٹر نہیں مانگتا وہ سچ مچ کی موٹر مانگتا ہے۔ جب وہ بچہ آپ سے وہ چھوٹا سا کھلونا مانگ رہا تھا، تو اس سے کہیں کہ ہاں بیٹا! اس وقت تو یہ لے لو، ہمارے پاس اس سے بھی کہیں زیادہ تمہارے لیے رکھی ہوئی ہیں۔ یہ ہے جو وہاں کہا گیا ہے کہ تمہاری مانگ تو بچپن کی مانگ ہے تم تو ابھی عہدِ طفولیت میں ہو۔ انسان سے کہا گیا ہے تم نے جوان ہونا ہے، اس وقت تمہاری مانگ بڑھ جانی ہے، تمہاری تمنائیں اور ہو جانی ہیں، تو ہمارے پاس ان تمناؤں کو پورا کرنے کا بھی سامان ہے، جو بڑھ کر اور ہو جانی ہیں۔ کیا بات ہے انسان کی مانگ اور اس کی تمنا! اس نے کہا کہ تمہاری ہر چیز محدود ہے، مانگ بھی تمہاری محدود ہے، وہ اس سے زیادہ دیتا ہے۔ کیا کہا ہے اس نے:

میں ہمیشہ اپنے سوالِ شوق کی کمتری پہ خجل رہا
کہ نوازشِ بے کراں نے مجھ کو میری طلب سے سوا دیا

یہ جو طلب سے سوا دینا ہے، یہ اسی کا کام ہے۔ یہ ہے وَ زِيَادَةٌ (10:26)۔ یہاں تو یہ کہا کہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ [1] (10:26) اور اس کے برعکس کہا وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ (42:39) لیکن اگر کسی سے غلطی ہوئی ہے، کوئی ایسا جرم ہوا ہے تو اس کی جو سزا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں ہے، وہ اتنی ہی ہے۔ اب اس تقابل سے معنی سمجھ میں آ گئے کہ وہ ''سیات'' کی جو مثل کہا ہے اس کے معنی کیا ہیں، تو حسن کارانہ خدمت کے معاوضے میں جو طے کیا گیا ہے اس سے زیادہ انعام بھی ہے، لیکن جرم کی سزا جرم سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ اتنی ہی ہے۔ یہ عدل ہے، وہ احسان ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ابھی میں نے آیت (42:40) کا

---

[1] جو لوگ اس روش کو اختیار کر کے حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں، اس کا نتیجہ اتنا ہی نہیں ہوتا کہ ان کی اپنی زندگی حسین ہو جاتی ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ بھی کہ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ (10:26) ان کا معاشرہ ذلت و رسوائی کے کرب انگیز عذاب سے محفوظ رہتا ہے اور اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (10:26) ایک ایسی جنت میں تبدیل ہو جاتا ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آتی (16:30; 55:60; 80:42)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص ص 465 تا 466)۔

پہلا حصہ پڑھا ہے۔ یہاں اجازت ہے' پھر میں کہوں کہ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ (42:39) زیادتی ہوتی ہے' اس کا بدلا بھی لے سکتے ہیں' لیتے بھی ہیں۔ بدلا لینے میں یہ ہے کہ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (42:40) جتنی کسی نے کچھ زیادتی کی ہے' اتنا ہی اس کا بدلا لیا جائے گا' جو جرم ہے اس کے مطابق سزا دی جائے گی۔

مومن کا شعار

اس بدلا لینے کے آگے ہے کہ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (42:40) بدلا لینے سے تم اپنے جذبات کی تسکین تو کر سکتے ہو' اتنی بات ٹھیک ہے' لیکن آگے بڑھو۔ اگر تم دیکھتے ہو' یہ وہی بات ہے جو میں نے پہلے بھی پچھلی دفعہ کہی تھی' پھر اس مجرم میں احساسِ ندامت پیدا ہو گیا ہے' وہ اپنے کیے پر پشیمان ہو گیا ہے' شرمندہ ہو گیا ہے' اسے احساس ہوا ہے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے' اس کا امکان ہے کہ اگر اس کو معاف کر دیا جائے تو اپنی اصلاح کر لے گا' سزا دینے سے وہ بات اس کے اندر رہتی کہ میں اس کی اصلاح کروں' جو کیا ہے اس کی سزا مل گئی۔ اس نے کہا ٹھیک ہے' لیکن کہا ہے کہ اگر تم اس سے درگزر کر دو گے اور اس طرح سے اس کی اصلاح ہو جائے تو تمہیں یہاں سے تو کچھ نہیں ملا مگر فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (42:40) ہم دیں گے اس کا اجر۔ اب یہ آیا مومن کا شعار۔ اب دیکھیے کہ یہ جو قرآن حکیم نے یہاں پورا سسٹم بتایا ہے وہ کس قدر عدل کے مطابق ہے' Practicable (قابلِ عمل) ہے اور جو اگلا حصہ ہے اس کے بعد وہ مومن کا شعار ہے۔ یعنی بات یہ ہو گئی کہ وہ اگر کوئی زیادتی کرتا ہے' تو بدلا لے سکتے ہو' یہ بدلا اتنا ہی ہو جتنا کسی نے زیادتی کی تھی' اس سے زیادہ نہیں' لیکن اگر وہ درگزر کر دیں' معاف کر دیں' اور اس طرح سے اس کے اصلاح کے لیے ایک Opportunity (موقعہ) بہم پہنچا دیں تو یہ ہے جو مومن کا شعار ہے۔ اس کا بدلا ہم دیں گے۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (42:40) ظالم کو تو ہم پسند ہی نہیں کرتے۔ اب یہ آیا مومن کا شعار۔

قصۂ ابلیس و آدم کی حقیقت اور ہماری معاشرتی زندگی

میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا اور اس دفعہ تو وہ جولائی کا پرچہ [1] شائع بھی ہو گیا ہے۔ اس پرچے میں میرا ایک مضمون آیا ہے۔ بظاہر اس کا عنوان تو کچھ عجیب قسم کا ہے: مشینی انسان اور قرآنی نظام وہ بھی ایک اہم چیز ہے۔ اس میں' میں نے یہ بتایا ہے کہ قرآنِ کریم میں ہر جرم کی تلافی کی گنجائش ہے' وہ انسانوں کی کمزوریوں کو جانتا ہے۔ ٹھیک ہے اس سے بھول چوک ہو سکتی ہے۔ وہ انسان کی لغزشوں سے واقف ہے۔ اس سے یہ کچھ ہو سکتا ہے۔ ایک چیز ہے دانستہ' ارادتاً' عمداً' کسی چیز کا کرنا اور پھر کرنے کے بعد سرکشی اختیار کرنا۔ یہ

---

[1] پرویزؒ: مشینی انسان اور قرآنی نظام (7:34)' طلوعِ اسلام' جولائی 1981ء ص ص۔ 1 تا 35۔

ایک اور Attitude (روّیہ) ہے۔ ایک یہ ہے کہ سہواً کوئی لغزش ہوگئی' اس لغزش کے بعد اس کا احساس ہوا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی تو اس کا ردِعمل یہ ہوا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (7:23) بارِالٰہا! لغزش ہوگئی' بھول ہوگئی' سہو ہوگیا' نسیان ہوگیا' اگر تُو اس سے درگزر نہ کرے گا تو ہم تو تباہ ہو جائیں گے۔ یہ جو اس چیز کا اظہارِ ندامت یا احساس ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی' اس سے نظر آتا ہے کہ اس میں اصلاح کا امکان ہے اور میں نے کئی دفعہ یہ کہا ہے کہ قصہ آدم و ابلیس میں تو بات ہی اتنی کہی گئی ہے کہ معصیت آدم سے بھی ہوئی' معصیت ابلیس سے بھی ہوئی' آدم سے کہا گیا کہ اس نے یہ کیوں کیا؟ اس نے کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23) اے پروردگار! بھول ہوگئی' چوک ہوگئی' غلطی ہوگئی' معافی چاہتا ہوں' آئندہ یہ نہیں کروں گا۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے' تیری اصلاح ہو سکتی ہے' اصلاح کے لیے ہم تمہیں موقع دیتے ہیں۔ ابلیس سے کہا گیا کہ تم نے کیوں کیا؟ قرآن کریم بتا رہا ہے کہ اس نے وَاسْتَكْبَرَ (2:34) کیا۔ اس سے سرکشی ہوگئی' وہ کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا کہ میں کیا کر سکتا ہوں' تیرے حکم کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہلتا' تُو کراتا ہے جو کچھ کراتا ہے' مجھ سے جو کچھ کیا گیا ہے یہ معصیت تم نے کی ہے۔ کہنے لگے کہ تُو اپنی ذمہ داری قبول نہیں کرتا' دوسروں کے سر دھرتا ہے اور اس کے بعد پھر اکڑتا بھی ہے' سرکشی بھی برتتا ہے' تم میں اصلاح کا امکان نہیں ہے' امکان تو یہ ہوتا کہ تُو ذمہ داری کو قبول کرتا' اپنی لغزش کا احساس ہوتا' آئندہ کے لیے اس سے مجتنب رہنے کا عہد کرتا' پھر تو بات تھی۔ یہی ہے سارا قصہٗ ابلیس و آدم۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک سزا تو اس کے لیے ہے جو اپنی غلطی کو تسلیم ہی نہ کرے

چیز یہ ہے کہ جس میں اصلاح کا امکان نظر آئے' اسے سزا نہیں دینا چاہیے۔ اب قرآن حکیم میں قانون اور عدل اور معافی' ان تمام کڑیوں کی وضاحت ہوگئی' اور یہاں ہمارے ہاں یہ ہے کہ صاحب! ٹھیک ہے جی' چور چوری کرتا ہے' اس کا ہاتھ کاٹ دو' اور ہاتھ کاٹنے کے بعد اس کی توبہ قبول کرلو۔ وہ اس کا ہاتھ ہی کٹ گیا تو اب کیا قبول کرلو گے' ایسا تو ہے نہیں کہ پھر اس کو سریش سے جوڑ دو' وہ تو کٹ گیا۔ وہ توبہ تو اس سے پہلے کی بات ہے۔ آپ میرے اس مضمون [1] کو دیکھیں گے' میں نے بڑی وضاحت سے اس میں لکھ دیا ہے۔ یہ ہے نظامِ عدل کہ جس میں احساسِ ندامت نظر آئے' امکان نظر آئے کہ اگر اس سے درگزر کیا جائے گا تو آئندہ کے لیے یہ پھر اس کو Repeat (باردگر) نہیں کرے گا۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ یہ سزا اس کے لیے ہے جو اپنی اس غلطی کے اوپر اصرار کرے اور اس سے باز نہ آئے' نادم نہ ہو۔ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ o وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ (42:40-41)۔ اسے پھر دہرا دیا کہ اس کی بھی اجازت ہے۔ تمہارا ردِعمل یہ ہونا چاہیے کہ درگزر کرو لیکن اگر تم دیکھو کہ اس

---

[1] ماہنامہ طلوع اسلام' جولائی 1981 میں مضمون ہے ''مشینی انسان اور قرآنی نظام''

میں ندامت کا احساس نہیں ہے‘ اصلاح کی گنجائش نہیں ہے‘ تم اس سے بدلا لیتے ہو‘ تو ٹھیک ہے۔ لے سکتے ہو‘ یہ کوئی جرم کی بات نہیں ہے۔ اِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (42:42) جرم تو ان کا ہے جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں‘ زیادتی کرتے ہیں‘ خواہ وہ بدلہ لینے میں ہی زیادتی کیوں نہ ہو‘ وہ بھی تو ظلم ہو جائے گا۔ جرم ان کا ہے جو یہ کرتے ہیں اور وہ بغاوت کرتے ہیں۔ یہاں ہے کہ بِغَيْرِ الْحَقِّ (42:42)۔ یہ کتنی Practicable (قابلِ عمل) چیز ہے یعنی یہ ایک تو انفرادی طور پر کسی کی غلطی یا جرم کے خلاف اٹھنا ہے‘ یہ جو قرآن حکیم میں ''بغیہ'' ہے وہ ایک نظام کے خلاف‘ مملکت کے خلاف‘ حکومت کے خلاف ہے یعنی ایک فرد کی طرف سے اگر وہ ظلم ہو رہا ہے تو وہ تو ان باتوں میں آ گیا جو کہا گیا ہے کہ اس طرح بدلا لو‘ اگر کوئی اس قسم کی چنگیزی حکومت آ گئی ہے کہ وہ مبنی ہی ظلم واستبداد پر ہے‘ تو اس کے لیے قرآن حکیم کی تلقین ہے کہ اس کے خلاف کھڑا ہوا جا سکتا ہے‘ کون سی چیز جرم ہے؟ کہا کہ وَيَبْغُونَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (42:42) یہ ہے استثنیٰ کہ جو الحق ہے‘ اس کے مطابق ہو اور الحق تو خدا کی کتاب ہی ہے۔ قرآنِ کریم کا تقاضا اس کی کتاب کا تقاضا ہو‘ اس کے مطابق کسی استبداد‘ ظلم وستم‘ غصب اور نہب وسلب پر مبنی کسی نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا قرآن حکیم کی اقدار کی رو سے‘ اس کی حدود میں رہتے ہوئے‘ یہ تو مومنین پر فریضہ عائد ہو جاتا ہے لیکن وہ الحق کے مطابق ہونا چاہیے۔ یہ چیز ہے شرف ومجد کی۔

بغاوت جیسے جرم کے سلسلہ میں بھی قرآنِ حکیم احساسِ ندامت کو آخری دم تک پیشِ نظر رکھتا ہے

قرآن حکیم کی رو سے جسے حکومت کہتے ہیں وہ الحق کو Establish (قائم) کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کے احکام وقوانین اور اقدار کو عملاً Establish (قائم) کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ کہا کہ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيمٌ (42:42)۔ الحق کے مطابق جو اس طرح سے بغاوت نہیں کرتے تو ان کے لیے درگزر ہے۔ اس کے برعکس جو قوت کے نشے میں بدمست ہو کر‘ ناحق ملک میں اودھم مچاتے ہیں‘ یہ سزاوالی بات ان کے لیے ہے‘ یہ جرم عظیم ہے۔ اب اس میں بڑی استقامت کی ضرورت ہوگی۔ کہا کہ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُورِ (42:43)۔ یہاں پھر قرآنِ کریم میں آگے وہ بات آ گئی جہاں باغیوں کو سزا دینے کے متعلق کہا گیا ہے‘ وہ سورۃ مائدہ کی جو آیت ہے‘ اس میں ان کے لیے سنگین ترین سزا ہے‘ وہ بغاوت ہے‘ نظامِ حق وعدل کو الٹنے کے لیے بغاوت ہے‘ قرآنی نظام کو الٹ کر اس کی جگہ ابلیسی نظام قائم کرنے کے لیے ایک بغاوت ہے۔ قرآنی نظام کو الٹنے کے لیے اگر کوئی استبداد یا بغاوت کی جاتی ہے تو قرآن حکیم نے اس کو بغاوت قرار دیا ہے اور اس کی بڑی سخت سزا قرار دی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کہا کہ اگر وہ باغی‘ وہ فوج کہیے‘ یا وہ پارٹی کہیے‘ قبل اس کے کہ تم اس پر غلبہ پا لو‘ وہ Surrender کر جائیں‘ پھر ان کو معاف کر دو کیونکہ ان کا جو

Surrender (ہتھیار ڈالنا) کر دینا ہے وہ اس کی علامت ہے کہ انہوں نے اپنی غلطی کو محسوس کر لیا ہے اور اس کے بعد تم دیکھ سکتے ہو کہ ان میں اصلاح کی گنجائش ہے۔ یہ اتنا بڑا جو جرم ہے' اس میں بھی قرآن حمید نے گنجائش رکھی ہے۔ انسان کے اندر جو چیز ہے کہ احساسِ ندامت ہونے کے بعد وہ اپنی اصلاح کر سکتا ہے' وہ اس سے کبھی چشم پوشی نہیں کرتا' انتہا تک جاتا ہے اور جو انتہا میں نے کہا ہے' قرآن حمید نے اس میں یہ اجازت دی ہے کہ اگر وہ قبل اس کے کہ تم ان پہ غالب آ جاؤ' اس سے پہلے اگر وہ Surrender کر دیں' تو ان کو معاف کر دو۔ اس کے برعکس قرآن حمید نے یہ چیز کہی ہے کہ اگر وہ Surrender نہ کریں' تم ان پہ غالب آ جاؤ' تو یہ سزا دے سکتے ہو۔

سزاؤں کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ قیامت تک بار آور ہو گا

ہمارے سامنے یہاں ایک بڑی اہم چیز آتی ہے کہ یہ نہیں ہے کہ تم پھر ان کے Surrender کرنے کے بعد ضرور ہی ایسی سزا دو۔ اب یہاں ہمارے سامنے نبی اکرم ﷺ کا اسوہ حسنہ آتا ہے۔ ان قریشِ مکہ نے' تیرہ سال حضور ﷺ کی مکے کی زندگی میں اور سات سال مدینے کی زندگی میں جماعتِ مومنین کے ساتھ اور حضور ﷺ کے ساتھ جس قدر تکالیف اور صعوبات بہم پہنچائیں' وہ سوہانِ روح ہیں۔ سات سال مدنی زندگی میں تو ہر سال' ہر مہینے' قریباً انہوں نے لڑائیاں کیں' جنگیں کیں بالآخر مکہ فتح ہوا' تو انہوں نے Surrender کیا۔ اس سے پہلے نہیں کیا۔ مکہ فتح ہو گیا' وہ گرفتار ہو کر سامنے آ گئے۔ قرآن مجید کی رو سے ان کو یہ سزا دی جا سکتی تھی۔ اب یہاں ایک اور اہم قانونی نکتہ آتا ہے کہ سزا دی جا سکتی ہے' اس کی ایک اجازت ہے کہ ایسا کیا جا سکتا ہے لیکن اگر سربراہِ مملکت یا آپ کا نظام' اس کے بعد بھی یہ دیکھتا ہے کہ اب بھی ان میں ایسا امکان نظر آتا ہے کہ ان کی اصلاح ہو جائے گی' اس کو اس کی اجازت ہے کہ اس پہ بھی سزا نہ دے' چنانچہ فتح مکہ کے بعد یہ تمام قریش جب پابجولاں حضورؐ کے سامنے آتے ہیں تو قرآن مجید کے اس حکم کی رو سے ان کو سزا دی جا سکتی تھی۔ آپؐ نے ان سے پوچھا کہ کہو تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ وہ تو دشمن بھی شریف دشمن تھے۔ انہوں نے کہا کہ جیسا دشمنوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ وہ رحم نہیں مانگتے تھے لیکن حضور ﷺ نے یہ دیکھ لیا کہ یہ قوم ایسی ہے کہ جب ان کو اپنی غلطی کا اس قسم کا احساس ہو گیا ہے تو اس وقت اگر ان پہ احسان رکھا جائے گا تو ان کے اندر اصلاح کی گنجائش ہے تو اس وقت ان پورے کے پورے مخالفین کی جماعت کے متعلق حضور ﷺ نے کہا کہ **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92) جاؤ' میں تمہیں کوئی سزا نہیں دینا چاہتا' تم سے کوئی مواخذہ نہیں۔ اب اس کے بعد آپ دیکھیے کہ وہ جتنا اسلام پھیلا ہوا آپ کو نظر آتا ہے' اس کے بعد یہ حضور ﷺ کے اسی فیصلے کا نتیجہ تھا۔ انہیں سزا دی جا سکتی تھی۔ وہ سزا دی جاتی یا ان کے متعلقین' ان کے ہمنوا' ان کے ہمدرد' عرب میں بھی تھے' عرب کے باہر مملکتوں میں بھی تھے' سزا ملنے کے بعد تو پھر ان کے دل میں بھی انتقام کا جذبہ بیدار ہوتا' وہ یوں سامنے نہیں آتے' انڈر گراؤنڈ روپوش ہو کر کوئی اقدام کرتے' سازشیں

کرتے' وہ ان مملکتوں کے ساتھ مل جاتے' پھیل جاتے لیکن یہ جو ایک چیز تھی کہ ان سے یہ اتنا کشادہ ظرفی کا سلوک تھا' ایک فرد کے ساتھ نہیں' پوری جماعت کے ساتھ تھا جس کے تحت آپ ﷺ نے کہا کہ **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92) جاؤ مواخذہ نہیں۔ اس فیصلے کا نتیجہ یہ تھا کہ انہوں نے پھر اسلام کی حفاظت میں اپنے سر کٹوا دیئے۔ اس کے بعد جو دوسروں سے اور جنگیں ہوئی ہیں اُن میں یہی لوگ تھے جن کو اس طرح سے کہیے کہ جنہیں معاف کر دیا گیا تھا' یہ اسلام کی حفاظت میں سب سے آگے آگے تھے۔ گویا یہ تھی وہ نگہ نبوی ﷺ جس نے دیکھا کہ ان کے اندر یہ صلاحیت ہے اور امکان ہے اور اگر ان کی اصلاح ہوگئی تو یہ ایسے ہیں کہ پھر جہاں یہ باطل کی خاطر اتنے سالوں تک لڑے رہے' حق کی خاطر اس سے بھی زیادہ گرمجوشی کے ساتھ میدان میں آئیں گے اور یہی ہوا۔

''غفر'' کے لیے استقامت اور عزم الامور

اسی لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ **وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ** (42:43)۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایسے وقت کے اندر تم بدلہ لے لو' سزا دیدو۔ یہ تمہیں رخصت (اجازت) ہے لیکن یہ عزم الامور نہیں ہے' کیریکٹر کی بلند ترین مثال نہیں ہے۔ وہ یہی ہے کہ ایسے موقعہ پر بھی تم اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھو۔ ان میں اصلاح کا امکان ہو تو کہو کہ **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92) اور **وَغَفَرَ** (42:43) کرو یعنی اس طرح سے اپنی بھی حفاظت کرو اور ان کی بھی حفاظت کرو۔ کیا بات ہے غفر کی! لیکن اس میں صبر کی ضرورت ہے' بڑی استقامت کی ضرورت ہوگی۔ یہ بہرحال ایک قیاس ہے' ایک رائے ہے' ایک خیال ہے' ایک گمان ہے کہ اس کے بعد یہ جو لوگ ہیں' یہ حق کے اوپر آئیں گے' حق کی خاطر ایثار کریں گے۔ یہ ان کے متعلق ایک اندازہ ہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ غلطی ہو۔ کہا کہ یاد رکھو! اس کے لیے بڑی استقامت کی ضرورت ہوگی' نگاہ رکھنی پڑے گی' اس کے لیے جو یہ روش اختیار کرے' دیکھنا پڑے گا اور اس کے بعد ان چیزوں کے اوپر مسلسل نگاہ رکھے' یہ عزم الامور ہے۔ ہمارے ہاں دو الفاظ ہیں: ایک رخصت کہلاتی ہے اور دوسری عزیمت کہلاتی ہے۔ رخصت تو یہ ہوتی ہے کہ تمہیں اجازت ہے کہ یہ کرلو یا وہ کرلو' اس سے گناہ نہیں ہوتا جسے ہم کہتے ہیں کہ یہ کوئی جرم نہیں ہے جیسے خدا نے اجازت دی ہے۔

ایک چیز ایسی ہے جس میں عزیمت کا ثبوت ہوتا ہے کہ اجازت کے باوجود انسان یہ کہے کہ **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92)۔ یہ عزیمت ہے۔ اجازت ہے کہ ان کو سزا دی جائے' پابجولاں سامنے کھڑے ہیں۔ یہ رخصت کہلاتی ہے۔ یہ مجبوری نہیں ہوتی کہ بالضرور ان کے ساتھ تم یہی کرو' اس سے زیادہ تو نہیں۔ تم سزا دے سکتے۔ یہ تو ہوا حکم۔ رخصت یہ ہے کہ اتنی سزا تم دے سکتے ہو لیکن اگر تم دیکھو کہ اس وقت عفو سے' درگزر کر دینے سے' اصلاح ممکن ہے تو اصلاح کرو لیکن اس کے لیے بہت بڑے پختہ کیریکٹر کی ضرورت ہوگی۔ عزم

الامور کے یہی معنی کیے جاسکتے ہیں۔ مومن کی صفتِ عزیمت زیادہ اہم ہے' جو رخصت ہے وہ ایسی چیز ہے کہ جس سے یوں کہیے کہ نہ گناہ ہوتا ہے نہ کوئی ثواب ملتا ہے' اجازت تھی آپ نے وہ کرلیا۔ اصل چیز اجازت کے بعد عزیمت ہے۔ یہ ہے اصل مقصد۔

ہمارے ہاں مروّجہ تراجم کی نوعیت اور ان کے اثرات

عزیزانِ من! آگے پھر وہی آیت آگئی جس کا کہا جاتا ہے کہ کئی دفعہ یہ آیتیں آتی ہیں۔ ان کے مروّجہ ترجموں نے پوچھو نہیں' ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ وہ آیت ہے وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ (42:44) جسے خدا گمراہ کردے پھر اس کے بعد اس کا کوئی والی وارث نہیں ہوتا' گویا خدا لوگوں کو گمراہ بھی کرتا ہے (معاذ اللہ)۔ قرآنِ کریم کے ہر نسخے میں آپ کو یہی ترجمہ ملے گا کہ جسے خدا گمراہ کردے' انتہا یہ ہے کہ وہ جو خدا کے ننانوے نام اسماالحسنٰی گنائے جاتے ہیں اُن میں ان کے ہاں خدا کے لیے ایک نام المُضِلُّ بھی ہے کہ گمراہ کرنے والا خدا' ویسے تو میں نے اپنی ''کتاب التقدیر'' میں ان مقامات پہ پوری روشنی ڈالی ہے کہ ان کا مفہوم کیا ہے۔ اتفاق سے پھر اسی مہینے یعنی جولائی کے طلوعِ اسلام میں ایک اور مضمون ہے ''تقدیر[1] کی گرہیں'' اس میں' میں نے یہی پوائنٹ (نکتہ) لیا ہے کہ جہاں خدا ان کاموں کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے کہ ہم نے یہ کیا ہے تو وہاں قرآن کریم کی رو سے اس کا مفہوم کیا ہوتا ہے؟ اب یہی جو چیز ہے کہ جسے خدا گمراہ کردے اور اس کے آگے ہے کہ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ[2] (42:44) پھر جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو اس وقت چلائیں گے یعنی خدا گمراہ کررہا ہے اور پھر ان کو جہنم میں پھینک رہا ہے اور وہ چیخ رہے ہیں' یعنی اتنے پہ انسان اگر کھڑا ہو کر سوچے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تو بات نہیں ہوسکتی' بات کچھ اور ہوگی۔ وہ جو کچھ اور ہے' وہ نہ بھی اس کی سمجھ میں آئے' اتنے پہ تو وہ کہہ دے گا کہ یہ تو نہیں ہوسکے گی' لیکن کون کہہ دے گا؟ وہ کہ جو کھڑا ہو کر سوچے گا۔

غور وفکر قرآنی تعلیم کا بنیادی تقاضا ہے

جب سوچنا ہی حرام اور جرم قرار دیا جائے تو پھر وہ سوچے گا ہی نہیں۔ جب یہ کہا جائے گا تو اس کے بعد وہ کہے گا کہ جی' وہ قادرِ مطلق ہے ٹھیک ہے' ایسے ہی چل رہا ہے' سوچنا تو ہے نہیں۔ ''سوچ اور قرآن'' یہی تو اسلام ہے۔ سوچ کے بغیر تو قرآن مجید سمجھ میں نہیں آسکتا' یہ خدا کا حکم ہے کہ تدبر فی القران کرو۔ اسے جرم قرار دیا ہے کہ یہ تدبر نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کچھ تالے بنائے ہیں اور پھر ان کو

---

1. پرویزؒ: تقدیر کی گرہیں: خدا اور انسان کا تعلق' طلوعِ اسلام (7:34)' جولائی 1981ء' ص ص۔ 36 تا 60۔
2. اس قسم کی سرکشی اختیار کرنے والوں کا حال یہ ہوگا کہ جب وہ عذاب کو اپنے سامنے دیکھیں گے تو چلا اٹھیں گے کہ کیا اس کے واپس چلے جانے کی کوئی سبیل ہوسکتی ہے؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص 1137 تا 1138)۔

اپنے دلوں پر لگا دیتے ہیں۔ یہ خود ان کے اپنے بنائے ہوئے تالے [1] ہیں' لیکن وہ جو سوچے گا وہ یقیناً ان مقامات پہ کھڑا ہو جائے گا۔ نہ سوچنے والے کے لیے آسانی ہے۔ اسلاف سے یہی کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے' وہ یہی مانتے چلے آ رہے ہیں' ان کا مسلک یہی ہے۔ وہ جو طبری [2] نے پہلی تفسیر میں لکھ دیا اور اس کے بعد پھر اس ہزار سال کے اندر بس اسی کے اوپر ہر چیز چلی آ رہی ہے۔

اسلاف پرستی' اجماعِ امت اور سوادِ اعظم کے تصورات

اس کی سند یہ ہے کہ یہ اسلاف کا مسلک ہے' سلفِ صالحین نے ایسا کہا ہے کہ سوچنا نہیں ہے۔ قرآن حمید تو اس کو دلیل نہیں مانتا بلکہ وہ جو مخالفین یا کفار تھے' ان کا مسلک یہ بتاتا ہے کہ جب ان سے کہیے میاں! قرآن حمید کی طرف آ ؤ تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں' صاحب! ہم تو اپنے اسلاف کے مسلک پہ چلتے جائیں گے۔ قرآنِ کریم کفار کا یہ مسلک بتاتا ہے' اور یہاں یہ بات فخر سے ہے کہ یہ اسلاف کا مسلک ہے' تواتر سے چلا آ رہا ہے' توارث سے چلا آ رہا ہے۔ اس کے بعد ایک اور چیز ان کے ہاں ہے۔ وہ ہے اجماعِ امت۔ امت کا اجماع آج تک کسی ایک نکتے پہ ہوا ہی نہیں' کسی پہ نہیں ہوا۔ اجماع کی ان کے ہاں Definition (تعریف) ہی بدل گئی ہے تاکہ سمٹ سمٹا کر کسی طرح سے سوادِ اعظم پہ لے آئیں اور سوادِ اعظم کے معنی ہیں جو گنتی میں زیادہ تھے۔ وہ چونکہ تہی تھے تو اس لیے سوادِ اعظم کہا۔ دینِ اسلام میں اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ عزیزانِ من! دین میں یہ سند اور حجت آپ کہہ رہے ہیں' روزمرہ کے معاملے میں نہیں کہہ رہے ہیں کہ پیاز مفید ہوتا ہے۔ دلیل کیا ہے؟ کہ صاحب! یہ چیز ہمارے ہاں حکماً لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ ٹھیک ہے' کھا کر دیکھ لیجیے گا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ دین کے معاملے میں' عزیزانِ من! سند اور حجت کے لیے قرآن حکیم کی رو سے ایک ہی معیار ہے کہ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) جو بھی خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا ان کو کافر کہا جاتا ہے۔ یہ بات کتنی واضح ہے! اس کے متعلق قرآن حکیم جو ما انزل اللہ ہے کا سند و حجت ہونا' ایک معیار ہے۔

سند و حجت یا معیار صرف خدا کی کتاب عظیم قرآن کریم ہے

عزیزانِ من! یہ جتنے بھی ہمارے ہاں مسالک ہیں' اسلاف کے سہی' بزرگوں کے سہی' تواتر سہی' توارث سہی' وہ اگر ما انزل اللہ کے مطابق ہیں تو ہماری سر آنکھوں کے اوپر' اگر اس کے خلاف جاتے ہیں تو ہم قرآن پر ایمان لانے پر مکلّف ہیں' ان پہ ایمان لانے

---

[1] اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُہَا (47:24) حیرت ہے کہ یہ لوگ قرآن میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟ ان کے دلوں پر کیوں ایسے تالے پڑ گئے کہ ان میں عقل و بصیرت کی کوئی بات جاتی ہی نہیں؟ (4:82)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 1190)۔

[2] ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (838-923 AD)۔

کے لیے مکلّف نہیں ہیں، خدا نے کہیں یہ نہیں کہا کہ تم سلفِ صالحین پر ایمان لاؤ، اجماعِ امت پر ایمان لاؤ، تواتر پہ ایمان لاؤ۔ سند و حجت یا معیار صرف خدا کی کتاب عظیم قرآنِ کریم ہے۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کو امتِ واحدہ کے انداز میں عام کرنا عزم الامور کا متقاضی ہے

عزیزانِ من! اس کے لیے بڑی، جسے میں نے ابھی عزیمت کہا ہے، کی ضرورت ہے جب تک آپ کے ہاں تھیوکریسی (مذہبی پیشوائیت) ہے، ان حضرات کا زور ہے، آپ کا یہ بات کرسکنا تو ایک طرف، آپ یہ کہہ بھی نہیں سکتے۔ اس کے لیے تو جب بھی کبھی، کچھ یوں جو عام الفاظ میں کہتے ہیں، قسمت نے یاوری کی، مسلمانوں کی اس قوم میں کوئی ایسی جماعت پیدا ہوئی جس میں یہ بات کہنے کی جرأت ہوئی، یا کوئی ایک فرد بھی اتنی بڑی جرأت کا ہوا، اتنے بڑے کیریکٹر کا ہوا جو یہ بات ان الفاظ میں کہہ سکے جن میں اقبالؒ نے سب Discuss (بحث و تمحیص) کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ ہے جو کچھ دین ہے، یہ کہا جائے کہ ما انزل اللہ نے یہ کہا ہے، یہ حق ہے، اس کے خلاف ہر بات باطل ہے۔ کہا کہ یہ تو وہ شخص کہہ سکے گا جو عمر ؓ (581-644/45 AD) کی روح کو لے کر جرأت اور بسالت سے آگے بڑھے، وہ عمر ؓ کہ جس سے نبی اکرم ﷺ کی وفات کے آخری سانسوں میں یہ کہہ دیا کہ "حسبنا کتاب اللہ" ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ اُس دور میں تو چنداں مشکل نہیں تھا، وہ سارے ہی اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہتے تھے لیکن جب یہ غیر از قرآن تمام چیزیں دین بن جائیں، سندیں بن جائیں، تو ان تمام چیزوں کو کاٹ کر صرف قرآن حکیم کو سند اور حجت تسلیم کرانا عزم الامور ہے، بڑی جرأت ہے لیکن بہرحال یہ قوم یا دنیا کی کوئی اور قوم صحیح راستے پہ اسی دن آئے گی جس دن اس نے دین کے اندر قرآن حکیم کو سند اور حجت مان لیا۔

توبہ کی قبولیت کے لیے غلط کام کا پہلے تعمیری انداز میں ازالہ کرنا ضروری ہے: ندامت بعد از وقت کی کچھ اہمیت نہیں

قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ وَتَرٰهُمۡ يُعۡرَضُوۡنَ عَلَيۡهَا خٰشِعِيۡنَ مِنَ الذُّلِّ يَنۡظُرُوۡنَ مِنۡ طَرۡفٍ خَفِىٍّ [1] (42:45) اس دن جب یہ تباہی ان لوگوں کے اوپر آئے گی، جسے قرآن حمید عذاب کہتا ہے، تو تم دیکھو گے کہ وہ ذلت اور خواری سے، ندامت سے سر جھکائے ہوئے ہوں گے لیکن یہ ندامت بعد از وقت ہے کیونکہ اب اصلاح کے لیے وقت نہیں رہا۔ قرآن حمید نے اسی لیے کہا ہے کہ توبہ اس کی ہے جس سے جب کوئی غلط کام ہو جائے تو اس کے فوری بعد اس کو احساس ہو اور اس کے فوراً ہی بعد یہ عزم کرلے کہ میں نے اس کا

---

[1] جب وہ اس عذاب کے روبرو لائے جائیں گے تو اُس وقت ان کی سرکشی اور رعونت سب ختم ہو چکی ہوگی۔ نہایت عاجزی اختیار کیے ہوں گے اور کنکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھیں گے کہ کیا ان پر کوئی ترس کھاتا ہے؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1138)۔

ازالہ کرنا ہے۔ اس کے بعد یہ ہے کہ توبہ اس کی نہیں ہے جس نے غلط کام کیا اور پھر انتظار کرتا رہا حتیٰ کہ جب موت سامنے آ گئی تو اس نے کہا کہ یا اللہ! میری توبہ اوئے ہوئے!!! ''او تے ڈین وانگو سامنے آ جاندی آ۔''[1] ایسے وقت میں کہنے والے کی توبہ توبہ نہیں ہے۔ توبہ کا لفظ زبان سے کہنا نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ اور پھر معافی ہو جائے' توبہ یہ ہے کہ جو کیا تھا اس کو undo (ختم) کیا جائے اور اس کی جگہ اس سے بہتر کام کیا جائے' یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہوں تو توبہ ہے۔ سارے قرآن مجید میں **تاب و اصلح**' **تاب و اصلح** دونوں چیزیں اکٹھی آتی ہیں' پہلے کیے ہوئے پہ ندامت ہو کہ مجھ سے غلطی ہوئی اور آئندہ کے لیے یہ عزم ہو کہ میں پھر ایسا نہیں کروں گا اور اس کے برعکس مزید ایسے اچھے کام کروں گا جن کا وزن اس سے زیادہ ہو۔ ان دونوں کے مجموعے کا نام ''توبہ'' ہے۔ جب ایسا وقت آ جائے کہ اس کے لیے پھر موقعہ اور وقت ہی نہ ہو کہ اچھے کام کر کے' پہلے کام کے نقصان کا ازالہ کرے' تو توبہ کاہے کی!! قرآن مجید نے کہا کہ توبہ اس کی نہیں ہے کہ جب موت آئے تو اس وقت کہے کہ ہاں میری توبہ۔ اس کے لیے اس نے فرعون کی مثال پیش کی ہے کہ یہ سب سرکشی کرتا رہا اور جب وہ ڈوبنے لگا تو اس وقت اس نے کہا کہ یا اللہ! میری توبہ' میں اسرائیل کے خدا پر ایمان لاتا ہوں ہم آپ ہوتے تو یہ کہتے کہ ٹھیک ہے ٹھیک ہے صاحب! دیکھیے ناچلا رہا ہے' رو رہا ہے' اس کو بچالو' لیکن وہ تو قانون والا خدا ہے' اس نے کہا ہے کہ ایک سانس پہلے تک سرکشی کی وہ کیفیت تھی اور اب یہ کیفیت ہے کہ موت سامنے آ رہی ہے' ڈوبنے لگے ہو' تو اس وقت اب یہ کہہ رہے ہو کہ ہم ایمان لائے۔

ایمان تو ایک طرف تُو تو کفر میں بھی پختہ نہیں ہے۔ اس کا ایمان نہیں مانا گیا' نہیں تسلیم کیا گیا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ وہ اسی لیے تھا کہ اس کے بعد اس کی عمر میں وقت نہیں رہتا جس میں وہ اچھے کام کر کے اپنے غلط کاموں کے نقصان کا ازالہ کر سکے' اس لیے کہا کہ جب عذاب آیا ہے اس وقت ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہیں' نہایت عاجزی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ نگاہوں کا وہ جھکنا نہیں ہے جو احساسِ ندامت سے ہوتا ہے۔ یہ تو عذاب کو دیکھ کر ہوا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ **یَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِیٍّ** (42:45)۔ قرآنِ کریم کا یہ بڑا عجیب محاکاتی انداز ہوتا ہے۔ کہنے لگا کہ اس وقت آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی اور کنکھیوں سے ادھر اُدھر دیکھتے ہیں کہ کوئی ایسا ہے کہ مدد کر سکے؟ کنکھیوں سے دیکھتے ہیں' آنکھیں اٹھا کر سامنے نہیں دیکھتے۔ وہی ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ عذاب یہ ہوتا ہے۔ پھر کہا کہ **وَقَالَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِیْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ** (42:45) اس وقت یہ اربابِ ایمان کہیں گے کہ نقصان درحقیقت اس کا

---

[1] وہ تو ڈائن کی طرح سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔

نقصان ہے جس نے اقدارِ خداوندی کی خلاف ورزی کی' اپنے آپ کو بھی تباہ کیا اور اپنے اہل کو بھی تباہ کیا۔ اہل میں صرف اہلِ خاندان ہی نہیں آتے۔ پارٹی' ساتھی' رفقا' اربابِ کارواں' یہ جتنے بھی ساتھ ہوں' ہم مسلک کہہ لیجیے' ان سب کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ کہا کہ **اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ فِیْ عَذَابٍ مُّقِیْمٍ** (42:45)۔ یہ پھر وہی بات آ گئی کہ ظالم ظلم کرنے والا' واقعی بہت بڑے عذاب میں ہوگا۔

عذاب کہیں باہر سے نہیں آتا' یہ انسانی عمل کا ہی فطری نتیجہ ہوتا ہے

قرآن کریم کہتا ہے کہ **وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (42:46) خدا کے قانون کی خلاف ورزی سے یہ عذاب آتا ہے۔ یہ عذاب آنا وغیرہ ہماری زبان کے الفاظ ہیں' عزیزانِ من! یہ عذاب آتا نہیں ہے بلکہ اپنے ہاتھوں سے لایا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بار بار یہ چیز کہی ہے کہ ہر مصیبت تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے لیے وہ جو ہم کہتے ہیں کہ عذاب آتا ہے' یہ ایسے ہی ہے کہ آپ ٹرین میں سفر کر رہے ہوتے ہیں تو آپ نے جہاں جانا ہے مثلاً گوجرانوالے جانا ہے تو اس سے ذرا پہلے کہتے ہیں کہ گوجرانوالہ آ گیا۔ او! گوجرانوالہ تو اپنے مقام پہ کھڑا ہے' اس نے آنا اور جانا کہاں ہے!! یوں کہو کہ ہماری گاڑی گوجرانوالے کے پاس آ گئی۔ یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن یہ کوئی کبھی نہیں کہتا کہ ہماری گاڑی گوجرانوالے کے پاس آ گئی۔ آپ بھی گاڑی میں بیٹھے ہوئے یہی کہتے ہیں اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ گوجرانوالہ آ گیا۔ ''او کتھے آ گیا او؟''[1] تم گوجرانوالے آ گئے ہو لیکن زبان میں یہی ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ عذاب آ گیا۔ آ نہیں گیا' بلکہ ہم عذاب میں چلے گئے۔ کہا کہ **وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ** (42:46) جو قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر غلط راہ اختیار کرتا ہے اس کو پھر کوئی سیدھا راستہ نہیں مل سکتا۔ یہ بات صاف ہو گئی۔ کہا کہ اسی لیے قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اے رسول! تم ان سے کہہ دو کہ **اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ** (42:47) اس سے پہلے کہ وہ وقت آ جائے کہ وہ تباہی تمہارے سامنے کھڑی ہو جائے' اس سے پہلے خدا کی آواز پہ لبیک کہو کیونکہ جب وہ آ جاتی ہے تو پھر لوٹتی نہیں ہے' پھر تمہاری تسبیحیں پھیرنے سے' استغفر اللہ کہنے سے' وہ ٹلتی نہیں ہے۔ اس سے پہلے ہی جب ہنوز وقت ہے صحیح کام سے اپنی غلطی کا ازالہ کر لینا۔ یہ اِس وقت کی بات ہے' ایسے کرو' انتظار نہ کرو۔ اس وقت کے بعد تو پھر کہیں پناہ نہیں ملے گی' تم انکار بھی نہیں کر سکو گے پھر تو یہ کیفیت ہوگی۔

مومن کا فریضہ ہے کہ ضابطۂ ہدایت دوسروں تک پہنچا دے

قرآن حکیم کہتا ہے کہ **فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ** (42:48) اے رسول! یہ

---

[1] ارے بھئی! وہ کہاں آیا ہے؟

سب کچھ ان کو بتا دو' واضح کر دو' اس کے بعد بھی اگر یہ لوگ اعراض کریں تو پھر اے رسول! تمہارے ذمے اور کچھ نہیں۔ قرآن حمید میں دوسری جگہ کہا ہے تاکہ کوئی جان اس لیے تباہ نہ ہو جائے' کوئی نفس اس لیے تباہ نہ ہو جائے کہ اس تک قرآن نہیں پہنچا تھا۔ کہا کہ اس کو بچانا تمہارا فریضہ ہے' یہ خود بچنا ہی نہیں ہے' اس کو بچانا بھی ہے۔ مومن اتنا ہی نہیں ہے کہ یہ تیرنا جانتا ہے' یہ خود دریا کے پار چلا جائے گا' اس کا فریضہ یہ ہے کہ یہ تیرنا جانتا ہے' تو ڈوبنے والے کو بچانا بھی اس کا فریضہ ہے۔ یہ بات ہے کہ کوئی جان اس لیے تباہ نہ ہو جائے کہ تم نے قرآن حمید اس تک نہیں پہنچایا تھا' وہ دہرا جرم ہو جائے گا۔ نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم نے بات پہنچا دی۔

اسوۂ حسنہ کے برعکس ہمارا طرزِ عمل

اب اگلی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر شخص لٹھ لیے کھڑا ہوتا ہے کہ یہ سارا کچھ' یہ سارا ماحول' ٹھیک کیوں نہیں ہوتا۔ یہ سارے جو پیشانیوں پہ جفر کے نقشے بنتے ہیں اور آنکھوں کے اندر چنگاریاں نکلتی ہیں' منہ سے جھاگ نکلتی ہے' ڈنڈا ہاتھ میں ہوتا ہے' منبر پہ کھڑے ہوئے ہوتے ہیں اور پوچھو نہیں کہ کس طرح ''او واعظ گھسُنّو گھسُنّی ہون ڈیا ہنداا ے'' [1] یعنی یہ چیز ہے کہ جیسے یہ کوئی ان کے ذمے لگا دیا تھا' یہ داروغہ ہیں' کسی طرح سے یہ ان کے اوپر تھانیدار ہیں کہ یہ Keep to the left [2] کے مطابق چلتے ہیں۔ رسول سے کہا جا رہا ہے کہ تمہارا فریضہ بات کو پہنچا دینا ہے' ہم انسان کے اختیار کو سلب نہیں کرنا چاہتے۔ انہیں واضح کر دو تا کہ انہیں بات سمجھ میں آ جائے' ان کو پتہ چلے کہ یہ غلط راستہ ہے' یہ صحیح راستہ ہے۔ راستہ دکھانا تمہارا کام ہے' صحیح راستے پہ چلانا تمہارا کام نہیں ہے۔ مجبوری سے صحیح راستے کے اوپر چلنا کوئی نیکی نہیں ہے۔ اپنے اختیار سے صحیح راستہ اختیار کرنا' یہ ہے اصل بات۔ تو کام اتنا ہی ہے کہ دونوں راستے دکھا دیئے گئے۔ کہا کہ تم ان پہ داروغہ نہیں ہو کہ انہیں مار مار کر' ڈنڈے کے زور پر' کہو کہ تم صحیح راستے پر چلو یا کہو کہ میں تمہیں صحیح راستے پر چلا کر رہوں گا' دیکھوں گا کہ تم کیسے نہیں چلتے!! صاحب! ٹھیک ہے ڈنڈا جو ہوا۔ یہاں کہا ہے کہ **اِنْ عَلَیْکَ اِلَّا الْبَلٰغُ** (42:48) تمہارے ذمے فقط یہ ہے کہ تُو اس ضابطہ ہدایت کو ان تک پہنچا دے۔ بس صرف یہ ہے تمہارا کام **وَاِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ** (42:48) یہ جو بات ہم نے کہی ہے کہ تُو ان کے اوپر داروغہ مقرر نہیں کیا گیا' تمہارا کام صرف پہنچا دینا ہے' کہنے لگے کہ باقی چیز انسان کے اختیار پہ ہے اور انسان کی کیفیت یہ ہے کہ جب اس پہ خوشحالی آتی ہے تو بڑا پھنے خاں [3] بنا پھرتا ہے کہ جناب! میں نے یہ کیا اور وہ بزنس چلایا اور یہ ایسا کیا اور اس میں سے یہ ہوا اور سب کچھ ہوا۔

---

[1] وہ واعظ مکے بازی پہ تلا ہوا ہے۔

[2] بائیں ہاتھ چلو۔

[3] تکبّر باز۔

جب کبھی انسان پہ مصیبت آتی ہے تو اب یہ ہیں وہ لفظ جو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے لائی ہوئی ہوتی ہے۔ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (42:48) جب ان پہ مصیبت آتی ہے تو یہ ان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ اس وقت انسان چیخنے لگ جاتا ہے' چلّانے لگ جاتا ہے کہ خدا نے مجھے تباہ کر دیا۔ یہاں بھی قرآن حمید نے یہ کہا ہے کہ ہم کسی کو تباہ و برباد نہیں کیا کرتے۔ کھڑے ہو کر سوچو کہ یہ تباہی تم پہ کیوں آئی ہے اور وہاں گنایا گیا ہے کہ تباہی کیوں آتی ہے۔ یہ عجیب چیزیں ہیں۔ کہا کہ یہ اس لیے ہے کہ تم کہتے ہو کہ خدا نے مجھے ذلیل کر دیا ہے لیکن خدا نے ذلیل نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرے میں جو تنہا رہ جاتا تھا' تم اس کی عزت نہیں کیا کرتے تھے' تم اس لیے ذلیل ہوئے: يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (90:15) معاشرے میں لاکھوں انسانوں کے اندر رہتا ہوا بھی' جو اپنی مصیبت میں تنہا محسوس کرتا تھا' کوئی اس کا یار و مددگار نہیں ہوتا تھا' یہ تمہارا معاشرہ تھا اور آج کہتے ہو خدا نے تمہیں ذلیل کیا ہے۔ تم اس لیے ذلیل ہوئے کہ تم اس کی عزت نہیں کرتے تھے [1] اور یہاں کہا ہے بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (42:48) یہ تمہاری اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی تباہی ہے' ہم تو کسی کو تباہ نہیں کرتے' اور دوسری بات یہ ہے کہ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ (42:48) انسان بے حد ناشکر گزار واقع ہوا ہے' سرکش واقع ہوا ہے' انکار کرنے والا واقع ہوا ہے۔ خدا کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ تمہیں ڈنڈے کے زور پر ضرور سیدھے راستے پہ چلاتا پھرے' ان انکار کرنے والوں کے ان اغراض و مقاصد سے خدا کا کیا بگڑتا ہے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (42:49) تم نہیں ہو تو کیا ہوا' اس کی بادشاہت ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہے اور فطرت کی اشیا تو اس کے قوانین کے اوپر از خود عمل کیے چلی جا رہی ہیں۔ اگر تم اس کے قانون کے مطابق نہیں چلتے تو ہمیں کیا ضرورت ہے' ہمارا کچھ نہیں بگڑ رہا ہے۔ اس کی بادشاہت میں کوئی فرق نہیں آ جاتا' وہ کیوں ڈنڈے کے زور پہ چلائے کہ میرا ہی وہ تخت ہے وہ ڈول جائے گا۔ اس کو اس کی فکر نہیں ہے' اس نے تو قرآن حمید میں دوسری جگہ کہا ہے کہ ساری کائنات کے تمام انسان بھی اگر کفر اختیار کر لیں تو ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ ہم تو اس دن بھی خدا تھے جب تم ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے' وجود میں ہی نہیں آئے تھے' پیدا ہونا تو ایک طرف رہا: لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (42:49) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں سارا اقتدار و اختیار ہمارا ہے جو کائناتی قوتیں ہیں' ان پہ ہمارا کنٹرول ہے۔

---

[1] اس مفہوم کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' پارہ 30 (مکمل)' پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006' سورۃ الفجر کی آیات 15 تا 18 یعنی (89:15-18)' ص ص۔ 422 تا 439۔

جنین کے متعلق اہلِ یورپ کے سائنسدانوں کی تحقیق

یہاں ایک بات ضمناً قرآن کریم نے کہی اور اس میں ایک اہمیت ہمارے لیے بھی ہے۔ کہا ہے کہ **يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ o اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ج وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ط اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ** (42:49-50)۔ کیا بات ہے قدیری! کہا کہ ہمارے ہاں کچھ قوانین مقرر ہیں۔ یہ جو مسئلہ ہے کہ صاحب! کہیں لڑکیاں ہی پیدا ہوتی ہیں، کہیں لڑکے پیدا ہوتے ہیں، کوئی لاولد رہ گئے ہیں، کہیں لڑکیاں اور لڑکے دونوں آتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے۔ یہ کہا ہے کہ اس کے لیے ہمارے قوانین مقرر ہیں، قاعدے مقرر ہیں۔ یہ بات ابھی تک ان اہلِ یورپ کی تحقیق میں نہیں آئی تھی۔ یہاں پہنچنے کے بعد ابھی تک میں عرض کر رہا ہوں کہ انسان نے (Genetics) (جینیات) کے متعلق تحقیق نہیں کی تھی کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ اب اس کی طرف رخ آ رہا ہے۔ یہ یورپ کے جو سائنسدان ہیں، اب ان کا کچھ یہ موضوع ہے یعنی انسان کی ابتدائی تخلیق کا، بچوں کا کہہ لیجیے یا جنین کا کہہ لیجیے۔ اس میں وہ بڑی تحقیق کر رہے ہیں۔

قرآنِ کریم میں قدیر کا لفظ ہے۔ قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ یاد رکھو! ہم نے اس کے لیے کچھ قوانین، کچھ قاعدے مقرر کر رکھے ہیں۔ ابھی تک انسان ان قاعدوں پہ پڑے ہوئے پردوں کو اٹھا نہیں سکا۔ اس کی طرف چل رہا ہے، اس کی طرف آ رہا ہے اور اب ان سے قدرے پردے اٹھے ہیں اور یہ چیز انہوں نے تحقیق کر لی کہ لڑکی کیسے پیدا ہوتی ہے، لڑکا کیسے پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح سے ہر چیز کا علاج ممکن ہے حتیٰ کہ اس چیز کا بھی کہ وہ اولاد نہیں ہوتی۔ یہاں تک تو یہ آ گئے ہیں کہ اس چیز کو دیکھ کر کہ نقص کہاں ہے، وہ اس قابل بنا دیتے ہیں کہ اولاد پیدا ہو۔ قرآن کریم نے خود حضرت زکریاؑ کی بیوی کے متعلق یہ کہا ہے۔ جب حضرتِ زکریا علیہ السلام نے کہا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں، میری بیوی بوڑھی ہے اور کوئی اولاد نہیں ہے تو قرآن کریم نے کہا ہے کہ **اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ** (21:90) ہم نے اس کی بیوی کی اصلاح کر دی جس کی وجہ سے وہ اولاد کے قابل ہو گئی تو قرآن کریم نے خود ایک اشارہ دیا ہے کہ اگر علاج کے ذریعے سے وہ اصلاح کر دی جائے تو جسے ہم کہتے ہیں کہ یہ لاولد ہے، اس عورت کے ہاں اولاد پیدا نہیں ہو سکتی تو اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ یورپ والے اس مسئلے (Issue) کے پیچھے چلے ہوئے ہیں، یہاں تک تو آ گئے ہیں۔

بیٹی کی پیدائش پر موت طاری ہو جاتی ہے

میں یہاں ایک بڑی اہم بات بتا دوں۔ ہمارے ہاں تو جس بیچاری مظلوم کے ہاں تیسری یا چوتھی بیٹی پیدا ہو جائے تو اس کے گھر میں قیامت آ جاتی ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا، کہ دو ایک بیٹیوں تک تو خیر برداشت کیا جاتا ہے، تیسری بیٹی یا چوتھی بیٹی ہو، تو پھر پوچھو

نہیں کہ کیا قیامت پیدا کر دی جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہماری ایک قرآنی بیٹی ہے' وہ گائنا کالوجی کی بہت بڑی اسپیشلسٹ (ماہر) ہے۔ وہ مجھے قصے سناتی ہے۔ کہنے لگی کہ بابا جان! بیٹیاں پیدا ہوں تو صورت یہ ہے۔ عورت کے ہاں غریب یا امیر کا سوال نہیں ہے' یہ جہالت ہے۔ بڑے بڑے ماڈرن' لکھے پڑھے ہوئے' سارے اچھے امیر گھرانے کے ہاں بھی یہی صورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ بچے کی پیدائش سے کچھ وقت پہلے پتہ نہیں کہ اس عورت کے ہاں کیا ہونے والا ہے یعنی یہ نہیں ہے کہ حمل میں کوئی حادثہ ہو جائے گا کہ درست طریق کے اوپر وہ Delivery (پیدائش) نہ ہو' تشویش انگیز بات یہ ہے کہ پتہ نہیں کہ کیا پیدا ہو جائے۔ وہ عورت پہلے خائف ہے۔ اس نے کہا کہ میرے ہاں وہ کیسز آتے ہیں۔ جو اس بات سے اپنے اوپر موت طاری کر لیتی ہیں کہ خدایا! کہیں پھر بیٹی نہ ہو اور اگر وہ پھر بیٹی پیدا ہو گئی تو کئی دفعہ ان کو اتنا شاک (صدمہ) پہنچتا ہے کہ ہارٹ فیل ہو جاتا ہے' وہ روتی جو رہتی ہیں۔ اس کے بعد وہ کتنے دنوں تک' جب تک وہ ہسپتال میں رہتی ہے' اسی حالت میں ہوتی ہے۔ یہ کیا قیامت ہے۔ جس گھر میں اس نے جانا ہے جہاں سے آئی ہوئی ہے' وہاں یہ منحوس گنی جا رہی ہے کہ اس کے ہاں بیٹیاں پیدا ہو رہی ہیں' وہ گھر میں برداشت ہی نہیں ہو رہی۔ جو عرب جاہلیت تھی' قرآن حکیم نے اس کے متعلق کہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب ان کو کوئی بتاتا تھا کہ تمہارے ہاں بیٹی پیدا ہو گئی' تو اس کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ سوچتا تھا کہ اس کو عمر بھر شرمندہ رہنے کے لیے زندہ رکھوں یا ابھی سے اس کو گڑھا کھود کر دفن کر دوں اور وہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ یہ تو پھر اسلامی معاشرہ تھا جس میں یہ کہا کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) صرف مرد نہیں کہا' اس کے اندر' عورت' بیٹی اور بیٹے برابر کے واجب التکریم ہیں۔

عزیزانِ من! میں یہاں اس تحقیق پہ آ رہا ہوں یہ جو ہو رہی ہے کہ یہ جو عورت مجرم ہوتی ہے کہ یہ بیٹیاں جن رہی ہے یعنی جیسے اس نے اپنے اندر کچھ انتظام کر رکھا ہے کہ ان کے ہاں بیٹا نہ ہونے پائے' میں انتظام ایسا کرتی ہوں کہ بیٹیاں ہی ہوں' اس کو ایسے مجرم قرار دیا جاتا ہے جیسے یہ اس کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ پہلی چیز تو یہی ہے کہ اس سے پہلے تو ہم سمجھتے نہیں تھے کہ یہ ٹھیک ہے' پتہ نہیں بہر حال کچھ قدرت کا قانون ہے جس کی وجہ سے بیٹیاں ہوتی ہیں یعنی اس میں بھی یہ چیز تھی ہم متعین طور پہ نہیں کہتے تھے کہ یہ اس کا ہی قصور ہے لیکن اب تو ان کی تحقیق عجیب چیز پر آ گئی ہے اور جب وہ چیز میرے سامنے آئی تو میں نے کہا کہ کیا بات ہے!

لڑکے یا لڑکی کی پیدائش کا انحصار مرد کے نطفہ پر ہوتا ہے: آج کی تحقیق

یہ گائنا کے جو اسپیشلسٹ ہیں' ان کی تحقیق ہے کہ عورت کا جو حمل ٹھہرتا ہے وہ اس طرح ہے کہ مرد کا جرثومہ عورت کے اندر جرثومے سے آ کر ملتا ہے' جسے اختلاط کہتے ہیں' اس سے حمل ٹھہرتا ہے۔ اب یہ بات سننے کے لائق ہے جو تحقیق ہوئی ہے۔ عورت کے رحم کے اندر

لڑکا پیدا کرنے والا جرثومہ بھی اور لڑکی پیدا کرنے والا جرثومہ بھی' دونوں موجود ہوتے ہیں' عورت کے رحم میں ان دونوں کا امکان ہوتا ہے۔ مرد کے نطفے میں سے یہ چیز آتی ہے: بیٹا پیدا کرنے والا یا بیٹی پیدا کرنے والا۔ وہ اگر بیٹا پیدا کرنے والا نطفہ آتا ہے تو عورت کے بیٹا پیدا کرنے والے جرثومہ میں اختلاط ہوتا ہے۔ اگر مرد کے نطفے میں بیٹی پیدا کرنے والا نطفہ ہوتا ہے تو عورت کا بیٹی پیدا کرنے والے جرثومہ کے ساتھ اختلاط ہوتا ہے۔ اگر کہیں جرم قرار دینا ہو تو وہ مرد کا ہوتا ہے۔ قرآن کریم تو اس کو جرم قرار ہی نہیں دیتا لیکن اگر تم نے قرار دینا ہے تو تحقیق تو یہ کہہ رہی ہے کہ کنٹرول خود کرنا ہے تو اس مرد کے اوپر کنٹرول کرو۔ اس کو کہو کہ کنٹرول اپنے آپ پر کرے' بیٹا پیدا کرانا ہے تو بیٹا پیدا کرنے والا جرثومہ اس رحم کے اندر داخل کرے' وہ تو دونوں کے استقبال کے لیے تیار بیٹھی ہوتی ہے۔ کتنی عجیب تحقیق ہے! یہ سائنس آپ کی یہاں تک پہنچی ہے۔

عزیزانِ من! میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا۔ میاں صاحب! اپنے متعلق سوچو کہ کیوں یہ جرثومہ تم نے بھیجا ہے اور اگر تم کہو کہ میرا تو بس نہیں تھا تو کیا اس کا بس تھا کہ وہ تمہارے لیے بیٹی پیدا کر دیتی' لیکن یہ چیز ہے کہ چلی جا رہی ہے' ہمارے ہاں ہر گھر میں یہ اتنی منحوس چلی جا رہی ہے' طلاقیں دی جاتی ہیں' نکاح ٹوٹ جاتے ہیں' منحوس بیچاری کو تپ دق ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے وہ گھر عذاب بن جاتا ہے' ساس نندیں ساری کی ساری' اور پھر آ کر سہیلیاں بیچاری اس کے ساتھ مل کر روتی بھی ہیں اور پھر اس کو حوصلہ دیتی ہیں کہ صبر شکر کرو' ''بھناں اللہ دی مرضی اے جو کچھ اے' یعنی او اللہ دی مرضی اے او لڑکیاں دئی جاندا اے تہانوں۔'' [1] جہالت کی انتہا ہے۔ کہا کہ اس کے لیے ہمارے وہ پیمانے ہیں اور وہ علم پر مبنی پیمانے ہیں۔ جب تمہیں ان پیمانوں کا علم حاصل ہو جائے [2] گا تو پھر تم بھی اس کو اپنے کنٹرول میں کر لو گے' پھر چاہو گے تو بیٹا پیدا ہو گا' اور چاہو گے تو بیٹی پیدا ہو گی۔ پھر جو عقیم ہونے والی بات ہے کہ وہ لا ولد ہی ہے' کہا ہے کہ اس کی بھی اصلاح ہو جائے گی۔ جو جڑواں کی بات ہے' کبھی ایسا بھی ہوتا ہے یہ بھی تم کر سکو گے' کیونکہ وہ قدیر ہے اور اس نے وہ قدرت محض ڈکٹیٹر شپ کی بنا پر نہیں بنا رکھی' قرآن نے علیم کہا ہے' عزیزانِ من! یہ چیزیں سوچنے کی ہوتی ہیں۔ جو قانون علم پر مبنی ہے' جب اس قانون کا علم حاصل ہو جائے گا تو وہ چیز حاصل ہو جائے گی۔ سیدھی سی بات ہے کہ ہمارے علم کی کمی ہے جو ہم ابھی تک اس کی قدرت کو یا اس کے قانون کو نہیں سمجھ سکے لیکن ہم نے تو اس کا قدرتاً بھی ترجمہ کر دیا جس کے معنی قانون ہی نہیں۔ یعنی صرف قدرت ہے یعنی ہمیں قانون کا کوئی پتہ نہیں کہ ہم کہاں گئے ہیں۔ یہ ہے ملوکیت کے زمانے کا وضع کردہ اسلام جس میں قانون نہیں آتا' ہر چیز حکم کی آتی ہے' اور

---

[1] اے بہن! یہ جو کچھ ہے اللہ کی مرضی سے ہے۔ یعنی یہ اللہ کی مرضی ہے کہ وہ آپ کو لڑکیاں ہی دیئے چلا جا رہا ہے۔

[2] اب ان پیمانوں کا علم آگے بڑھا ہے اور پتہ چل جاتا ہے کہ لڑکا ہو گا یا لڑکی یا جنین میں کوئی نقص ہے یا دونوں (Twlns) ہیں یا کچھ اور ہے اور یہ تحقیق مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔

یہ جو قانون ہے‘ یہ کیسے ملا۔ یہ بڑی اہم آیت آگے آ گئی ہے۔

انسان قوانین فطرت اور اقدارِ خداوندی کو Discover (بے نقاب) کر سکتا ہے لیکن وضع نہیں کر سکتا

عزیزانِ من! ایک تو قوانینِ فطرت ہیں۔ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں‘ خدا کے بنائے ہوئے ہیں لیکن ان میں یہ چیز ہے کہ اگر انسان اپنے علم اور تحقیق میں ترقی کرتا چلا جائے تو ان قوانین کو بے نقاب کر سکتا ہے۔ جیسے میں نے کہا تھا کہ انسان قوانینِ فطرت کو Discover (بے نقاب) کر سکتا ہے‘ اس پہ پردے پڑے ہوئے ہوتے ہیں‘ وہ ان پردوں کو اٹھا سکتا ہے۔ جب قانون سمجھ میں آ جائے تو اس کی رو سے نیچر کی جو قوت (Energy) ہوتی ہے‘ پھر وہ اس کو کنٹرول کر لیتا ہے۔ ایٹم کے اندر جو بے پناہ قوت تھی اس قانون کا علم ہونے کے بعد انہوں نے اسے کنٹرول کر لیا۔ یہ اس پہ علیم اور قدیر ہے۔ وہ یہ کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ قوانین وہ بھی ہیں جن کو ہم قوانین نہیں بلکہ Values (اقدار) کہتے ہیں۔ وہ انسانی زندگی کے متعلق ہوتے ہیں۔ اس طرح سے انسان ان کی تحقیق کر کے انہیں Discover (بے نقاب) کر سکتا تھا۔ یہ اقدار وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں [1]۔ نبی پہ‘ رسول پہ‘ یہ وحی کس طرح نازل ہوتی تھی اسے کوئی غیر از نبی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ یہ خصوصیت ایک انفرادیت تھی‘ جو صرف نبی کی ایک چیز تھی۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس میں نبی کی اپنی فکر کا اور کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا یہ منزل من اللہ تھی‘ ان پر خارج سے ایک علم آتا تھا۔ وہ کہاں ہوتا تھا؟ قلبِ نبوی کے اندر اس کو داخل کیا جاتا تھا۔

خدا کی طرف سے وحی الفاظ کے ذریعے تھی اور اس کے ملنے کا طریق نبی کے علاوہ کوئی شخص جان نہیں سکتا تھا

یاد رکھیے! یہ جو چیز ہے اور جیسا کہ بعض کہتے ہیں کہ کچھ خیالات ہوتے تھے جو نبی کے قلب میں ہوتے تھے‘ پھر وہ اپنی زبان میں ان کو باہر بیان کرتے تھے اور وہ وحی تھی‘ یہ بالکل غلط ہے‘ کوئی خیال بغیر الفاظ کے القا ہی نہیں کیا جا سکا‘ انسان کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا‘ یہ علم اللسان کا بنیادی مسئلہ ہے۔ یہ جو وحی آتی ہے‘ یہ الفاظ کے ذریعے سے وحی تھی‘ الفاظ بھی خدا کے ہیں۔ اس لیے ان کو کلام اللہ کہا ہے تو قرآن حکیم میں جو الفاظ ہیں جیسے قرآن ہے یہ الفاظ خدا کے ہیں‘ وحی کے ذریعے رسول کو دیئے جس میں رسول کی اپنی فکر کا کوئی شائبہ تک نہیں ہے۔

---

[1] اسی لیے علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ وحی سے وقت کی بچت ہو جاتی ہے۔ الفاظ یہ ہیں کہ It economises time۔

وحی کے ملنے کا طریق نبی کے علاوہ کوئی شخص جان نہیں سکتا تھا

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ وحی کا یہ سلسلہ کیسے ہوتا تھا' اس لیے کہ ہمیں کوئی ایسا علم مل ہی نہیں سکتا۔ یہ نبوت کی خصوصیت تھی' ہم جو بات بھی کریں گے' جو کچھ بھی سوچیں گے' اس میں ہماری فکر کا دخل ہوگا' کسب و ہنر کا دخل ہوگا' تعلیم کا دخل ہوگا' ریسرچ (تحقیق) کا دخل ہوگا۔ وحی ان تمام ذرائع سے' وسائل سے' مستثنا اور منفرد ہوتی تھی۔ یہ کیسے ہوتا تھا' کوئی نہیں کہہ سکتا۔ قرآن حکیم نے یہ کہا ہے کہ **وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ** (42:51)۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ وحی یا خدا کی طرف سے انسانوں کو جو علم ملتا ہے اس کے تین طریقے ہیں۔ دو طریقے تو وہ ہیں جو رسولوں کے یا نبیوں کے لیے مختص ہیں اور تیسرا طریقہ وہ ہے کہ خدا سے عام انسانوں تک احکام کس طرح سے پہنچتے ہیں۔ یہ تیسرا طریقہ عام انسانوں کے لیے ہے۔ انبیاء سے خدا کی ہم کلامی کا طریق یہ ہے کہ کبھی خدا کی بات نبی کے دل میں ڈال دی جاتی تھی [1] اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ پس پردہ خدا کی باتیں ان کے کان تک پہنچ جاتی تھیں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوا [2] یہ دونوں طریقے انبیاء کے ساتھ مخصوص تھے۔ [3] دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ ایک طریقہ یہ ہوا کہ وحی کے لیے جبریل خدا کے احکام قلبِ نبوی میں القا کرتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جبریل کیا تھا' کس طرح سے قلبِ نبوی میں اس کا القا ہوتا تھا۔ ہمارا ایمان اتنا ہی ہے کہ حضور ﷺ نے جو فرمایا کہ یہ اللہ کا ارشاد ہے' ان الفاظ پہ ہمارا ایمان ہے کہ یہ خدا کا ارشاد ہے' زبانِ نبی سے یہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں اور تو اور نبی کی اپنی فکر کا بھی کوئی دخل نہیں ہے۔ ایک تو طریقہ یہ ہے۔ جس کو وحی کہا ہے' اس میں ایک استثنا ہے۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ **وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا** (4:164) حضرت موسیٰؑ سے خدا نے باتیں کی تھیں۔ قرآن کے اندر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ ایک تخصیص ہے۔ ہم سمجھ نہیں سکتے کہ وہ کیا ہے کہ خدا اس کو ورائے حجاب کہتا ہے۔ خدا سامنے نہیں آیا۔ وہ طور کی چوٹی کے اوپر باتیں ہوئی ہیں تو اس میں یہ چیز تھی کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ بات تو آپ کرتے ہو' کیسا پردہ ہے کہ چلمن میں چھپے بیٹھے ہو' ذرا سامنے تو آیئے' سامنے آ کر بات کیجیے' یہ بات فردوسِ گوش تو بنی ہے' جنت نگاہ بھی تو بننی چاہیے۔ اس پر کہا گیا تھا کہ نہیں' تم دیکھ نہیں سکتے۔ آواز سنائی دیتی ہے' سامنے نہیں آتے۔ یہ کیسے ہوتا تھا' وہ آواز کیسے آتی تھی' کس طرح صرف نبی سن سکتا تھا' اس کا ساتھی بھی نہیں سن سکتا تھا' یہ ہم نہیں سمجھ سکتے۔ خدا

---

[1] (2:97)۔

[2] (2:253; 4:164)۔

[3] ان الفاظ کا حوالہ یہ ہے: پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1139۔

سامنے نہیں آتا تھا۔ وہ تو بڑی بلند چیز ہے صاحب! یہ روز ہم ٹیلیفون پہ باتیں کرتے ہیں' بات ہی کان میں آتی ہے وہ سامنے آتا نہیں' تو معاذ اللہ یہ بات نہیں ہے کہ وہ اس کی مثال میں دے رہا ہوں۔ یہ ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے تخصیص ہے اور قرآن حکیم نے کہی ہے کہ ان سے خدا وراءِ حجاب بات کرتا تھا۔ بات حضرتِ موسیٰ علیہ السلام پہ ختم ہوئی' ہمارا تو Topic (موضوع) ہی نہیں' ہم پہ وحی نہیں ہوسکتی' ہم نبی نہیں ہوسکتے۔ یہ کیسے ہوتا تھا؟ اس کی ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہم ضرور معلوم کریں اور نہ معلوم کر سکتے تھے' ہمارا تعلق تو اس وحی سے ہے۔ اس آیت جو اگلا حصہ ہے وہ یہ تیسرا طریق ہے کہ انسانوں تک وحی کیسے پہنچتی ہے۔ کہا ہے کہ **یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ اِنَّہٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ** (42:51) انسانوں کی طرف رسول بھیجا جاتا تھا' جو خدا کی وحی کو ان تک پہنچاتا تھا۔ بس ہمارا تعلق یہاں تک ہے۔ رسول کو وحی کیسے ملتی تھی؟ نہ ہمیں معلوم ہے' نہ ہم معلوم کر سکتے ہیں' نہ جان سکتے ہیں۔ ہمارا تعلق یہ ہے کہ رسول ہماری طرف آیا' اس نے خدا کی وحی ہم تک پہنچادی اور کہہ دیا کہ یہ میری بات نہیں ہے' یہ خدا کا کلام ہے جو میں بالفاظہٖ تم تک پہنچا رہا ہوں' اس پر ہمارا ایمان ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔

ہمارا فریضہ وحی پر ایمان لانا ہے

عزیزانِ من! بس اتنی سی بات ہے جو قرآن نے کہی ہے۔ اس کے لیے کیا کچھ کہا گیا ہے' تصوف کیا کہہ رہا ہے' الہام اور کشف کیا کہہ رہے ہیں' یہ سارے افسانے ہیں اور قرآن حمید کے خلاف ہیں' عزیزانِ من! قرآن حمید میں وحی کا صرف ایک ہی طریق ہے کہ کبھی خدا کی بات نبی کے دل میں ڈال دی جاتی ہے (2:97) اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پس پردہ' خدا کی باتیں ان کے کان تک پہنچ جاتی ہیں جیسے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوا (4:164)۔ یہ دونوں طریقے انبیائے کرام کے ساتھ مخصوص تھے۔ اس طرح رسول کی طرف خدا کا کلام براہِ راست آتا ہے۔ ہم نہیں جان سکتے کہ کیسے آتا ہے۔ [1] ہمارا فریضہ اس وحی پر ایمان لانا ہے کہ یہ وحی خدا کی طرف سے بذریعہ رسول ہم تک پہنچی' اور رسول کے متعلق یہ ہے کہ اس کی اپنی فکر کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ یہاں یہی واضح کیا ہے کہ **وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا** (42:52) اسی طرح سے وحی کے ذریعے' قرآن حمید نے جبریل کے ذریعے کہا ہے' ہم نے اپنا امر تمہاری

---

[1] وحی کی کنہ وحقیقت اور ماہیت کو کوئی غیر از نبی جان نہیں سکتا۔ اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ قلب نبوی پر اس کا القا کیسے ہوتا تھا۔ جبریل امین اسے کس طرح لاتا تھا۔ یا (جیسے حضرت موسیٰ کے ضمن میں) ''تکلم'' سے تعبیر کیا گیا ہے' اس کی صورت کیا تھی۔ جہاں تک غیر از نبی کا تعلق ہے' ان کی طرف وحی رسولوں کی وساطت سے پہنچتی ہے۔ وہ خود براہِ راست خدا سے ہم کلام نہیں ہوسکتے۔ ختم نبوت کے بعد ''خدا سے ہم کلامی'' کا ذریعہ صرف قرآنِ کریم ہے۔ یعنی جب ہم قرآن پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے ہم کلام ہوتا ہے کیونکہ قرآن خدا کا کلام ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شخص' کسی طرح خدا سے ہم کلام نہیں ہوسکتا۔ جو ایسا کہتا ہے وہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1140 فٹ نوٹ 1)۔

طرف وحی کیا۔ یہ امر کا لفظ ہے۔ ایک تو وہ عالمِ امر ہے۔ وہ خدا کے ہاں کا ایک عالم ہے جہاں یہ ساری چیزیں طے ہوتی ہیں' ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہاں کیسے ہوتا ہے۔ وحی کے بنیادی معنی ہوتے ہیں: زندگی اور توانائی۔ ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی تعلیم بھیجی جس میں زندگی اور توانائی مضمر ہے اور آگے کہا کہ مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (42:52) تُو تو اس سے پیشتر یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں' ایمان کیا ہوتا ہے۔ بات تو ختم ہو گئی کہ حضور ﷺ کی اپنی فکر تو ایک طرف رہی' اسی جگہ اسی آیت میں یہ چیز واضح کر دی کہ رسول کی اپنی فکر کا اس میں کوئی دخل ہی نہیں ہو سکتا۔ کہا کہ اے رسول! تُو تو اس سے پہلے یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں' ایمان کیا ہوتا ہے چہ جائیکہ یہ اپنی فکر سے تُو ایسی وحی لے آتا۔ ہم نے اس کو ایک روشنی بنایا ہے' اس کے ذریعے سے ہدایت ملتی ہے' صحیح راستے پہ چلنا تمہارا اپنا کام ہے۔ اب ہو گیا کہ یہ جو کہا جائے گا کہ خدا جس کو ہدایت دے تو معنی یہ ہیں کہ یہ قرآن حمید دیا گیا ہے۔

قرآن حمید از خود ایک جگمگاتا ہوا سورج ہے

اس نے قرآن حمید دیدیا ہے' یہ نور ہے۔ یہ روشنی ہے اور نور اپنے لیے کسی دوسری روشنی کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ نہیں ہوتا کہ آپ کا بلب جل رہا ہے اور آپ موم بتی کے ذریعے سے کمرے میں ڈھونڈیں کہ وہ بلب کہاں ہے' وہ تو اپنی دلیل آپ ہوتا ہے بلکہ آپ کو وہ دلائل بہم پہنچاتا ہے کہ تم اس کے ذریعے سے دیکھو کہ وہ چیز کہاں ہے' وہ آدمی کہاں ہے' وہ شے کہاں رکھی ہے۔ نور اپنی نورانیت یا اپنی روشنی کے لیے کسی خارجی ذریعے کا محتاج نہیں ہوتا۔ قرآن حمید اس کا محتاج نہیں ہے کہ خارجی ذرائع سے اس کے اندر ہم روشنی ڈالیں اور پھر ہمیں یہ صحیح راستہ دکھائے۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ تو جگمگاتا ہوا سورج ہے' ہر شے کو روشن کر دیتا ہے تیرا کام یہی ہے کہ وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (42:52) جو سیدھا راستہ ہے تُو اس کی طرف اس قرآن کے ذریعے راہنمائی کر دے نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ (42:52)۔ قرآن کریم کے ذریعے سے ہی رسول بھی صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرتا تھا۔ اس بات کو یاد رکھیے! رسول کے پاس بھی اس کے سوا دوسرا ذریعہ نہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِىْ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ (42:52-53) اس سے ہم اپنے بندوں کو اپنے قانونِ مشیت کے مطابق زندگی کا صحیح راستہ دکھاتے ہیں اور وہ قانونِ مشیت یہ ہے کہ جو شخص عقل و فکر سے کام لے کر اس کی طرف رجوع کرے وہ اس سے راہ نمائی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی طریق کے مطابق اے رسول! تو بھی لوگوں کو زندگی کی سیدھی اور متوازن راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ اُس خدا کی طرف لے جانے والی راہ' کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' سب اس کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرم

عمل ہے۔ یہاں قرآن کریم نے صراطِ مستقیم کہا ہے۔ کتنی بڑی چیز ہے وہ راستہ' جو تمہیں خدا کی طرف لے جائے گا! بڑی جامع چیز ہے صاحب! اور خدا وہ ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ساری مملکت اسی کی ہے اَلَآ اِلَی اللّٰہِ تَصِیۡرُ الۡاُمُوۡرُ (42:53) یاد رکھو! تمہارے جتنے معاملات ہیں جو کچھ تم کرتے ہو' انہیں اس کے قانونِ مکافات کے سامنے جانا ہے اور وہاں سے اس کے مطابق نتائج برآمد ہوں گے۔ تم اس کی مملکت کے دائروں سے باہر نکل نہیں سکتے' اشتہاری مجرم بن نہیں سکتے' ہر معاملے نے وہاں ہی آ کر رہنا ہے۔

سورۃ الشوریٰ آج اختتام تک پہنچ گئی' عزیزانِ من! اگلے درس میں ہم سورۃ الزخرف لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀❀............❀❀............❀❀

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے، وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے، وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔ معراجِ انسانیت)